بسم اللہ الرحمن الرحیم

تذکرہ

سلطان العلماء

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری

شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند

سوانحی نقوش
زریں خدمات
کمالات وخصوصیات
اعتراف فضل وکمال
فقہی بصیرت واصلاحی تنقیدات
مشاہیر کے تعزیتی پیغامات
منظومات

خلیل الرحمٰن قاسمی برنی

صدر ادارہ علمی مرکز وامام وخطیب مسجد الفاروق ولیمس ٹاؤن بنگلور

Mob : 9611021347

تفصیلات

جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ ہیں

نام کتاب : سلطان العلماء
حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ
مرتب : مولانا مفتی خلیل الرحمٰن صاحب قاسمی برنی
صدر علمی مرکز وامام وخطیب مسجد الفاروق ولیمس ٹاؤن بنگلور
تعداد : ۱۰۰۰
قیمت : ۴۰۰/روپیہ
کمپیوزنگ : اخلاق الرحمٰن قاسمی سیتامڑھی
ماڈرن عربک اکیڈمی وکمپیوٹر کتابت سینٹر، بنگلور

طباعت : محمود بک ڈپو بنگلور ۵۱
No. 82, "Khan Mansion" Haines Road, Bangalore - 51
Phone : 080-42032128 Mobile : 09845 176837

ناشر : ادارہ علمی مرکز بنگلور
فون نمبر : 9611021347

☆☆☆☆☆

انتساب

- **ازہر ہند دار العلوم دیوبند کے نام:**

  جس کے اکابرین اور فرزندوں نے خصوصاً برصغیر اور عموماً عالم اسلام میں اپنی دینی، علمی خدمات اور مذہبی قیادت کا اہم فریضہ انجام دیا۔

- **اپنے محبوب اور مشفق اساتذہ کے نام:**

  جن کی توجہات عالیہ اور خصوصی محنتوں سے ہم جیسے سینکڑوں افراد میں لکھنے پڑھنے کا جذبہ پیدا ہوا۔

- **والد محترم حضرت مولانا قاری شفیق الرحمن صاحب کے نام:**

  جو احقر کے صرف مشفق باپ ہی نہیں بلکہ محسن ترین استاذ و مربی بھی ہیں۔

  اللہ تعالیٰ آں موصوف کا سایۂ عاطفت وشفقت تا دیر صحت وعافیت کے ساتھ قائم رکھے اور آپ کی عنایتوں کا بہتر سے بہتر بدلہ دارین میں عطا فرمائے۔

فہرست مضامین

۱	حرف ناگزیر	مفتی خلیل الرحمٰن قاسمی برنی	۹
۲	حرف دعاء	حضرت مولانا قاری شفیق الرحمٰن بلندشہری	۱۱
۳	حرف تشجیع	حضرت مولانا سلمان صاحب بجنوری	۱۲
۴	حرف تائید	حضرت مفتی افتخار احمد قاسمی	۱۳
۵	حرف اعتبار	حضرت مولانا محمد اسلام انجم صاحب	۱۴
۶	حرف تعارف	مولانا اخلاق الرحمٰن قاسمی	۱۵

سوانحی نقوش

۷	فقہ وحدیث کا بحر بیکراں	مفتی خلیل الرحمٰن قاسمی برنی	۱۹
۸	حیات سعید کا مختصر خاکہ	حضرت مولانا ڈاکٹر مولانا اشتیاق احمد قاسمی	۲۶
۹	حیات سعید ایک نظر میں	مولانا مصطفیٰ امین پالن پوری	۳۱
۱۰	والد محترمؒ کی خانگی زندگی	مولانا محمد سعید پالن پوری	۵۳
۱۱	عالم اسلام کے بلند پایہ محدث	مولانا مفتی ریاست علی قاسمی	۷۳
۱۲	حضرت الاستاذؒ کی زندگی کے چند گوشے	مولانا فضیل احمد ناصری	۹۲
۱۳	مفتی صاحبؒ ایک عہد ساز شخصیت	مولانا محمد فرقان قاسمی	۱۳۰
۱۴	مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ تجھے	مولانا مفتی عبداللہ قاسمی	۱۳۶

۱۵	تم جیسے گئے ایسے بھی جاتا نہیں کوئی	مولانا ڈاکٹر مولانا اشتیاق احمد قاسمی	۱۴۴

زریں خدمات

	اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا	حضرت مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی	۱۵۸
	تصنیفی خدمات کا تعارف	حضرت مولانا نجیب قاسمی سنبھلی	۱۶۰
	دیوبند تشریف آوری، تصانیف وعلمی خدمات ویادگار مجالس	حضرت مولانا مفتی خورشید قاسمی	۱۶۹
	خواص کے لئے خاصہ کی چیز ''تفسیر ہدایت القرآن''	حضرت مولانا ذکاوت حسین قاسمی	۱۷۳
	مفتی صاحبؒ کی علمی خدمات	حضرت مولانا کمال اختر قاسمی	۱۸۹
	بحیثیت مدّرس، مصنف ومؤلف	حضرت مولانا احسان ندوی قاسمی	۱۹۴

اوصاف و کمالات اورامتیازات و خصوصیات

	اے علم! ترا قافلہ سالار کہاں ہے؟	حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری	۱۹۹
	...............نایاب ہیں ہم	حضرت مفتی سلمان صاحب منصور پوری	۲۰۴
	وقت کی اہمیت	مولانا توحید عالم قاسمی بجنوری	۲۱۹
	اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے۔	ڈاکٹر مولانا اسجد قاسمی ندوی	۲۲۳
	زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر	مولانا مفتی عمران اللہ قاسمی	۲۵۲
	سلطان العلماءؒ کی چند خصوصیات اور نمایاں اوصاف وکمالات	مولانا مفتی خلیل الرحمٰن قاسمی برنی	۲۶۵
	اکیسویں صدی کے ایک عظیم محدث وفقیہِ دوراں	مولانا اخلاق الرحمٰن قاسمی	۲۷۱
	الأستاذ العبقری چند اوصاف وکمالات	مولانا احمد سعد قاسمی	۲۸۲
	آسمان علم کا نیر تاباں غروب ہو گیا	مولانا مفتی عفان قاسمی	۲۹۷

	مسلک دیوبند کے سب سے مضبوط ترجمان اور کسوٹی تھے	مولانا مفتی خلیل الرحمٰن قاسمی برنی	۳۰۴

اعتراف فضل و کمال

	کچھ تأثرات، کچھ حالات	حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی	۳۰۹
	انتہائی صدمے کی خبر	حضرت مفتی شبیر احمد صاحب قاسمی	۳۴۲
	علم حدیث کا مہر تاباں غروب ہوگیا	مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی	۳۴۶
	ایک مردم ساز شخصیت.. لاثانی مدرس... یکتا مصنف	حضرت مفتی عبد الرؤف غزنوی	۳۵۲
	مولانا سعید احمد پالن پوریؒ — فکر ولی اللہی کے مستند شارح	حضرت مولانا زاہد الراشدی	۳۸۰
	حضرت مفتی سعید احمد پالن پوری کی رحلت	مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ	۳۸۳
	جاوداں وہ سایۂ دامان رحمت میں رہیں	مولانا مصلح الدین قاسمی	۳۹۰
	حضرت مفتی صاحبؒ نقوش وتاثرات	مولانا منیر الدین عثمانی نقشبندیؔ	۳۹۷
	ایک عہد آفریں شخصیت	مولانا محمد ساجد صاحب قاسمی ہردوئی	۴۰۶
	یادوں کے نقوش	مولانا اختر امام عادل قاسمی	۴۱۵
	”سلطان العلماء“	مولانا محمد فہیم الدین بجنوری قاسمی	۴۳۸
	..................مردم ساز انسان کامل	مولانا قاری شفیق الرحمٰن صاحب بلند شہری	۴۶۲
	محرم اسرارِ دیں و مشیخیت حدیث کے مسند نشیں	مفتی شکیل منصور القاسمی بیگوسرائے	۴۶۸
	..........جوارِ رحمت میں	مولانا حسین القاسمیؔ	۴۶۷
	نگہ بلند سخن دل نواز	ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی	۴۹۱
	ہائے! کہاں غروب یہ آفتاب ہوگیا	مولانا ظفر امام	۵۰۱

	مفتی سعید احمد صاحبؒ شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند	مفتی امانت علی قاسمی	۵۰۷
	وہ جاں نثارِ علمِ شریعت نہیں رہا	مولانا وصی اللہ قاسمی	۵۱۴
	ایک نادرۂ روزگار فقیہ و محدث کی رحلت	مولانا محمد عارف جیسلمیری	۵۱۹
	کچھ یادیں کچھ باتیں	مفتی محمد جاوید قاسمی	۵۳۰
	مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے	مولانا منظور احمد قاسمی ملوا	۵۳۹
	انگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا!	مولانا نایاب حسن قاسمی	۵۴۳
	رحلت پہ تری غلغلۂ آہ و فغاں ہے	مفتی محمد اسجد قاسمی ہریدواری	۵۴۷
	ایک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا	مولانا اسجد عقابی	۵۶۱
	یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے	مولانا احمد نور عینی	۵۶۶
	آئی جوان کی یاد.......!	پروفیسر محمد فیضان بیگ صاحب	۵۷۶

فقہی بصیرت اور تنقیدات

	حضرت مفتیؒ صاحبؒ اور ان کی اصلاحی تنقیدات	مفتی خلیل الرحمٰن قاسمی برنی	۵۸۲
	مفتی صاحب کی فقہی بصیرت کی چند مثالیں:	مفتی خلیل الرحمٰن قاسمی برنی	۵۹۶
	مفتی سعید احمد پالن پوری کی فقہی بصیرت	مولانا مرغوب احمد لاجپوری	۶۰۹
	فقہی بصیرت و فکری اعتدال	مولانا نور اللہ جاوید	۶۹۵

تعزیتی پیغامات

	مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کا انتقال : ایک عظیم سانحہ	حضرت مولانا سید ارشد مدنی	۷۰۷
	تعزیت نامہ	حضرت مفتی ابوالقاسم نعمانی	۷۰۹

	تعزیت نامہ	حضرت قاری سید محمد عثمان صاحب منصور پوری	۷۱۱
	تعزیت نامہ	حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب	۷۱۳
	پیغام تعزیت	حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی	۷۱۵
	تعزیت نامہ	حضرت مولانا محمد سعیدی	۷۱۷
	تعزیت نامہ	حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی	۷۱۹
	تعزیت نامہ	حضرت مفتی خالد سیف اللہ گنگوہی	۷۲۰
	فخر دار العلوم کا سانحۂ ارتحال	حضرت مفتی افتخار احمد قاسمی	۷۲۱

منظومات

	مرثیہ	حضرت مفتی محمد یوسف تاؤلوی	۷۲۴
	نظم	ظفر اعظمی	۷۲۶
	دعائیہ کلام	حیدر میواتی ندوی	۷۲۷
	دکھے دلوں کی عرضی	قاسم نور حیدر آبادی	۷۲۹
	مرثیہ	رشید الدین معروفی	۷۳۰

حرف ناگزیر

استاذ محترم، شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری قدس سرہٗ کی شخصیت سے ہر کوئی واقف ہے، وہ اپنی زندگی میں بھی محتاج تعارف نہیں تھے۔ وہ ایشیاء کی عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے سب سے اعلیٰ منصب صدر المدرسین کے مسند پر فائز تھے۔ اسی کے ساتھ علم و شعور کے لحاظ سے بھی اکابر دیوبند کی روایات کے امین اور اسلاف عظام کی قدروں کے محافظ تھے، جس طرح ان کی تدریسی صلاحیت کا لوہا مانا گیا اسی طرح ان کی تصنیفی خدمات کو بھی قبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی زندگی میں ان کی تصنیفات ساری دنیا میں پھیل کر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکی تھیں۔ وہ اپنی گوناگوں خصوصیات اور کمالات و اوصاف کی بنا پر قدیم علماء کی یادگار تھے۔ ان کی زندگی کا ہر گوشہ قابل تقلید اور تمام لوگوں کے لئے بالخصوص اہل علم کے لئے خوبصورت نمونہ تھا۔ پھر جب وہ دنیا سے رخصت ہوئے اور اس فانی دنیا کو الوداع کہہ کر اپنے مالک حقیقی کے روبرو حاضر ہوئے تو ان کی جدائیگی اور مفارقت کے احساس نے ساری علمی دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا آپ کے فراق کو شدت سے محسوس کیا گیا۔ دیوبندی، اہل قلم، علماء، ادباء اور شعراء نے اپنے اپنے انداز میں اس عظیم علمی ہستی کو خراج تحسین پیش کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے کئی ہزار صفحات بہت کم مدت میں وجود میں آگئے اور کئی کتابیں بھی منظر عام پر آگئیں۔

مرتب نے بھی کئی مضامین لکھے جو حضرت رحمہ اللہ کے حالات، اوصاف علمی و فقہی بصیرت اور اصلاحی تنقیدات سے متعلق تھے۔ ان مضامین کو اہل علم میں پذیرائی حاصل ہوئی، مگر چوں کہ مضمون کی مدت بہت مختصر ہوتی ہے اس لئے خیال آیا کہ میری طرح اور مجھ

سے بہت اعلی اصلاحیتوں کے حامل کئی دیگر حضرات اہل علم کی نگارشات بھی وقتی طور پر مفید ہوکر ختم ہو جائیں گی۔ اس لئے ان کو جمع کیا جائے اور کچھ دیگر اہل قلم و اہل تعلق سے حضرت رحمہ اللہ کے بارے میں تاثرات لکھنے کی درخواست کی جائے۔ چنانچہ کئی اکابر نے صرف میری درخواست پر لکھا اور بہت مفید اور حقائق سے بھرپور تحریر لکھی۔ بہت سے اہل قلم حضرات نے صرف میرے اعلان سے مطلع ہو کر مجھے اپنے مضامین ارسال فرمائے۔ ان کا بھی میں بہت شکر گذار ہوں جب کہ بعض حضرات سے میں نے خود رابطہ کر کے مضامین ارسال کرنے کی درخواست کی تو انہوں نے بھی اپنے مضامین ارسال فرما کر میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔

اس طرح یہ مجموعہ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کے حالات زندگی، روشن کارنامے وزریں خدمات، کمالات وخصوصیات اور اوصاف وامتیازات، نقوش وتأثرات اور اعتراف فضل وکمال، فقہی بصیرت اور اصلاحی تنقیدات، مشاہیر کے تعزیتی پیغامات اور منظومات ومراثی پر مشتمل ایک ضخیم تذکرہ کی شکل میں آپ کے سامنے ہے، جو در حقیقت عقیدت ومحبت اور رشتۂ تلمذ کے پاکیزہ خدمات کا اظہار ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ تذکرہ اپنے استاذ محترم رحمہ اللہ کی خدمت میں ایک حقیر سا نذرانۂ عقیدت ہے۔

برادرم مولانا اخلاق الرحمٰن قاسمی استاذ حدیث جامعۃ الطیبات بنگلور اور عزیز محترم جناب مولانا مفتی محمد عارف جیسلمیری مقیم حال لدھیانہ کا بے حد مشکور ہوں کہ اول الذکر نے کمپیوٹر کتابت کے مراحل بہت تندہی سے انجام دیے اور ثانی الذکر دام فضلہ نے کتاب کی ترتیب میں میرا تعاون کیا۔ اللہ ان دونوں حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

خلیل الرحمٰن قاسمی برنی

حرف دعا

حضرت مولانا قاری شفیق الرحمٰن بلندشہری……استاذ دارالعلوم دیوبند

باسمہ تعالیٰ

میرے مشفق ومربی اور محسن وکرم فرما استاذ محترم حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری قدس سرہٗ شیخ الحدیث وصدر المدرسین درالعلوم دیوبند کے تذکرہ پر مشتمل ایک مفصل مجموعہ میرے سامنے ہے، جس میں عزیزم مفتی خلیل الرحمٰن قاسمی سلمہ اللہ تعالیٰ نے مختلف اصحاب قلم کے مضامین جمع کیے ہیں، نیز خود انہوں نے بھی اپنے مختلف مضامین اس میں شامل کئے ہیں جو حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کے حالات زندگی اور اوصاف وعلمی خدمات سے متعلق ہیں۔

عزیز سلمہ کو اللہ نے حضرات اکابر اور علمی شخصیات پر لکھنے کا خاص ذوق وسلیقہ دیا ہے۔ ماشاء اللہ اس سلسلے کی کئی اہم کتابیں ان کے قلم سے لکھی جاچکی ہیں اور مقبولیت کی نگاہ سے دیکھی گئیں ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ رب العزت عزیزم کی اس نئی کاوش کو بھی مقبولیت سے نوازے۔ اور مزید دینی وعلمی خدمات کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

شفیق الرحمٰن
خادم دارالعلوم دیوبند
۱۵؍ربیع الاول ۱۴۴۲ھ

حرف تشجیع

حضرت مولانا سلمان صاحب بجنوری مدظلہ | استاذ دار العلوم دیوبند

عزیز گرامی جناب مولانا مفتی خلیل الرحمٰن برنی زید مجدہ کی نئی تالیف سامنے ہے، جس میں انہوں نے استاذ العلماء، محدث وفقیہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری نور اللہ مرقدہٗ کے بارے میں مختلف اصحاب قلم کے مضامین جمع کئے ہیں۔ نیز اپنے قلم سے کئی عنوانات کے تحت حضرت کی شخصیت پر اظہار خیال کیا ہے۔

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کی شخصیت اپنی حیات میں بھی محتاج تعارف نہیں تھی کہ وہ ملت اسلامیہ کے مرکز دار العلوم دیوبند کے سب سے اعلیٰ منصب صدر المدرسین کے مسند نشیں تھے، اور ان کی تصانیف، ساری دنیا میں پھیل کر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکی تھیں، لیکن وفات کے بعد تو ان کے تلامذہ و منتسبین کی نگارشات نے ان کی شخصیت اور خصوصیات کو اور زیادہ نمایاں اور واضح کر دیا ہے اور بہت کم مدت میں ان کے بارے ہزارہا صفحات وجود میں آچکے ہیں اور متعدد کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔

زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک خوبصورت کڑی ہے جو یقیناً مرتب کے سلیقہ کی بناء پر مقبولیت حاصل کرے گی، عزیز مرتب حفظہ اللہ کو اپنے اساتذۂ کرام اور علمی شخصیات پر لکھنے کا خاص شوق اور سلیقہ و تجربہ ہے، ان کے قلم سے تذکرہ وسوانح اور دیگر اصلاحی موضوعات پر متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور اہل علم نے ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ رب العزت اس کتاب کو بھی قبول عام عطاء فرمائے اور عزیز محترم کو مزید علمی و دینی خدمات کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین۔ والسلام

محمد سلمان عفا اللہ عنہ...... خادم تدریس دار العلوم دیوبند

۱۳/ربیع الاول ۱۴۴۲ھ ۳۱/اکتوبر ۲۰۲۰ء شنبہ

حرف تائید

حضرت مولانا مفتی افتخار احمد صاحب قاسمی
مہتمم مدرسہ عربیہ تعلیم القرآن وصدر جمعیۃ علماء کرناٹک

اس میں کوئی شک نہیں کہ بزرگان دین، اکابرین امت اور اولیائے کرام کی حیات میں جس طرح ان کی ذات، ان کے علوم اور ان کے وجود سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اسی طرح ان کے وصال کے بعد ان کے حالات زندگی، ان کے اقوال اور ان کے ملفوظات وغیرہ کو تحریروں میں ضبط کر کے ہمیشہ فائدہ اٹھایا جانے کا راستہ قائم کیا جاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ زمانے سے چلا آرہا ہے دینی کتب کے ذخیروں میں بزرگوں کی سوانح حیات اور ان کے ملفوظات واقوال پر مشتمل بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ اسی ذخیرہ میں اضافہ کرتے ہوئے اس وقت ہندوستان کی عظیم علمی وعبقری شخصیت حضرت مولانا مفتی سعید صاحب پالنپوری رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح اور زندگی کے قیمتی گوشوں پر مشتمل ملک کے اکابرین کے مضامین جمع کر کے شاندار مواد جمع کیا گیا ہے۔ اس کے مؤلف ومرتب ایک جید الاستعداد نیک اور صالح عالم دین حضرت مولانا خلیل الرحمٰن صاحب برنی دامت برکاتہم امام وخطیب مسجد الفاروق ولیمس ٹاؤن بنگلور ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے لکھنے پڑھنے کا ذوق سلیم عطا فرمایا ہے۔ اور جن کے قلم سے چھوٹی بڑی دسیوں کتابیں منصۂ شہود پر آکر داد تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

محترم موصوف نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ پر ایک شاندار کتاب تالیف فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اس گرانقدر خدمت کو شرف قبولیت عطا کر کے مقبول عام وتام فرمائے اور مؤلف کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین

افتخار احمد قاسمی
مہتمم مدرسہ عربیہ تعلیم القرآن بنگلور وصدر جمعیۃ علماء کرناٹک

حرف اعتبار

حضرت مولانا محمد اسلام انجم صاحب مظاہری

مہتمم مدرسہ فیض الاسلام ہسور وخطیب مسجد لبابین کمرشیل اسٹریٹ بنگلور

گذرے ہوئے حضراتِ اہل علم واہل تقویٰ کے احوال و واقعات میں بعد میں آنے والوں کے لئے عبرتیں اور نصیحتیں ہوتی ہیں، اس لئے اسلاف سے یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی سوانح مرتب کرتے ہیں، جن میں ان کے حالات اور واقعات، حصول علم کی راہ میں ان کی مساعی جمیلہ، کوششیں اور جدوجہد، اس مبارک راہ میں حائل مشکلات، دشواریاں اور پریشانیاں اور پھر ان سے عہدہ برآ ہونے کی صورتیں، نیز اُن کی ان دشوارترین گھاٹیوں سے گذرنے کے بعد کامیابی اور مقبولیت کا ذکر جمیل ہوتا ہے۔ اس وقت میرے سامنے عزیزم مفتی خلیل الرحمٰن قاسمی برنی کی تذکرہ وسوانح کی قبیل سے ایک ضخیم اور شاندار کتاب سامنے ہے۔ اس میں انہوں نے ماضی قریب کی ایک عظیم ہستی، مسلم شخصیت اور استاذ العلماء حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری قدس سرہٗ شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کے متعلق مبسوط وقیمتی تحریریں جمع کی ہیں۔ جامع ومرتب چوں کہ اس راہ کے معروف واقف کاروں میں سے ایک ہیں، جن کا قلم رواں دواں ہے۔ وہ ماشاء اللہ خوب لکھتے ہیں اور اچھا لکھتے ہیں۔ تذکرہ نگاری میں ان کا اپنا اسلوب ہے، دسیوں کتابیں ان کے قلم گوہر بار سے لکھی جاچکی ہیں اور مقبولیت کی نگاہ سے دیکھی گئیں ہیں۔ شہر بنگلور کی ایک معروف مسجد ''الفاروق ولیمس ٹاؤن'' میں امام وخطیب کے ساتھ شہر کی کئی جگہوں میں درس حدیث اور دروس قرآن کا سلسلہ جاری رکھنے کے ساتھ ان کا تصنیفی وتالیفی کام ایک قابل قدر اور لائق تقلید نمونہ ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف کی یہ کتاب شرف قبولیت سے نوازے اور مزید علمی ترقیات سے مالا مال فرمائے۔ آمین

(مولانا) محمد اسلام انجم مظاہری
خطیب مسجد لبابین کمرشیل اسٹریٹ بنگلور

حرف تعارف

حضرت مولانا محمد اخلاق الرحمٰن قاسمی
ڈائرکٹر ماڈرن عربک اکیڈمی بنگلور

مفتی خلیل الرحمٰن قاسمی برنی، ابن حضرت مولانا قاری شفیق الرحمٰن صاحب بلند شہری، استاذ دارالعلوم دیوبند، ایک صالح نوجوان اور مضبوط وبافیض عالم دین ہیں۔ شریف باپ کی شریف اولاد ہونے کے ساتھ علم وعمل کا حسین سنگم ہیں۔ اخلاق وکردار اور حسن معاشرت میں بزرگوں کی روایات کے امین ہیں۔ فیاضی وسخاوت اور دوسروں کیلئے ہمدردی والے جذبات میں اپنے والدمحترم کے سچے جانشین ہیں۔ وضعداری اور رکھ رکھاؤ والی صفت بھی ان میں بہت نمایاں ہے۔ اسلاف سے اعلی درجے کی شرعی عقیدت اور مکمل احترام، نیز صالحین سے محبت ان کا شعار ہے۔ میں نے بارہا ان کو یہ شعر گنگناتے ہوئے سنا: احب الصالحین ولست منهم لعل الله یرزقنی صلاحا ۔ اس سے آپ ان کے دلی جذبات وخیالات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وہ حقیقت میں نیک اور صاحب علم وفضل ہیں اور نیکی ونیک لوگوں سے محبت کرتے ہیں۔ کئی بزرگوں سے ان کا اصلاحی تعلق رہا ہے اور ان اکابر کی طرف سے ان کو اجازت وخلافت بھی حاصل ہے۔ قدرت نے انھیں گوناگوں خصوصیات سے نوازاہ؛ چناں چہ وہ ایک خوش بیاں مقرر ہونے کے ساتھ بہترین قلمکار بھی ہیں۔ دل دردمند رکھتے ہیں۔ اس لیے تحریر وتقریر دونوں میں اثر انگیزی صاف نظر آتی ہے۔ ان کی تحریریں شستہ، صاف اور آسان ہوتی ہیں۔ سوانح، خاکہ نگاری اور دعوت واصلاح ان کے موضوعات ہیں۔ زیادہ تر خامہ فرسائی انھیں تین موضوعات پر کرتے ہیں، مگر

کئی دفعہ حالات کے تناظر میں بھی قلم کو جنبش دیتے ہیں، تو قلم کا حق ادا کرتے ہیں۔ جاری حالات پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب راہنمائی کا ایک فاضلانہ انداز اور اسلاف ہی کا نظریہ ہے، جسے انھوں نے نئے اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہیں۔ آپ کو نظر آئے گا کہ ان کی تحریروں میں سادگی کے ساتھ ندرت و بانکپن بھی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی تحریریں حوالوں سے مزین اور دلائل و براہین سے آراستہ ہوتی ہیں ۔

موصوف کی پیدائش 1982ء میں یوپی کے مشہور شہر بلند شہر میں ہوئی۔ نورانی قاعدہ او ناظرہ قرآن کی تعلیم گھر کے قریب ایک مکتب میں ہوئی۔ اس کے بعد قریب دو پارے قاری محسن صاحب کے سامنے حفظ ہوے۔ بعد ازاں پورا قرآن مع تجوید و قرأت اپنے والد محترم سے پڑھا۔ دو سال شعبۂ تجوید میں رہے اور اسی درمیان حضرت مولانا قاری جمشید علی صاحب استاذ دار العلوم دیوبند سے فارسی کی ضروری تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد باقاعدہ عربی اول میں داخل ہوے اور پھر 2003 میں سند فراغت حاصل کی۔ دورۂ حدیث میں آپ کے اساتذہ میں حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب شیخ الحدیث قدس سرہٗ حضرت مولانا عبد الحق اعظمی قدس سرہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری قدس سرہ، حضرت مولانا سید ارشد مدنی حضرت مولانا قمر الدین صاحب گورکھپوری، حضرت مولانا نعمت اللہ اعظمی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور حضرت مولانا قاری عثمان دامت برکاتہم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دار العلوم دیوبند مادر علمی سے ہی 2004ء. میں تکمیل افتاء سے فراغت حاصل کی. اس کے بعد اساتذہ دار العلوم دیوبند کے حکم سے دو سال دار العلوام سعدیہ ایکڑ ضلع ہری دوار اترانچل میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ 2008ء میں بنگلور منتقل ہوے، یہاں ایک مدرسے میں چھ سال کتب فقہ اصول حدیث اور حدیث کی مشہور کتاب سنن ترمذی کی تدریس کا شرف حاصل رہا اور ساتھ میں امامت و خطابت کے بھی فرائض انجام دیتے رہے۔ اس

وقت شہر بنگلور کے کئی مقامات پر دروس تفسیر اور تاریخ کے محاضرات پیش کرنے کی ذمہ داری کے ساتھ درس ترمذی کا بھی سلسلہ ہے اور قرآن وحدیث آن ٹی وی چینل پر اسلامی خطبات کی ذمہ داری ہے۔ ایک درجن س زیادہ تصانیف ہیں، جن میں نقوش حیات سوانح حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اور قافلہ علم و کمال، دعوت فکر واصلاح کئی ضخیم جلدوں میں مقبول عام وخاص کتابوں میں شامل ہیں۔ شہر کی معروف مسجد بنام الفاروق میں امام وخطیب اور مفسر کی حیثیت سے خدمات ہیں، شہر بنگلور کے مشہور اور معتبر علماء میں ان کا شمار ہے اور وہیں الفاروق کے قریب میں رہائش ہے۔ اس وقت موصوف کی تازہ تالیف بنام سلطان العلماء تذکرہ حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ میرے سامنے ہے، جو ہر اعتبار سے ایک مکمل سوانحی دستاویز ہے۔ امید ہے کہ حضرت مفتی صاحب کی یہ کاوش بھی سابقہ تحریروں کی طرح مقبول عام وخاص ہوگی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف کی عمر اور علم میں برکت عطا فرمائے اور ان کا زور قلم اور زیادہ کرے۔ آمین

اخلاق الرحمٰن قاسمی مقیم حال بنگلور
ڈائرکٹر ماڈرن عربک اکیڈمی بنگلور

سوانحی نقوش

فقہ وحدیث کا بحر بیکراں

حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری

شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند

مفتی خلیل الرحمٰن قاسمی برنی بنگلور

19؍ مئی 2020ء مطابق 25؍ رمضان المبارک 1441ھ صبح سویرے سوشل میڈیا کے ذریعہ اطلاع ملی کہ فقہ وحدیث کے بحر ناپیدا کنار اور امام المعقول والمنقول استاذ محترم حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کئی دنوں کی علالت کے بعد دار فانی سے دار باقی کی طرف رحلت فرما گئے۔ بے ساختہ زباں پر استرجاع کے کلمات جاری ہو گئے۔ آنسوؤں کا ایک سیل رواں تھا جو رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ بہت دنوں کے بعد ایسی کیفیت ہوئی کہ کافی دیر تک اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

حضرت الاستاذؒ کی وفات کی اندوہناک خبر نے ان تمام دلوں کو حیرت میں ڈال دیا ہے، جن میں علم وفن کی عظمتیں جاگزیں ہیں آج پوری جماعتِ دیوبند اپنے آپ کو یتیم محسوس کر رہی ہے کیوں کہ حضرت الاستاذ موجودہ دور میں جماعت دیوبند کے سب سے بڑے سرخیل تھے، آپ استاذ تھے، استاذ الاساتذہ تھے، بڑے تھے، بڑوں کے بھی بڑے تھے، آپ کو دیکھ کر اسلاف کی یاد تازہ ہوتی تھی، آپ بقیۃ السلف اور یادگار صالحین تھے۔

راقم کو جن عظیم المرتبت شخصیات اور بلند پایہ ہستیوں کو قریب سے دیکھنے کا حسین موقع ملا اور ان کے جاوداں نقوش سے قلب ابھی تک متأثر ہے ان میں حضرت الاستاذؒ کی ذات گرامی خاص طور پر شامل ہے۔ آپ کے اس طرح اچانک رحلت فرمانے سے دیوبند سے وابستہ ہر شخص پر غم واندوہ کا کوہ گراں ٹوٹ پڑا ہے۔ پوری فضا سوگوار

ہے۔ درودیوار ماتم کناں ہیں۔ ہر ایک رو رہا ہے سب کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ والد محترم حضرت مولانا قاری شفیق الرحمٰن صاحب بلند شہری استاذ دارالعلوم دیوبند کا ابھی فون آیا، آواز بھرا رہی تھی، روتے ہوئے پوچھا، بیٹا کچھ اطلاع ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے اطلاع مل چکی ہے۔ یہ کہہ کر ہچکیوں کے ساتھ رونا شروع کر دیا اور کہا کہ بیٹا! حضرت کے لئے جتنا ہو سکے ایصال ثواب کرو حضرت الاستاذ کے ہمارے اوپر بہت احسانات ہیں۔ اتنا کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ کون کس سے کیا کہے۔ سب غمزدہ ہیں سب مغموم ہیں، تمام تلامذہ اور تمام وابستگان دیوبند کے لئے یہ حادثہ یکساں نوعیت کا ہے۔ ہر ایک کو تسلی کی ضرورت ہے اور ہر ایک کو تعزیت کی ضرورت ہے۔ اللہ آپ کے تمام شاگردوں، محبین اور اہل وعیال کو صبر جمیل نصیب فرمائے۔ یقیناً آپ کی رحلت اس دور قحط الرجال میں امت کے لئے بہت بڑے خسارہ کا سبب ہے۔ یہ ایسا عظیم سانحہ ہے جس کو فضلائے دارالعلوم اور وابستگانِ دیوبند شاید ہی کبھی بھلا سکیں۔

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ سے جڑی یادوں اور باتوں کا ایک طویل سلسلہ ہے مگر آج کی تحریر میں حضرت رحمہ اللہ کے اوصاف وخدمات کی ایک جھلک اور مختصر سوانحی نقوش پیش کئے جا رہے ہیں۔

ولادت : تقریباً ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۰ء میں موضع کالیڑہ ضلع بناس کانٹھا (شمالی) گجرات میں پیدا ہوئے، آپ کا نام والدین نے صرف ''احمد'' رکھا تھا لیکن جب ''مظاہر علوم سہارنپور'' میں داخلہ لیا تو آپ نے اپنا نام ''سعید احمد'' خود لکھوایا تھا، بناس کانٹھا ایک ضلع ہے جس کا مرکزی شہر پالن پور ہے موضع کالیڑہ پالن پور کی مشہور بستی ہے جو پالنپور سے جنوب مشرق میں تیس میل کے فاصلے پر ہے۔

تعلیم و تربیت: پانچ یا چھ سال کے ہوئے تو آپ کے والد محترم نے گاؤں کے مکتب میں تعلیم کے لئے بٹھا دیا، مکتب کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد موصوف اپنے ماموں مولانا عبد الرحمٰن صاحب کے ساتھ ''چھاپی'' تشریف لے گئے، یہاں چھ ماہ تک اپنے ماموں اور دیگر

اساتذہ سے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھتے رہے، چھ ماہ کے بعد ماموں چونکہ تدریس چھوڑ کر گھر واپس آگئے تھے۔ اس لئے آپ بھی ماموں کے ساتھ گھر تشریف لے آئے اور چھ ماہ تک ماموں کے گھر ان سے فارسی کی کتابیں پڑھتے رہے، اس کے بعد چار سال تک پالن پور کے مدرسہ میں حضرت مولانا ہاشم صاحب بخاری اور مفتی محمد اکبر میاں صاحب سے عربی کی ابتدائی اور متوسط کتابیں پڑھیں۔

۱۳۷۷ھ میں مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ لیکر تین سال تک نحو و منطق اور فلسفہ کی کتابیں پڑھیں، پھر فقہ، تفسیر، حدیث اور فنون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ۱۳۸۰ھ میں دار العلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ دارلعلوم دیوبند میں آپ کے اساتذہ میں مولانا سید محمد اختر حسین صاحب، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مولانا سید فخر الحسن صاحب مرادآبادیؒ، مولانا فخر الدین صاحب مرادآبادیؒ، مولانا مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہانپوریؒ، مولانا بشیر احمد خان صاحب بلند شہریؒ، اور حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحبؒ شامل ہیں۔

حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب سے آپ نے دو کتابیں پڑھیں ''الفوز الکبیر، جلالین شریف'' آپ بچپن ہی سے ذہین، فطین، کتب بینی اور محنت کے عادی تھے دار العلوم دیوبند کی طالب علمانہ زندگی میں بھی کمال شوق، لگن اور یکسوئی کے ساتھ تعلیم میں مشغول رہے، اسی لئے دورۂ حدیث میں آپ نے اول نمبر سے کامیابی حاصل کی۔

۱۳۸۳ھ اور ۱۳۸۴ھ میں آپ نے حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحبؒ کی نگرانی میں فتوی نویسی کی مشق کی، جس میں مہارت کے سبب ارباب دار العلوم دیوبند نے آپ کا ''معین مفتی'' کی حیثیت سے دار الافتاء دار العلوم دیوبند میں تقرر کر دیا۔

تدریسی زمانہ: ذیقعدہ ۱۳۸۴ھ میں بحیثیت مدرس علیا آپ دار العلوم اشرفیہ راندیر (سورت) تشریف لائے، موصوف نے یہاں ''ابوداؤد شریف، ترمذی شریف، طحاوی شریف، شمائل، مؤطین، نسائی شریف، ابن ماجہ شریف، مشکوۃ شریف جلالین شریف مع الفوز

الکبیر“ اور دیگر کتب پڑھانے کے ساتھ تصنیف وتالیف کا مبارک مشغلہ بھی جاری رکھا، یہاں رہتے ہوئے آپ نے ”داڑھی اور انبیاء کی سنتیں، حرمت مصاہرت، العون الکبیر“ اور علامہ طاہر پٹنی کی ”المغنی“ کی شرح عربی زبان میں تحریر فرمائی نیز اسی زمانہ میں آپ نے حضرت نانوتویؒ کے علوم ومعارف کی تسہیل اور تشریح کے گراں قدر کام کا آغاز فرمایا۔

دار العلوم دیوبند میں تدریس: ۱۳۹۳ھ میں آپ کا تقرر دار العلوم دیوبند میں ہوا اور بحمد اللہ اس وقت سے وفات تک دار العلوم دیوبند میں تسلسل کے ساتھ تدریس کا فریضہ انجام دیا۔ ۹۸، ۱۳۹۷ میں باقاعدہ حدیث کا درس ارباب دار العلوم دیوبند نے آپ کو تفویض کیا، پہلے سال مشکوٰۃ شریف جلد ثانی مع نخبۃ الفکر کا سبق آپ سے متعلق رہا پھر اگلے سال مشکوٰۃ شریف کے ساتھ موطا امام مالکؒ اور نسائی شریف کا سبق متعلق ہوا، پھر ۱۴۰۲ھ سے تقریباً ۱۴۳۰ھ تک ترمذی شریف کا سبق مکمل جاہ وجلال کے ساتھ پڑھاتے رہے پھر اپنے استاذ محترم حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحبؒ کے بعد سے بخاری شریف کا سبق بھی اسی شان وشوکت سے پڑھاتے رہے۔

درس کی خصوصیات: حضرت مفتی صاحبؒ کے درس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ رسوخ فی العلم کے ساتھ مضامین کو سلیقہ مندی اور سلجھی ہوئی زبان میں اس طرح بیان فرماتے تھے کہ طالب علم آپ کا سبق بہ آسانی سمجھ لیتا، طلبۂ حدیث آپ کے درس میں حاضری کے لئے خصوصی شوق کا مظاہرہ کرتے نظر آتے تھے اور اکثر طلبہ آپ کی ہر بات نقل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ دوران درس سنت کے مطابق ٹھہر ٹھہر کر کلام فرماتے تھے اور ائمۂ سلف، ائمۂ مجتہدین اور محدثین کرام کا ذکر انتہائی ادب وعظمت کے ساتھ کرتے تھے۔ درس میں فقہا کے مذاہب اور دلائل کی وضاحت میں جو طریقہ اختیار کرتے، وہ عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ انوکھا اور نرالا ہوتا تھا۔ اسی طرح اقوال مختلفہ کی تنقیح اس انداز پر کرتے کہ ہر امام کا قول حدیث شریف کے قریب نظر آتا اور ہر طالب علم محسوس کرتا کہ اکثر مسائل میں اختلاف کی بنیاد نص فہمی کا اختلاف ہے، دلائل کا اختلاف نہیں۔ ایک بڑی خوبی آپ کے

درس کی یہ بھی تھی کہ پورے سال درس اس ٹھہراؤ اور ترتیب سے ہوتا تھا کہ کتاب بحسن وخوبی مکمل ہوجاتی، یہ نہیں ہوتا کہ مشہور مباحث میں وقت صرف کرکے بقیہ کتاب پر ضروری توجہ نہ دی جائے، آپ کے یہاں اختلاف ائمہ کے بجائے مدارک اجتہاد (یعنی اختلاف کی بنیادیں، بیان کرنے پر زیادہ زور تھا۔ آپ کے درس کی یہ خصوصیت ترمذی شریف کے درس کے دوران کھل کر سامنے آتی تھی اور یہ بات تو آپ کا ہر شاگرد جانتا ہے کہ سبق کے دوران آپ صرف مسائل ہی بیان نہیں کرتے بلکہ کتاب بھی پڑھاتے اور فن بھی سمجھاتے۔

تصنیفی خدمات: حضرت والا دامت برکاتہم کی جملہ تصانیف مقبولیت عامہ حاصل کرچکی ہیں۔ آپ کی بیشتر تصانیف کثرت سے شائع ہوکر مشرق ومغرب میں پہونچ چکی ہیں، جن کو ہر جگہ کے علماء نے قدر کی نگاہ سے دیکھا، آپ کی تصانیف میں جو زیادہ مشہور ہیں ان کی فہرست درج ذیل ہے:-

"تفسیر ہدایت القرآن، العون الکبیر، (الفوز الکبیر کی عربی شرح) فیض المنعم شرح مقدمۂ مسلم، تحفۃ الدرر شرح نخبۃ الفکر، مبادئ الفلسفہ، معین الفلسفہ، اسلام تغیر پذیر دنیا میں، داڑھی اور انبیاء کی سنتیں، تسہیل ادلۂ کاملہ، رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ (مکمل پانچ جلدوں میں) تہذیب المغنی (المغنی کی عربی شرح) زبدۃ الطحاوی، تحفۃ الالمعی شرح ترمذی (مکمل آٹھ جلدیں) تحفۃ القاری شرح بخاری"

حضرت والا دامت برکاتہم کی مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ بھی کئی اور تصانیف ہیں، آپ کی تمام تصانیف اور تمام تحریروں کا قدر مشترک یہ ہے کہ ان میں ترتیب، توضیح اور جامعیت خوب ہے، اسی لئے آپ کی کئی تصانیف دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس عربیہ کے نصاب میں شامل ہیں۔

اوصاف وکمالات: قدرت نے آپ کو بے شمار خوبیوں اور عمدہ اوصاف وکمالات سے نوازا تھا، اس تعلق سے آپ کے برادر صغیر حضرت مفتی امین صاحب پالنپوری کی تحریر ملاحظہ ہو:

''استاذ محترم کو اللہ جل شانہٗ وعم نوالہٗ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے، آپ کا ذوق؛ لطیف، طبیعت؛ سادہ اور نفیس ہے، مزاج میں استقلال اور اعتدال ہے، فطرت میں سلامت روی اور ذہن رسا کے مالک ہیں، زودنویس اور خوشنویس ہیں، حق و باطل اور صواب وخطاء کے درمیان امتیاز کرنے کی وافر صلاحیت رکھتے ہیں اور حقائق کے ادراک میں یکتائے زمانہ ہیں۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ موصوف اپنے کاموں میں نہایت چست اور حالات کا جواں مردی سے مقابلہ کرنے والے ہیں، میں نے حضرت اقدس جیسا شب وروز محنت کرنے والا اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، آپ کے تمام شاگرد جانتے ہیں کہ آپ کا درس کتنا مقبول ہے. آپ کی تصانیف اور تقاریر کتنی پرمغز، مرتب اور جامع ہوتی ہیں''۔

حضرت الاستاذ دامت برکاتہم کی ذات گرامی کا ایک بڑا وصف خورد نوازی بھی تھی اپنے چھوٹوں کی اصلاح وتربیت اور ان کو آگے بڑھانے کے لئے راہ کی تعیین اور ان کے دینی علمی تخلیقی کارناموں پر ان کی تحسین وحوصلہ افزائی بھی آپ کی خصوصی عادات میں شامل تھیں۔

تصوف وسلوک سے آپ کا تعلق: حضرت والا دامت برکاتہم زمانۂ طالبعلمی سے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہٗ سے بیعت ہوئے۔ اسی کے ساتھ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمہ اللہ کی عرفانی واصلاحی مجالس میں شرکت کرتے رہے، اور آخر میں حضرت مولانا مفتی محمد مظفر حسین صاحب قدس سرہٗ سے تعلق قائم کیا حضرت مفتی مظفر حسین صاحب قدس سرہٗ نے باقاعدہ آپ کو اجازت بیعت وارشاد سے نوازا۔

اہل وعیال کی تربیت : اہل وعیال کی تربیت آپ نے جس طریقۂ کار کو سامنے رکھ کر انجام دی تھی، وہ ایک انوکھی مثال ہے، آپ نے سب سے پہلے اپنی اہلیہ محترمہ (نوراللہ مرقدہا) کو قرآن کریم حفظ کرایا، پھر تمام بچوں کے حفظ کی ذمہ داری اہلیہ محترمہ (نوراللہ مرقدہا) کے سپرد کی۔ ماشاء اللہ انہوں نے تمام صاحبزادوں اور صاحبزادیوں کو حفظ قرآن مکمل کرادیا نیز صاحبزادوں کی دلہنوں کو بھی حفظ قرآن کی دولت سے بہرہ مند کیا۔

حضرت الاستاذ دامت برکاتہم کو اللہ تعالیٰ نے کثرت اولاد کی نعمت عظمیٰ سے بھی

نوازا ہے، چنانچہ گیارہ صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں ہوئیں جن میں بڑے صاحبزادے جناب حافظ مولوی مفتی رشید احمد صاحب ۱۹۹۵ء کے ایک حادثہ میں شہید ہو گئے اور ایک صاحبزادی بچپن میں انتقال کر گئیں۔ چند سال قبل ایک اور صاحبزادے جناب بھائی سعید صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ ماشاء اللہ نو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں بقید حیات ہیں، اہلیہ محترمہ چند عرصہ پہلے اللہ کو پیاری ہو گئیں تھیں۔ بلاشبہ حضرت کی علمی ترقیوں میں ان کا بھی حصہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ آج حضرت الاستاذ کے اس طرح چلے جانے سے پوری علمی دنیا سوگوار ہے اور ہر ایک اپنے آپ کو یتیم محسوس کر رہا ہے۔ خدا! آپ کی حسنات کو قبول فرمائے اور دارالعلوم دیوبند کو آپ کا نعم البدل نصیب فرمائے۔ آمین)۔

حیات سعید کا مختصر خاکہ

از حضرت مولانا مفتی امین صاحب پالن پوری مدظلہ العالی

تلخیص واضافہ: ڈاکٹر مولانا اشتیاق احمد قاسمی ...... استاذ دارالعلوم دیوبند

اسم گرامی : (حضرت مولانا مفتی سعید احمد بن یوسف بن علی بن جیوا (یحییٰ) بن نور محمد (شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند)

ولادت باسعادت : (محفوظ نہیں، اندازے سے) ۱۹۴۰ء/۱۳۶۰ھ۔

جائے پیدائش: کالیڑہ ضلع: بناس کانٹھا، شمالی گجرات، آبائی وطن: ڈبھاڈ گاؤں کی نئی بستی مجاہد پورہ، رہائش گاہ: ڈبھاڈ کی سرحد میں۔ مستقل رہائش گاہ۔ محلّہ اندرون کوٹلہ، دیوبند۔

تعلیم: (1) مکتب کالیڑ، اساتذہ: مولانا داؤد چودھری، مولانا حبیب اللہ چودھری، مولانا ابراہیم جونکی (سابق شیخ الحدیث دارالعلوم آنند، گجرات) ہیں۔

(۲) دارالعلوم چھاپی، میں چھ ماہ) اپنے ماموں: مولانا عبدالرحمٰن شیر اور دیگر اساتذہ سے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، پھر ماموں کے ساتھ ان کے وطن جونی سیندھنی میں فارسی کی تکمیل ہوئی۔

(۳) پالن پور میں مصلح امت حضرت مولانا محمد نذیر میاں کے مدرسہ میں عربی کی ابتدائی اور متوسط کتابیں پڑھیں حضرت مولانا مفتی محمد اکبر صاحب اور مولانا محمد ہاشم بخاری آپ کے استاذ ہیں، جو بعد میں دارالعلوم دیوبند میں استاذ ہوے۔

(۴) مظاہر علوم سہارن پور: ۱۳۷۶ھ تا ۱۳۷۸ھ حضرت علامہ صدیق احمد صاحب جموئی مولانا محمد یامین صاحب سہارنپوری، حضرت مولانا مفتی محمد یحییٰ صاحب سہارنپوری، حضرت

مولانا مفتی عبدالعزیز صاحب رائے پوری اور حضرت مولانا وقار علی صاحب بجنوری رحمہم اللہ سے منطق وفلسفہ نحو اور دیگر علوم کی کتابیں پڑھیں۔

(۵) دارالعلوم دیوبند: شوال ۱۳۷۹ھ میں داخلہ لیا اور ۱۳۸۲ھ تک ہدایہ اولین، جلالین، الفوز الکبیر، تصریح، بست باب، شرح چغمینی، رسالہ فتحیہ، شمسیہ۔ علم ہیئت کی کتابیں، مشکوۃ المصابیح، ہدایہ آخرین، تفسیر بیضاوی اور دورۂ حدیث شریف کی کتابیں پڑھیں۔

اساتذہ : حضرت مولانا سید اختر حسین صاحب دیوبندی، حضرت مولانا بشیر احمد خاں صاحب بلند شہری، حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب بلند شہری، حضرت مولانا سید حسن صاحب دیوبندی، حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب کیرانوی، حضرت مولانا اسلام الحق صاحب اعظمی، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، حضرت مولانا فخر الحسن صاحب مرادآبادی، حضرت مولانا محمد ظہور دیوبندی، حضرت مولانا فخر الدین مرادآبادی، حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی، حضرت مفتی مہدی حسن صاحب شاہ جہاں پوری، حضرت مولانا عبدالاحد صاحب دیوبندی، شیخ محمود عبدالوہاب محمود مصری رحمہم اللہ تعالی۔

دورۂ حدیث شریف میں پہلی پوزیشن سے کامیابی حاصل ہوئی، صحیح مسلم میں نمبرات پینتالیس ہیں بقیہ ساری کتابوں میں پورے (صد فی صد) پچاس پچاس ہیں۔ ۱۳۸۲ھ میں تکمیل افتاء میں داخلہ لیا، اسی سال شیخ محمود عبدالوہاب محمود مصری سے حفظ قرآن کا آغاز فرمایا اور اپنے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کو حفظ کرایا، اگلے سال ارباب انتظام نے فتوی نویسی کے لیے معاون افتاء کی حیثیت سے تقرر کیا مستقل تقرر میں بعض لوگوں نے روڑے اٹکائے تو حضرت علامہ بلیاوی نے فرمایا: ”مولوی صاحب! گھبراؤ نہیں، اس سے اچھے آؤ گے، چنانچہ نو سال بعد ۱۳۹۳ھ میں درجہ وسطی الف کے استاذ کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔

منصب شیخ الحدیث وصدر المدرسین: حضرت الاستاذ شیخ الحدیث مولانا نصیر احمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علالت اور معذرت تدریس کے بعد ۱۷ ربیع الاول

۱۴۲۹ھ بروز چہارشنبہ مجلس تعلیمی نے صحیح بخاری جلد اول کی تدریس آپ سے متعلق فرمائی، اس کے بعد سے رجب ۱۴۴۱ھ تک آپ نے تیرہ سال بخاری شریف کا درس دیا، اس کے بعد اسی سال ۲۱ شعبان المعظم کو مجلس شوری نے پہلی نشست میں صدر المدرسین کا عہدہ تفویض فرماتے ہوئے دوسری نشست میں شرکت کی دعوت دی، الحمد للہ اس عہدے پر بھی وقار و تمکنت کے ساتھ وفات تک فائز رہے۔

زیر درس کتابیں: مسلم الثبوت، ۲-، ہدایہ مکمل، ۳-سلم العلوم، ۴-ہدیہ سعیدیہ، ۵- جلالین مکمل، ۶- الفوز الکبیر، ۷- ملاحسن، ۸-شرح عقائد جلالی، ۹-مسامرہ، ۱۰- دیوان متنبّی، ۱۱-میبذی، ۱۲-بیضاوی سورہ بقرہ اور (پارہ ۲۱ تا ۲۵)، ۱۳۔ مشکوۃ المصابیح مکمل، ۱۴- نخبۃ الفکر، ۱۵-حسامی (بحث قیاس) ۱۶-سبعہ معلقہ، ۱۷-موطا مالک، ۱۸-دیوان حماسہ، ۱۹ تفسیر مظہری (۱۶ تا ۲۰) ۲۰-سراجی، ۲۱-نسائی، ۲۲ تفسیر مدارک (پارہ ۶ تا ۱۰)، ۲۳ ۲ - موطا محمد، ۲۴-ترمذی (جلد اول)، ۲۵-ابوداؤد، ۲۶-صحیح بخاری مکمل، ۲۷ مسلم جلد اول، ۲۸- مقدمہ ابن الصلاح، ۲۹-مناظرہ رشیدیہ، ۳۰-ابن ماجہ، طحاوی ۳۲- حجۃ اللہ البالغہ۔

تدریس کے ساتھ ۱۳۹۵ھ اور ۱۴۰۲ھ میں دار الافتاء کی نگرانی اور فتوی نویسی کی خدمات بھی انجام دی ہیں۔

مجلس تحفظ ختم نبوت کی نظامت: ''مجلس تحفظ ختم نبوت'' کی نظامت کا سہرا آپ کے سر تھا مجلس کے قیام کے روز اول سے اپنی وفات تک آپ نے اس کو بحسن و خوبی انجام دیا اور زندگی کی آخری تقریر بھی ختم نبوت کے اثبات'' پر فرمائی۔

تصانیف: ۱-ہدایت القرآن (آٹھ جلد)، ۲ تحفۃ القاری (گیارہ جلد)، ۳-تحفۃ الالمعی آٹھ جلد)، ۴- زبدۃ الطحاوی (عربی)، ۵- رحمۃ اللہ الواسعہ، ۶-تہذیب المغنی (غیر مطبوعہ)، ۷- ہے۔ افادات نانوتوی، ۸- افادات رشیدیہ، ۹ - الفوز الکبیر (عربی) ۱۰- العون الکبیر شرح عربی الفوز الکبیر، ۱۱-فیض المنعم، ۱۲-تحفۃ الدرر، ۱۳-حیات امام ابوداؤد، ۱۴ -حیات امام طحاوی، ۱۵-مشاہیر محدثین وفقہائے کرام اور تذکرہ راویان کتب حدیث، ۶۱-

مبادی الفلسفہ (عربی)، ۱۷- معین الفلسفہ، ۱۸- مبادی الاصول (عربی)، ۱۹- معین الاصول، ۲۰- مفتاح التہذیب، ۲۱- آسمان منطق، ۲۲- آسان صرف ۲۳- آسان نحو ۲۴- آسان فارسی قواعد، ۲۵- محفوظات (بچوں کے لیے آیات واحادیث کا مجموعہ) تین حصے، ۲٦- آپ فتوی کیسے دیں؟، ۲۷- کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟ ۲۸- اسلام تغیر پذیر دنیا میں، ۲۹- نبوت نے اسلام کو کیا دیا؟، ۳۰- ڈاڑھی اور انبیاء کی سنتیں، ۳۱- حرمت مصاہرت ۳۲- تسہیل ادلۂ کاملہ حواشی وعناوین ۳۳- ایضاح الادلہ ۳۴- حواشی امداد الفتاوی (جلد اول)، ۳۵- تحقیق وتعلیق حجۃ اللہ البالغہ (عربی)، ۳٦- شرح علل ترمذی، ۳۷- وافیہ حاشیہ عربی کافیہ، ۳۸- ہادی شرح کافیہ، ۳۹ علمی خطبات (دو جلد)، ۴۰- دین کی بنیادیں اور تقلید کی ضرورت، ۴۱- عصری تعلیم ۴۲- جلسۂ تعزیت اور اس کا شرعی حکم، ۴۳- ارشاد الفہوم شرح سلم العلوم، ۴۴- کامل برہان الٰہی (چار جلد)، ۴۵- فقہ حنفی اقرب الی النصوص ہے۔ (متعدد کتابوں کے ترجمے ، فارسی، پشتو، انگریزی، بنگالی، برمی اور دیگر زبانوں میں ہو چکے ہیں)

اولاد واحفاد: ۱- مولوی مفتی حافظ رشید احمد مرحوم ان کے دو فرزند: (۱) مفتی حافظ مسیح اللہ، (۲) حافظ سمیع اللہ۔ ۲- حافظ سعید مرحوم، ان کے دو فرزند: (1) حافظ حبیب اللہ، (۲) مجیب اللہ اور دو دختر: (۳) حافظہ نجیبہ، (۴) حافظہ فاطمہ۔

۳- مولوی حافظ وحید احمد، ان کے فرزند: (۱) حافظ سعد اللہ اور دختر: (۲) فریحہ۔

۴- مولوی حافظ حسن احمد، ان کے فرزند: (۱) حافظ حسان، دختر: (۲) حافظہ بشریٰ، (۳) حافظہ حسنیٰ، (۳) حافظہ سعدیٰ۔

۵- مولانا حافظ حسین احمد، ان کے فرزند: (۱) محمد، دختر: (۲) حافظہ سلمیٰ۔

٦ مولانا حافظ ابراہیم، ان کے فرزند: (1) حافظ یحییٰ، (۲) انیسہ، (۳) اریبہ۔

۷ حافظ قاسم احمد، ان کے فرزند: (۱) حافظ عاصم، (۲) رشدہ۔

۸- حافظہ عائشہ: ان کے فرزند: (۱) محمد، دختر: (۲) حافظہ فائزہ، (۳) حافظہ فوزیہ (۴) حافظہ مبشرہ۔

۹- مولانا حافظ محمد: ان کے فرزند: (۱) رشید، (۲) حافظہ نجمہ۔

۱۰- مولانا حافظ احمد سعید: ان کے فرزند: (۱) حافظ حفیظ، (۲) یوسف، دختر: (۳) زینب۔

۱۱- حافظ فاطمہ: فرزند: (۱) نعیم، دختر: (۲) نعمیٰ، (۳) عظمیٰ۔

۱۲۔ حافظ عبداللہ: (۱) عائشہ، (۲) سعدیہ۔

۱۳- حافظ عبداللہ۔ ان کی ابھی تک کوئی اولاد نہیں ہے۔

صلبی اولاد تیرہ ہیں اور سب حافظ ہیں، پوتے پوتی نواسے اور نواسیوں میں اٹھارہ حافظ ہیں اور بہوؤں میں پانچ حافظہ ہیں، اس طرح خاندان میں کل چھتیس (۳۶) حفاظ ہیں۔

زیارت حرمین: آٹھ مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت نصیب ہوئی، چار بار حج اور چار بار عمرے کے لیے، ایک عمرہ پچاس بار طواف کی فضیلت حاصل کرنے کے لیے کیا تھا، اہلیہ محترمہ ساتھ تھیں۔

اسفار: ہندوستان کے علاوہ بنگلہ دیش، پاکستان، افریقہ، امریکا، کناڈا، برطانیہ، ترکی، قطر کویت، بحرین، متحدہ عرب امارات، فجی اور سمرقند وغیرہ کے اسفار دین حنیف کی تبلیغ کے لیے کیے۔

بیعت و خلافت: شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا سے بیعت ہوئے، مولانا عبد القادر رائے پوری کی مجالس میں شرکت کی، حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب مظاہری نے اجازت بیعت عنایت فرمائی، پھر تحریری اجازت نامہ ارسال فرمایا۔

وفات حسرت آیات: ۲۵ / رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹ / مئی ۲۰۲۰ء روز سہ شنبہ بوقت صبح: ساڑھے چھ پونے سات کے درمیان۔ بمقام: نیو سنجیونی ہاسپٹل ملاڈ ممبئی۔

نماز جنازہ: ”محراب مسجد کے باہر؛ امامت فرزند ارجمند: مولانا حافظ وحید احمد نے کی۔ تدفین: قبرستان اوشیورہ، جوگیشوری ممبئی۔

حیات سعید ایک نظر میں

مولانا مصطفیٰ امین صاحب پالن پوری ثم دیوبندی
معاون مرتب فتاوی دارالعلوم دیوبند

مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری کا تعارف

ولادت اور مقام ولادت: تایا ابا کی صحیح تاریخ پیدائش محفوظ نہیں مگر ہمارے دادا ابا کی خریدی ہوئی زمین کے بیع نامہ کے کاغذات کی روشنی میں تخمینے سے ۱۳۶۰ھ=۱۹۴۰ء میں آپؒ کی پیدائش ہوئی۔ اور آپؒ مضافات 'پالن پور' کی مشہور مسلم بستی 'کالیڑہ' (ضلع: بناس کانٹھا، شمالی گجرات) میں پیدا ہوئے، اسی لیے آپ 'پالن پوری' کی نسبت سے مشہور ہیں۔

"پالن پور" ضلع "بناس کانٹھا" کا مرکزی شہر اور ریلوے اسٹیشن ہے؛ اور اسی شہر سے تقریباً ۴۳ کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب مشرق میں اس کی ایک مشہور مسلم بستی 'کالیڑہ' (Kaleda) واقع ہے؛ جہاں ایک عربی مدرسہ 'سلم العلوم' کے نام سے قائم ہے۔

واضح رہے آپؒ کے والدین کا رکھا ہوا نام صرف 'احمد' تھا، مگر جب آپ (۱۳۷۶ھ میں) مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور میں داخلہ لینے کے لیے تشریف لائے تو از خود اپنا نام 'سعید احمد' تجویز فرما کر یہی نام مدرسہ مظاہر علوم میں درج کرایا، اسی وقت سے "سعید احمد" آپ کا پورا نام ہو گیا، اور اسی نام سے آپ کو عالمی شہرت حاصل ہوئی۔

اصل وطنِ مولوف اور حالیہ مقامِ سکونت: دادا اباؒ بہ سلسلہ زمین داری 'کالیڑہ' سے 'ڈبھاڈ' تشریف لائے اور خریدی ہوئی زمین کے گرد و نواح میں نو آباد گاؤں 'مجاہد پورہ' میں رہائش اختیار کی؛ اس لیے اب رہائشی اعتبار سے آپؒ کا موجودہ وطن مالوف 'مجاہد پورہ'، قصبہ: 'ڈبھاڈ' (Dabhad)، وایا: 'کھیرالو' (Kheralu)، ضلع: "مہسانہ"

(Mahesana) ہے، اور یہ 'کالیڑہ' سے تقریباً ۴ کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب مغرب میں واقع ہے۔

حالیہ مقام سکونت: محلّہ: اندرون کوٹلہ، دیوبند، ضلع: سہارن پور، اترّ پردیش، انڈیا۔

نام ونسب اور خاندان: پورا نام: سعید احمد بن یوسف بن علی جی بن جیوا (یحیٰی) بن نور محمد۔ نیز آپ پالن پور کے مشہور خاندان: 'ڈھکا' سے ہیں، اور برادری: 'مومن' ہے۔

آپؒ کی بسم اللہ اور طفولیت کے اساتذہ

جب تایا ابّاؒ کی عمر پانچ یا چھ سال کی ہوئی تو دادا ابّاؒ نے آپ کی بسم اللہ کرائی، اور اس کے بعد آپ کو دادا ابّاؒ نے کالیڑہ کے مکتب میں داخل فرمایا تھا، جہاں آپؒ نے ناظرہ اور دینیات کی تعلیم سے اپنے آپ کو آراستہ فرمایا۔ آپؒ کے مکتب کے اساتذہ یہ ہیں:

۱) ...... حضرت مولانا داؤد صاحب چودھریؒ
۲) ...... حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب چودھریؒ
۳) ......اور حضرت مولانا ابراہیم صاحبؒ سابق شیخ الحدیث دار العلوم آنند

چھاپی اور پالن پور میں تعلیم اور آپؒ کے اساتذہ

اس کے بعد دار العلوم چھاپی میں جا کر اپنے ماموں مولانا عبدالرحمٰن صاحب شَیرُاؒ اور دیگر اساتذہ کرام سے چھ ماہ تک فارسی کی ابتدائی کتب پڑھتے رہے، اور جب آپؒ کے ماموں چھاپی کی تدریس چھوڑ کر اپنے گاؤں 'جونی سیندھنی' آنے لگے تو آپؒ بھی اپنے ماموں کے ہمراہ آگئے، اور یہیں چھ ماہ تک ان سے فارسی کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ فارسی کی تعلیم سے فارغ ہو کر حضرت مولانا محمد نذیر میاں صاحب پالن پوریؒ کے 'مدرسہ اسلامیہ عربیہ، پالن پور' میں داخل ہو کر حضرت مفتی محمد اکبر میاں صاحب پالن پوریؒ اور حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب بخاری مہاجر مدنیؒ سے عربی کی ابتدائی اور شرح جامی تک کی تعلیم حاصل فرمائی۔

مدرسہ مظاہر علوم میں تعلیم اور آپؒ کے اساتذہ

۱۳۷۶ھ = ۱۹۵۷ء میں آگے کی مزید تعلیم حاصل فرمانے کے لیے مدرسہ مظاہر علوم، سہارن پور میں داخلہ لیا۔ آپؒ کے مظاہر علوم کے اساتذہ یہ ہیں:

۱)......امام النحو والمنطق حضرت مولانا صدیق احمد صاحب جمویؒ
۲)......حضرت مولانا محمد یامین صاحب سہارن پوریؒ
۳)......حضرت مولانا یحییٰ صاحب سہارن پوریؒ
۴)......حضرت مولانا مفتی عبدالعزیز صاحب رائے پوریؒ
۵)......اور حضرت مولانا وقار علی صاحب بجنوریؒ

دار العلوم دیوبند میں داخلہ اور آپؒ کے اساتذہ

۲۱/شوال ۱۳۷۹ھ میں اعلیٰ تعلیم کے قصد سے ازہر ہند دار العلوم دیو بند میں باضابطہ داخلہ لیا، اور دار العلوم دیو بند کے سویں سال ۱۳۸۲ھ = ۱۹۶۲ء میں دورۂ حدیث کی تکمیل فرمائی، اور دار العلوم جیسے عظیم الشان اسلامی مرکز کے سالانہ امتحان میں ’’فرسٹ پوزیشن فرسٹ ڈویژن‘‘ سے کامیاب ہوئے، اور سالانہ امتحان میں دورۂ حدیث کی ممتحنہ دس کتبِ حدیث میں سے نو کتابوں میں آپؒ نے صد فی صد پورے پورے ۵۰/۵۰ نمبر سے کامیابی حاصل فرمائی تھی، صرف مسلم شریف میں ہی اُن کے ۴۵ نمبر آئے (اس وقت دار العلوم میں فل نمبرات کی آخری حد ۵۰ تھی، اور اب ایک دہائی سے ۱۰۰ نمبر کر دیے گئے ہیں)

اور دار العلوم دیو بند میں تایا اباؒ نے جن حضرات اساتذہ سے پڑھا وہ درج ذیل ہیں:

۱)حضرت مولانا سیّد اختر حسین صاحب دیوبندیؒ
۲)حضرت مولانا بشیر احمد خان صاحب بلند شہری
۳)حضرت مولانا سیّد حسن صاحب دیوبندیؒ
۴)حضرت مولانا عبد الجلیل صاحب کیرانویؒ
۵)حضرت مولانا اسلام الحق صاحب اعظمیؒ
۶)حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دار العلوم دیوبند
۷)حضرت مولانا فخر الحسن صاحب مراد آبادیؒ
۸)حضرت مولانا محمد ظہور صاحب دیوبندیؒ

۹) فخر المحدّثین حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب مراد آبادیؒ ۱۰) امام المعقول والمنقول حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ
۱۱) حضرت مولانا مفتی سیّد مہدی حسن صاحب شاہ جہاں پوریؒ ۱۲) حضرت شیخ محمود عبد الوہّاب محمود صاحب مصری ازہریؒ
۱۳) حضرت مولانا عبد الاحد صاحب دیوبندیؒ ۱۴) اور حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب بلند شہریؒ۔

دار الافتاء میں داخلہ و تقرّر اور حفظِ قرآن

فراغت کے بعد ۱۳۸۲ھ - ۱۳۸۳ھ کے تعلیمی سال تکمیلِ افتاء میں زیرِ تعلیم رہے، اور مفتیِ اعظم حضرت مولانا مفتی سیّد مہدی حسن صاحب شاہ جہاں پوریؒ کی نگرانی میں کتبِ فتاوی کا مطالعہ اور فتوی نویسی کی تمرین فرماتے رہے۔ اور اسی سال تایا ابّاؒ نے حضرت شیخ محمود عبد الوہّاب محمود صاحب مصری ازہریؒ کے پاس کلام پاک کے حفظ کا بھی آغاز فرمایا۔

مستحکم صلاحیت اور بشارتِ عظمی

۱۳۸۳ھ میں حضرت مفتی سیّد مہدی حسن صاحبؒ کے علیل ہو کر اپنے وطن شاہ جہاں پور چلے جانے کی وجہ سے دار الافتاء کے لیے ایک نئے مفتی حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب نانوتویؒ کا تقرّر عمل میں آیا تھا تو ان کے تعاون کے لیے تایا ابّاؒ کا معین مفتی کی حیثیت سے تقرّر ہوا، چنانچہ آپؒ نے اپنی مستحکم مہارت و جید صلاحیت سے حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب نانوتویؒ کے تعاون اور حسنِ کارکردگی کا ایسا ثبوت پیش فرمایا کہ مفتی محمود حسن صاحب نانوتویؒ نے حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دار العلوم دیوبند سے سنہ ۱۳۸۴ھ کے اواخر میں آپ کے باقاعدہ تقرّر کی سفارش فرمائی، حضرت قاری صاحبؒ نے مفتی صاحب کی اس درمندانہ سفارش کو پُر خلوص توجہ سے سرفراز فرماتے ہوئے آپ کے تقرر کے حوالہ سے حضرت قاری صاحبؒ نے افتاء کمیٹی کے نام ایک تحریر بھی جاری فرمائی جس کو بعض احباب نے کارروائی کے لیے آگے نہیں بڑھنے دیا اور اس طرح تایا ابّاؒ کا باقاعدہ دار الافتاء میں تقرّر ہوتے ہوتے رہ گیا۔ جب اس قصہ کی اطلاع حضرت علامہ بلیاویؒ صاحب کو ہوئی تو اس سے آپ کو قلبی صدمہ پہنچا، اس پر حضرت علامہؒ نے تسلی دیتے ہوئے تایا ابّاؒ کو

فرمایا: ’’مولوی صاحب! گھبراؤ نہیں؛ اس سے اچھے آؤ گے‘‘۔ بحمد اللہ یہ پیشین گوئی نو (۹) سال بعد صادق آئی، اور آپ پورے اعزاز کے ساتھ دارالعلوم دیوبند میں باضابطہ درس وتدریس کے لیے بلالیے گئے۔ سید صادق حسین کاظمی کشمیریؒ نے کیا خوب کہا ہے:

تو سمجھتا ہے؛ حوادث ہیں ستانے کے لیے   یہ ہوا کرتے ہیں ظاہر آزمانے کے لیے
تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب!   یہ تو چلتی ہے تجھے اُونچا اُڑانے کے لیے

راندیر میں آپ کا تقرّر اور تدریسی سفر کا آغاز

جب دارالعلوم دیوبند میں آپ کا تقرّر نہ ہوسکا تو حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ صاحب کے توسُّط سے دارالعلوم اشرفیہ راندیر (سورت) میں درجۂ علیا کے استاذ کی حیثیت سے آپ کا تقرّر ہوا، پھر آپ اپنے چھوٹے بھائیوں مولانا عبدالمجید صاحبؒ میرے والد صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو اپنے ہمراہ لے کر راندیر تشریف لے گئے، اور پورے ۹ سال (ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ-تا-شعبان ۱۳۹۳ھ) کے تعلیمی دورانیہ میں دار العلوم اشرفیہ راندیر میں رہ کر تفسیر، حدیث، فقہ اور عقائد کی مختلف کتابیں پڑھائیں، اور تدریس کے ساتھ اردو وعربی زبان میں چند مفید کتب بھی تالیف فرمائیں۔

دار العلوم دیوبند میں تقرّر اور مناصب جلیلہ

شعبان ۱۳۹۳ھ = اگست ۱۹۷۳ء کی مجلس شوریٰ میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ نے عربی درجات کے لیے تایا اباؒ کا نام پیش فرمایا تھا، بحمد اللہ اسی مجلس میں اراکینِ شوریٰ نے تایا اباؒ کا بہ حیثیت استاذ عربی تقرّر فرمایا، اور شعبان ہی میں آپ کو اس خوش خبری کی اطلاع ملی تو رمضان المبارک کے بعد ہی دار العلوم دیوبند میں تدریسی فرائض انجام دینے کے لیے تشریف لے آئے، اور شوال (۱۳۹۳ھ = نومبر ۱۹۷۳ء) سے تدریسی خدمت کا آغاز فرمایا، اور زندگی کے آخری لمحات تک تدریس کا حق ادا فرماتے رہے، اور دار العلوم دیوبند کی شیخ الہند لائبریری کے تہ خانہ میں عشاء کے بعد ۲۲-۲۳ رجب ۱۴۴۱ھ بدھ اور

جمعرات کی درمیانی شب میں دورۂ حدیث کے پندرہ سو (۱۵۰۰) طلبہ کو بخاری شریف کا آخری درس دیا ۔

شوال ۱۳۹۳ھ سے ۱۴۳۰ھ کے تعلیمی سال کے ختم تک ۳۶ سال پر محیط تعلیمی دورانیہ میں مختلف کتب کے اسباق آپ کے ذمہ رہے، حتی کہ مجلس تعلیمی نے ایک تجویز میں ۱۷/ ربیع الاوّل ۱۴۲۹ھ بدھ سے بخاری شریف اوّل کا درس بھی آپ کے ذمّے کر دیا، بعدہ شعبان ۱۴۲۹ھ کی مجلس شوری نے اس تجویز کی توثیق فرمادی اور ساتھ میں شیخ الحدیث اور صدر المدرسین کے مناصب جلیلہ پر بھی آپ کو فائز فرمایا، تب سے ۱۴۴۱ھ = ۲۰۲۰ء کے تعلیمی سال کے اختتام تک کل ۱۳ مرتبہ مکمل بخاری شریف اوّل کا درس دیا، اور بہ حیثیت عہدۂ صدر المدرسین کے دار العلوم کی مجلس شوری کے رکن بھی رہے۔

سرِ بزمِ تدریس؛ دیکھا ہر اِک نے　　ترے سر پہ؛ سایہ فگن فضلِ باری
ہر اِک طالبِ علم کی آرزو تھی　　تمہی سے پڑھے؛ جامعہ میں بخاری
دل وجاں سے شیدا ہے، ہر طالبِ دیں　　بخاری کی تقریر سن کر تمہاری

دار العلوم دیوبندمیں تعلیمی خدمات

شوال/ سنہ ۱۳۹۳ھ سے وفات تک تایا ابا نے دار العلوم دیو بند میں جو کتابیں پڑھائیں ان کی تفصیل سنہ وار درج ذیل ہے:

سنہ ۹۴-۱۳۹۳ھ میں: مسلم الثبوت، ہدایہ اول، سلم العلوم، ہدیہ سعیدیہ، جلالین شریف نصف اوّل مع الفوز الکبیر، ملاحسن۔

سنہ ۹۵-۱۳۹۴ھ میں: مسلم الثبوت، شرح عقائد جلالی، ملاحسن، جلالین شریف نصف ثانی مع الفوز الکبیر۔

سنہ ۹۶-۱۳۹۵ھ میں: مسامرہ، دیوان متنبّی، میبذی، تفسیر بیضاوی پارہ ۲۱ تا ۲۵۔

سنہ ۱۳۹۶-۹۷ھ میں: دیوان متنبیّ، تفسیر بیضاوی پارہ ۲۶ تا ۳۰، ملاحسن، مشکاۃ شریف (عارضی)

سنہ ۱۳۹۷-۹۸ھ میں: مشکاۃ شریف جلد ثانی مع شرح نخبۃ الفکر، حسامی (باب القیاس) ملاحسن، دیوانِ حماسہ، سبعہ معلقہ، ہدایہ ثانی، موطا امام مالک۔

سنہ ۱۳۹۸-۹۹ھ میں: دیوان حماسہ، سبعہ معلقہ، بیضاوی شریف سورۂ بقرہ، مشکاۃ شریف جلد ثانی مع شرح نخبۃ الفکر، تفسیر مظہری پارہ ۱۶ تا ۲۰، موطا امام مالک، سراجی، نسائی شریف۔

سنہ ۱۳۹۹-۱۴۰۰ھ میں: مشکاۃ شریف جلد ثانی مع شرح نخبۃ الفکر، بیضاوی شریف پارہ ۲۱ تا ۲۵، دیوان حماسہ، سبعہ معلقہ، موطا امام مالک، سراجی۔

سنہ ۱۴۰۰-۰۱ھ میں: مشکاۃ شریف جلد اوّل مع شرح نخبۃ الفکر، بیضاوی شریف پارہ ۲۶ تا ۳۰، تفسیر مدارک پارہ ۶ تا ۱۰، سراجی، موطا امام محمد۔

سنہ ۱۴۰۱-۰۲ھ میں: ترمذی شریف جلد اوّل، بیضاوی شریف سورۂ بقرہ، ابو داؤد شریف بخاری شریف جلد ثانی، موطا امام مالک، موطا امام محمد۔

سنہ ۱۴۰۲-۰۳ھ میں: ترمذی شریف جلد اوّل، بیضاوی شریف سورۂ بقرہ، مسلم شریف جلد اوّل، مقدمہ ابن صلاح، رشیدیہ، ابن ماجہ شریف۔

سنہ ۱۴۰۳-۰۴ھ میں: ترمذی شریف جلد اوّل، بیضاوی شریف سورۂ بقرہ، ہدایہ رابع، طحاوی شریف۔

سنہ ۱۴۰۴-۰۵ھ میں: ترمذی شریف جلد اوّل: بیضاوی شریف سورۂ بقرہ، ہدایہ ثالث، بخاری شریف جلد اوّل، طحاوی شریف۔

سنہ ۱۴۰۵-۰۶ھ میں: ترمذی جلد اوّل، تفسیر القرآن، ہدایہ رابع، طحاوی شریف۔

سنہ ۱۴۰۶-۰۷ھ میں تلخیص الاتقان، ترمذی جلد اوّل، ہدایہ رابع، طحاوی۔

سنہ ۱۴۰۷-۰۸ھ میں: ترمذی شریف جلد اوّل، ہدایہ رابع، طحاوی، حجۃ اللہ البالغہ۔

سنہ ۱۴۰۸-۰۹ھ میں: ترمذی شریف جلد اوّل، ہدایہ رابع، طحاوی، حجۃ اللہ البالغہ۔

سنہ ۱۴۰۹-۱۰ھ میں: ترمذی جلد اوّل، ہدایہ ثالث، طحاوی، حجۃ اللہ البالغہ۔

سنہ ۱۴۱۰ھ سے ۱۴۲۸ھ تک ترمذی شریف جلد اوّل، حجۃ اللہ البالغہ اور طحاوی شریف پڑھاتے رہے۔

سنہ ۱۴۲۹ھ اور ۱۴۳۰ھ میں بخاری شریف جلد اوّل اور ترمذی شریف جلد اوّل پڑھائیں۔ اور سنہ ۱۴۳۱ھ سے ۱۴۴۱ھ تک بخاری شریف جلد اوّل پڑھاتے رہے۔

دیگر اہم ذمہ داریاں

درس وتدریس کے ساتھ ۱۳۹۵ھ میں تایا ابّاؒ کے ذمے دار الافتاء کی نگرانی بھی رہی، اور اسی طرح ۱۴۰۲ھ=۱۹۸۲ء میں تایا ابّاؒ اور والد صاحب نے دار الافتاء کی نگرانی اور فتوی نویسی کی خدمات انجام دیں۔ نیز مجلس تحفّظ ختم نبوّت کے قیام سے آخری دم تک آپ اس شعبہ کے ناظم اعلی رہے۔ الغرض سب مفوّضہ ذمہ داریاں آپ بہ حسن وخوبی سنبھالتے رہے، اور دار العلوم دیوبند کی پیش کش کے باوجود اُن کا اضافی الاؤنس لینے سے انکار فرما دیا۔

تصانیف اور شروحات

تایا ابّاؒ نے درس وتدریس اور مذکورہ بالا خدمات کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی گراں قدر خدمات انجام دیں اور آپ نے ایک عظیم علمی سرمایہ تصانیف کی شکل میں چھوڑا ہے؛ جو تشنگانِ علوم کے لیے یقیناً سامانِ تسکین ہے، اور ان شاء اللہ انمول تصانیف کی وجہ سے آپ کا نام صفحاتِ دَہر پر زندۂ جاوید رہے گا اور جو آثارِ علوم چھوڑ کر دُنیا سے گئے ہیں وہ بہ طور باقیات صالحات ہمیشہ ان کی سعید روح کے واسطے اجر وثواب بڑھاتے رہیں گے، اور آپ کی بہت سی تصانیف دار العلوم دیوبند سمیت کئی مدارس میں شاملِ نصاب ہیں، اس لیے جو تالیفات، شروحات، افادات اور تقاریر خالص آپ کی ہیں؛ استفادۂ عام کے لیے ذیل میں ان کا اجمالی تعارف پیش خدمت ہے:

نمبر	اسمائے کتب
۱	تفسیر ہدایت القرآن (اُردو، ۸ جلدیں)
۲	الفوز الکبیر (تعریب جدید)

۳	العون الکبیر عربی شرح الفوز الکبیر
۴	رحمۃ اللہ الواسعہ اردو شرح حجۃ اللہ البالغہ (۵ جلدیں)
۵	کامل برہانِ الٰہی تلخیص رحمۃ اللہ الواسعہ (اردو، ۴ جلدیں)
۶	حجۃ اللہ البالغہ پر عربی حاشیہ (۲ جلدیں)
۷	تحفۃ القاری اُردو شرح صحیح البخاری (۱۲ جلدیں)
۸	تحفۃ الالمعی اُردو شرح جامع الترمذی (۸ جلدیں)
۹	مقدمہ تحفۃ الالمعی (وحی کی اقسام اور تاریخِ تدوینِ حدیث)
۱۰	شرح علل الترمذی عربی شرح کتاب العلل للترمذیؒ
۱۱	شرح علل الترمذی اردو (یہ تحفۃ الالمعی جلد اوّل میں شامل ہے)
۱۲	زبدۃ الطحاوی عربی شرح معانی الآثار للطحاویؒ
۱۳	شمائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم اردو (یہ تحفۃ الالمعی جلد ہشتم کے آخر
۱۴	فیض المنعم اردو شرح مقدمۂ مسلم شریف
۱۵	ایضاح المسلم اوّل اردو شرح مسلم شریف (کتاب الایمان)
۱۶	تحفۃ الدرر اردو شرح نخبۃ الفکر
۱۷	حیاتِ امام ابوداؤد رحمہ اللہ (سوانح/تعارف)
۱۸	حیاتِ امام طحاوی رحمہ اللہ (سوانح/تعارف)
۱۹	مشاہیر محدثین وفقہاء کرام وتذکرۂ راویانِ کتبِ حدیث
۲۰	تسہیل ادلۂ کاملہ، مصنفہ: حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ

۲۱	تحقیق وتعلیق ایضاح الادلہ، مصنفہ: حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ
۲۲	حواشی امداد الفتاوی جلد اوّل (باقی جلدوں پر کام نہیں ہوا)
۲۳	ڈاڑھی اور انبیاء کی سنتیں
۲۴	حرمتِ مصاہرت (سسرالی اور دامادی رشتوں کے مسائل)
۲۵	کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟ (توثیق الکلام مصنفہ نانوتویؒ کی شرح)
۲۶	آپ فتوی کیسے دیں؟ اُردو شرح عقود رسم المفتی للشامیؒ
۲۷	جلسۂ تعزیت کا شرعی حکم
۲۸	مبادئ الاصول فی اصول الفقہ (عربی متن)
۲۹	معین الاصول اردو شرح مبادئ الاصول
۳۰	مبادئ الفلسفہ (عربی متن)
۳۱	معین الفلسفہ اردو شرح مبادئ الفلسفہ
۳۲	ارشاد الفہوم اردو شرح سلم العلوم
۳۳	مفتاح التہذیب اردو شرح تہذیب المنطق
۳۴	آسان منطق (یہ تیسیر المنطق کی تہذیب ہے)
۳۵	وافیہ عربی شرح کافیہ
۳۶	ہادیہ اردو شرح کافیہ (مع مشقی سوالات)
۳۷	آسان نحو (مکمل دو حصے)
۳۸	آسان صرف (مکمل تین حصے)

۳۹	محفوظات (تین حصے) یہ آسان آیات واحادیث کا مجموعہ ہے
۴۰	آسان فارسی قواعد (مکمل دو حصے)
۴۱	اسلام تغیر پذیر دُنیا میں (یہ ۴ قیمتی مقالوں کا مجموعہ ہے)
۴۲	دین کی بنیادیں اور تقلید کی ضرورت
۴۳	عصری تعلیم (ضرورت/ شرطیں/ تدبیریں)
۴۴	علمی خطبات (دو حصے/ قیمتی اور مفید تقریروں کا مجموعہ)
۴۵	مسئلہ ختم نبوت اور قادیانی وسوسے (مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم دیوبند)
۴۶	’افادات نانوتوی‘ / ماہنامہ الفرقان لکھنؤ میں شائع شدہ مضمون۔
۴۷	’افادات رشیدیہ‘ / ماہنامہ دارالعلوم دیوبند میں شائع شدہ مضمون۔
۴۸	”مسلم پرسنل لا اور نفقۂ مطلقہ کا مسئلہ“ / ۱۴۰۶ء میں دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند سے شائع شدہ مضمون۔
۴۹	تعدد ازواج رسول ﷺ پر اعتراضات کا علمی جائزہ (اس کو کمال الدین شہاب قاسمی نے مرتب کر کے دارالنشر ڈھاکہ سے شائع کیا تھا)

نظر ثانی اور اصلاح کردہ کتب کا تذکرہ

ان کے علاوہ تایا ابا ؒ نے متعدد کتابوں کی نظر ثانی فرمائی ہے اور حرف بہ حرف عرق ریزی سے ان کی اصلاح کی ہے اور قیمتی حواشی لکھے ہیں؛ وہ یہ ہیں:

نمبر	اسمائے کتب
۱	آسان بیان القرآن (۵ جلدیں/ تسہیل: مولانا عقیدت اللہ قاسمی)
۲	فتاویٰ رحیمیہ جدید (۵ جلدیں/ مفتی سید عبدالرحیم لاج پوری ؒ)

۳	باقیات فتاوی رشیدیہ (از: مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی)
۴	مکمل ومدلل فتاوی دار العلوم دیو بند جلد اوّل تا چہارم وجلد ۱۳ تا ۱۸
۵	مفتاح العوامل اردو شرح مأۃ عامل (شیخ فخر الدین احمد مرادآبادیؒ)
۶	گنجینۂ صرف اردو شرح پنج گنج (از: شیخ فخر الدین احمد مرادآبادیؒ)
۷	الخیر الکثیر اُردو شرح الفوز الکبیر (از: مفتی محمد امین پالن پوری)
۸	اصلاح معاشرہ (از: مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری)
۹	آدابِ اذان واقامت (از: مفتی محمد امین صاحب پالن پوری)
۱۰	رضاخانیت کا تعارف وتعاقب (از: مفتی محمد امین پالن پوری)
۱۱	طرازی اُردو شرح سراجی (از: مولانا مفتی اشتیاق احمد صاحب)
۱۲	مالا بہ منہ ترجمہ اردو (از: مولانا مفتی اشتیاق احمد صاحب)
۱۳	فقہی ضوابط، ۲ جلدیں (از: مفتی اسامہ صاحب پالن پوری)
۱۴	فقہی اصول (از: مولانا مفتی اسامہ صاحب پالن پوری)
۱۵	مسائل المیز ان (از: مولانا مفتی اسامہ صاحب پالن پوری)
۱۶	عون الغفّار تنویر الابصار کتاب الوقف کی اردو شرح (از: مولانا مفتی محمد مرشد قاسمی استاذ مسیح العلوم بنگلور)
۱۷	سوانح نذیری جدید (از: مولانا حکیم عبد القیوم صاحب پالن پوریؒ)

صدر جمہوریہ ایوارڈ

تایا ابا کو بھارت کی سابقہ راشٹر پتی پرتبھا دیوی سنگھ پاٹیل نے عربی میں علمی شغف اور مسلمہ قابلیت کی سند عطا کی تھی، جس کا متن درج ذیل ہے:

”میں بھارت کی راشٹر پتی پرتبھا دیوی سنگھ پاٹیل سعید احمد کو عربی میں علمی شغف اور مسلمہ

قابلیت کے لئے یہ سند عطا کرتی ہوں۔

نئی دہلی ۱۹؍جون ۲۰۱۲ء'' یہی مضمون اوپر ہندی میں اور نیچے اردو میں درج ہے اور آخر میں راشٹر پتی (پرتبھا دیوی سنگھ پاٹیل) کے دستخط ہیں۔

سحر آفریں خطابات اور دینی اسفار

تایا ابّاؒ مذکورہ بالا تدریسی اور تصنیفی کام بہ حسن وخوبی جاری رکھتے ہوئے مُلک و بیرون مُلک کے دینی اسفار فرماتے رہتے تھے، چنانچہ چالیس (۴۰) سال سے تایا ابّاؒ ہر سال رمضان المبارک میں، اور کبھی کبھی عید الاضحیٰ اور ششماہی کی تعطیل کلاں میں برطانیہ، کناڈا امریکہ، افریقہ، قطر، بنگلہ دیش وغیرہ تشریف لے جاتے تھے، ایک دن میں متعدد تقریریں فرماتے تھے، خوفِ خدا، اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فکرِ آخرت اور نیک اعمال پر اُبھارتے اور منکرات سے نہایت مؤثر انداز میں باز رہنے کی تلقین فرماتے رہتے تھے، آپ کے سحر آفریں خطابات کو سعادت مند سامعین بہت دلچسپی سے سنتے تھے، بہ ظاہر حضرتؒ کے بیانوں اور تقریروں میں نہ جوش وخروش ہوتا تھا، نہ ادیبانہ جملے نہ خطیبانہ ادائیں مگر افہام وتفہیم اور حکیمانہ اسلوب کے شہنشاہ تھے، اور سننے والا سراپا گوش بن جاتا تھا۔ شعر:

تمہی معدنِ علم، وجود وسخا ہو
تمہارا جہاں بھر میں ہے فیض جاری

بیعت و خلافت

تایا ابّاؒ طالب علمی کے زمانے سے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ اور حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب مظاہریؒ سے اجازتِ بیعت وارشاد سے بہرہ ور تھے اور حضرت اقدس مولانا عبد القادر صاحب رائے پوریؒ کی مجالس سے بھی فیض یافتہ تھے، نیز شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے خلیفہ حضرت مولانا سید محمود صاحب پٹھیرویؒ کے واسطے سے بھی تایا ابّاؒ مجازِ بیعت وارشاد تھے، دونوں بزرگوں کی سندِ اجازت والد صاحب کی کتاب 'حیات سعید' میں ہے۔

زیارت حرمین شریفین اور سعادتِ حج

تایا ابّاؒ متعدد بار زیارتِ حرمین شریفین اور سعادتِ حج سے بہرہ ور ہو چکے ہیں:

پہلا حج: ۱۴۰۰ھ=۱۹۸۰ء میں اپنی اہلیہ محترمہ کے ہمراہ پانی کے جہاز سے ادا فرمایا۔

دوسرا حج: ۱۴۰۶ھ=۱۹۸۶ء میں حضورﷺ کی طرف سے حج بدل کی نیت سے ادا فرمایا۔

تیسرا حج: ۱۴۱۰ھ=۱۹۹۰ء میں سعودی وزارتِ حج واوقاف کی دعوت پر ادا فرمایا۔

چوتھا حج: ۱۴۲۳ھ=۲۰۰۳ء میں میرے والد صاحب اور مفتی حسین کے ساتھ کیا۔

اور چار عمرے کیے، پہلی بار شعبان المعظّم ۱۴۲۱ھ میں اہلیہ محترمہ کے ساتھ عمرہ کیا، دوسری مرتبہ محرم الحرام ۱۴۳۱ھ میں عمرہ کیا، تیسری مرتبہ ربیع الاوّل ۱۴۳۶ھ میں عمرہ کیا، اور چوتھی بار ربیع الاوّل ۱۴۳۹ھ میں عمرہ کیا۔

مثالی توکل اور سخاوت

تایا ابّاؒ بشارتِ باری تعالیٰ ﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾ (سورہ طلاق: ۳) پر یقین سے سرشار تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ نے ۱۴۲۴ھ سے دارالعلوم دیوبند سے تنخواہ لینا موقوف فرما دیا، اور دار العلوم اشرفیہ راندیر سے لی ہوئی نو (۹) سال کی تنخواہ اور دار العلوم دیوبند سے حاصل کی ہوئی بتیس (۳۲) سال کی تنخواہ کو بھی طیبِ خاطر سے واپس فرما دیا، اور پھر آپ نے تا حیات کسی دینی خدمت کا معاوضہ قبول نہ فرمایا، اور آپ کی سخاوت اور دریا دلی قابلِ رشک تھی، آپ اپنے اساتذہ واحباب، اعزہ واقارب تلامذہ وخدام کا خوب خیال رکھتے تھے اور ان کا بھرپور مالی تعاون فرماتے رہتے تھے، اور اپنی تصانیف کے سیٹ کے سیٹ احباب واصحاب کو ہدیہ کرتے رہتے تھے۔

قرآن کریم سے وارفتگی اور اس کے تئیں فکر مندی

تایا ابّاؒ کا دل قرآن کریم کی عظمت ومحبت سے سرشار تھا، چنانچہ سب سے پہلے آپ نے خود حفظ کیا، میرے والد صاحب (حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب) کو حافظ

بنایا، اپنے چھوٹے بھائی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو حافظ بنایا، اپنی اہلیہ محترمہ صاحبہ کو از خود حافظ بنایا، اپنے گیارہ بیٹوں، دو بیٹیوں اور دو پوتوں کو حافظ بنایا، اور تایا ابّاؒ کی ترغیب سے حفظِ قرآن کا یہ مبارک سلسلہ اکثر بہوؤں اور دیگر پوتوں حتی کہ نواسوں اور نواسیوں تک چلتا رہا، اور اب بھی جاری ہے۔

جب آپ قرآن کریم کی تلاوت فرماتے تو ایمانی حرارت دو بالا ہو جاتی، آپ فرمایا کرتے تھے کہ احکام کی آیات کو چھوڑ کر پورا قرآن ہر عام وخاص کے سمجھنے کے لیے بہت آسان ہے، اور تذکیر کے لیے قرآن سے بہتر کچھ بھی نہیں، بس ضرورت ہے کہ عوام میں عربی کی تعلیم عام کی جائے، اور قرآن کی عربی بہت آسان ہے، اللہ جلّ شانہٗ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾ بس ٹھہر ٹھہر کر تدبُّر کے ساتھ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ تایا ابّاؒ قرآن کریم اور اس کے مفاہیم سے عوام کی دوری پر بہت زیادہ تشویش کا اظہار کرتے رہتے اور فرماتے تھے کہ عربی پڑھے ہوئے بھی قرآن سمجھ کر پڑھنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں، لوگوں تک پیغامِ خداوندی پہنچانے کے تعلق سے آپ کا یہ طرزِ عمل اور تڑپ ہم سبھی کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے؟! **اللّٰهم اهدنا بالقرآن و نوّر قلوبنا بالقرآن و زيّن أخلاقنا بالقرآن.**

مرحوم کے والدین ماجدین کا ذکر خیر

تایا ابّاؒ اور میرے والد صاحب کے ابا اور میرے دادا مشکاۃ تک پڑھے ہوئے تھے، اس لیے حرام مال بلکہ مشتبہ مال سے خود بھی پرہیز فرماتے تھے، اور اپنی اولاد کو بھی کلی اجتناب کرنے کی تاکید فرماتے تھے، اور ان کی تعلیم وتربیت کی فکر ہمیشہ آپ کو دامن گیر رہتی تھی، نماز پنج گانہ کے ایسے پابند تھے کہ کبھی ان کی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی، ۱۹/ ذی قعدہ ۱۴۱۲ھ = ۲۳/ مئی ۱۹۹۲ء کی شب میں تہجد کے لیے بیدار ہوئے تو آپ کو شدید گرمی لگی اور ٹھنڈک کے لیے غسل کیا، ابھی کپڑے بدل ہی رہے تھے کہ اچانک سینے میں درد شروع ہوا اور پورا بدن پسینہ سے تربہ تر ہو گیا، اور اس اثنا میں چچاؤں کی طرف سے ڈاکٹر کو بلانے کی

تگ و دو ہونے لگی، تو دادا اباؒ نے فرمایا: ’’ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت نہیں‘‘ یہ کہہ کر تھوڑی دیر میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اسی طرح تایا اباؒ اور میرے والد صاحب کی والدہ محترمہ اور میری دادی امیؒ دین کی ضروری باتوں سے واقف، امور خانہ داری میں ماہر، نہایت سلیقہ مند، صابرہ شاکرہ عابدہ زاہدہ خاتون، اور نماز و روزے کی پابند تھیں۔ ۱۰ محرم الحرام (۱۳۹۹ھ = دسمبر ۱۹۷۸ء میں جب راقم سطور کی عمر سوا دو سال کے قریب تھی) کا دادی امی نے روزہ رکھا، مغرب کے وقت روزہ افطار کیا اور نماز ادا کی، پھر سب گھر والوں کے ساتھ کھانا کھایا اور کچھ دیر آرام کیا، جب عشاء کا وقت ہوا تو میرے دادا اباؒ اور چچا جان مولانا عبد المجید صاحب کو نماز کے لیے روانہ کیا، اور میری چھوٹی پھوپھی صاحبہ سارہ خاتون اپنی بچی حفصہ خاتون کو لے کے لیٹی ہوئی تھیں ان کو بھی عشاء کی نماز پڑھنے کے لیے اٹھایا، سب دادی امی کی فکر سے نماز عشاء ادا کرنے میں مشغول ہو گئے، جب عشاء کی نماز پڑھ کر دادا اباؒ تشریف لائے تو دیکھتے ہیں کہ دادی امی کے بال چارپائی سے نیچے بے قاعدگی سے لٹک رہے ہیں، دادا اباؒ نے مکرّر سہ کرّر آوازیں دیں، مگر دادی امی نے کوئی جواب نہ دیا، جب دادا اباؒ نے بالوں کو ٹھیک کرنے کے لیے ہاتھ لگایا تو پتا چلا کہ دادی امی اللہ کی رحمت میں جا چکی ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون

اللہ تعالیٰ دادا اباؒ اور دادی امیؒ کی بال بال مغفرت فرمائیں، جنت الفردوس کا مکیں بنائیں اور اُن کی قبروں کو نور سے بھر دیں۔ آمین

برادران اور ہمشیراؤں کا تذکرہ

تایا اباؒ کے اُن سے بڑے ایک اخیافی (ماں شریک) بھائی، اور اُن سے چھوٹے چار حقیقی بھائی اور چار حقیقی بہنیں ہیں، کل وہ دس بھائی بہن ہیں؛ جن کے اسماء اور احوال مختصراً ذیل میں درج ہیں:

۱	اخیافی بڑے بھائی کا نام احمدؒ تھا، جن کا تقریباً دس سال پہلے وصال ہو چکا ہے۔
۲	تایا اباؒ، حقیقی بھائی بہنوں میں سب سے بڑے تھے، جن کے یہ احوال ہیں۔

۳	محترمہ بہن حواء صاحبہ، بہ قید حیات ہیں، البتہ بیوہ ہیں۔
۴	جناب عبدالرحمٰن صاحبؒ، متوفی یکم مارچ ۲۰۱۳ء، یہ عالم نہیں تھے، مشغلہ کھیتی تھا۔
۵	محترمہ رحیمہ صاحبہ، بہ قید حیات ہیں، یہ بھی بیوہ ہیں۔
٦	جناب مولانا عبدالمجید صاحبؒ، متوفی یکم جنوری ۲۰۱۵ء، یہ عالم اور کاشتکار تھے۔
۷	میرے والد صاحب حضرت مفتی محمد امین صاحب مدظلہ، ولادت: ۱۵ جنوری ۱۹۵۲ء، آپ ۱۹۸۲ء سے دارالعلوم دیوبند میں تدریس کی خدمت اور ۱۴۲۸ھ سے فتاوی دارالعلوم دیوبند کی ترتیب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔
۸	محترمہ عائشہ صاحبہ، بہ قید حیات ہیں۔
۹	محترمہ سارہ خاتون صاحبہ، بہ قید حیات ہیں، اور میری خوش دامن ہیں۔
۱۰	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مظاہری مدظلہ، ولادت: ۷ فروری ۱۹۶۰ء استاذ تفسیر و حدیث دارالعلوم اشرفیہ راندیر سورت و شیخ الحدیث دارالعلوم صوفی باغ سورت اور حضرت مولانا قمرالزماں صاحب الہ آبادی کے جلیل القدر خلیفہ ہیں۔

نکاح اور آل و عیال کا تذکرہ

جس سال تایا اباؒ نے دارالعلوم اشرفیہ راندیر (سورت) میں تدریسی سفر کا آغاز فرمایا؛ اسی سال ۱٦/ذی الحجہ ۱۳۸۴ھ = ۱۹/اپریل ۱۹٦۵ء میں تایا اباؒ کا عقدِ مسنون اُن کے ماموں حافظ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شیرؒ کی بڑی صاحب زادی سکینہ صاحبہؒ سے ہوا؛ جو ایک مثالی شریکِ حیات ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی کثیر العیال فیملی کو سلیقہ مندانہ انداز اور ہنر مندی سے سنبھالنے والی، نہایت صابرہ شاکرہ، عابدہ زاہدہ، صوم وصلاۃ کی پابند، صفائی کا خوب خیال رکھنے والی، آپ کلام اللہ کی حافظہ اور اپنے بیشتر بچوں اور بچیوں کی تحفیظ قرآن کی استاذ تھیں۔ اور تقریباً ۴۹ سال قمری تایا اباؒ کی شریکِ حیات رہ کر ۱۹/جمادی الاخری ۱۴۳۲ھ = ۲۳/مئی ۲۰۱۱ء بہ روز پیر بہ وقت صبح چار بج کر دس منٹ پر موصوفہ اللہ کی رحمت میں چلی گئیں

۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، اور دیوبند کے مشہور تاریخی ’قبرستان قاسمی‘ میں مدفون ہیں اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے، اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین!

ان ہی نیک پارسا خاتون کے بطن سے تایا ابّاؒ کے گیارہ صاحب زادے اور تین صاحب زادیاں پیدا ہوئیں، ایک صاحب زادی بچپن میں اور دو بڑے جوان صاحب زادے انتقال کر گئے اور تادمِ تحریر نو (۹) صاحب زادگان اور دو (۲) صاحب زادیاں بہ قید حیات ہیں اور شادی شدہ ہیں، ان تمام کے اسماء اور مختصر احوال مندرجۂ ذیل ہیں:

۱	مرحوم حافظ مفتی رشید احمد صاحب قاسمیؒ سابق استاذ جامعہ حسینیہ راندیر (سورت) ولادت: ۴/ جمادی الثانیہ ۱۳۸۶ھ = ۲۰/ ستمبر ۱۹۶۶ء، منگل/ شہادت: ۵/ شوال ۱۴۱۱ھ = ۷/ مارچ ۱۹۹۵ء، منگل/ آپ دیوبند کے ’قبرستان قاسمی‘ میں مدفون ہیں۔
۲	مرحوم حافظ سعید احمد صاحبؒ سابق استاذِ حفظ دار العلوم رام پورہ (سورت) ولادت: یکم ذی قعدہ ۱۳۸۷ھ = یکم/ فروری ۱۹۶۸ء، جمعرات/ وفات: ۲۸/ ربیع الاوّل ۱۴۴۱ھ = ۲۶/ نومبر ۲۰۱۹ء، منگل/ اور راندیر میں مدفون ہیں۔
۳	جناب حافظ مولانا وحید احمد صاحب قاسمی زید مجدہ استاذِ حفظ نور الاسلام دَمن، واپی، گجرات/ ولادت: ۱۷/ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۹ھ = ۲/ اگست ۱۹۶۹ء/ آپ ہی نے تایا ابّاؒ کی نماز جنازہ پڑھائی تھی۔
۴	مرحومہ عائشہ/ ولادت: ۱۳/ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۱ھ = ۷/ جولائی ۱۹۷۱ء/ وفات: ۱۶/ ربیع الاوّل ۱۳۹۳ھ = ۲۰/ اپریل ۱۹۷۳ء، جمعہ/ اور راندیر میں مدفون ہیں۔
۵	جناب حافظ مولانا حسن احمد صاحب قاسمی زید مجدہ/ ولادت: ۱۴/ محرم ۱۳۹۳ھ = ۱۸/ فروری ۱۹۷۳ء/ تایا ابّاؒ کی تمام تصانیف آپ ہی کے ہاتھ کی کمپوز کردہ ہیں۔
۶	جناب حافظ مولانا حسین احمد صاحب قاسمی زید مجدہ سابق استاذ دار العلوم راندیر، و مدرسہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ اور دار العلوم زکریا دیوبند/ ولادت: ۲/ جمادی الثانیہ ۱۳۹۴ھ = ۲۴/ جون ۱۹۷۴ء/ آپ ہی تحفۃ القاری اور تحفۃ الألمعی کے مرتب ہیں اور مسلم کی شرح ایضاح المسلم کی ترتیب دے رہے ہیں، اس کی جلد اوّل شائع ہو چکی ہے۔
۷	جناب حافظ مولانا محمد ابراہیم سعیدی صاحب قاسمی زید مجدہ صدر المدرسین و ناظم تعلیمات نافع العلوم، کورانہ، ہاپوڑ، یوپی/ ولادت: شعبان ۱۳۹۶ھ = ۱۹۷۶ء۔

۸	جناب حافظ قاسم احمد صاحب زید مجدہ مینجر مکتبہ حجاز دیوبند/ ولادت: ۱۳۹۸ھ = ۱۵/ مارچ ۱۹۷۸ء/ تایا اباؒ کی اکثر تصانیف اسی مکتبہ حجاز سے شائع ہوتی ہیں۔
۹	حافظہ عائشہ سلمہا/ ولادت: ۱۳۹۹ھ = جنوری ۱۹۷۹ء/ موصوفہ ضروری دینی تعلیم سے آراستہ ہیں اور حافظہ ہیں/ اور ان کا عقدِ نکاح رفیقِ درس جناب مولانا مفتی اسامہ پالن پوری زید مجدہ مدرس جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل سے ہوا ہے۔
۱۰	جناب حافظ مفتی محمد سعید صاحب قاسمی زید مجدہ استاذ حدیث جامعۃ الامام انور شاہ کشمیریؒ دیوبند و سابق مدرس مدرسہ بحر العلوم کشن پور، مظفر نگر، یوپی/ ولادت: ۱۴۰۱ھ = فروری ۱۹۸۱ء۔
۱۱	جناب حافظ مولانا احمد سعید صاحب قاسمی زید مجدہ استاذ حدیث جامعۃ الشیخ حسین احمد مدنی دیوبند، یوپی/ ولادت: ۴/ صفر ۱۴۰۳ھ = ۲۱/ نومبر ۱۹۸۲ء، اتوار۔
۱۲	حافظہ فاطمہ سلمہا/ تاریخ ولادت محفوظ نہیں/ موصوفہ بھی ضروری دینی تعلیم سے آراستہ ہیں اور حافظہ ہیں/ اور ان کا عقدِ نکاح جناب حافظ بلال پالن پوری سلمہ (جو جناب محمد حنیفؒ کھروڈیہ بانی و مہتمم جامعہ نور العلوم گٹھامن، پالن پور کے فرزند ہیں) سے ہوا ہے/ جب تایا اباؒ بہ غرض علاج ممبئی تشریف لے گئے تھے تو ۱۹/ مارچ ۲۰۲۰ء - تا - ۱۹/ مئی ۲۰۲۰ء مستقل دو مہینے اسی سعادت مند صاحب زادی کے یہاں قیام فرمایا تھا، اور موصوفہ نے اور ان کے اہل خانہ نے تایا اباؒ کی خوب خدمت کی تھی، اللہ ان سب کو اپنے شایانِ شان اجر عطا فرمائے۔ آمین
۱۳	جناب حافظ قاری عبد اللہ صاحب سلمہ/ تاریخ ولادت محفوظ نہیں/ موصوف دیوبند ہی میں تجارت سے وابستہ ہیں/ جب تایا اباؒ علالت کی وجہ سے ممبئی تشریف لے گئے تو آپ ہی کو دیوبند سے وفات تک آخری ایام زندگی کی خدمت کی سعادت حاصل رہی اور تایا اباؒ کی تکفین و تدفین میں بھی شریک رہے۔
۱۴	جناب حافظ عبید اللہ صاحب سلمہ/ ولادت: ۹/ صفر ۱۴۰۹ھ = ۲۲/ ستمبر ۱۹۸۸ء، موصوف اپنے برادر کبیر حافظ قاسم احمد زید مجدہ کے ہمراہ تجارت میں مشغول ہیں۔

امراض اور علاج معالجہ

تایا اباؒ کی اکثر زندگی خیریت اور عافیت سے گزری، آپ برابر صحت مند رہتے تھے حتی کہ آپ کی صحت و تندرستی قابلِ رشک تھی، اور ہمہ وقت کتب بینی، تدریس و تالیف اور تقریر و تحریر میں منہمک رہتے تھے اور تھکنے کا شائبہ تک نہیں ہوتا تھا، البتہ زندگی کے آخری ایام میں شوگر بلڈ پریشر اور امراضِ قلب میں مبتلا ہو گئے تھے، وفات تک ان تکلیفوں کا عارضہ رہا، اور برابر اُن امراض کا علاج معالجہ فرماتے رہے۔

۲۷/ اکتوبر ۲۰۱۳ء میں شدید اٹیک آیا اور بے ہوشی لاحق ہو گئی تو 'نانا وتی ہاسپٹل

ممبئی' کے ڈاکٹروں نے کامیاب آپریشن کیا، اور ۲۵ روز بعد ۲۰/نومبر ۲۰۱۳ء کو شفایاب ہوکر دیوبند آ گئے، مگر تین دن بعد ہی ملیریا کا شدید بخار شروع ہوگیا کہ گردے بھی متاثر ہو گئے، تو آپ دوبارہ علاج کے لیے ممبئی تشریف لے گئے اور وہاں 'ملت ہاسپٹل' میں داخل کیا گیا، بحمد اللہ دوستوں کی دعاؤں سے ایک ہفتے میں شفایاب ہو گئے، مگر احباب کے ہمدردانہ اصرار پر آرام کے لیے تقریباً ایک ماہ ممبئی میں ہی قیام فرما کر ۲۴/دسمبر ۲۰۱۳ء کو دیوبند تشریف لے آئے، اور ایک ہفتے بعد جنوری ۲۰۱۴ء سے درس و تدریس کا سلسلہ شروع فرما دیا اور ساتھ میں تحفۃ القاری کی تصنیف کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔

انعامی جلسہ میں آخری تقریر اور بخاری شریف کا آخری درس

تایا اباؒ دار العلوم دیوبند کے انعامی جلسہ منعقدہ ۱۶/رجب ۱۴۴۱ھ = ۱۲/مارچ ۲۰۲۰ء میں تقریر فرما رہے تھے کہ اچانک آپ کی زبان نے ساتھ دینا چھوڑ دیا اور تلفُّظ کی ادائیگی بند ہوگئی، کچھ وقفے بعد زبان چلی تو پھر تقریر شروع فرمائی مگر تھوڑی دیر بعد پھر زبان بند ہوگئی اور دوبارہ زبان کھلی تو بیان فرماتے رہے اور بہ مشکل تمام آپ نے یہ تقریر مکمل فرمائی اور طلبہ و اساتذہ غرقِ حیرت تھے کہ اچانک آپ کو کیا ہوگیا؟!!

ٹیسٹ کے بعد دیوبند کے ڈاکٹروں سے علاج شروع کیا تو قدرے افاقہ ہوا تایا اباؒ کو آرام کی شدید ضرورت تھی مگر رواں سال ۱۴۴۱ھ کا تعلیمی دورانیہ ختم ہونے کو تھا، اس لیے اسی نازک حالات میں بخاری کا درس جاری رکھا، اور ۲۲-۲۳ رجب ۱۴۴۱ھ = ۱۸-۱۹ مارچ ۲۰۲۰ء بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب میں عشاء کے بعد پورے سو منٹ آخری درس دیا، حسبِ توفیق ایک دو مرتبہ کلام کیا مگر اس کے بعد کلام پر قادر نہ ہو سکے اور ہزار کوششوں کے باوجود اُن کی زبان بندی ختم نہ ہوئی حتی کہ دُعا بھی نہ کرا سکے اور طلبہ سے صرف اتنا فرمایا: ''بھائیو! معاف کرنا'' پھر گھر تشریف لے آئے۔

ممبئی کا آخری سفر اور وفات حسرت آیات

بہ غرض علاج تایا اباؒ ۲۳/رجب ۱۴۴۱ھ = ۱۹/مارچ ۲۰۲۰ء بہ روز جمعرات

دیوبند سے دہرادون ائیر پورٹ کے لیے روانہ ہوئے، آپ کے فرزند جناب حافظ عبداللہ جناب عمار بھائی اور جناب عبداللہ بن مرحوم محمد حنیف آپ کے رفیقِ سفر تھے، اور اسی روز شام کو یہ سب ممبئی پہنچ گئے۔ اگلے روز بہ روز جمعہ حضرت کو 'ملت ہوسپٹل، جوگیشوری' میں علاج کے لیے ایڈمٹ کیا گیا، ٹھیک تین دن بعد بہ روز پیر شفایاب ہوکر اپنی چھوٹی صاحب زادی فاطمہ سلمہا کے گھر تشریف لے آئے، کچھ روز تک علاج معالجہ ہوتا رہا اور اختتام مارچ تک آپ مکمل صحت یاب ہوگئے، تو اصرار فرمانا شروع کردیا: ''مجھے دیوبند لے چلو، میں بالکل ٹھیک ہوگیا ہوں''، مگر افسوس صد افسوس کورونا وائرس کی وجہ سے آل انڈیا لاک ڈاؤن تھا، اور آمد و رفت کا سلسلہ ہر فرد بشر کے لیے بالکل بند اور قابلِ گرفت تھا، اس لیے لاکھ کوششوں اور چاہتوں کے باوجود دیوبند آنے کی کوئی سبیل نہ نکل پائی، اور آپ کو ممبئی ہی میں قیام کرنا پڑا۔

پورا شعبان المعظم اور تقریباً رمضان المبارک کا پہلا عشرہ خیریت و عافیت سے گزرا، یہاں تک کہ بعد نمازِ تراویح ۱۲؍ رمضان (۱۴۴۱ھ) تک آپ نے آن لائن تفسیر قرآن کا بھی اہتمام فرمایا، عام طور پر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیان فرماتے تھے؛ جس سے خلقِ خدا نے خاصہ فائدہ اٹھایا، ۱۳؍ رمضان کو سخت بخار ہوا اور اٹیک آیا، ۱۴ اور ۱۵؍ رمضان کو بعد تراویح نصف گھنٹہ بیان فرمایا، ۱۶؍ رمضان کو سحری سے قبل طبیعت بہت زیادہ ناساز ہوئی تو ۱۷؍ رمضان بہ روز پیر ممبئی کے ملاڈ علاقہ میں واقع 'سنجیونی ہاسپٹل' میں آپ کو ایڈمٹ کیا گیا اور 'آئی سی یو' میں رکھا گیا، چند دنوں کے بعد افاقے کی کیفیت محسوس ہوئی تو ۲۳ رمضان کو بعد مغرب 'آئی سی یو' سے باہر آگئے، اور ۲۳ رمضان المبارک کی شب میں وہاں موجود احباب سے باتیں کرتے رہے اور بعض احباب سے فون پر بھی گفتگو فرمائی، مگر فجر کے بعد دن میں ایسے سوئے کہ مرتے دَم تک آنکھ کھول کر بھی نہ دیکھا، اور مستقل بے ہوشی کا عالم طاری رہا تو ۲۴ رمضان المبارک کو پھر 'آئی سی یو' میں رکھا گیا، بالآخر ۲۵؍ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ = ۱۹؍ مئی ۲۰۲۰ء بہ روز منگل صبح ساڑھے چھ اور پونے سات کے درمیان علوم وفنون کا یہ روشن آفتاب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سرزمین ممبئی میں غروب ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ شعر:

نہیں ہے پیرِ مے خانہ ، مگر فیضان باقی ہے
ابھی تک مے کدہ سے، بوئے عرفانی نہیں جاتی

تکفین و تدفین ، نماز جنازہ اور آخری آرام گاہ

جناب مولانا حارث صاحب پالن پوری زید مجدہ اور جناب مولانا ہاشم صاحب پالن پوری زید مجدہ نے غسل اور کفن دیا، اور آپ کے صاحب زادے جناب مولانا حافظ وحید احمد زید مجدہ نے نماز جنازہ پڑھائی ، لاک ڈاؤن کی پابندیوں اور آمد و رفت کی سختیوں کے باوجود کافی لوگوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی ، اس کے بعد آپ کے جنازہ کو بہ ذریعہ ایمبولینس 'اوشیورہ مسلم قبرستان' جوگیشوری (ویسٹ) کے گیٹ تک لے جایا گیا ، اور گیٹ سے جنازہ کو کاندھوں پر اٹھا کر قبر تک پہنچایا گیا، اور مسنون طریقے کے مطابق تدفین عمل میں آئی، اور غروب آفتاب سے تقریباً ایک گھنٹہ قبل دفن اور مٹی ڈالنے سے فراغت ہوئی۔

نوٹ : یہ ''اوشیورہ مسلم قبرستان' حضرت مولانا بدر الدین اجمل صاحب دامت برکاتہم العالیہ کے ادارہ مرکز المعارف سے متصل ہے۔ شعر:

میں آج مر کے بھی بزمِ وفا میں زندہ ہوں
تلاش کر میری محفل، مرا مزار نہ پوچھ

والد محترمؒ کی خانگی زندگی

مولانا محمد سعید پالن پوری
استاذ جامعۃ الامام محمد انور شاہ کشمیری دیوبند

والد محترم حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری صاحب سابق شیخ الحدیث و صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی وفات کے بعد سے تادم تحریر مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری ہے، ان مضامین میں ارباب قلم والد محترمؒ کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈال رہے ہیں، ان گوشوں میں سے ایک گوشہ والد محترمؒ کی خانگی اور گھریلو زندگی بھی تھا، خانگی زندگی کے احوال پر روشنی ڈالنے کے لیے ہم بھائیوں کو حکم ہوا کہ عربی مقولہ ہے: ''صَاحِبُ الْبَیْتِ اَدْرٰی بِمَا فیه'' (گھر کے لوگ ہی گھر کی چیزوں کو اچھی طرح جانتے ہیں) اسی حکم کی تعمیل میں یہ چند اوراق لکھے جا رہے ہیں۔

مساوات وبرابری

حضرت والد صاحبؒ کا خانوادہ کافی بڑا ہے، خود ہم بھائی بہن درجن سے زائد تھے، پھر ہماری اولاد سب مل کر چار درجن کے قریب ہیں، اتنا بڑا گھرانہ ہونے کے باوجود والد صاحب سب کو ایک نظر سے دیکھتے تھے، سب کے ساتھ برابری اور مساوات کا معاملہ فرمایا کرتے تھے، پوتوں پوتیوں میں جب کھانے کی کوئی چیز تقسیم کرنی ہوتی تو کسی ایک بچے کو بھیج کر پہلے سب کو اپنے کمرے میں بلا لیتے، پھر ان سب میں چیز کو برابر سرابر تقسیم فرماتے تھے، یہ نہیں ہوتا تھا کہ جن بچوں کی طرف طبعی میلان زیادہ تھا ان کو زیادہ دیتے ہوں یا الگ سے بلا کر صرف انھیں کو دیتے ہوں، نہیں! یہ آپ کے مزاج کے خلاف تھا۔ مساوات کا یہ عمل دیگر موقعوں پر بھی دیکھنے کو ملتا تھا، گھر کے اضافی خرچوں کی تکمیل کے سلسلہ میں ایک معتد بہ

رقم ہر سال والد صاحبؒ جب کتب خانہ کا حساب کرتے تھے تو اپنی اولاد کو عنایت فرماتے تھے یہاں بھی عنایت کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ صرف دیوبند میں مقیم وفروکش بچوں کو یہ رقم ملتی ہو، یا صرف نرینہ اولاد کو ملتی ہو، نہیں! سب بھائی بہنوں کو ملتی تھی، بہنوں کے باب میں یہ بھی دیکھنے کو ملا کہ ان کو صرف میراث میں بھائیوں سے آدھا حصہ؛ ان کے حصہ شرعی کے مطابق ملا، باقی دیگر تمام جگہوں پر والد صاحبؒ نے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ لڑکے اور لڑکی کے حصوں میں فرق نہیں کیا، سب کو برابر عنایت فرماتے تھے۔

مساوات ہی نہیں عدل بھی

یہ جو مساوات و برابری والا عمل تھا اس پر والد صاحبؒ آنکھ بند کر کے عمل پیرا نہیں ہوتے تھے کہ ہر جگہ مساوات ہی فرماتے ہوں، بعض مواقع ایسے بھی تھے جہاں وہ مساوات کو چھوڑ دیا کرتے تھے، اور مساوات کا یہ چھوڑنا کسی بچے پر ظلم کے لیے نہیں؛ بلکہ عدل وانصاف کے حصول کے لیے ہوتا تھا، ان مواقع میں سے ایک موقع یہ تھا کہ سالانہ بنیادوں پر ملنے والی مذکورہ بالا رقم والد صاحبؒ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ میں برابر تقسیم نہیں فرماتے تھے، ظاہر ہے کہ شادی شدہ اور متاہلانہ زندگی گزارنے والوں کے اخراجات کنواروں اور نا کتخداؤں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ حضرت والد صاحبؒ اس فرق کو ملحوظ رکھا کرتے تھے اسی وجہ سے متاہل کے مقابلے میں غیر متاہل کو ملنے والی یہ رقم کچھ کم ہوتی تھی۔

مشترکہ خاندان یا علاحدہ؟

یہ مسئلہ لوگوں کے درمیان موضوع بحث رہتا ہے کہ شادی کے بعد والدین کا اپنی اولاد کو اپنے ساتھ رکھنے والا نظام زیادہ مفید ہے یا بچوں کو الگ کر دینے والا نظام، بالفاظ دیگر مشترکہ گھر کا نظام زیادہ مفید وکار آمد ہے یا الگ الگ گھر کا نظام، دونوں نظاموں کے فوائد بیان کرنے والے مل جاتے اور دونوں اپنے اپنے حق میں غور وفکر کو دعوت دیتے؛ دلائل و براہین اور شواہد ونظائر بھی رکھتے ہیں، والد صاحبؒ نے ہم درجن بھر بھائیوں کے لیے ایک بیچ

کی راہ نکالی جس کے دینی و دنیوی فوائد ہم سبھوں نے محسوس کیے، وہ یہ کہ الگ بھی کر دیا اور الگ نہیں بھی کیا۔ عموم خصوص من وجہٍ کی نسبت، الگ کر دیا اس معنی میں کہ والد صاحبؒ نے شادی کے بعد سب بچوں کو اپنے پلو سے باندھے نہیں رکھا، ہوتا یہ تھا کہ جب چھوٹے بھائی کی شادی کی تاریخ متعین ہوتی تو تاریخ کا یہ متعین ہونا بڑے بھائی کے الگ کیے جانے کا الارم ہوتا، والدین اپنے ساتھ صرف چھوٹی بہو کو رکھتے تھے، اور جب تک اگلے لڑکے کی شادی نہ ہو اُس بہو کی تربیت فرماتے تھے، ڈیڑھ دو سال کے بعد جب اگلے لڑکے کی شادی ہوتی تو بڑے بھائی کو الگ بلا کر گفتگو کرتے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی تلقین فرماتے، کچھ مہینے کے راشن کے پیسے دیتے، چولہا، ضروری برتن، کپڑوں بستروں کے لیے الماری اور ایک فِرِج بھی دیتے، اور سب سے بڑھ کر حوصلہ دیتے کہ دیکھو ہم تمھیں صرف الگ کر رہے ہیں ہم مر نہیں رہے ہیں، الگ اس وجہ سے کر رہے ہے کہ تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکو، آج نہیں تو کل ہمارے مرنے کے بعد تمھیں الگ ہونا ہی ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اپنا گھر چلایا کیسے جاتا ہے اسے تم ہماری حیات ہی میں سیکھ لو، گھر کے چلنے میں کوئی مسئلہ یا پریشانی پیش آئے تو تم ہمارے پاس کبھی بھی آ سکتے ہو۔ ان کے اس حوصلہ دینے اور آگے کے گھریلو امور میں مسلسل نگرانی فرماتے رہنے کے باعث ہم سبھی بھائی بحمد اللہ والد صاحبؒ کی حیات ہی میں برسر روزگار ہو کر اپنا اپنا گھر چلا رہے تھے، سب بھائیوں کی شادی ہو جانے کے بعد والد صاحب کے حکم وخواہش کے بموجب رسمی طور سے ان کے کھانے پینے کے جملہ امور برادرم احمد سعید صاحب کے گھر سے انجام دیے جاتے تھے اور غیر رسمی طور سے سبھی گھروں سے۔

یہ تو ہوا الگ الگ کرنا، اور الگ الگ نہ کرنا بایں معنی کہ والد صاحبؒ نے ہم بھائیوں کو جو الگ الگ مکان دیے؛ وہ الگ الگ محلوں یا پلاٹوں میں نہیں تھے، بلکہ ایک بڑے پلاٹ میں انگلش حرف تہجی یو (U) کی شکل میں بھائیوں کی تعداد کے بقدر درجن بھر درمیانے انداز کے (نہ بہت بڑے نہ بالکل چھوٹے) مکانات بنوائے جن کی ہر چیز؛ بشمول بجلی کا میٹر اور پانی کی پائپ لائن الگ الگ تھی، والد صاحبؒ نے اپنی رہائش بھی انھیں

مکانوں میں سے ایک مکان میں رکھ لی۔ یوں ہم سب بھائی داخلی طور سے الگ الگ اور خارجی طور سے والد صاحبؒ کے ساتھ تھے، والد صاحبؒ کو بھائیوں میں سے اگر کسی کو بلانا ہوتا تو وہ کسی بھی بچے کو بھیج کر جب چاہتے بلا لیتے، ان کی طبیعت کبھی ہلکی سی بھی خراب ہوتی تو آن کے آن میں سارے بھائی ان کے کمرے میں جمع ہو جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ برتن جب دو ہوتے ہیں تو وہ بجتے ہیں؛ جب کہ یہاں درجنوں کی تعداد میں برتن تھے؛ مگر والد صاحبؒ اپنے اس انوکھے نظام کے ذریعہ برتنوں کے بجنے کے اس احتمال کو زمین سے لگا گئے، دست بدعا ہوں کہ اللہ سبحانہ وتعالی اس کو زمین سے لگائے رکھیں، اللّٰہم لاتفتنا بعدہ ولاتحرمنا اجرہ۔

الگ الگ کرنے کا دینی فائدہ

بھائیوں کو الگ الگ گھر دینے کے دینی اور دنیوی ہر دو فوائد ہم سبھی نے محسوس کیے، دنیوی فوائد تو طوالت کے پیش نظر قلم زد کیے جاتے ہیں؛ البتہ دینی فائدوں میں سے ایک بڑے فائدہ کا تذکرہ فائدے سے خالی نہیں، وہ یہ کہ بھابھیوں کو جو حفظ کی سعادت حاصل ہوئی اس سعادت کے حصول میں اس الگ الگ گھر کے نظام کا بھی بڑا کردار رہا، آج بحمد اللہ وہ خود حافظہ بن کر نہ صرف اپنی اولاد کو حافظ بنا چکی اور بنا رہی ہیں بلکہ محلّہ کے بچوں اور بچیوں کو بھی صحیح ادائیگی کے ساتھ ناظرہ خواں اور حافظ بنا کر والدین کے نامۂ عمل میں نیکیوں کے اضافہ کا موجب بن رہی ہیں، اس خامہ پرداز کی اہلیہ کو بھی شادی اور بچہ ہو جانے کے بعد اسی نظام کی برکت سے حفظ قرآن کریم کی سعادت حاصل ہوئی، اس کے بعد راقم کو پتہ بھی نہ چلا اور فقیر زادی کو بھی انھوں نے از خود حافظہ بنا دیا، جب راقم کی اہلیہ کا حفظ مکمل ہوا تو اس خوشی وسعادت کا اطلاعی مراسلہ خاص دوستوں کے ایک گروپ میں ارسال کیا گیا تھا دوستوں نے جہاں مبارک بادی اور دعاؤں سے نوازا، وہیں یہ سوال بھی کیا کہ آخر شادی اور بچے ہو جانے کے بعد خاتونِ خانہ کے لیے حفظ کر لینا کیسے ممکن ہوتا ہے؟ اس پر روشنی ڈالی جائے، جواب میں جو پوسٹ لکھ کر گروپ میں ارسال کی گئی تھی اسے افادۂ عام کے لیے یہاں نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں تاکہ والد صاحبؒ کے جاری کردہ اس نظام کے دینی فائدے کوئی سمیٹنا

چاہے تو وہ سمیٹ سکے، بالخصوص مدارس اسلامیہ کے وہ اساتذہ جو مدرسہ کی جانب سے فراہم کردہ فیملی کواٹرز میں رہتے ہیں، ان کے لیے یہ نظام بالخصوص مفید و نافع ہوسکتا ہے کہ یہ فیملی کواٹرز اور ہم بھائیوں کے مکانات ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں۔

’’سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ بندے کا اپنا چولہا ہو، گھر والوں سے ایک دم الگ۔ اپنا چولہا اپنی جلن۔ اپنا حقہ اپنی گڑگڑ۔ دوسرے نمبر پر ضروری ہے: صحیح ٹائمنگ، اور اس باب میں مدرسے کی ٹائمنگ سے بڑھ کر کوئی ٹائمنگ نہیں، بڑی بابرکت ٹائمنگ ہے یہ پرکھا تو جانا؛ چنانچہ ہم دارالعلوم کے گھنٹوں کو فولو کرتے ہیں، پہلے گھنٹے کی آواز آتے ہی پڑھائی شروع۔ آخری گھنٹہ لگتے ہی چھٹی۔ آیئے پڑھائی شروع کرتے ہیں۔ کہاں سے شروع کی جائے؟۔۔۔۔ چلئے مغرب سے شروع کرتے ہیں۔ مغرب بعد نیا سبق یاد کیا جاتا ہے عشا تک، اذان پر چھٹی، عشا کی اذان پر صرف پڑھائی سے چھٹی ہوتی ہے، امور خانہ سے نہیں۔ اذان کے بعد رات کے کھانے کی تیاری کرنی ہے، رات میں سالن نیا نہیں بنے گا، روٹی بھی ابھی نہیں بنے گی، وہ تو عصر میں بن جانی ہے، ہاں عشا کی اذان کے بعد سادہ سفید چاول ضرور بنائے جاسکتے ہیں جن کو بھیگنے کے لیے پہلے ہی رکھ دیا جاتا ہے، اذان کے آدھے گھنٹے بعد نماز ہونی ہے، نماز کے بعد کھانا کھایا جائے گا۔ واضح رہے کہ اگر آپ کا معمول مغرب بعد کھانا کھانے کا ہے تو اسے ضرور بالضرور تبدیل کرنا ہوگا۔ مغرب بعد کا وقت بڑا برکتی اور قیمتی ہے، اسے کھانے کی نذر نہیں کیا جاسکتا، رات کا کھانا کھا چکنے کے بعد پندرہ بیس منٹ ادھر ادھر گھوم کر کھانا ہضم کر لیں۔ اس کے بعد جلدی سو جانا ہے؛ تاکہ فجر میں اٹھنا آسان رہے، فجر میں اٹھ کر سبق تازہ کریں۔ بعد نماز فجر سبق سنایا جائے گا۔ سنانے کے بعد ناشتہ کی تیاری میں لگنا ہے، واضح رہے کہ ناشتہ کے لیے روٹیاں تازہ نہیں بنیں گی، باسی ہوں گی رات والی؛ بلکہ عصر والی، ناشتہ اسی باسی روٹی سے ہوگا، ہاں اگر سبق سنانے کے بعد آپ کو کافی وقت مل رہا ہو تو ضرور تازہ روٹیاں بنائی جاسکتی ہیں، ناشتہ سے فارغ ہو کر اگر بچے ہوں تو ان کو اسکول اور مدرسے کے لیے تیار کیا جائے گا۔ بچوں کو بھیج کر خود پڑھنے میں لگا جائے گا۔

پہلے گھنٹے سے چوتھے گھنٹے تک آموختہ یاد کیجیے۔ صبح میں آموختہ ہو کہ صبح میں وقت زیادہ ملتا ہے، شام میں سبقاً پارہ۔ جب آموختہ یاد ہو جائے یا یاد سا ہو جائے تو اس کو دہراتے وقت دوپہر کے سالن کے لیے پیاز لہسن سبزی وغیرہ ساتھ ساتھ کاٹ لیجیے۔ کپڑے بھی واشنگ مشین میں گھمائے جا سکتے ہیں۔ چوتھے گھنٹے کے آس پاس آموختہ سنایا جائے گا۔ سنانے کے بعد کھانے کی تیاری۔ واضح رہے دوپہر میں سالن اتنا بنانا ہے کہ وہ رات کو بھی چلے؛ بلکہ تھوڑا سا صبح ناشتے میں بھی، بارہ بجے تک ہر حال میں کھانا کھا لینا ہے۔ پھر قیلولہ نماز ظہر تک، نماز ظہر کے پندرہ منٹ بعد دار العلوم کا گھنٹہ لگتا ہے، گھنٹہ لگتے ہی پڑھائی شروع، سبقاً پارہ یاد کیجیے؛ چونکہ سبقاً پارہ ہے اس لیے نسبتاً جلدی یاد ہوگا، ایسے میں بچوں کے "ہوم ورک" میں تعاون بھی کر سکتے ہیں۔ عصر کی اذان کے آس پاس سبقا پارہ سنایا جائے گا، عصر کی نماز کے بعد رات کے کھانے کی روٹیاں بنانی ہیں، اور اتنی مقدار میں بنانی ہیں کہ وہ ناشتے میں بھی چلیں، روٹیوں کا بوجھ اگر زیادہ ہو رہا ہو تو سادہ چاول بھی روٹیوں کے ساتھ لگا لیں، کبھی طبیعت اگر ناساز ہو یا مہمانوں کے ساتھ گفتگو میں عصر بعد کا وقت چلا گیا ہو یا روٹیاں بنانے کا دل نہ کر رہا ہو تو روٹیاں اب بازار سے آئیں گی، اسی طرح مشکل سبق والے دن بھی روٹیاں یا پورا کھانا بازار سے آ سکتا ہے، عصر کے بعد مغرب آ گئی، مغرب ہی سے ہم نے آغاز کیا تھا، دن مکمل۔ معمول اور روٹین سے ہٹ کر جو کام ہیں جیسے سینا پرونا، گھر دھونا، کہیں آنا جانا، کسی کی دعوت کرنا، اس طرح کے امور یا تو عصر کے بعد انجام دیے جائیں گے، یا پھر جمعرات کے دن ظہر بعد سے جمعہ تک میں، یا پھر عورتوں کے اپنے مخصوص دنوں میں انجام دیے جائیں گے۔"

تقسیم میراث

والد محترم اپنے مزاج کے مطابق اپنی زندگی ہی میں بچوں کو خود کفیل بنا کر اپنی ذمہ داریوں کو کم کرتے چلے جا رہے تھے، اسی تناظر میں انھوں نے اپنی میراث اپنی حیات ہی میں تقسیم فرما دی، راقم سطور کی نظر میں تقسیم میراث کا یہ عمل بھی اسی درجہ اہم ہے جیسا اپنی اولاد

کو الگ الگ گھر بنا کر دینا۔ رشتہ داروں کی وفات پر والد صاحبؒ کا معمول ہم نے یہ دیکھا کہ وفات کے تین چار دن بعد وہ مرحوم کی میراث تقسیم فرما دیتے تھے، تازہ ترین میراث انھوں نے چار مہینے پہلے ہی ہمارے مرحوم بھائی: حافظ سعید احمد رحمہ اللہ کی تقسیم فرمائی تھی، قارئین کرام جانتے ہوں گے کہ گھر کے بڑے کے گزر جانے کے بعد اللّٰھم لاتفتنا بعدہ پڑھ پڑھ کر جس فتنہ سے بچنے کی، اور پس ماندگان کے درمیان اتحاد، یگانت اور بھائی چارگی کی دعا مانگی جاتی ہے، تقسیم میراث کا یہ عمل: اگر اس میں ذرا سی بھی اونچ نیچ رہ جائے تو اس اتحاد و یگانگت کو سبوتاژ کرنے کے لیے اکیلا ہی کافی ہوتا ہے، میراث میں مال و منال ہی نہیں، بعض دفعہ دل بھی تقسیم ہو جاتے ہیں، اللہ سبحانہ وتعالی والد صاحب کے درجات بلند فرمائیں کہ وہ دلوں کو تقسیم کرنے والے اس مشکل مرحلہ کو اپنی حیات ہی میں بحسن وخوبی انجام دے گئے۔ اپنی وفات سے ڈیڑھ دو سال پہلے اپنے سارے بچوں کو عید الاضحیٰ کی تعطیلات میں دیوبند بلایا، پھر ایک رات سب کو اپنے کمرے میں جمع کیا اور ذاتی خرچہ کی تکمیل کے مد میں کچھ مال روک کر باقی کل اثاثہ بچوں اور بچیوں کے درمیان ان کے شرعی حصے کے مطابق تقسیم فرما دیا، جہاں تقسیم سیدھے سیدھے ہو سکتی تھی وہاں تقسیم سیدھے سیدھے کی، جہاں وجہ ترجیح نہ تھی وہاں حصے قرعہ اندازی کی وساطت سے تقسیم فرمائے، یوں یہ مشکل مرحلہ حسن وخوبی کے ساتھ انجام پا گیا اور اس تقسیم پر کسی طرف سے آواز نہیں اٹھی۔ یہ اسی پیشگی تقسیم میراث کی برکت تھی کہ اپنی وفات سے پہلے کے آخری ہفتے میں والد صاحب نے دیوبند میں رہ جانے والے بچوں، گھر اور کاروبار کے بارے میں کوئی بات نہیں کی، ان کو آخری ہفتے میں صرف دو باتوں کی فکر تھی، ایک گٹھامن مدرسہ کا نیا مہتمم اور تعلیمی ذمہ دار کون ہو، اسی مرض الوفات میں انھوں نے رات ڈھائی بجے مدرسہ کے ایک قدیم استاذ وصدر مدرس مولانا محمد یوسف صاحب مدظلہ کو فون کر کے نئے مہتمم کی تعیین فرمائی اور آئندہ کا لائحہ عمل دیا۔ دوسری چیز تھی نماز، انتہائی نگہداشت کی یونٹ میں ہونے کی وجہ سے آخری ہفتہ میں ان کی چند نمازیں قضا ہوئیں، جب بھی وہ بات کرنے کی حالت میں ہوتے تو نہ صرف تیمار

داروں سے قضا شدہ نمازوں کی تعداد کے بارے میں استفسار فرماتے؛ بلکہ نہلانے اور ہسپتال کے ڈریس کے بجائے اپنے رواجی کپڑے پہنانے پر اصرار بھی کرتے تاکہ جو نمازیں قضا ہوئی ہیں ان کو ادا کرسکیں۔ دیوبند میں پیچھے رہ جانے والوں کے بارے میں اگر انھوں نے کوئی پیغام بھجوایا تو وہ صرف یہ تھا کہ بھائی (عم مکرم حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب دامت برکاتہم) کو سلام کہنا!

تعلیم و تربیت

حضرت والد صاحبؒ کثیر العیال تھے، دار العلوم دیوبند میں ترمذی، بخاری اور حجۃ اللہ البالغہ جیسی اہم اور وقیع کتابوں کی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے کاموں کی بے پناہ مصروفیت کے باوصف آپ نے سب بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ذاتی دلچسپیوں کی بنیاد پر انجام دی، تعلیم و تربیت کی یہ ذمہ داری آپ نے جو اپنی عملی زندگی کے آغاز سے انجام دینی شروع کی تو اسے تاحین حیات تیسری نسل تک انجام دیتے رہے، عملی زندگی کے آغاز میں ہمارے چچاؤں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دیا، اس تعلق سے تفصیل کی ضرورت نہیں کہ عم مکرم حضرت مولانا مفتی محمد امین پالن پوری صاحب دامت برکاتہم مرتب فتاوی واستاذ حدیث دار العلوم دیوبند تفصیل سے اس پر روشنی ڈال چکے، چچاوں کے بعد اولاد کا نمبر شروع ہوا تو ہمارے سب سے بڑے بھائی مفتی رشید احمد پالن پوری رحمہ اللہ کو حفظ کرانے کے ساتھ ساتھ ہماری والدہ ماجدہ رحمہا اللہ کو بھی حفظ کرادیا، والدہ محترمہؒ کو حفظ کرانا آپ کا ایک نہایت مفید و مستحسن فیصلہ رہا، والدہ محترمہؒ کی شکل میں ایسا معاون ملا کہ باقی دیگر اولاد کو حفظ کرانے میں والد صاحبؒ کی ریاضت کم ہوگئی، اس کے بعد والد صاحبؒ بچے کو بسم اللہ کراتے، باقی کا کام والدہ ماجدہؒ کا ہوتا جب ناظرہ قرآنِ پاک ختم ہوجاتا تو حفظ شروع کراتے، فجر کی نماز کے بعد ہی والد صاحب سبق سنتے، پھر آموختہ اور سبق کے پارے والدہ صاحبہ یاد کراتیں اور سنتیں کہتے ہیں کہ ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، ایسے میں یہ کیسے ممکن ہے کہ درجن بھر اولاد دماغی قوی کے تناظر میں برابر ہو، کمی بیشی ہونا فطری تھا اور وہ ہوا

بھی، ہم میں سے بعض ایسے تھے کہ اپنے مخصوص دماغی قوی کے ساتھ والد صاحبؒ کے پاس حفظ نہ کر پاتے، حفظ کے باب میں جس صبر وتحمل اور ضبط و برداشت کی ضرورت ہوتی ہے وہ صبر و برداشت عورتوں میں مردوں کی بہ نسبت اللہ سبحانہ وتعالی نے زیادہ ودیعت کیا ہے، پھر وہ عورت اگر ان بچوں کی ماں بھی ہو تو اس کے ضبط و برداشت کا مستوی اور بڑھ جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قوائے دماغی میں فرق ہونے کے باوصف والدہ ماجدہؒ سب کو حفظ کرا لے گئیں جب ہمارا قرآن بالکل تیار ہو جاتا تو دور کے لیے والد صاحبؒ کے پاس بھیجا جاتا، والد صاحبؒ بڑی توجہ سے دور سنتے، اگر بچہ ان کے طے کردہ معیار کے مطابق دور سنا دیتا تو اب وہ اس کو اردو پھر فارسی پڑھانا شروع کرتے، تختی پر لکھنا سکھاتے، یہاں سے والد صاحبؒ کا کام شروع ہو جاتا، اردو، فارسی اور عربی کی کتابیں نصاب کے مطابق وہ بذات خود پڑھاتے اگر کوئی آسان کتاب ان کے معیار پر نہ اترتی تو کتاب تصنیف فرماتے، آسان صرف آسان نحو اور آسان فارسی قواعد اس سلسلہ کی کڑیاں ہیں، ذاتی تدریس کے پہلو بہ پہلو معاونین کا تعاون بھی لیتے، حضرت الاستاذ مولانا مفتی خورشید انور گیاوی صاحب دامت برکاتہم ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا قاری شفیق الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم استاذ دار العلوم دیوبند اور حضرت مولانا ڈاکٹر اشتیاق احمد قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند مدظلہ تعاون و معاونت کی اسی سلسلۃ الذہب کی آب دار و بارونق کڑیاں ہیں، درجہ دوم عربی یا کبھی درجہ سوم عربی تک تعلیم دی جاتی، اس کے بعد دارالعلوم کے داخلہ امتحان میں شرکت کرائی جاتی، داخلہ ہو جانے کے بعد بچہ کے تعلیمی امور کی نگرانی فرماتے رہتے، درس گاہ کی حاضری اور ششماہی و سالانہ امتحانوں میں ملنے والے نمبر و فیصد پر نظر رکھتے، مدارس میں رائج نصاب کے دوش بدوش ہندی، انگلش اور حساب کے ضروری مضامین اور بنیادی کتب بھی پڑھاتے، پھر فارغ ہونے کے بعد بچہ کو برسر روزگار بھی خود فرماتے، جو مدرسے کی لائن کے ہوتے ان کو مدرسے میں لگاتے، جب کہ دیگر کو کاروبار اور تجارت میں جماتے؛ چونکہ والد صاحبؒ مدرس بھی تھے اور تاجر بھی، دونوں میدانوں کے وہ گرم و سرد چشیدہ تھے؛ اس لیے اپنے بچوں میں ہر دو طبقہ کو

ہر دو اعتبار سے ان کی عملی زندگی کے لائحہ عمل اور طریقِ کار بتاتے اور اپنی زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کی روشنی میں افادہ وفیض رسانی فرماتے رہتے تھے۔

عظمت و عبقریت

آج جب کہ ہم بھی صاحب اولاد ہو گئے ہیں، اور دو دو چار چار بچوں کی تعلیمی ذمہ داریاں سر پر آن پڑی ہیں تو حضرت والد صاحب رحمہ اللہ کی تعلیم و تربیت کے باب میں ان کی سرفروشانہ کوششوں اور جاں سوز جدوجہد کا اندازہ ہوتا ہے، کوئی اگر اپنی زندگی میں کچھ نہ کرے، درجن بھر اولاد کی صرف تعلیم و تربیت کا فریضہ خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے اور ان کو برسر روزگار کر کے اس حد تک خود کفیل بنا جائے کہ والد و مربی کے گزر جانے کے بعد وہ اولاد کسی کی دست نگر ومحتاج نہ رہے تو صرف یہ ایک بات ہی اس کے کمال و امتیاز کے لیے کافی ہے۔ کوئی اگر اپنی زندگی میں کچھ نہ کرے، صرف تدریس کی وادی کا طویل و پُر پیچ، خم دار و انتہائی دشوار راستہ اس انداز سے عبور کر جائے کہ وہ اکابر کے لیے بھی رشک بن جائے تو صرف یہ ایک بات ہی اس کی انفرادیت و یکتائی کے لیے کافی ہے۔ کوئی اگر اپنی زندگی میں کچھ نہ کرے صرف تصنیف و تالیف کے میدان میں کارہائے نمایاں اور علمی و تحقیقی مآثر و خدمات کے دوش بدوش اتنا کام کر جائے کہ کثرتِ نگارش کے تعلق سے وہ اپنی جماعت کے گنے چنے خوش نصیبوں میں شمار ہونے لگے، کثرت تصنیف کے تناظر میں اگر کوئی اسے اپنے دور کا ''حیوانِ کاتب'' کہے تو اِس کہنے والے پر مبالغہ آرائی و رنگ آمیزی کی تہمت ہرگز نہ لگے تو صرف یہ ایک بات ہی اس کے ممتاز و نمایاں ہونے کے لیے کافی ہے؛ لیکن اگر کسی شخص میں مذکورہ بالا سبھی اوصاف جمع ہو جائیں تو اس کی عظمت و عبقریت کا صرف اندازہ کیا جا سکتا ہے، اسے لفظوں کی گرفت میں نہیں لایا جا سکتا، اس کو کسی لفظی تعبیر کے ذریعہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ سچ ہے کہ قسام ازل نے والد محترمؒ میں عظمت و عبقریت اور کمال و امتیاز کے مذکورہ عناصر کے پہلو بہ پہلو اس طرح کے دیگر اور بہت سے عناصر جمع فرما دیے تھے، ذلك فضل الله يوتيه من يشاء۔

تربیت

والد محترمؒ کی شخصیت کے تناظر میں یہ باب مختلف الجہات اور کثیر شاخوں والا ہے جسے ایک مضمون میں سمیٹنا ممکن نہیں، اولاد کی تربیت کے باب میں آپ کتنے فکرمند واقع ہوئے تھے اس کا اندازہ لگانے کے لیے یہ بات ہی کافی ہے کہ دورۂ حدیث شریف میں سنن ترمذی اور صحیح بخاری کی عبارت خوانی (جسے عام طور سے رواروی کی ایک چیز گردانا جاتا ہے) کے لیے بھی والد صاحبؒ طلبہ کی تربیت فرماتے تھے، ہر کہ ومہ کو ان کے گھنٹے میں عبارت خوانی کا شرف حاصل نہ ہوتا تھا، پہلے عبارت خوانی کا طریقہ صحتِ اعراب اور رفتار سے لے کر انداز تک بتایا جاتا، اس کی روشنی میں خواہش مند طلبہ اپنا نام لکھواتے، پھر ان طلبہ کا اپنی بیٹھک میں ٹیسٹ لیتے، جو نہ چلنے والے ہوتے ان کا نام وہیں کٹ جاتا، جو چلنے والے ہوتے اور ان میں کچھ خامیاں دیکھتے تو اس کی نشاندہی کر کے اسے دور کرنے کی تلقین فرماتے، اس ٹیسٹ کو پاس کرنے والے طلبہ کے نام ایک کاغذ میں لکھے جاتے، پھر یہ فہرست ترجمان کو سونپی جاتی تھی، سونپے جانے کا مطلب یہ نہیں تھا اب ان طلبہ کا نام اس فہرست سے نکل نہیں سکتا، نہیں! پورے سال ان طلبہ کی نگرانی فرماتے، عبارت خوانی کے دوران نحوی صرفی اور تجویدی غلطیوں کی صورت میں یا طے کردہ معیار سے اِدھر اُدھر نکل جانے کی صورت میں نام کبھی بھی اس فہرست سے نکال دیا جاتا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو شخص عبارت خوانی جیسی غیر اہم سمجھی جانے والی چیز میں تربیت کا اتنا اہتمام کرتا تھا وہ اپنی اولاد کی تربیت جیسے اہم کام میں کہاں تک فکرمند رہتا ہوگا!؟ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ماتحتوں کی دینی و دنیوی ہر دو اعتبار سے تربیت میں تا بہ زیست کوشاں رہے اور اس تعلیم و تربیت کے باب میں انھوں نے اپنی سرفروشانہ کوششوں اور جاں سوز جہد و جہد میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، اس حوالے سے ان کے بہت سے واقعات مل جائیں گے، ان کی وفات کے بعد سوشل میڈیا پر آنے والے تعزیتی مضامین میں بھی بہتوں نے لکھے ہیں، ایک دو مجھ سے بھی سن لیجیے!

مدرسی کے زمانے میں میرا امتحان

عصر بعد کی کوئی مجلس تھی، یہ خامہ بردار بھی اس میں موجود تھا، مجلس میں سوال کرنے والا کوئی نہ تھا، قبرستان کا سا سناٹا، اس قسم کا سناٹا ہم جیسوں کے لیے بڑی آزمائش اور امتحان کی گھڑیاں لاتا کہ عام طور سے اس کے بعد والد صاحب کی طرف سے سوال آتا جو کہ خاصا مشکل ہوتا تھا۔ پوچھا: کون کونسی کتاب پڑھاتے ہو؟ کتابوں کے نام بتائے جن میں ایک نام شرح عقائد نسفی کا بھی تھا، پوچھا: شرح عقائد کتنی ہوئی؟ عرض کیا: اتنے صفحے! چند سیکنڈ خاموش رہے، اس کے بعد شرح عقائد کے ان صفحات میں سے جو پڑھائے جا چکے تھے کوئی عبارت زبانی پڑھی اور پوچھا کہ اس عبارت کا کیا مطلب ہے؟ اللہ اکبر کبیرا، یہ سطور لکھتے وقت اب بھی میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے، ان کا رعب اتنا ہوتا تھا کہ آج کے پڑھائے ہوئے سبق میں سے اگر وہ کسی عبارت کے بارے میں سوال کرتے تو زبان تالو سے جا چپکتی، چہ جائیکہ ہفتے اور مہینے پہلے پڑھائے ہوئے سبق کی کسی عبارت کے بارے میں سوال کرنا، جیسے دیگر مدرسین ویسے ہم بھی، پڑھایا اور بھلایا، جواب نہ آنے کے باعث وہ صورت حال سمجھ گئے، عبارت تو چھوڑ دی، پہلے تو خوب سنائی، اس کے بعد اپنی مشہور زمانہ نصیحت فرمائی کہ ”وقتی طور سے سبق حل کر کے پڑھانا کوئی کمال نہیں، یوں تو اگر بیس سال بھی ایک کتاب پڑھاؤ گے تو کتاب یاد نہیں ہوگی، مدرس کا کمال اس وقت ہے جب اس کو اپنی کتاب کے جملہ مباحث ایسے یاد ہوں کہ جب بھی اور جو بھی کتاب میں سے دریافت کرے تو وہ اسی وقت جواب دینے پر قادر ہو، شرح دیکھ کر یا پھر سے عبارت حل کر کے جواب دیا تو کیا جواب دیا“۔ اس کے بعد کتاب کے مضامین یاد رکھنے کے اپنے طریقے بھی بتائے، طریقے بھی وہ جن میں پتے پانی ہوتے ہیں۔

دیوبند کی مشہور چیز

یہ تو تھا خصوصی سوال، ایک عمومی سوال بھی سنیے! عصر بعد کی مجلس تھی، ہم طلبہ اس

میں شریک، والد محترمؒ حسب معمول نیم دراز، ایک طالب علم سر میں تیل رکھ رہا، آنکھیں بند طلبہ کی طرف سے ہلکے پھلکے سوالات جاری، اسی دوران والد محترمؒ نے ہمارے غیر اہم سوالات چھوڑ کر اپنی طرف سے ایک سوال اُچھالا: سنو! (قدرے خاموشی، سب طلبہ ہمہ تن گوش) ''ایک سوال ہے اس کا جواب دو!'' ایک آدمی دیوبند اپنے کسی کام سے آیا، ایک دو دن میں اس نے اپنا کام نمٹایا، آج شام کو اس کی واپسی کی گاڑی ہے، کچھ پیسے اس کے پاس بچ گئے ہیں، اس نے سوچا کہ واپس جاتے ہوئے ان اضافی پیسوں سے دیوبند کی کوئی مشہور چیز خریدتا چلوں؛ مگر اسے یہ معلوم نہیں کہ دیوبند کی مشہور چیز کیا ہے؟ وہ آپ کے پاس آیا ہے اور آپ سے کہہ رہا ہے کہ مجھے دیوبند کی مشہور چیز کے بارے میں بتاؤ! تاکہ میں اسے خرید سکوں۔ اب تم بتاؤ کہ اسے کیا چیز خریدواؤ گے؟ وہ آپ کے پاس آیا ہے اور آپ سے کہہ رہا ہے کہ مجھے دیوبند کی مشہور چیز کے بارے میں بتاؤ! تاکہ میں اسے خرید سکوں۔ اب تم بتاؤ کہ اسے کیا چیز خریدواؤ گے؟

ہم طلبہ نے اپنے دماغ میں ''دیوبند کی مشہور چیز'' کو سوچتے ہوئے جواب دینے شروع کیے، کسی نے کہا: حضرت فلاں ہوٹل کا حلوہ بہت مشہور ہے، حلوہ خریدوائیں گے۔ کسی نے کہا: حضرت دیوبند کے بیر بہت مشہور ہیں بیر خریدوائیں گے۔ کسی نے کہا: قاضی مسجد کے نیچے جو ''پلنگ توڑ'' ملتا ہے، وہ بہت زور دار ہوتا ہے، وہ خریدوائیں گے! والد محترمؒ ہر جواب کے بعد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اچھا اچھا کہہ رہے تھے، ایک صاحب نے کہا: حضرت پی پی خریدوائیں گے۔ والد محترمؒ نے وضاحت طلب کی کہ یہ پی پی کیا چیز ہے؟ مجیب نے وضاحت کی کہ حضرت یہ جو آپ کے محلے میں بنتی ہے، بچوں کا کھلونا، جسے بجاتے ہیں تو پی پی کی آواز نکلتی ہے۔ اس پر والد محترمؒ کھل کھلا کر ہنسے اور ماشاء اللہ کہا، ان کے ہنسنے سے اہلِ مجلس بھی ہنسے اور اس ماشاء اللہ کہنے نے بھٹکے ہوؤں کو اور بھٹکا دیا، سب سے زیادہ بھٹکے وہ جنھوں نے یہ پی پی والا جواب دیا، ان کو لگا کہ میں نے میدان مار لیا، انھوں نے ابھی ہی سے داد طلب نظروں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا، ہماری کم عقلیاں دیکھیے کہ اس

کے بعد تو ہم طلبہ نے خریدوانے کے لیے جن چیزوں کا انتخاب کیا ان کا معیار اور گرتا چلا گیا ان جوابوں میں کوشش یہ نظر آرہی تھی کہ ہم بھی حضرت کو ہنسائیں، والد محترمؒ اب اثبات میں صرف سر ہلا رہے تھے، زبان سے کچھ نہیں کہہ رہے تھے، ہم نے دیوبند کی مشہور چیز کے ذیل میں وہ وہ چیزیں خریدوادیں جو مشہور بھی نہیں تھیں، جب سب طلبہ اپنے اپنے حساب سے جواب دے چکے تو مجلس میں خاموشی ہوگئی، والد محترمؒ نے آنکھ کھولے بغیر پوچھا: کیا سب کے جواب ہوگئے؟ عرض کیا گیا: جی حضرت! .... پھر خاموشی، اشتیاق کے مارے تھوڑی دیر کی خاموشی بھی گھنٹوں کی خاموشی سی لگ رہی تھی، پی پی والے طالب علم نے از خود پوچھ بھی لیا کہ حضرت کونسا جواب سب سے صحیح رہا؟ پھر بھی خاموشی رہی، ہم طلبہ کان اور آنکھ دونوں ان پر جمائے ہوئے، کچھ دیر بعد آپ نے دایاں ہاتھ قدرے اٹھایا اور آنکھ کھولے بغیر ہی گویا ہوئے: ”بے قوفو! کتاب خروائیں گے، کتاب! .... کیا تم لوگ دیوبند کی مشہور چیزوں میں کتاب کو شامل نہیں مانو گے؟ دیوبند کتابوں کا مرکز ہے، حلووں، پلنگ توڑوں اور پپیوں میں تو تم لوگ گھسا رہے ہو، مگر کتاب خانہ میں نہیں لے جا رہے! اتنا کہا اور خاموش ہوگئے۔ یہ جواب سن کر ہم طلبہ ان کی بڑی سی میز کی آڑ میں سر جھکائے اپنی خفت مٹا رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ ہم کہاں خاک میں تھے اور سوال کرنے والا کہاں ثریا پر تھا، ہر چند کہ یہ جواب آپ نے بصارت کی آنکھ کھولے بغیر دیا تھا؛ مگر یہ جواب ہماری بصیرت کی آنکھیں کھول گیا، اب پتہ چلا کہ وہ جو ہنسنا اور ماشاء اللہ کہنا تھا وہ پیرایہ تبسم میں افسوس تھا، اسی سوال سے یہ سبق بھی ملا کہ ہم تو اصل جواب سے اتنا ہی دور تھے جتنا شِعریٰ ستارہ زمین سے دور ہے۔ اس سوال کے ذریعہ آپ نے ہمارا قِبلہ درست کیا اور ہماری ترجیحات میں علم اور متعلقاتِ علم کو سرِ فہرست رکھنے کا قیمتی سبق پڑھایا، اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے!

ڈرایا ھی ڈرایا

محلّہ کی مسجد کے امام صاحب کی طبیعت ناساز تھی، موذن صاحب والد صاحبؒ کی موجودگی میں مصلیٰ

پر جانے کو تیار نہ ہوئے، امام صاحب نے مجھ سے صورت حال بتا کر ایک دو دن کے لیے امامت کے فرائض انجام دینے کی گزارش کی، بندے نے قبول کر لی، فجر کی نماز میں راقم نے پہلی رکعت میں سورہ رحمٰن کے پہلے دو رکوع پڑھے، اور دوسری رکعت میں ائمہ کے عام معمول کے مطابق اذا الشّمس کورت پڑھی، سلام پھیرا، نماز ختم ہوئی، آیت الکرسی پڑھنے کے بقدر خاموشی رہی، اس کے بعد والد صاحبؒ نے فرمایا: تم نے ہمیں بس ڈرایا ہی ڈرایا، پہلی رکعت میں بھی ڈرایا، دوسری رکعت میں بھی ڈرایا، پہلی رکعت میں جہنم کی ہولناکیوں سے ڈرایا (سورہ رحمٰن کے دوسرے رکوع کی طرف اشارہ) دوسری رکعت کے لیے اٹھتے وقت ہم سوچ رہے تھے کہ اب تم تیسرے رکوع: ولمن خاف مقام ربہ جنتان سے، تسکین بخش وخوش کن جنت والا مضمون شروع کر کے اس ڈر کو کچھ کم کرو گے مگر تم نے اذا الشّمس کورت پڑھ کر ایک بار پھر ڈرایا، اس بار قیامت کی ہولناکیوں سے ڈرایا، پس تم نے ہمیں دونوں رکعتوں میں ڈرایا۔ یہ صحیح نہیں، قرآن کریم میں تقابلات چلتے ہیں، جہاں جہنم کا مضمون آتا ہے وہاں ساتھ ہی جنت کا بھی آتا ہے، جہاں ترغیب کا مضمون آتا ہے وہاں ساتھ ہی ترہیب کا بھی آتا ہے، ایک تقابل کے دونوں مضمون نماز میں پڑھنے چاہئیں، یا تو دوسری رکعت میں سورۂ رحمٰن کا تیسرا رکوع بھی پڑھتے، اور اگر دو ہی رکوع پڑھنے تھے تو بجائے الرحمٰن سے شروع کرنے کے کل من علیہا فان سے شروع کرتے۔

ایک سانس میں دو دو تین تین آیتیں

امام صاحب تعطیل عید الاضحیٰ میں گھر گئے ہوئے تھے، نمازوں کی ذمہ داری راقم آثم کے سپرد تھی، کسی امامِ حرم کے طرز کا اتباع کرتے ہوئے بندہ سورہ فاتحہ کی دو دو تین آیتیں ایک سانس میں پڑھ رہا تھا، دو تین نمازوں تک تو والد صاحب نے برداشت کیا، اگلے دن عشاء کی نماز کے ختم پر فرمایا: حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ سورہ؟ فاتحہ میں آیت کے بعد جواب دیتے ہیں صف میں بیٹھے بیٹھے مصلیان کرام کی طرف رخ کر پہلے اس حدیث کی وضاحت

فرمائی اور اللہ کی طرف سے دیے جانے والے جوابات سنائے، پھر راقم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: مگر تم نے قسم کھا رکھی ہے کہ اللہ کو بولنے نہیں دینا ہے، ایک سانس میں دو دو تین تین آیتیں پڑھ ڈالتے ہو! یہ صحیح نہیں ہے، آرام آرام سے پڑھو، ہر آیت پر ٹھہرو!

ولا الضالین کا مد

ایسے ہی کسی موقع پر سورۂ فاتحہ میں ایک اور چیز پر ٹوکا تھا، فرمایا: تمہارے سارے مد صحیح ہیں، مگر ولا الضالین میں معلوم نہیں تمہیں کیا ہو جاتا ہے کہ اسے اعتدال سے زیادہ کھینچتے ہو اور کھینچتے ہی چلے جاتے ہو، پہلے ولا الضالین میں ''ضا'' کو کھینچتے ہو، پھر ''لین'' کے ''لام'' میں وقت لگاتے ہو، اس کے بعد لین کو کھینچتے ہو، سب مل ملا کر اتنا کھینچتے ہو کہ پیچھے ہمارا منہ ''آمین'' کے لیے کھلا کا کھلا رہتا ہے، تم ختم کرو تو ہم آمین کہیں، تمہارا ہی ختم ہو کر نہیں دیتا ولا الضالین کے مد کو بھی دیگر مدوں کے برابر معتدل کرو۔

اولاد کو حج کرانا

والدین محترمین نے سب بچوں کی شادیاں جس اہتمام و ترتیب سے کیں اسی اہتمام سے ہم نے ان کو اپنے بچوں کو حج کراتے ہوئے بھی دیکھا، جب وہ بڑے لڑکے کو الگ کرتے تھے اور کچھ دنوں بعد اس کا گھر چلنے لگتا تھا تو اسے الگ بلا کر ہدایت کرتے تھے کہ خرچوں میں سے کچھ پس انداز کرو اور حج میں جانے کی رقم جمع کرو، تمہیں صرف اپنے حصہ کے بقدر حج کے پیسے جمع کرنے ہیں، تمہاری بیوی کے حصے کے پیسے میں دوں گا۔ فرماتے: حج میں بیوی کا ساتھ ہونا ضروری ہے، وہ بیچاری ساری زندگی خدمت کرتی ہے، بیوی جب زندگی کے سفر میں ساتھ ہے تو اس سفر میں بھی ساتھ رہنی چاہیے۔ یہ بھی فرماتے کہ حج کا مزا جوانی کے دنوں میں ہے، بھائیوں میں جو تدریسی فرائض انجام دے رہے ہوتے ان سے بالخصوص فرماتے تھے کہ تم لوگوں کا حج کرنا تو اور بھی ضروری ہے، حج کر لو گے تو حدیث وفقہ کی کتابوں میں آنے والا باب الحج پڑھانا آسان ہو جائے گا، طور نہ ٹامک ٹوئیاں مارو گے۔

عام طور سے دو دو بھائیوں کو ان کی بیویوں کے ساتھ بھیجتے تھے، بڑی بہن کو بھی اسی طرح ان کے شوہر کے ساتھ بھیجا، راقم سطور کی باری میں ہم تین بھائی ایک ساتھ تھے، دو بھائیوں نے تو حج کے پیسے مکمل جمع کر لیے تھے کہ اصلاً نمبر انھیں کا تھا، راقم چونکہ تدریسی خدمت انجام دینے لگا تھا اس لیے غالباً والد صاحبؒ نے مناسب سمجھا کہ اس کو بھی حج کرا دینا چاہیے، مجھے بلا کر کہا: تمہارے دو بڑے بھائی پیسے جمع کر چکے ہیں، تمہارے پاس اگر پیسے ہوں تو تم بھی ان کے ساتھ چلے جاؤ! عرض کیا کہ میرے پاس پیسے پورے نہیں! کتنے ہیں؟ ساٹھ ہزار کے آس پاس ہوں گے (ان دنوں ایک بندے کے سفر کا خرچ ۹۰ ہزار تھا، یہ سن ۲۰۰۷ کی بات ہے) فرمایا: تم بھی فارم بھر لو، تمہاری بیوی کا حصہ تو میں ڈال ہی رہا ہوں تمہارے حصے کے جو پیسے بچ رہے ہیں وہ بھی ڈالے دیتا ہوں، حج سے فارغ ہونے کے بعد ادا کرتے رہنا۔ یوں ہم تین بھائیوں نے ایک ساتھ حج ادا کیا۔ حج کے بعد جب ادھار والے پیسے جمع کر کے والد صاحبؒ کو دینے گیا تو آپ اپنی بیٹھک میں حسبِ معمول لکھنے میں مشغول تھے، ایک نظر میری طرف دیکھا اور پھر مسودہ کی طرف متوجہ ہو گئے، اسی کی طرف متوجہ رہتے ہوئے پوچھا کہ کیوں آئے ہو؟ عرض کیا کہ وہ پیسے جو آپ نے حج سے پہلے دیے تھے وہ لایا ہوں، فرمایا: اچھا، ٹھیک ہے، تمہی ان کو اپنے خرچوں میں لے آو!

حج میں جانے والے بیٹوں اور بہوؤں کو ایک نصیحت یہ بھی فرماتے کہ حج کے سفر میں مشکلات پیش آسکتی ہیں، اور جب مشکلات پیش آتی ہیں تو لوگ آپس میں لڑ پڑتے ہیں، حالات چاہے جیسے پیش آئیں تمہیں آپس میں لڑنا نہیں ہے، صبر کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالی والدین کے درجات بلند فرمائیں کہ ان کی مدد واعانت سے ہم کو بھرپور جوانی میں حج کی سعادت نصیب ہوگئی، حفظ قرآن کریم کے بعد یہ دوسری اہم ترین سعادت ہے جو والد صاحبؒ کی عنایتوں، نوازشوں اور توجہات کے طفیل ہم سب بھائیوں، بھابھیوں، بہنوں اور بہنوئیوں کو حاصل ہے۔ چھوٹے تین بھائی بہن (فاطمہ عبداللہ اور عبیداللہ) کا حج باقی ہے، عبداللہ بھائی کی تیاری مکمل ہے، سب بھائیوں نے طے

کیا ہے کہ ان سب کو بھی والد صاحبؒ کے طرز پر حج کرائیں گے، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں اور ہم سب میں اتحاد و اتفاق باقی رہے (آمین) حج کر کے معلوم ہوا کہ حج واقعی جوانی میں ہونا چاہیے، کاتب سطور کو سفرِ حج کے دس سال بعد اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے سفرِ عمرہ کی سعادت بھی حاصل ہوئی، اس سفر میں اہلیہ ساتھ نہیں تھیں تو اس میں یہ پتہ چل گیا کہ والد صاحبؒ کیوں بیوی کے ساتھ بھیجنے کا اہتمام فرماتے تھے!

صبر و استقامت

استقامت کے باب میں راقم سطور کی گناہ گار آنکھوں نے والد صاحبؒ سے بڑھ کر حالات پر صبر کرنے والا نہیں دیکھا، مشکل حالات میں نہ صرف وہ خود صبر کرتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی صبر کرنے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے لو لگانے کی تلقین فرماتے تھے، ہر چند کہ ان کے دل کا بڑا آپریشن ہو چکا تھا، اس طرح کے لوگوں کو کسی حادثہ کی خبر دینے سے پہلے خبر کا مضمون اور خبر دینے کا طور و ڈھنگ سوچنا پڑتا ہے کہ مبادا وہ خبر دلی صدمہ کا باعث بن جائے! مگر بحمد اللہ والد صاحبؒ کے تعلق سے اتنے اہتمام اور غور و فکر کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی ان کے ارد گرد لوگ ایک ایک کر کے اللہ کو پیارے ہو رہے تھے، اس طرح کی خبریں سن کر وہ کوئی بڑا صدمہ لینے کے بجائے آخرت کی اپنی تیاریوں کو اور بڑھا دیتے تھے، دارالعلوم دیوبند میں ان کے دیرینہ رفیق حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری صاحب رحمہ اللہ کا جب وصال ہوا تو والد صاحبؒ ان دنوں لندن میں تھے، یہ خبر والد صاحب کے لیے بڑی اندوہ ناک تھی، حسن بھائی آپ کے ساتھ تھے، ان کا بیان ہے کہ جب میں نے حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ کے انتقال کی خبر والد صاحبؒ کو دی تو وہ سن کر خاموش ہو گئے، کچھ دیر خاموش رہے پھر فرمایا: ''اب میرا نمبر ہے''۔ اسی خبر کے بعد والد صاحبؒ نے آخرت کے سفر کی تیاریوں کے تناظر میں میراث اپنی حیات ہی میں تقسیم فرمائی، نیز آسان بیان القرآن پر رات دن اتنی تیزی سے کام کیا کہ اپنے کمپیوٹر آپریٹر حسن بھائی کی ساری توانائیاں نچوڑ لیں کہ وہ داخلِ شفاخانہ کیے جانے کے قریب قریب پہنچ گئے۔

ذاتی نقصان کے قبیل کی اسی طرح کی ایک بڑی خبر: والد صاحبؒ کے دنیوی کاموں میں ان کے سب سے بڑے معین و مددگار، برادرم مولانا احمد سعید صاحب اور ہمشیرہ خورد کے خسر محترم، جامعہ نور العلوم گٹھامن کے بانی و مہتمم، گجرات کے سفر میں والد صاحبؒ کے واحد میزبان، ہم سب کے محسن: محمد چچا کے انتقال کی خبر بھی تھی، چچا مرحوم کی طبیعت ایک دو برس سے کافی تولہ ماشہ ہوتی رہتی تھی، ان کے تعلق سے فکرمندی رہتی تھی کہ اگر چچا کا انتقال والد صاحبؒ کی حیات میں ہوا تو خبر کس طور سے دی جائے گی، تکوینی طور سے ہوا یہ کہ ان کا انتقال ایک دم ہوا، انتقال سے قبل والی رات ہی میں ان سے ان کی صاحب زادی نے بات کی تھی، پس انتقال کی خبر اچانک آئی اور ایسے وقت میں آئی کہ گھر میں کوئی مرد بھی نہیں تھا پڑھانے والے بھائی اپنے اپنے مدرسوں میں تھے تو دکان والے اپنی دکان پر، خود والد صاحبؒ بھی بخاری کے گھنٹے کے لیے تیار بیٹھے تھے، اور چائے کے انتظار میں تھے، گجرات سے فون پر اطلاع دینے والوں نے پہلے نہ حضرت والد صاحبؒ کو اطلاع دی اور نہ چچا مرحوم کی صاحب زادی بیگم احمد سعید کو اطلاع دی، پہلی اطلاع بیگم قاسم کے پاس آئی، خبر اتنی بڑی تھی اور آنا فانا آئی تھی کہ انھوں نے بھائیوں کا انتظار نہیں کیا، بھابیوں کو ساتھ لے کر رندھے گلے اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ والد صاحبؒ کو اطلاع دی کہ محمد چچاؒ کا انتقال ہو گیا ہے، والد صاحب نے ا؟ نا للہ وا؟ نا ا؟ لیہ راجعون پڑھا، بھابیوں کو تسلی دی کہ اس میں رونے والی بات نہیں، سبھی کو اللہ کے پاس جانا ہے، کوئی پہلے جاتا ہے کوئی بعد میں، پھر گٹھامن، پالن پور چچا مرحوم کے گھر فون کیا، اس کے بعد مرحوم کی صاحب زادی بیگم احمد سعید کو بلوایا، ان کو ان کے والد صاحب کے گزر جانے کی اطلاع دی، ساتھ ہی چند کلمات تسلی بھی کہے اور یہ کہہ کر بخاری شریف کا گھنٹہ پڑھانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے کہ ابھی تو پڑھانے کے لیے جا رہا ہوں، واپس آؤں گا تو پالن پور جانے کے تعلق سے ترتیب بناؤں گا حسبِ معمول آپ نے گھنٹہ پڑھایا اور چچا مرحوم کے لیے دعا بھی کرائی، جس خبر میں ہمیں والد صاحبؒ کے آپریشن اور عمر کی فکر تھی اسی خبر میں والد صاحبؒ ہماری فکر کر کے ہمیں کلمات تسلی

اور صبر کی تلقین فرمارہے تھے۔

ورق تمام ہوا اور مدعا باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

یہ ایک مضمون کسی بھی طور والد محترمؒ حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری صاحب رحمہ اللہ تعالی رحمۃ واسعہ سابق شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی گھریلو زندگی کے نوع بنوع احوال کے احاطہ کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ دست بدعا ہوں کہ اللہ سبحانہ وتعالی والد محترمؒ کے درجات بلند فرمائیں اور ہمیں ان کے بتائے رہنما خطوط، طریق کار اور لائحہ عمل کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق ارزانی سے بہرہ ور فرمائیں۔ ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد!

عالم اسلام کے بلند پایہ محدث

استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ

شیخ الحدیث و صدر المدرسین دار العلوم دیوبند

حضرت مولانا مفتی ریاست علی قاسمی رام پوری

استاذ حدیث ومفتی جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ

عالم اسلام کے بلند پایہ محدث، محقق دوراں، ممتاز فقیہ اور مفتی، فکر نانوتوی کے امین، علوم شریعت کے نکتہ داں، علوم اکابر کے ترجمان، علوم ولی اللہی کے شارح، ہزار ہا ہزار علماء، ارباب افتاء، اصحاب تدریس اور مصنفین ومؤلفین، ادباء کے استاذ اور مربی، نابغۂ روزگار بلکہ یکتائے روزگار شخصیت، لاکھوں عوام وخواص کے قلوب کی دھڑکن، ملت اسلامیہ کے عظیم سرمایہ، جامع علوم وفنون، ازہر الہند ام المدارس دار العلوم دیوبند کے عظیم سپوت اور مسند صدارت تدریس اور عہدہ شیخ الحدیث کے تاجور، بے شمار محاسن وکمالات سے متصف بزرگ عالم دین، استاذ الاساتذہ والعلماء والفقہاء حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری نور اللہ مرقدہٗ و برد اللہ مضجعہ، آج مؤرخہ ۲۵؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹؍مئی ۲۰۲۰ء بروز منگل صبح سات بجے کے قریب نماز اشراق کے وقت اپنی حیات سعید کی اسی بہاریں مکمل کر کے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اور آپ وہاں تشریف لے گئے یہاں ہر متنفس کو جانا ہے۔ انا لله و انا اليه راجعون، ان لله ما اعطى وله ما اخذ و كل عنده باجل مسمى فلتصبر ولتحتسب۔

اللّٰهم اغفرلهٗ، وارحمه، واكرم نزلهٗ، و وسع مدخلهٗ، واجعل الجنة مثواه، وادخلهُ بحبوحة الجنة، واغسله بالماء والثلج، و نقهٖ من الذنوب

والخطايا كما ينقى الثوب الابيض من الدنس، اللهم ابدله دارا خيرا من داره، واهلا خيرا من اهله، اللهم اعذه من عذاب القبر وعذاب النار، و ادخله الجنة جنت الفردوس، و ارفع درجته فى عليين، والهم ذويه الصبر والسلوان والاجر والغفران.

نام و نسب ، وطن، خاندان اور ولادت

آپ کا وطن موضع کالیڑہ ضلع بناس کانٹھا شمالی گجرات ہے، بناس ندی کا نام ہے اور کانٹھا گجراتی زبان میں کنارہ کو کہتے ہیں، بناس کانٹھا ایک علاقہ کا نام ہے جو اس وقت صوبہ گجرات کا ایک ضلع ہے اور بناس ندی کے جنوب میں واقع ہے، اس ضلع کا مرکزی شہر پالن پور ہے جو آزادی سے پہلے ایک مسلم ریاست تھی اور مسلمان نواب اس کا حکمراں اور والی تھا، اسی مرکزی شہر کی جانب نسبت کرتے ہوئے آپ کو پالن پوری کہا اور لکھا جاتا ہے۔ آپ کا آبائی وطن کالیڑہ پالن پور شہر سے تیس میل کے فاصلہ جنوب مشرق میں واقع ہے، کالیڑہ پالن پور ضلع کی مشہور بستی ہے، اس بستی میں ’’سلم العلوم‘‘ نام سے ایک مدرسہ قائم ہے جس میں متوسطات تک عربی کی تعلیم ہوتی ہے۔ آپ مومن برادری سے تعلق رکھتے ہیں جس کو غالباً گجراتی زبان میں چلیہ برادری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس علاقہ میں آپ کا خاندان ڈھکا کہلاتا ہے۔

آپ کی ولادت کے بعد آپ کے والدین نے آپ کا نام احمد تجویز فرمایا اور آپ کے خاندان کے بوڑھے لوگ پوری زندگی آپ کو احمد بھائی کہہ کر پکارتے رہے، اگرچہ اب ایسے بوڑھے دو چار ہی ہوں گے مگر آپ نے خود اپنا نام سعید احمد رکھا اور مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور میں داخلہ کے وقت داخلہ فارم میں آپ نے سعید احمد نام لکھوایا تھا اور آج عالم اسلام میں اسی سعید احمد نام کو شہرت و دوام حاصل ہے؛ لیکن مظاہر علوم داخلہ سے پہلے سابقہ مدارس میں آپ کا نام احمد ہی مرقوم ہے اور مدارس اسلامیہ سے حاصل شدہ انعامی کتابوں

میں انعام یوسف کالیڑہ لکھا ہوا ہے۔ آپ کے والد کا نام یوسف دادا کا نام علی جو احتراماً ’’علی جی‘‘ کہلاتے تھے، پردادا کا نام جیوا بمعنیٰ یحییٰ اور پردادا کے والد کا نام نور محمد ہے خود آپ نے اپنے احوال میں اپنا سلسلۂ نسب اس طرح تحریر فرمایا ہے:

خاکپائے علماء سعید احمد بن یوسف بن علی بن جیوا بن نور محمد پالن پوری گجراتی ثم دیوبندی۔ آپ کی تاریخ ولادت محفوظ نہیں ہے مگر آپ کے والد محترم نے اندازے سے آپ کی تاریخ ولادت ۱۹۴۰ء کا آخر مطابق ۱۳۶۰ھ بتلائی ہے اور اسی تاریخ کو مدارس اسلامیہ میں داخلہ کے وقت داخلہ فارم میں لکھوایا ہے۔

تعلیم و تربیت کا آغاز

جب آپ کی عمر پانچ چھ سال کی ہوئی تو والد محترم محمد یوسف جوڈ بھاڈ کے جنگل میں رہتے تھے، آپ کی تعلیم کا آغاز فرمایا مگر کھیتی کے کاموں میں زیادہ مصروفیت کی وجہ سے والد صاحب آپ کی تعلیم کی جانب زیادہ توجہ نہیں دے سکتے تھے، اس لیے کالیڑہ کے مکتب میں آپ کا داخلہ کرایا اور قرآن کریم ناظرہ اور ریاضی، حساب وغیرہ ابتدائی تعلیم اس مکتب میں مکمل ہوئی۔ آپ کے مکتب کے اساتذہ کرام میں مولانا محمد داؤد صاحب چودھری، مولانا حبیب اللہ چودھری اور حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب جونکیہ قابل ذکر ہیں۔

دارالعلوم چھابی گجرات میں داخلہ

مکتب کی تعلیم مکمل کر کے آپ اپنے ماموں حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب شیرا نور اللہ مرقدہٗ کے ہمراہ دارالعلوم چھابی تشریف لے گئے اور دارالعلوم چھابی میں داخلہ لے کر اپنے ماموں اور دوسرے اساتذہ کرام سے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ دارالعلوم چھابی میں آپ کا قیام تقریباً چھ ماہ رہا۔ اس کے بعد آپ کے ماموں دارالعلوم چھابی چھوڑ کر اپنے وطن تشریف لے گئے تو آپ بھی اپنے ماموں کے ہمراہ آ گئے اور اپنے ننھیال ’’جونی سیندھنی‘‘ میں رہ کر اپنے ماموں سے فارسی کی کتابیں پڑھتے رہے۔

پالن پور میں داخلہ

اس کے بعد مصلح الامت حضرت مولانا محمد نذیر میاں صاحب پالن پوری قدس سرہٗ کے مدرسہ واقع شہر پالن پور میں داخلہ لیا، یہاں آپ نے چار سال قیام کیا اور مکمل محنت و جفاکشی کے ساتھ ابتدائی عربی و فارسی سے شرح جامی تک جملہ علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں پالن پور کے قابل ذکر اساتذہ کرام میں حضرت مولانا محمد ہاشم بخاری صاحب نور اللہ مرقدہٗ سابق استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند (موصوف دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہونے سے پہلے گجرات میں تدریسی خدمات انجام دیتے تھے) اور حضرت مولانا مفتی محمد اکبر میاں صاحب پالن پوری برادر خورد مولانا محمد نذیر میاں صاحب پالن پوریؒ قابل ذکر ہیں۔

مظاہر علوم سہارن پور میں داخلہ

پالن پور شہر میں شرح جامی تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد تعلیمی سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے ۱۳۷۷ھ میں مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور میں داخلہ لیا خود راقم السطور سے حضرت والا نے ایک موقع پر سہارن پور داخلہ کا واقعہ اس طرح بیان فرمایا کہ حضرت مولانا محمد ہاشم بخاری صاحبؒ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد پالن پور تدریسی خدمات کے لیے جب تشریف لائے تو دارالعلوم دیوبند کی خدمات اور اکابرین دارالعلوم دیوبند کے واقعات بہت اہمیت اور دلچسپی کے ساتھ بیان فرماتے تھے، جس کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند کی عظمت کے نقوش عوام وخواص کے قلوب پر جاگزیں ہوگئے تھے۔ اس وجہ سے والد صاحب دارالعلوم دیوبند داخلہ کے ارادہ سے گھر سے سفر کے لیے نکلے۔ جب ریل دہلی سے دیوبند کے لیے چلی تو والد صاحب کو کوئی صاحب ٹرین میں ملے، انہوں نے والد صاحب سے بتایا کہ ابتدائی اور متوسط درجات کی تعلیم دیوبند کے بجائے سہارن پور اچھی ہوتی ہے، آپ اپنے فرزند کو اولاً سہارن پور داخل کرائیں اور انتہائی درجات کی تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند داخل کرا دینا پھر والد صاحب کا ارادہ بدلا اور دیوبند کے بجائے سہارن پور مدرسہ مظاہر علوم میں داخلہ کرا دیا

مظاہر علوم سہارن پور داخلہ کے بعد آپ نے تین سال تک قیام کیا، یہاں آپ نے منطق و فلسفہ، نحو وصرف اور فصاحت و بلاغت اور فنون کی تمام کتابیں انتہائی محنت اور جانفشانی سے پڑھیں۔ اکثر کتابیں امام النحو والمنطق حضرت مولانا علامہ صدیق احمد صاحب کشمیری نوراللہ مرقدہٗ سے تعلیمی گھنٹوں میں اور خارج اوقات میں پڑھیں۔ علامہ محمد صدیق احمد کشمیری کے علاوہ مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور کے دیگر قابل ذکر اساتذہ کرام میں حضرت مولانا محمد یامین صاحب سہارن پوریؒ، حضرت مولانا مفتی یحییٰ صاحب سہارن پوریؒ (والد ماجد حضرت مولانا محمد سلمان صاحب مظاہری موجودہ ناظم مدرسہ مظاہر علوم) حضرت مولانا وقار علی صاحب بجنوری، حضرت مولانا مفتی عبدالعزیز صاحب رائے پوری شامل ہیں۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ

مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور میں تین سال قیام کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۳۸۰ھ مطابق ۱۹۶۰ء میں آپ نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، دارالعلوم دیوبند داخلہ کے بعد پہلے سال حضرت الاساتذہ مولانا نصیر احمد خاں صاحب بلندشہری نوراللہ مرقدہٗ سابق صدرالمدرین و شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند سے آپ نے جلالین شریف، الفوزالکبیر، حضرت مولانا میاں اختر حسین صاحب دیوبندیؒ سے ہدایہ اولین اور حضرت مولانا بشیر احمد خاں صاحب بلندشہریؒ سے تصریح بست باب، شرح چغمینی رسالہ فتحیہ اور رسالہ شمشیہ علم ہیئت کی کتابیں پڑھیں اور دوسرے سال مشکوۃ شریف، ہدایہ آخرین اور تفسیر بیضاوی وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد تیسرے سال شوال ۱۳۸۱ھ تا شعبان ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء دورۂ حدیث شریف میں داخل ہو کر صحاح ستہ پڑھ کر درس نظامی کے نصاب کی تکمیل فرمائی اور باضابطہ فارغ التحصیل قرار پائے۔

دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ کرام

دارالعلوم دیوبند میں علوم نبوت کے جن درخشندہ ستاروں سے آپ نے اکتساب فیض کیا ان کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب ہاپوڑ ثم مرادآبادی شیخ الحدیث

دارالعلوم دیوبند، جامع معقول ومنقول حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا سید فخرالحسن صاحب مرادآبادیؒ، حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہانپوریؒ، حضرت مولانا محمد ظہور صاحب عثمانی دیوبندیؒ، حضرت مولانا جلیل احمد صاحب کیرانویؒ، حضرت مولانا اسلام الحق صاحب اعظمیؒ، حضرت مولانا سید اختر حسین صاحب دیوبندیؒ، حضرت مولانا بشیر احمد صاحب بلندشہریؒ، حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب بلندشہریؒ، حضرت مولانا عبدالاحد صاحب دیوبندیؒ، حضرت مولانا معراج الحسن صاحب دیوبندیؒ، شیخ محمود عبدالوہاب محمود مصری قدس سرہٗ۔

آپ نے خود اپنی کتاب ''مشاہیر محدثین وفقہاء کرام'' میں دارالعلوم دیوبند میں خواندہ اسباق کی تفصیل اس طرح فرمائی ہے:

بخاری شریف حضرت فخرالمحدثین مولانا سید فخرالدین صاحب مرادآبادی سے مقدمہ مسلم، مسلم شریف، کتاب الایمان، ترمذی شریف جلد اول، علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ سے، مسلم شریف کا باقی حصہ حضرت مولانا بشیر احمد خاں صاحب بلندشہریؒ سے، ابوداؤد شریف مکمل، ترمذی شریف جلد ثانی، شمائل ترمذی حضرت مولانا سید فخرالحسن صاحب مرادآبادیؒ سے، نسائی شریف، مولانا محمد ظہور صاحب عثمانی دیوبندیؒ سے، طحاوی شریف مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہانپوریؒ سے، موطا امام مالک حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ سے، مؤطا امام محمد حضرت مولانا عبدالاحد صاحب دیوبندیؒ سے، مشکوۃ شریف اولاً مولانا سید حسن دیوبندیؒ سے اور ان کی وفات کے بعد جلد اوّل حضرت مولانا سید جلیل احمد کیرانویؒ اور جلد ثانی حضرت مولانا اسلام الحق صاحب اعظمیؒ سے پڑھی۔ دیگر کتابوں کی تفصیل حضرت والا نے اپنے قلم سے نہیں لکھی ہے۔

آپ بچپن ہی سے انتہائی زیرک وہوشیار اور اعلیٰ درجہ کے ذہین وفطین تھے، کتب بینی اور محنت کرنے کے عادی تھے، پھر مثالی اساتذ کرام کی تعلیم وتربیت اس پر مستزاد جس کی

وجہ سے آپ کی صلاحیت واستعداد بام عروج پر پہنچ چکی تھی اوراسی صلاحیت واستعداداورمحنت وجفاکشی کے نتیجہ میں دارالعلوم جیسی معیاری عظیم دینی درس گاہ کے سالانہ امتحان میں دورۂ حدیث شریف میں آپ اعلیٰ نمبرات اور اولا پوزیشن سے کامیاب ہوئے اور علاوہ مسلم شریف کے دورۂ حدیث شریف کی تمام کتابوں میں آپ کے نمبرات پچاس تھے، صرف مسلم شریف میں ۴۵ نمبرات تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی جانب سے خصوصی انعام میں آپ کو تفسیر بیان القرآن مکمل اور عمومی انعام میں شرح عقائد نسفی ملاحسن اور قرآن کریم مجلد دیا گیا۔

دارالافتاء دارالعلوم میں داخلہ

شوال ۱۳۸۲ھ میں آپ نے دارالافتاء میں داخلہ کی درخواست پیش کی اور یکم ذی قعدہ ۱۳۸۲ھ کو دارالافتاء میں آپ کا داخلہ مکمل ہوگیا اوراس وقت کے صدر مفتی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہانپوری قدس سرہٗ کی نگرانی میں کتب فقہ کا مطالعہ اورفتویٰ نویسی کی مشق کا آغاز فرمادیا اور پورے سال میں صرف ایک کتاب شرح عقود رسم المفتی کا درس حضرت مفتی صاحب مذکور الصدر کے پاس ہوا ورنہ تمام اوقات صرف کتب فقہ و فتاویٰ کا مطالعہ، استخراج مسائل اور فتویٰ نویسی کی مشق وتمرین میں مصروف رہتے تھے۔ اس سال آپ نے شیخ محمود عبدالوہاب محمود مصری استاذ دارالعلوم دیوبند سے حفظ شروع کیا جو قرآن کریم کے جید حافظ اور مصری قاری تھے اور جامعۃ الازہر قاہرہ کی طرف سے دارالعلوم دیوبند تدریس کے لیے مبعوث تھے۔ اس طرح آپ نے اپنے بھائیوں کی تعلیم وتربیت کی جانب توجہ فرمائی اور ۱۳۸۲ھ میں مولانا مفتی محمد امین صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند صغرسنی ہی میں دیوبند لاکر حفظ شروع کرادیا اولاً قاری محمد کامل صاحب دیوبندی کی درس گاہ میں بٹھایا اور جب وہاں نہیں چل سکے تو خود ہی حفظ کرایا۔ یہ سال آپ کا بیحد مصروف تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے جملہ امور مفوضہ کے ساتھ خود اپنا حفظ کرنا اور چھوٹے بھائی مفتی محمد امین صاحب کو حفظ کرانا حد درجہ محنت طلب کام تھا۔ اسی مصروفیات کی وجہ سے ماہ رمضان میں وطن بھی نہیں گئے۔

دارالافتاء کے داخلہ میں مزید ایک سال کی توسیع

شوال ۱۳۸۳ھ، شعبان ۱۳۸۴ھ میں افتاء کمیٹی نے آپ کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے دارالافتاء کے داخلہ کی توسیع کر دی اور آپ کو مزید ایک سال دارالافتاء دارالعلوم دیوبند میں استفادہ کرنے اور اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو پختہ کرنے کا موقع ملا تو اس سال آپ نے دوسرے بھائی مولوی عبدالمجید کو بھی دارالعلوم دیوبند میں بلایا اور ان کو فارسی کتابیں پڑھانی شروع کر دیں، اس سال آپ کی مصروفیات میں حد درجہ اضافہ ہو گیا خود فتویٰ نویسی کی مشق کرتے تھے، خود اپنا حافظ کرتے تھے اور دونوں بھائیوں کو بھی پوری ذمہ داری کے ساتھ پڑھاتے تھے اور اس قدر محنت فرمائی کہ چھ ماہ بعد معین مفتی کے لیے آپ کا تقرر کر دیا۔ اس کے بعد دارالافتاء میں مستقل تقرر کی بات بھی چلی اور اس کے لیے ابتدائی کارروائی بھی عمل میں آئی مگر بعض خاص حالات کی وجہ سے وہ کارروائی آگے نہ بڑھ سکی۔ آپ کے مربی و مشفق استاذ حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ کو اس کا صدمہ بھی ہوا مگر حضرت علامہؒ نے فرمایا صبر کرو ان شاء اللہ جلد ہی دوبارہ دارالعلوم شان و شوکت سے آؤ گے۔

دارالعلوم اشرفیہ راندیر میں تقرر

شوال ۱۳۸۴ھ میں حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ کے توسط سے دارالعلوم اشرفیہ راندیر ضلع سورت گجرات میں آپ کا درجہ علیا کے استاذ کی حیثیت سے تقرر ہو گیا اور آپ ۲۱؍ شوال ۱۳۸۴ھ کو دارالعلوم دیوبند سے اولاً وطن تشریف لے گئے اور والدین و اہل خاندان کی زیارت سے مشرف ہوئے اس کے بعد مفتی محمد امین صاحب، مولانا عبدالمجید صاحب جو دونوں دارالعلوم دیوبند میں آپ سے پڑھتے تھے اور تیسرے بھائی مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کو لے کر راندیر تشریف لے گئے اور جامعہ اشرفیہ راندیر میں تدریس کا آغاز فرمایا۔

ذیقعدہ ۱۳۸۴ھ تا شعبان ۱۳۹۳ھ مکمل ۹؍ سال تک آپ نے دارالعلوم اشرفیہ راندیر گجرات میں تدریسی خدمات انجام دیں اور ساتھ ہی تصنیف و تالیف کے کام میں بھی

مصروف رہے۔ نو سالہ قیام کے دوران آپ نے دار العلوم اشرفیہ میں ابوداؤد شریف، ترمذی شریف، طحاوی شریف، شمائل ترمذی، مؤطین، نسائی شریف، ابن ماجہ شریف، مشکوۃ شریف، جلالین شریف، الفوز الکبیر، ترجمہ قرآن کریم، ہدایہ آخرین، شرح عقائد نسفی اور حسامی وغیرہ مختلف کتابیں پڑھائیں؛ نیز اسی زمانہ میں آپ نے متعدد کتابیں ”داڑھی اور انبیاء کی سنتیں“، ”حرمت مصاہرت“، ”العون الکبیر عربی شرح الفوز الکبیر“ اور شیخ محمد بن طاہر پٹنیؒ کی کتاب ”المغنی“ کی عربی شرح ”تہذیب المغنی“ تصنیف فرمائیں۔ اول الذکر تینوں کتابیں شائع شدہ ہیں البتہ تیسری کتاب ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اسی زمانہ میں حجۃ الاسلام قاسم العلوم والمعارف بانی دار العلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے علوم و معارف اور ان کی کتابوں کی تسہیل وتشریح کا آغاز فرمایا اور افادات نانوتویؒ کے نام سے تفصیلی مضمون ارقام فرمایا جو ماہنامہ ”الفرقان“ میں قسط وار شائع ہوا۔ آپ کے دار العلوم اشرفیہ راندیر گجرات کے ممتاز اور قابل فخر شاگردوں میں گجرات کے مفتیٔ اعظم مشہور شیخ طریقت حضرت مولانا مفتی احمد خان پوری صاحب دامت برکاتہم شیخ الحدیث جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل ورُکنِ شوریٰ دار العلوم دیوبند ہیں۔

دار العلوم دیوبند میں تقرر

اکابر واساتذہ کے مشورہ اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب قدس سرہٗ رکن شوریٰ دار العلوم دیوبند کی تجویز وتحریک پر مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند منعقدہ شعبان ۱۳۹۳ھ میں دار العلوم دیوبند نے تدریس کے لیے آپ کا تقرر منظور فرمایا اور شعبان ۱۳۹۳ھ ہی میں آپ کو تحریری اطلاع دے دی گئی اور شوال ۱۳۹۳ھ کو آپ دار العلوم دیوبند مدرس وسطی کی حیثیت سے تشریف لے آئے اور تدریسی کام کا آغاز فرمادیا۔

دار العلوم دیوبند میں وسیع خدمات

شوال ۱۳۹۳ھ تا شعبان ۱۴۴۱ھ مکمل اڑتالیس سال تک مکمل انہماک، یکسوئی اور ذمہ داری کے ساتھ آپ نے دار العلوم دیوبند سے وابستہ رہ کر درس وتدریس، تصنیف و

تالیف اور دوسری علمی خدمات انجام دیں۔ اس اڑتالیس سالہ دور میں آپ نے معقولات میں سلم العلوم، ہدیہ سعیدیہ، ملا حسن ، میبذی، عقائد و علم کلام شرح عقائد، مسامرہ عقیدۃ الطحاوی، اصول فقہ میں حسامی و مسلم الثبوت، عربی ادب میں دیوان متنبیؔ، حماسہ، سبعہ معلقہ، فقہ میں ہدایہ اولین، ہدایہ آخرین (تمام ہی جلدیں) تفسیر و اصول تفسیر میں جلالین شریف، بیضاوی شریف سورۂ بقرہ، تفسیر مدراک (پارہ ۶، ۱۰) تفسیر مظہری (پارہ ۱۶ تا ۲۰) بیضاوی شریف (پارہ ۲۱ تا ۲۵)، (پارہ ۲۶ تا ۳۰)، مناظرہ میں رشیدیہ، اصول حدیث میں شرح نخبۃ الفکر، مقدمہ ابن صلاح حدیث شریف میں مشکوۃ شریف، صحاح ستہ کی تمام کتابیں بشمول طحاوی شریف، شمائل ترمذی اور موطا امام مالک اور موطا امام محمد پڑھائیں، سب سے زیادہ ترمذی شریف جلد اول طحاوی شریف، بخاری شریف جلد اول پڑھائی۔

صدرالمدرسین اور شیخ الحدیث کے لیے انتخاب

استاذ الاساتذہ حضرت الاستاذ مولانا نصیر احمد خاں صاحب بلند شہری قدس سرہٗ سابق صدرالمدرسین و شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی علالت کے بعد ۱۴۲۹ھ میں آپ کو عارضی طور سے شیخ الحدیث منتخب کر کے بخاری شریف جلد اول کا درس آپ سے متعلق کیا گیا اگرچہ اس سے پہلے بھی حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کی علالت و اعذار کی وجہ سے متعدد مرتبہ آپ نے بخاری شریف کا درس دیا ہے پھر اسی سال مجلس شوریٰ میں آپ کو مستقل طور سے عہدۂ شیخ الحدیث و صدرالمدرسین تفویض کیا گیا جس پر تاحیات مسلسل بارہ سال تک متمکن رہے۔

سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے   آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

دارالعلوم دیوبند میں دیگر ذمہ داریاں

دارالعلوم دیوبند میں تعلیمی و تدریسی خدمات کے ساتھ دوسری خدمات بھی آپ نے پوری ذمہ داری کے ساتھ انجام دی ہیں۔ ۱۳۹۵ھ اور اس کے بعد ۱۴۰۲ھ میں مفتیان دارالعلوم دیوبند کے اپنے اعذار کی وجہ سے طویل رخصتوں پر تشریف لے جانے کی وجہ سے دارالافتاء کی عارضی نگرانی اور ذمہ داری آپ کو تفویض کی گئی اور آپ نے پوری ذمہ داری

کیساتھ استفاءات کے جوابات تحریر فرمائے جو دارالافتاء کے ریکارڈ میں موجود ہیں۔ اسی طرح ۱۴۰۷ھ میں دارالعلوم دیوبند میں تحفظ ختم نبوت کے عنوان سے عالمی اجلاس منعقد ہوا جس میں ہندوستان کے علاوہ بیرون ہند دوسرے ممالک سے بھی مندوبین نے شرکت فرمائی، رابطہ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف نے بھی اجلاس کی غیر معمولی اہمیت کی وجہ سے بطور خاص شرکت فرمائی اور وہ اجلاس توقع سے زیادہ کامیاب رہا اس کے بعد قادیانیت کے تعاقب کے لیے باقاعدہ مجلس تحفظ ختم نبوت کے نام سے ایک شعبہ دارالعلوم دیوبند میں قائم کیا گیا تو اس شعبہ کا ناظم اعلیٰ آپ کو تجویز کیا گیا، جس پر آپ تاحیات فائز اور متمکن رہے جبکہ اس شعبہ کا صدر دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نوراللہ مرقدہٗ کو منتخب کیا گیا (اوراب شعبہ کے صدر عالی وقار حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند ہیں) اور حضرت الاستاذ مولانا قاری محمد عثمان صاحب منصورپوری استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند وصدر جمعیۃ علماء ہند کو اس کا ناظم بنایا گیا۔ اس شعبہ سے وابستہ رہ کر آپ نے اندرون ملک اور بیرون ملک متعدد اسفار کیے اور مسئلہ ختم نبوت اور قادیانیت کی دسیسہ کاریوں سے عوام وخواص کو اپنے دلنشین انداز میں واقف کرایا اور آپ کی ذات باجود سے اس شعبہ کے وقار میں اضافہ ہوا اگرچہ ایک مرتبہ ۱۴۱۹ھ میں مذکورہ شعبہ سے علیحدگی کے لیے مجلس شوریٰ میں درخواست بھی دی مگر شوریٰ نے آپ کی درخواست نامنظوری فرمادی۔

تصنیفات و تالیفات

درس وتدریس کے ساتھ ابتداء ہی سے آپ نے تصنیف وتالیف کا محبوب مشغلہ بھی اختیار فرمایا اور اس طویل عرصہ میں انتہائی بیش بہا قیمتی تالیفات آپ کے اشہب قلم سے وجود پذیر ہوئیں جن سے امت مسلمہ اور خاص طور سے علماء امت دیر تک ان شاء اللہ استفادہ کرتے رہیں گے، اگرچہ ان تصانیف کی مجموعی تعداد چار درجن کے قریب ہے مگر آپ کی بعض تالیفات متعدد مجلّات میں تین چار ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ اگر ہر جلد کو مستقل

تصنیف قرار دیا جائے تو یہ تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہو جائے گی۔ راندیر قیام کے زمانہ میں آپ کے قلم سے العون الکبیر عربی شرح الفوز الکبیر، حرمت مصاہرت داڑھی اور انبیاء کی سنتیں اور تہذیب المغنی عربی شرح المغنی وجود میں آئیں اور دار العلوم دیوبند کے اڑتالیس سالہ قیام کے زمانہ میں آپ کی چھوٹی بڑی تصنیف کردہ چالیس سے زیادہ کتابیں ہیں جن میں رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ آپ کی معرکۃ الآراء تصنیف ہے، جو ضخیم پانچ مجلدات پر مشتمل ہے۔ صفحات کی مجموعی تعداد چار ہزار سے متجاوز ہے۔ اس کتاب کو عالم اسلام میں زبردست پذیرائی ملی، مختلف زبانوں میں اس کے تراجم ہو کر شائع ہوئے، وقت کے اکابر علماء اسلام نے اس کتاب کی تصنیف پر آپ کو خراج عقیدت وخراج تحسین پیش کیا جو یقیناً آپ کی زندگی کا تاریخی اور شاہکار کارنامہ ہے۔ نیز آپ کے درس حدیث کے افادات کو آپ کے لائق و ہونہار فرزند مولانا حسین احمد صاحب پالن پوری مدظلہ نے مرتب کر کے آپ کی نظر ثانی اور تہذیب کے بعد تحفۃ الالمعی شرح سنن ترمذی اور تحفۃ القاری شرح بخاری کے نام سے شائع فرمایا جو یقیناً علماء اور طلبہ کے لیے قیمتی سوغات ہیں۔ تحفۃ الالمعی آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ہر جلد تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے، صفحات کی مجموعی تعداد چار ہزار کے قریب ہے تحفۃ القاری بارہ جلدوں پر مشتمل ہے، یہ بھی مجموعی طور سے کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ تفسیر ہدایت القرآن (آٹھ جلدیں) آسانی بیان القرآن (چار جلدیں) کامل برہان الٰہی (چار جلدیں) عربی حاشیہ حجۃ اللہ البالغہ، زبدۃ الطحاوی، تعریب الفوز الکبیر، فیض المنعم شرح مقدمہ مسلم، تحفۃ الدرر شرح نخبۃ الفکر، شرح علل الترمذی، مبادی الفلسفہ، معین الفلسفہ شرح مبادی الفلسفہ، ہادیہ شرح اردو کافیہ، وافیہ شرح عربی کافیہ، مفتاح التہذیب شرح اردو تہذیب، آسان نحو (دو حصے)، آسان صرف (دو حصے)، محفوظات (تین حصے)، اسلام تفسیر پذیر دنیا میں، مفتاح العوامل شرح شرح مأۃ عامل، گنجینہ صرف شرح پنج گنج، ارشاد الفہوم شرح سلم العلوم، دین کی باتیں اور تقلید کی ضرورت، حیات امام طحاوی، حیات امام ابوداؤد، مسئلہ ختم نبوت اور قادیانی وسوسے، افادات نانوتوی، افادات رشیدیہ، فقہ حنفی اقرب الی النصوص

ہے، آسان فارسی قواعد (دو حصے)، مبادی الاصول، معین الاصول، آسان منطق، تسہیل ادلہ کاملہ، حواشی وعنوانات ایضاح الادلہ، حاشیہ امداد الفتاویٰ جلد اول، کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے، مسلم پرسنل لاء اور نفقہ مطلقہ، مشاہیر محدثین رفقہاء اور تذکرہ راویان حدیث، آپ فتویٰ کیسے دیں شرح اردو شرح عقود رسم المفتی، مبادیات فقہ وغیرہ قیمتی کتابیں آپ کے خامہ مبارک سے صادر ہوکر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئیں جن سے امت برابر استفادہ کررہی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری تالیفات بھی ہیں جو اس وقت ذہن میں نہیں ہیں۔

تصوف و سلوک

آپ سلوک وتصوف اور تزکیۂ نفس کے لیے اولاً زمانہ طالب علمی میں ہی شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور کے دست حق پرست پر مدرسہ مظاہر علوم کی طالب علمی کے دور ہی میں بیعت ہوگئے اور آپ کے بتلائے ہوئے اوراد ووظائف کو پورا کرنے لگے تھے اسی زمانہ طالب علمی میں رائے پور جاکر حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری نوراللہ مرقدہٗ کی مجالس میں بھی شرکت فرماتے تھے۔

حضرت شیخ الحدیث نوراللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد مختلف مشائخ سے رابطہ رہا مگر باقاعدہ کسی سے تعلق قائم نہیں فرمایا۔ حضرت شیخ الحدیثؒ کے تلقین کردہ اوراد ووظائف کی پابندی کے ساتھ پورے کرتے رہے۔ آخر میں فقیہ الاسلام مولانا مفتی مظفر حسین صاحب نوراللہ مرقدہٗ ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور کے دست مبارک سے بیعت ہوئے اور انہی کی جانب خرقۂ خلافت آپ کو عنایت کیا گیا۔ حضرت ناظم صاحبؒ نے ۲۱؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۸ھ کو باقاعدہ تحریری طور پر آپ کو خلافت عطا فرمائی اور مجاز بیعت بنایا۔ یہ تحریری اجازت نامہ الخیر الکثیر شرح الفوز الکبیر کے مقدمہ میں چھپا ہوا ہے۔

حرمین شریفین کی زیارت

آپ متعدد مرتبہ حج وعمرہ کے ارادہ سے زیارت حرمین شریفین زادہا اللہ شرفاً و

کرامۃ وعزا کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ سب سے پہلی مرتبہ آپ نے ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۸۰ء میں اہلیہ محترمہ کے ساتھ فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے سفر کیا اور مناسک حج کی تکمیل فرمائی پھر دوسری مرتبہ ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۹۸۶ء میں افریقہ سے واپسی پر دوسرا حج کیا کیونکہ اس سے پہلے آپ فریضۂ حج ادا کر چکے تھے۔ اس لیے آپ نے دوسرا حج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حج بدل کے طور پر کیا۔ اس کے بعد ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۹۹۰ء میں تیسرا حج آپ نے سعودی وزارت حج واوقاف کی جانب سے مہمان کی حیثیت سے کیا۔ اس کے علاوہ ایک مرتبہ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ میں عمرہ کی سعادت عظمیٰ سے بہرہ ور ہوئے۔

دعوتی اور تبلیغی اسفار

تعلیمی اور تدریسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ ملک و بیرون ملک آپنے دعوتی و تبلیغی اسفار بھی فرمائے ہیں۔ ان اسفار میں بڑے اور چھوٹے اجتماعات سے آپ خطاب فرماتے تھے۔ مختلف علمی اجتماعات میں بھی آپ نے خطاب فرمائے اور مقالات و محاضرات پیش فرمائے۔ ہمارے طالب علمی کے دور میں امام بخاریؒ پر ایک سیمینار بخارا میں منعقد ہوا اس سیمینار میں عربی زبان میں آپ نے مقالہ پیش کیا جو بعد الداعی مجلّہ میں شائع ہوا۔ بیرون ملک پڑوسی ممالک بنگلہ دیش اور پاکستان کے علاوہ انگلینڈ، افریقہ، امریکہ، کناڈا، ترکی، سعودی عرب، قطر، کویت، بحرین، متحدہ عرب امارات، فیجی وغرہ کے آپ کے اسفار ہوئے۔ ماہ شعبان کی تعطیلات کے بعد عام طور سے آپ تعطیل کلاں ماہ رمضان وغیرہ برسہابرس سے یورپ کے کسی ملک میں گزارتے تھے اور جدید وقدیم ہر طرح کے لوگ آپ سے استفادہ کرتے تھے۔ بیرونی ممالک کے آپ کے خطبات علمی خطبات کے نام سے شائع بھی ہو چکے ہیں۔ آپ کے بیرونی ممالک کے خطابات سے عوام وخواص کو بیحد فائدہ ہوا۔ ان کی زندگیوں میں انقلاب پیدا ہوا اور وہ شرعی زندگی گزارنے والے، تقویٰ وصلاح سے متصف نیک انسان ہوگئے، کوئی صاحب قلم مستقبل قریب میں بیرونی ممالک کے اسفار پر تفصیل سے ان شاء اللہ روشنی ڈالے گا۔

کمالات اور محاسن

آپ بے پناہ کمالات اور خوبیوں کے حامل انسان تھے، تضیع اوقات اور خواہ مخواہ کی مجلس نشینی سے ہمیشہ گریز کرتے تھے، مردم سازی اور رجال سازی میں خود کو مکمل طور سے منہمک رکھتے تھے، آپ کا انداز خطابت نہایت مؤثر اور درس بے انتہاء مقبول اور عام فہم ہوتا تھا، آپ کی تدریس اور تقریر کی طرح تمام تصانیف بھی نہایت آسان، عام فہم اور مقبول خاص وعام ہیں، آپ کی عوام وخواص کے اجتماعات میں تقریریں انتہائی مبسوط، مدلل اور علمی نکات سے پُر ہوتی تھیں اور تحریرات نہایت واضح، مرتب اور جامع ہوتی تھیں، اسی وجہ سے آپ کی بعض تصانیف دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس عربیہ میں داخل درس اور شامل نصاب ہیں مشکل ترین مسائل کو حل کرنا آپ کے لیے نہایت آسان تھا۔ ہر طالب اور سامع کو آپ کے درس اور تقریر وتحریر سے انتہائی درجہ تشفی اور اطمینان قلب ہوتا تھا۔

آپ کے محاسن اور کمالات میں یہ بھی ہے کہ آپ کے مزاج میں استقلال اور اعتدال ہے اور آپ ذوق لطیف اور سادہ نفیس طبیعت کے مالک ہیں۔ سلامتی فکر اور ذہن رساء کے بھی مالک ہیں، زدونویس اور خوش نویس ہیں، حق و باطل اور خطاء و صواب کے درمیان امتیاز کی وافر صلاحیت آپ رکھتے ہیں، حقائق و معارف کے ادراک میں یکتائے روزگار ہیں۔ حالات زمانہ کے نباض اور ان سے جوانمردی سے مقابلہ کرنے کی پوری قوت و استعداد آپ رکھتے ہیں، محنت، مجاہدہ، جفاکشی اور اوقات کی حفاظت آپ کا وصف خاص ہے۔

عادات و اخلاق اور خودنوازی

آپ اخلاق جمیلہ اور بہترین عادات وخصائل سے متصف نامور شخصیت تھے بدعات و رسومات سے حد درجہ تنفر فرماتے تھے اور بلاخوف لومۃ لائم ان پر نکیر فرماتے تھے۔ مرجع الخلائق تھے اپنے تلامذہ اور خوشہ چینوں سے خندہ پیشانی اور طلاق وجہ کے ساتھ ملتے تھے اور ان کے معمولی علمی

کاموں پر بھی حد درجہ اظہار مسرت اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ حقیر راقم السطور نے شوال ۱۴۰۵ھ تا شعبان ۱۴۰۶ھ دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث شریف پڑھا ہے۔ حضرت والا نوراللہ مرقدہٗ سے متعلق ہماری ترمذی شریف جلد اول اور طحاوی شریف دو کتابیں تھیں اور پورے تعلیمی سال کے بیشتر ایام میں عبارت خوانی اور حدیث شریف کی تلاوت کی سعادت اس حقیر کو میسر رہ اور بندہ حضرت والا کی تقریر بھی نوٹ کرتا تھا، حضرت والا اپنے معمولی طالب علم کا اس قدر خیال فرماتے تھے کہ جب کاپی پر قلم رک جاتا تھا اس کے بعد عبارت آگے پڑھنے کا حکم دیتے تھے۔ دورۂ حدیث شریف سے پہلے بیضاوی شریف سورۂ بقرہ پڑھنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ حضرت والا کا درس سننے کے بعد پوری تقریر مع حل عبارت ذہن میں فٹ ہوجاتی تھی۔ حضرت والا کے درس کی بہت سی باتیں عرصہ دراز گزرنے کے بعد آج بھی اسی لب ولہجہ کے ساتھ ذہن میں منقش ومرتسم ہیں یہ بھی عجیب حسن اتفاق ہے کہ حضرت کے درس حدیث کے آخری سال بخاری شریف کی تلاوت وعبارت خوانی کی سعادت زیادہ تر بندہ کے برخوردار عزیزم محمد اخلد سلّمہٗ کو حاصل رہی بلکہ حضرت کی حیات سعید کے آخری درس بخاری کی عبارت بھی برخوردار نے پڑھی جس میں گریہ وزاری کی عجیب کیفیت پیدا ہوئی جس کی ویڈیو بے شمار لوگوں نے دیکھی۔ بندہ سے حد درجہ تعلق رکھتے تھے۔ دارالعلوم کے اندر اور دوسرے شہروں میں عظیم اجتماعات وسمیناروں میں جب ملاقات ہوتی، دور سے ہی پہچان لیتے تھے اور برملا اظہار محبت اور ظہار مسرت فرماتے تھے۔ مدرسہ خادم الاسلام ہاپوڑ قیام کے زمانہ میں جب بھی اس علاقہ کا سفر فرماتے تھے، بندہ ملاقات کرتا بہت زیادہ خوشی کا اظہار فرماتے تھے، ایک مرتبہ ہاپوڑ مدرسہ تشریف لائے بندہ ایک اصلاحی پروگرام کے لیے فیض آباد کے سفر پر تھا، بندہ کو موجود نہ پاکر ذمہ داران مدرسہ سے میرے بارے میں معلوم کیا اور جب تک ذمہ داران سے معلوم نہ کرلیا آپ کو سکون قلبی حاصل نہ ہوا جس زمانہ میں آپ رحمۃ اللہ الواسعہ تصنیف فرمارہے تھے اور مرحلہ وار جلدیں مرتب ہوکر شائع ہورہی تھیں، احقر دو جلدوں کا مطالعہ بالاستیعاب کرچکا تھا۔ تیسری جلد کے حصول کا

انتظار تھا، حضرت والا کا ہاپوڑ علاقے کے ایک مدرسہ میں جلسہ کا پروگرام تھا، بندہ نے فون کر کے حضرت والا سے تیسری جلد کے بارے میں معلوم کیا تو فرمایا کہ چھپ چکی ہے۔ اس کے بعد جب ہاپوڑ تشریف لائے تو میرے لیے تیسری جلد ساتھ لے کر آئے اور فرمانے لگے کہ تیرے شوق مطالعہ کے جذبہ نے مجھے کتاب ساتھ لانے پر مجبور کر دیا۔

۱۴۱۸ھ مطابق ۱۹۹۸ء میں احقر نے ایک چھوٹی کتاب قرآن کریم ایک عظیم دولت، مرتب کی تو حضرت والا نے پورے شوق وتوجہ سے پوری کتاب کے مسودہ کا مطالعہ کیا پھر بعض مقامات پر مضمون بدلنے کا حکم دیا پھر دوبارہ حضرت والا کو دکھایا اس کے بعد وقیع الفاظ میں اپنی رائے تحریر فرمائی اور کتابت کی تصحیح میں مکمل وقت دیا، یہ تمام شفقت ورافت سے بھرپور واقعات جب یاد آتے ہیں تو دل بے قابو ہو جاتا ہے اور آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ علمی دنیا میں مجھ جیسے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں لوگ حضرت کے تشریف لے جانے سے یتیم ہو گئے ہیں، آج ان کا کوئی سہارا اور مرجع نہیں ہے، وہ اپنے علمی مسائل اور اشکالات کو کیسے حل کریں گے اور اپنی علمی گتھیوں کو کہاں سلجھائیں گے، اللہ تعالیٰ حضرت والا کو آخرت کی بھرپور راحت سے سرفراز فرمائے اور علمی دنیا میں آپ کے جانے سے جو نقصان ہوا ہے، اس کی تلافی فرمائے۔ آمین۔

اولاد احفاد و پسماندگان

آپ کی اہلیہ محترمہ تقریباً دس سال پہلے وفات پا چکی ہیں، ان کے بطن سے حضرت والا کے کل چودہ بچے ہوئے، تین لڑکیاں اور گیارہ لڑکے۔ ایک بچی صغر سنی ہی میں دو سال کی عمر میں انتقال کر گئی، بڑے صاحب زادہ مولانا رشید احمد مرحوم اب سے ۲۵؍سال پہلے ایک حادثہ میں شہید ہو گئے، جنہوں نے اپنے پیچھے اہلیہ اور دو بچے چھوڑے تھے۔ اہلیہ کا دوسری جگہ نکاح ہو گیا اور دونوں پوتے حضرت والا کی تربیت میں رہے۔ ماشاء اللہ جوان عالم فاضل اور شادی شدہ ہیں۔ دوسرے صاحب زادہ حافظ سعید مرحوم تقریباً چھ مہینہ پہلے طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے، بوقت انتقال حضرت کی صلبی اولاد میں ۹ صاحب

زادگان مولانا وحید احمد، مولانا حسین احمد، مولانا حسن احمد، مولانا محمد ابراہیم، حافظ محمد قاسم مولانا محمد، مولانا احمد، مولانا عبد اللہ، مولانا عبید اللہ اور دولڑکیاں مسماۃ عائشہ خاتون، مسماۃ فاطمہ خاتون اور ان گنت تعداد میں پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں، برادران، بھتیجے، بھتیجیاں موجود ہیں، صلبی اولاد و احفاد کے علاوہ آپ کے پسماندگان میں آپ کے لاکھوں تلامذہ لامحدود تعداد میں متعلقین و مسترشدین ہیں جو آپ کے فراق کے غم میں نڈھال ہیں، اللہ تعالیٰ سبھی کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

علالت، وفات اور تدفین

آپ کافی زمانہ میں مختلف عوارض و بیماریوں میں مبتلا تھے، کئی دفعہ آپ کے کامیاب آپریشن بھی ہوئے اور آپ شفایاب ہوکر اپنے امور مفوضہ میں مصروف و منہمک ہوجاتے تھے۔ سال رواں بھی پوری توجہ وانہماک کے ساتھ درس و تدریس وتصنیف وتالیف میں مشغول رہے مگر کبھی کبھی بیماری کی وجہ سے آپ کی زبان مبارک رُک جاتی تھی، آخری درس میں بھی یہ کیفیت طاری ہوئی، اختتام درس کے بعد آپ علاج کے لیے عروس البلاد ممبئی تشریف لے گئے، جہاں آپ کا پہلے سے علاج جاری تھا اور ماشاء اللہ شفایاب ہوئے؛ لیکن حد درجہ اشتیاق کے باوجود پورے ملک میں لاک ڈاؤن کی وجہ سے دیوبند تشریف نہ لاسکے اور ممبئی میں قیام پذیر رہتے ہوئے دینی مجالس اور وعظ وتقریر کا سلسلہ جاری رکھا جو انٹرنیٹ اور موبائل سے جاری ہوتا رہا اور کثیر تعداد میں لوگ عوام وخواص اس سے مستفید ہوتے رہے۔ ثریا ستارہ کے بارے میں علمی تحقیق آپ نے ماہ رمضان ہی میں پیش فرمائی۔ آخری وعظ آپ کا رمضان المبارک کی پندرہویں شب کو ہوا۔ اس کے بعد اچانک آپ کی طبیعت بگڑی فوراً ہسپتال میں داخل کرایا گیا اور طبیعت تشویش ناک حد تک بگڑتی چلی گئی، بالآخر وقت موحود آگیا اور ۲۵؍ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹؍ مئی ۲۰۲۰ء بروز منگل بوقت اشراق صبح سات بجے کے وقت آپ نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد فرمادی اور آپ کی روح سعید قفس عنصری سے پرواز کرگئی اور آپ نے دنیا میں رہنے پر بقاء رب کو ترجیح دی جو اہل اللہ اور عارفین کی

محبوب چاہت ہوتی ہے۔ کاغذی کارروائی کے بعد شام بجے کے قریب آپ کی نماز جنازہ ہوئی اور دو مرتبہ نماز جنازہ ہوئی، ایک مرتبہ مولانا مبین الحق گریڈہی قاسمی فاضل دارالعلوم دیو بند نے نماز جنازہ پڑھائی اور دوسری مرتبہ آپ کے صاحب زادہ مولانا احمد نے نماز پڑھائی۔ اس کے بعد جوگیشوری کے معروف قبرستان میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ پورے ملک میں لاک ڈاؤن کے نفاذ کی وجہ سے محدود لوگ ہی تدفین اور نمازِ جنازہ میں شرکت کر سکے ورنہ عام حالات میں یہ تعداد لاکھوں میں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت کاملہ نصیب فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

خدا بخشے بڑی ہی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

الوداع اے آبروئے علم وعرفاں الوداع

حضرت الاستاذ پالن پوریؒ کی زندگی کے چند گوشے

مولانا فضیل احمد ناصری | استاذ حدیث وفقہ جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند

کل 25 ویں رمضان 1441ھ مطابق 19 مئی 2020 کو حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری بھی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ اس رحلت کا قلب پر اتنا اثر ہے کہ کسی کام میں جی نہیں لگ رہا۔ وہ ہمارے لیے استاذ کے ساتھ مربی بھی تھے۔ وہ ایک روشن چراغ اور علم وفن کے قابلِ تقلید سالار بھی تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی تدریسی شہرت کو انہوں نے چار چاند لگایا اور سلف کی روش پر چل کر خود بھی زندۂ جاوید ہوئے۔

حضرت الاستاذ کے حالاتِ زندگی پر ایک نظر

حضرت مفتی صاحب کا وطنی تعلق شمالی گجرات کے پالن پور سے تھا۔ پالن پور ایک بہت بڑے علاقے کا نام ہے، اس میں چار اضلاع ہیں: سابر کانٹھا، بناس کانٹھا، مہسانہ اور پٹن۔ ان کا گاؤں کالیڑا کے نام سے متعارف ہے، جو ضلع بناس کانٹھا میں واقع ہے۔ وہیں 1360ھ مطابق 1940 میں ان کی ولادت ہوئی۔ والد صاحب نے احمد نام رکھا، بعد میں حضرت نے اس کے ساتھ سعید کا اضافہ کر لیا۔ ان کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے: سعید احمد بن یوسف ابن علی ابن جیوا ابن نور محمد۔ آپ مومن برادری سے تعلق رکھتے تھے، یہ گجرات کی بہت بڑی برادری ہے۔ اسی برادری کی ایک شاخ ''ڈھگّا'' کہلاتی ہے۔ آپ بھی اسی شاخ سے تھے۔

تعلیمی اسفار

آپ نے مکتب کی تعلیم اپنے وطن ''کالیڑا'' میں ہی پائی۔ مولانا داؤد چودھری مولانا حبیب اللہ چودھری اور مولانا ابراہیم جونکیہ رحمہم اللہ آپ کے مکتبی اساتذہ میں ہیں۔

مکتب سے فارغ ہوئے تو دارالعلوم چھاپی میں داخلہ لیا، جہاں ان کے ماموں مولانا عبدالرحمٰن شیرا پڑھایا کرتے تھے۔ وہاں ماموں سمیت متعدد اساتذہ سے دروس لیے۔ چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ ماموں کا تعلق چھاپی سے ختم ہوگیا اور وہ اپنے وطن ''جونی سیندھی'' میں اقامت گزیں ہو گئے، مفتی صاحب بھی ماموں کے ساتھ ان کے گھر چلے گئے اور انہیں سے فارسی کی کتابیں پڑھیں۔

پھر عربی درجات کے لیے پالن پور ہی میں مصلح الامۃ مولانا نذیر میاں صاحب کشمیری ثم پالن پوریؒ کے ادارے مدرسہ دعوۃ الحق میں داخلہ لیا۔ یہاں مولانا اکبر میاں پالن پوریؒ اور مولانا ہاشم بخاری مہاجر مدنیؒ پڑھایا کرتے تھے۔ مفتی صاحب نے بانیِ مدرسہ سے بھی پڑھا۔ چار سال تک ان حضرات سے خوب علمی فیضان سمیٹا۔ ابتدائی اور متوسط جماعتوں کی کتابیں پڑھیں۔ شرح جامی بھی یہیں پڑھی۔ مولانا ہاشم بخاری صاحب نے دارالعلوم دیوبند میں بھی تدریسی خدمات انجام دی ہیں۔

وطن سے باہر کے علمی اسفار

پالن پور سے نکلے تو مظاہرِ علوم سہارن پور پہونچ گئے۔ یہ 1377ھ تھا۔ یہاں اپنے تین سالہ قیام کے دوران منطق اور نحو کے امام مولانا محمد صدیق صاحبؒ سے نحو اور منطق کی متعدد کتابیں پڑھیں۔ مفتی یحییٰ سہارن پوری، مولانا عبدالعزیز رائے پوری اور مولانا وقار احمد بجنوری رحمہم اللہ سے بھی کئی کتابوں کے دروس پڑھے۔

دارالعلوم دیوبند کی طرف

فقہ، تفسیر اور حدیث کی تحصیل کے لیے 1380ھ میں دیوبند پہونچے اور مولانا نصیر احمد خان صاحب بلند شہریؒ اور مولانا سید اختر حسین میاں صاحب دیوبندیؒ سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں۔ 1382ھ مطابق 1962ء میں فراغت پائی۔ نامور اساتذہ میں مولانا بشیر احمد خان بلند شہری، مولانا اسلام الحق اعظمی، مولانا ظہور احمد دیوبندی، حکیم

الاسلام قاری محمد طیب، مولانا سید فخر الدین مراد آبادی، مولانا فخر الحسن مراد آبادی اور علامہ ابراہیم بلیاوی اور مفتی مہدی حسن شاہ جہاں پوریؒ رحمہم اللہ ہیں۔ سالانہ امتحان میں پہلی پوزیشن پائی۔

درجۂ افتا میں داخلہ

دورے سے فراغت کے بعد درجۂ افتا میں داخلہ لیا۔ اور حضرت مفتی سید مہدی حسن شاہ جہاں پوریؒ سے فتویٰ نویسی کے گُر حاصل کیے۔ یہ ایک سالہ نصاب تھا، مگر حضرت الاستاذ پالن پوری صاحبؒ کی مسلسل محنت اور شوق ولگن کے چلتے اس کا نصاب دو سالہ کر دیا گیا۔ دوسرے سال معینِ مفتی بنائے گئے۔ حفظ بھی اسی دورانیے میں کیا۔

عملی زندگی کا آغاز

درجۂ افتا سے فراغت کے بعد علامہ ابراہیم بلیاویؒ کے مشورے پر گجرات کے مشہور ادارے دار العلوم اشرفیہ راندیر ضلع سورت سے تدریسی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ مدرسِ علیا قرار دیے گئے۔ 1384ھ سے 1393 تک یہاں مسلسل درس دیا۔ ابوداؤد، ترمذی، مؤطائین، شرح عقائد، حسامی اور دیگر کتابیں ان سے متعلق رہیں۔ تدریس کے ساتھ یہاں تصنیف کا سلسلہ بھی شروع کیا اور متعدد علمی واصلاحی کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔ داڑھی اور انبیاء کی سنتیں، حرمتِ مصاہرت، العون الکبیر اور علامہ طاہر پٹنی کی مشہور کتاب ''المغنی'' کی عربی شرح لکھی۔ اسی زمانے میں *افاداتِ نانوتوی* کے نام سے ایک طویل مضمون لکھا، جو ماہ نامہ الفرقان میں قسط وار چھپا۔

حضرت الاستاذ کا دار العلوم دیوبند میں تقرر

مفتی صاحب دار العلوم اشرفیہ راندیر میں اپنی تدریسی مہم نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے رہے تھے کہ اسی اثنا میں مولانا ہاشم بخاری صاحب کا پیغام پہونچا کہ دار العلوم دیوبند میں استاذی کے لیے ایک جگہ خالی ہے، تقرر کی درخواست پیش کر دیں۔ مولانا

بخاری مدرسہ دعوۃ الحق پالن پور میں مفتی صاحب کے استاذ رہ چکے تھے اور اب دار العلوم میں علیا کے مدرس تھے۔ مفتی صاحب کو ان کا یہ مشورہ پسند آیا اور ضلع سورت کی باا ثر شخصیت مولانا حکیم سعد رشید اجمیری صاحب کے مشورے سے ایک درخواست اور ایک خط دار العلوم کے مہتمم حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کے نام روانہ کر دیا۔ قاری صاحب نے اسے پڑھ کر امید دلائی۔ شعبان میں مجلسِ شوریٰ منعقد ہوئی اور استاذ کے تقرر کی بات آئی تو مناظرِ اسلام مولانا محمد منظور نعمانیؒ رکنِ شوریٰ دار العلوم نے مفتی صاحبؒ کا نام پیش کر دیا، جسے باتفاقِ رائے منظور کر لیا گیا۔ آپ کا تقرر 1393ھ میں عمل میں آیا اور درجۂ وسطیٰ کے استاذ منتخب ہوئے۔ مفتی صاحبؒ تا زندگی اپنی اس ذمے داری کو ادا کرتے رہے۔

مفتی صاحب کی بحیثیت مفتی خدمات

دار العلوم میں صرف عربی درجات میں ہی تدریس نہیں کی، بلکہ 1402ھ میں جب دار العلوم انتشار میں مبتلا ہوا اور کئی اہم مفتیان علیحدہ اور کچھ رخصت پر چلے گئے تو طلبہ کو فتاویٰ نویسی کی مشق کرانے کے لیے حضرت الاستاذ کو نگراں بنایا گیا۔ آپ نے کئی سال تک یہ ذمے داری بھی شان دار طریقے سے نبھائی۔

ایک دل چسپ واقعہ

سورت میں مولانا حکیم سعد رشید اجمیری کے نام سے ایک بڑے بزرگ تھے، جن کا نام ابھی چند سطور پہلے بھی آپ نے پڑھا ہے۔ یہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے مرید تھے۔ سورت میں ہی مطب کرتے تھے۔ حضرت الاستاذ بھی چوں کہ حضرت شیخ الحدیثؒ کے مرید تھے، اس لیے دونوں میں خوب بنتی تھی۔ انہیں کے مشورے پر مفتی صاحبؒ نے دار العلوم دیوبند کے نام خط بھی لکھا تھا۔ جب مفتی صاحب دار العلوم آ گئے اور پڑھانے کے لیے کتابیں تفویض ہوئیں تو ان میں ایک کتاب ملا محبّ اللہ بہاری کی ''مسلم الثبوت'' بھی تھی۔ مفتی صاحبؒ نے دار العلوم سے سب سے پہلا خط حکیم صاحبؒ

کے نام لکھا، جس میں کتابوں کی تفصیل تھی۔ حکیم صاحب نے جواب لکھا کہ الحمدللہ دارالعلوم میں آپ کا ثبوت مسلّم ہو گیا ہے۔ حکیم صاحب کا یہ جملہ اس خلوص سے نکلا تھا کہ حضرت الاستاذ کی شخصیت آگے چل کر واقعی مسلّم الثبوت بن گئی۔

مفتی صاحب کی تدریس

حضرت الاستاذ مفتی صاحبؒ یوں تو ہمہ جہت کمالات کے حامل تھے، مگر تدریس اور تصنیف میں زیادہ عزت وشہرت کمائی۔ ان دونوں میدانوں میں کوئی مدرس ان کا شریک نہیں ہے۔ تدریس کی بات کیجیے تو وہ اس فن میں انفرادی صلاحیت کے مالک تھے، بلکہ اپنے طرزِ تفہیم کے موجد وخاتم دونوں تھے۔ آپ نے مؤطین اور مسلم شریف کے دروس بھی دیے ہیں۔ کیمپ کے زمانے میں شیخ الحدیث بھی رہے، پھر شیخ نصیر احمد خان بلند شہریؒ واپس آگئے تو بخاری ان کے پاس واپس چلی گئی۔ اس وقت سے ترمذی شریف کا درس متعلق رہا، جس کا سلسلہ 1432ھ تک چلا۔ ادھر چند سالوں سے بخاری شریف مستقل وابستہ ہوئی جو اختتامِ سال تک چلی۔ حضرت الاستاذ تدریس کے معاملے میں مقامِ اجتہاد پر فائز تھے۔ حلِ عبارت میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ تفہیم کے لیے وہ ایسی ترتیب اپناتے کہ غبی سے غبی طالب علم کے لیے بھی مشکل مسئلہ مشکل نہ رہتا۔ بندے نے ان سے ترمذی شریف اور طحاوی پڑھی ہے۔ ان کا درسِ ترمذی دیکھ کر ایسا لگتا تھا گویا کہ امام ابوعیسیٰ ترمذی نے انہیں کی تدریس کے لیے اس کی تالیف فرمائی ہے۔ حدیث پر مفصل ومدلل کلام۔ موقع بہ موقع حوالجات۔ درسِ ترمذی کے دوران ان کی شانِ فقاہت خوب نمایاں ہوتی تھی۔ زیرِ بحث حدیث پر فقہی کلام اتنی بصیرت اور مرتب انداز میں کرتے کہ طبیعت جھوم جاتی۔ احناف کی ترجیح کے دلائل اس قوت سے دیتے کہ دوسرے طبقے کی طرف سے پیدا کردہ شبہات ہوا ہو کر رہ جاتے۔ متنِ حدیث پر کلام کے ساتھ سندِ حدیث پر بھی ایسا مضبوط تبصرہ کہ آنکھیں کھلی رہ جاتی تھیں۔ رجالِ حدیث پر کلام کے دوران جب حدیث کے مشہور ضعیف راوی عبداللہ ابنِ لہیعہ کا نام آتا، جسے غیر احناف نے بطور دلیل پیش کیا ہوتا، تو دونوں مونڈھوں کو کہنیوں سمیت اس طرح پھڑ پھڑاتے

کہ غیر احناف کے استدلال کا بوداپن صاف محسوس ہو جاتا۔

طلبہ میں درس کی مقبولیت

طلبہ کو عموماً دو چیزیں چاہییں۔ فہمِ اسباق اور مرتب کلام۔ مفتی صاحب کے درس میں یہ دونوں باتیں خوب پائی جاتی تھیں۔ حلِ عبارت اس طرح فرماتے کہ مقصودِ مصنف بڑی سرعت سے الم نشرح ہو جاتا۔ اس کے لیے ترتیب اور تمہید ایسی قائم کرتے کہ ان کی مرادات تک بہ آسانی پہنچا دیتے۔ اس کا لازمی اثر اسباق کی مقبولیت تھی۔ وہ آسان اور مختصر تعبیرات میں اپنی بات کی ترسیل کا عجیب وغریب ملکہ رکھتے تھے۔ ان خوبیوں کی بنا پر ان کے اسباق میں پوری حاضری ہوتی۔ وہ طلبہ جو دیگر اساتذہ کے گھنٹوں میں تساہل اور لا پروائی کرتے، مفتی صاحب کے گھنٹے میں بڑی مستعدی سے حاضر ہوتے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی مقناطیس دارالحدیث میں رکھ دیا گیا ہے اور وہ سارے آہن ریزوں کو پل بھر میں کھینچ رہا ہے۔ احقر نے ترمذی اور طحاوی کے درس میں دیکھا کہ پوری درس گاہ کھچا کھچ بھر جاتی تھی۔ اس طرح کی مقبولیت راقم الحروف نے دارالعلوم میں کسی اور گھنٹے میں نہیں دیکھی۔

حسنِ قرآت کا زبردست اہتمام

مفتی صاحب کے یہاں عبارت خوانی پر بڑا زور تھا۔ عبارت خواں طلبہ پر لازم تھا کہ تصحیحِ اعراب کے ساتھ میانہ روی اور بلند آہنگی کو ملحوظ رکھے۔ ابتدائے سال میں باقاعدہ انتخاب بھی ہوتا اور جہیر الصوت وداؤد اللہجہ کو ترجیح دی جاتی۔ جس کی عبارت خوانی میں کوتاہی ہوتی، اسے ایسی نرم اور مشفقانہ ڈانٹ پلاتے کہ آئندہ کے لیے ایک دم سنبھل جاتا۔ ان کے دروس میں تلاوت کرنے والے کا ذی استعداد، بلبل نوا اور بلند آواز ہونا لازم تھا۔ ان کے سامنے کا کامیاب ہر جگہ کامیاب رہتا۔

مفتی صاحبؒ کی تعبیرات

حضرت الاستاذ اپنے درس کے دوران ایسی تعبیرات اختیار کرتے کہ طلبہ کئی کئی گھنٹے لگاتار بیٹھنے کے بعد بھی اکتاہٹ کا شکار نہ ہوتے۔ مثلاً جب امام ترمذی ایک سند پر کسی

دوسری سند کو ترجیح دیتے ہوں تو مفتی صاحب فرماتے کہ: فلاں سند میں یہ خامی ہے، اسی لیے امام ترمذی نے دوسری سند کو راجح کہا ہے۔ حضرت کی عادت ہے کہ جہاں نشیب دیکھتے ہیں، ادھر پانی بہا دیتے ہیں۔ اسی طرح کسی امام یا محدث کا تعارف کراتے تو کبھی کبھار درمیان میں فرماتے کہ ان کا وطنی تعلق گاگلہیڑی سے ہے، جس پر طلبہ بے اختیار ہنس پڑتے۔ طلبہ عموماً ایسے خطیبوں یا مدرسین کو سننا پسند کرتے ہیں، جن کے یہاں تفریحِ طبع اور منورنجن کا سامان ہو، حضرت الاستاذ اس پر فرماتے کہ یہ دین کی طلب نہیں، کان کی عیاشی ہے۔ رجالِ حدیث میں کوئی راوی حد سے زیادہ کمزور ہوتا تو فرماتے کہ یہ راوی تو دو پیسے کا بھی نہیں ہے۔ کبھی کبھی مسئلے کی تفہیم کے وقت خود ہی کوئی استفتاء قائم کرتے تو کہتے: کیا فرماتے ہیں علمائے دین، مفتیانِ شرعِ متین مسئلۂ ذیل میں کہ آیا زید کا یہ عمل درست ہے؟ اگر جواب نفی میں ہوتا تو خاص انداز میں متصلاً فرماتے: اونہوں!! مجمع قہقہوں سے گونج اٹھتا۔ کئی بار عبارت خواں غلطیاں کرتا تو کہتے: تیرے ساتھ سر ٹکرانے سے اچھا ہے کہ میں خود ہی عبارت پڑھ لوں۔ بھینس اللغات کی تعبیر بھی پہلی دفعہ انہیں کی زبانی میں نے سنی۔ غرض کہ اچھوتی اور نئی نئی تعبیرات لا کر طلبہ کو تازہ دم رکھتے۔

تفردات کے سلسلے میں حضرت الاستاذ کی وضاحت

حضرت الاستاذ جو کچھ فرماتے وہ ان کی اپنی تحقیق ہوتی تھی۔ کبھی کبھار ان کی تحقیق سب سے الگ تھلگ ہو جاتی اور تفردات کے خانے میں چلی جاتی تھی۔ کسی فقہی مسئلے پر اپنی کوئی بات رکھتے اور وہ بات جمہور کے خلاف ہو تو طلبہ سے صاف صاف کہہ دیتے کہ میری اس رائے پر تمہارا عمل درست نہیں۔ دار العلوم کا دار الافتاء ہی تم پر لازم ہے۔ فرمایا کرتے کہ میں ساری مرجوح حدیثوں پر زندگی میں کم از کم ایک بار عمل تو کر ہی لیتا ہوں۔ میں کبھی کبھار رفعِ یدین بھی کر لیتا ہوں۔

اپنی تشریحات سے رجوع

مفتی صاحب کے درس کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اگر کسی مسئلے کی تقریر ان

سے غلط ہو جاتی تو اگلے دن فرماتے کہ میں نے پچھلے دن تقریر یوں کی تھی، وہ غلط ہے۔ صحیح تقریر وہ ہے جو ابھی بیان کر رہا ہوں۔ یہ ان کی امانت کی بات تھی۔ میری طالب علمی کے دوران سال بھر دو تین بار ایسی نوبت آئی تھی۔

درس گاہ میں حاضری سے متعلق حضرت الاستاذ کا اصول

حضرت الاستاذ طلبہ کو نظم وضبط کا پابند بننے پر خوب زور دیتے۔ چناں چہ ان کی جانب سے ابتدائے سال میں ہی صاف اعلان ہوتا کہ میرے آنے سے پہلے سارے طلبہ دارالحدیث میں آ جائیں۔ یوں نہ ہو کہ میں سبق شروع کروں اور کچھ طلبہ اس رخ سے آئیں اور کچھ طلبہ اس جانب سے۔ یہ عمل بہتر نہیں ہے۔ اس سے ذہن منتشر ہوتا ہے۔ مفتی صاحب کے اس اعلان پر طلبہ کی جانب سے بھی حتی المقدور عمل ہوتا۔ کبھی ایسا ہوا کہ مفتی صاحب درس گاہ تشریف لائے تو طلبہ کم تھے اور بعض دوڑتے ہوئے درس گاہ میں گھس رہے تھے۔ حضرت الاستاذ کو یہ عمل اس قدر ناگوار ہوتا کہ اسی وقت الٹے پاؤں واپس چلے جاتے اور جب تک ترجمان اچھی طرح معافی تلافی نہ کر لے وہ درس گاہ میں نہیں آتے تھے۔ اس دن کا سبق تو ناغہ ہو ہی جاتا تھا۔

کوئی حدیث بغیر کلام کے جانے نہ دیتے

حضرت الاستاذ کی خاص ادا یہ تھی کہ کتاب کی ہر ہر حدیث پر کچھ نہ کچھ کلام ضرور کرتے۔ اگر حدیث بحث طلب ہے اور معرکۃ الآراء مسئلے پر مشتمل ہے تب تو تفصیلی کلام لازم تھا۔ اس کے ہر رخ سے پردہ ہٹاتے۔ اگر مسئلہ معرکۃ الآراء نہیں، مگر کسی نہ کسی درجے میں اہم ہے تو ضروری کلام کر کے آگے بڑھ جاتے۔ اور اگر وہ حدیث پہلے گزر چکی ہے تو فرماتے کہ اس حدیث پر کلام ہو چکا ہے۔ پوری کتاب اسی طرح مکمل ہوتی۔ حضرت الاستاذ کے یہاں سرداً پڑھنے کا معمول نہیں تھا۔ تعلیمی ایام میں انہیں کسی سفر کی عادت نہیں تھی، اس لیے کتاب کی تکمیل میں انہیں کوئی دشواری نہیں آتی تھی۔ بہت کم سنا گیا کہ آج مفتی صاحب تشریف نہیں لائیں گے۔ اپنے مشن میں انہماک اور انہاک میں تواتر وتسلسل ان کی کامیابی

کا سب سے بڑا راز تھا۔

کوئی اشکال ہو تو پرچی بھیجو

استاذِ محترم کی یہ ادا بھی رہی کہ وہ دورانِ درس سوالیہ پرچی کے فوری جواب کے قائل نہیں تھے۔ ان کی واضح ہدایت تھی کہ اگر کوئی تقریر سمجھ میں نہ آئی ہو یا کوئی سوال و اشکال ذہن میں آرہا ہو تو پرچہ لکھ کر ابھی دو، لیکن اس کا جواب کل دوں گا۔ پرچیوں پر فوری توجہ سے درس متاثر ہوتا ہے۔

درس گاہ میں بیٹھنے کا انداز

حضرت الاستاذ کے درس گاہ تشریف لانے کا انداز بڑا پرکشش تھا۔ وہ اپنے روایتی لباس میں تشریف لاتے۔ جبہ، جو نصف ساق تک دراز ہوتا۔ پاجامہ اور خاص قسم کی گجراتی ٹوپی، جو سفید، گول اور سر سے چپکی ہوتی تھی۔ اس پر سفید رومال۔ کبھی کبھار عمامہ اور اس پر سفید رومال۔ دیکھ کر لگتا کہ کوئی عربی النسل محدث تشریف فرما ہے۔ پروقار رفتار سے درس گاہ آتے اور چارزانو ہو کر بیٹھ جاتے۔ ان کے بیٹھنے کی یہ شکل درمیان میں کسی وقت بھی نہ بدلتی تھی، خواہ کتنا ہی وقت درس گاہ میں نہ لگ چکا ہو۔

حضرت الاستاذ اور احترامِ اسلاف

حضرت الاستاذ کی جن اداؤں نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا، ان میں سے ایک یہ تھی کہ دورانِ درس جب بھی کسی بزرگ، محدث یا فقیہ کا نام آتا، خواہ وہ ائمہٗ اربعہ میں سے کسی بھی امام کے مقلد ہوں، بڑے احترام سے انہیں یاد کرتے۔ حضرت، رحمہ اللہ، قدس سرہ اور برد اللہ ضجعہ جیسے دعائیہ جملے ان کی زبان کا لازمی حصہ تھے۔ میں نے کبھی بھی اس ادا میں تخلف نہیں پایا۔ حالانکہ ان کا علمی رد پورے شباب پر چل رہا ہوتا تھا۔ ان کی دلیلوں کی کاٹ پر پوری تقریر چلتی تھی، مگر اس کے باوجود ہوش و حواس اور احترام بہر صورت قائم۔ اپنے اساتذہ کے نام بھی اسی انداز سے لیتے۔ صرف مولانا مرحوم کہہ کر گزرتے انہیں نہیں دیکھا گیا۔ زندہ شخصیات میں سے بھی کسی محترم شخصیت کا نام لینا ہوتو بھی احترام کا پہلوان کی نظر

سے اوجھل نہیں ہوتا تھا۔

مفتی صاحب اور خطابت

حضرت الاستاذ بہترین استاذ کے ساتھ بہترین خطیب بھی تھے۔ البتہ ان کی خطابت میں جوش، آواز کا ابھار، لہجے کا زیر و بم، حواس باختگی، کرسی شکنی اور ایک سانس میں کئی کئی جملے کی ادائیگی نہیں تھی، مگر وعظ و خطابت مؤثر بہت ہوتی تھی۔ یوں تو حضرت کی پوری توجہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف پر تھی۔ چھٹی بہت کم، برائے نام کرتے تھے۔ ہمیشہ وقت پر درس گاہ آتے۔ وعظ و خطابت کے لیے ایامِ تعطیل تھے۔ ان دنوں میں وہ اکثر دیوبند سے باہر رہتے تھے۔ دارالعلوم میں طالب علمی کے دوران انجمن کے کئی جلسوں میں، اسی طرح دارالعلوم کے سالانہ انعامی اجلاس میں حضرت الاستاذ کی تقریریں سننے کا شرف مجھ کو ملا ہے۔ ممبئی کے حج ہاؤس میں بھی ان کی خطابت دیکھی۔ وہ نہایت نرم و نازک اور خوب صورت و بلیغ انداز میں اپنی بات رکھتے۔ ان کے بیان میں علم و فضل کے ساتھ دل کش اور مزاحیہ تعبیرات اس قدر ہوتیں کہ سامعین میں سے کوئی بھی نہ اٹھتا۔ اپنی بات کو مخاطب کے ذہن میں اتار دینے کے فن سے خوب آشنا تھے۔ انزلوا الناس علیٰ قدر عقولہم پر ان کا کامل عمل تھا۔ قرآن و حدیث سے استدلال کرنے کا ڈھنگ بڑا ہی اچھوتا پایا تھا۔ ان کی تقریریں زیادہ تر نہی عن المنکر کے قبیل سے ہوتی تھیں۔ ان کے تلامذہ ان کی تقریروں کو درسِ ترمذی کا نام دیتے۔ اپنے اس فن سے انہوں نے بڑے بڑے ہنگامے سرد کیے ہیں۔ دنیا کے کئی ممالک ان کے مواعظ سے براہِ راست مستفید ہو چکے ہیں۔

ان کے خطبات کے تین مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں، جن میں ''علمی خطبات'' دو جلدوں میں، ''دین کی بنیادیں اور ان کی ضرورت'' اور تیسرا مجموعہ ''عصری تعلیم'' ہے۔ ان کے فرزندوں سے توقع رکھتا ہوں کہ غیر مطبوعہ تقریروں کے مجموعے بھی حسبِ سہولت شائع کریں گے۔

تصنیف و تالیف

درس و تدریس اور اس کے ساتھ کثرتِ تصنیف و تالیف کی بات جب بھی آئے

گی، حضرت الاستاذ ہمیشہ صفِ اول میں نظر آئیں گے۔ تدریس کے دوش بدوش کتب نویسی کا کام دارالعلوم کی تاریخ میں کسی نے اس کثرت سے نہیں کیا۔ کئی کتابیں تو کئی کئی جلدوں میں ہیں۔ تحفۃ القاری، رحمۃ اللہ الواسعہ، تحفۃ الالمعی، برہانِ الٰہی، ہدایت القرآن وغیرہ۔ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی کتابیں ان کے قلم سے آئیں۔ محفوظات سے لے کر تحفۃ القاری تک۔ ان کتابوں میں سے زیادہ تر کا تعلق درسیات سے ہے۔ جو کتاب بھی تدریس کے لیے ان سے متعلق ہوئی، اس کی شرح آ گئی۔ ترمذی شریف کی شرح تحفۃ الالمعی، بخاری شریف کی شرح تحفۃ القاری، حجۃ اللہ البالغہ کی شرح رحمۃ اللہ الواسعہ، الفوز الکبیر کی شرح العون الکبیر، رسم المفتی کی شرح آپ فتویٰ کیسے دیں؟ نخبۃ الفکر کی شرح وغیرہ۔ تصنیف وتالیف میں حضرت الاستاذ کی عادت تھی کہ باقاعدہ وہ اپنے قلم سے لکھتے تھے۔ املا نہیں کراتے تھے۔ زود نویس تھے۔ کم وقت میں کئی کئی سطریں لکھ ڈالتے تھے۔ کتب نویسی میں وہ ایسے مگن تھے کہ ان سے ملاقات کرنا آسان نہیں تھا۔ ملاقات کے لیے عصر بعد کا وقت طے تھا، اس کے بعد ان سے ملنا تقریباً محال تھا۔

حضرت الاستاذ سے ملاقات کا ایک واقعہ

چار سال قبل کی بات ہے، میرے ایک رشتے دار حضرت مولانا وصی احمد قاسمی صاحب ممبئی سے دیوبند تشریف لائے، وہ دارالعلوم کے فاضل تھے۔ حضرت الاستاذ سے انہیں بڑی عقیدت تھی۔ دارالعلوم میں ان کی طالب علمی کا جو سال تھا، وہی حضرت الاستاذ کی مدرسی کا بھی سال تھا، یعنی 1973۔ اسی سال آٹھ سالہ نصاب کی درجہ بندی عمل میں آئی تھی۔ مولانا نے ان سے الفوز الکبیر، سلم العلوم، جلالین اور ہدایہ جلد اول پڑھی تھی۔ فراغت کے بعد ممبئی گئے تو چالیس سال کے بعد ہی دیوبند واپس آئے۔ وقت کم تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ حضرت مفتی صاحب سے ملنا ہے۔ میں نے کہا کہ مغرب کے بعد ملاقات ممکن نہیں۔ کہنے لگے: نہیں ملاقات کر ہی لیں۔ میں انہیں لے کر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ حضرت نے اجازت دی۔ ہم جوں ہی ان کے قریب ہوئے تو خیریت پوچھی۔ پھر فرمایا: مولانا! آپ

غلط وقت پر آ گئے۔ یہ وقت میری تصنیف وتالیف کا ہے۔ میں ساری متعلقہ بحثیں دیکھ کر اپنے ذہن میں ایک خاص ترتیب بناتا ہوں اور پھر انہیں قلم بند کرتا ہوں۔ آپ تشریف لائے تو خوشی ہے، مگر میرے سوچے ہوئے سارے مضامین اڑ گئے۔ ساری محنت ضائع ہوگئی۔ یہ جملے درمیانِ گفتگو کئی بار دہرائے۔ مجھے بڑی ندامت ہورہی تھی کہ بلا وجہ خیر کے ایک بڑے کام میں مخل ہوگیا۔ کہنے لگے: اب تو باتیں کرو، لیکن آئندہ خیال رکھو!

ایک بہترین نصیحت

میرے مہمان نے حضرت سے دعا کی درخواست کی تو فرمایا: اپنے اعمال درست کرلو، ایمان میں خود بخود استحکام آئے گا۔ فرمایا کہ جس درخت یا پودے کی کاٹ چھانٹ ہوتی رہے، ان کی تندرستی اور نمو چلتی رہتی ہے۔ ایمان کی مضبوطی کے لیے اعمال کی تزئین و آرائش ضروری ہے اور یہ اتباعِ سنت کے کمال سے ہی ممکن ہے۔

حفاظتِ وقت کا اہتمام

اس قصے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وقت کی قدر و قیمت ان کے نزدیک کیا تھی۔ سچ یہ ہے کہ وقت کے معاملے میں وہ انتہائی حساس واقع ہوئے تھے۔ وہ اسے متاعِ گراں مایہ خیال کرتے تھے۔ ایک لگی بندھی زندگی تھی۔ ایک اصولی طرزِ حیات۔ ایک ایک سکینڈ ان کی نظر میں ہیرے جواہرات سے زیادہ قیمتی تھا۔ بہت سوچ سمجھ کر اور گن گن کر اسے صرف کرتے تھے۔ انہیں کبھی خالی نہیں دیکھا گیا۔ ایسے لوگ ہی کم وقت میں زیادہ کام کر جاتے ہیں اور انقلاب ایسے ہی نفوس سے برپا ہوتا ہے۔ اسی حفاظتِ وقت کے پیشِ نظر طلبہ اور ملاقاتیوں سے ملاقات کے لئے عصر کے بعد کا وقت طے تھا، اس کے بعد ملنا مشکل، بلکہ محال۔ اور یہ وقت بھی علم وفن کی ترسیل واشاعت میں خرچ ہوتا تھا۔ طلبہ پرچیاں دے کر سوالات کرتے اور حضرت الاستاذ بڑی بشاشت سے ان کے جوابات دیتے۔

تحفة القاری کی تصنیف کا دوبارہ آغاز

2005 میں حضرت الاستاذ کے سینے میں درد اٹھا تھا۔ ڈاکٹروں کے مطابق رپورٹ نکلوائی گئی تو پتہ چلا کہ دل کی تین رگیں بند ہو چکی ہیں۔ ایک سال تک علاج چلا، مگر طبیعت بگڑتی چلی گئی، پھر شفا مل گئی، اگرچہ کمزوری دن بہ دن بڑھتی رہی۔ 2013 میں طبیعت پھر بگڑی اور ہارٹ اٹیک ہوا۔ ڈاکٹروں نے آپریشن کیا اور آرام کا مشورہ دیا۔ یہ ساری کارروائی ممبئی میں ہوئی۔ چند دنوں کے بعد صحت یاب ہو گئے، مگر معالجین کا مشورہ تھا کہ ابھی مزید آرام کریں، تھوڑے دن آرام کیا اور چلے آئے۔ دیوبند پہونچے تو اب بخار نے زوردار حملہ کیا۔ پھر بمبئی جانا پڑا۔ علاج سے طبیعت سنبھلی، تاہم ڈاکٹر کا اشارہ تھا کہ آپ ابھی یہیں رہیں۔ حضرت الاستاذ کو آرام کی یہ تجویز بھی وقت کا زیاں معلوم ہوئی۔ ممبئی سے جلدی چلے آئے اور تحفۃ القاری کا کام دوبارہ شروع کیا۔ تفصیل کے لیے تحفۃ القاری جلد نمبر 9 دیکھیے۔

شعر و شاعری سے لا تعلقی

شعر و شاعری وقت کا خون بہت کرتی ہے۔ جتنے وقت میں ایک شاعر ایک نظم یا کوئی کلام مکمل کرتا ہے، اتنے وقت میں ایک اچھا مضمون ترتیب پا سکتا ہے۔ احقر کو اس کا بڑا تجربہ ہے۔ اب تو میرے ساتھ ایسا نہیں ہوتا، مگر مبتدیوں کے لیے یہ بڑی مہلک چیز ہے حضرت الاستاذ کا قلم پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اردو پر ان کی گرفت کس قدر شاندار تھی!! اگرچہ ان کی زبان سادہ اور لفظی صنعت گری سے آزاد تھی، مگر الفاظ اور جملوں کے برمحل استعمال کا فن انہیں خوب آتا تھا۔ ان کی کتابوں میں ایسے نمونے جگہ جگہ مل جائیں گے، مگر شاعری سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ بچپن میں اشعار یاد کرنے کا شوق انہیں ضرور تھا اور اسی شوق میں اپنا تخلص واصل بھی رکھ لیا تھا۔ تھوڑی بہت مشقِ سخن بھی جاری تھی، لیکن یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ تحفۃ الالمعی ج 6 میں حضرت الاستاذ فرماتے ہیں کہ: جب میں مظاہرِ علوم سہارن پور میں طالب علم تھا اور ابھی نابالغ تھا، اس وقت جنون کی حد تک مشاعرے سننے کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور خود بھی تک بندی کرتا تھا۔ واصل تخلص رکھ رکھا تھا۔ حضرت الاستاذ مولانا مفتی محمد یحیٰ صاحب قدس سرہ جو میرے سرپرست تھے، میرے حال سے واقف ہوئے

انہوں نے مجھے بلا کر یہ حدیث سنائی۔ اس کے بعد میرا حال یہ ہو گیا کہ میں نے وہ سب کاپیاں پھاڑ کر پھینک دیں، جن میں مشاعرے لکھ رکھے تھے۔ اور وہ ہزاروں اشعار جو مجھے یاد تھے، رفتہ رفتہ بھول گیا اور اب یہ حال ہو گیا ہے کہ اشعار پڑھتا ہوں تو وزن ٹوٹ جاتا ہے۔ صحیح شعر نہیں پڑھ سکتا، پڑھتے پڑھتے بھول جاتا ہوں۔ فالحمد لله علیٰ ذالك و جزی اللّٰه استاذی خیرا و غفرله و برد اللّٰه مضجعه۔ (598)

وزن کی سلامتی واقعی باقی نہیں رہی

اشعار سے رشتہ ٹوٹا تو اس سے قدر دور ہوئے کہ کلام کی تخلیق تو کیا ہوتی، اشعار کا پڑھنا بھی ان کے لیے مشکل ہو گیا۔ اس کی ایک مثال ان کی کتاب تحفۃ القاری سے پیشِ خدمت ہے، اپنی سخت علالت اور ہارٹ اٹیک کی کیفیت قلم بند کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”28 اکتوبر پیر کا دن عملِ جراحی کے لیے طے کیا، مگر 27 اکتوبر بروز اتوار دوپہر کے وقت سخت اٹیک آیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ساتھیوں نے فوراً ڈاکٹروں کو فون کیا۔ ڈاکٹر مع عملہ اتفاقاً شفاخانے میں موجود تھا۔ انہوں نے مجھے فوراً آپریشن کے لیے اٹھایا اور خبر آناً فاناً ملک اور بیرونِ ملک پھیل گئی اور ہر جگہ دعائیں شروع ہو گئیں، بعض جگہ ختم پڑھے گئے اور مکہ مکرمہ میں بعض حضرات طواف اور دعا میں لگ گئے“

ملک الموت اڑے ہیں جان لے کے جائیں گے
سر بسجدہ ہے مسیحا کہ میری بات رہے

اس شعر میں پہلا مصرع وزن سے باہر ہے اور نقل بھی مطابقِ اصل نہیں۔ اصل شعر اس طرح ہے:

ملک الموت کو ضد ہے کہ میں جاں لے کے ٹلوں

ممبئی میں ایک مختصر ترین تقریر

وقت کی قدر و قیمت ان کی طبیعت میں اس قدر راسخ تھی کہ اپنے مخاطبین کو اس کی حفاظت کی تلقین ضرور کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ میں ممبئی کے دارالعلوم عزیزیہ میں مدرس تھا حضرت الاستاذ اس ادارے میں چند منٹوں کے لیے تشریف لائے۔ مہتمم حضرت مولانا مظہر عالم قاسمیؒ نے ان سے طلبہ کے درمیان خطاب کی فرمائش کی۔ حضرت الاستاذ نے اسے قبول کرتے ہوئے نہایت مختصر تقریر کی۔ خطبہ کے بعد فرمایا: عربی کا مقولہ ہے: ”من جد وجد“ پھر فرمایا کہ محنت اور جفاکشی انسان کو منزل تک پہنچا کر دم لیتی ہے، اس لیے آپ اپنے مقصد کے حصول میں اپنا وقت صرف کریں، منزل مل کر رہے گی۔ بس اتنی سی بات پر ان کا خطاب مکمل ہو گیا۔

مفتی صاحب اور نہی عن المنکر

کسی برائی کو دیکھ کر تکلیف کا ہونا زندہ ایمانی کی علامت ہے۔ احادیث میں آیا ہے کہ تم میں سے جو کوئی کسی گناہ کو دیکھے تو چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے روکے، اگر اس کی ہمت نہ ہو تو کم از کم زبان سے روک دے۔ یہ بھی اگر بس میں نہ ہو تو دل سے اسے گناہ سمجھے، اور یہ ایمان کا سب سے کمزور حصہ ہے۔ حضرت الاستاذ نہی عن المنکر کے باب میں بڑے عزیمت والے واقع ہوئے تھے۔ کسی گناہ پر خاموش رہنا ان کی طبیعت میں نہیں تھا۔ وہ جو کہتے، ڈنکے کی چوٹ پر کہتے۔ بلاخوفِ لومۃ لائم کہتے۔ انہیں اس کی پرواہ نہیں تھی کہ کوئی کیا کہے گا۔ اس طبیعت کی بنا پر ان پر سخت حالات بھی آئے، لیکن اپنے موقف سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔

مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ صاحب کی تحریک میں پیدا شدہ خامیوں پر گرفتیں

کم و بیش سو سال قبل حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی صاحبؒ نے مسلم عوام میں اسلامی ماحول بنانے کے لیے ایک گشتی نظام چلایا، جسے تبلیغی جماعت کا نام دیا گیا۔ اس

جماعت سے اللہ نے بڑا کام لیا، لیکن آہستہ آہستہ اس میں کچھ خامیاں سر اٹھانے لگیں۔ جن علمائے امت نے اس کی خامیوں کی نشان دہی کی، ان میں حضرت الاستاذ بھی ہیں۔ وہ دورۂ حدیث کے اسباق میں کسی مناسب موقعے پر اس پر بھی اصلاحی تبصرے کرتے تھے۔ ملک و بیرونِ ملک کے دیگر جلسوں اور نشستوں میں بھی ان خامیوں کو دور کرنے کے لیے اصحابِ جماعت کو متوجہ کیا۔ مولانا سعد کاندھلوی صاحب اور دار العلوم دیوبند کے درمیان جو خطوط کا سلسلہ چلا ان میں حضرت الاستاذ کے دستخط بھی ہیں۔ پھر جب جماعت دو ٹکڑوں میں بٹ گئی اور دار العلوم میں دونوں پر پابندی لگی تو جملہ اساتذہ کی طرح حضرت الاستاذ بھی غیر جانب دار تھے۔ اور دونوں سے فاصلہ بنائے ہوئے۔ بعضوں نے انہیں شوریٰ والوں کا حامی سمجھا تو انہوں نے سختی سے تردید کی۔ دار العلوم کے اس فیصلے کے بعد جن بڑے اساتذہ پر جارحانہ اور غیر اخلاقی تبصرے ہوئے، ان میں مفتی صاحب بھی ہیں، مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔

مفتی صاحب کا واضح موقف

مفتی صاحب صرف کہنے کی حد تک نہیں، جماعت کی غلطیوں پر قلم بھی چلاتے تھے اور بہت صاف الفاظ میں اپنا موقف رکھتے تھے۔ مولانا شعیب اللہ خان صاحب کی کتاب غلو فی الدین میں لکھتے ہیں کہ:

یہاں ایک سوال ہے کہ جماعت کا غلو جماعت کے بڑوں کو سمجھانا چاہیے، اس کو پبلک کے سامنے نہیں رکھنا چاہیے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پانی سر سے گزر گیا ہے۔ اب جماعت کے عوام و خواص ''انا انا ولا غیری'' کے زعم میں مبتلا ہو گئے ہیں؛ پس جب بات خواص تک محدود نہیں رہی تو قضیہ عوام کے سامنے رکھنا ضروری ہے۔ [ص 20]

اسلام اعتدال کا نام ہے

منکرات کے باب میں حضرت الاستاذ کے اس تصلب کی وجہ ان کا یہ موقف تھا کہ اسلام افراط و تفریط سے پاک مذہب ہے، اس میں کمی بیشی اور خلافِ شریعت کوئی آمیزش نہیں چلے گی۔ جس جماعت نے بھی غلو کا راستہ اپنایا وہ منزل چوک گئی اور ایک نیا فرقہ تشکیل پا

گیا، چناں چہ فرماتے ہیں کہ:

اسلام کے مزاج میں اعتدال ہے اور غلو اعتدال کے منافی ہے۔ اور عقائد کی خرابی اعمال کی خرابی سے ناشی ہوتی ہے۔ جس طرح عملِ صالح سے ایمان کو جلا ملتی ہے، اسی طرح اعتدال سے ہٹے ہوئے اعمال سے [اگر چہ وہ اعمالِ صالحہ ہوں] ایمان کو گھن لگ جاتا ہے اور وہ دن بدن کمزور ہوتا جاتا ہے، تا آں کہ وہ دائرۂ ایمان سے بالکل نکل جاتا ہے۔ جیسے قادیانی، غالی شیعہ اور منکرینِ حدیث وغیرہ فرقے اور جماعتیں حدود پار کر گئے ہیں اور ان کا اسلام سے کچھ تعلق باقی نہیں رہا اور اسلامی فرقے اور جماعتیں اگر چہ حدود میں ہیں، مگر ان کا اپنے عقائد و اعمال میں غلو کسی دن ان کے لیے وبالِ جان بھی بن سکتا ہے۔ ایضاً، [ص 19]

ممبئی کے حج ہاؤس میں غیر مقلدین کے خلاف مفتی صاحب کا خطاب

میں نے دارالعلوم میں اپنی طالب علمی کے بعد بھی مفتی صاحب کے بیانات متعدد مقامات پر سنے ہیں۔ ایک بیان 2001 میں ممبئی کے حج ہاؤس میں سننے کا موقع ملا۔ یہ غیر مقلدیت کے خلاف جلسہ تھا جو جمعیۃ علمائے ہند کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا تھا۔ اس وقت غیر مقلدین عالمِ عرب میں چھائے ہوئے تھے اور پورے شباب میں چل رہے تھے۔ احناف کے خلاف ان کی مہم کسی منہ زور آندھی سے کم نہ تھی۔ سعودی عرب نے مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تائید کے ساتھ شیخ الہند کا ترجمۂ کلام پاک چھاپ رکھا تھا، جو حاجیوں کو ہدیے میں دیا جاتا تھا۔ غیر مقلدین نے اپنی لگاتار کوششوں سے اسے ہٹوا کر محمد جونا گڑھی صاحب کا ترجمہ سعودی حکومت سے چھپوا لیا تھا۔ منکرینِ فقہ کے اس بڑھتے سیلاب پر بند ڈالنا ضروری تھا۔ جمعیۃ علمائے ہند اسی غیر مقلدیت کو لگام کسنے کے لیے ملک بھر میں تحفظِ سنت کانفرنس کے نام سے جلسے کر رہی تھی۔ یہ جلسہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ میں اس وقت دارالعلوم عزیزیہ میں مدرس تھا۔ جلسے میں شرکت کے لیے میں بھی روانہ ہوا۔ مجھے معلوم تھا کہ حضرت الاستاذ بھی تشریف لا رہے ہیں، اس زمانے میں موبائل کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ان کی

تقریر ٹیپ کرنے کے ارادے سے ایک ٹیپ ریکارڈ بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ مفتی صاحب کا خطاب شروع ہوا تو سب کی نگاہیں ان کی طرف ٹک گئیں اور کان ان کے الفاظ کی طرف ملتفت۔ خطاب بہتے دریا کی مانند رواں دواں تھا۔ بڑا علمی اور نہی عن المنکر سے لبریز۔ سلسلۂ کلام میں فرمایا کہ غیر مقلدین کے پاس علم و دلائل کچھ نہیں، بس پیسے کے بل پر اچھل رہے ہیں، جس دن تھیلی خالی ہو جائے گی ساری اکڑ فوں ختم ہو جائے گی۔

ایک شان دار لطیفہ

اس موقع پر انہوں نے ایک لطیفہ بھی سنایا تھا جو نفحۃ الیمن میں کچھ یوں ہے:

حضرت ابوبکر بن الخاضبہ محدث رات میں کچھ لکھ رہے تھے تو چوہے کا ایک جوڑا اچھلتا کودتا ان کے سامنے آیا، انہوں نے ایک کو پیالے سے ڈھانپ دیا۔ اس کے بعد دوسرے چوہے نے بار بار ایک ایک اشرفی لا کر ان کے سامنے رکھنا شروع کیا یہاں تک کہ آخر میں ایک چمڑے کی تھیلی اٹھا لایا جس میں ایک اشرفی تھی۔ اس سے انہوں نے سمجھ لیا کہ چوہے کے پاس اب کوئی اشرفی باقی نہیں رہ گئی ہے پھر انہوں نے پیالہ اٹھا لیا اور چوہا نکل کر اپنے جوڑے کے ساتھ اچھلتا کودتا بھاگ نکلا۔

تصویر کشی کے سلسلے میں حضرت مفتی صاحب کا موقف

حضرت الاستاذ منکرات کے خلاف بہت سخت تھے اور بے انتہا مخالف۔ جہاں موقع پاتے، سختی سے ان کی نکیر کرتے۔ ممبئی کی اسی تحفظِ سنت کانفرنس میں میں نے دیکھا کہ جب کچھ صحافی اپنے کیمرے چلانے لگے تو مفتی صاحب نے بڑی شد و مد سے منع کیا اور فرمایا کہ اگر یہ سب چلے گا تو میں چلا جاؤں گا، چناں چہ پھر کسی کو ہمت نہیں ہوئی۔ اس وقت تک موبائل اکا دکا کسی کے پاس ہوتا تھا اور جس کے پاس ہوتا وہ بڑا مال دار سمجھا جاتا۔ کیمرے اور چپ والے موبائل کا تو دور دور تک تصور نہ تھا۔

تصویر کشی پر دار العلوم دیوبند کا شروع سے ہی فتویٰ یہ ہے کہ وہ حرام ہے اور اس

کے جواز کی کوئی بھی صورت نہیں نکلتی۔ حکومتی مجبوری اور بات ہے۔ مفتی صاحب اس فتوے کے پرزور مؤید تھے اور پابندی سے اس پر عامل بھی۔ تصویر کشی کے خلاف ہمیشہ شمشیرِ بے نیام رہتے۔ اس کی قباحت وشناعت پر کھل کر اور پوری قوت سے بولتے تھے۔ فوٹو ڈیجیٹل ہو یا منقوش، جامد ہو یا متحرک، سب کو حرام کہتے تھے۔ اس بارے میں طلبہ کو بھی خاص تاکید تھی کہ کوئی بھی ان کا فوٹو نہ لے اور جو بھی تصویر کھینچے گا، قیامت کے دن میں اس کا دامن پکڑوں گا۔

ہم مسلک علما سے ناراضگی

وہ مسلکِ دیوبند سے وابستہ ان علما سے سخت نالاں بھی تھے جن کی تصویریں آئے دن اخبارات اور سوشل میڈیا میں شائع ہوتیں۔ وہ کہتے تھے کہ عجیب بات ہے! ایک طرف دارالعلوم تصویر کی ہر شکل کو حرام کہتا ہے اور دوسری طرف اس کے منتسبین دھڑلے سے کھنچوا بھی رہے ہیں۔ یہ دورنگی درست نہیں۔ یا تو دارالعلوم حرمت کے فتوے دینے چھوڑ دے یا اس کے منتسبین کیمرے سے ہٹ جائیں۔ فتوے اور عمل میں سخت تضاد کی وجہ سے دیوبندیت کے تئیں امت میں غلط پیغام جارہا ہے، اس سلسلے کا دروازہ بند ہوجانا چاہیے۔

بدعات کے خلاف سخت ترین رخ

اتباعِ سنت سے مضبوط وابستگی نے انہیں بدعات کا سخت حریف بنادیا تھا۔ وہ دوسروں کے خلاف تو بولتے ہی تھے، اپنوں کے خلاف بھی سخت تبصرے موقع کی مناسبت سے کرجاتے تھے۔ قبروں پر کتبے کو وہ حرام کہتے تھے۔ درس کے دوران حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کا ملفوظ مفتی صاحب کی زبانی میں نے خود سنا اور پھر ان کے قلم سے پڑھا بھی کہ دیوبندیت اور بریلویت میں پہلے بعد المشرقین تھا۔ بریلویت بدعت کے ساتھ کھڑی تھی اور دیوبندیت سنت کے ساتھ، لیکن اب فاصلے مٹتے مٹتے اتنے سکڑ گئے ہیں کہ دونوں میں صرف ایک بالشت کا فاصلہ رہ گیا ہے۔ انہیں کی زبانی سنیے:

آج سے تقریباً 30 سال پہلے حضرت اقدس مولانا محمد منظور نعمانی قدس سرہ سے

میں نے براہِ راست سنا ہے، آپ بریلویت کی رگ رگ سے واقف تھے، انہوں نے الفرقان شروع میں بریلی سے ہی نکالا تھا۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ اب دیوبند اور بریلی میں ایک بالشت کا فاصلہ رہ گیا ہے۔ یعنی بریلی دیوبند کے قریب نہیں آیا، وہ اپنے منہاج سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹا۔ دیوبند ہٹ کر ان کے قریب جا پہونچا ہے۔ [جلسۂ تعزیت کا شرعی حکم، ص39]

تعزیتی اجلاس بھی ناجائز

سنت سے محبت اور بدعت سے سخت نفرت ہی کا ایک واضح اثر یہ دیکھنے میں آیا کہ وہ جلسۂ تعزیت کو مسلکِ دیوبند کے خلاف کہنے لگے۔ ان کے بقول: جب تک مسئلہ منقح نہیں ہوا تھا، میں بھی ان جلسوں میں جاتا تھا، لیکن اب نہیں جاتا۔ ان کے اس موقف پر خوب علمی بحث ہوئی اور جواب اور جواب الجواب کا دور چلا۔ اس سلسلے کی پوری تفصیل کے لیے ان کی آخری تصنیف ''*جلسۂ تعزیت کا شرعی حکم'' ملاحظہ فرمائیں، اس کتاب میں بدعات کے خلاف ان کے تیور کچھ زیادہ نمایاں ہیں۔

دینی حمیت

بدعات وخرافات کے خلاف مہم پر مجھے یاد آیا۔ ابھی دو سال قبل بابری مسجد کے مسئلے پر جب دینی حلقے کے بعض مذہبی افراد نے نامناسب مشورے دیے اور مسجد کی منتقلی پر اپنا زور صرف کیا تو اس وقت میں نے ایک نظم بڑی تیز وتند لکھی تھی۔ یہ نظم بڑی مشہور ہوئی۔ شدہ شدہ حضرت الاستاذ تک بھی پہنچی تو بڑے خوش ہوئے۔ اس پر مجھے انہوں نے ملاقات کے لیے بلایا۔ مفتی صاحب مجھے نام سے جانتے تھے، مگر شکل سے ناآشنا تھے۔ مجھے بھی ان سے ملتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ ان کا رعب وداب مجھ پر اتنا تھا کہ میری کل ملاقاتیں 5 سے زیادہ نہیں تھیں۔ مفتی صاحب کے خادمِ خاص مولانا حکمت اللہ حنیف صاحب کا فون آیا کہ مفتی صاحب نے یاد فرمایا ہے۔ وہ آپ کی نظم سے بہت خوش ہیں۔ میری خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ میں اپنی قسمت پر نازاں تھا کہ فضل وکمال کے سلیماں جاہ نے مجھ ایسے بے بضاعت کو یاد کیا ہے۔ عصر بعد پہنچا تو مولانا حکمت اللہ حنیف صاحب نے خبر دی۔ مفتی صاحب کا چہرہ تمتمارہا تھا۔ فرمایا: تم نے نظم بڑی

شان دار لکھی ہے، اسے اپنے ماہ نامہ میں شائع کرو، تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے۔ میں نے اثباتاً سر ہلا دیا۔

بنات کے اقامتی مدارس پر مفتی صاحب کا موقف

حضرت الاستاذ کی ان غیر مترقبہ بے پناہ شفقتوں نے مجھے کھل کر بات کرنے کا حوصلہ دیا۔ آج وہ بڑے خوش گوار موڈ میں بھی تھے۔ میں نے لگے ہاتھ لڑکیوں کے اقامتی مدارس پر ان کی رائے جاننی چاہی تو فرمایا کہ اقامتی ادارے کا کوئی جواز نہیں۔ بنات کے مدارس بس اس شرط کے ساتھ کھولے جا سکتے ہیں کہ لڑکیاں محرم کے ساتھ جائیں، واپسی پر بھی محرم ساتھ ہو، پڑھانے کے لیے معلمات ہوں۔ میں نے کہا: حضرت! حدیثِ رسول ﷺ میں رجال کا لفظ بتاتا ہے کہ علم کے لیے دور دراز کا سفر کرنا مردوں کا وظیفہ ہے، نہ کہ عورتوں کا اس کا مطلب یہ کہ بنات کے اقامتی مدارس کی گنجائش نہیں۔ فرمایا: تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔

مفتی صاحب اور قبولِ حق

حضرت الاستاذ مفتی صاحب علم و معلومات کے معاملے میں خود کفیل واقع ہوئے تھے۔ ان کا جو بھی علم تھا وہ ان کے مطالعے کا کشید کردہ تھا۔ کسی بھی مسئلے پر وہ اپنی نظر سے دیکھتے تھے۔ اپنی تحقیقات کی روشنی میں انہیں جو راجح معلوم ہوتا اس پر جم جاتے تھے اور اس وقت تک جمے رہتے تھے، جب تک کوئی مضبوط دلیل ان کے خلاف نہ آ جائے۔ مضبوط دلائل کے بعد پھر وہ اپنی رائے بدل دیتے تھے۔ اہلِ حق کی پہچان یہی ہوتی ہے۔

تحفۃ الالمعی پر مفتی احمد خان پوری صاحب مدظلہ کا نقد

حضرت الاستاذ کی تصنیف تحفۃ الالمعی جب چھپ کر آئی تو کئی مقامات پر اس میں تعبیر کی غلطیاں تھیں، جن پر اہلِ علم کو سخت اشکال تھا۔ مفتی احمد خان پوری صاحب مدظلہ و دیگر نے ان کی نشان دہی کی، مفتی صاحب نے اگلی اشاعت میں انہیں درست فرما لیا اور ان کے تبصرے کو کتاب میں جگہ دی۔

حدیثِ جساسہ اور مفتی صاحب کا رجوع

ترمذی شریف میں دجال کے بیان سے پہلے جساسہ کا بھی تذکرہ ہے۔ مشہور صحابی حضرت تمیم رضی اللہ عنہ نے اپنی طویل حدیث میں دجال سے مکالمہ سے پہلے جساسہ سے بات چیت کو بیان کیا ہے۔ یہ ایک جانور تھا، جس کے بدن پر اتنے بال تھے کہ حضرت تمیم کو اس کا اگلا پچھلا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ واقعہ ترمذی سمیت احادیث کی کتابوں میں تفصیل سے آیا ہے۔ مفتی صاحب کی تحقیق میں یہ حدیث قابلِ استدلال نہیں تھی، اس لیے تحفۃ الالمعی میں اس پر سخت جرح فرمادی۔ اس تبصرے سے اہلِ علم میں بے چینی پھیلی۔ حضرت الاستاذ مولانا نعمت اللہ اعظمی صاحب مدظلہ نے اس کے رد میں باقاعدہ ایک رسالہ لکھا، جس میں مضبوط حوالوں کی روشنی میں حدیثِ جساسہ کو قابلِ استدلال بتایا۔ اس کے بعد مفتی صاحب نے بھی رجوع کرلیا۔ مفتی صاحب کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

پہلے تحفۃ الالمعی میں اس حدیث کی تشریح میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ نہایہ والے حاشیے سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔ پھر غور کرنے پر یہ بات سامنے آئی کہ حدیث کی سند تو صحیح ہے، اس کے متابع اور شواہد بھی موجود ہیں، اس لیے وہ ساری تشریح حذف کردی گئی اور اس کی جگہ یہ نئی تشریح لکھی گئی۔ [ص630، ج5]

حدیث اور سنت میں فرق

حضرت الاستاذ کی خاص بات یہ تھی کہ وہ طویل مطالعے کے بعد جو بھی موقف اپناتے، اس پر جم جاتے تھے۔ پھر ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے۔ ان کا علمی رد اگر مضبوط دلائل سے آجاتا تو رجوع کرنے میں بھی انہیں کوئی تامل نہیں ہوتا تھا۔ اس سلسلے کی کئی مثالیں پہلے پیش کی جا چکی ہیں۔ اس کی ایک مثال ”حدیث اور سنت کا فرق“ بھی ہے۔ مفتی صاحب کا موقف تھا کہ سنت اور حدیث میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے۔ ہر سنت حدیث ہوتی ہے لیکن ہر حدیث سنت نہیں۔ اپنے اس موقف پر مضبوط دلائل بھی رکھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ سنت کہتے ہیں ”الطریقۃ المسلوکۃ“ کو۔ وہ راستہ جس پر امت مسلسل چلتی آئی ہو، یعنی اس

حدیث سے امت کا عملی تعلق ہو، جب کہ حدیث آپ ﷺ کے قول، فعل اور کسی واقعہ کے وقت آپ ﷺ کی خاموشی کو کہتے ہیں۔ الطریقۃ المسلوکۃ والی شان ہر حدیث میں نہیں پائی جاتی۔ تفصیل کے لیے علمی خطبات ملاحظہ فرمائیں۔

ان کے اس موقف پر بعض اہلِ علم کی طرف سے قلمی نگارشات بھی آئیں، لیکن مفتی صاحب جمے رہے۔ ان کے خیال میں وہ نگارشات کوئی وزن دار نہیں تھیں۔

مفتی صاحب، سلوک و تصوف اور اخفائے حال

حضرت الاستاذ کی ایک خصوصیت اخفائے حال بھی ہے۔ اپنی جس خوبی کو وہ چھپا سکتے تھے، اسے چھپانے کی حتی الامکان سعی کرتے تھے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ کسی پہلو پر گفتگو فرما رہے ہیں، ضمناً ان کے کچھ کمالات بھی سامنے آنے لگے تو لاحول ولاقوۃ کہہ کر بات وہیں روک دی اور پوری تفصیل القط۔ استاذِ اکبر کے بارے میں اب تک یہی سمجھا جاتا رہا ہے کہ وہ محض علومِ ظاہرہ کے شہ سوار تھے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ علومِ باطنہ یعنی سلوک و معرفت میں بھی انہیں درک حاصل تھا۔ اس کمال کے حصول کے لیے انہوں نے اولاً جنیدِ زمانہ شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کی مجالس میں شرکت کی اور بار بار حاضری دی۔ پھر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کو اپنا مرشد بنایا اور آٹھ سال مسلسل رمضان میں ان کے ساتھ گزارے۔ ایک سال تو ایسا بھی ہوا کہ کرائے پر مکان لے کر پورے اہل وعیال کے ساتھ رمضان کی ساعات بسر کیں۔ کرایہ خود حضرت شیخ الحدیثؒ نے ادا کیا۔ ان کے وصال کے بعد از خود کسی سے مربوط نہیں ہوئے۔ ایک بار مفتی مظفر حسین مظاہریؒ دیوبند تشریف لائے تو حضرت الاستاذ سے ملاقات کر کے فرمایا کہ آپ جیسے اہلِ کمال کا میدان میں آنا ضروری ہے۔ میں آپ کو خلافت دیتا ہوں، مزید تفصیل کے لیے سہارن پور تشریف لائیں۔ حضرت الاستاذ جمعرات کو ترمذی شریف کا درس دے کر بذریعہ بس سہارنپور تشریف لے گئے۔ وہیں پیر و مرشد نے تحریری خلافت بھی عطا فرمائی۔ لیکن بیعت وارشاد کا سلسلہ گرم دمی کے ساتھ کبھی جاری نہیں رکھا۔ بیعت لی بھی تو صرف ان علما کی، جو دس دس سال کسی ادارے میں درس

دے چکے تھے۔ آپ کا نظریہ یہ تھا کہ علما صرف اشارے سے سمجھ جاتے ہیں، جب کہ غیر علما کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے، اسی لیے بطور مرشد آپ کی سرگرمی برائے نام ہی رہی۔ فرماتے تھے کہ میرے پاس دینے کو بہت کچھ ہے، مگر وقت نہیں۔ لوگوں کو مرید کرلوں، مگر وقت نہ دے سکوں تو اس سلسلے کا فائدہ کیا، لہذا میں عوامی بیعت کے لیے کبھی آمادہ نہیں ہوا۔

حضرت الاستاذ کو ایک خلافت تو مفتی مظفر حسین مظاہریؒ صاحب سے ملی تھی اور دوسری خلاف مولانا محمود صاحبؒ خادمِ شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ سے۔ یہ حصول یابیاں بڑی اہم ہیں۔ اتنی بڑی کامیابی کسی کو مل جائے تو اس کی تشہیر سے نہیں چوکتا اور کسی نہ کسی بہانے سے اس کا ذکر کرہی جاتا ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ مگر مفتی صاحبؒ نے اس کی بھنک کبھی بھی لگنے نہیں دی۔ درسِ نظامی کی مشہور کتاب ''الفوز الکبیر'' کو جب عربی زبان کا لباس پہنایا تو ان کے بھائی حضرت مولانا مفتی امین پالن پوری مدظلہ نے ''الخیر الکثیر'' کے نام سے اردو میں اس کی شرح لکھی۔ آغازِ کتاب میں صاحبِ تصنیف یعنی شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مفصل حالات قلم بند کیے تو اسے فارسی سے عربی میں منتقل کرنے والی شخصیت کا مفصل تعارف بھی مناسب سمجھا گیا۔ مفتی امین پالن پوری مدظلہ نے حالاتِ زندگی معلوم کیے تو بڑی مشکلوں اور منت سماجت سے آمادہ ہوئے۔ اسی موقع پر حصولِ خلافت کا یہ راز بھی کھلا۔ اخفائے حال کا یہ کمال سب کو نصیب نہیں ہوتا۔

حضرت الاستاذ کا ایک دل چسپ واقعہ

ترمذی شریف میں جمعہ کے فضائل میں ایک وجہ یہ بھی آئی ہے کہ اسی دن سیدنا حضرت آدم جنت سے نکالے گئے۔ اس پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ جنت سے اخراج فضیلت کی وجہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کا جواب حضرت الاستاذ یوں دیتے ہیں کہ کبھی کبھی اخراج بھی بڑی سعادتوں کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ اگر آدم جنت سے نہ نکالے جاتے تو خلافتِ ارضی کا منصب انہیں کیسے ملتا؟ پھر اپنا ایک واقعہ سنایا کہ میں مظاہرِ علوم میں زیرِ تعلیم تھا۔ اس وقت مفتی مظفر حسین صاحبؒ کا درسِ جلالین بہت مقبول تھا۔ سال کے آخر میں طلبہ میں یہ بات

پھیلی کہ اگلے سال جلالین کا درس مفتی مظفر حسین مظاہریؒ صاحب سے متعلق نہیں رہے گا۔ اس خبر سے اگلے سال جلالین میں جانے والے طلبہ میں بے چینی پھیل گئی۔ حضرت الاستاذ کے ہم جماعت کچھ طلبہ نے تعلیمات کو درخواست دی کہ آئندہ سال بھی جلالین مفتی صاحب کو دی جائے۔ اس درخواست پر جن تیرہ طلبہ کے دستخط تھے، ان میں میں بھی تھا۔ اس درخواست کا نقصان یہ ہوا کہ دستخط کنندہ سارے طلبہ کا اخراج ہو گیا۔ میرے والد مظاہرِ علوم کے شیدائی تھے۔ شوال میں مظاہر پہنچے اور مفتی یحییٰ صاحبؒ سے صورتِ حال عرض کی، انہوں نے تعلیمات کے نام سفارش لکھی، لیکن منظور نہ ہوئی۔ ناچار مولانا یحییٰ کاندھلویؒ نے فرمایا کہ یہاں داخلہ نہیں ہوا تو مایوسی کیوں! میں سعید احمد کو دارالعلوم میں داخل کرواتا ہوں۔ وہ دیوبند آئے اور داخلہ کروایا۔ حضرت الاستاذ کہتے ہیں کہ اگر مظاہر سے میرا اخراج نہ ہوا ہوتا تو آج اتنے بڑے مقامات تک کیسے پہنچ پاتا۔ معلوم ہوا کہ کبھی کبھی اخراج بھی بڑی نعمت بن جاتا ہے۔

جامع الکمالات

معاصر آدمی جلدی کسی کی تحسین نہیں کرتا۔ ہم عصروں سے پذیرائی کے کلمات حاصل کرنا گویا ہتھیلی پر سرسوں اگانا ہے، لیکن مفتی صاحب کی بات ہی جدا ہے، وہ ایسے خوش قسمت اور سعادت مند ہیں کہ معاصرین نے بھی انہیں خوب سراہا۔ مشہور ناقد و مصنف مولانا ابوبکر غازی پوریؒ، جنہوں نے بعد میں تحفۃ الالمعی کی اغلاط پر کئی صفحات لکھ دیے تھے، زمزم میں ان کے قلم سے اعتراف کے ایسے ایسے جملے ہیں کہ ان پر رشک ہی کیا جاسکتا ہے۔ ایک جگہ مولانا لکھتے ہیں:

> حضرت مفتی صاحب نے تھوڑے عرصہ میں پورے ایک ادارے کا کام کیا ہے اور کرتے جارہے ہیں۔ ان کی عمر اگر ڈھل رہی ہے تو ان کے قلم کی جوانی اور اس کی رعنائی بڑھتی جارہی ہے۔ اور یہ سب اللہ کی توفیق ونصرت کے بعد برکت ہے کہ مفتی صاحب کو بلا وجہ کی مجلس جمانے سے مطلب نہیں ہے۔ کثرتِ اختلاط سے ان کو اجتناب ہے۔ ان کو اپنے وقت کی قدر و قیمت کا اندازہ ہے۔ مکمل یکسوئی اور دل جمعی کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہتے

ہیں۔ سیاست سے مولانا کا دور کا واسطہ نہیں ہے۔ علمی کام میں لگے رہنا اور مست رہنا یہی ان کا مزاج اور یہی ان کی طبیعت ہے۔ [تحفۃ الالمعی، ج6، ص623]

موجودہ زمانے کے سلطان القلم، عربی و اردو کے یکساں بطلِ جلیل حضرت مولانا نورِ عالم خلیل امینی نے کئی بار مجھ سے کہا کہ دارالعلوم کے جس استاذ کے علم و تحقیق پر مجھے سب سے زیادہ اعتماد ہے وہ مفتی صاحب ہی ہیں۔ ان کے پاس تقریباً ہر سوال کا جواب رہتا ہے۔ علمی بات یا پیدا شدہ اشکال میں ان سے معلوم کر لیتا ہوں اور وہ بھی اچھی طرح مسئلے کی توضیح کر جاتے ہیں۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جو بات انہیں معلوم نہیں ہوتی تو اپنے عدمِ علم کا صاف صاف اعلان کر دیتے ہیں۔ میری نظر میں وہ ہر طرح کامل و مکمل عالم ہیں۔

مفتی صاحب کے تصنیفی کارنامے

حضرت الاستاذ مفتی صاحب کی تدریس شہرۂ آفاق تو تھی ہی، تصنیف کا انداز بھی بڑا مستند تھا۔ ان کے قلم سے 44 کتابیں نکلیں۔ دیگر کتابوں پر حواشی اور تعلیقات کو بھی ملا لیا جائے تو یہ تعداد 50 سے بھی اوپر پہونچتی ہے۔ مفتی صاحب نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کو مرجعیت مل گئی۔ ان کی قلمی خدمات کا بھی ایک طویل سلسلہ ہے، جو اس مختصر سے مضمون میں نہیں سما سکتا۔ یہاں صرف چند کتابوں پر ہلکا پھلکا تبصرہ مقصود ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ کی شرح رحمۃ اللہ الواسعہ

حجۃ اللہ البالغہ مُسند الہند الامام المحدث شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تصنیفِ لطیف ہے اس میں مصنف نے کمالِ مہارت سے اسلامی تعلیمات اور احکام کی حکمتیں بیان کی ہیں عبادات، معاملات، معاشرت وغیرہ مسائل پر کھل کر بحث کی ہے۔ متعارض احادیث کے درمیان خوب صورت تطبیق بھی دی گئی ہے۔ دین کی تفہیم کے لیے انہوں نے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ بڑا دل چسپ، لاجواب اور عدیم المثال ہے۔ کتاب میں متعدد ابواب کے تحت قیمتی مباحث ہیں۔ یہ کتاب عربی میں ہے اور ابتدا سے ہی اہلِ علم کے نزدیک سرمۂ نورِ نظر۔

اس کتاب کی تدریس کا آغاز دارالعلوم میں حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ نے کیا، ان سے پہلے یہ کبھی داخلِ نصاب نہیں تھی اور اکثر وبیش تر انہیں سے متعلق رہی حضرت حکیم الاسلام کا حکیمانہ طرزِ کلام ہمیشہ مقبول رہا ہے اوران کی حکمت وتعقل میں بلاشبہ اس کتاب کا بڑا حصہ تھا۔ مشہور عالم ومصنف مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ نے بھی دارالعلوم میں ایک دو برس اس کی تدریس کی ہے۔ پھر یہ کتاب حضرت الاستاذ سے متعلق ہوئی۔ اہلِ علم و مطالعہ جانتے ہیں کہ اسے پڑھانا جوئے شیر لانا ہے۔ اس کتاب کی پیچیدگی کا عالم یہ ہے کہ دارالعلوم میں ایک مرتبہ اس کی تدریس کا مسئلہ کھڑا ہوا تو کوئی بھی سامنے نہ آسکا۔ ہمت کر کے ایک استاذ آئے بھی تو مراجع کی نشان دہی کی شرط کے ساتھ۔ کوئی معاون کتاب نہ دیکھ کر وہ بھی پیچھے ہٹ گئے، لیکن یہی کتاب جب حضرت الاستاذ کے پاس آئی تو انہوں نے اسے چیلنج کے طور پر لیا اور پھر پوری تن دہی سے اس کی تدریس سے عہدہ برآ ہوئے۔ بعض جگہ پر مشکلات پیش آئیں اور بے چینی بڑھی تو ان کا حل خواب کے ذریعے ملا۔ پھر تو اس کتاب سے ایسی محبت ہوئی کہ اس سے لپٹ کر رہ گئے۔ اس کو ایڈٹ کیا اور اپنے گراں قدر تعلیقات کے ساتھ اپنے مکتبہ سے شائع کیا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ رحمۃ اللہ الواسعہ کے نام سے اس کی اردو شرح بھی لکھی، جو پانچ جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایک ایسے وقت میں، جب کہ اس کے حل کے لیے کسی بھی زبان میں کوئی معاون کتاب نہیں تھی، حضرت الاستاذ نے اپنی انتھک کوششوں سے اس کی شرح لکھی اور کیا لاجواب لکھی!! ان کی یہ شرح کسی بھی زبان میں اب تک کی واحد شرح ہے۔ جس طرح حجۃ اللہ البالغہ اربابِ فضل وکمال کی نگاہوں میں محبوب و مقبول رہی ہے، امید ہے کہ رحمۃ اللہ الواسعہ بھی اسی کے شانہ بشانہ اپنی اہمیت وافادیت درج کراتی رہے گی۔

رحمۃ اللہ الواسعہ کی تصنیف کے دوران عجیب و غریب واقعات

حجۃ اللہ البالغہ کا مختصر تعارف آپ پڑھ چکے ہیں۔ یہ کتاب جب مفتی صاحب سے وابستہ ہوئی تو آپ نے پوری لگن سے اسے پڑھایا۔ پھر دن رات لگ کر سالہا سال کی

عرق ریزی کے بعد اس کی شرح بھی تیار کر ڈالی۔ اس کتاب کی تصنیف میں نصرتِ غیبی کا خاصا دخل رہا ہے۔ دار العلوم کے استاذ محترم جناب مولانا اشتیاق احمد در بھنگوی زید مجدہم کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ حضرت! آپ اسے حل کیسے کرتے ہیں؟ اس کے لیے کوئی معاون کتاب بھی دیکھتے ہیں کیا؟ تو فرمایا: کچھ نہیں۔ حجۃ اللہ کے مسلسل مطالعہ سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاہ صاحب ساتویں آسمان کی بات کرتے ہیں۔ اس کے لیے بہت غور کرنا پڑتا ہے۔ مولانا در بھنگوی کے بقول: حضرت الاستاذ فرماتے تھے کہ ایسا کئی مرتبہ ہوا کہ کوئی عبارت سمجھ میں نہیں آئی۔ پورا زور لگا لیا، مگر عقدہ نہ کھلا، اسی حال میں آنکھ لگ گئی۔ دیکھا کہ کوئی صاحب تشریف لائے اور انھوں نے متعلقہ مقامات کی ایسی تشریح کر دی کہ طبیعت منشرح ہوگئی۔ آنکھ کھلی تو وہ مقامات حل تھے۔ ایک بار تو اور بھی عجیب قصہ ہوگیا۔ کسی مقام پر بری طرح پھنس گئے۔ بات کسی طرح نہ بن سکی۔ سوئے تو دیکھا کہ خاکی رنگ کے دراز کرتے میں ملبوس ایک بزرگ شخصیت تشریف فرما ہے اور متعلقہ بحث کی توضیح کر رہی ہے مارے خوشی کے آنکھ جو کھلی تو دیکھا کہ خواب والے وہی بزرگ آنکھوں کے سامنے ہیں اور ان کے پاس سے واپس جا رہے ہیں، پھر آنگن کی طرف نکلے۔ ان کے پیچھے مفتی صاحب بھی گئے تو دیکھا کہ کوئی بھی نہیں تھا۔

تحفۃ الالمعی کا تعارف

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ترمذی شریف کے اسباق حضرت الاستاذ سے 1402ھ میں متعلق ہوئے۔ حضرت کی خاص بات یہ تھی کہ وہ ہر سبق سے پہلے معقول تیاری کرتے تھے اور خاص ترتیب سے ان کا درس ہوتا تھا، جس کا عمومی اور نقد فائدہ یہ تھا کہ طلبہ کا ذہن ان کے دروس سے فوراً ہم آہنگ ہو جاتا تھا۔ حضرت الاستاذ نے بعد میں ہر سبق کو ریکارڈ کرانے کا بھی اہتمام کیا۔ تحفۃ الالمعی اور تحفۃ القاری کی کئی جلدیں اسی طرح تیار ہوئیں۔ تحفۃ الالمعی بڑے سائز میں آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے اور ہر جلد کم وبیش ساڑھے چھ سو

صفحات لیے ہوئی۔ شروع کی تین چار جلدیں درسی تقریروں کا مجموعہ ہیں اور بقیہ جلدیں باقاعدہ تصنیف کردہ۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ خالص درسی انداز لیے ہوئے ہے۔ پہلے ترجمۃ الباب ہے اور پھر اس کے ذیل میں آنے والی ساری حدیثوں پر پوری بحث۔ پھر ان احادیث کا ترجمہ، پھر تشریح اور اس کے بعد متن۔ متن کے بعد راویوں پر کلام لغات کی تحقیق و تشریح وغیرہ۔ یعنی بالکل اسی ترتیب پر، جس پر ان کے اسباق کا التزام رہا ہے۔

اس کتاب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ہر فقہی مسئلے پر تنقیحی کلام ہے۔ مباحث کو مکمل طور پر الم نشرح کر دیا گیا ہے۔ تقریر کا سائز حسبِ ضرورت ہے۔ نہ بلا وجہ طوالت ہے، نہ بے سبب اختصار۔

اس کتاب کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اختلافِ ائمہ کو کم سے کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کے لیے ایک نئی تعبیر بھی تراشی گئی ہے، جس کا عنوان ہے کہ ''یہ اختلاف نص فہمی کا ہے، دلائل کا نہیں''، حالانکہ اس نئے نکتے پر بعض اہلِ علم نے سخت اشکالات وارد کیے ہیں، تاہم بہت سے اہلِ علم نے اسے قبول بھی کیا ہے۔

اس کتاب کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ پوری بحثیں آسان الفاظ میں ہیں جن سے مفاہیم کا اخذ و التقاط سہل تر ہو گیا ہے۔ موقع کی مناسبت سے جگہ جگہ تفریحی جملے بھی ہیں واقعات اور مشاہدات بھی ہیں۔ عربی ضرب الامثال کی قریب الفہم تشریح بھی ہے۔ مثلاً: احادیث کے ذخیرے میں جابجا ایک جملہ آتا ہے: یجر ثوبہ، جس کا لفظی معنیٰ ہوتا ہے کہ لنگی گھسیٹتے ہوئے فلاں کام کیا۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ ایک اسلوبِ بیان ہے۔ حقیقتِ لفظیہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس جملے کی غرض وغایت تیزی سے اٹھنے کو بتانا ہے۔ آدمی لنگی پوش ہو یا پاجامے میں، زمین سے اس کا گھسٹنا پایا جا رہا ہو یا نہیں، بہر صورت یہ تعبیر اختیار کی جا سکتی ہے۔ میری طالب علمی کے دور میں حلِ ترمذی کے لیے طلبہ کی تپائیوں پر درسِ ترمذی دیکھی جاتی تھی، اب تحفۃ الالمعی سکۂ رائج الوقت ہے۔ یہ کتاب بلا شبہ حلِ

ترمذی میں انمول اضافہ ہے اور خاص بات یہ کہ از اول تا آخر ترمذی کا کوئی متن کلام سے خالی نہیں ہے۔

تحفۃ القاری

حضرت الاستاذ کا ایک اور بڑا کارنامہ تحفۃ القاری کی تصنیف ہے۔ یہ بخاری شریف کی اردو شرح ہے۔ بارہ جلدوں میں۔ اور اہلِ علم وفن میں بے حد مقبول۔ شروع کی پانچ جلدیں درسی تقریروں پر مشتمل ہیں۔ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جلدیں تصنیف بھی ہیں اور تقریر بھی، جب کہ نو سے بارہ جلدیں کل کی کل تصنیف ہی ہیں۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ رحمۃ اللہ الواسعہ اور تحفۃ الالمعی کی طرح یہ بھی مکمل بخاری کی شرح ہے۔ کوئی حدیث شرح سے خالی نہیں۔ ایجاز واطناب کے عیب سے پاک۔ ضروری مقامات پر مکمل کلام ہے اور جہاں کسی طویل بحث کی ضرورت نہیں، وہاں سے اختصار کے ساتھ گزر گئے ہیں۔ بقیہ دو شروحات کی طرح اس میں بھی متن پر اعراب لگا دیا گیا ہے۔ ترجمہ اور تشریح بھی ہے۔ بخاری شریف کے عنوانات کے بارے میں مشہور ہے کہ فقہ البخاری فی تراجمہ، یعنی امام بخاری کی شانِ فقاہت تراجمِ ابواب سے واضح ہوتی ہے۔ انہیں سے سمجھا جا سکتا ہے کہ امام بخاری محض محدث ہی نہیں، مہتم بالشان فقیہ بھی تھے۔ حضرت الاستاذ نے بخاری کے تراجم پر بھی کھل کر کلام کیا ہے۔ جا بہ جا اصولِ حدیث پر بھی گفتگو موجود ہے۔ ترتیب واسلوب وہی تحفۃ الالمعی والا ہے۔ بہت سے مدرسین اسی کتاب کی مدد سے شیخ الحدیث بن گئے۔ کتاب بڑی مقبول ہے اور متداول۔

چند دیگر تصنیفات

یہاں صرف تین کتابوں کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ مختصر مضمون میں سب کے تعارف کی گنجائش کہاں! یہاں صرف چند مشہور کتابوں کے نام پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ 1: کامل برہانِ الٰہی۔ یہ اصلاً رحمۃ اللہ الواسعہ ہی ہے، فرق اتنا ہے کہ اس میں حجۃ اللہ البالغہ کا متن اور ترجمہ موجود نہیں۔ یہ کتاب چار جلدوں میں ہے۔ 2: ہادیہ شرح اردو کافیہ۔ اس

کتاب میں کافیہ کو نہایت آسان زبان اور ترتیب کے ساتھ حل کیا گیا ہے۔ 3: آسان نحو۔ عربی کے ابتدائی بچوں کے لیے زبردست کتاب ہے، یہ دو حصوں میں لکھی گئی ہے۔ 4: آسان صرف۔ یہ کتاب تین حصوں میں ہے اور ابتدائی طلبہ کے لیے مفید تر۔ 5: آسان منطق۔ یہ کتاب تیسیر المنطق کی تسہیل ہے۔ 6: فیض المنعم۔ مقدمۂ مسلم کی اردو شرح ہے اصولِ حدیث کے طالب علموں کے لیے نایاب تحفہ۔ 7: تحفۃ الدرر۔ یہ نخبۃ الفکر کی کامیاب شرح ہے اور بے حد مقبول۔ 8: مفتاح التہذیب۔ علامہ سعد الدین تفتازانی کی کتاب: تہذیب المنطق کی زبردست شرح ہے۔ شرح تہذیب کے حل میں بڑی معاون۔ 9: آپ فتویٰ کیسے دیں؟۔ یہ کتاب علامہ محمد امین ابنِ عابدین شامی کی شرحُ عقود رسم المفتی کی اردو شرح ہے۔ 10: حیاتِ امام ابوداؤد۔ اس میں مشہور محدث امام ابوداؤد سجستانی کے حالات تفصیل سے قلم بند کیے گئے ہیں۔

مفتی صاحب اور تجارت

بعید ترین ماضی کے اکابر علما درس وتدریس کے ساتھ تجارت سے بھی وابستہ تھے اور تجارت ہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ یہ مزاج تقریباً اب ختم سا ہو گیا ہے۔ ادھر چند سالوں سے علمائے امت تجارت کی طرف بھی مائل ہوئے ہیں، جو بڑی خوش آئند بات ہے۔ حضرت الاستاذ نے بھی مکتبہ حجاز دیوبند کے پلیٹ فارم سے اسلافِ قدیم کے طرز پر کتابوں کی تجارت شروع کی، جس میں الحمد للہ بڑی کامیابی ملی۔ مرفہ الحالی آئی، حالات مزید بہتر ہوئے، پھر حجِ بیت اللہ کی سعادت بھی حصے میں آئی۔

پوری تن خواہ واپس کر دی

مالی حالت مستحکم ہوئی تو تن خواہ لینی بند کر دی۔ 1423ھ سے بلا مشاہرہ پڑھاتے رہے۔ اپنی تدریس کے دور میں جتنی تنخواہیں پائی تھیں، سب متعلقہ مدارس کو واپس کر دیں۔ دار العلوم اشرفیہ راندیرا اور دار العلوم دیوبند سے ہر ماہ جتنے روپے ملے، سب ایک ایک کر کے لوٹا دیے۔ واپس کی ہوئی کل رقم 9 لاکھ 49 ہزار آٹھ سو چار روپے پچھتر پیسے ہے

یہ ایک بہترین اور مثالی قدم تھا، جسے اربابِ فضل وکمال نے استحسان کی نگاہوں سے دیکھا اپنے اس عمل سے گویا یہ بتا دیا کہ اساتذہ کو چاہیے کہ مدارس پر بوجھ نہ بنیں اور وسعت کے وقت محض حسبۃً للہ اپنی خدمات پیش کریں۔

حضرت الاستاذ بحیثیت قوّام البیت

حضرت الاستاذ قوام البیت یا بالفاظِ دیگر گھریلو ذمے دار کی حیثیت سے بھی ممتاز ترین مقام رکھتے ہیں۔ بچوں کی دینی تربیت اس انداز سے کی کہ اس پر ہر نیک بندے کو رشک آسکتا ہے۔ ان کے سارے فرزند حافظ ہیں۔ ساری بیٹیاں حافظہ ہیں۔ حتیٰ کہ ساری بہوویں بھی۔ نظام الاوقات ایسا بنایا کہ گھر کی ساری مستورات حفظ کی دولت آسانی کے ساتھ سمیٹنے میں کامیاب رہیں۔ حافظ بیٹے، بیٹیوں اور بہوؤں کی اتنی بڑی تعداد کسی ایک مسلم گھرانے میں شاید ہی مل سکتی ہے۔

صبرِ جمیل کا حسین عنوان

مفتی صاحب صبرِ جمیل کے باب میں بھی بڑے نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے بڑے فرزند مولانا رشید احمد کی شہادت کے الم ناک سانحے کے وقت مفتی صاحب انگلینڈ کے سفر پر تھے۔ واپس تشریف لائے تو اپنے گھر کے افراد کو جمع کیا۔ دونوں یتیم پوتوں کو بھی بلایا۔ پھر وصیت کی کہ جب تک میں زندہ ہوں یہ دونوں پوتے میری پرورش میں رہیں گے میرے مرنے کے بعد میرے ترکے میں سے ان کو بھی اسی قدر حصہ ملے گا، جس قدر میرے بیٹوں کو۔ یہ ترکہ میرے تہائی مال میں سے بطور وصیت کے ملے گا۔ مفتی صاحب کی خواہش تھی کہ ان کے بیٹوں کی تعداد بارہ ہو جائے، اس طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت الاستاذ نے فرمایا: اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میرا ایک بچہ لے لیا، مگر اس کے بدلے میں دو بیٹے عنایت کیے۔ اب میں بارہ لڑکوں کا والد ہوں۔

ایسے غم آگیں ماحول میں استاذِ اکبر کا صبر، شکر اور علمی استحضار حیرت انگیز ہے۔

اھلیہ کی وفات پر مفتی صاحب کا رد عمل

23 مئی 2011 میں ان کی رفیقۂ حیات بھی داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئیں۔ ان کی وفات پر تعزیت کے لیے آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ہمارے جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند سے بھی ایک وفد تعزیت کے لیے پہونچا، جس میں میں بھی شریک تھا۔ میں نے مفتی صاحب کو دیکھا کہ ہمیشہ کی طرح پُر سکون ہیں اور تبسم ریز بھی۔ ہم سے اس طرح بات کر رہے تھے، جیسے ان کے یہاں کچھ ہوا ہی نہ ہو، حالانکہ ان پر قیامت گزر چکی تھی۔

ٹھیک اسی دن حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی بجنوریؒ کی اہلیہ کا بھی سانحۂ ارتحال پیش آیا تھا، تعزیت کے لیے ان کے یہاں بھی پہنچے تو وہی طمانیت، وہی سکونِ دل اور وہی حسبِ معمول کیفیت تھی۔ میں حیران تھا کہ اتنے بڑے سانحے کے بعد بھی ان کا انداز وہ تھا، جیسے کوئی غیر معمولی واقعہ پیش ہی نہ آیا ہو۔ ایسے تھے ہمارے اساتذہ۔

مفتی صاحب کی صحت

حضرت الاستاذ برسوں سے جادو کے شکار تھے۔ اس سے بڑے پریشان بھی رہتے عرصے سے شوگر نے بھی جکڑ لیا تھا، ادھر کم وبیش پندرہ سال سے دل کی بیماری بھی لگ گئی تھی، مگر با ایں ہمہ ان کی صحت بحیثیتِ مجموعی قابلِ رشک تھی۔ بیماری کے عنوان سے ان کی چھٹیاں شاذ و نادر ہی ہوئی ہیں۔ وہ بڑی پابندی سے اسباق پڑھا رہے تھے۔ وہی طول طویل نشستیں۔ وہی لمبی چوڑی بحثیں۔ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح چلے جائیں گے۔

میں سب کو مار کر مروں گا

ادھر دو تین برسوں سے مفتی صاحب کی بیماری کبھی کبھی زیادہ بڑھ جاتی تو ان کی وفات کی افواہیں بھی گردش کرنے لگ جاتیں۔ ایک دن دارالحدیث آئے تو مزاحیہ لہجے میں کہا: تم سمجھتے ہو کہ میں مر جاؤں گا؟ سن لو میں ابھی نہیں مروں گا، بلکہ سب کو مار کر مروں گا۔ ان کے اس جملے سے اپنی صحت کے تئیں خود اعتمادی کو سمجھا جا سکتا ہے۔

بخاری شریف کا آخری درس

تین ماہ قبل رجب میں بخاری شریف کی آخری حدیث پڑھانے آئے۔ بالکل روایتی شان سے۔ نقاہت تھی، مگر اتنی بھی نہیں۔ سبق شروع ہوا۔ طالب علم کی قرات کے بعد

مفتی صاحب نے بولنا چاہا تو زبان ہی نہ کھلی۔ بڑی مشکل سے بولے بھی تو صرف اتنا: جو اللہ چاہے گا وہی ہوگا۔ ہر ممکن کوشش کے باوجود بھی جب زبان نے کوئی ساتھ نہیں دیا تو مجبوراً سبق روک دیا۔ پھر ہچکیوں کے ساتھ کر رونے لگے۔ یہ منظر بڑا ہی الم ناک تھا۔ بلبل کی طرح چہکنے والے محبوب استاذ کی یہ بے بسی دیکھی تو کوئی بھی طالب علم اپنے کو نہ روک سکا۔ پورا دار الحدیث دیوارِ گریہ بن گیا۔ نالہ وشیون سے طلبہ کا مجمع قیامت کا منظر پیش کر رہا تھا۔ بادلِ ناخواستہ مفتی صاحب اٹھے اور ہاتھ ہلاتے ہوئے درس گاہ سے نکل گئے:

اب کے جاتے ہوئے اس طرح کیا اس نے سلام
ڈوبنے والا کوئی ہاتھ اٹھائے جیسے

علاج کے لیے ممبئی روانگی

بوجھل قدموں اور ساکت زبان کے ساتھ دار الحدیث سے باہر نکلے تو اگلے دن بغرضِ علاج ممبئی پہنچ گئے۔ وہاں جا کر ابتدائی طبی امداد نے ہی صحت یابی کی نوید سنائی۔ اسی دوران کورونا وائرس نامی عالمی وبا کی بنا پر لاک ڈاؤن لگ گیا۔ مفتی صاحب کی چھوٹی بیٹی وہیں رہتی ہیں۔ ان سمیت متعلقین کی غیر معمولی خدمات اور توجہات کے طفیل صحت میں دن بدن بہتری دیکھی گئی۔ رجب کے بعد شعبان بھی صحت کے ساتھ نکل گیا۔ رمضان آیا تو تراویح کے بعد بیان کا سلسلہ بھی شروع کیا، جو سوشل میڈیا پر براہِ راست نشر ہوتا رہا۔ وہی علمی باتیں، وہی تفہیم، وہی تسہیل۔ ہم نے یہی سمجھا کہ سب خیریت ہے۔ عید الفطر میں دار العلوم کھلے گا تو ان کی تدریس کی مسند ایک بار پھر اپنی قسمت پر ناز کرے گی۔

مجھے کورونا نہیں ہے

حضرت الاستاذ کے بیانات کا مسعود سلسلہ ہنوز جاری تھا کہ 15 ویں رمضان کو طبیعت بگڑنے کی خبر نے تلامذہ، متعلقین اور متوسلین کے ہوش اڑا دیے۔ اسی دوران مفتی صاحب نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ مجھے ہلکا سا بخار ہے۔ جو موسم کی تبدیلی سے عموماً آجاتا

ہے۔ خیال رہے کہ طبی تجزیے کے مطابق مجھے کورونا نہیں ہے۔ اسی بیان میں یہ بھی کہا کہ میری ناسازئ طبع کے چلتے مجھے مولانا عبدالرؤف غزنوی صاحب نے کراچی سے فون کیا ہے کہ ان حالات میں آپ بیانات کم کریں۔ اسی طرح میرے ایک اور دوست نے درخواست کی ہے کہ بیان کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لیکن میں بیان کروں گا۔

پھیپھڑے میں پانی جمع ہو گیا ہے

پھر اتار چڑھاؤ کا دور شروع ہوا۔ دو دن کے بعد ان کے فرزند حافظ قاسم سعید صاحب نے خبر دی کہ پھیپھڑے میں پانی جمع ہو گیا ہے۔ اس خبر نے سب کو دہشت میں ڈال دیا۔ سارے متعلقین دعاؤں میں لگ گئے۔ پھیپھڑے میں پانی کا جمع ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ حالات کی سنگینی کے باوجود دعاؤں کا دور جاری تھا۔ اللہ نے چاہنے والوں کی لاج رکھ لی۔ وہ ایک بار پھر صحت کی طرف لوٹنے لگے۔ تشویش کی بات ختم ہو گئی۔

کیا مفتی صاحب کی وفات کورونا سے ہوئی؟

لیکن بحالی صحت کا یہ سلسلہ زیادہ دن نہ چل سکا۔ دو تین دن ہی گزرے تھے کہ ان پر ہارٹ اٹیک ہوا۔ ہسپتال لے جایا گیا تو ڈاکٹروں نے ایڈمٹ کرنے کے لیے کورونا کی منفی رپورٹ پہلے پیش کرنے کی شرط لگا دی۔ کئی ہسپتال کے چکر لگائے گئے، مگر سب کا ایک ہی جواب تھا۔ اسی رواروی میں ڈیڑھ دو دن ضائع ہو گئے۔ اخیر میں ملاڈ کے سنجیونی ہسپتال میں آئی سی یو وارڈ میں داخل کیا گیا۔ مرض کی شدت اور اس پر بھی تاخیر در تاخیر۔ اس کے باوجود طبیعت میں سدھار ہوا۔ آئی سی یو سے جنرل وارڈ میں لائے گئے۔ آم اور پان کھایا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہسپتال سے سالماً غانماً لوٹ آئیں گے، لیکن وا اسفاہ! صحت نے پھر بے وفائی کی۔ فرزندِ ارجمند حافظ قاسم سعید صاحب نے خبر دی کہ حالت تشویشناک ہے۔ دو تین روز سے ہوش میں نہیں ہیں۔ پھر پچیسویں رمضان کو یہ روح فرسا خبر بھی کانوں سے ٹکرائی کہ مفتی صاحب داعئِ اجل کو لبیک کہہ گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ موت کے کئی اسباب ایک ساتھ جمع ہو گئے۔ پھیپھڑے میں پانی جمع تو ہوا ہی تھا، دل

کے دورے کے بعد کورونا نے بھی حملہ کر دیا۔

کلمہ کے ورد کے ساتھ دنیا کو الوداع

ابھی مفتی صاحب بے ہوش ہی تھے۔ ناک میں وینٹی لیٹر لگا ہوا تھا۔ علاج کی کوشش جاری تھی کہ ہسپتال کی نرس کے بقول: اچانک رات کے دو تین بجے حضرت الاستاذ نے اسی بے ہوشی کے عالم میں وینٹی لیٹر ہٹا دیا۔ ساری ڈاکٹری چیزیں نوچ نوچ کر الگ کر دیں اور پھر کلمۂ طیبہ کا وظیفہ بہ آوازِ بلند زبان سے جاری ہو گیا، جس کا پہلا حصہ سراً تھا اور دوسرا جز جہراً۔ اللہ اللہ! بے ہوشی میں بھی کس قدر ہوش تھا!! کلمۂ طیبہ کا یہ ورد آخری سانس تک چلا۔

کتنی مبارک موت ملی!!

مفتی صاحب کی موت سعادتوں کا گنجینہ بن گئی۔ رمضان المبارک کے مسعود اوقات۔ ان پر مستزاد شب قدر کی امکانی رات۔ غریب الوطنی۔ پھر عالمی وبا بھی، جس میں مرنا شہادت کا مقام دلاتا ہے۔ اتنی ساری فضیلتیں اس محدث و مفسر کے حصے میں آئیں جو ساری زندگی گناہوں سے نفرت اور نیکیوں سے محبت کرتا رہا۔ سچ ہے:

این سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

وفات کی خبر نے علمی دنیا میں صفِ ماتم بچھا دی

وفات کی خبر جوں ہی عام ہوئی، ایک کہرام مچ گیا۔ علمی دنیا میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ لوگ قرآن کی تلاوت اور ایصالِ ثواب میں لگ گئے۔ ہندو بیرونِ ہند پر ایک جیسی ہی قیامت تھی۔ حقیقی فرزندوں ہی کیا، علمی فرزندوں کا حال بھی کچھ گفتنی نہ تھا۔ ہر زبان کہہ رہی تھی کہ ہمارے سروں سے ایک سائبان ہٹ گیا۔ علمِ نبوت کا ایک سفیر، سنتوں کا ایک عاشق، اسلاف کا ایک ترجمان اور دینِ قیم کا ایک اور منفرد، مستند و مقبول شارح ہمارے درمیان سے اٹھ گیا:

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

چہرے پر انوار کی بارش

فارسی شاعر نے کہا ہے:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

یعنی مردِ مومن کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ موت کے وقت اس کے لب تبسم سے سجے ہوتے ہیں۔ مفتی صاحب کا چہرۂ انور بھی مردِ مومن کی اس نشانی سے آراستہ و پیراستہ تھا۔ چہرے پر انوار کی برسات تھی اور لب پر تبسم اور سکون کی گل فشانی۔ بہجت و شادابی بھی خوب بلائیں لے رہی تھی۔ دیکھ کر کہا نہیں جاسکتا تھا کہ مفتی صاحب اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔

جنازے کی نماز کس طرح ادا ہوئی؟

وفات کا اہم سبب چوں کہ کورونا کو بتایا گیا، اس لیے طبی عملے نے سارے کام کورونا متاثرین والے انجام دیے۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ اہلِ خانہ نے انہیں غسل بھی دیا اور کفن بھی پہنائے۔ لاک ڈاؤن کے دوران میت کے ساتھ دس بارہ افراد سے زیادہ کو جمع ہونے کی اجازت نہیں، تاہم اس فقیہ النفس اور مردِ قلندر کی کرامت تھی کہ اس کی نمازِ جنازہ میں پسِ پردہ کافی افراد شریک ہوئے، جس کے لیے کئی کئی مکبرین کا بھی سہارا لیا گیا۔ نماز قبرستان سے متصل مسجد میں ہوئی۔ امامت فرزندِ ارجمند مولانا وحید احمد صاحب نے کی۔ اگر لاک ڈاؤن نہ ہوتا تو ممبئی جیسی جگہ میں بھی لاکھوں مسلمان جنازے میں شریک ہوتے۔ لیکن کیا کیجیے! مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔

جنازہ تدفین کے لیے قبرستان چلا تو ساتھ میں بس اتنے ہی لوگ تھے، جتنے کسی سنتی نکاح کی تقریب میں ہوتے ہیں۔ جسدِ خاکی اوشیوارہ گورستان پہونچا اور پھر علم و فضل اور فقہ و حدیث کا وہ آفتاب، جو پالن پور کے مطلع پر ظاہر ہوا، دیو بند کے افق پر چمکا، عالم کو روشنی بخشی، ممبئی میں غروب ہوگیا۔ اس طرح مدینۃ العلم دیو بند کا کوہِ نور عروس البلاد کی خاک

میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا گیا۔ ہماری سیاہ نصیبی کہ انہیں کاندھا تو کیا دیتے، مٹی ڈالنے کی سعادت کیا معنی، ان کے آخری سفر کے کسی بھی حصے کے گواہ بھی نہ بن سکے۔ دل کی اس حسرت پر سینہ کوبی کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے!! ناقدری کی سزا بھی تو ملنی چاہیے!

مفتی صاحب کی خوش بختی کہ حفاظ اور علما سے آباد ایک پورا خاندان تو چھوڑا ہی تھا، ہزاروں ہزار تلامذہ اور متوسلین کا قابلِ رشک ہجوم بھی چھوڑا۔ جائیے استاذِ اکبر! اور جنت الفردوس کی گلگشت کیجیے!

رئیس المحدثین حضرت مولانا

مفتی سعید احمد صاحب پالنپوریؒ

ایک عہد ساز شخصیت

مولانا محمد فرقان قاسمی ......مرکز تحفظ اسلام ہند

رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی تیسری طاق رات ختم ہوکر جب صبح صادق کا پرنور اجالا کرۂ ارض پر پھیل رہا تھا، چڑیوں کی خوشگوار چہچہاہٹ رب کائنات کی وحدانیت کا ثبوت دے رہی تھی، سورج اپنے آب وتاب کے ساتھ طلوع ہورہا تھا، اسی صبح کی اولین ساعتوں میں علم وعرفان کا ایک عظیم آفتاب غروب ہورہا تھا، جس کے دوبارہ طلوع ہونے کی قطعی امید نہ تھی۔ یہ خبر عالم اسلام پر بجلی کی طرح گری اور جنگل کی آگ کی طرح پوری دنیا میں پھیل کر ہر کسی کو غم و افسوس میں مبتلا کرتے ہوئے لاکھوں افراد کی آنکھوں کو نم کرگئی کہ عالم اسلام کی عظیم المرتبت عہد ساز شخصیت، ام المدارس دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث وصدر المدرسین، رئیس المحدثین، قدوۃ المفسرین، امام المتکلمین، فخر المحققین، سند الکاملین، زبدۃ المجتہدین، قطب العارفین، شیخ المشائخ، استاذ الاساتذہ حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ طویل علالت کے بعد ۲۵؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق 19؍مئی 2020ء بروز منگل کو اس دار فانی سے دار البقاء کی طرف کوچ کرگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، ان اللہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل شیء عندہ بأجل مسمی۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اسی دن شام پانچ بجے کے قریب مہاراشٹرا کے دارالحکومت ممبئی کے جوگیشوری

کے اوشیوارہ مسلم قبرستان میں حضرت علیہ الرحمہ کے فرزندار جمند حضرت مولانا حافظ وحید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور وہیں تدفین کی گئی۔ حضرت مفتی صاحبؒ کا انتقال ایک عظیم خسارہ ہے بلکہ ایک عہد کا خاتمہ ہے جو امت مسلمہ کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ لیکن موت ایک ایسی حقیقت ہے جسے قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں۔ موت کا کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ موت نے کسی کو نہیں چھوڑا۔ چاہے انسان ہو یا حیوان یا پھر چرند ہو یا پرند، سب جانداروں کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ یہ نظام اس دنیا کے پیدا کرنے والے کا ہی بنایا ہوا ہے اور اسی نے قرآن مجید میں فرمایا ہے: ’’ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت‘‘ (سورہ آل عمران، آیت :185) کہ ’’ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔‘‘ اور مومن کے لئے موت ایک عظیم نعمت ہے جو مالک حقیقی سے جا ملنے کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ انبیاء ورسل، صحابہ و تابعین اور اولیاء وصلحاء سب کو اس جہاں سے کوچ کرنا پڑا۔ اسی طرح حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ بھی اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

ایک سورج تھا کہ تاروں کے گھرانے سے اٹھا
آنکھ حیراں ہے کیا شخص زمانے سے اٹھا

رئیس المحدثین حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ کی ولادت کالیڑہ، ضلع بناس کانٹھا، پالن پور، شمالی گجرات میں جناب یوسف صاحبؒ کے گھر ۱۳۶۰ھ مطابق 1940ء میں ہوئی۔ آپ کے والدین نے آپ کا نام ’’احمد‘‘ رکھا تھا، لیکن جب آپ نے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ لیا تو اپنے نام کے شروع میں ’’سعید‘‘ کا اضافہ کردیا، اس طرح آپ کا پورا نام ’’سعید احمد‘‘ ہوگیا۔ آپ کی ابتدائی تعلیم اپنے وطن گجرات ہی میں ہوئی، آپ کی ’’بسم اللہ خوانی‘‘ آپ کے والد ماجد نے کرائی اور ناظرہ ودینیات وغیرہ کی تعلیم آپ نے وطن کے مکتب میں حاصل کی، پھر آپ اپنے مامو مولانا عبدالرحمٰن صاحب قدس سرہ کے ہمراہ دارالعلوم چھاپی تشریف لے گئے اور وہاں فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، دارالعلوم

چھاپی میں آپ کا قیام چھ ماہ رہا۔ پھر آپ مصلح الامت حضرت مولانا نذیر احمد صاحب پالن پوریؒ کے مدرسہ میں داخل ہوئے اور وہاں حضرت مولانا مفتی محمد اکبر صاحب پالن پوریؒ اور حضرت مولانا ہاشم صاحب بخاریؒ سے عربی کی ابتدائی اور متوسط کتابیں پڑھیں۔ پالن پور میں شرح جامی تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۳۷۷ھ مطابق 1957ء میں آپ نے مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ لیا اور تین سال تک حضرت مولانا صدیق احمد صاحب جمویؒ سے نحو اور منطق وفلسفہ کی بیشتر کتابیں پڑھیں۔

حضرت شیخ الحدیث علیہ الرحمہ نے فقہ، حدیث، تفسیر اور دیگر فنون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ۱۳۸۰ھ مطابق 1960ء میں دار العلوم دیوبند کا رخ کیا اور ۱۳۸۲ھ مطابق 1962ء میں دورۂ حدیث شریف سے فارغ ہوئے اور سالانہ امتحان میں امتیازی نمبرات حاصل کیے۔ آپ نے بخاری شریف فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدین صاحب مرادآبادیؒ سے، مقدمہ مسلم شریف و مسلم شریف کتاب الایمان و ترمذی شریف جلد اول حضرت علامہ ابراہیم صاحب بلیاویؒ سے، باقی مسلم شریف حضرت مولانا بشیر احمد خاں صاحب بلند شہریؒ سے، ترمذی جلد ثانی مع کتاب العلل وشمائل اور ابوداؤد شریف حضرت علامہ فخر الحسن صاحب مرادآبادیؒ سے، نسائی شریف حضرت مولانا محمد ظہور صاحب دیوبندیؒ سے، طحاوی شریف حضرت مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہ جہاں پوریؒ سے، مشکوٰۃ شریف حضرت مولانا سید حسن صاحب دیوبندیؒ سے، ان کے انتقال کے بعد جلد اول حضرت مولانا عبد الجلیل صاحب دیوبندیؒ سے اور جلد دوم حضرت مولانا اسلام الحق صاحب اعظمیؒ سے پڑھی، اس سال موطا امام مالک حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ اور موطا امام محمد حضرت مولانا عبد الاحد صاحب دیوبندیؒ کے پاس تھی۔ (مشاہیر محدثین وفقہائے کرام)

دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد اگلے سال حضرت مفتی صاحبؒ نے شعبۂ افتاء میں داخلہ لیا اور حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہ جہاں پوریؒ کی نگرانی میں کتب فتاوی کا مطالعہ اور فتوی نویسی کی تربیت حاصل کی۔ تکمیل افتاء کے بعد ۱۳۸۴ھ میں

دارالعلوم اشرفیہ راندیر (سورت) میں علیا کے مدرس مقرر ہوئے، یہاں تقریباً دس سال تدریسی خدمات انجام دیں۔ پھر دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے معزز رکن حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ کی تجویز پر ۱۳۹۳ھ میں دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے لئے آپ کا انتخاب عمل میں آیا۔ دارالعلوم میں مختلف فنون کی کتابیں پڑھانے کے ساتھ سالہا سال سے ترمذی شریف جلد اول اور طحاوی شریف کے اسباق پڑھاتے رہے اور ۱۴۲۹ھ مطابق 2008ء سے دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث وصدر المدرسین حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحبؒ کی علالت کے بعد سے حضرت مفتی صاحبؒ تاحیات بخاری شریف کا درس بھی دیتے رہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ بچپن سے ہی نہایت ذہین وفطین، کتب بینی، اور محنت کے عادی تھے۔ ان کا مزاج شروع ہی سے فقہی رہا ہے، یہی وجہ تھی کہ فقہی سیمیناروں میں آپ کی رائے کو بڑی اہمیت دی جاتی اور آپ کے مقالات کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے نیز، آپ کی فقہی مہارت اور رائے قائم کرنے میں حد درجہ حزم واحتیاط ہی کی وجہ سے دارالافتاء دارالعلوم کے خصوصی بنچ میں آپ کا نام نمایاں طور پر شامل تھا۔ اس کے علاوہ جس طرح حضرت والا کا انداز خطابت نہایت مؤثر، درس نہایت مقبول اور عام فہم ہوتا تھا، اسی طرح آپ کی تمام تصانیف نہایت آسان، عام فہم اور مقبول عام وخاص ہیں، آپ کی تقریریں نہایت مبسوط اور علمی نکات سے پُر اور تحریریں نہایت مرتب، واضح اور جامع ہوتی تھیں، اسی لئے آپ کی کئی تصانیف دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس عربیہ کے نصاب درس میں داخل ہیں۔ آپ کی تصانیف کو عالم اسلام میں کافی مقبولیت حاصل تھی۔ مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی شرح ''رحمۃ اللہ الواسعہ'' حضرتؒ کے تصنیفی کمالات کا شاہکار ہے، اس کے علاوہ انہوں نے متعدد درسی کتابوں کی تسہیل اور شرح کی خدمت بھی انجام دی اور ساتھ ہی ''ہدایت القرآن'' کے نام سے قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے تصوف وسلوک کے میدان میں بھی عظیم مقام پایا تھا

آپ طالب علمی کے زمانہ سے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہ سے بیعت تھے، اور دیگر بزرگان دین خاص طور پر حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوریؒ سے بھی فیض یافتہ ہوتے رہے اور اخیر میں حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب مظاہریؒ سے تعلق قائم کیا، جنہوں نے آپ کو اجازت بیعت وارشاد سے نوازا تھا۔ اس طرح حضرت مفتی صاحبؒ کو ہر میدان میں یکساں عبور حاصل تھا۔

راقم الحروف کو عالم اسلام کی جن عظیم المرتبت شخصیات کو قریب سے دیکھنے، سننے اور ملاقات کا حسین موقع ملا ان میں رئیس المحدثین حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمہ اللہ کی ذات گرامی بطور خاص شامل ہے۔ ماضی قریب کے سالوں میں جب بھی حضرت والا کی شہر گلستان بنگلور میں تشریف آوری ہوتی تو راقم بلا ناغہ ان کی مجالس میں شریک رہتا۔ آپ کی شخصیت تواضع وانکساری، خوش مزاجی وسادگی، تقویٰ وپرہیزگاری، شستہ وشگفتہ اخلاق کی حامل تھی۔ آپ کا ذوق لطیف، طبیعت سادہ اور نفیس، مزاج میں استقلال اور اعتدال، فطرت میں سلامت روی، اور ذہن رسا کے مالک، زود نویس اور خوش نویس، حق و باطل، اور صواب وخطاء کے درمیان امتیاز کرنے کی وافر صلاحیت اور حقائق ومعارف کے ادراک میں یکتائے زمانہ تھے۔ آپ دبستان علم وتحقیق کی معزز ومؤثر شخصیت، صاحب فہم و بصیرت، فضل وعمل اور خلوص وصداقت کے پیکر، فکر نانوتوی ودیوبندیت کے پاسبان دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز شیخ الحدیث وصدر المدرسین اور رکن شوریٰ، مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند کے ناظم اعلیٰ، ہزاروں اداروں کے سرپرست، لاکھوں علماء کے استاذ اور اکابرین امت کے علوم کے عظیم شارح تھے۔

زندگی کے آخری لمحات میں حضرت مفتی صاحبؒ طویل عرصہ تک بیمار رہے بغرض علاج ممبئی میں مقیم تھے کچھ افاقہ ہوا تو رمضان المبارک میں بعد نماز تراویح درس قرآن دیا کرتے تھے لیکن اچانک طبیعت پھر سے خراب ہوگئی۔ جس کے علاج کے لئے آپ کو ممبئی کے ایک نجی ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ جہاں علم وعمل کے اس روشن ستارے نے ۲۵؍

رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق 19/ مئی 2020ء بروز منگل بوقت چاشت اپنی آخری سانس لیتے ہوئے اس دار فانی سے کوچ کرلیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کے انتقال کو دنیا بھر کے علماء ومشائخ نے عالم اسلام کے لئے ایک عظیم خسارہ قرار دیا۔ یہ ایک ایسا موقع تھا کہ ہر ایک غم و افسوس میں مبتلا تھا اور ہر کوئی تعزیت کا مستحق تھا۔ ان کے انتقال سے آقائے دوعالم جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ''موت العالِم موت العالَم'' کا ہر کسی نے عملی مشاہدہ کیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمات کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے ان کی مغفرت فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائے، ہم تمام کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور امت مسلمہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین

عجب قیامت کا حادثہ ہے، کہ اشک ہے آستیں نہیں ہے
زمین کی رونق چلی گئی ہے، اُفق پہ مہر مبیں نہیں ہے
تری جدائی سے مرنے والے، وہ کون ہے جو حزیں نہیں ہے
مگر تری مرگ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

مفتی محمد عبداللہ قاسمی

موت ایک اٹل اور ناقابل انکار حقیقت ہے، اس کائنات رنگ و بو میں ہر اس چیز کے لئے موت مقدر ہے جو اس صفحہ ہستی پر زندگی کا عارضی لباس پہن کر نمودار ہوئی ہے؛ لیکن جیسے زندگی زندگی میں نمایاں فرق ہوتا ہے، ایسے ہی ہر ایک کی موت یکساں نہیں ہوتی، کچھ اموات ایسی واقع ہوتی ہیں جو افراد و اشخاص کی موت نہیں ہوتی؛ بلکہ اس سے ان لاکھوں افراد کی زندگی کا ہرا بھرا باغ ویران ہو جاتا ہے جو ان کے دامانِ عقیدت سے وابستہ ہوتے ہیں، بعض بندگان خدا کی رحلت سے ان بے شمار لوگوں کی امیدوں کا چراغ ٹمٹمانے لگتا ہے جو ان کے خوانِ نعمت کے ریزہ چیں ہوتے ہیں، پھر اس کی موت کا ماتم آنکھوں کے چند قطرہائے اشک سے نہیں ہوتا؛ بلکہ قطرہ قطرہ گر کر مستقل دریا کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اس کی وفات کی وجہ سے دلوں کی پرسکون آبادیاں آتش کدۂ حسرت بن جاتی ہیں، زندگی کے ہنگامے اور ولولے سرد پڑ جاتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بساطِ ہستی کی ہر ہر چیز اداس اور غمگین ہے، اس کے احوال و کوائف کو قلم بند کرنے کے لئے سیاہی بازار کی بوتلوں میں نہیں ملتی؛ بلکہ خونچکاں دلوں میں پائی جاتی ہے، شیخ الحدیث حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری کی رحلت کے بعد بھی کچھ یہی دل فگار نقشہ آج ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کی وفات ایک شخصیت کا خاتمہ نہیں؛ بلکہ ایک زرین عہد اور ایک روشن باب کا خاتمہ ہے، حضرت شیخ الحدیث کے سانحۂ ارتحال سے علمی حلقے میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا بہ ظاہر مشکل نظر آتا ہے۔ مجھے اس موقع پر عربی شاعر کا ایک شعر یاد آ رہا ہے:

وما كان قيس هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهدما

(ترجمہ) قیس کی موت فردواحد کی موت نہیں ہے، لیکن وہ قوم کی بنیاد تھا جو متزلزل ہوگئی۔

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۴۰ء مطابق ۱۳۶۰ھ کو کالیڑہ ضلع بناس کانٹھا (شمالی گجرات) میں پیدا ہوئے، آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقائی مکتب میں حاصل کی، پھر آپ نے پالن پور کے ایک مدرسہ کا رخ کیا اور وہاں آپ نے چار سال تک حضرت مولانا مفتی اکبر میاں صاحب پالن پوری اور حضرت مولانا ہاشم صاحب بخاری سے عربی کی ابتدائی اور متوسط کتابیں پڑھیں، اپنے تعلیمی سلسلہ کو مزید بڑھانے کے لئے آپ نے سہارن پور یوپی کا سفر کیا اور وہاں کی بافیض دینی درس گاہ مظاہر علوم میں داخلہ لیا اور تین سال تک آپ نے جید اساتذہ کرام سے علمی فیض حاصل کیا، مظاہر علوم کے اساتذہ کرام میں امام النحو والمنطق حضرت مولانا صدیق احمد صاحب جموی قدس سرہ، حضرت مولانا یامین صاحب سہارن پوری، حضرت مولانا مفتی یحییٰ صاحب سہارن پوری، حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رائے پوری اور حضرت مولانا وقار صاحب بجنوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پھر آپ نے برصغیر کی شہرۂ آفاق یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند، جس کی وجہ سے علم وادب کے گلشن میں بہار آئی، اور اس کے برگ وبار کو ذوق نمو ملا، اور جس کی وجہ سے بحمد اللہ آج دنیا کا چپہ چپہ متمتع اور فیض یاب ہورہا ہے کا قصد کیا، اور وہاں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب بلند شہریؒ، مولانا فخر الدین صاحبؒ، علامہ ابراہیم بلیاویؒ، مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہ جہاں پوریؒ جیسے جبال العلم اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، اور ان قدآور اساتذہ کرام سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں، مادر علمی کی علمی اور روحانی فضا نے آپ کی خوابیدہ صلاحیتوں کو پروان چڑھایا، جستجوئے علم وادب کی چنگاری کو شعلہ زن کیا اور شخصیت کی تعمیر وتشکیل کے لئے جو خام مواد اپنے گھر سے لائے تھے آپ کے اساتذہ نے اس کو تب وتاب، رنگ وآہنگ، لمس ولذت اور صورت ومعنی عطا کیا، چنانچہ کچھ ہی سالوں کے بعد چشم فلک نے دیکھا کہ وہ آسمان دین ودانش کے ماہ وپروین بن کر جلوہ گر ہوئے، جس کی تابانی اور ضوفشانی سے نہ صرف راہ علم کے مسافر مستفید ہوئے؛ بلکہ وہ کاروان علم کے رہنما اور رہبر بھی بن گئے۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ کے ایماء

پر ۱۳۸۳ء میں آپؒ دارالعلوم اشرفیہ راندیر (سورت) تشریف لے گئے، اور وہاں ۱۳۹۳ء نوسال تک پوری محنت وجانفشانی کے ساتھ تدریسی خدمات انجام دینے لگے، اس نوسالہ عرصہ میں علیا کی کتابیں: ابوداؤد، ترمذی، طحاوی، شمائل، مؤطین، نسائی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ جلالین، الفوزالکبیر، ہدایہ آخرین، شرح عقائداور حسامی وغیرہ آپ کے زیردرس رہیں، پھر ۱۳۹۳ء میں دارالعلوم دیوبند میں آپ کی تقرری عمل میں آئی اورآپ وہاں تادم وفات تدریسی فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے رہے، ۱۴۲۹ھ میں حضرت مولانا شیخ نصیراحمد خان صاحب کے سبکدوش ہونے کے بعدآپ کوصدرمدرس بنایا گیا، اور بخاری شریف جلداول آپ کے سپرد کی گئی، بخاری شریف جلداول کے علاوہ متعدداصولی وفنی کتابیں پڑھانے کا آپ کوشرف حاصل ہوا، ایشیاء کی عظیم دینی درس گاہ سے آپ تقریباپانچ دہائیوں تک وابستہ رہے، اورتشنہ گان علوم نبوت کے لئے تشنگی کا سامان فراہم کرتے رہے۔

حضرت شیخ الحدیث کادرس طلبہ میں بے حدمقبول تھا، قسام ازل نے آپ کوافہام وتفہیم کاغیرمعمولی ملکہ عطا کیا تھا، آپ پیچیدہ سے پیچیدہ مباحث کوبہت ہی آسان اورسہل انداز میں طلبہ کے ذہن نشیں کردیتے تھے، آپ کی درسی تقاریراپنے تمام پہلوؤں کوجامع اورحاوی ہونے کے ساتھ مرتب اورمنضبط ہوتی تھیں، قدرت نے آپ کودریا کوکوزہ میں بندکرنے اوراورقطرے کوسمندرکی شکل میں پھیلانے کاغیرمعمولی ہنرعطا کیا تھا اورجہاں جیساموقع اورمحل ہوتاآپ اپنی عبقریت کے حسن کوکانوں کے راستے دلوں میں اتاردیتے تھے، آپ کے درس حدیث میں محض دوچارکتابوں کامطالعہ نہیں جھلکتا؛ بلکہ آپ کادرس فن حدیث کے ایک قابل قدرکتابوں کے مطالعے کی غمازی کرتا، آپ کے درس میں تحقیقی شان، محدثانہ طرزاورمتکلمانہ اسلوب اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ کروٹیں لیتا، اورطلبہ کوحدیث کے جام وساغرسے مخمورکئے رہتا، حضرت شیخ الحدیث کادرس عام اساتذہ کی طرح خشک اوربے کیف نہیں ہوتا تھا؛ بلکہ دل چسپ اوردلوں کوموہ لینے والا ہوتا تھا، اعلی، متوسط اورادنی ہرطرح کے طلبہ کے لئے اس میں نشاط ودل چسپی

کا سامان ہوتا، اوران کے لئے غور وفکر کی نئی شاہراہیں کھولتا، آپ کے درس کی ان ہی خوبیوں کی وجہ سے طلبہ آپ کے درس میں پورے ذوق وشوق سے شریک ہوتے اور حسب استعداد اپنے دامان علم کو علم وحکمت کے گراں قدر موتیوں سے بھرتے، ہم جب دورہ حدیث میں زیر تعلیم تھے اس وقت طلبہ کی تعداد ہماری جماعت میں آٹھ سو سے کچھ متجاوز ہوا کرتی تھی اور دارالحدیث تحتانی اپنی کشادگی کے باوجود تنگ پڑ جاتی تھی، ہمیں یاد پڑتا ہے کہ حضرت شیخ الحدیث کا درس شروع ہونے سے پہلے ہی دارالحدیث کھچا کھچ بھر جاتی، اور جو طالب علم دیر سے آتا وہ اس طرح درس میں شریک ہوتا کہ آدھا اندر اور آدھا باہر ہوتا تھا، حضرت کے درس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اپنی بات کو کچھ اس خاص انداز سے پیش کرتے کہ طلبہ پوری یکسوئی ودل جمعی کے ساتھ سبق سننے پر مجبور ہوتے اور گھنٹوں اس طرح ہمہ تن گوش رہتے گویا ان کے سروں پر پرندہ ہے، کائنات کی بہترین ہستی کے زبان فیض ترجمان سے نکلے ہوئے موتیوں سے آپ کو اس قدر شیفتگی اور محبت تھی کہ عمر کے اخیر مرحلے میں بھی جب کہ صبح پیری کے آثار نہ صرف نمایاں ہوئے تھے؛ بلکہ پیری کا ہلال ماہ کامل بن چکا تھا اور ضعف ولاغری کا سایہ آپ کے جسم پر مکمل طور پر چھا گیا تھا آپ دو ڈھائی گھنٹے بے تکان تسلسل کے ساتھ ایک ہی ہئیت پر بیٹھ کر درس دیتے اور آپ کے چہرے پر تھکان اور اضمحلال کے آثار ظاہر نہیں ہوتے تھے، درس کے دوران آپ کا ظاہری وقار اور علمی رعب ودبدبہ دیدنی ہوتا، آپ کی زبان نہایت صاف ستھری اور شائستہ تھی، آپ کی زبان میں وہ بہاؤ تھا جو ایک دریا میں ہوتا ہے، آپ کے انداز تدریس کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا جیسے ایک ندی ہے جو خراماں خراماں، گاتی ہوئی گنگناتی ہوئی، عراق دل نشیں ساز کو چھیڑتی ہوئی چل رہی ہے، اور کشت زاروں کو سیراب کر رہی ہے، ان سب کے ساتھ آپ بڑے باہمت اور اوقات کے پابند تھے، اخیر عمر تک بھی آپ بخاری شریف کا طویل نصاب مقررہ وقت میں مکمل کرتے تھے، درس کی پابندی کا یہ حال تھا کہ تعلیمی سال کے دوران آپ بالکل اسفار نہیں کرتے تھے، یوں معلوم ہوتا تھا کہ آپ نے تدریس کے لئے خود کو پابہ زنجیر کرلیا ہے، اور اپنے سفینۂ علم

کو لنگر انداز کرلیا ہے، یہ کہنا شاید مبالغہ نہیں ہوگا کہ آپ نے درس نظامی کی کتابوں کی تدریس کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ فراہم کیا ہے، جو نسل نو کے لئے مفید بھی ہے اور اثر انگیز بھی، حضرت شیخ الحدیث نے تدریسی میدان میں اپنا ایسا نقش جمیل چھوڑا ہے جو ان شاء اللہ صدیوں تک ارباب مدارس کے لئے سرمۂ چشم اور رفیق خضر ثابت ہوگا۔

آپؒ ایک جلیل القدر محدث، بلند پایہ فقیہ اور مادر علمی دار العلوم دیوبند کی پیشانی کا جھومر تھے، اور علمی کمالات اور گوناگوں امتیازات وخصوصیات کی وجہ سے شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ اپنی مثال آپ تھے، چنانچہ جس طرح سورج کی روشنی پھیل کر تیز ہو جاتی ہے، اور شمیم گل باغ سے نکل کر عطر فشاں بن جاتی ہے، اسی طرح مولانا کی مختلف علوم وفنون پر دسترس اور ان کے علمی کمالات کا آوازہ دار العلوم دیوبند کی چہار دیواری تک ہی محدود نہیں رہا؛ بلکہ دار العلوم دیوبند کی چہار دیواری سے نکل کر صرف ہندوستان ہی نہیں؛ بلکہ پورے برصغیر کے چپہ چپہ میں آپ کی تگ وتاز پہنچی، اور برصغیر کے گوشہ گوشہ میں آپ نے دعوتی اسفار فرمائے اور اپنے پر مغز اور اثر آفریں خطابات سے خلق خدا کو مستفید اور فیض یاب کیا، ان کے دلوں میں طاعت وفرماں برداری کی شمع فروزاں کی، گم گشتہ راہ لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لئے سنجیدہ کوششیں کیں۔

آپ علم وفن کے شوقین، مطالعہ وکتب بینی کے والہ وشیدا اور قلم وقرطاس کے حریص تھے، آپ نے جہاں تدریسی ذمہ داریاں بحسن وخوبی نبھائیں وہیں تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی آپ نے انمٹ اور یادگار نقوش چھوڑے ہیں، چنانچہ آپ کے قلم گل ریز سے چار درجن سے زائد کتابیں منصۂ شہود پر آئیں، اور دیکھتے ہی دیکھتے مشرق ومغرب میں پھیل گئیں، آپ کی تصانیف کو عوام وخواص نے ہاتھوں ہاتھ لیا، اور ذوق وشوق سے انہیں پڑھنے کا اہتمام کیا، درس کی طرح آپ کی تمام تصانیف بھی آسان اور عام فہم ہونے کے ساتھ جامعیت اور حسن ترتیب کا بہترین نمونہ ہیں، علمی جواہر پارے اور تحقیقی نکات سے لبریز اور سینکڑوں کتابوں کے مطالعے کا نچوڑ ہیں، زبان وبیان سادہ اور سلیس ہے، خدائے

بزرگ وبرتر نے آپ کی بعض تصانیف کو وہ دوام اور مقبولیت عطا کی ہے جو بہت کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے، چنانچہ آپ کی متعدد کتابیں آج مدارس عربیہ میں داخل درس ہیں، اور اساتذہ وطلبہ کے لئے یکساں مفید اور نفع بخش ثابت ہو رہی ہیں، بلکہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ آج مدارس عربیہ میں داخل ہونے والے طلبہ کے اندر بنیادی استعداد پیدا کرنے میں حضرت شیخ الحدیث کی کتابیں مرکزی اور کلیدی کردار ادا کر رہی ہیں اور ان کی زنگ آلود صلاحیتوں کو صیقل کر رہی ہیں۔

این سعادت بزور بازو نیست …… تانہ بخشد خدائے بخشندہ

آپ کی تصانیف میں حجۃ اللہ البالغہ کی شرح رحمۃ اللہ الواسعۃ، تفسیر ہدایت القرآن، الفوز الکبیر عربی، العون الکبیر، مبادیٔ الفلسفۃ، آپ فتوی کیسے دیں؟ کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟ حیات امام ابوداؤد، حیات امام طحاوی، اسلام تغیر پذیر دنیا میں، ڈاڑھی اور انبیاء کرام کی سنتیں، حرمت مصاہرت، تحفۃ الالمعی شرح سنن ترمذی، تحفۃ القاری شرح صحیح بخاری، دین کی بنیادیں اور تقلید کی ضرورت، مسلم پرسنل لا اور نفقہ مطلقہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

آپ کو ظاہری علوم میں جیسے کمال اور درک حاصل تھا اور اپنے ہم عصروں پر فوقیت اور برتری رکھتے تھے، اسی طرح خدائے بخشندہ نے آپ کو علوم باطنیہ کی دولت سے بھی مالا مال کیا تھا، لیکن اس کے اخفاء کا اتنا اہتمام تھا کہ عام لوگ حضرت شیخ الحدیث کو محض ظاہری علوم شریعت کا امین سمجھتے ہیں، اور کوچۂ عشق ومعرفت سے انہیں نا آشنا اور نابلد خیال کرتے ہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ زمانہ طالب علمی ہی میں آپ نے راہِ طریقت کا سفر شروع کر دیا تھا، اور اس پر خار منزل کو قطع کرنے کے لئے ایک مردِ کامل شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ کا دامن تھام لیا تھا، اور باقاعدہ حضرت مرحوم نے ان سے بیعت فرمائی تھی، مدرسہ مظاہر علوم کے اندر حضرت کے زمانہ طالب علمی میں مولانا عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ کی اصلاحی مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں، حضرت شیخ الحدیث پابندی سے ان بافیض مجالس میں شرکت کرتے، اور قیمتی نصائح سے متمتع اور فیض یاب ہوتے، بالآخر آپ نے مفتی مظفر حسین صاحب سے باقاعدہ اصلاحی تعلق قائم فرمایا، کچھ

دنوں کے بعد حضرت نے ان کو خرقۂ خلافت عطا کیا، اور بیعت وارشاد کی تلقین فرمائی۔

بچوں کی تربیت اور ان کے اخلاق ورجحانات کی تشکیل وتعمیر کے لیے حضرت شیخ خاص طور بہت ہی فکرمند رہا کرتے تھے، ہر کوئی جانتا ہے کہ تربیت کا میدان ایک صبر آزما اور دشوار گزار گھاٹی ہے اس وادی کو بحسن وخوبی قطع کرنے کے لیے ایک طرف بچوں کی نفسیات اور ان کے طبع بوقلموں سے مکمل واقفیت ضروری ہے تو دوسری طرف معلم ومربی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی شخصیت متضاد عناصر کی سنگم ہو، اس کی ذات میں نرمی بھی ہو گرمی بھی جلال بھی جمال بھی، شیشہ بھی آہن بھی، کوہِ فراز بھی ماں کے دل کا گداز بھی، شعلہ بھی اور شبنم بھی۔ حضرت شیخ الحدیث کی شخصیت میں فیاض عالم نے یہ دو متضاد صفات جس خوبی اور اعتدال سے جمع کردی تھیں وہ اپنی نظیر آپ ہے؛ چنانچہ حضرت شیخ الحدیث نے اپنے صاحبزادوں اور اپنے پوتوں کی عمدہ طور پر تربیت فرمائی، اور ان کو اخلاق وکردار کے لحاظ سے نمایاں بنایا، اور بہ راہ راست ان کی تعلیم کا انتظام فرمایا۔

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ تقوی وللّٰہیت کی جیتی جاگتی تصویر تھے، تضرع اور انابت الی اللہ حضرت کی زندگی کا خاص وصف تھا، سنت نبوی کے اتباع وپیروی کا آپ خاص اہتمام فرماتے تھے، آپ انتہائی متواضع اور منکسر المزاج تھے، چھوٹوں کے ساتھ شفقت ورحمت سے پیش آتے، اور ان کی غلطیوں کو درگزر کرتے، حلم وبردباری اور تحمل مزاجی آپؒ کا خصوصی وصف تھا، کوئی بات خلاف طبیعت پیش آتی تو خاموشی اختیار فرماتے، اور بے جا غصہ سے گریز کرتے، اسی کے ساتھ آپؒ نہایت متین اور سنجیدہ طبیعت کے مالک تھے، متانت وشائستگی اور وقار وسنجیدگی آپؒ کے قول وعمل سے جھلکتی تھی، آپؒ ہر کام نہایت اطمینان اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے، عجلت اور جلد بازی سے گریز کرتے تھے، آپ استغناء اور بے نیازی میں اپنے اسلاف واکابر کی ایک زندہ تصویر تھے، آپ اسباب تجمل سے مستغنی اور بلند معیار زندگی سے دور اور نفور تھے، آپ نے پوری زندگی ایک گوشہ نشیں اور خلوت گزیں عابد کی طرح گزار دی، نہ خدمات کی ستائش کی تمنا کی، نہ زخارف دنیوی سے اپنے دامن کو ملوث کیا، آپؒ کی پوری زندگی ریاضت ومجاہدے اور مسلسل جدوجہد سے عبارت تھی، کم ہمتی

اور سستی و کاہلی کو کبھی آپؒ نے راہ نہ دی، کبھی کسی عہدہ اور منصب کی نہ طلب رہی اور نہ دادو تحسین کی پرواہ؛ بلکہ زندگی بھر بے لوث اور مخلصانہ خدمات انجام دیتے رہے۔

آج جب کہ قحط الرجال کا دور ہے، اساطین علم وفن ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے ہیں، علماء اور صلحاء یکے بعد دیگرے اٹھتے جا رہے ہیں، ایسے نازک وقت میں حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کا سانحۂ ارتحال ملت کے لئے ایک عظیم خسارہ ہے، آپ جیسی عبقری اور نابغہ روزگار شخصیات بڑی مدتوں میں جا کر پیدا ہوتی ہیں، اور جب پیدا ہوتی ہیں تو ان کے افکار و کردار کی خوشبو سے پورا چمنستان عالم مہک اٹھتا ہے، اور اس کی خوشبو صدیوں تک باقی رہتی ہے، شیخ الحدیث مرحوم ہمارے درمیان سے رخصت ہو گئے ہیں؛ لیکن ان کی روحانی اولاد ہزاروں کی تعداد میں ہمارے درمیان موجود ہے جن کی دینی وعلمی خدمات سے لاکھوں بندگان خدا مستفید ہو رہے ہیں، اور یہ مبارک سلسلہ ان شاء اللہ قیامت تک چلتا رہے گا، یہ ٹھیک ہے کہ موت کے بے رحم پنجہ نے حضرت مرحوم کو موت کی ابدی نیند سلا دیا؛ لیکن حضرت شیخ الحدیث مرحوم کی مخلصانہ خدمات و کارنامے اور ان کی صفات وخوبیوں کا گلشن ہمیشہ سرسبز وشاداب اور سدا بہار رہے گا، اور اس کی خوشبو اور مہک صدیوں تک قلب ودماغ کو معطر کرتی رہے گی، اور رفتار زمانہ اور گردش لیل ونہار کی وجہ سے اس گلستاں پر خزاں کا سایہ نہیں پڑے گا۔

اللہ تبارک وتعالی سے دعا ہے کہ حضرت شیخ الحدیث کو غریقِ رحمت فرمائے، اعلی علیین میں ان کو ٹھکانہ نصیب فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

آمین ثم آمین

* * *

تم جیسے گئے ایسے بھی جاتا نہیں کوئی

زندگی کے آخری ایام

بہ قلم: مولانا اشتیاق احمد قاسمی مدرس دارالعلوم دیوبند

گرامی قدر محسن ومربی حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت پر پچیس دن گزر گئے؛ مگر اپنی طبیعت بحال نہیں پا رہا ہوں، وقفے وقفے سے یاد آتی رہتی ہے اور طبیعت بے چین ہوجاتی ہے، کبھی آنسو نکل آتے ہیں، کبھی بلکتے ہوئے سر بھاری ہوجاتا ہے، کبھی نیند میں ہی رونے لگتا ہوں اور دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہو پا رہا ہے، نہیں لگتا تھا کہ ممبئی کا یہ سفر ملکِ عدم کا سفر ہے اور اب کبھی نہیں آئیں گے، میں نے کہا تھا کہ اسباق بند ہوگئے ہیں خدمت کے لئے میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں؛ مگر اس کے لئے راضی نہ ہوئے۔ ''موت کا ایک دن معین ہے'' اس پر ایمان ہے؛ لیکن حضرت الاستاذ کی رحلت عجیب ادا سے ہوئی۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی ☆ ایک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

ایسی حالت میں کیا لکھوں، ذہن، حواس اور قلم سب پر بے کیفی طاری ہے

حضرت مدیر محترم مولانا محمد سلمان بجنوری دامت برکاتہم کا حکم ہوا کہ ''علالت اور آخری ایام کی تفصیلات سپرد قلم کرو! سوچا کہ شاید اسی طرح غم ہلکا ہوجائے کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا، بیٹھتے ہی دل بیٹھنے لگا، آنسو ہے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہا ہے، وضو کیا، پھر بیٹھا، لیکن لکھ نہ سکا تو بیٹی کو سبق پڑھانے لگا، پھر آکر بیٹھا لکھ رہا ہوں، قارئین سے بے ربطی اور بے ہنگم تعبیرات کے لئے معذرت خواہ ہوں، بہت سے شاگردوں نے کہا: اپنے عزیز وقریب کی رحلت پر بھی ہمیں اتنا غم نہ ہوا اور نہ ہم اس قدر دل گرفتہ ہوئے جتنا کہ حضرت الاستاذؒ کی رحلت پر ہو رہے ہیں۔

رجب میں اسباق میں زیادہ انہماک کا ہوتا ہے، کئی دن سے ملاقات کے لئے

خدمت میں حاضر نہ ہوسکا تھا، ۱۶/رجب المرجب ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۲/مارچ ۲۰۲۰ء روز پنج شنبہ کو ''مسجد رشید'' کے تہہ خانے میں سالانہ انعامی جلسہ تھا، حضرت مولانا سلمان صاحب مدظلہ ناظم جلسہ تھے۔ بڑے ہی ادب واحترام سے حضرت شیخ الحدیث وصدر المدرسین کو دعوت اسٹیج دی۔ حسبِ روایت حضرت کرسی پر تشریف فرما ہوئے، طلبۂ کرام کے لئے تشجیعی بیان شروع فرمایا پندرہ منٹ کے بعد محسوس ہوا کہ زبان رک رہی ہے، رک کر اپنی عادت کے مطابق ''اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم'' پڑھا پھر بولنے لگے، گفتگو کا سلسلہ نہیں ٹوٹا، تھوڑی دیر بعد پھر رکاوٹ ہوئی پھر اسی طرح رک کر اعوذ باللہ الخ پڑھا پھر بیان شروع کیا اور موضوع کو پھر سے دہرایا، تھوڑی ہی دیر بعد بندش ہوئی اب کی بار سلسلۂ کلام ٹوٹ گیا پھر جب بندش ہوئی تو بات ختم کردی، آدھ پون گھنٹہ بیان ہو پایا تھا کہ کرسی سے اتر کر پیچھے زینت آرائے مسند ہوئے اور حضرت مہتمم صاحب سے باتیں کرنے لگے، درمیان میں کئی اساتذہ نے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا کہ شاید دو سال پہلے کی طرح شوگر زیادہ ہوگئی ہے، اس سے پہلے جب زبان کی بندش ہوئی تھی تو شوگر پانچ سو اٹھارہ تھی اور ایک بار تو مشین میں اِیرر (شوگر کی حد بتانے سے معذرت کا اشارہ) آگیا تھا علاج ہوا شفایاب ہوگئے، گھر سے معلوم کیا تو بتایا گیا کہ گذشتہ کل (بدھ) سے یہ کیفیت ہورہی ہے۔ غرض یہ کہ خلافِ عادت جلسہ میں گیارہ بجے تک موجود رہے، اپنے دستِ مبارک سے انعامات بھی تقسیم فرمائے۔ پھر گھر تشریف لائے، مولوی محمد طفیل دربھنگوی سلمہ ساتھ تھے، گھر سے فرزند ارجمند جناب مولانا حسین احمد صاحب ڈاکٹر کے پاس لے گئے، وہاں سے ڈھائی بجے واپس آئے۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ شاید زبان پر لقوے کا اثر ہے۔ اس کے لئے رپورٹ ضروری تھی، واپس آکر ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد کھانا کھا کر سو گئے، عصر بعد طلبۂ کرام آئے؛ مگر زبان بندی کی وجہ سے باربار کوشش کرتے رہے؛ لیکن بات نہ کرسکے، مغرب بعد ماہنامے، رسائل وغیرہ کو اٹھا اٹھا کر دیکھتے رہے، عشاء کی نماز پڑھی، تھوڑا کھانا تناول فرمایا پھر دوا کھا کر سوئے مگر مدتوں سے نیند بہت دیر سے آتی تھی، کبھی ایک دو بجے اور کبھی چار بجے آتی تھی رات بھر

پیروں کی جلن اور پیروں کے نیچے سے اوپر کو چڑھتے ہوئے درد سے پریشان رہتے ”یا اللہ، اے اللہ، اے میرے مولیٰ! رحم فرما“ کے جملے زبان پر ہوتے اور غالبؔ کی زبان میں۔

موت کا ایک دن معین ہے ☆ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

کبھی تو آنسوؤں سے رونے لگتے اور فرماتے: ”اے اللہ! اگر آپ راضی ہیں اور بلانا چاہتے ہیں تو بلالیں اور مجھے اس تکلیف سے بچالیں!“ دعائیں پڑھ پڑھ کر جھاڑتے رہتے، آرام ہوجاتا پھر نیند آتے ہی تکلیف شروع ہوجاتی، جیسے کوئی پیر ہلا کر جگا دیتا ہو، علامتوں سے آپ کو سحر ہونے کا بھی یقین تھا، کبھی تکیہ کے نیچے، کبھی گدّے اور مسند کے نیچے، کبھی سرہانے، کبھی پائتانے الماری کے پاس تعویذ رکھے ہوئے ملتے، کبھی ٹوپی غائب ہوجاتی ایک بار نئی صدری اتار کر لٹکائی تھی کہ غائب ہوگئی، یہ کرشمے دیکھنے کو ملتے رہتے تھے، اس سے ہم لوگوں کو بھی سحر کا شبہ رہتا تھا غرض یہ کہ یہ رات بھی اسی طرح گزری، فجر کی نماز کے بعد ناشتہ کیا پھر سوئے اور الحمدللہ نیند آئی، ساڑھے گیارہ بجے تک سوئے، اٹھنے کے بعد غسل کیا اور معمول کے مطابق ساڑھے بارہ بجے جمعہ کی نماز کے لئے امام باڑے کے قریب کی ”محبوب“ مسجد پہنچے پھر گھر آکر کھانا کھایا اور قیلولہ کے لئے لیٹے، عصر سے پہلے اٹھ کر چائے پی، کوئی کتاب اٹھا کر دیکھنے لگے، پھر نماز پڑھی، اس دن عصر بعد طلبۂ کرام کو مجلس میں بیٹھنے سے منع کر دیا گیا، مغرب بعد بھی بیٹھے رہے۔ عشا کی نماز کے بعد بخاری شریف پڑھانے کے لئے درسگاہ پہنچے ساڑھے دس بجے تک سبق ہوا۔ زبان رکتی رہی؛ لیکن کام چل گیا معمول سے ایک گھنٹہ پہلے ہی سبق موقوف کر دیا، گھر تشریف لے آئے پھر رات معمول کی پریشانی میں بسر ہوئی۔

اگلے دن سنیچر کو چوتھے گھنٹے میں پڑھانے آئے اور سبق ہوتا رہا زبان کی بندش کبھی کھلتی، کبھی نہیں، جب ”باب برکة الغازی فی ماله حیا و میتا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ (۴۴۱ ص ۵) پر پہنچے اور سمجھانا چاہا تو زبان بالکل بند ہوگئی، بار بار ”اعوذ باللہ“ پڑھنے کے بعد، کھلی تو فرمایا: یہ حدیث بڑی اہم ہے، سمجھانا ضروری ہے

مگر کیا کروں؟ چھوڑ و رہنے دو، آج چیک اپ کے لئے جانا ہے۔ چانچہ معمول سے ایک گھنٹہ پہلے ہی ساڑھے گیارہ بجے تک سبق ہوا۔ صاحب زادہ مولانا حسین احمد زید مجدہ کے ساتھ دارالعلوم زکریا کے قریب ایک ڈاکٹر کے پاس گئے، سیٹی اسکین ہوا۔ رپورٹ نارمل آئی کہ دماغ کی ساری رگیں درست ہیں؛ البتہ خون کی رپورٹ میں نمک کی کمی کی بات آئی؛ مگر اس سے زبان کی بندش سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، زبان پر فالج کا خیال بھی غلط تھا۔

عشاء بعد درسگاہ تشریف لائے میں نے محمد طفیل سلمہ سے کہا کہ تم میری طرف سے کہو کہ اب جو بچا ہے اسے اپنی عادت کے مطابق درایتاً (سمجھا کر) نہ پڑھائیں روایتاً اور سرداً ہی پڑھا دیں۔ موصوف نے عرض کیا، الحمدللہ! عرضی قبول ہوگئی۔ درسگاہ پہنچے طالب علم نے عبارت پڑھنی شروع کی، سات آٹھ صفحے کے بعد اسّی فی صد زبان کھل گئی، پھر متعدد بحثوں کو سمجھایا بھی، اس طرح کتاب الجہاد ص: ۴۵۲ پوری ہوئی، اسی پر بارہواں پارہ بھی پورا ہوا۔ پھر اگلے دن مجھے فون کیا: کہاں ہو؟ نظر نہیں آ رہے ہو تو میں نے بتایا، حضرت آسام آیا ہوا ہوں، ختم بخاری شریف کا پروگرام ہے، کل حاضر ہو جاؤں گا، فرمایا: میں اس بدعت کو ختم کر رہا ہوں اور تم اس میں شریک ہو رہے ہو؟ میں نے کہا: حضرت! آئندہ احتیاط کروں گا، فرمایا: اچھا آؤ، میں بھی ٹھیک ہوں، اگلے دن شام کو پہنچا اور عشاء بعد سبق میں حاضر ہو گیا، جب ساتھ ساتھ گھر تک پہنچا تو گیارہ بج رہے تھے، مجھے اصرار کے ساتھ آرام کرنے کے لئے واپس کیا، پھر صبح ہی خدمت میں پہنچا اور ممبئی رخصت ہونے تک ساتھ میں رہا۔ غرض یہ کہ اتوار، دوشنبہ اور سہ شنبہ چوتھے گھنٹے اور عشا بعد دونوں وقت سرداً سبق ہوتا رہا۔ اگر زبان کام کرتی تو بولتے ورنہ خاموش سنتے رہتے۔ اس طرح سہ شنبہ کو دو محسن و مشفق رشتہ دار تشریف لائے ایک عمار بھائی برخوردار مولانا حسین احمد صاحب کے برادر نسبتی اور دوسرے برخوردار مولانا احمد سعید کے برادر نسبتی عبداللہ بھائی (محمد چچا کے لڑکے) کو یاد کر کے رونے لگے کہ وہ بڑے اچھے بھائی تھے، وہ (۱۸ر فروری ۲۰۲۰ء منگل کو) چلے گئے عمار بھائی نے ڈاکٹری پڑھی ہے اس شعبے کی خدمات کے لئے لوگوں کا خوب تعاون کرتے

ہیں، اگرچہ پیشے سے منسلک نہیں ہیں۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت بھی خوب کی، دل کے آپریشن کے بعد سے وفات تک جب بھی طبیعت ناساز ہوتی خدمت میں حاضر ہوجاتے، اس بار بھی ممبئی لے جانے کے لئے آئے تھے، تین اسباق باقی تھے۔ تینوں میں ساتھ ساتھ رہے، سہ شنبہ کی شام کو چودھواں پارہ پورا ہوا، اب آخری پارہ (۳۰ صفحے) باقی بچا، چوتھے گھنٹے میں دس صفحے ہوئے، عشاء بعد پورا کرنے کے ارادے سے بیٹھے، صفحہ ۵۴۲ سطر ۹ القسامۃ فی الجاهلیۃ سے عبارت شروع ہوئی۔ دارالحدیث میں بھیڑ بڑھتی گئی، جب چار یا تین صفحے بچے تو رونے لگے، بار بار رومال سے آنسو پوچھتے، بدن پر بھی رونے کا اثر ظاہر ہو رہا تھا، جب آخری حدیث پر قاری پہنچا تو بے اختیار ہوکر رو پڑے، طلبہ بھی رونے لگے پوری دارالحدیث سسکیوں سے گونج رہی تھی، اسی درمیان تین بار فرمایا: ”اللہ جو چاہے گا وہ ہوگا“ میں نے اپنے کو سنبھالا اور کان کے قریب ہوکر کہا طلبہ بے قابو ہو رہے ہیں، آپ اپنے کو سنبھالیں، تو سنبھال لیا، دستی سے آنسو پوچھے، میں نے کہا: آپ ہاتھ اٹھائیں طلبہ سری دعا کرلیں گے اور میں نے عمار بھائی سے کہا: آپ تھرمس میں سے چائے لے کر پیش کریں، ہارٹ کمزور ہے (تیس پینتیس فی صد متحرک رہا کرتا تھا) میں طلبہ کو سنبھالتا ہوں، میں نے مائک لیا، اتنے میں حضرت تخت سے اترنے لگے پھر دایاں ہاتھ ہلا کر طلبہ سے کہا: بھائیو! معاف کرنا“ اس پر طلبہ کے رونے کی آواز اور بلند ہوئی، غالباً عمار بھائی نے کہا: ابّا آپ نے بہت اچھا پڑھایا (اس لئے کہ درمیان میں دو تین بار مختصر مختصر طور پر مسئلہ سمجھایا تھا، بالکل اخیر میں کچھ نصیحت اور وصیت کرنا چاہتے تھے وہ کر نہ کرسکے) اس پر فرمایا: ”کیا خاک پڑھایا“؟ غرض یہ کہ آہستہ آہستہ اترے، پھر چپل پہن کر باہر نکلے، بھیڑ سے بچا بچا کر کار تک لایا گیا، کار میں بھی مسلسل روتے ہی رہے، جب گھر پہنچے تو کرسی پر بیٹھے اور کہنے لگے: لگتا ہے کہ ”میں اگلے سال بخاری شریف نہیں پڑھا پاؤں گا!“ (قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید!) میں نے کہا: نہیں، ایسا نہ سوچیں، آپ ممبئی جائیں گے مرض کی تشخیص ہوگی، پھر ٹھیک ہوکر آجائیں گے ابھی طلبہ امتحانات دیں گے، پھر جائیں گے

، آپ کی واپسی کے بعد ایک مجلس رکھی جائے گی، اس میں آپ وہ سب باتیں کہیں گے جو آج نہ کہہ سکے، اس پر فرمایا: ہاں! مجھے (حضرت کے قدیم خادم اور محبوب ترین شاگرد) ابوبکر بھائی (بنگلہ دیش) نے کہا تھا کہ تم ساتھ میں ہی رہو؛ اس لیے میں رک گیا، لیکن حضرت نے اصرار کے ساتھ واپس کیا، برخوردار عبیداللہ بھائی کو کہا کہ گاڑی سے پہنچاؤ، رات زیادہ ہوگئی ہے، بہرحال میں آگیا، مجھے اچھی طرح نیند نہیں آئی پھر صبح کو حاضر ہوا، ممبئی کی تیاری چل رہی تھی، طلبۂ کرام خصوصاً دورۂ حدیث شریف کے طلبہ کے آنے کا سلسلہ جاری تھا، اکثر طلبہ محبت میں مصافحہ کرنا اور خدمت میں بیٹھنا چاہتے تھے، جگہ کم تھی اس لئے تھوڑی تھوڑی دیر بعد قسط واران سب کو ملاقات کے بعد رخصت کرتا رہا، اسی درمیان حضرت نے غسل کیا کپڑے بدلے، موئے لب تراشے، خوشبو لگائی اور کرسی پر بیٹھے مسکراتے رہے، ''مصائب میں الجھ کر مسکرانا ان کی فطرت تھی'' اتنے میں مظفر نگر کے ایک پرانے شاگرد ایک عامل کو لے آئے، وہ سحر کی کاٹ کرنا چاہ رہے تھے، بھائیوں سے مشورہ کیا، تو سب نے کہا: اگر معلوم ہوگا کہ سحر ہے تو شاید سفر ملتوی ہوجائے، اِدھر عامل صاحب بڑے دعوے کررہے تھے، پھر حسین بھائی نے کہا: کس طرح کاٹیں گے؟ تو انہوں نے کاغذ منگوایا اور اس پر کچھ لکھا اور حضرت کے سر پر پھیرا، پھر جلا دیا اور پانی دم کرکے دیا، اسی درمیان کھانے کا دسترخوان بچھا، حضرت نے برائے نام تھوڑا کھایا، پھر اپنی بہوؤں کی طرف گئے، سب کو الوداعی سلام کیا اور کہا میں جلد ہی آجاؤں گا، پھر گاڑی میں بیٹھے، میں نے دم کیا ہوا پانی فرزند ارجمند عبداللہ کو دیا اور حضرت سے کہا: راستے میں اسی کو پیتے رہیں، پھر سلام کیا اور دروازہ بند کرکے رخصت کیا، گاڑی چل پڑی، یہ آپ کی الوداعی تقریب تھی اور آخری دیدار، یہ ۱۹/ مارچ ۲۰۲۰ء مطابق ۲۳/ رجب ۱۴۴۱ھ جمعرات کا دن تھا۔ دن کے بارہ بجے کے قریب کا وقت تھا۔

اگلے دن ۲۰/ مارچ کو ''ملت ہاسپٹل'' جوگیشوری ممبئی میں داخل ہوئے، مرض کی تشخیص ہوئی کہ کولسٹرول (خون میں چربی کی وجہ سے گاڑھاپن) کا اضافہ ہوگیا ہے، جب دماغ کی باریک رگوں میں خون کی گردش رک جاتی ہے تو دماغ کچھ سوچنا چھوڑ دیتا ہے، اس

کی وجہ سے زبان پر بات نہیں آتی اور قلم سے بھی لکھنا ممکن نہیں رہتا، نہ تو زبان پر کوئی اثر ہے اور نہ ہی ہاتھ پر۔ (بخاری شریف کے سبق کے بعد حضرت نے مجھے اصرار کے ساتھ گھر اس لئے بھیجا تھا کہ بخاری شریف کا پرچہ بنانا چاہ رہے تھے؛ لیکن بتایا کہ رات ڈھائی بجے تک کوشش کرتا رہا؛ مگر لکھ لکھ کر کاٹ رہا تھا بنا نہ سکا، پھر اس کی ذمہ داری حضرت مفتی محمد امین صاحب مدظلہ العالی کو دی کہ پہلے مولانا قمرالدین صاحب کے پاس جائیں اگر وہ بنا دیں تو بہتر ہے ورنہ آپ بنائیں؛ چنانچہ حضرت مفتی محمد امین صاحب مدظلہ کے ساتھ میں بھی مولانا قمرالدین صاحب کے گھر گیا؛ ہم دونوں دیر تک کھڑے رہے، دروازہ نہ کھلا تو یہ خیال ہوا کہ شاید آرام فرمارہے ہیں، اس لئے ہم واپس آگئے، وہ پرچہ حضرت مفتی محمد امین صاحب مدظلہ العالی نے ہی بنا کر جمع فرمایا۔)

غرض یہ کہ مرض کی تشخیص کے بعد علاج ہوا اور دھیرے دھیرے چار دن میں ٹھیک ہوگئے پھر ۲۳ر مارچ کو اپنی قیام گاہ (اپنے داماد بلال بھائی کے گھر) پر واپس آگئے اب اچھی طرح بولنے لگے، دوائیں بھی چلتی رہیں اور مایوسی کی بات باقی نہ رہی۔ اب دیوبند واپس آنے کے لئے اصرار کرنے لگے، میزبان بیٹی (فاطمہ بہن) اسی بہانے خدمت کرنا چاہتی تھی، ان سب کی رائے تھی کہ ابھی یہیں رہیں، دیوبند نہ جائیں۔ وہاں اسباق تو ہیں نہیں ادھر ہم لوگوں کی بھی رائے تھی کہ جب تک اطمینان بخش صحت نہ ہوجائے تب تک نہ آئیں، چوں کہ وہاں لکھنے پڑھنے کے اسباب نہیں تھے، اس لئے جی نہیں لگ رہا تھا اور آخری متوقع تصنیف ''دیوبندیت کیا ہے'' کی تکمیل کے لئے بے چین تھے، جس کا خاکہ آپ نے طے کرلیا تھا اور اس کے مختلف پہلوؤں کو مرتب بھی کرلیا تھا، پھر کسی عزیز کے یہاں کئی دنوں تک مہمان رہنا ان کے لئے بارِ خاطر کا باعث تھا، اصرار و انکار کا سلسلہ چلتا رہا، سنا کہ کسی ایک دن اصرار اتنا بڑھا کہ ناشتہ واپس کردیا۔ پھر کھانا نہیں کھایا، جب بہت اصرار کیا گیا تو شام کو کھانا تناول فرمایا، اسی درمیان ایک دن جوگیشوری کے امدادی کیمپ میں دس پندرہ منٹ بیان فرمایا: ''لاعدوی'' (کسی کا مرض دوسرے کو نہیں لگتا) بہت مختصر اور جامع بیان ہے، پھر

اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی ترغیب دی۔ ادھر ’’کرونا وائرس‘‘ کی وجہ سے پورے ملک بلکہ عالم میں لاک ڈاؤن کا نفاذ عمل میں آچکا تھا، عشرے کی کسی تاریخ میں فون آیا؛ کیا حال ہے؟ میں نے کہا: الحمد للہ! ٹھیک ہوں، بچے کیسے ہیں؟ بتایا: سب خیریت سے ہیں۔ ہم سب آپ کی صحت کاملہ کی دعائیں کرتے ہیں۔ فرمایا: میں بھی الحمد للہ ٹھیک ہوگیا ہوں، بالکل اچھی طرح زبان چلنے لگی ہے، اسی کی اطلاع کے لئے فون کیا، میں نے کہا: ۱۶؍اپریل کو پلین کا ٹکٹ بنا ہوا ہے، اب تو دیوبند آجائیں گے؟ فرمایا: بنا ہوا تو ہے؛ مگر دیکھو ہمارا تیلی کیا کرتا ہے؟ وزیر اعظم اسی تحصیل کے ہیں جس کے حضرت مفتی صاحب ہیں؛ چنانچہ ٹکٹ کینسل ہوگیا اور سفر ملتوی، اب کار یا ایمبولینس سے آنے کی بات چلی؛ مگر اس میں مصلحت نہ سمجھی گئی، حضرت کو سمجھانے کے لئے شاگرد رشید ورکن شوریٰ دار العلوم دیوبند مفتی احمد خان پوری صاحب کے ذریعے کہلوایا گیا: انہوں نے گزارش کی تو حضرت مان گئے؛ اس لئے کہ دیوبند بھی ہاٹ اسپاٹ (کرونا کا حساس علاقہ) اور ممبئی بھی، سب کے کورنٹائن ہونے کا خطرہ لیکن حضرت کا جی نہیں لگ رہا تھا، جب ۲۵؍اپریل کو رمضان شروع ہونے والا تھا تو ممبئی میں رہنا طے کرلیا، ساتھ ہی آن لائن بیان کے اعلانات آنے لگے، بڑی خوشی ہوئی، پہلی شب دس بجے تک بیان ہوا، پھر ساڑھے دس سے بارہ بجے تک بیان ہوتا رہا اخیر کا آدھ گھنٹہ سوال و جواب کا تھا، پندرہ رمضان المبارک تک بیانات ہوئے ہیں، بارہ رمضان کو طبیعت پھر ناساز ہوئی، موسمی بخار ہوا، سوئے رہے چار نمازیں قضا ہوگئیں تو تیرہ اور چودہ رمضان کو بیان نہ کرسکے، کل چودہ تقریریں ہوئیں ان کے عناوین درج ذیل ہیں: ’’ثنا میں ائمہ کا اختلاف حدیثِ ثریا کی تشریح، ’’الائمۃ من قریش‘‘ کا مطلب، قرآن کے پاروں کی نئی تقسیم کی تردید بنائے کعبہ کی مختصر روداد، سورۂ فاتحہ سے علاج، حدیث الحلال بین والحرام بین کی تشریح ایمانیات کی تفصیل، تخلیق کے مراحل، دادی حوا کی پیدائش سے متعلق غلط فہمی کا ازالہ، توحیدِ الوہیت اور توحید ربوبیت میں تلازم، آخرت اور رسالت، ایاک نعبد وایاک نستعین کی تشریح، جن بندوں پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا، زمزم کے کنویں سے متعلق غلط فہمی کا ازالہ، تقلید کا

اثبات، قرأت الامام، کرامات میں غلو، متقیوں کی تعریف، الطلاق مرتان کی تشریح، ستر کی تعیین، سونے اور چاندی کا نصاب، آخری بیان ''ختم نبوت کے اثبات'' پر ہوا۔ پھر مہر لگ گئی (امید ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کا جوار رحمت نصیب ہوا ہوگا۔ فرشتوں نے استقبال کیا ہوگا، حور وغلمان کی خدمت نصیب ہوئی ہوگی۔) بیانات سننے کے لئے آٹھ ہزار سے زیادہ نمبرات مربوط تھے پھر اس کو دوسرے گروپوں میں شیئر کیا جاتا تھا، وہ یورپ، امریکہ اور پورے عالم میں بڑی اہمیت سے سنے جارہے تھے؛ لیکن یہ سلسلہ پندرہ رمضان سے آگے نہ چل سکا۔

زمانہ بڑے غور سے سن رہا تھا ''تمہیں'' سو گئے داستاں کہتے کہتے

اب ان تقاریر کو مولوی محمد طفیل دربھنگوی کاغذ پر منتقل کررہے ہیں۔ ان شاء اللہ کتابی شکل میں بھی شائع ہوں گی، تو ان کی افادیت مزید عام ہوگی۔ وباللہ التوفیق۔

رمضان المبارک کی کسی تاریخ میں فون آیا / یا میں نے فون کیا: خبر خیریت کے بعد پوچھا: کیا کررہے ہو؟ تو بتایا کہ آپ نے جو ہدایت القرآن کے لفظی اور بامحاورہ ترجمہ کو سامنے رکھ کر آسان اسلوب میں ''ترجمہ قرآن کریم'' کرنے میں لگا رکھا ہے، اسی میں لگا ہوں، چھ پارے ہوئے ہیں تو خوش ہوئے اور آسانی کے ساتھ تکمیل کی دعا فرمائی، یہ آخری گفتگو تھی۔ اللہ کرے کہ یہ کام پورا ہو اور خدا و خلقِ خدا تعالیٰ کے نزدیک قبول حاصل کرے (آمین)

۱۶؍رمضان کی رات کو بخار آیا، سحری کے بعد بخار بڑھ گیا اور سانس میں تکلیف ہونے لگی کھانسی بھی ہونے لگی، گھر پر ہی رہے، رات میں بھی گھر پر ہی تھے، ۱۷؍رمضان میں چوں کہ ''ملت ہاسپٹل'' بند تھا: اس لئے ''نیو سنجیونی ہاسپٹل ملاڈ'' لے جائے گئے، جنرل وارڈ میں پورا دن رہے، رات کو دست آنے لگے، کمزوری بڑھنے لگی تو دوپہر کو آئی، سی، یو میں منتقل ہوئے، رپورٹ آئی تو معلوم ہوا کہ دو دن پہلے ہارٹ اٹیک آیا تھا، اسی وجہ سے پھیپھڑے میں پانی آگیا ہے، سانس کی تکلیف بھی اسی وجہ سے ہے، گردہ تو کئی سال سے کمزور تھا

کریٹنن کبھی گھٹتا تھا، ۲۱؍رمضان تک آئی، سی، یو میں ہی رہے، دھیرے دھیرے طبیعت ٹھیک ہوگئی، ہسپتال کے کھانے کے بجائے گھر کے کھانے کی فرمائش کی، کھایا بھی، عبداللہ بھائی (فرزند برخوردار) آم لائے اس تھوڑی مقدار کو مزے لے کر کھایا، اسّی فی صد طبیعت ٹھیک ہوگئی، حضرت کے فرزند حافظ عبداللہ سلمہٗ اس معنی کر خوش قسمت ہیں کہ آخری ایام علالت میں ان کو والد صاحب مرحوم کی خدمت نصیب ہوئی، اللہ تعالیٰ قبولیت سے نوازیں (آمین)۔ میرے پاس اسی دن عمار بھائی نے فون کیا اور بتایا کہ: ابا کی طبیعت بہت اچھی ہے، ماشاء اللہ، اب اصرار کرنے لگے ہیں کہ مجھے جنزل وارڈ میں لے چلو، یا گھر لے چلو، ٹھیک ہو گیا ہوں۔ دیوبند آنے کے لئے بہت اصرار کرنے لگے، خود سے موئے لب تراشا، کہنے لگے، مجھے نہلاؤ۔

بہر کیف! ۲۲؍رمضان کو آئی، سی، یو سے جنزل وارڈ میں منتقل ہوئے، ۲۳؍رمضان کی رات بہت اچھے رہے، نو بجے اپنی بہو (مولانا احمد سعید کی اہلیہ) کو فون کیا، خیر خیریت پوچھی اور دیوبند آنے کی خواہش کی تو کہا گیا کہ الحمد للہ آپ کی طبیعت ٹھیک ہو رہی ہے، ہاسپٹل سے نکلتے ہی آجائیں گے، ان شاء اللہ کوئی انتظام ہو جائے گا پھر رات ڈیڑھ بجے سے پہلے عمار بھائی سے بھی بات ہوئی، پھر اپنے عزیز القدر بھائی حضرت مفتی محمد امین صاحب کو سلام بھجوایا پھر سحری کے وقت دو بجے رات کو جامعہ نور العلوم گٹھامن پالن پور کے صدر مدرس مولانا یوسف قاسمی مدظلہ کو فون کیا کہ محمد بھائی مرحوم کے فرزند عبداللہ کو مدرسہ کا مہتمم بنایا جائے۔ میری یہ رائے سارے اراکین شوریٰ کو پہنچا دیں۔ قضا نماز پڑھنے کے لئے اصرار کیا؛ مگر آئی سولیشن میں نگراں نرس وغیرہ نے توجہ نہ دی، اسی رات نیند کے لئے انجکشن دے دیا، اسی سے سوئے اور ہمیشہ کے لئے سو گئے، بظاہر یہی انجکشن موت کا سبب ثابت ہوا۔ ورنہ طبیعت تو اسّی فیصد ٹھیک ہوگئی تھی، حضرت نیند کی گولی وغیرہ سے خوف کھاتے تھے، بیمار ہو کر ممبئی جانے سے گھبراتے اور ہسپتال کی موت سے پناہ مانگتے تھے؛ مگر ہوا وہی جس کا ڈر تھا اور جو تقدیر میں لکھا تھا۔ غنودگی جیسی کیفیت رہی، جب اٹھایا جاتا تو کہتے: ''مجھے سونے دو'' جب چوبیس گھنٹے گزر گئے اور کچھ نہ کھایا تو ڈاکٹروں نے ناک سے پائپ کے

ذریعہ معدے میں غذا پہنچائی اور ۲۴ر رمضان کو دوبارہ آئی سی یو میں منتقل کیا، کمزوری بڑھتی گئی بلڈ پریشر گھٹتا گیا، آکسیجن میں کمی آتی گئی، پھیپھڑے میں پانی بڑھتا رہا بخار تیز ہوتا رہا، رات ڈیڑھ بجے عمار بھائی نے مجھے کہا: سوگئے ہیں، میں نے خطرہ محسوس کیا، اس لئے کہ وہ تو دو دنوں سے سو رہے تھے، ساڑھے تین بجے مسلمان نرس نے ہاشم بھائی کو بتایا کہ کچھ پڑھ رہے ہیں، عمار بھائی گھر پر تھے، انہوں نے فون پر کہا کہ فون قریب کرو۔ پھر سنا گیا کہ کلمہ پڑھ رہے ہیں، عمار بھائی سحری کھا کر ساڑھے پانچ بجے ہاسپٹل پہنچے تو بڑی صاف اور قدرے تیز آواز میں پڑھ رہے تھے: ”اشھد ان لاالہ الا اللہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ“ کمرے میں موجود مسلمان نرس اور عمار بھائی وغیرہ سب نے سنا۔

غم میں بھی ہے سرور، وہ ہنگام آگیا شاید کہ دور بادۂ گلفام آگیا

اس کے بعد کمزوری بڑھتی چلی گئی، بلڈ پریشر گھٹ رہا تھا، آکسیجن بھی کم ہو رہا تھا، یہاں تک کہ ساڑھے چھ اور پونے سات بجے کے درمیان ڈاکٹر نے قفسِ عنصری سے روح کے پرواز ہونے کی تصدیق کردی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، ان للہ ما اخذ ولہ ما اعطیٰ وکل شئی عندہ باجل مسمی۔ ۱۹ر مئی ۲۰۲۰ء مطابق ۲۵ر رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ روز منگل کی طاق رات میں غنودگی کی حالت میں رہے اور صبح سویرے ایک مسافر، محدث کبیر، مفسر عظیم سنت کے شیدائی ولی اللہ کی روح اس طرح نکلی کہ احساس تک نہ ہوا، جیسے آٹے سے بال نکلتا ہے، بلڈ پریشر اور آکسیجن دھیرے دھیرے کم ہوتے چلے گئے اور روح عالم ارواح سدھار گئی، اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے کو سکرات کی تکلیف سے محفوظ رکھا، ہائے! ہم میں سے کسی کو یہ احساس نہ تھا کہ صحت یابی کے بعد اچانک رخصت ہو جائیں گے، پھیپھڑے میں پانی اس سے پہلے بھی دوبار آگیا تھا، پھر صحت ہوگئی تھی، کبھی کبھی گہری نیند بھی آتی تھی؛ اس لئے یہ بھی معمول کی بات لگ رہی تھی، بخار اور کھانسی تو معمولی بیماریاں ہیں، مسلسل بیانات ہو رہے تھے، اس سے بھی امید تھی کہ مشکل سے نکل گئے ہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے موت کا وقت کسی کو نہیں بتایا اور نہ موت کی جگہ اور نہ ہی سبب کسی کو معلوم ہے، اللہ تعالیٰ کی جو مرضی ہوئی اسی میں خیر ہے، اگر اس دنیا میں کسی کو رہنے کا حق تھا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم تھے۔ انہیں کے لئے یہ دنیا بنائی گئی وہی خلاصہ کائنات ہیں۔ اگر ان کی رحلت ہوئی اور شدید ترین محبت کرنے والے صحابۂ کرام نے صبر کیا تو ہم سب کو بھی صبر جمیل کرنا چاہیے انہیں کا اسوہ ہمارے لئے لائق عمل اور باعث نجات ہے۔

ہاسپٹل کا بل ساڑھے گیارہ لاکھ ادا کیا گیا، نماز کے فدیہ کے طور پر احتیاطاً دس ہزار روپے نکالے گئے، آٹھ بجے ڈیتھ سرٹیفکیٹ (تصدیق نامہ وفات) تیار ہوا اور چوں کہ اٹیک کی وجہ سے پھیپھڑے میں پانی اتر آیا تھا، نمونیا بخار تھا، کھانسی تھی اور کافی عرصہ پہلے ٹی بی کا بھی حملہ ہوا تھا۔ یہ سب ''کرونا'' کے سمٹم ہیں؛ اس لیے ہاسپٹل سے اسی پروسیس سے باہر لانے کی اجازت ہوئی؛ مگر کافی رعایت دی گئی، مولانا حارث اور مولانا ہاشم صاحب نے غسل وکفن کی ذمہ داری نبھائی، پہلے وضو کرایا؛ پھر روئی بھگا بھگا کر پورے بدن کو صاف کیا، پھر نیا تولیہ بھگا بھگا کر پورے بدن کو آدھی بالٹی پانی سے پوچھا، سجدہ گاہوں پر کافور اور عطر لگایا، پھر سنت کے مطابق کفن پہنایا، زیارت کے لئے ایک ایک آدمی کو اجازت تھی، زیارت کرنے والوں نے پیشانی پر بوسے بھی دیے، عمار بھائی نے وفات کے بعد اور کفن پہنانے کے بعد کل تین بار بوسے دیے، ساڑھے دس بجے سے زیارت کا سلسلہ چار بجے تک چلتا رہا، ادھر قبر تیار ہو رہی تھی، چار بجے ملاڈ کی ''محراب مسجد'' کے پاس تقریباً دو سو لوگوں نے نماز جنازہ ادا کی، فرزند ارجمند مولانا حافظ وحید احمد صاحب نے امامت کی، ساڑھے پانچ بجے تدفین عمل میں آئی، اس علاقے میں پوری قانونی رعایت کے ساتھ تدفین کی اجازت اقبال بھائی نے حاصل کی تھی، قبر میں اتارے جانے کے بعد اقبال بھائی اترے اور انہوں نے خوب اچھی طرح پورے بدن کو مشرق کی دیوار سے لگا کر قبلہ رخ کیا، پھر ایک پلائی ووڈ کا بڑا تختہ ترچھا کر کے رکھا گیا جس سے پورا سراپا ڈھک گیا، پھر مٹی دینے والوں نے مٹی دی۔ پھر قبر پر پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا، ساڑھے چھ بجے تدفین سے فراغت ہوئی۔ چوں کہ قبرستان میں قبر کھودنے والا کوئی نہیں تھا؛ اس لئے حاضرین عزیز واقارب نے قبر کھودی ان سعادت مندوں میں سے چند کے نام یہ ہیں: (محمد چچا کے لڑکے) حذیفہ، معاذ بن ہارون، انس، اسماعیل سلیم، سہیل، عمران، عبدالستار اور مرکز المعارف میں پڑھنے والے چند فضلاء وغیرہ، قبر ساڑھے

چھ تا سات فٹ کھودی گئی، جب کوئی اندر کھڑا ہو تو سر سے اوپر تک ڈیڑھ دو بالشت قبر ہو رہی تھی، جس کا اندازہ ساڑھے چھ تا سات فٹ ہوتا ہے، عبد اللہ بن محمد چچا، مولانا حارث قاسمی عمار بھائی سب نے یہی بتایا۔

تدفین کے بعد سرہانے ایک پتھر کھڑا کر دیا گیا، پھر دونوں صاحبزادوں، داماد اور مولانا حارث صاحب اور بہت سے حاضرین نے سورۂ بقرہ کی شروع اور اخیر کی اور قرآن پاک کی دوسری آیتیں پڑھیں اور آب دیدہ واپس ہوئے۔

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

حضرت کی زندگی کا سب سے ممتاز پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ہر عمل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی طرح کرنے کی کوشش کی، ہر عمل کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کئے جانے کے لائق بنانے کا تصور ہر لمحہ غالب رکھا، کسی بھی حق کو ظاہر کرنے میں ذرہ برابر کسی بندے کی خوشی اور ناراضگی کا ادنیٰ خیال بھی نہیں آنے دیا اور موت کے لئے ہر وقت تیار رہے۔ ایک مرتبہ ایک بڑے استاذ دار العلوم عیادت کے لئے تشریف لائے تو فرمایا: مولانا میں اللہ تعالیٰ کے پاس حاضری کے لئے بالکل تیار ہوں، کسی کا کوئی حق میرے ذمے نہیں ہے، میں نے کتب خانے کو بچے بچیوں میں بانٹ دیا ہے، اپنے لئے صرف ہدایت القرآن رکھی ہے، جس سے میرا کھانا خرچہ چلتا ہے، پرانے مکان کو بھی کمرہ کمرہ کر کے تقسیم کر دیا ہے، اب اس میں داخل نہیں ہوتا۔

آسماں کچھ بھی نہیں تیرے کرنے کے لئے
میں نے سب تیاریاں کر لی ہیں مرنے کے لئے

میں نے اتنا بڑا انسان نہیں دیکھا اور نہ دیکھنے اور برتنے کی امید ہے، جس کے ہر عمل اور ہر قول نے عقیدت کو بڑھایا اور متاثر کیا، علوم شریعہ کے ہر فن کی ہر کتاب کی مشکل ایسے حل ہوتی ہے، جیسے اسی بحث کو ابھی دیکھا ہے۔ علماء کی وفات کے ساتھ علم کے رخصت ہونے کا کھلی آنکھوں ایسا مشاہدہ پہلی بار ہوا۔ ع

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

زریں خدمات

اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

حضرت مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی مدظلہ

نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند

۲۵/ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ کی پچیسویں تاریخ کو یہ اندوہناک خبر ملی کہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ دار فانی سے دار جاودانی کی طرف رحلت فرما گئے، (اناللہ وانا الیہ راجعون) موت کوئی انہونی چیز نہیں، انسان کا پیدا ہونا ہی مرنے کی دلیل ہے، بس افسوس اس کا ہے کہ دنیا ایک عظیم ترین عالم دین سے محروم ہوگئی، علم کا ایک عظیم ترین ذخیرہ ان کے ساتھ رخصت ہوگیا دنیا سے دینی علوم کے رخصت ہونے کی صورت یہی ہوتی رہی ہے کہ علم اہل علم کے ساتھ دفن ہوتا رہا، اس قحط الرجال کے دور میں دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث وصدر المدرسین بڑی تسلی کا سامان تھے، ان کے اندر علوم کی گہرائی وگیرائی تو تھی ہی، اسی کے ساتھ جادو بیانی کی دولت سے بھی سرفراز تھے، مشکل سے مشکل مسئلہ کو بڑی آسانی سے سمجھا لیتے تھے، آسان سے آسان الفاظ اور سہل ممتنع تعبیرات ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی رہتیں، بڑے پروقار لب ولہجہ میں سامعین کے کانوں کے راستے سے ان کے دل ودماغ تک رسائی حاصل کر لیتے تھے۔

مولانا مرحوم نے جہاں مشکل سے مشکل موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے، وہیں آسان سے آسان تصنیفات سے نسل نو کی علمی آبیاری بھی فرمائی ہے۔ ''حجۃ اللہ البالغہ'' جیسی دقیق ترین کتاب کی شرح لکھ کر آپ نے علمائے دیوبند کے ذمہ تین سو سالہ قرض کی ادائیگی فرمائی، مؤقر مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے مبارک بادی کی تجویز کے ذریعہ موصوف کی حوصلہ افزائی فرمائی، صحیح بخاری، جامع ترمذی اور طحاوی شریف کی شروحات نے آپ کے علمی مقام کو خوب متعارف کرایا، اصول تفسیر میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی فارسی تصنیف

''الفوز الکبیر'' کی تعریب کی توفیق بھی نصیب ہوئی جو آج دارالعلوم دیوبند کے نصاب کا جز ہے، اسی طرح علم منطق و فلسفہ کو مبتدی طلبہ کرام کے ذہن سے قریب کرنے کے لیے ''مبادی الفلسفہ'' اور ''آسان منطق'' کی ترتیب کی ذمہ داری بھی مجلس شوری نے موصوف کے سپرد فرمائی؛ چنانچہ پندرہ بیس سال سے یہ تینوں کتابیں دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں داخل ہیں، مولانا مرحوم پہلے خوش نصیب مصنف ہیں جن کی تین کتابیں مادر علمی میں پڑھائی جاتی ہیں اور دوسری تصانیف: آسان نحو، آسان صرف، آسان فارسی قواعد، مبادی الاصول (اصول فقہ) وغیرہ دیگر مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں۔ تصانیف سے ہر ایک اندازہ کرسکتا ہے کہ موصوف کو جملہ علوم شرعیہ میں مہارت تامہ حاصل تھی، ایسی شخصیت کی رحلت سے کتنا بڑا خلا ہوا ہے، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

ناچیز کو جب وفات کی اطلاع ملی تو بے ساختہ زباں پر آیا:

ماکان قیس هلکه هلك واحد
ولکنه بنیان قوم تَهَدَّمَا

(قیس کی وفات ایک شخص کی وفات نہیں؛ بلکہ اس سے قوم کی عمارت منہدم ہوکر رہ گئی)، فورا ہی دولت کدہ پر پہنچا اور صاحب زادوں کو تعزیت مسنونہ پیش کی اور کہا: وہ محض آپ ہی کے والد نہیں تھے وہ تو پوری امت مسلمہ کے عظیم ترین سرپرست تھے، مسلک دیوبند کی بے باک ترجمانی کی جب بھی ضرورت پیش آئی مولانا مرحوم نہایت ہی اچھے انداز میں اس کی تکمیل فرماتے تھے، موصوف کو میں نے اڑتالیس سال سے دارالعلوم میں دیکھا؛ کیوں کہ ان کا اور میرا تقرر ایک ہی دن ہوا ہے۔ صبح وشام کا فرق تھا، موصوف نے ہمیشہ دارالعلوم کے مفاد کو مقدم رکھا، ہر مجلس میں ان کے خلوص نے متاثر کیا، انھوں نے کبھی کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا، وہ دوستوں سے کبھی منہ نہ پھیرتے تھے، اللہ تعالی مرحوم کی مغفرت فرمائے اور دارالعلوم دیوبند کو نعم البدل عطا فرمائے، ان کی رحلت سے جو خلاء پیدا ہوا ہے اس کو پر فرمائے۔

وما ذلك على الله بعزيز

شیخ الحدیث مفتی سعید احمد پالن پوریؒ

کی تصنیفی خدمات کا تعارف

ڈاکٹر مولانا محمد نجیب قاسمی سنبھلی

شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند مفتی سعید احمد پالن پوریؒ نے ۲۵ رمضان ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹ مئی ۲۰۲۰ء کو وفات سے قبل تک ۵۷ سال مدارس اسلامیہ بشمول ۴۸ سال دارالعلوم دیوبند میں قرآن وحدیث کی وہ عظیم خدمات پیش فرمائی ہیں کہ صدیوں تک علماء کرام اُن سے سیراب ہوکر امت مسلمہ کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔ دارالعلوم دیوبند میں ۳۰ سال سے زیادہ حضرت نے حدیث کی مشہور کتاب ترمذی شریف اور ۲۰۰۸ء سے وفات تک تقریباً ۱۲ سال بخاری شریف کا درس دیا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حجۃ اللہ البالغہ جیسی معرکۃ الآراء کتاب کو آپ نے ۲۰ سال سے زیادہ عرصہ تک پڑھایا۔ ایک طرف حضرت کے لاکھوں شاگرد دنیا کے چپہ چپہ میں دینی علوم کے پیاسوں کو اپنے علوم سے فیضیاب اور سیراب کررہے ہیں، دوسری طرف آپ کی تصانیف سے دنیا کے شرق وغرب میں استفادہ کیا جارہا ہے۔ آپ نے عربی، اردو اور فارسی میں تفسیر قرآن، شرح حدیث، سیرت، اصول تفسیر، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، اسماء الرجال، تاریخ، نحو، صرف، منطق وفلسفہ، اختلافی مسائل اور جدید مسائل پر ایسی مایۂ ناز تصانیف تحریر فرمائی ہیں کہ اُن میں سے اکثر متعدد مرتبہ شائع ہوئی ہیں بلکہ بعض کتابوں کے لاکھوں نسخے شائع ہوچکے ہیں۔ آپ کی تمام ہی تصانیت پوری دنیا میں بڑی قدر ومنزلت سے پڑھی جاتی ہیں۔ آپ کی متعدد تالیفات دارالعلوم دیوبند اور ہزاروں مدارس کے نصاب میں داخل ہیں۔ استاذ محترم کی تالیفات کا مختصر تعارف اپنی استطاعت کے مطابق پیش کررہا ہوں۔

تحفۃ القاری شرح صحیح البخاری

دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا نصیر احمد خانؒ کی علالت کے بعد ۱۴۲۹ھ

مطابق ۲۰۰۸ء سے بخاری جلد اول کا درس مفتی سعید احمد پالن پوریؒ سے متعلق کر دیا گیا تھا۔ ۱۴۰۲ھ میں کیمپ کے سال آپ نے بخاری جلد۲ بھی پڑھائی تھی۔ ۱۲ جلدوں پر مشتمل بخاری کی اردو زبان میں یہ شرح مفتی صاحب کے بخاری کے دروس کا مجموعہ ہے جو نہ صرف بخاری پڑھنے پڑھانے والوں کے لئے نہایت مفید ہے بلکہ حدیث کی دیگر کتابوں کو سمجھنے کے لئے بھی خاص اہمیت کی حامل ہے۔

تحفة الالمعي شرح سنن الترمذي

۸ ضخیم جلدوں پر مشتمل ترمذی کی مذکورہ شرح مفتی صاحب کے دروس کا مجموعہ ہے۔ ہندوستان میں موجود ترمذی کے نسخے بہت قدیم تھے، حضرت نے ابواب واحادیث کے نمبرات کے ساتھ عربی عبارت کو صحیح طریقہ سے ترتیب دیا تاکہ استفادہ میں آسانی ہوجائے۔ شرح کا مقدمہ اساتذہ اور طلبہ دونوں کے لئے قیمتی معلومات پر مشتمل ہے۔

شرح علل الترمذي

یہ ترمذی کی ”کتاب العلل“ کی عربی شرح ہے۔ اس میں نہایت آسان زبان میں کتاب العلل کو سمجھایا گیا ہے۔ کتاب العلل میں کسی حدیث کی سند میں موجود ضعف پر بحث کی جاتی ہے۔

رحمة الله الواسعه

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی عربی زبان میں تحریر کردہ ایک کتاب ”حجۃ اللہ البالغہ“ ہے۔ ۲۵۰ سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود اس کتاب کی کسی بھی زبان میں کوئی شرح تحریر نہیں کی جاسکی۔ مفتی صاحب نے ۵ جلدوں پر مشتمل ”رحمۃ اللہ الواسعہ“ کے نام سے اردو زبان میں یہ شرح تحریر فرمائی ہے۔ اہل علم نے اس کتاب کی بہت پزیرائی فرمائی ہے۔

تحقيق وتعليق حجة الله البالغه

حجۃ اللہ البالغہ مفتی صاحب کی تحقیق وتعلیق کے بعد ۲ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

عربی داں حضرات کے لئے اس اہم کتاب کو سمجھنے میں مفتی صاحب کا حاشیہ کافی مفید ہے۔

تفسیر ھدایت القرآن

مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمیؒ ۳۰ ویں پارہ اور ایک تا ۹ پارے کی تفسیر لکھنے کے بعد بعض اعذار کی وجہ سے قرآن کریم کی تفسیر مکمل نہ کر سکے۔ مفتی صاحب نے یہ تفسیر نہ صرف مکمل کی بلکہ اپنی گرانقدر خدمات سے ۸ جلدوں پر مشتمل یہ تفسیر شائع بھی فرمائی۔

آسان بیان القرآن

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ۳ جلدوں پر مشتمل اردو زبان میں قرآن کریم کی تفسیر ''بیان القرآن'' تحریر فرمائی ہے۔ مولانا عقیدت اللہ قاسمی نے اس کی تسہیل کی، مفتی صاحب نے مکمل تفسیر پر نظر ثانی فرما کر ''آسان بیان القرآن'' کے نام سے شائع فرمائی جس کی ۵ جلدیں ہیں۔

فیض المنعم

مسلم کا مقدمہ حدیث کے پڑھنے پڑھانے والوں کے لئے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ مفتی صاحب کی فیض المنعم شرح مقدمہ مسلم طلبہ واساتذہ میں کافی مقبول ہے۔

ایضاح المسلم

مسلم شریف کی مکمل شرح بھی موصوف نے تحریر کرنا شروع کردی تھی، جس کی پہلی جلد شائع ہوگئی ہے۔

زبدہ شرح معانی الآثار

امام طحاویؒ کی مشہور کتاب ''شرح معانی الآثار'' کے کتاب الطہارۃ کی عربی شرح ''زبدہ شرح معانی الآثار'' مفتی صاحب نے تحریر کی ہے۔

الفوز الکبیر فی اصول التفسیر

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی فارسی زبان میں تحریر شدہ کتاب کا متعدد حضرات

نے عربی زبان میں ترجمہ کیا تھا مگر ہر ترجمہ میں کچھ خامیاں موجود تھیں۔ مفتی صاحب نے تہذیب وتصحیح فرما کر حاشیہ کے ساتھ یہ کتاب دوبارہ شائع کی۔ یہ عربی ترجمہ دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس اسلامیہ کے نصاب میں داخل ہے۔

العون الکبیر شرح الفوز الکبیر

یہ ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' کی عربی شرح ہے۔ اس شرح کے ذریعہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی مشہور کتاب کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔

مفتاح التہذیب

یہ منطق کی مشہور کتاب ''تہذیب المنطق'' کی اردو شرح ہے۔

الوافیہ بمقاصد الکافیہ

نحو کی کتاب ''الکافیہ'' آج بھی مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ کتاب کے مشکل ہونے کی وجہ سے طلبہ کو سمجھنے میں دشواری آتی ہے۔ مفتی صاحب نے عربی زبان ہی میں حواشی اور تعلیقات تحریر کرکے نحو کی اس اہم کتاب کو سمجھنے اور سمجھانے میں کسی حد تک آسانی پیدا کردی ہے۔

ھادیہ شرح کافیہ

نحو کی اہم کتاب ''الکافیہ'' کی یہ اردو شرح ہے۔ اس شرح کے ذریعہ اب کافیہ جیسی مشکل کتاب کا سمجھنا کافی حد تک آسان ہوگیا ہے۔

مبادئ الفلسفہ

فلسفہ کی عربی زبان میں تحریر کردہ کتابیں طلبہ کو سمجھنے میں کافی دقت پیش آتی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کی طلب پر مفتی صاحب نے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ اس کتاب میں فلسفہ کی تمام اصطلاحات کو عربی زبان میں مختصر اور عمدہ طریقہ سے تحریر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس میں طلبہ کو پڑھائی جاتی ہے۔

معین الفلسفہ

یہ مبادئ الفلسفہ کی بہترین اردو شرح ہے جس میں حکمت وفلسفہ کے پیچیدہ مسائل کی عمدہ وضاحت کی گئی ہے۔

مبادئ الاصول

اصول فقہ کی کتابوں کو سمجھنے میں طلبہ کو دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مفتی صاحب نے اصول فقہ کی بنیادی اصطلاحات پر مشتمل عربی زبان میں یہ کتاب تحریر فرمائی ہے تاکہ اس کو پڑھنے کے بعد اصول فقہ کی مشہور ومعروف کتابوں کا سمجھنا آسان ہو جائے۔ یہ کتاب مختلف مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔

معین الاصول

یہ مبادئ الاصول کی آسان اردو شرح ہے جس میں اصول فقہ کی اصطلاحات کو اچھے طریقہ سے سمجھایا گیا ہے۔ اس اردو شرح سے اصل کتاب ''مبادئ الاصول'' اور اصول فقہ کی دیگر کتابوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

آپ فتوی کیسے دیں؟

علامہ شامیؒ کی عربی کتاب ''شرح عقود رسم المفتی'' کا مفتی صاحب نے سلیس اردو ترجمہ کر کے ''آپ فتوی کیسے دیں؟'' نام سے شائع کیا۔

آسان نحو (دو حصے) وآسان صرف (تین حصے)

یہ کتابیں متعدد مدارس کے نصاب میں داخل ہیں۔ ان کتابوں کو ابتدائی طلبہ کے لئے مفتی صاحب نے آسان زبان میں اس طرح ترتیب دیا ہے کہ ان کے پڑھنے کے بعد عربی زبان میں علم النحو وعلم الصرف کی کتابیں بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہیں۔

آسان فارسی قواعد

ابتدائی درجوں میں فارسی پڑھانے کے لئے دو حصوں پر مشتمل یہ نہایت مفید اور آسان کتاب ہے۔ بہت سے مدارس میں یہ کتاب نصاب میں داخل ہے۔

آسان منطق

یہ کتاب اصل میں ''تیسیر المنطق'' کی ترتیب وتسہیل ہے جو مفتی صاحب نے کی ہے۔ یہ کتاب دارالعلوم دیوبند اور بہت سے مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔

تحفۃ الدرر شرح نخبۃ الفکر

علامہ ابن حجر عسقلانیؒ کی اصول حدیث کی مشہور کتاب ''نخبۃ الفکر فی مصطلح اہل الاثر'' کی یہ اردو شرح ہے۔

مفتاح العوامل شرح مئۃ عامل

''شرح مائۃ عامل'' فنِ نحو کی اہم کتاب ہے۔ مولانا فخر الدین مرادآبادیؒ نے اس کتاب کی شرح تحریر فرمائی تھی، مگر شائع نہیں ہوسکی تھی۔ مفتی صاحب نے قابل قدر خدمات پیش فرما کر اس کتاب کو شائع فرمایا۔

گنجینۂ صرف

یہ علم صرف کی فارسی زبان میں مشہور کتاب ''پنج گنج'' کی اردو شرح ہے، جو مولانا فخر الدین مرادآبادیؒ نے لکھی تھی، مگر شائع نہیں ہوسکی تھی۔ مفتی صاحب نے اس کی نظر ثانی کی اور اس کو مرتب ومکمل کر کے شائع فرمایا۔

علمی خطبات

یہ مفتی صاحب کی اُن تقاریر کا مجموعہ ہے جو انہوں نے بیرون ملک میں کیں۔ آپ کے صاحبزادوں نے ان کو قلمبند کیا اور مفتی صاحب نے لفظ بلفظ ان کو پڑھا۔ دو حصوں میں یہ تقریریں شائع کی گئیں۔

تذکرۂ مشاہیر محدثین وفقہاء کرام اور تذکرۂ راویان کتب حدیث

اس کتاب میں خلفاء راشدین، عشرۂ مبشرہ، حضور اکرم ﷺ کی بیویوں اور

بیٹیوں، مدینہ منورہ کے سات بڑے فقہاء، حدیث کے راویوں، کتب حدیث کی شرح لکھنے والوں، مشہور مفسرین ومحدثین ومجتہدین وفقہاء اور متکلمین کا مختصر جامع ذکر ہے۔

دین کی بنیادیں اور تقلید کی ضرورت

تقلید ائمہ کے موضوع پر چند تقاریر کا مجموعہ ہے جو مفتی صاحب کی نظر ثانی اور رحمۃ اللہ الواسعہ سے دین کی بنیادی باتوں کے اضافہ کے ساتھ شائع ہوئی۔

داڑھی اور انبیاء کی سنتیں

اس کتاب میں داڑھی پر اعتراضات کے مدلل جوابات کے علاوہ انبیاء کرام کی اہم سنتوں کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔

اسلام تغیّر پذیر دنیا میں

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) کے سمیناروں میں پیش کئے گئے چار قیمتی مقالوں (اسلام تغیر پذیر دنیا میں، فکر اسلامی کی تشکیلِ جدید کا مسئلہ، فقہ حنفی میں فہمِ معانی کے اصول اور نبوت نے انسانیت کو کیا دیا؟) کا یہ مجموعہ ہے۔

حرمت مُصاھَرت

اس کتاب میں سسرالی اور دامادی رشتوں کے احکام ومسائل بیان کئے گئے ہیں۔

حیاتِ امام طحاوی

اس کتاب میں امام طحاویؒ کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف کے ساتھ ان کی کتاب ''شرح معانی الآثار'' کا تعارف اور اس کی شروح پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

حیاتِ امام ابو داود

اس کتاب میں حدیث کی مشہور کتاب ''سنن ابی داودؒ'' کے مصنف امام ابوداود سجستانیؒ کی سوانح حیات، سنن ابی داود کا تفصیلی تعارف اور اس کی تمام شروح کا مفصل جائزہ عمدہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

جلسۂ تعزیت کا شرعی حکم

اس کتاب میں تعزیتی جلسوں کے انعقاد کا شرعی حکم بیان کیا گیا ہے۔ تسہیل ادلہ کاملہ: شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے غیر مقلدین کے ۱۰ سوالات کے تحقیقی جوابات پیش کئے تھے۔ مفتی صاحب نے اس کی تسہیل فرمائی ہے جس کو شیخ الہند اکیڈمی (دارالعلوم دیوبند) نے شائع کیا ہے۔

تحقیق وتحشیہ ایضاح الادلہ

غیر مقلدین کے ۱۰ سوالات کے تحقیقی جوابات کی شرح خود شیخ الہند نے تحریر فرمائی تھی۔ مفتی صاحب نے اس پر حواشی تحریر کئے ہیں، نیز کچھ ذیلی عناوین کا اضافہ کیا ہے۔ یہ کتاب بھی شیخ الہند اکیڈمی سے شائع ہوئی ہے۔

کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی کتاب ''توثیق الکلام والدلیل المحکم'' کی یہ آسان وعام فہم شرح ہے۔

ارشاد الفہوم شرح سلم العلوم

مفتی صاحب نے منطق کی اہم کتاب ''سلم العلوم'' کی ایسی شرح تحریر فرمائی ہے کہ کتاب کے مشکل مقامات بھی سہل انداز میں حل ہوجاتے ہیں۔

کامل برہان الٰہی

''حجۃ اللہ البالغہ'' کی شرح ''رحمۃ اللہ الواسعہ'' کے ہر باب کے شروع میں اس کے مشمولات کو سمجھانے کے لئے مفتی صاحب نے کچھ مفید باتیں تحریر فرمائی ہیں۔ ان مفید مضامین کو اس کتاب میں ذکر کرکے شائع کیا ہے تاکہ جو لوگ شاہ ولی اللہؒ کی عربی عبارت کے بغیر اُن کی مراد کو سمجھنا چاہیں تو وہ اس کتاب کو پڑھ لیں۔ یہ کتاب ۴ جلدوں پر مشتمل ہے۔

محفوظات

یہ ۳ کتابچے ہیں جن میں مفتی صاحب نے آیاتِ قرآنیہ واحادیث نبویہ اردو

آسان ترجمہ کے ساتھ تحریر فرمائی ہیں تا کہ چھوٹے بچے انہیں سمجھ کر یاد کر لیں۔ بعض مدارس ومکاتب میں داخل نصاب ہیں۔

مسئلہ ختم نبوت اور قادیانی وسوسے

دارالعلوم دیوبند کے شعبہ ”کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت“ سے شائع شدہ اس کتاب میں ردّ قادیانیت اور مسئلہ ختم نبوت پر بحث کی گئی ہے۔

تعدد ازواج رسول اللہ ﷺ پر اعتراضات کا علمی جائزہ

درس کے دوران مذکورہ موضوع پر مفتی صاحب کی یہ تقریر ہے جو مولانا کمال الدین شہاب قاسمی نے مرتب کر کے شائع کی ہے۔

آخر میں مفتی صاحب سے متعلق چند اہم باتیں تحریر کرنا ضروری سمجھتا ہوں تا کہ ہم بھی ان کے نقش قدم پر چل کر کامیابی کی منازل طے کر سکیں۔ پہلی بات حضرت کے والد صاحب نے کبھی انہیں حرام لقمہ نہیں کھلایا، دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے پوری زندگی یعنی ۵۷ سال بغیر تنخواہ کے تدریسی خدمات انجام دیں حتی کہ جو تنخواہیں پہلے وصول کر چکے تھے وہ سب بھی واپس کیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ آپ کا درس بے حد مقبول تھا، طلبہ کا ازدحام آپ کے درس میں رہتا تھا۔ چوتھی بات عرض ہے کہ آپ کی تحریر کردہ کتابوں کے صفحات کی تعداد تقریباً ۳۵۰۰۰ ہے جو موصوف کی زندگی میں برکت اور اللہ کی طرف سے قبولیت کی واضح علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔ آمین۔

شیخ الحدیث وصدر المدرسین حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری نور اللہ مرقدہ

دیوبند تشریف آوری

تصانیف وعلمی خدمات ویادگار مجالس

حضرت مولانا خورشید حسن قاسمی ابن حضرت مولانا سید حسن صاحبؒ
سابق استاذ حدیث وتفسیر دار العلوم دیوبند

حضرت اقدس حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری نور اللہ مرقدہ کا تعلق راقم الحروف کے خانوادہ سے حضرت کے زمانۂ طالب علمی سے تسلسل کے ساتھ چلا آرہا ہے، جس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ جس وقت راقم الحروف مادر علمی دار العلوم دیوبند کے شعبۂ فارسی وریاضی کی کتب کا ابتدائی طالب علم تھا اس وقت والد ماجد حضرت مولانا سید حسن صاحب سابق استاذ تفسیر وحدیث دار العلوم دیوبند سے درس مشکوۃ شریف متعلق تھا اور حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری حضرت قبلہ والد ماجد کی خدمت میں جماعت مشکوٰۃ کے دیگر چند طلباء کی طرح حضرت والد صاحب کے ہمراہ اکثر وبیشتر راقم الحروف کے خاندانی مکان جامع مسجد تشریف لاتے اور حضرت والد صاحب سے خارج میں بھی استفادہ فرماتے اور یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ نومبر ۱۹۶۰ء میں طویل عرصہ کے بعد پاکستان سے حضرت والد صاحب کے حقیقی ماموں جد المکرّم فقیہ ملت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی دیوبند تشریف آوری ہوگئی حضرت والد صاحب نے موقع کو غنیمت خیال فرماتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سے تبرکاً مشکوۃ شریف کے ایک درس کی تدریس کے لیے گذارش فرمائی جس کو حضرت مفتی شفیع صاحب نے منظور فرمایا اور مشکوۃ شریف کی فضیلت علم سے متعلق ایک حدیث کا درس دیا مذکورہ درس میں حضرت مفتی سعید احمد صاحب بھی شریک رہے۔ مذکورہ درس حضرت مولانا شاہد حسن صاحب قاسمیؒ سابق استاذ دار العلوم دیوبند نے قلم

بند کیا اور حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری نظر ثانی اور باہمی اصلاح کے بعد کتابی شکل میں ”طلباء دین سے حضرت مفتی محمد شفیع کا ایک یادگار خطاب“ کے نام سے شائع بھی فرمایا بہر حال مذکورہ مناسبت کے بعد حضرت مفتی سعید احمد پالن پوری کا راقم الحروف کے خانوادہ اور احقر سے تعلق اور مناسبت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

حضرت مفتی پالن پوریؒ صاحب کو حضرت والد صاحب کے علاوہ جن اکابر اساتذۂ کرام سے شرف تلمذ حاصل ہوا، ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

دورۂ حدیث کے اساتذۂ کرام

استاذ الاساتذہ حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ صدر المدرسین دار العلوم دیوبند، شیخ الحدیث حضرت مولانا شیخ فخر الدین صاحب، حضرت مولانا قاری محمد طیب، حضرت مولانا سید فخر الحسن صاحب، حضرت مولانا بشیر احمد خاں صاحب حضرت مولانا محمد عبد الاحد صاحب دیوبندی وغیرہ وغیرہ۔ ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں دورہ حدیث شریف سے فراغت کے بعد حضرت مفتی صاحب نے مادر علمی کے شعبۂ افتاء میں داخلہ لیا اور افتاء میں بھی امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل فرمائی۔ فراغت افتاء کے بعد بھی مشق وتمرین کا سلسلہ جاری رہا اور حضرت مفتی صاحب کو حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہاں پوری صدر مفتی دار العلوم دیوبند نے افتاء کی سند خصوصی بھی عنایت فرمائی اور کچھ عرصہ تک مفتی صاحب نے معین مفتی کے طور پر بھی شعبۂ افتاء دار العلوم میں خدمات انجام دیں۔

بہر حال خدمت افتاء کے علاوہ مفتی صاحب نے بشمول دار العلوم دیوبند ملک کے دیگر مدارس میں نصف صدی سے کچھ زائد عرصہ تک تدریسی خدمات انجام دیں، حضرت کے تلامذہ ہند و پاکستان، بنگلہ دیش کے علاوہ امریکہ لندن وغیرہ اور عالم اسلام کے مختلف علاقوں میں خدمت افتاء وخدمت تدریس میں مشغول ہیں، حضرت کے تلامذہ ہزاروں کی تعداد میں ہیں اور دار العلوم دیوبند میں بھی درجۂ ابتدائی، درجۂ وسطیٰ اور بعض درجۂ علیا کے استاذ حضرت کے خاص تلمیذ ہیں۔

حضرت اقدسؒ ان نامور چند حضرات اساتذۂ کرام میں سے ہیں کہ جن کو ابتداء سے لے کر انتہاء تک اکثر علوم وفنون کی تدریس کا موقع ملا اور آپ کا درس طلبہ میں ہمیشہ مقبول رہا، درسی تقریر پر مغز او تفہیم عام فہم، فقہی اختلافی مسائل میں ائمہ اربعہ کے دلائل کے علاوہ حضرات احناف کے ترجیحی دلائل کا خاص خیال فرماتے؛ لیکن وجہ اختلاف کو ضرور ذکر کرتے، حضرت کثیر التصانیف اساتذہ کرام میں سے ہیں اور حضرت کی تصانیف کی تعداد پچاس کے قریب ہے۔ حضرت کی تصانیف تفسیر وحدیث، فقہ وافتاء، نحو وصرف، منطق، فلسفہ غرض تقریباً جملہ علوم وفنون متداولہ پر مشتمل ہیں۔ بعض تصانیف، سوانح وتاریخ سے متعلق بھی ہیں نیز درسی کتب کی شروحات اور فقہی مقالات وتحقیقی فتاوی اس کے علاوہ ہیں جو کہ بلاشبہ ملت کے لیے عظیم سرمایہ اور گنج گراں مایہ ہیں۔ اہم تصانیف کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

تفسیر ہدایت القرآن کامل آٹھ جلد یہ تاریخی آسان تفسیر ہے، جس کا آغاز حضرت نے دیوبند تشریف لانے کے بعد تقریباً فوراً ہی بعد فرمایا۔ مذکورہ تفسیر کے شروع کے آٹھ پاروں کی تفسیر حضرت مولانا کاشف الہاشمی راجوپوریؒ نے فرمائی اور پارۂ عم کی تفسیر بھی حضرت راجوپوری ہی نے فرمائی تھی؛ لیکن بعد میں حضرت مفتی صاحب نے مذکورہ تفسیر کی تکمیل فرمائی، تحفۃ القاری شرح صحیح البخاری کامل بارہ جلدیں، تحفۃ الالمعی شرح ترمذی شریف اردو کامل، رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ، تعلیقات وتشریحات حجۃ اللہ البالغہ، حواشی و حوالہ جات شرح الفوز الکبیر، امداد الفتاوی جس کی صرف ایک ہی جلد ادارہ تالیفات اشرفیہ دیوبند سے شائع ہوسکی، تسہیل بیان القرآن کامل، فیض المنعم شرح مسلم شریف، ایضاح المسلم جلد اول، زبدۃ الطحاوی شریف کتاب الصلوۃ، کتاب الطہارت، مفتاح التہذیب شرح تہذیب اردو، حیات امام طحاوی شریف، حیات امام ابوداؤد، کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟ شرح عقد رسم المفتی، آپ فتوی کیسے دیں؟، مسائل حرمت مصاہرت، آسمان وآسان صرف وغیرہ وغیرہ۔

حضرت کی مجلس: علوم ومعارف کا خزانہ تھی اور علمی جواہر پاروں کا عظیم مجموعہ تھی

جو کہ تفسیری نکات حدیثی تشریحات، فقہی اشکالات کے جوابات اور واقعات اکابر کے علاوہ سائنس جدید سے پیدا ہونے والے نت نئے سوالات کے جوابات اور بیش بہا معلومات پر مشتمل ہوتی تھی جس میں ارباب افتاء حضرات اساتذہ کرام اور طلبا دلچسپی سے شرکت فرماتے۔ مذکورہ مجلس ہمارے اکابر کے طرز کی یادگار مجلس تھی۔ مذکور مجلس کے ملفوظات و افادات اگر کتابی شکل میں شائع ہو جائیں تو یقین ملت کے لیے رہنما تصنیف ثابت ہوں۔

حضرت کی حیات طیبہ کا خاص طور سے قابل ذکر پہلو یہ ہے۔ تدریسی و دیگر علمی و تصنفی و انتظامی غیر معمولی مشغولیات کے باوجود اہل محلّہ اور مسجد محلّہ کے احوال سے خوب واقفیت رکھتے اور مسجد محلّہ کی ضروریات کی تکمیل اور اہل محلّہ کا بھی تعاون سرپرستی فرماتے یہی وجہ ہے کہ حضرت کی خصوصی توجہ سے محلّہ اندرون کوٹلہ کی مسجد جو کہ طویل عرصہ سے بوسیدہ اور شکستہ حالت میں تھی مذکور مسجد کی تزئین و تعمیر جدید عمل میں آئی اور حال میں بھی حضرت موصوف کی توجہ کی برکت سے مذکورہ مسجد کی توسیع کے لیے مسجد کے متصل جانب مشرق ایک وسیع مکان کی خریداری عمل میں آئی اور حضرت کے جذبۂ صلہ رحمی کا عالم یہ تھا کہ محلّہ کے ایک غریب رکشہ چلانے والے کی شکستہ حالت کا علم ہوا تو حضرت نے دارالعلوم مستقل آمد و رفت کے لیے اسی کا رکشہ مقرر فرمایا اور اس طرح حسن تدبیر سے مذکور شخص کا مزید تعاون فرماتے رہے۔ ان کا ارادہ تھا کہ جب اللہ تعالی انتظام فرمائیں گے تو اس کو بیٹری والا کش خریدوں گا؛ اس لیے کہ اب ہاتھ رکشے پر لوگ سوار نہیں ہوتے ہیں۔

حضرت کی ذات گرامی اہل محلّہ اور اہل علاقہ کے لیے نعمت غیر مترقب تھی اور ایک انجمن اور ایک ادارا تھی آج علمی حلقوں کے ساتھ عوامی حلقے بھی حضرت کی وفات حسرت آیات کی وجہ سے آہ بلب اور اشک بار ہیں۔

خداوند قدوس حضرت کے درجات بلند فرمائے اور جملہ پسماندگان اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

خواص کے لئے خاصہ کی چیز
تفسیر ہدایت القرآن

مفتی ذکاوت حسین قاسمی..........شیخ الحدیث ومفتی مدرسہ امینیہ دہلی

استادوں کا استاد ہے، استاد ہمارا: شخصیات کا تعارف ان کے ناموں کے علاوہ صحیح معنیٰ میں ان کی خدمات، اوصاف وکمالات اور القاب وتخلصات سے ہی ہوتا ہے بشرطیکہ ان سب کا برمحل استعمال ہو۔

وَقَلَّمَا اَبۡصَرَتۡ عَیۡنَاكَ ذَا لَقَبٍ　　اِلَّا وَمَعۡنَاهُ اِنۡ فَتَّشۡتَ فِیۡ لَقَبِہٖ

(صاحب لقب کے اوصاف وکمالات تلاش وجستجو سے اس کے القاب وآداب میں آپ بہ آسانی پاسکتے ہیں)

لیکن یہ بھی ایک عین حقیقت ہے کہ عظیم الشان وارباب کمالات شخصیات القاب واوصاف کی بیساکھیوں سے بے نیاز ہوتی ہیں بلکہ ان عظیم شخصیات کے ساتھ القاب کو لاحقہ کی سعادت کی وجہ سے دوام واستمرار نصیب ہوتا ہے۔

بقول اطالوی فلسفی نکھرلو میکاولی: القاب شخصیات کو عزت نہیں بخشتے بلکہ شخصیات القاب کو قابل احترام بنادیتی ہیں۔ اور بقول حضرت حسانؓ:

مَا اِنۡ مَدَحۡتُ مُحَمَّدًا بِمَقَالَتِیۡ
وَلٰكِنۡ مَدَحۡتُ مَقَالَتِیۡ بِمُحَمَّدٖ

(میں اپنے مقالے سے حضرت محمد ﷺ کی مدحت وتوصیف کا حق تو ادا نہیں کرسکا، البتہ حضرت محمد مصطفی ﷺ کے ذکر جمیل سے میرا مقالہ لائقِ تعریف وقابلِ تحسین بن گیا)

برہان العلم، سلطان العلماء حضرت الاستاذ علامہ مفتی سعید احمد پالن پوری نور اللہ

مرقدہٗ کی شخصیت گرامی بھی کسی وصف، لقب اور تکریمی الفاظ کی قطعاً محتاج نہیں بلکہ ان کے ساتھ استعمال ہونے والے القاب وآداب کو ایک دوام اور زندگی کی نعمت مل رہی ہے، میں اگرچہ حضرت علامہ کا ادنیٰ ترین تلمیذ ہوں اور شاید میری بات کو کوئی عقیدت ومحبت، قصیدہ خوانی یا مبالغہ آمیزی پر محمول کرے مگر میں اپنی فکر ونظر کے زاویے سے حضرت الاستاذ کی ہشت پہلوئی شخصیت اور گوناگوں صفات وکمالات سے معمور ذات گرامی کے جامع ترین تعارف کے لئے کسی لقب اور وصف کے استعمال وانطباق سے عاجز وقاصر ہوں۔

حضرت مفتی صاحب کی شخصیت پر خامہ فرسائی کرنے والے اکابر واصاغر اور تمام معاصرین وتلامذہ الگ الگ زاویوں اور پہلوؤں سے ان کے کمالات واوصاف اور خدمات کے احاطے کی کوشش ومحنت میں لگے ہوئے ہیں مگر ہمارے لئے تو ہر جانب سے تھک ہار کر اپنی قسمت پر فخر وناز کے لئے اور مفتی صاحب سے اپنی قریب ترین نسبت ورشتے کے اظہار کے لئے تلمیذی کی باسعادت نسبت سے بڑھ کر کوئی دوسری نسبت باعثِ فخر وانبساط نہیں۔ ع:

ان کے دامن سے تعلق بھی بڑی نعمت ہے
اس سے عظیم نسبت اور کیا ہوسکتی ہے

استادوں کا استاد ہے، استاد ہمارا

حضرت الاستاذ علامہ مفتی صاحبؒ کی عبقری شخصیت علم کے ہر میدان میں تنہا وممتاز دکھائی دیتی ہے زبان وبیان کا میدان ہو، درس وتدریس کا مسند ہو، تصنیف وتالیف کی جولان گاہ ہو یا وعظ ونصیحت کا ممبر، ہر ایک میں صدفی صد کامیاب اور صدفی صد ممتاز ومنفرد

کیا سراپا غزل تھے مفتی سعید

آؤ تمھیں تفسیر پڑھاؤں

حضرت الاستاذ کی تالیفات وتصنیفات میں سے عظمت وجلالت اور درجے ورتبے کے اعتبار سے سب پر فائق ومقدم ’’تفسیر ہدایت القرآن‘‘ سے متعلق چند تعارفی

سطریں لکھنے کا ارادہ کیا ہے، جس کا محرک وباعث ایک خواب ہے، میں علم وعمل سے کورا اور تہی دامن شاگرد ہرگز اس لائق نہیں کہ حضرت الاستاذ کی عظیم تفسیر پر کچھ خامہ فرسائی کروں اور اگر کچھ لکھتا یا لکھنا چاہئے تھا تو حضرت الاستاذ کی ''تحفۃ القاری'' شرح بخاری پر لکھتا کیوں کہ میں اس کی طباعت کے پہلے دن سے ہی تدریسی ضرورت کے پیش نظر ''تحفۃ القاری'' کا قاری رہا ہوں، مگر بندے میں نہ اہلیت ہے اور نہ اب ضرورت، کیونکہ ہمارے رفیق گرامی جناب مفتی فہیم الدین صاحب بجنوری استاذ دارالعلوم دیوبند اپنے لاجواب طویل مضمون میں ''تحفۃ القاری'' کی خصوصیات لکھ کر فرض کفایہ ادا کر چکے ہیں۔

مگر فی الوقت تفسیر ہدایت القرآن کے بارے میں کچھ لکھنے کا پس منظر یہ ہے کہ پھلت سے نکلنے والے ماہنامہ ''ارمغان'' نے جون ۲۰۲۰ء مطابق شوال ۱۴۴۱ھ کے رسالے میں حضرت الاستاذ کے بارے میں ''گوشۂ خاص'' شائع کیا تھا، وسط شوال میں موبائل کے ذریعے پی ڈی ایف فائل سے بندہ اس خاص گوشے کا مطالعہ کر رہا تھا دوران مطالعہ نیند آگئی اسی نیند کی حالت میں الگ الگ انداز میں غالباً تین بار حضرت الاستاذ کی زیارت وملاقات کی سعادت حاصل ہوئی، جن میں سے ایک بار حضرت الاستاذ اپنی عالمانہ مخصوص وجاہت کے ساتھ تشریف لائے اور بندے سے فرمایا کہ آؤ تمہیں تفسیر پڑھاؤں! میں نے سوال کیا حضرت کون سی کتاب سے پڑھائیں گے؟ جواب میں ارشاد فرمایا ''ہدایت القرآن'' سے چنانچہ ہم تین طلبہ درسگاہ کی نشست کے انداز میں تپائی پر ہدایت القرآن کی جلد اول کھول کر بیٹھ گئے اور پھر حضرت الاستاذ نے اپنی زبان سے یہ آیات تلاوت فرمائیں ''الٓمّٓ، ذلک الکتاب لا ریب فیہ، ھدیً للمتقین، بس خواب اسی منظر پر مکمل ہوگیا۔ حسنِ توفیق اور خوبیٔ قسمت یہ کہ میں نے اسی رمضان ۱۴۴۱ھ میں حضرت الاستاذ کی زبان سے آن لائن انھی آیات کی تفسیر سماعت بھی کی تھی جو آپ بعد تراویح ممبئی میں قیام کے دوران بیان فرما رہے تھے۔ میں نے اب سے پہلے ہدایت القرآن کا باقاعدہ مطالعہ نہیں کیا تھا اگر چہ بارہا اوراق پلٹنے اور تبرکاً دیکھنے وچھونے کا شرف حاصل تھا، مگر اس خواب نے ہدایت القران سے قریب

ہونے اوراس سے خصوصی استفادے کی ترغیب وتحریک پیدا کی۔

ھدایت القرآن کی اجمالی خصوصیات

چنانچہ میں نے اپنے ناقص مطالعہ میں ہدایت القرآن کی یہ اجمالی خصوصیات نوٹ کیں، تفسیر کی جامعیت ومعنویت، سہل اسلوب نگارش، لفظی محاوری دونوں ترجموں کا فرق، جامع ومختصر تفسیری نکات، آیات میں مذکور مضامین کے الگ الگ عناوین، حاشیہ میں اہل علم کے لئے بیش قیمت علمی جواہر پارے، ضروری تراکیب، صرفی ونحوی تحقیقات، فقہی مباحث اور چند لفظوں یا جملوں میں کئی کئی صفحات کے مفصل مضامین کا تفسیری عطر وخلاصہ، جو درحقیقت ''دریا بہ کوزہ'' کا مصداق تو ہے ہی، لیکن اگر آپ اس تفسیری نچوڑ اور لب لباب کو کسی سلیس اردو ترجمۂ قرآن کے تفسیری فوائد ونکات کے طور پر درج کرنا چاہیں تو یہ مکمل تفسیر ہی کہلائے گی اور قرآنی مضامین کی بہترین ترجمانی اور روح بھی، حضرت الاستاذ نے یہ مضامینِ قرآن کا بے نظیر عطر کشید کیا ہے، اس سے عوام وخواص کے لئے قرآنی پیغام کا اخذ کرنا اور ذہن نشیں کرنا نہایت آسان ہے۔ اس تفسیر کی ایک اور اہم خصوصیت آیات کا باہمی ربط ہے جس سے مضامین ایک دوسرے سے مربوط اور مکمل معلوم ہوتے ہیں مگر ربط آیات کا یہ اہتمام صرف آمد کی حد تک ہے ہر قسم کے آورد اور تکلف وتصنع سے گریز کیا گیا ہے، مفسر علام نے خود بھی اس کی خاص طور پر وضاحت فرمائی ہے ''باہر سے ربط داخل کرنا آورد ہے اور آیات سے ربط نکالنا آمد ہے، میں نے کوشش کی ہے کہ ربط آیات ہی سے نکلے، باہر سے داخل نہ کیا جائے۔''

ھدایت القرآن کا ایک تعارفی اقتباس

حضرت الاستاذ مفتی صاحبؒ ایک لائق شاگرد، تدریس وتحقیق کے راہ نورد اور اب دارالعلوم دیوبند کے استاذ جناب مولانا مفتی اشتیاق احمد قاسمی صاحب حفظہ اللہ نے چند سال قبل اکتوبر ۲۰۱۷ء میں ''ماہنامہ دارالعلوم دیوبند میں ہدایت القرآن پر ایک تعارفی تحریر لکھی تھی جس میں اس تفسیر کی چند نمایاں چیزیں پیش کی تھیں، اس تعارف کا یہ اقتباس ہدایت

القرآن کی افادیت واہمیت کو جاننے کے لئے کافی اور لائقِ مطالعہ ہے۔

''کسی بھی سورت کے شروع کرتے ہوئے پہلے سورت کا نام، نمبر شمار، نزول کا نمبر، مکی اور مدنی کی صراحت، رکوع اور آیات کی تعداد لکھتے ہیں پھر پوری سورت میں پھیلے ہوئے مضامین کا خلاصہ تحریر فرماتے ہیں، تاکہ قاری پہلے بیک نظر ان مضامین سے اجمالی طور پر واقف ہو جائے، پھر شان نزول لکھ کر ایک مضمون کی آیات لکھتے ہیں، پھر مفردات کے ساتھ کچھ حواشی تحریر فرماتے ہیں، جن میں لغات، اعراب اور تراکیب کی وضاحت ہوتی ہے، یہ حواشی طلبہ اور علماء کے لئے ہیں، جن میں ہر اس پیچیدگی کا حل ہوتا ہے جو طالب علم کے ذہن میں آتی ہے،

تفسیریں تو بہت ہیں مگر اس انداز کا مختصر حاشیہ جس میں اس خاص پہلو کو ذہن میں رکھا گیا ہو تبصرہ نگار کی نگاہ میں نہیں ہے مشکل مضامین کو آسان کر کے پیش کرنا آپ کا امتیازی وصف ہے، اس تفسیر میں بھی آپ کا انداز بیان نہایت ہی شُستہ اور شگفتہ ہے، الفاظ وتعبیرات کا انتخاب پُرکشش ہے پہلے مفردات کا کالم بناتے ہیں، ہر لفظ کے سامنے دوسرے کالم میں اس کا معنی لکھتے ہیں، پھر ربط آیات لکھ کر، عنوان لگا کر رواں دواں اور سُبک تعبیرات میں تفسیر سمجھاتے ہیں، پھر آیات کا با محاورہ ترجمہ کرتے ہیں، مغلق کی وضاحت، مشکل کو آسان اور غیر مربوط جملوں کو مربوط کرنے کے لئے جملوں کے درمیان قوسین میں اضافہ بھی کرتے ہیں۔ اور بعض جگہوں پر اخیر میں کوئی ''قول زرّیں'' لکھ دیتے ہیں، اس ایک جملہ میں آیات کے مضمون کی روح ہوتی ہے، قاری اس جملے کو مکرر پڑھنے پر مجبور ہوتا ہے، راقم الحروف کو اس تفسیر میں یہ بات بہت پسند آتی ہے کہ آپ دو ٹوک انداز میں ایک بات بیان فرماتے ہیں، اگر مگر اور قیل وقال کے

جنگل میں قاری کو نہیں لے جاتے۔"

ہدایت القرآن کیوں لکھی گئی؟

ہدایت القرآن کے اس تعارفی خاکے کے بعد ضروری اور مفید معلوم ہوتا ہے ہم یہ بھی دیکھیں کہ حضرت الاستاذ مفسر علام نے اس تفسیر کے تعلق سے خود کیا کچھ لکھا اور فرمایا ہے اس طرف بھی نظر التفات سے بہت سے علوم و معارف اور مباحث و نکات سامنے آئیں گے اور ساتھ ہی ہدایت القرآن نامی تفسیر قلم بند کرنے کے اسباب و علل بھی، ان تمام چیزوں کی معلومات اور دستیابی کے لئے بندے نے تفسیر ہدایت القرآن کی ہر جلد کے شروع میں مفسر علام کے قلم فیض رقم سے الگ الگ عنوانات سے لکھے ہوئے کل چودہ صفحات سے استفادہ کیا ہے، واضح ہو کہ آپ نے جلد اول کے شروع میں "تقریب" کا عنوان لگا کر کل چار صفحوں میں چند ضروری باتیں بیان فرمائی ہیں اور علوم قرآن یا علوم تفسیر کے عنوان سے کوئی مقدمہ وغیرہ نہیں لکھا بلکہ یوں فرمادیا کہ "علوم قرانی کے موضوع پر علمائے کرام بہت کچھ لکھ چکے ہیں، ان سے استفادہ کیا جائے، باقی ہر جلد کے شروع میں حسب موقع صرف ایک صفحہ میں اپنی بات مکمل کرلی ہے۔ البتہ جلد چہارم کے آخر میں تین صفحات کا ضمیمہ بھی ہے، جس کی تفصیل مضمون میں آرہی ہے۔

ہدایت القرآن کے قاری اور حضرت الاستاذ کے ہر تلمیذ کو یہ بات بخوبی معلوم ہونی چاہئے کہ آپ نے یہ تفسیر بالکل ابتدا یعنی سورہ فاتحہ سے لکھنی شروع نہیں فرمائی تھی، بلکہ پہلے سے لکھی جارہی ایک تفسیر کی تکمیل کے خیال سے قلم اٹھایا تھا اور دسویں پارے سے تفسیر لکھنے کا آغاز کیا تھا، نیز بعض مخلصین کی تحریک پر یہ مبارک قدم اٹھایا بذات خود ارادہ نہیں کیا تھا ان باتوں کی وضاحت حضرت الاستاذ نے خود اپنی تحریروں میں فرمائی ہے، جلد اول کے آغاز میں لکھا ہے۔

> "کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ آپ نے یہ تفسیر کیوں لکھی؟

> جواب: میں نے تفسیر نہیں لکھی، مجھ سے لکھوائی گئی، اگر مجھ سے نہ لکھوائی جاتی تو شاید میں ہمت نہ کرتا''

پھر اس کی تفصیل اور وضاحت بھی فرمائی جو درحقیقت تفسیر کا سبب اور محرک بنا، لکھتے ہیں۔

> ''اس تفسیر کی تقریباً پچاس سال پہلے حضرت مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی (ولادت: ۵:رمضان ۱۳۱۵ھ مطابق: ۳؍جون ۱۹۳۳ء وفات: ۱۸؍شعبان ۱۴۱۷ھ مطابق ۳۰؍دسمبر ۱۹۹۶ء جو دیوبند میں مقیم ہو گئے تھے اور دیوبند کے قریب قریہ راجوپور کے باشندے تھے) نے بسم اللہ کی تھی انھوں نے پہلے آخری پارہ (پارۂ عم) لکھا وہ مقبول ہوا، تو انھوں نے شروع سے لکھنا شروع کیا بیس سال میں نو پارے لکھے اور چھاپے، سورۃ الانفال کی آیت ۵۴؍تک لکھ کر قلم رکھ دیا۔ ۱۹۷۴ء میں جب میں دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہو کر آیا تو مکتبہ حجاز دیوبند کے مالک میرے ساتھی جناب مولانا قاضی محمد انوار صاحب نے دوستی کے ناتے اصرار کیا کہ میں تفسیر لکھوں، اور وہ چھاپیں پس میں نے قلم پکڑا اور دسواں پارہ لکھا، (واضح رہے کہ مکتبہ حجاز بعد میں حضرت الاستاذ نے خرید لیا تھا) جب یہ پارہ قاضی صاحب نے مولانا کاشفؒ کو بھیجا تو انھوں نے پڑھ کر تبصرہ کیا ''پیوند کچھ برا تو نہیں'' اس سے میرا حوصلہ بڑھا اور میں نے وقفے وقفے سے لکھنا شروع کیا، کئی سال میں سورۃ المؤمنون تک پہنچا پھر سلسلہ رک گیا پارہ اٹھارہ آدھا لکھنے کے بعد کام بالکل ہی رک گیا میں دوسرے کاموں میں لگ گیا مگر تفسیر کی تکمیل کا فکر ہمیشہ سوار رہا۔''

حضرت الاستاذ مفسر علام نے تفسیر ہدایت القرآن لکھنے کا ظاہری سبب اور اس کا نقطۂ آغاز بیان فرمانے کے بعد دو منامی بشارتوں کا تذکرہ بھی کیا ہے

خواب (۱)

> جس زمانہ میں، میں خود وقفہ وقفہ سے تفسیر لکھتا اور چھاپتا تھا، ایک سال فیملی

کے ساتھ عید الاضحیٰ کی تعطیل میں وطن گیا، اور مئو کے ایک طالب علم (مولوی فیاض سلمہٗ) کو مکان سونپ گیا، وہ میری بیٹھک میں لیٹتے تھے انھوں نے خواب دیکھا:

حضور نبی کریم ﷺ میری جگہ تشریف فرما ہیں، طلبہ آپ ﷺ کو گھیرے ہوئے ہیں، آپ نے طلبہ سے فرمایا ''سعید سے کہنا.......... پوری کرے'' ان کی آنکھ کھل گئی، وہ بھول گئے کہ کون سی کتاب پوری کرنے کے لئے فرمایا تھا، مگر میں اسی زمانہ میں ہدایت القرآن کا کوئی پارہ لکھ رہا تھا۔

خواب (۲)

> ''پھر ایک عرصہ کے بعد سہارنپور سے کسی خاتون کا خط آیا وہ لڑکیوں کا مدرسہ چلاتی ہیں، انھوں نے خواب میں حضور نبی کریم ﷺ کو دیکھا اور پوچھا کہ وہ طالبات کو کیا پڑھائیں؟ آپ نے فرمایا ''ہدایت القرآن پڑھاؤ''''

تفسیر ہدایت القرآن کی تکمیل وتالیف کی تحریک میں حضور اقدس ﷺ کی جانب سے ملنے والے یہ منامی اشارے بھی بڑی قدر ومنزلت اور عظمت وشرف کے حامل ہیں اور ساتھ ہی بارگاہ رسالت مآب میں پسندیدگی اور مقبولیت کی سند بھی، اللھم تقبلہ بقبول حسن۔

حضرت الاستاذ نے ایک طویل وقفے کے بعد ۱۴۳۶ھ کے وسط میں پھر تفسیر کی تکمیل کا عزم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''پھر بلا توقف تفسیر شروع کی اور ۱۴۳۷ھ کے ختم تک تفسیر مکمل کی، اب شروع سے لکھنا شروع کیا ہے شروع کا حصہ اگرچہ مولانا کاشف الہاشمی قدس سرہ لکھ چکے ہیں، تاہم میں بھی لکھ رہا ہوں، میرے دل پر اس کا شدید تقاضا ہے۔''

یعنی اولاً تو آپ نے ایک ناتمام تفسیر کی تکمیل کے خیال سے دسویں پارے سے تفسیر کی بسم اللہ فرمائی تھی، پھر تکمیل تک پہنچتے پہنچتے ارادہ بن گیا کہ میں یہ تفسیر از فاتحہ تا ناس

پوری کی پوری اپنے قلم سے لکھوں، اس طرح اب یہ کسی دوسری تفسیر کی تکمیل کے بجائے حضرت الاستاذ کی اپنی مکمل تفسیر بن گئی جو آٹھ جلدوں میں بفضل الٰہی پوری ہوئی ہے حضرت الاستاذ نے اس کی پوری وضاحت فرمائی تھی اور عمر دراز کی بھیک بھی مانگی تھی:

> ''اب میں شروع سے تفسیر لکھوں گا اور اگر وہ (دوست واحباب) کہیں کہ شروع کا حصہ حضرت مولانا محمد عثمان کاشفؒ لکھ چکے ہیں ،تو جواب یہ ہے کہ انھوں نے تیسویں پارے کی تفسیر بھی لکھی ہے تاہم میں نے اس کو دوبارہ لکھا ہے:
>
> کیونکہ ''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔''
>
> آپ دونوں کو ملا کر پڑھیں تو فرق ظاہر ہوگا اس لئے ارادہ ہے کہ تا حیات اسی خدمت میں لگا رہوں، شروع کے نو پارے ہی نہیں، پارہ چودہ تک دوبارہ لکھوں اور عزم یہ ہے کہ کوئی اور کام نہ چھیڑوں، کیونکہ عمر ڈھل چکی ہے، ایک اندازے کے مطابق ۱۹۴۰ء کی پیدائش ہے۔ پس اب کیا باقی رہ گیا ہے۔ مگر مولیٰ کریم سے بھیک مانگی ہے کہ تفسیر کی تکمیل تک عمر دراز فرمائیں اور امید ہے کہ میری یہ دعا ضرور قبول فرمائیں گے، انھوں نے مجھے کبھی نامراد نہیں کیا۔''

طرز تفسیر اور خصوصیات حضرت مفسر علام کے قلم سے!

> ''اس تفسیر کے ٹائٹل پر حضرت مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی قدس سرہ یہ عنوان لکھا کرتے تھے ان شاء اللہ یہ تفسیر آپ کو قرآن کریم سے بہت قریب کر دے گی کیونکہ انھوں نے تفسیر کا انوکھا طریقہ اختیار کیا تھا وہ پہلے مفردات کے معانی لکھا کرتے تھے، پھر سلیس ، آسان بامحاورہ ترجمہ کیا کرتے تھے، مرحوم تفسیر بھی آسان لکھتے تھے وہ عوام کو پیش نظر رکھ کر لکھتے تھے
>
> پھر جب میں نے پارہ دس سے لکھنا شروع کیا تو ان کے طریقے کی پیروی کی، پھر چند پاروں کے بعد میں نے ایک اضافہ کیا، حاشیہ میں مشکل

الفاظ کے معانی اور مشکل جملوں کی ترکیب لکھنی شروع کی ، میں نے یہ کام طلبہ اور علماء کے لئے مفید سمجھ کر کیا ہے۔

حضرت مولانا کاشف الہاشمی عوام کو پیش نظر رکھ کر تفسیر لکھتے تھے، اس لئے اس میں وعظ ونصیحت کے مضامین کا غلبہ ہوتا تھا، میں نے بھی شروع میں یہ بات پیش نظر رکھی تھی ، اور ساتھ ہی قرآن کریم کی تفہیم بھی ملحوظ رکھی تھی اور آیات کے مشمولات میں ارتباط کا بھی خیال رکھا تھا، پھر جلد ششم کے نصف سے عنوانات بھی بڑھائے ہیں (جواب سبھی جلدوں میں ہیں) اس لئے میری لکھی ہوئی تفسیر کی عبارت تو اسی طرح آسان ہے مگر مضامین ذرا بلند ہیں چنانچہ مولانا رحمہ اللہ کی تفسیر عوام کے لئے بہت مفید ہے اور میری لکھی ہوئی تفسیر خواص کے لئے خاصہ کی چیز ہے جس سے خواص استفادہ کر سکتے ہیں۔ مفسرین عظام نے ہر زمانے میں (آیات پاک اور آیات کے اجزاء میں) ربط بیان کیا ہے، بیان القرآن میں حضرت تھانویؒ نے اس سلسلے میں عظیم کارنامہ انجام دیا ہے، میں نے بھی تفسیر میں ٹوٹی پھوٹی محنت کی ہے شاید کسی کو پسند آئے ، البتہ آمد اور آورد میں فرق ہے، باہر سے ربط داخل کرنا آورد ہے اور آیات سے ربط نکالنا آمد ہے، میں نے کوشش کی ہے کہ ربط آیات ہی سے نکلے، باہر سے داخل نہ کیا جائے میں نے نص فہمی کے مفید یقین چار طریقوں (عبارۃ النص ، اشارۃ النص ، دلالۃ النص ، اقتضاء النص) میں صرف عبارۃ النص (عبارت والفاظ کے مقصدی مضمون اور مرکزی نقطۂ نظر) پیش نظر رکھ کر تفسیر کی ہے باقی تین استدلات فائدے کی صورت میں بیان کئے ہیں، اس لئے ارتباط خود بخود نکل آتا ہے اس تفسیر کا خاص امتیاز سورتوں، آیات اور آیت کے اجزاء میں ربط کا بیان ہے۔''

مفسرین کے لئے ایک تفسیری نکتہ

مفسر علامؒ نے ایک اور خاص تفسیری نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے عربی مفسرین

کے اسلوب پر نقد بھی کیا ہے اور یوں لکھا ہے:

> ”ایک خاص بات یہ ہے کہ عربی تفسیروں میں نص قرآنی کو علمائے نحو کے مرتب کردہ قوانین کے تابع کیا جاتا ہے، جب کہ ان میں بعض قواعد میں اختلاف بھی ہے، مفسرین اس کی رعایت سے ترکیبی احتمالات بیان فرماتے ہیں، مگر ہمارے اکابر ایسے احتمالات بیان نہیں کرتے، اس لئے کہ نحو کے قواعد زبان سے اخذ کئے گئے ہیں، اس لئے اللہ کے کلام کو ان قواعد کے تابع نہیں کرنا چاہئے، سیاق کلام سے جو ترکیب ہم آہنگ ہو وہ متعین ہے اور اس کو پیش نظر رکھ کر مراد خداوندی بیان کرنی چاہئے“

تفسیر میں قرآنی فصاحت وبلاغت بھی ملحوظ ہے

جلد دوم کے ابتدائیہ میں لکھا ہے ”فصاحت وبلاغت میں بھی قرآن کے ہم پلہ کوئی کتاب نہیں، فصاحت: مانوس لفظ کو برمحل استعمال کرنا ہے، آج چودہ صدیاں گذر چکی ہیں، مگر قرآن کا کوئی لفظ متروک نہیں ہوا، نہ اس کو دوسرے لفظ سے بدلا جاسکتا ہے اور بلاغت کے معنی ہیں: برمحل بات کہنا، قرآن کریم کے مضامین باہم نہایت مربوط ہیں کوئی مضمون بے محل اور بے موقع نہیں، آپ یہ تفسیر اس نقطۂ نظر سے پڑھیں۔

اس تفسیر کے مطالعے کا طریقہ!

”یہ تفسیر قارئین کو قرآن کریم سے قریب کرے گی اس تفسیر میں زوائد وفوائد نہیں ہیں، اس کے لئے بڑی تفسیریں ہیں، اس تفسیر میں قرآن پاک جو ارشاد فرماتا ہے وہی سمجھایا ہے۔ لہذا تفسیر پڑھنے والے پہلے آیات پاک کو دو تین مرتبہ پڑھیں، پھر مفردات پڑھیں پھر ترجمہ مفردات کے ساتھ ملائیں اور طلبہ واہل علم حواشی بھی دیکھیں، پھر عنوان میں غور کریں اور تفسیر پڑھیں، امید ہے کہ وہ قرآن پاک سے نزدیک ہوں گے۔

بہرحال میں نے کوشش میں کمی نہیں کی، رہی یہ بات کہ میں قارئین کرام کو قرآن کریم سے قریب کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ دوسرے کریں گے

میں نے تو در گذر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا۔

سپردم بتو مایۂ خویش را　　　　تو دانی حساب کم وبیش را‘‘

حضرت الاستاذ مفسر علام نے اپنی تفسیر کی کامل آٹھ ضخیم جلدیں تیار کر کے اپنی حیات مبارکہ میں طبع بھی کرا دیں اور ہر جلد کے شروع میں ایک ایک صفحہ اس وقت کی ضرورت اور موقع کی مناسبت سے لکھ کر شامل اشاعت بھی کر دیا تھا، بندہ نے اپنی اس تحریر میں میں حضرت الاستاذ کے قلم فیض رقم سے نکلے ہوئے بیش قیمت منتشر مضامین کو یکجا ومرتب کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ تفسیر ہدایت القرآن کے خصائص ومحاسن ایک نظر میں قاری کے سامنے آجائیں اور مفسر علام نے کن امور کو تفسیر میں پیش نظر رکھا ہے الگ الگ مضامین وصفحات سے اخذ کرنے کے بجائے بسہولت مسلسل تحریر ومضمون کی شکل میں سامنے آجائیں

تفسیر کی ضخامت اور جلدوں کی تقسیم

تفسیر ہدایت القرآن کی کل آٹھ جلدیں اور ۴۵۷۲ ؍صفحات ہیں، جن کی تفصیل جلدوار حسب ذیل ہے:

جلد اول: کل ۶۰۰ ؍صفحات پر مشتمل ہے اور شروع کے چار پاروں (۱ تا ۴) کی مکمل تفسیر ہے یہ جلد ۱۱ ؍ذی قعدہ ۱۴۳۸ھ مطابق ۵ ؍اگست ۲۰۱۷ء کو مکمل ہوئی تھی۔

جلد دوم: کل ۶۰۷ ؍صفحات پر مشتمل ہے، کل چار پاروں (۵ تا ۸) کی مکمل تفسیر ہے البتہ موضوع کی مناسبت سے پارہ ۹ ؍کا پہلا رکوع بھی جلد دوم میں شامل کر لیا گیا ہے مفسر علام نے اس جلد کے ختم پر یہ عبارت لکھی ہے:

بفضل اللہ تعالیٰ ۲۱ ؍جمادی الاخریٰ ۱۴۳۹ھ مطابق ۹ ؍مارچ ۲۰۱۸ء کو جلد دوم پوری ہوئی۔

جلد سوم: کل ۵۴۱ ؍صفحات پر مشتمل ہے، یہ جلد ۹ ؍۱۰ ؍۱۱ ؍صرف تین پاروں کی تفسیر ہے بلکہ نویں پارے کا پہلا رکوع اور گیارہویں پارے کا آخری رکوع بھی اس کا حصہ نہیں ہے

سورۂ یونس پر یہ جلد سوم پوری ہوئی ہے، اس میں تکمیل کی تاریخ بھی درج نہیں ہے۔

نوٹ: مفسر علام نے تیسیری جلد کے بارے میں ایک اور وضاحت بھی فرمائی ہے جو قابل توجہ ہے:

> ”انداز بدلا ہے، اب تک جو انداز چل رہا تھا وہ یہ تھا کہ ایک مضمون کی آیات لکھ کر مفردات کا ترجمہ کیا جاتا تھا، پھر عنوان قائم کر کے تقریر کی جاتی تھی، پھر آخر میں آیت مع ترجمہ لکھی جاتی تھی، مگر جلد سوم کے نصف سے یہ انداز بدل گیا ہے، مفردات کے بعد عنوان قائم کر کے تقریر اور آیات کا ترجمہ ساتھ ساتھ چلتا ہے، اس میں قارئین کو ذرا دشواری پیش آئے گی، آیت کے ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ ملانے کی زحمت اٹھانی پڑے گی“

جلد چہارم: کل ۵۶۰؍ صفحات پر مشتمل ہے، یہ جلد ۱۲؍۱۳؍۱۴؍ کل تین پاروں کی تفسیر ہے، سورۂ ہود سے شروع ہو کر سورۂ نحل کے ختم پر مکمل ہوئی ہے۔

مفسر علام نے اس جلد کے ختم پر دو سطریں لکھ کر ایک وضاحت کی ہے۔

”یہاں جلد چہارم مکمل ہو گئی، آگے جلد پنجم سورہ بنی اسرائیل سے شروع ہوگی، اس پر میں نے نظر ثانی کر رکھی ہے، اس میں اگرچہ عناوین نہیں ہیں مگر ربط اور تفسیر واضح ہے، اس لئے قلم کی لگام کھینچ رہا ہوں۔

پھر بالکل آخری تین صفحوں میں ”ضمیمہ“ کا عنوان لگا کر پہلے اپنے اسلوب تفسیر پر روشنی ڈالی ہے اور پھر جناب قاری محمد طارق انور صاحب پٹنوی کا تفصیلی خط نقل کیا جو ہدایت القرآن کی تعریف و توصیف اور عظمت و اہمیت پر دال اور لائقِ مطالعہ ہے۔

حضرت الاستاذ نے سوال و جواب قائم کر کے اسلوب تفسیر سے متعلق یہ لکھا ہے:

> سوال: آپ نے یہ تفسیر کیوں لکھی ہے؟ اس میں کن باتوں کی رعایت ملحوظ رکھی ہے؟
>
> جواب: طلبہ بار بار مذکورہ سوال کرتے ہیں، میں ان کو جواب دیتا

> ہوں، میں نے صرف ایک بات پیش نظر رکھی ہے وہ یہ کہ اللہ پاک کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ اپنے ناقص فہم کے مطابق اس کو میں نے سمجھایا ہے، بے ضرورت، تفسیروں کو میں نے سامنے نہیں رکھا، البتہ بیان القرآن، ترجمہ شیخ الہند اور فوائد شبیری کو سامنے رکھا ہے، اس اندیشے سے کہ میں بہک نہ جاؤں اور بوقت ضرورت روح المعانی سے استفادہ کیا ہے،
>
> پہلے اور تفسیریں بھی دیکھتا تھا، شروع کی جلدوں میں ان کے حوالے ہیں، اور مفردات کے ترجمہ میں شاہ عبد القادر صاحب: (قرآن کے پہلے با محاورہ ترجمہ کرنے والے) کو پیش نظر رکھا ہے، اس کو الہامی ترجمہ کہا گیا ہے بس اتنا جواب دیا کرتا ہوں، میاں مٹھو نہیں بنتا۔ اس سے زیادہ تبصرہ قارئین کر سکتے ہیں‘‘

جلد پنجم: کل ۵۷۶/صفحات پر مشتمل ہے، یہ جلد ۱۵/۱۶/۱۷/اور ۱۸/ویں پارے کے ۶/رکوع تک تقریباً ساڑھے تین پاروں کی تفسیر ہے اور سورتوں کے حساب سے سورۂ بنی اسرائیل سے سورۂ مؤمنون کے ختم تک ہے۔ اس کے آخر میں یہ مسطور ہے ’’اللہ کے فضل وکرم سے آج بتاریخ: ۲۱/ربیع الاول ۱۴۲۷ھ سورۃ المؤمنون کی تفسیر پوری ہوئی‘‘

جلد ششم: کل ۵۶۸/صفحات پر مشتمل ہے، یہ جلد سورۂ نور سے شروع ہو کر سورۂ فاطر پر پوری ہوئی ہے، اٹھارہویں پارے کے تقریباً نصف آخر سے بائیسویں پارے کے ختم تک ہے، البتہ آخری ڈیڑھ رکوع اس جلد میں شامل نہیں ہے کیوں کہ وہاں سے مستقل مضمون ’’سورۂ یٰسٓ‘‘ کی شکل میں شروع ہو رہا ہے، اس طرح یہ جلد ششم تقریباً ساڑھے چار پاروں (۱۸ تا ۲۲) کی تفسیر ہے۔ اس جلد کے ختم پر مفسر علام نے یہ لکھا ہے:

> ’’اللہ تعالیٰ کی بے پایاں عنایتوں سے بروز اتوار ۲۸/ذی قعدہ ۱۴۳۶ھ مطابق ۱۳/ستمبر ۲۰۱۵ء کو رات میں ڈیڑھ بجے سورۃ الفاطر کی تفسیر پوری ہوئی، یہ جلد اسی پر ختم ہے، اگلی جلد سورہ یٰسٓ سے ان شاء اللہ شروع ہو گی‘‘

جلد ہفتم: کل ۵۱۲/صفحات پر مشتمل ہے، یہ جلد سورۂ یٰسٓ سے شروع ہو کر سورہ حُجرات پر مکمل ہوئی ہے، اس طرح اس جلد میں تقریباً پونے چار پاروں کی تفسیر شامل ہے، پارہ ۲۲/کے آخری ڈیڑھ رکوع سے شروع ہے۔ ۲۳/۲۴/۲۵/یہ تین پارے مکمل ہیں اور ۲۶/ویں کا تقریباً پون پارہ رکوع نمبر ۱۴/تک شامل ہے۔ اس کی تکمیل پر حضرت الاستاذ نے یہ لکھا ہے:

> ''بفضلہٖ تعالیٰ بروز بدھ ۸/جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ مطابق ۱۷/فروری ۲۰۱۶ء کو سورۃ الحجرات کی تفسیر مکمل ہوئی''

جلد ہشتم: کل ۶۰۸/صفحات پر مشتمل ہے، یہ جلد سورۂ قٓ سے شروع ہو کر سورۃ الناس پر پوری ہوئی ہے، اس میں تقریباً سوا چار پارے شامل ہیں، ۲۶/ویں پارے کا آخری پاؤ، ۲۷/۲۸/۲۹/۳۰/یہ چاروں پارے مکمل۔

قرآنی ابتدا وانتہا میں ربط

جلد ہشتم کے آخر میں ایک علمی نکتہ بھی ذکر کیا ہے جو قرآن کریم کی ابتدا وانتہا میں ربط ومناسبت بتلانے کے لئے لکھا گیا ہے:

> ''قرآن کریم ہدایت کی دعا سے شروع ہوا ہے اور ہدایت میں رخنہ ڈالنے والے سے اللہ کی پناہ طلب کرنے پر ختم ہوا ہے، پس ابتدا اور انتہا ہم آہنگ ہیں''
>
> ''بحمدہٖ تعالیٰ یکم محرم الحرام ۱۴۳۸ھ مطابق ۳/اکتوبر ۲۰۱۶ بروز پیر تفسیر پوری ہوئی''

گر قبول افتد

اس طرح ہدایت القرآن کی کل آٹھ جلدوں کی ضخامت ۴۵۷۲/صفحات پر مشتمل ہے جو مفسر علام کے اعمال نامہ میں باقیات صالحات اور جاری حسنات کا ایک عظیم الشان وافر حصہ ہے، باری تعالیٰ اس گراں قدر قرآنی وعلمی خدمت کو حضرت الاستاذ کے حق میں ''فتقبلها ربها بقبول حسن'' کا سچا اور حقیقی مصداق بنائے اور قارئین بلکہ پوری امت محمدیہ

کے لئے قرآن پاک سے قرب اور سیدھی راہ دکھانے کا ذریعہ فرمائے، تاکہ لوح تفسیر یعنی ہدایت القرآن کے ٹائٹل پر مندرج آیت ان ھذ القرآن یھدی للتی ھی اقوم (بلا شبہ یہ قرآن نہایت سیدھی راہ دکھاتا ہے) اور حسن نیت سے لکھے ہوئے زریں قول ''ان شاءاللہ یہ تفسیر آپ کو قرآن کریم سے بہت قریب کردے گی'' کی عملی تکمیل ہو جائے آمین یا رب العالمین بجاہ النبی الامین ﷺ وعلی آلہ اجمعین۔

خواص کے لئے خاصہ کی چیز

حضرت الاستاذ مفسر علام رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ نے اپنی اس تفسیر کے بارے میں خود تحریر فرما دیا ہے کہ ''یہ خواص کے لئے خاصہ کی چیز ہے'' اس خاصے کی چیز علمی، عرفانی اور قرآنی بے نظیر تفسیر کے حوالے سے ہم تلامذہ، ترجمۂ قرآن یا تفسیر پڑھنے اور پڑھانے والے مدرسین وطلبہ، مساجد یا خواص وعوام کے حلقوں میں تفسیر کرنے والے اہل علم وائمہ حضرات، نیز قرآن مجید سے ہدایت پانے کا شوق اور تمنا رکھنے والے متلاشیانِ حق، یا قرآن پاک کا قرب حاصل کر کے روحانی سکون کے طلب گار وشائقین کا علمی فریضہ ہے کہ اس جلیل القدر اور عظیم الشان تفسیر ہدایت القرآن سے بھرپور استفادہ کریں، عوام وخواص کے حلقوں میں اس کی معنویت وافادیت پر گفتگو کریں، اس کی قدر ومنزلت اور علمی مقام سے شائقین تفسیر کو روشناس کرائیں، ہر اسلامی کتب خانے اور لائبریری کی زینت بنائیں، اس تفسیر کا یہ علمی دنیا پر حق بھی ہے اور حضرت الاستاذ کے جملہ تلامذہ ومنتسبین پر قرض بھی، مبالغہ آرائی نہیں بلکہ مبنی برحقیقت ہے کہ یہ تفسیر عوام وخواص، طلبہ وطالبات، علماء وائمۂ مساجد، واعظین وخطباء، پروفیسر وریسرچ اسکالر، ڈاکٹر وانجینئر اور قرآن کریم کے مطالعہ کا شوق رکھنے والے تمام حضرات ومستورات کے لئے نہایت وقیع اور مفید ہے۔

''یہ تفسیر آپ کو قرآنِ کریم سے بہت قریب کردے گی۔ ان شاءاللہ
تعالیٰ۔''

مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری کی علمی خدمات

مولانا محمد کمال اختر   رکن ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے ہر جاندار کو دو چار ہونا ہوتا ہے لیکن بعض حادثات ایسے ہوتے ہیں جو اپنے پیچھے نا قابل تلافی نقصانات چھوڑ جاتے ہیں، استاذ گرامی حضرت مفتی سعید احمد پالن پوری کی وفات بھی علمی دنیا کے لیے بڑا خسارہ ہے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کی گراں قدر علمی خدمات ان کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ تفسیر، حدیث اور فقہ تینوں علوم میں ان کو غیر معمولی ملکہ حاصل تھا، احادیث کے مشکل ترین مقامات اور ابہامات کو بہت ہی آسان ترین اسلوب میں حل کر دیتے تھے۔ منطق وفلسفہ اور علم صرف میں بھی ان کا درک نمایاں ہے۔

درس وتدریس

درس وتدریس ان کا اہم میدان تھا، وہ نہایت کامیاب مدرس او شفیق مربی تھے، ۱۳۸۴ھ بمطابق ۱۹۶۵ء سے آخر تک درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، طویل عرصہ سے مادر علی دار العلوم دیوبند میں ترمذی شریف جلد اول اور طحاوی شریف پڑھا رہے تھے۔ شیخ الحدیث شیخ نصیر احمد خان کی رحلت کے بعد بخاری جلد اول ان کے ذمہ کی گئی اور وہ شیخ الحدیث کے منصب پر بھی فائز ہوئے اور انہیں صدر المدرسین کی ذمہ داری بھی سپرد کی گئی۔

طرز تدریس

تدریس میں سادگی اور بے پناہ سلاست تھی، افہام کی ایسی خداداد صلاحیت حاصل تھی کہ معمولی توجہ سے سننے والا بھی بات کو پورے طور پر سمجھ لیتا تھا، گفتگو میں شفافیت کے ساتھ دل کشی تھی اور طرز تخاطب محبت والفت سے بھرا ہوا تھا۔ احادیث کی تدریس میں فقہاء کی آراء اور ان کے دلائل اور طرز استدلال کے ذکر کے ساتھ اجتہادی طریقہ اختیار کرتے اور تحقیقی مواد سے بھر پور گفتگو کرتے۔ تفسیر وحدیث میں مہارت کے ساتھ فقہ اور اصول فقہ کی تمام باریکیوں پر ان کی گہری نظر تھی، ملک و بیرون ملک کے فقہی سیمیناروں میں ان کی رائے کو خاص اہمیت دی جاتی تھی، دارالافتاء دارالعلوم دیو بند کی فتاوی کمیٹی کے صدر تھے۔ تصنیف وتالیف، درس وتدریس میں مہارت کے ساتھ تصنیف وتحقیق میں بھی امتیازی مقام رکھتے تھے تفسیر، اصول تفسیر، حدیث اور اصول حدیث، فقہ اور اصول فقہ، علم کلام اور فلسفہ ان سب موضوعات پر ان کی تصانیف موجود ہیں۔ تفسیر میں ہدایت القرآن نہایت اہم ترین تفسیر ہے جس میں آیات احکام اور قصص القرآن پر تفصیلی بحث کے ساتھ قرآن مجید کے تذکیری پہلو پر خصوصی توجہ دی گئی ہے، اصول تفسیر میں ”الفوز الکبیر (جو شاہ ولی اللہ کی فارسی تصنیف ہے) کو مرحوم نے عربی میں منتقل کیا ہے، پھر اس کی اردو شرح بھی کی جو ”العون الکبیر“ کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

تفسیر کے ساتھ حدیث اور اصول حدیث میں انہوں نے گراں قدر تصنیفی خدمات انجام دیں اور اس سے متعلق متعدد تصانیف منظر عام پر آئیں، ان میں سے مقدمۂ مسلم کی اردو شرح فیض المنعم کافی اہم ہے، ان کے دروس ترمذی کا مجموعہ ”تحفۃ الالمعی“ کے نام سے آٹھ جلدوں میں شائع ہو چکا ہے، اس میں برسوں کی محنت سے گراں قدر علمی ذخیرہ کو جمع کیا گیا ہے، الفاظ حدیث کی تشریح کے ساتھ تمام احادیث کی مدلل ومفصل تحقیقی معلومات سے معمور شرح پیش کی گئی ہے۔ کتاب العلل کی علمی وفنی تشریح کے ساتھ قیمتی مقدمہ سے اس کتاب کو مزین کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ حدیث میں متعدد تصانیف ہیں، بطور خاص امام

طحاوی کی شرح ’’شرح معانی الآثار‘‘ کی عربی شرح زبدۃ الطحاوی، دروس بخاری کا مجموعہ تحفۃ القاری شرح بخاری‘ نہایت مقبول ہیں۔ علم اصول حدیث میں مرحوم کی تصانیف ریفرنس کی حیثیت رکھتی ہیں۔ خاص کر تحفۃ الدرر شرح نخبۃ الفکر، شرح علل الترمذی اور تہذیب المغنی (جو علم رجال میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے) مقبول ترین ہیں۔

فقہ اور اصول فقہ کے ممتاز استاد تھے، اس میدان میں وہ بہت بلند مقام پر نظر آتے ہیں، فقہ وافتاء کی تدریس کے ساتھ ان کی تصنیفی کاوشیں دنیائے فقہ کے لیے گراں قدر سرمایہ ہیں۔ ان میں سے ’’حواشی الفتاوی‘ نہایت اہم ہے، اسی طرح حرمت مصاہرت حقیقی مواد پر مشتمل اہم تصنیف ہے، اس میں سسرالی اور دامادی رشتوں کے متعلق مفصل اور مدلل احکام بیان کیے گئے ہیں، اصول فقہ میں ان کی متعدد معرکۃ الآراء تصانیف ہیں، ان میں سے کئی کتابیں دارالعلوم دیوبند کے علاوہ متعدد دینی مدارس میں شامل نصاب ہیں، بطور خاص ’’مبادی الاصول اور اس کی شرح معین الاصول اصول فقہ سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے نہایت اہم ہیں۔ افتاء کے آداب اور اس کی بنیادی شرائط کی رہنمائی کے لیے مرحوم کی کتاب ’’آپ فتوی کیسے دیں؟ افتاء کے طالب علموں کے لیے نہایت قیمتی رہنما ہے۔ جو بنیادی طور پر علامہ شامی کی شہرۂ آفاق کتاب ’’شرح عقود رسم المفتی‘‘ کی نہایت عمدہ شرح ہے۔

منطق اور فلسفہ میں بھی ان کو درک حاصل تھا، اس فن میں بھی ان کے تصنیفی جواہر بے مثل ہیں، ان میں سے مبادی الفلسفہ کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی جس میں فلسفہ کی تمام اصطلاحات کی عربی زبان میں مختصر اور سلیس وضاحت کی گئی ہے، مبادی الفلسفہ کی شرح معین الفلسفہ کو بھی بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہے، جس میں حکمت وفلسفہ کے دقیق مسائل کی آسان اسلوب میں وضاحت کی گئی ہے اور فلسفہ کی فنی بحثوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے ان کے علاوہ مفتاح التہذیب، آسان منطق، منطق کی معروف کتاب ’’سلم العلوم‘‘ کی مقبول ترین شرح ارشاد الفہوم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

صرف ونحو میں بھی مرحوم کو مکمل مہارت حاصل تھی، چنانچہ صرف ونحو سے متعلق

ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، خاص طور سے ابتدائی درجات کے لیے آسان نحو اور آسان صرف بے حد مفید ہیں۔ فن نحو کی معروف کتاب ”کافیہ“ کی نہایت آسان اسلوب میں انہوں نے عربی اور اردو دونوں زبانوں میں شرح لکھی، اردو شرح ”ہادیہ“ کے نام سے اور عربی شرح ”وافیہ“ کے نام سے شائع ہوئیں۔ معروف محدثین، فقہاء اور راویان کتب کے تفصیلی سوانح پر مشتمل نہایت مبسوط دستاویز تیار کی ہے، جو ”مشاہیر محدثین وفقہاء کرام اور تذکرہ راویان کتب حدیث“ کے نام سے شائع ہو چکی ہے، جو خلفائے راشدین، عشرہ مبشرہ ازواج مطہرات، بنات طیبات، مدینہ کے فقہاء سبعہ مجتہدین، محدثین، راویان کتب حدیث، شارحین حدیث، معروف فقہاء ومفسرین متکلمین اسلام اور دیگر مشہور ترین شخصیات کے جامع ترین تذکرے پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ مشہور محدثین کے تفصیلی حالات زندگی پر مشتمل متعدد تصانیف ہیں، ان میں حیات امام ابو داؤد، حیات امام طحاوی وغیرہ معروف و مقبول ہیں۔ ان کی تالیفات میں محفوظات جو تین جلدوں پر مشتمل ہے، طالبان علوم نبوت کے لیے بیش قیمت تحفہ ہے، اس میں ان منتخب آیات واحادیث کو جمع کیا گیا ہے جو بطور خاص طالبان علوم دینیہ کے ایمانیات واخلاقیات کی درستگی کے لیے نہایت اہم ہیں۔ ”محفوظات“ میں موجود آیات واحادیث کو مدارس میں حفظ یاد کرایا جاتا ہے اور یہ اکثر دینی مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سیمیناروں میں پیش کیے گئے چار اہم مقالوں کا مجموعہ ”اسلام تغیر پذیر دنیا میں“ کے نام سے شائع ہوا، جس میں عصر حاضر میں اسلام کو درپیش چیلنجز اور ان چیلنجز زدہ حالات میں اسلام کے قائدانہ کردار کی بحالی پر نہایت تفصیل سے مدلل اور محقق گفتگو کی گئی ہے، ان کے علاوہ مختلف موضوعات پر ان کی اور بھی قیمتی تالیفات شروحات اور حواشی ہیں، جو متعلقہ موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اہل علم کے لیے مفید ہیں۔ ان میں سے تسہیل ادلۂ کاملہ، حواشی وعناوین ایضاح الادلہ، افادات نانوتوی، رحمۃ اللہ الواسعۃ، کامل برہان الٰہی، حجۃ اللہ البالغہ عربی، مجموعہ علمی خطبات، دین کی

بنیادیں اور تقلید کی ضرورت، مسلم پرسنل لاء اور نفقہ مطلقہ وغیرہ اہم ترین علمی تحقیقی تالیفات ہیں۔ ایک طرف جہاں وہ کثیر التصانیف محقق اور باکمال مدرس تھے وہیں متنوع علمی جہات پر کامل دسترس رکھتے تھے، مدارس دینیہ میں متداول تمام فنون میں ان کی حیثیت ایک مرجع کی تھی، ان کا درس نہایت مقبول اور عام فہم ہوتا تھا، معلومات سے پر اور نہایت موثر گفتگو کرتے تھے، اندازِ تحریر بھی اسلوب بیان ہی کی طرح آسان، عام فہم، معلومات سے پر اور نہایت مؤثر تھا، اللہ تعالی مرحوم کی خدمات سے دنیا کو فیض یاب کرے اور ان کے لیے مغفرت اور بلندی درجات کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔

حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ

بحیثیت مدرّس، مصنف و مؤلف

|| مولانا محمد احسان ندوی قاسمی ||

یہ دنیا دار الفناء ہے، یہاں جو بھی آیا ہے اسے ایک نہ ایک دن یہ دنیا چھوڑ کر جانا ہی ہے اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں، لیکن اللہ کے کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے جانے سے صرف ایک قصبہ اور گاؤں ہی نہیں بلکہ پورا عالم ماتم کناں ہوتا ہے، اسی لئے تو کہا گیا ہے کہ ”موت العالِم موت العالَم“ یعنی ایک عالم کا دنیا سے چلا جانا پورے ایک عالم کی موت ہے، ایسے ہی پاکیزہ نفوس میں سے حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری قدس سرہٗ بھی تھے۔ آپ پورے ایک عالم کو سسکتا، بلکتا چھوڑ ہمیشہ ہمیش کے لئے 19 مئی 2020 کو ممبئی کے ایک ہاسپٹل میں اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے اور وہیں جوگیشوری کے مسلم اوشیورہ قبرستان میں سپردخاک ہوئے۔

وہ بڑی خوبیوں کے حامل انسان تھے، راقم الحروف آپؒ کی کن کن صفات کو بیان کرے اور کن کن کو نظرانداز کرے، حقیقت تو یہ ہے کہ آپ پوری ایک انجمن تھے، یوں تو راقم الحروف جب دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں زیرِ تعلیم تھا اور آپ کے علمِ حدیث وفقہ کی شہرت سنتا تھا، اور آپ کی کتاب تحفۃ الدرر شرح نخبۃ الفکر اور تحفۃ الالمعی شرح سنن الترمذی مطالعہ کرتا تھا، تو دورانِ استفادہ آپ کی تبحرِ علمی کا بخوبی اندازہ ہوگیا تھا، دل ہی دل میں حسرت ہوتی تھی کہ کاش حضرت سے براہ راست ملاقات یا کسبِ فیض کا موقع مل جاتا، آپ کے متعلق اس ناچیز کی زبان سے خوب دعائیں نکلتی تھیں، لیکن دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فراغت کے بعد دورۂ حدیث (فضیلت) کے لئے راقم الحروف نے جب دارالعلوم دیوبند کا قصد کیا، اور بخاری شریف جلد اول حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالنپوریؒ سے پڑھنے کا موقع ملا تو جو باتیں میں نے حضرت کے متعلق سن رکھی تھیں انہیں بالکل ویسا ہی

پایا بلکہ جتنا سنا تھا اس سے بڑھ کر پایا۔ ع

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

حدیث پاک سے آپ کے شغف اور شوق کو میں کس انداز سے بیان کروں کہ آپؒ عام طور پر پورا پورا سال روزانہ ڈھائی گھنٹے پڑھاتے اور اخیر سال میں جب دیگر اساتذہ کے اسباق مکمل ہو جاتے تو آپ سات بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک مکمل پڑھاتے تھے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ دوران درس پانی وغیرہ کی طرف خیال بھی نہیں جاتا تھا اور انتہائی ذوق وشوق سے بخاری شریف پڑھاتے رہتے تھے، آپ خود حدیث پاک بالکل صاف صاف پڑھتے اور توضیح وتشریح بھی بالکل صاف کرتے اور ٹھہر ٹھہر ایک ایک بات صاف کہنا اور پیچیدگیوں کو دور کر دینا آپ کے درس کا خاص پہلو تھا، آپؒ پورے سال بخاری شریف ایک ہی انداز سے پڑھاتے تھے، عام طور سے دیگر مدارس کا حال ہے کہ شروع سال میں خوب لمبی، چوڑی بحث کریں گے اور سال کے اخیر میں صرف عبارت خوانی پر اکتفا کریں گے۔ ایسا آپ کبھی نہیں کرتے تھے، آپؒ کے پڑھانے کا انداز بڑا نرالا اور دلچسپ تھا، جس نے آپؒ سے استفادہ کیا ہے وہی اس درس کی اثر انگیزی کا لطف اٹھا سکتا ہے، جو حدیثیں کچھ مشکل معلوم ہوتیں، آپؒ اسے اس طرح حل فرماتے تھے کہ طلبہ عش عش کرتے رہ جاتے تھے، حدیث فہمی کا جو ملکہ اللہ نے آپؒ کو ودیعت کیا تھا، مجھ کوتاہ نظر نے پورے ہندوستان میں دور دور تک اس میں آپ کا ثانی نہیں دیکھا، آپؒ کا جب وہ انداز یاد آتا ہے تو آپؒ کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں، وہ فرماتے تھے کہ دیکھو بھائی! یہ حدیث ہے، اس میں امام اعظم ابوحنیفہؒ یہ کہیں گے، کیوں کہ ان کا اصول یہ ہے، اور امام مالک، امام شافعی امام احمد بن حنبلؒ یہ کہیں گے کیوں کہ ان کے اصول یہ ہیں، مطلب یہ کہ آپؒ کو ائمہ کرام رحمہم اللہ کے اصول اور ان کے مسالک اس طرح مستحضر تھے کہ آپ اصول سے ہی ائمہ کے مسالک سمجھ جاتے تھے اور ائمہ کے مسالک اور دلائل اس طرح بیان کرتے تھے جیسے آپ کے سامنے کوئی کتاب کھلی ہو اور آپ اسی میں سے نقل کر رہے ہوں۔

طالبین حدیث جانتے ہیں کہ بخاری کا ترجمۃ الباب سمجھنا کس قدر مشکل کام ہے، لیکن آپ اسے چٹکیوں میں حل فرماتے تھے، اور یہ بات تو بہت ہی مشکل ہے کہ امام بخاریؒ اس مسئلہ میں کس امام کے ساتھ ہیں؟ آپ اسے بھی انتہائی آسانی کے ساتھ حل فرماتے تھے آپؒ دورانِ درس لایعنی باتوں سے مکمل اجتناب فرماتے تھے۔ ادھر ادھر کی بات بالکل نہ کرتے تھے۔

ایک طرف تو آپ خود بھی کامیاب مدرس اور استاذ تھے دوسری طرف ممتاز مصنف اور مؤلف بھی تھے، درجنوں کتابیں آپؒ کے سیال قلم سے منظر عام پر آئیں اور اہل علم ونظر سے خوب داد وتحسین حاصل کی، کچھ معروف کتابیں یہاں ذکر کی جارہی ہیں۔ رحمۃ اللہ الواسعۃ شرح حجۃ اللہ البالغہ پانچ جلدیں مکمل، تفسیر ہدایت القرآن، تحفۃ الالمعی شرح ترمذی آٹھ جلدیں مکمل، تحفۃ القاری شرح بخاری شریف بارہ جلدیں مکمل، تحفۃ الدرر شرح نخبۃ الفکر، علمی خطبات دو جلدیں، فقہ حنفی اقرب الی النصوص ہے، فیض المنعم شرح مقدمۃ المسلم، ہادیہ شرح کافیہ، وافیہ شرح کافیہ، حیات امام طحاویؒ، زبدۃ الطحاوی، آسان صرف، آسان نحو، محفوظات، دین کی بنیادیں اور تقلید کی ضرورت، آسان فارسی قواعد، مبادی الاصول، مبادی الفلسفہ، معین الاصول، شرح علل الترمذی، ارشاد الفہوم شرح سلم العلوم، مفتاح العوامل شرح شرح مأۃ عامل، حاشیہ امداد الفتاویٰ، کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟ ڈاڑھی اور انبیاء کی سنت، وغیرہ، ان کے علاوہ بہت سے مضامین ومقالات اور علمی وفقہی بحثیں ہیں جو ان شاء اللہ قیامت تک طالبین وباحثین کے لئے نئے نئے راستے بناتی رہیں گی اور آپ کے حق میں صدقۂ جاریہ اور وسیلۂ نجات ثابت ہوں گی۔

آپؒ نے اپنے بعد جو اولاد چھوڑی ہے وہ بھی قابل رشک ہے، آپ کا پورا خاندان علم کا گہوارہ ہے، ایک دو بچوں کے علاوہ سب حافظ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ عالم بھی ہیں، اور حیرت کی بات یہ ہے کہ بہوویں بھی حافظہ ہیں، فالحمد للہ علی ذلک۔

راقم الحروف اس بات پر جتنا بھی اللہ رب العزت کا شکر ادا کرے کم ہے، کہ اس

نے مجھے بھی آپ سے بخاری شریف جلد اول پڑھنے کا موقع عطا فرمایا اور اس سے مجھے جو فائدہ پہنچا بندہ اس کو بیان کرنے سے قاصر ہے۔

اخیر میں اللہ سے دست بدعا ہوں کہ وہ استاذ محترم مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کی بال بال مغفرت فرمائے اور دارالعلوم کو آپؒ کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کرگیا

اوصاف و کمالات اور امتیازات و خصوصیات

اے علم! ترا قافلہ سالار کہاں ہے؟

حضرت مولانا محمد سلمان بجنوری — استاذ حدیث وفقہ دارالعلوم دیوبند

25/رمضان 1441ھ مطابق 19/مئی 2020ء منگل کا دن، پوری ملت اسلامیہ اور بالخصوص اس کے مرکزِ ثقل دارالعلوم دیوبند کے لئے رنج والم کا پیغام لایا کہ اس کے شیخ الحدیث وصدر المدرسین اور علوم وفنون کی جامعیت میں نمونۂ سلف حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری چندروزہ علالت کے بعد مسافرانِ آخرت میں شامل ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان العین تدمع والقلب یحزن ولانقول الا ما یرضیٰ ربنا وانا بفراقک یا شیخنا لمحزونون۔

یہ جانکاہ خبر چند منٹوں میں دنیا کے طول وعرض میں پھیل گئی اور تمام دینی طبقوں کو سوگوار کرگئی، سب لوگ ایک دوسرے سے تعزیت کرنے لگے، ان کے تلامذہ کو یتیمی کا احساس ستانے لگا، بڑے بڑے علماء خراج عقیدت پیش کرنے لگے اور تمام اہل نظر ایک عجیب خلا محسوس کر کے فکر مند نظر آنے لگے اور سبھی کی زبانِ حال سے گویا یہ مضمون ادا ہونے لگا۔

عجب قیامت کا حادثہ ہے کہ اشک ہے آستیں نہیں ہے
زمیں کی رونق چلی گئی ہے، افق پہ مہر مبیں نہیں ہے
تری جدائی سے مرے والے! وہ کون ہے جو حزیں نہیں ہے؟

حضرت الاستاذؒ کی وفات پر تحریری وزبانی تاثرات اور اظہار رنج وغم کا ایک غیر معمولی سلسلہ جاری ہے، مضامین پر مضامین چلے آرہے ہیں، رسائل کے خصوصی نمبر نکالے جارہے ہیں، خود ہمارے پاس اشاعت کے لئے اچھے اور معیاری مضامین اتنی تعداد میں آچکے ہیں کہ ان کو رسالہ کے چار شماروں کی ضخامت میں بھی سمیٹنا ممکن نہیں ہے۔ ایسی صورت

حال میں اس مدیر عاجز کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ نہایت اختصار کے ساتھ اپنے جذبات وتاثرات پیش کرکے دیگر اہل قلم کی تحریرات سے استفادے کی راہ ہموار کرے۔

حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کے امتیازات وخصوصیات پر لکھنے والوں نے اپنے اپنے بہترین انداز میں روشنی ڈالی ہے، جس کے نمونے آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے آئیں گے، اس کوتاہ بیں نے اس عظیم شخصیت کی انفرادیت کو جس انداز میں محسوس کیا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

(۱) مثالی مدرس: حضرت کی شخصیت مبارکہ کی شاہ کلید، احقر کی نظر میں تدریس ہے، وہ فطری اور بنیادی طور پر مدرس تھے، معلم تھے اور اگر آپ غور سے دیکھیں تو صاف محسوس ہوگا کہ ان کا ملکۂ تدریس صرف درسگاہ تک محدود نہیں ہے، بلکہ وہ اپنی تصنیفات اور تقریر وتحریر میں بھی ایک سنجیدہ اور مشفق و ماہر استاذ ہی نظر آتے ہیں، جو اپنے فن پر پوری طرح حاوی ہوکر اپنے قاری اور سامع کو بھی اسی طرح مضمون سمجھاتے ہیں جس طرح وہ درسگاہ میں گہر افشانی فرماتے ہیں۔

تدریس کے لئے حضرت کی سنجیدگی اور محنت مثالی تھی، وہ فریضۂ تدریس کی انجام دہی اس طرح فرماتے تھے جیسے اس کو مقصد زندگی سمجھتے ہوں، اسی کی یہ برکت تھی کہ اللہ رب العزت نے ان کے سبق کو بے نظیر مقبولیت سے نوازا جس کی شہرت ملکوں ملکوں پہنچی۔

یہ سطور لکھتے ہوئے اچانک یاد آیا کہ ہم نے تعلیمی سال ۱۴۰۷ھ-۱۴۰۸ھ میں حضرت سے ترمذی شریف اور طحاوی شریف پڑھی اس کے اگلے سال (۱۴۰۸ھ-۱۴۰۹ھ) میں ہم لوگ تکمیل ادب سے فارغ ہوئے تو النادی الادبی کے دفتر میں ایک الوداعی تقریب منعقد کی گئی، اس میں ہمارے ایک ساتھی (مولانا ظفر احمد اعظمی) نے ایک الوداعی نظم پیش کی جس کا پہلا مصرع اس طرح تھا۔

ع   یہ ہنستے کھیلتے منظر تو ہوں گے، ہم نہیں ہوں گے

اس نظم میں انہوں نے حضرات اساتذۂ کرام کے بارے میں بھی اپنی

محبت وعقیدت کا اظہار کیا، اس میں حضرت الاستاذ سے متعلق شعر اس طرح تھا۔

وہ کس پر درسگاہِ جامعہ مغرور ہے یارو!

سنو! وہ افتخارِ ارض پالن پور ہے یارو!

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اب سے تیس پینتیس برس پہلے بھی ان کا درس طلبہ کے درمیان مقبولیت کی کس معراج پر تھا اور اب تو بلاشبہ ان کے درس کی مقبولیت ملکوں کی سرحدوں کو بہت پیچھے چھوڑ گئی تھی اور یہ عالم ہوگیا تھا کہ (میؔر کے شعر میں ترمیم کرکے) کہا جاسکتا ہے۔

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میؔر ہوئے سب اسی کے درس کے اسیر ہوئے

(۲) جہد مسلسل: حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کی دوسری صفت جس کو اس کوتاہ ہمت نے سب سے زیادہ محسوس کیا وہ ان کی انتھک محنت اور مسلسل کام کرنے کی صلاحیت ہے۔ ان کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ وہ چوبیس گھنٹے میں کوئی وقت کسی بامقصد کام کے بغیر گزارنے کے قائل ہی نہیں تھے۔ ان کی تدریس کی طرح تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی سارے سال جاری رہتا تھا، یہاں تک کہ سفر میں بھی مسودات کی تصحیح اور پروف ریڈنگ وغیرہ کا کام کرتے رہتے تھے۔ پھر تدریس صرف دارالعلوم کے اسباق تک محدود نہیں تھی، بلکہ گھر پر پہلے بیٹوں اور پھر پوتوں کو پڑھانے کا معمول ہر دور میں جاری رہا۔ اسی کے ساتھ ان کا تجارتی مکتبہ (مکتبہ حجاز) جب تک صاحبزادوں نے نہیں سنبھالا، اس کے بھی سارے کام خود ہی کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ باری تعالیٰ نے ان کو قوت عمل اور توفیق عمل عطا فرمانے میں خصوصی رحمت سے کام لیا ہے۔

(۳) جامعیت: حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کا سب سے اہم امتیاز ان کی جامعیت ہے، یہ جامعیت مختلف پہلوؤں سے سمجھی جاسکتی ہے۔ سب سے پہلے تو جامعیتِ علوم وفنون ہے کہ وہ بیک وقت ایک ممتاز محدث، مفسر اور فقیہ تو تھے ہی، اس کے علاوہ منطق وفلسفہ اور نحو وصرف جیسے علوم آلیہ میں بھی گہری نظر اور مہارت کے حامل تھے، پھر یہ جامعیت تدریس اور تالیف میں بھی نمایاں ہے۔ وہ ان تمام علوم وفنون کی کتابیں بے تکان پڑھاتے تھے

اور تقریباً ان تمام ہی علوم میں ان کی تالیفات بھی ہیں، جن میں سے بہت سی کتابیں مدارس کے نصاب میں داخل درس ہیں۔ زبانوں کو دیکھا جائے تو وہ عربی، اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی سے بھی بخوبی واقف تھے۔ ان تمام صلاحیتوں کے ساتھ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کے علوم سے گہری واقفیت اور ان کی تدریس وتشریح نے ان کی شخصیت کی علمی گیرائی وگہرائی کو عمومی اعتراف اور قبول عام عطا کر دیا تھا۔

جامعیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ شریعت وطریقت دونوں کے شناور تھے، اسی طرح وہ اعلیٰ درجہ کے مدرس، مقبول مقرر اور عالی مقام مصنف تھے۔ اور ان تینوں میدانوں بالخصوص تدریس وتصنیف میں ان کا مقام بلند، ان کے نام کو زندۂ جاوید رکھنے کے لئے کافی ہے

(۴) خود اعتمادی اور صبر وہمت: حضرت الاستاذ کی ایک نمایاں صفت جو ہمیشہ احقر نے محسوس کی وہ ان کی خود اعتمادی اور ہمت وحوصلہ تھا، خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ کبھی بھی اپنی بات پیش کرنے میں جھجکتے نہیں تھے، ہم نے ان کو ایسی مجالس میں بھی گفتگو کرتے دیکھا جہاں ان کے اساتذہ واکابر موجود ہوتے؛ لیکن ان کی خود اعتمادی میں کوئی فرق نہ آتا، بسا اوقات وہ عام رائے سے مختلف کسی رائے کا اظہار فرماتے تو اس میں بھی ان کی بے پناہ خود اعتمادی کار فرما رہتی۔

جہاں تک ہمت وحوصلہ کی بات ہے تو اس باب میں ان کی نظیریں کم ملیں گی۔ مشکل سے مشکل حالات اور بڑے سے بڑا صدمہ پیش آنے پر بھی ان کی ہمت اور صبر دیکھنے کی چیز ہوتی۔ احقر کو اس کا سب سے پہلا تجربہ اس وقت ہوا جب شوال ۱۴۱۵ھ میں ان کے بڑے صاحبزادے مولانا رشید رحمہ اللہ کی ایک حادثہ میں شہادت ہوئی اور حضرت الاستاذ سفر میں ہونے کی وجہ سے جنازہ میں بھی شریک نہ ہو سکے۔ پھر جب تشریف لائے تو اگلے دن احقر تعزیت کے لئے حاضر ہوا، اس وقت چند مقامی اور بیرونی حضرات بھی وہاں پر موجود تھے، تعزیت کا ایک آدھ جملہ کہا تو حضرت نے کئی منٹ تک تسلی آمیز گفتگو فرمائی جس پر احقر نے عرض کیا کہ: حضرت! ہم تو آپ کی تعزیت کے لئے حاضر ہوئے تھے؛ لیکن آپ سے مل کر ہماری تعزیت ہوگئی اور ہمیں سکون ملا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دن رضا بالقضا کا اعلیٰ

ترین نمونہ ہم نے دیکھا۔ آخر میں (وفات سے چند ماہ پہلے) دوسرے صاحبزادے حافظ سعید احمد صاحب رحمہ اللہ کے انتقال کا صدمہ بھی اسی صبر وہمت کے ساتھ برداشت کیا۔

یہی حوصلہ بیماری اور تکلیف میں سامنے آتا تھا، آخر کے آٹھ دس سال مختلف امراض اور تکالیف میں گزرے؛ لیکن ان سے بات کر کے یا ان کے کام دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی خاص بات ہی نہ ہو۔ اسی ہمت وحوصلہ کی وجہ سے بسا اوقات بیماری اور علاج پر ضروری توجہ نہ ہونے کی صورت بھی پیش آتی تھی۔ ایسے بعض مواقع پر، جب اصاغر کا توجہ دلانا کافی نہ ہوا تو اہل تعلق نے حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری نور اللہ مرقدہٗ کے ذریعہ متوجہ کرایا، جن کی بات کا معاصرین میں سے زیادہ لحاظ کرتے تھے اور ان کو بھی حضرت الاستاذ سے محبت تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرۃ الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری نور اللہ مرقدہ کی شخصیت اس دور میں ان شخصیات میں تھی جن سے علم وفن کی آبرو قائم رہتی ہے اور خلق خدا کے دلوں میں ان کی عظمت بیٹھ جاتی ہے اور ان کے نام اور کام زندۂ جاوید رہتے ہیں۔

جی تو نہیں چاہتا کہ اس تذکرے کو مختصر کیا جائے؛ لیکن سر دست اختصار کے سوا چارہ بھی نہیں ہے، آئندہ جب توفیق ہوگی ان شاء اللہ کچھ مزید معروضات پیش کی جائیں گی۔

......نایاب ہیں ہم

بیاد: اُستاذ الاساتذہ، محدث کبیر حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری نور اللہ مرقدہٗ
شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند
(ولادت: ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۲ء، وفات: ۱۴۴۱ھ مطابق ۲۰۲۰ء)

تحریر: مفتی محمد سلمان صاحب منصور پوری

استاذ الحدیث والافتاء جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد

رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ کی ۲۵ر تاریخ اور ۱۹ر مئی ۲۰۲۰ء منگل کا دن ہمارے لئے اور ہم جیسے ہزاروں اَفراد کے لئے بہت صدمہ اور افسوس کا دن تھا، جب صبح اِشراق کے وقت ہمارے محبوب ومشفق اور مہربان اُستاذ گرامی قدر، فکر ولی اللّٰہی کے ترجمان، علومِ نانوتوی کے اَمین، دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین، محدث کبیر حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمہ اللہ تعالیٰ ممبئی کے ایک اسپتال میں اپنے خالق ومالک کے دربار میں بصد عجز ونیاز حاضر ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جو بھی دنیا میں آیا ہے، اُسے بہرحال یہاں سے جانا ہے؛ لیکن بعض حضرات کا جانا دیر تک محسوس کیا جاتا ہے، اور اُن کی یادیں سالہا سال ذہن ودماغ میں رچی اور بسی رہتی ہیں، اور اُن کے خلا کو بہت زیادہ محسوس کیا جاتا ہے، بالخصوص کسی عالم ربانی کا دنیا سے اُٹھ جانا ایسا نقصان ہے جس کی تلافی قیامت تک نہیں ہوسکتی۔ امیر المؤمنین، خلیفۂ رابع سیدنا حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کا مقولہ ہے: ’’إِذَا مَاتَ الْعَالِمُ انْثَلَمَ فِي الإِسْلَامِ ثَلْمَةٌ لَا يَسُدُّهَا شَيْءٌ إِلىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ‘‘۔ (کشف الخفاء للعجلوني ۱/۸۷ ولہ شواہد) (یعنی جب کسی عالم کا انتقال ہوتا ہے تو اسلام میں ایسا خلا ہوجاتا ہے، جسے قیامت تک کوئی چیز پر

نہیں کرسکتی) وجہ اِس کی یہ ہے کہ ہر عالم کی ایک امتیازی شان ہوتی ہے جو اُسی کے ساتھ رخصت ہوجاتی ہے۔ دیکھنے میں بظاہر سب کام جاری رہتے ہیں؛ لیکن قدم قدم پر جانے والے کی کمی کا احساس بھی ہوتا رہتا ہے۔

ایسے ہی نایاب علماء ربانیین میں حضرت الاستاذ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی شمار ہے۔ آپ نے قمری اعتبار سے ۸۰/سال اور شمسی اعتبار سے ۷۸/سال کی عمر پائی اور نصف صدی تک دارالعلوم دیوبند کی مسند تدریس پر فائز رہ کر ہزار ہا ہزار تشنگانِ علومِ نبوت کو جی بھر کر سیراب فرمایا، اور نہ صرف یہ کہ تدریس؛ بلکہ بیش قیمت نہایت مفید اور نافع تصانیف اور شروحات لکھ کر اُمت پر احسان فرمایا۔ اِس اعتبار سے آپ کی ذاتِ عالی زندۂ جاوید بنی رہے گی، اِن شاء اللہ تعالیٰ۔

سرورِ عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشادِ عالی ہے: "إِذَا مَاتَ الإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ: إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْ لَهُ". (صحيح مسلم ٤١/٢) (یعنی جب اِنسان دنیا سے چلا جاتا ہے تو اُس کے اَعمال کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے؛ لیکن تین چیزیں ایسی ہیں جن کا اجر وثواب بعد میں بھی جاری رہتا ہے: (۱) صدقہ جاریہ (۲) علم نافع (۳) دعاءِ خیر کرنے والی نیک اَولاد)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اِن تینوں سعادتوں سے بہرہ ور فرمایا تھا، صدقہ جاریہ کے ساتھ ساتھ علم نافع اور صالح اَولاد (جو سب ماشاء اللہ قرآنِ کریم اور علم دین سے وابستہ ہیں) آپ کے لئے اَجر وثواب میں اِضافے اور آخرت میں رفع درجات کا ذریعہ بنتی رہیں گی۔

نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ بھی اِرشاد فرمایا ہے کہ: "اُذْكُرُوْا مَحَاسِنَ مَوْتَاكُمْ" ......الخ. (سنن أبي داؤد رقم: ٤٩٠٠) (یعنی اپنے مرحومین کی خوبیوں کو

اُجاگر کیا کرو) خاص طور پر ایسے حضرات جن کی زندگی بعد والوں کے لئے مشعلِ راہ اور بہترین نمونہ ہو؛ اُن کی قابلِ تقلید باتوں کو سامنے لانا بجائے خود بہت نفع کی بات ہے۔ اِس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی چند نمایاں صفات کو اختصار کے ساتھ عرض کریں؛ تاکہ ہمارے اندر بھی اُن کو اپنانے کا جذبہ پیدا ہوسکے:

(۱) اَوقات کی حفاظت:- حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا بہت ہی قیمتی اور روشن پہلو یہ ہے کہ آپ نے اپنی عمر عزیز کو بالکل ضائع نہیں ہونے دیا اور ایسے مشاغل ومصروفیات سے اپنے کو دور رکھا جن کی وجہ سے آپ کے علمی سفر میں کوئی خلل پڑسکتا تھا۔ جن حضرات نے آپ کو قریب سے دیکھا ہے، وہ اِس بات کی گواہی دیں گے کہ طبعی تقاضوں اور دنیوی ضروریات کے علاوہ آپ کی چوبیس گھنٹے کی پوری زندگی کسی نہ کسی خیر اور فائدے کے کام ہی میں گذرتی تھی۔ مدرسہ کا وقت: تدریس یا بوقت ضرورت تعلیمی وانتظامی مشوروں میں گذرتا؛ جب کہ گھر میں درس کی تیاری، مطالعہ یا تصنیف وتالیف میں دیر رات تک مشغول رہا کرتے تھے۔ درمیان میں اگر وقت ملتا تو گھر کے بچوں کو بھی چھوٹی بڑی کتابیں خود ہی پڑھا دیا کرتے تھے۔ الغرض آپ نے پورا ماحول اِس طرح کا بنا رکھا تھا کہ آپ کی زندگی کا کوئی لمحہ فضول ضائع نہ ہو، اِسی کی برکات تھیں کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے عظیم الشان کاموں کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائی، جن کی تیاری کے لئے پوری پوری اکیڈمی کی ضرورت پڑتی ہے۔

حضرت الاستاذ کی زندگی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ جو شخص بھی اپنے مقصد زندگی کو متعین کرکے نظام الاوقات بنا کر یکسوئی اور دل جمعی کے ساتھ محنت میں لگے گا، وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے اَوقات اور خداداد صلاحیتوں کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

(۲) ٹھوس استعداد:- حضرت مفتی صاحبؒ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِستعداد کی پختگی اور قابلِ رشک علمی گیرائی سے بھی سرفراز فرمایا تھا۔ نحو وصرف سے لے کر فقہ وحدیث اور تفسیر تک تمام علوم پر آپ کی نظر تھی، اور بر موقع حسبِ ضرورت اُن باتوں کو مرتب کرنے کا سلیقہ بھی آپ کو عطا ہوا تھا۔

اور ظاہر ہے کہ عالم اَسباب میں یہ علمی رسوخ اچانک حاصل نہیں ہو جاتا؛ بلکہ اُس کے لئے شروع سے ہی محنت اور جدوجہد ضروری ہوتی ہے۔ آپ کی استعداد کیسے بنی؟ اِس کا تذکرہ فرماتے ہوئے مدرسہ شاہی مرادآباد کے اجلاسِ دستار بندی (منعقدہ: ۴؍جون ۲۰۱۳ء بروز منگل) میں خطاب کرتے ہوئے آپ نے اِرشاد فرمایا:

> ”مدرسہ میں محض پڑھنے سے علم نہیں آتا، آپ کہیں گے کہ ہم تو پڑھ رہے ہیں؟ امتحان دے رہے ہیں؟ تو بات یہ ہے کہ پڑھنا دو طرح سے ہوتا ہے: ایک پڑھنا ہے اپنے لئے اور ایک پڑھنا ہے ابّا کے لئے، ابّا کے لئے پڑھنے سے علم نہیں آئے گا......۔
>
> میں نے چہارم تک ابّا کے لئے پڑھا، شرح جامی میں میں نے سہارن پور مظاہر علوم میں داخلہ لیا، چناں چہ سہارن پور کی کوئی گلی ایسی نہیں ہے جس میں میں نے سائیکل نہ چلائی ہو، اتفاق ایسا ہوا کہ مجھے ”ٹائی فائڈ“ ہوگیا، ٹیلی گرام کیا گیا، ابّا لینے کے لئے آئے اور مجھے گھر لے گئے، یہ یاد رہنا چاہئے کہ میں انتہائی غریب گھر کا تھا، میں نے سنا کہ ابّا اپنی والدہ سے میرے بارے میں باتیں کر رہے تھے کہ مجھے اس لڑکے کو اب نہیں پڑھانا ہے؛ کیوں کہ یہ بیمار ہوا اس پر اتنا خرچ ہوا، میں لینے گیا اب یہ واپس جائے گا، اور اس پر اس قدر خرچ ہوگا، اس نے پڑھا تو کچھ نہیں، میری دادی کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا، میں یہ سب باتیں سن رہا تھا، مجھے احساس ہوا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اَب مجھے پڑھنا ہے، مجھے پوری رات نیند نہیں آئی، میں صبح کو والدہ کے پاس آیا اور میں نے کہا میرا سامان تیار کرو اور مدرسہ آگیا

اُس دن سے آج تک میں ۲۷ ر سال کا ہو گیا ہوں؛ میں اپنے لئے پڑھ رہا ہوں''۔
(ندائے شاہی جولائی ۲۰۱۳ء)

اِس خطاب سے آپ کے عزم وہمت اور تادمِ آخر طلبِ علم میں حوصلہ مندی کا پتہ چلتا ہے، جو ہم سب کے لئے بہترین نمونہ ہے۔

علاوہ اَزیں آپ نے حالاتِ زمانہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے بقدرِ ضرورت گجراتی اور انگریزی زبان بھی سیکھی، اور اپنے تلامذہ کو بھی اِس کی ترغیب دیتے رہے۔ مدرسہ شاہی کے اِجلاس دستار بندی (منعقدہ: نومبر ۲۰۰۳ء) میں تقریر کرتے ہوئے اِرشاد فرمایا:

> ''میں نے بچپن میں گجراتی زبان بالکل نہیں پڑھی تھی، اور میرا گجرات میں رہنے کا اِرادہ بھی نہیں تھا؛ لیکن قسمت نے مجھے راندیر (گجرات) ہی پہنچادیا، تو میں نے سوچا کہ اَب زندگی بھر گجرات میں رہنا ہے، تو دین کا کام کرنے کے لئے گجراتی پڑھنا ضروری ہے چناں چہ میں نے راندیر میں مدرسی کے دوران ایک غیر مسلم ماسٹر سے ڈبل اُجرت دے کر باقاعدہ گجراتی سیکھی اور اِس قدر سیکھی کہ میں نے پانچ کتابیں گجراتی زبان میں تصنیف کیں، جو اَب بھی موجود ہیں اور چھپی ہوئی ہیں۔
>
> پھر مجھے خیال آیا کہ انگریزی بھی پڑھنی چاہئے، اِس کے بغیر دنیا میں کام نہیں چل سکتا، چناں چہ میرا ایک طالب علم جو ساؤتھ افریقہ کا رہنے والا اور اچھا انگریزی تعلیم یافتہ تھا، تو میں نے اُس سے کہا کہ ''احمد! تم مجھے انگریزی پڑھاؤ''۔ چناں چہ میں اُسے ''ہدایہ اولین'' پڑھاتا تھا، اور وہ مجھے عصر کے بعد انگریزی پڑھایا کرتا تھا اور میں نے اُس سے اتنی انگریزی پڑھی کہ میرے اندر یہ داعیہ پیدا ہوا کہ میں ڈگری حاصل کرنے کے لئے علی گڈھ میں امتحان دوں

> اگرچہ بعد میں عین وقت پر یہ اِرادہ ترک کردیا، اس خطرہ سے کہ کہیں یہ ڈگریاں راستہ بدلنے کا ذریعہ نہ بن جائیں؛ لیکن الحمدللہ آج میں انگریزی زبان میں اپنی ضرورتیں پوری کرنے پر قادر ہوں۔ تو اگر ہم سب یہی طریقہ اختیار کریں کہ جو بھی کمی اپنے اندر پائیں اُسے دور کرنے کی کوشش کریں، تو اعتراض کرنے والوں کو اعتراض کا موقع ہی نہ ملے"۔ (ندائے شاہی دسمبر ۲۰۰۳ء)

حضرت کے اِس طرزِ عمل میں بھی بعد والوں کے لئے بہترین رہنمائی موجود ہے۔

(۳) بے مثال اَندازِ تفہیم:- حضرت الاستاذ کی وہ اِمتیازی صفت جس کا لوہا مانا گیا اور تسلیم کیا گیا، وہ آپ کا بے نظیر اَندازِ تفہیم وتدریس تھا، اِسی بنا پر آپ کو طلبہ کے درمیان اِنتہائی محبوبیت ومقبولیت حاصل ہوئی۔ آپ کا درس بلاشبہ ایک شاہکار درس کی حیثیت رکھتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہمیں ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۹۸۷ء میں حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے درسِ "ترمذی شریف" و"طحاوی شریف" میں شرکت کی سعادت ملی، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ دور علمی اعتبار سے حضرت والا کے عروج کا دور تھا، صحت وقوت بھی قابلِ رشک تھی درس کی پابندی بھی مثالی تھی، اگر پورے سال کا حساب لگایا جائے تو شاید ہی دو ایک روز ایسے ہوں گے جن میں آپ کسی عذر کی وجہ سے درس کے لئے تشریف نہ لائے ہوں؛ ورنہ روزانہ بلاناغہ اور بلاتکان دو ڈھائی گھنٹے انتہائی نفع بخش اور عالمانہ شان والا درس ہوتا تھا۔ بڑی سے بڑی گنجلک بحثوں کو آسان سے آسان تر کرکے گویا کہ سامعین کو گھول کر پلادینے کا فن اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا تھا۔ اِسی لئے اَدنیٰ سے اَدنیٰ طالبِ علم کو آپ کے درس سے انتہائی دلچسپی ہوتی تھی، آپ کی تشریف آوری سے پہلے ہی دارالحدیث طلبہ سے بھر جاتی اور جو کچھ دیر میں آتا اُسے دروازوں پر ہی جگہ ملتی تھی۔

درس میں آپ کا طرزِ گفتگو ایسا دل موہ لینے والا ہوتا تھا کہ شروع سے آخر تک ہر

شخص ہمہ تن گوش رہتا، پوری درس گاہ میں سناٹا چھایا رہتا۔ ائمہ مجتہدین کے کامل احترام کے ساتھ ساتھ اُن کے مابین اختلافی مسائل کی ایسی وضاحت فرماتے کہ بات دل میں اُترتی چلی جاتی، اور شروع کتاب سے لے کر اخیر تک علوم و معارف کا ایسا فیضان ہوتا کہ ہر نکتہ پر طبعیت عش عش کر اُٹھتی۔ حدیث کے ایک ایک لفظ کا ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ اہم مباحث کو بھی ایسے دلچسپ انداز میں پیش فرماتے کہ ساری بحث بسہولت ذہن نشیں ہوجاتی۔ اِنہیں امتیازات کی وجہ سے آپ کا درس غیر معمولی اہمیت کا حامل ہوتا تھا، اور کوئی طالب علم بھی اُس کا ناغہ پسند نہیں کرتا تھا۔ اکثر طلبہ آپ کے درس کو بہ آسانی کاپی میں نوٹ کرتے، اور علمی جواہر پاروں کو محفوظ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

آپ کے یہاں حدیث کی عبارت پڑھنے والے طلبہ بھی شروع سال ہی میں منتخب ہوجاتے تھے، جو صحیح اعراب اور تلفظ کے ساتھ حدیث کی قرأت کرتے اور ساتھ میں آپ کے مزاج شناس بھی ہوتے کہ کب پڑھنا ہے اور کہاں رکنا ہے؟

(۴) نافعیت:- حضرت الاستاذ رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو خلق خدا بالخصوص طالبانِ علوم ِنبوت اور علماء کے لئے نافع بنانے پر بھی مسلسل کوشش فرمائی۔ درس و تدریس کا نفع تو ظاہر ہے، اِس کے علاوہ آپ نے جو گراں قدر تصنیفات اور شروحات مرتب فرمائیں جن سے طلبہ اور اَساتذہ بھرپور فائدہ اُٹھارہے ہیں، وہ ضرور آپ کے حسنات میں بے حد اِضافے کا ذریعہ اور سبب بنتی رہیں گی۔

یوں تو آپ نے چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں مرتب فرمائیں؛ لیکن اُن میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی ضخیم اُردو شرح ''رحمۃ اللہ الواسعہ'' (۵؍ جلدیں) کو ممتاز مقام حاصل ہے حضرات اہل علم واقف ہیں کہ یہ کتاب (حجۃ اللہ البالغہ) اعلیٰ ترین علمی و فکری مضامین پر مشتمل ہونے کی وجہ سے عوام تو کجا؟ بڑے بڑے علماء کی گرفت سے بھی باہر سمجھی گئی ہے، اور

ہما شما کو تو اُس سے کما حقہ فائدہ اُٹھانے کا حوصلہ بھی نہ تھا، اور چوں کہ اس کے مضامین عموماً اِس طرح کے ہیں کہ اُنہیں حل کرنے کے لئے کوئی باقاعدہ کتاب بھی دستیاب نہ تھی، اِس لئے آج تک کسی نے اُس کی شرح کرنے کی بھی ہمت نہ کی تھی، مگر یہ عظیم سعادت اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لئے مقدر فرما رکھی تھی کہ آں موصوف نے اپنے اعلیٰ حکیمانہ علمی ذوق کا مظاہرہ فرماتے ہوئے نہایت جانفشانی کے ساتھ اِس عظیم اور بے نظیر خدمت کا بیڑا اُٹھایا، اور صرف ۵؍سال کے عرصے میں بڑی تختی کی ۵؍ضخیم جلدوں اور ۳۶۰۰؍صفحات میں اِس شرح کو مکمل فرمایا۔ بلاشبہ یہ دورِ حاضر کا عظیم ترین علمی کارنامہ ہے، اور فرزندانِ دارالعلوم دیوبند کی شاہکار خدمات میں سے ایک ہے۔ حضرت موصوفؒ نے علومِ ولی اللّٰہی کی تسہیل وتشریح فرما کر علماءِ حق پر ناقابلِ فراموش احسان فرمایا ہے، جسے برابر یاد رکھا جائے گا۔ اِس عقلیت پسندی کے دور میں ایسی کتابوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے تاکہ نت نئے پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کا بہتر انداز میں جواب دینے کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔

اِسی طرح آپ کی ''تفسیر ہدایت القرآن'' بھی عظیم کارنامہ ہے، جس میں بہت دل نشیں اَنداز میں قرآنی مضامین کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

علاوہ اَزیں بخاری شریف اور ترمذی شریف کے آپ کے درسی اِفادات: جنہیں آپ کی نگرانی اور سرپرستی میں آپ کے صاحب زادے جناب مولانا حسین احمد صاحب پالن پوری زید علمہ نے بالترتیب ''تحفۃ القاری'' (۱۱؍جلدیں) اور ''تحفۃ الالمعی'' (۸؍جلدیں) کے نام سے مرتب فرمایا، وہ بھی بڑی گراں قدر خدمت ہے، جس سے طلبہ اور اَساتذہ بھرپور فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو اِس کا بہترین بدلہ عطا فرمائیں، آمین۔

(۵) عالمانہ وقار:- حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ نے پوری زندگی مکمل عالمانہ شان کے ساتھ گذاری، اور جو علم اللہ تعالیٰ نے آپ کے سینے میں ودیعت فرمایا تھا، اُس کی پوری لاج رکھی۔ ایک واقعی عالم کی زندگی جیسی ہونی چاہئے، اُس کا نمونہ آپ کی حیات میں ہمیں نظر آتا تھا۔ کئی سال ہم لوگ حضرت کے مکان کے قریب دیوبند کے محلّہ ’’بیرونِ کوٹلہ‘‘ میں مقیم رہے، اور ایک ہی مسجد میں حضرت کے ساتھ نماز پڑھنے کی سعادت میسر آئی، اُس وقت حضرت اپنے دولت خانے سے پیدل دارالعلوم تشریف لے جاتے تھے، اکثر سر پر عمامہ اور اُس پر سفید رومال، جھکی ہوئی نظریں اور جو بھی سامنے نظر آئے اُس کو سلام کی ابتدا؛ یہ آپ کا خاص وصف تھا۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ کسی دوسرے کو آپ سے سلام میں سبقت کا موقع ملے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاص رعب بھی عطا فرمایا تھا، ہر ایک کو آپ سے بات کرنے کی بھی جلدی سے ہمت نہ ہوتی تھی، ہر روز عصر کے بعد آپ کی عام مجلس ہوتی، جس میں صرف علمی گفتگو اور نصیحت کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔

اکثر آپ طلبہ کو نصیحت فرماتے ہوئے اپنے اُستاذ گرامی حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایات کا خاص طور پر ذکر فرماتے تھے۔ ایک موقع پر فرمایا کہ:

> ’’میں جب پڑھانے کے لئے راندیر جانے لگا تو حضرت الاستاذ علامہ ابراہیم بلیاوی قدس سرہ سے میں نے نصیحت کی گذارش کی، حضرت نے کہا: مولوی صاحب صبح آئیو! میں صبح ۴ر بجے حاضر ہوا، حضرت نے کھڑے کھڑے معانقہ کیا اور کہا کہ: (۱) ’’فن دیکھ کر پڑھائیو علم آئے گا‘‘ یعنی فقہ پڑھانا ہے تو پورا فن دیکھو، اوپر بدائع اور شامی تک اور نیچے تعلیم الاسلام تک؛ کیوں کہ بعض اَوقات تعلیم الاسلام اور بہشتی زیور میں مسئلہ کی ایسی تعبیر مل جاتی ہے جسے ہم جھک مار کر بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ (۲) اور فرمایا کہ: ’’سنت کی پیروی کرنا تمہاری قدر بڑھے گی‘‘۔ (۳) اور فرمایا کہ: ’’طلبہ کو اپنی اولاد سمجھنا‘‘۔ (ندائے شاہی دسمبر ۲۰۰۳ء)

حضرت مفتی صاحبؒ اکثر فرماتے کہ: ’’یہ حضرتؒ کی انتہائی قیمتی نصیحتیں ہیں، جن سے مجھے بہت فائدہ پہنچا، میں حضرتؒ کا احسان نہیں بھول سکتا‘‘۔

اِسی طرح استغناء اور خودداری بھی آپ کی سرشت میں داخل تھی۔ بار بار فرماتے تھے کہ: ”کسی بھی شخص کو ”عبدالدینار والدرہم“ (روپیہ پیسہ کا غلام) نہیں بننا چاہئے، حدیث میں بھی اِس کی ممانعت وارد ہے“۔

آپ کی خواہش یہ رہتی تھی کہ مدارس کے فضلاء زندگی بھر علمی مشغلے ہی میں لگے رہیں اور اپنی مصروفیات کو تبدیل نہ کریں۔ کئی مرتبہ آپ کے سامنے ایسے عصری اِداروں کا تذکرہ ہوا، جن میں فارغین مدارس کے لئے عصری تعلیم کی سہولیات فراہم کی گئی تھیں، تو آپ فرماتے تھے کہ: ”مدارس میں پڑھنے والے اعلیٰ ذہن کے طلبہ اگر ایسے اِداروں کی طرف متوجہ ہوں گے تو دین کی ضرورتیں کیسے پوری ہوں گی؟ اِس لئے کہ عصری تعلیم کے بعد معمولی دینی خدمت پر قائم رہنا آدمی کے لئے بہت مشکل ہوتا ہے“۔

(٦) مسلک پر تصلب:- حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ اپنے فقہی مسلک یعنی فقہ حنفی پر پوری ثبات قدمی کے ساتھ قائم رہے اور کسی بھی مسئلے میں فقہی جزئیات واُصول سے اعراض آپ کو گوارا نہ تھا۔ اِسی طرح اکابر علماء دیوبند کے نظریات وافکار پر بھی آپ کی گہری نظر تھی اور اپنی دانست میں اُن سے سرمو انحراف بھی آپ کو منظور نہ تھا۔

آپ فرقِ باطلہ سے کبھی بھی مرعوب نہیں ہوئے؛ بلکہ جب بھی اِس موضوع پر گفتگو فرماتے، تو پورے اعتماد کے ساتھ مضبوط گفتگو کرتے تھے اور اِس بارے میں کسی کی اچھائی یا برائی کی کوئی پروا نہیں فرماتے تھے اور اپنے تلامذہ کا بھی یہی ذہن بناتے تھے کہ وہ حق پر قائم رہیں اور اکابر کے نقشِ قدم پر ثابت قدم رہیں اور اِس سلسلے میں جہاں کوئی کوتاہی دیکھتے تو بروقت تنبیہ بھی فرماتے تھے۔

آزاد رَوی اور سلفِ صالحین کے منہج سے دوری کو آپ ساری خرابی کی بنیاد سمجھتے تھے۔ اِسی وجہ سے مولانا مودودی کے افکار ونظریات اور غیر مقلدین کی حرکتوں پر آپ سخت نکیر فرمایا کرتے تھے۔ آپ کا واضح موقف یہ تھا کہ یہ کج فکری آدمی کو اہل السنہ والجماعہ کے

دائرے سے خارج کر دیتی ہے۔ ایک مرتبہ جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام حضرت فدائے ملت مولانا سید اسعد صاحب مدنیؒ کی صدارت میں دہلی میں ''تحفظ سنت کانفرنس'' منعقد ہوئی، تو حضرت مفتی صاحبؒ نے اُس میں جامع اور مختصر خطاب کرتے ہوئے عدمِ تقلید کی خطرناکی کو واضح فرمایا، یہ خطاب ایسا مؤثر تھا کہ اُسے کانفرنس کا خلاصہ اور ماحصل سمجھا گیا۔

(۷) خورد نوازی:- حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک خاص صفت یہ بھی تھی کہ آپ اپنے اصاغر اور تلامذہ کی زبانی اور تحریری طور پر بہت حوصلہ افزائی فرماتے تھے جس کی وجہ سے لوگوں کو آگے بڑھنے کا حوصلہ ملتا تھا۔ جب بھی آپ کو اپنے کسی شاگرد کی علمی و دینی خدمات کا علم ہوتا، تو آپ نہایت مسرت اور خوشی کا اظہار فرماتے اور دعاؤں سے نوازا کرتے تھے۔

دورانِ سفر آپ کا ساتھیوں کے ساتھ بہت ہی بے تکلفی کا معاملہ رہتا تھا، جس کی وجہ سے سفر میں کوئی کلفت نہ ہوتی تھی۔ اِس ناکارہ کو بھی متعدد مواقع پر آپ کے ساتھ سفر کی سعادت حاصل ہوئی۔ ایک مرتبہ ممبئی میں ''مدرسہ معراج العلوم چیتا کیمپ'' کا اجلاس تھا اور حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مقررین میں حضرت مولانا شوکت علی صاحب بستوی اُستاذ دارالعلوم دیوبند اور اِس ناکارہ کا بھی نام شامل تھا، جب ہم لوگ مدرسہ سے جلسہ گاہ کے لئے روانہ ہونے لگے، تو گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہم دونوں کو ایک کنارے لے گئے اور فرمایا کہ: ''بے خوف ہو کر تقریر کرنا، میرے لحاظ میں تقریر میں کوئی کمی نہ کرنا''۔ ظاہر ہے کہ حضرت کے سامنے لب کشائی کوئی آسان کام نہ تھا؛ لیکن حضرتؒ نے ہمت بندھائی، چناں چہ جلسہ میں ڈرتے ڈرتے ایک مختصر حدیث کا ترجمہ پیش کیا گیا، پھر بعد میں جب حضرتؒ کا بیان ہوا، تو آپ نے بھی اُنہیں باتوں کا حوالہ دیا، یہ خورد نوازی نہیں تو اور کیا ہے؟

آپ نے احقر کی متعدد تالیفات پر بہت ہی حوصلہ افزا تحریرات لکھیں۔ احقر کا

ایک مضمون ’’ایک جامع قرآنی وعظ‘‘ کے نام سے ’’ندائے شاہی‘‘ میں ۲۷؍ قسطوں میں شائع ہوا، پھر بعد میں اُس کو کتابی شکل دی گئی، تو حیدرآباد کے فقہی اجتماع سے واپسی میں ہوائی جہاز میں احقر نے حضرت کی خدمت میں اُس کا مسودہ برائے ملاحظہ پیش کیا، حضرتؒ نے پورے مسودے پر سرسری نظر ڈالی، اور پوچھا کہ: ’’یہ ایک ہی آیت: ﴿اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ﴾ ...... الخ سے مربوط مضمون ہے؟‘‘ جب احقر نے اِثبات میں جواب دیا، تو بہت مسرت کا اظہار فرمایا اور دیوبند واپسی کے بعد ایک دعائیہ تحریر ’’آیتِ قرآنی پر سلمانی وعظ‘‘ کے نام سے اِرسال فرمائی، جسے پڑھ کر خود احقر کو شرم آ گئی اور فون پر عرض کیا کہ: ’’حضرت کا یہ حسن ظن ہمارے لئے بہت بڑی سعادت کی بات ہے‘‘۔ حضرت نے بہت دعائیں دیں اور خوشی کا اظہار فرمایا۔

آپ ’’ندائے شاہی‘‘ کا اہتمام سے مطالعہ فرماتے تھے اور ملاقات پر مضامین کے بارے میں تذکرہ اور تبصرہ بھی فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ: ’’میں ندائے شاہی کے وفیات کا کالم ضرور پڑھتا ہوں، جس سے بہت سے حضرات کی وفات کے بارے میں علم ہوجاتا ہے اور اُن کے لئے دعاء خیر کرنے کا موقع ملتا ہے‘‘۔

تحفظ ختم نبوت

۱۹۸۶ء میں دارالعلوم دیوبند میں جب ’’عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت‘‘ قائم ہوئی، تو آپ کو اُس کا ناظم اعلیٰ بنایا گیا، جب کہ والد محترم حضرت اقدس مولانا قاری سید محمد عثمان صاحب منصورپوری دامت برکاتہم ناظم بنائے گئے۔ تو حضرت والد صاحب مدظلہ کی اَنتھک محنت اور دلچسپی اور حضرت مفتی صاحبؒ کی مشاورت سے الحمد للہ ’’تحفظ ختم نبوت‘‘ کا کام پورے ملک میں حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا گیا اور افراد سازی کے لئے جابجا تربیتی کیمپوں کا انعقاد ہوا، جن میں حسبِ موقع حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ بھی تشریف لے جاتے اور ’’ردِ مرزائیت‘‘ کے موضوع پر اپنے مخصوص انداز میں مدلل اور مؤثر گفتگو فرمایا

کرتے تھے۔ اِس سلسلے کی آپ کی بعض تقریریں شائع بھی ہو چکی ہیں۔

فقہی اجتماعات میں شرکت

جمعیۃ علماء ہند کے ''اِدارۃ المباحث الفقہیہ'' کے اِجتماعات میں بھی اکثر آپ اہتمام سے از اول تا آخر پوری دلچسپی کے ساتھ شرکت فرمایا کرتے تھے۔ تمام مقالات اور بحثوں کی سماعت فرماتے اور اپنے علم اور رائے کی روشنی میں اُن پر تبصرے بھی فرماتے تھے بہت سی مرتبہ رائے کا اختلاف بھی ہوتا تھا اور بسا اَوقات آپ کے تلامذہ آپ کے سامنے مخالف دلائل بھی پیش کرتے تھے؛ لیکن اکثر آپ اپنی رائے پر ثابت قدم رہتے اور اختلافِ رائے کے باوجود کسی کی بات کا برا نہیں مانتے تھے۔

ایک مرتبہ احقر دولت خانہ پر حاضر ہوا، تو دورانِ گفتگو اِرشاد فرمایا کہ: ''عالم اور جاہل میں یہی فرق ہے کہ جاہل شخص اختلافِ رائے کی وجہ سے تعلقات ختم کرلیتا ہے، جب کہ عالم دلائل کی روشنی میں اختلاف کو اختلاف تک رکھتا ہے، اُس سے قدیم تعلقات پر فرق نہیں آنے دیتا''۔

بلاشبہ حضرت کا یہ اِرشاد ایک روشن نصیحت ہے، جسے ہمیں پیش نظر رکھنا چاہئے۔

آپ کا عام طور پر مدرسہ وغیرہ کے جلسوں میں شرکت کا معمول نہ تھا؛ لیکن تلامذہ یا ہم عصر علماء کے اصرار پر بعض جلسوں میں تشریف لے جاتے تھے۔ کئی سال تک مرادآباد میں شہری جمعیۃ کی طرف سے منعقد ہونے والی سالانہ ''سیرت خاتم النبیین ﷺ کانفرنس'' میں تشریف لاکر گراں قدر ملفوظات سے نوازتے رہے۔

آپ سالوں سے شعبان کے اَواخر میں بیرونِ ملک (لندن، کنیڈا اور امریکہ) کے طویل سفر پر تشریف لے جاتے اور وہاں مختلف شہروں میں حضرت کا قیام رہتا اور علمی واصلاحی اِفادات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اکثر اِس سفر سے شوال کے اخیر میں واپسی ہوتی

تھی، اِس ذریعہ سے آپ کا فیض ملکوں ملکوں تک پہنچ رہا تھا۔

علالت اور وفات

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحت اگرچہ عام طور پر بہتر رہی؛ تاہم ایک عرصہ سے شوگر کا مرض تھا، اور ''انسولین'' استعمال فرماتے تھے۔ چند سال قبل قلب کے عارضہ کی وجہ سے آپریشن کی نوبت بھی آئی، اُس کے بعد طبیعت بحال ہوگئی؛ البتہ چند سالوں سے سماعت پر معمولی اثر تھا، جو اکثر محسوس نہ ہوتا تھا، اِسی کے ساتھ کبھی کبھار زبان الفاظ کا ساتھ نہ دیتی تھی۔

اِسی طرح کا واقعہ اِس سال رجب کے وسط میں بخاری شریف کے ختم پر دارالحدیث میں پیش آیا کہ آپ کوشش کے باوجود ختم پر کوئی کلام نہ فرما سکے اور یہ کہہ کر تشریف لے آئے کہ ''اَب جو اللہ چاہے گا وہی ہوگا''۔ یہ منظر دیکھ کر طلبہ میں ہیجان اور گریہ وزاری کا عالم برپا ہوگیا اور جس نے بھی اِس واقعہ کو سنا وہ تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ اگلے دن آپ علاج کے لئے ممبئی تشریف لے گئے، اللہ تعالیٰ نے صحت عطا فرمائی اور وہ کیفیت جلد ہی ختم ہوگئی لیکن چوں کہ ۲۴؍ مارچ ۲۰۲۰ء سے پورے ملک میں ''لاک ڈاؤن'' نافذ ہوگیا تھا، اِس لئے آپ واپس دیوبند تشریف نہ لا سکے۔ اِسی دوران رمضان المبارک کا مہینہ آ گیا، تو متعلقین نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے آپ سے علمی اِستفادے کی درخواست کی، جسے آپ نے قبول کرلیا اور ہر دن تراویح کے بعد آپ کے آن لائن بیانات اور سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوا، جو ۱۵؍ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ تک جاری رہا۔ جس میں بہت سی قیمتی باتیں آپ نے اِرشاد فرمائی، جو یوٹیوب پر محفوظ ہیں۔

اس کے بعد آپ کو شدید بخار آیا، مرض کی زیادتی پر ''ملاڈ اسپتال'' میں داخل کیا گیا، اَولاً طبیعت میں کافی سدھار تھا؛ لیکن دو دن قبل یعنی ۲۳؍ رمضان المبارک کو اَچانک حالت تشویش ناک ہوگئی، اور گہری نیند کی کیفیت طاری ہوگئی، ڈاکٹروں نے پھیپھڑوں میں

انفیکشن تجویز کیا۔

بالآخر اسی حالت میں ۲۵ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹ مئی ۲۰۲۰ء بروز منگل کو صبح آپ نے داعئ اجل کو لبیک کہا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اسپتال میں ہی آپ کو غسل وکفن دیا گیا اور قریبی مسجد کے میدان میں آپ کے صاحبزادے مولانا عبدالوحید صاحب مدظلہ کی اقتداء میں آپ کی نماز جنازہ اَدا کی گئی، اور شام کو عصر کے بعد جوگیشوری ویسٹ کے عام مسلم قبرستان میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درجات بے حد بلند فرمائیں اُمت کو آپ کے نعم البدل سے نوازیں اور آپ کی خدمات کا بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائیں متعلقین کو صبر جمیل سے نوازیں اور ہم سب کو آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں آمین ثم آمین۔

◆

حضرت استاذ محترم مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کے نزدیک

وقت کی اہمیت

مولانا توحید عالم قاسمی بجنوری..............استاذ دارالعلوم دیوبند

سلطان العلماء، استاذ الاساتذہ، حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ صدر المدرسین وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی وفات کا عظیم سانحہ ملت اسلامیہ کے لئے ایک ایسا عظیم خسارہ اور نقصان ہے جس کی تلافی بڑی مشکل ہے، بالخصوص مادر علمی دارالعلوم دیوبند اور ابناء دارالعلوم دیوبند کے لئے ایسا گہرا زخم ہے جس کے علاج ومعالجہ کے لئے ایک مدتِ دراز درکار ہے اور اس زخم کے بھرنے میں ایک لمبا عرصہ لگ جائے گا۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

الغرض حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کی وفات حسرت آیات خود حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کے لئے تو باعث صد افتخار وسعادت ہے کیوں کہ مہینہ بھی ایسا مبارک جس میں دوزخ کے دروازے بند اور بہشت کے دروازے وا ہو جاتے ہیں اور اس مبارک ماہ میں وصال نصیب وروں کو میسر ہوتا ہے، حالت بھی سفر اور غربت کی جس میں انتقال کرنا شہادت کا درجہ رکھتا ہے، بیماری بھی وہ جس سے شہادت کا رتبہ نصیب ہوتا ہے اور سب سے فائق اور بڑھی ہوئی جو چیز راقم کو متاثر کرتی ہے وہ ہے آخری ایام اور اوقات قرآن وسنت اور دین و مذہب کی ترویج واشاعت میں مصروف رہنا جو تمام اللہ والوں کی آرزو اور تمنا رہتی ہے۔

ان سب کے باوصف گرامی قدر حضرت اقدس استاذ محترم قدہ سرہٗ کا وصال حضرت الاستاذ کے خوشہ چینوں، روحانی ونسبی اولاد اور اہل تعلق وارادت کے لئے بڑا المناک اور دردناک حادثۂ فاجعہ ثابت ہوا ہے۔ ہر ایک اپنے کو ایسا محسوس کر رہا ہے جیسے بس یتیم و بے سہارا ہو گیا

ہے، اب علمی وفکری سر پرستی کون کرےگا؟ ہر میدان میں اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلک ومنہج کی بے لاگ اور بلاخوف وخطر ترجمانی کون کرے گا؟ باطل کے سامنے مردِ میدان بن کر کون کھڑا ہوگا؟ وغیرہ۔

خیر دین ومذہب اور قرآن وسنت کی حفاظت خود خالق کائنات کرتے ہیں اور خود انہوں نے اس کا ذمہ لیا ہے، اس لئے افراد وشخصیات کو کھڑا کرنا اللہ کا کام ہے اور ان شاء اللہ تا قیامت ایسی شخصیات آتی رہیں گی۔ بس ہم جیسے کمزور انسانوں کو ایسا لگتا ہے جیسے یہ خلا اب پر ہونا ناممکن ہے؛ جب کہ خود حضرت الاستاذ قدس سرہٗ ایسا جملہ کہنے اور ایسی بات زبان سے نکالنے پر ناراض ہوتے تھے اور اپنی عادت کے عین مطابق برملا ٹوکتے تھے کہ ایسا مت کہو! اللہ تعالیٰ اہل علم وفضل کو وفات دیتے رہتے ہیں اور دنیا کا کام بھی چلتا ہی رہتا ہے۔

قلم کے شہسوار اور اس میدان کے تجربہ کار حضرات اس موقع پر بہت کچھ لکھ رہے ہیں اور لکھیں گے اور ہر ہر پہلو پر ارباب بصیرت کی نگاہ ہے، وہ حق ادا فرمائیں گے، حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کی ہمہ جہت اور جامع کمالات ذات کے لئے ضخیم کتابیں وجود میں آنے کی توقع ہے؛ لیکن میرے جیسے کم لکھنے والوں کو بھی دشواری پیش آرہی ہے اور بڑی دقت درپیش ہے کہ کیا لکھا جائے؟ اور کیا نہ لکھا جائے؟ کیوں کہ ارباب قلم نے تمام گوشوں اور شوشوں کا حق ادا کر دیا ہوگا؛ لیکن پھر بھی حقِ شاگردی اور ادنی تعلق بھی کچھ نہ کچھ لکھنے پر مجبور کر رہا ہے اور راقم السطور حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کی حیات وزندگی کے قابلِ تقلید پہلوؤں اور روشن اوصاف وکمالات جیسے درس وتدریس اور افہام وتفہیم کا نرالا انداز، وعظ ونصیحت اور بیان و تقریر کا دلچسپ اسلوب، تصنیف وتالیف کی گراں قدر خدمات، اہل حق اور اہل السنۃ والجماعۃ کی سب سے معتبر تعبیر علماء دیوبند کے مسلک ومنہج کی بلاخوف وخطر ترجمانی اور بلاکسی رورعایت کے حق گوئی وغیرہ کو بہ نظر غائر دیکھتا ہے تو ان تمام میں وہ پہلو جو سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے وہ ہے وقت کی قدر ومنزلت، اس کی حفاظت اور پھر اس کا صحیح استعمال اور یہ وصف وخوبی حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کی زندگی کے ہر دور میں نمایاں رہی ہے، ایسا نہیں

ہے کہ حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ نے بالغ النظر، کامل العقل ہونے کے بعد متاعِ وقت کی اہمیت کو سمجھا ہو؛ بلکہ آپ کی زندگی کا ہر دور خواہ بچپن ہو یا جوانی، کہولت ہو یا بڑھاپا، ہر دور میں آپ اس وصف سے متصف نظر آتے ہیں۔ آپ قدس سرہٗ کے طالب علمی ہی کے دور سے یہ وصفِ محمود آپ کی زندگی کا جزو لاینفک بن چکا تھا۔

واقف کار حضرات اور حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کی ادنی معرفت رکھنے والے بھی اتنا تو جانتے ہی ہیں کہ حضرت نے اپنی جوانی سے اخیر وقت تک وقت کو ضائع کرنے سے حد درجہ گریز فرمایا ہے، اسی لئے درس وتدریس کی مشغولیت کے باوصف دورِ حاضر میں تصنیف و تالیف میں آپ اپنے معاصرین میں نمایاں ہیں، چھوٹی بڑی پچاس کے قریب کتابیں آپ کے قلم گہر بار کا نتیجہ ہیں جن میں چند بڑی ضخیم ونمایاں ہیں مثلاً (۱) رحمۃ اللہ الواسعہ شرح اردو حجۃ اللہ البالغہ پانچ جلدیں، (۲) ہدایت القرآن اردو زبان میں قرآن کریم کی تفسیر آٹھ جلدیں (۳) تحفۃ الالمعی شرح اردو سنن ترمذی شریف چھ جلدوں میں (۴) تحفۃ القاری شرح اردو بخاری شریف بارہ جلدیں (۵) امداد الفتاویٰ کی چھ جلدوں پر حاشیہ (۶) فتاویٰ دار العلوم کی ترتیب جدید پر آخری عمیق نظر اور حواشی (۷) تسہیل بیان القرآن پر نظر ثانی وغیرہ۔

یہ تو آپ کی جوانی اور بڑھاپے کی خدمات ہیں جن سے اخیر اور وسط زندگی میں ضیاعِ وقت سے پرہیز واضح ہوتا ہے اور طالب علمی میں وقت کی حفاظت حضرت کیسے فرماتے تھے اس کا اندازہ دو واقعات سے ہوتا ہے جو نہایت باوثوق اور معتبر شخصیات کے واسطے سے پہنچے ہیں۔

(۱) مخدوم گرامی، میر کارواں حضرت اقدس مفتی ابو القاسم صاحب نعمانی دامت برکاتہم مہتمم دار العلوم دیوبند بیان فرماتے ہیں (راقم نے حضرت سے کئی دفعہ یہ واقعہ سنا ہے) کہ مفتی سعید احمد صاحب کا کمرہ صدر دروازہ کے باہر والا تھا جو آج کل شعبۂ صفائی کا دفتر ہے اور میرا کمرہ اس کے اوپر تھا مفتی صاحب کا افتا تھا میں ابتدائی جماعت میں تھا، سہ ماہی یا ششماہی امتحان سے فراغت کے بعد مفتی سعید احمد صاحب نے فرمایا کہ ابو القاسم آؤ آج دار جدید کی طرف چلتے ہیں شوال سے ادھر جانا نہیں ہوا۔

واضح رہے کہ تکمیل افتا کے اسباق دارالافتا میں ہوا کرتے تھے، لہذا مولسری پار کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ درسگاہ، مسجد اور مطبخ سب ضرورتیں صدر دروازے کی طرف ہی تھیں اب اندازہ لگائیں دارالعلوم میں رہتے ہوئے دارجدید دیکھے ہوئے کئی ماہ گزر گئے یہ وقت کی کس قدر حفاظت ہے۔

(۲) استاذ گرامی حضرت اقدس مفتی محمد امین صاحب پالن پوری دامت برکاتہم استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند بیان فرماتے ہیں کہ بھائی صاحب دارالافتاء کے سال مجھے حفظ قرآن کریم کے لئے دیوبند لے آئے تھے اور میرا سبق، سبق کا پارہ اور آموختہ پارہ خود سنا کرتے تھے اسی میں محسوس فرمایا کہ حفظ سننے کے لئے سننے والے کا بھی حافظ ہونا ضروری ہے لہذا خود حفظِ قرآن کریم شروع فرمادیا اور ایک بھائی ساتھ تھے ان کو نحو وصرف وغیرہ کی کتابیں پڑھاتے تھے، نیز تین اساتذہ کرام حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی قدس سرہٗ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند، حضرت مفتی مہدی حسن صاحب قدس سرہٗ مفتی دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا عبدالوہاب محمود مصری قدس سرہٗ استاذ دارالعلوم دیوبند کی مستقل خدمت کرنا بھی بھائی صاحب کا عمل تھا۔ اب اندازہ لگائیں افتاء کے اسباق کا مطالعہ، تمرینی فتاویٰ، میرا سبق، سبق کا پارہ اور آموختہ پارہ سننا اپنا حفظ قرآن کرنا، دوسرے بھائی کو کتابیں پڑھانا اور سننا اور تین تین اساتذہ کرام کی خدمات بجالانا یہ سب وقت ضائع کرنے کے ساتھ ممکن ہی نہیں ہے؛ بلکہ وقت کی قدر اور اہمیت کا ادراک کر کے اس کی حفاظت اور صحیح استعمال کے ساتھ ہی ممکن ہے۔

اس لئے تمام خردوں اور خوشہ چینوں کو حضرت اقدس استاذ محترم قدس سرہٗ کے تمام اوصاف کو اور بالخصوص اس اہم خوبی اور وصف کو اپنانے کی ضرورت ہے اور یہ بھی حضرت والا قدس سرہٗ کو سچا خراج تحسین ہے

اللہ تعالیٰ استاذ گرامی قدس سرہٗ کی بال بال مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے، تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ہم تمام شاگردوں اور ارادت مندوں کو آپ کے اوصاف اختیار کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین!

استاذنا حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

ڈاکٹر مولانا اسجد قاسمی ندوی

مہتمم وشیخ الحدیث جامعہ عربیہ مرادآباد

اس دور قحط الرجال میں بالعموم یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ علمی مسندیں مسند نشین اہل علم وتحقیق کے لئے عظمت ووقار اور وجاہت ومقبولیت کا باعث ہوتی ہیں، ایسا خال خال اور شاذونادر ہی ہوتا ہے کہ مسند نشین شخصیت علم وفضل کے حوالے سے اتنی باوزن اور باعظمت ہو کہ وہ بجائے خود مسندِ علمی کے وقار کو چار چاند لگادے اور اس کے دم سے اس مسند کا وقار واعتبار قائم وباقی رہ جائے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

استاذنا حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ انہیں نابغۂ روزگار اور عظیم شخصیات میں تھے، بلکہ بے جانہ ہوگا اگر کہا جائے کہ متنوع کمالات کی جامعیت، علمی رسوخ اور عملی صلاح، انہماک اور انضباط اوقات، بے مثال اور منفرد انداز تفہیم وطرز تدریس اور حق گوئی کی جرأت وقوت کے حوالے سے ان کی ذات گرامی موجودہ علمی افق پر ''بدر مبین اور ماہِ کامل'' کا مقام رکھتی تھی۔

وَلَیْسَ عَلَی اللّٰہِ بِمُسْتَنْکِرٍ
أَنْ یَجْمَعَ الْعَالَمَ فِیْ وَاحِدِ

حضرت کے امتیازات وخصوصیات کا ذکر ایک مختصر مضمون میں کیا ہی نہیں جاسکتا اس کے لئے مبسوط کتاب درکار ہے، ان سطور کے حقیر راقم نے ان کی شخصیت میں جو سب

سے بنیادی اور نمایاں کمالات وامتیازات دیکھے اور محسوس کیے، ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں وہی قارئین کی نذر ہیں۔

(۱) علمی جلال ووقار

اللہ رب العزت نے حضرت کو متانت، وقار اور وجاہت کا ایسا پیکر مجسم بنایا تھا کہ ہر چھوٹے بڑے پر آپ کے علمی جلال اور عظمت کی ہیبت اور رعب ضرور طاری ہوتا تھا اوصاف نبوت میں یہ مذکور ہے:

مَنْ رَآهُ بَدِيْهَةً هَابَهُ وَمَنْ خَالَطَهُ مَعْرِفَةً أَحَبَّهُ.

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو اچانک ملتا تھا اس پر آپ کی ہیبت طاری ہو جاتی اور جو شناسائی کے ساتھ ملتا جلتا تھا وہ آپ کا گرویدہ بن جاتا تھا۔

ان اوصاف کی تجسیم حضرت مفتی صاحب کی ذات میں خوب خوب نظر آتی تھی اول وہلہ میں ہر ملنے اور آنے والا مرعوب ہو ہی جاتا تھا، مگر بار بار کی ملاقاتوں اور رفاقت اور مصاحبت کے بعد کیفیت یہ ہوتی تھی کہ حضرت اپنی سادگی، بے تکلفی، خورد نوازی اور وسعت ظرفی سے اپنی محبت کا اسیر اور اپنا گرویدہ بنا دیتے تھے، اس کا تجربہ ان کے تلامذہ اور خوردوں کو بار بار ہوتا تھا، اور ہر مرتبہ دل ان کی عقیدت سے لبریز اور دماغ ان کی عظمت ورفعت کے آگے خمیدہ ہو جاتے تھے۔

ان سطور کے حقیر راقم کو بھی ربع صدی تک حضرت سے وابستگی کی سعادت میسر رہی، اس دورانیے میں پہلا سال (دورۂ حدیث کا سال) باضابطہ تلمذ اور باقی اوقات مسلسل (براہ راست بھی، ٹیلی فونک رابطے کے ذریعہ بھی اور حضرت کی بلند پایہ تالیفات کے واسطے سے بھی) استفادہ واستفاضہ کا شرف حاصل رہا، حضر میں بار بار اور سفر میں گاہے گاہے ملاقات، زیارت، خدمت میں حاضری اور مقالات، مضامین، کتب اور تراجم پر نظر ثانی اور اصلاح کے عنوان سے دیر دیر تک علمی مجالست کے علاوہ متعدد بار طویل اسفار میں کئی کئی دنوں تک خادمانہ رفاقت کا زریں موقعہ دستیاب ہوا، اور ہر بار حضرت کی شفقت وعنایت، سادہ

مزاجی، بے تکلفی، اپنائیت، مربیانہ وناصحانہ اصلاح، علمی نکتہ آفرینی، ہمت افزائی اور ترغیب و تشویق جیسی خصوصیات کا خوب خوب تجربہ ہوتا رہا۔

جلال و جمال یا یوں کہئے کہ وقار ومتانت اور بے تکلفی واپنائیت کا یہ خوب صورت امتزاج (جو بہ ظاہر دھوپ اور چھاؤں کا سہانا منظر رکھتا ہے) حضرت کی حیات وسیرت کا بے انتہا امتیازی گوشہ ہے اور اسی کا نتیجہ ہوتا تھا کہ ان کے تلامذہ، مستفیدین اور زائرین کے دل بیک وقت ان کی عظمت اور محبت دونوں سے آباد وسرشار رہا کرتے تھے، کسی شخصیت میں محبوبیت اور عظمت دونوں کا اجتماع خاص انعام الٰہی ہوتا ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست...... تانہ بخشد خدائے بخشندہ

(۲) تشجیع اور خورد نوازی

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو لوگ بڑے اور باعظمت ہوتے ہیں، اپنی ذات کے حصار میں بند ہو جاتے ہیں، پھر ان کی مصروفیت اور مزاج کی ساخت دونوں انہیں دوسروں سے فاصلے کا عادی بنا دیتے ہیں، مگر حضرت مفتی صاحبؒ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا، ان کا حال تو ''باہمہ اور بے ہمہ'' دونوں کا جامع اور انداز ع ''شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق'' ہوتا تھا۔

ان کی بے پناہ مصروفیات ایک طرف کہ دم لینے کی بھی فرصت نہ تھی، مگر خوردوں کے ساتھ تشجیع، ہمت وحوصلہ افزائی، اصلاح وتشویق اور ترغیب وتحریض کا سلسلہ بھی جاری رہا کرتا تھا اور یہ کبھی کبھار کا نہیں روزمرہ کا معمول تھا، چھوٹوں کو آگے بڑھانا، انہیں آگے جانے کے ہنر بتانا، انگلی پکڑ کے انہیں راہ سجھا دینا، بے تکلف اپنے تجربات سے آگاہ کر دینا اور ان کی نقائص سے لبریز کاوشوں کی تحسین کر کے ان کا دل بڑھا دینا اور حوصلہ جما دینا حضرت کی ادائے دل نواز اور خوئے نادر مثال تھی۔

اس حوالے سے اس حقیر کو اپنے ذاتی متعدد تجربات لوح دماغ پر تازہ نظر آ رہے ہیں، اس حقیر کو دورۂ حدیث کے سال میں حضرت سے جامع ترمذی اول اور شرح معانی

الآثار پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے، ترمذی میں امتحان سالانہ میں حضرت کے قلم سے مجھے پورے ۵۰/نمبر حاصل ہوئے، اس سال دورۂ حدیث کی جماعت میں ترمذی میں اتنے نمبر حاصل کرنے والا اتفاق سے تنہا میں ہی تھا، آئندہ شوال میں جب حضرت کی خدمت میں حاضری ہوئی تو حضرت نے ہر ہر کتاب کے نمبرات دریافت کئے، میں نے ترمذی کا نمبر ذکر کیا تو حضرت چونکے اور فرمایا: وہ تمہاری کاپی تھی؟ پھر کچھ توقف کے بعد بولے: تم نے جوابات بہت سلیقے سے لکھے ہیں، ترتیب بھی اچھی ہے، عربی بھی اچھی ہے، تحریر بھی مناسب ہے جسے اور بہتر بنانا چاہئے، ماشاء اللہ: تمہاری کاپی نمایاں تھی، اسی لئے تم کو پورے نمبر ملے اب تم کو میری طرف سے انعام بھی ملنا چاہئے، پھر حضرت نے کچھ نقد اور کچھ کتابیں انعام کے طور پر عنایت فرمائیں۔ ایک حقیر طالب علم کی کاپی اور انداز کیا، من آنم کہ من دانم، مگر اس واقعے سے حضرت کی خوردنوازی اور تشجیع کی ادا بہت نمایاں ہوتی ہے۔

احقر نے دارالعلوم سے فراغت کے بعد ندوۃ العلماء میں تخصص ادب عربی میں داخلہ لیا، ابتدائی مرحلے میں اردو سے عربی اور عربی سے اردو میں بہت چیزیں منتقل کیں، اخباری تراشوں کے بجائے میں نے اپنے اکابر اور اساتذہ کے افادات کی تعریب پر خاص توجہ رکھی چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کی مایہ ناز کتاب ''علوم القرآن'' کا عربی ترجمہ کیا جو استاذ گرامی حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی صاحب دامت برکاتہم نے ازراہِ شفقت ''البعث الاسلامی'' میں مکمل بالاقساط اپنی اصلاح کے بعد شائع فرمایا۔

حضرت الاستاذ مفتی صاحبؒ کا ایک رسالہ ''فقہ حنفی اقرب الی النصوص ہے'' مجھے بے حد پسند آیا، میں نے لگے ہاتھوں اس کا بھی ترجمہ کر دیا جو دارالعلوم الاسلامیہ بستی کے عربی ترجمان ''النہضۃ الإسلامیۃ'' اور جامعہ عربیہ امدادیہ مرادآباد کے عربی آرگن ''الحرم'' میں طبع ہوا اس کے بعد سفرِ دیوبند کے موقع سے ناشتے کے وقت حضرت کی اجازت سے درِ دولت پر حاضری ہوئی اور یہ مضمون ''ہدیۂ مور پیش سلیماں'' کے طور پر پیش کیا، تو حضرت نے دسیوں صفحات کا یہ مضمون اسی مجلس میں مکمل پڑھا اور پھر فرمایا: ''ماشاء اللہ: تمہاری عربی سلیس ہے

مشق خوب جاری رکھو، اور ''زوائد'' کے بجائے اس طرح کی علمی چیزوں کا ترجمہ کرتے رہو''۔

حضرت کے ان کلمات سے اور پھر دعائیہ جملوں سے دیر تک احقر پر سرشاری اور بے حد فرحت وانبساط کی کیفیات طاری رہیں۔

کرناٹک کے ایک سفر میں کئی دن حضرت کے ساتھ رہنے کی سعادت میسر آئی یہ سفر ''تحفظ شریعت'' کی ایک کانفرنس کے لئے تھا جس میں کئی نشستیں صرف علماء کرام کی موضوعاتی تربیت کے لئے اور ایک نشست عوامی اجلاس کی تھی، حسن اتفاق سے منتظمین اجلاس نے احقر کی قیام گاہ کا نظم حضرت کی جائے قیام سے بالکل متصل کیا تھا، اس موقع پر انفرادی نشستوں، اجتماعی مجلسوں، خطابات ومحاضرات میں مکمل شرکت کے ساتھ، دسترخوان پر ہم طعامی کا شرف بھی حاصل ہوا اور سچی بات یہ ہے کہ بہت کچھ سیکھنے کو ملا اور حضرت کی بلند نگاہی اور سادہ مزاجی کے نقوش ذہن ودماغ پر مرتسم ہوئے، علمی محاضرات کے سلسلے میں جو عنوان اس حقیر سے متعلق کیا گیا تھا، اس پر میں نے بالارادہ اور منتظمین سے گذارش کر کے ترتیب یہ رکھی تھی کہ میری ٹوٹی پھوٹی گفتگو حضرت کی استراحت کے اوقات میں ہو، مگر اجلاس عام میں احقر کو بڑی آزمائش کا سامنا ہوا، حضرت شروع میں ہی اسٹیج پر تشریف لے آئے کلیدی خطاب آخر میں آپ کا ہی ہونا تھا، احقر کو ''اصحاب رسول کی علمی وعملی عظمت اور اس سلسلے میں امت سے شریعت کے مطالبات'' پر چالیس منٹ خطاب کرنا تھا، بالآخر خدا خدا کر کے یہ مرحلہ تمام ہوا، میری بے ربط اور ناقص گفتگو جاری تھی اور حضرت میری طرف مکمل متوجہ اس صورت حال نے مجھے ''آزمائش در آزمائش'' سے دوچار کر دیا تھا، چونکہ مجمع میں ایک بڑا طبقہ ان افراد کا بھی تھا جن کے ہاں متعدد معتبر احادیث کو بھی ''ضعیف'' کے خانے میں ڈال دینے کا مزاج نمایاں ہوتا ہے، اس لئے ان کی رعایت بھی احقر نے ملحوظ رکھی تھی اور عظمت صحابہ کے اثبات کے لئے خطبہ میں بھی اور خطاب کے دوران بھی مشہور حدیث ''أَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ، فَبِأَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمْ إِهْتَدَیْتُمْ'' کے بجائے صحیح مسلم کی روایت ''أَنَا أَمَنَةٌ لَأَصْحَابِیْ وَأَصْحَابِیْ أَمَنَةٌ لِأُمَّتِیْ الخ'' کو پیش کیا تھا اور اسی کی روشنی میں امت کی

ذمہ داریوں اور صحابہ سے وابستگی کے صلے میں حاصل ہونے والی تائید الٰہی، امان وحفاظت ونصرت اور فتنوں سے سلامتی کا تذکرہ کیا تھا، حضرت نے ازراہِ خردنوازی اپنے کلیدی خطاب میں اپنے اس حقیر وتہی دامن شاگرد کی تحسین بلند الفاظ میں فرمائی تھی اور پھر اجلاس کے بعد دسترخوان پر حضرت نے بشاشت کے عالم میں حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا:

> ”تم نے حسب موقع اہم ترین حدیث کو بنیاد بنایا اور مغز ہی مغز پیش کیا، ایسی ہی بات ہونی چاہئے، اسی کی مشق رکھو کہ مغز ہی بیان کرنا ہے، مضبوط بات ہی پیش کرنی ہے، چھلکا اور کچی بات نہیں پیش کرنی ہے۔“

ظاہر ہے کہ کہاں حضرت کا مقام بلند اور کہاں یہ طفل مکتب اور کودکِ ناداں: مگر یہ حضرت کا بڑکپن اور اندازِ تشجیع تھا اور واقعہ یہ ہے کہ اس ادا سے مخاطب کی کیسی دل بستگی ہوتی تھی اور اس کی رگوں میں جہد مسلسل کے لئے کیسے خونِ تازہ دوڑ پڑتا تھا، اسے محسوس تو کیا جاسکتا ہے، الفاظ کے پیکر میں ڈھالا نہیں جاسکتا۔

دورۂ حدیث کے سال میں ایک دن سبق سے فارغ ہونے کے بعد حضرت تخت سے نیچے اترے، استاذ کی دائیں جانب دوسری تپائی پر احقر کی نشست ہوتی تھی، آپ گذرے اور میرے پاس آکر کھڑے ہوگئے، میرا معمول حضرت کی درسی تقریر من وعن کاپی میں ضبط کا تھا، میں اسی میں مشغول تھا، حضرت رک کر دیکھنے لگے، طلبہ متوجہ ہوگئے، میں نے آہٹ محسوس کی تو مرعوب ہوکر کھڑا ہوگیا، حضرت نے خیریت دریافت کی، بات کرتے ہوئے چل پڑے، میں بھی ساتھ ہوگیا، میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحبؒ کی خیریت پوچھی اور فرمایا: تمہیں شاید معلوم نہ ہو، تمہارے والد کا دار العلوم میں مدرس کی حیثیت سے تقرر ہوگیا تھا، معاملات طے پاگئے تھے، کتابیں نامزد ہوگئی تھیں، مگر وہ نہ آسکے، تو پھر میرا تقرر ہوا، اس طرح میں تمہارے والد کی جگہ پڑھا رہا ہوں۔

میں بتا نہیں سکتا کہ حضرت کے ان الفاظ اور خردنوازی کے اس انداز نے کس

طرح سے مجھے گھائل کیا اور حضرت کی عظمت و محبت نہاں خانۂ قلب میں کس طرح پیوست ہوتی چلی گئی۔

اب ان یادوں کو قرطاس پہ منتقل کر رہا ہوں تو احساس ہو رہا ہے کہ
اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

(۳) تربیت کا بے مثال اہتمام

حضرت کی زندگی میں اپنے متعلق و منسلک افراد کی تربیت کا خاص اہتمام تھا اور اس میں حضرت کا انداز پدرانہ اور مشفقانہ ہوتا تھا، آپ کے تلامذہ کی ایک بڑی ٹیم ہے جو آپ کے فیضان تربیت سے کندن بنی اور جس نے حضرت سے وابستگی اور حضرت کے زیر تربیت رہنے کو اپنے لئے مایۂ عزت و افتخار سمجھا اس کی برکت سے اسے علمی و عملی برکات و فتوحات کے خزانے میسر آئے۔

ان سطروں کے راقم کو- اپنی تمام ترکم علمی کے باوجود- کسی نہ کسی درجے میں یہ خوش نصیبی حاصل رہی، میں اپنی غیر مطبوع یا مطبوع کوئی کاوش جب بھی آپ کی خدمت میں پیش کرتا تو اس کا ایک حصہ تو آپ اسی وقت ملاحظہ فرماتے، باقی بعد میں دیکھتے اور جو کمی یا خامی نظر آتی فوراً متنبہ فرماتے، اصلاح کرتے، مضمون کو کیسے ادا کیا جائے، رہنمائی فرماتے اور کون سے مراجع پیش نظر رہیں، رہبری کرتے۔

اس حقیر نے ''اہل علم کے مجمع میں ہونے والے اپنے ایک مفصل خطاب ومحاضرہ'' کو بعض ذمہ دار اہل علم کی توجہ دہانی پر کتابی شکل میں ''فقہ حنفی میں اتباع احادیث کا جائزہ'' کے عنوان سے مرتب کیا تھا، ارادہ یہ تھا کہ یہ کتاب حضرت کی نظر ثانی اور کلمات مبارکہ کے بعد ہی طبع ہوگی، دیوبند حاضر ہوکر کتاب کا مسودہ خدمت میں پیش کیا اور درخواست رکھ دی، حضرت نے ازراہِ ذرہ نوازی گذارش قبول فرمائی اور فرمایا: تین دن بعد ٹیلی فون پر بات ہوگی۔ تین دن بعد میں نے رابطہ کیا تو حضرت نے فرمایا:

''تم اسلامیات پر اچھا لکھتے

ہو مگر خلافیات پر اچھا لکھنے کے لئے
ابھی اور ریاضت درکار ہے۔“

اس اصولی بات کے بعد آپ نے مذکورہ کتاب کے حوالے سے نمبر وار نشان دہی فرمائی اور اصلاح وترمیم کے بعد دوبارہ دکھانے کو کہا، میں نے حسب ہدایت واصلاح کام پورا کیا اور پیش کیا، حضرت نے بہ نظر غائر ملاحظہ فرمایا اور فرمایا:

”اب میں حضرت عمر کا قول دہراتا ہوں: اَلآنَ إِسْتَرَحْتُ (اب مجھے راحت ملی)۔“

پھر خوب دعاؤں سے نوازا، تقریظ لکھی، جس میں اس حقیر کے لئے ازراہِ خردنوازی تحسین کے خوب کلمات ارقام فرمائے، سوء اتفاق یہ کتاب اب تک بعض اسباب سے زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکی۔

یہ حقیر دار العلوم الاسلامیہ بستی میں تدریسی خدمات سے وابستہ تھا، جامعہ عربیہ امدادیہ مرادآباد میں ہنگامی تدریسی ضرورت پیش آئی، جامعہ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا معین الدین گونڈویؒ علاج کے سلسلے میں گجرات منتقل ہو گئے تھے، بڑوں کے حکم پر ۲۰۰۶ء کے اوائل سے مجھے ”صحیح بخاری“ کی خدمت کے لئے مرادآباد آنا پڑا، یہ خدمت -اپنی تمام تر نااہلی کے باوجود- بڑوں کے امتثال حکم میں تاحال جاری ہے، اللہ اسی خدمت پر خاتمہ بالخیر فرمائے۔

اس خدمت سے وابستگی کے بعد یہ حقیر پہلی بار دیوبند حاضر ہوا، اور حضرت کی بارگاہ میں پہونچا اور پوری بات عرض کی تو حضرت نے فرمایا: تم نے اس سے پہلے کون سی کتابیں پڑھائی ہیں؟ میں نے بطور خاص کئی سال سے ”مشکوۃ المصابیح“ پڑھانے کا ذکر کیا آپ نے فرمایا: دیگر فنون کی کیا کتب زیر درس رہی ہیں؟ میں نے نحو، صرف، ادب وانشاء اور فقہ وتفسیر تمام فنون کی اپنے زیر درس رہ چکی کتب کی تفصیل عرض کی، یہ سن کر حضرت نے دو باتیں فرمائیں:

(۱) تم نے معقول کی کتابیں پہلے پڑھائی ہیں، اب تم

> معقول سے گزر کر منقول کی طرف آئے ہو، یہ فالِ نیک ہے، میرا تجربہ ہے کہ یہ ترتیب ہر قدم پر فکری و عملی گمراہی سے محفوظ رکھتی ہے اور مسلکِ حق پر ثابت قدم رکھتی ہے۔
>
> (۲) دورۂ حدیث کی تمام کتب کا از اول تا آخر بالاستیعاب مطالعہ کر ڈالو، بخاری کے لئے دیگر شروح کے ساتھ بالالتزام ''فیض الباری'' بہ غور دیکھو، پڑھانے میں ''تفصیل واختصار یا درایت و روایت'' کے حوالے سے ''اعتدال'' اور ''خَیرُ الْکَلام مَا قَلَّ وَ دَلَّ'' کے طریقے کی پابندی رکھو، طلبہ کو ان کے معیار سے آگے کی بات نہ بتاؤ، وہی خوراک دو جو وہ ہضم کرسکیں، یہ دعا بھی اپنے لئے اور ہم سب کے لئے کرتے رہو کہ دین اور حدیث کی خدمت میں عمر تمام ہو جائے۔

گذشتہ دو یا تین سال قبل احقر ''رابطہ مدارس اسلامیہ'' کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں دیوبند گیا تھا، اجلاس کے بعد مہمان خانے میں لفٹ سے اترتے ہوئے حضرت سے ملاقات کی، حضرت نے خیریت دریافت کی، اسی وقت دولت کدے پر لے گئے، تحفۃ القاری مکمل اور ہدایت القرآن کی کئی جلدیں عطا فرمائیں اور فرمایا:

> ''عمامہ سنت ہے، تم حدیث پڑھاتے ہو، اب عمامہ باندھنا شروع کر دو، روز نہ باندھ سکو تو جمعہ کے دن باندھ لو، یہ سنت کسی نہ کسی شکل میں حدیث کے خادم کی زندگی میں باقی و جاری رہنی چاہیئے۔''

احقر کو ایک مسئلے میں علمی اشکال تھا، عرض کیا، حضرت نے مفصل جواب دیا اور اپنی دعاؤں کے حصار میں رخصت کیا۔

احقر نے اپنی کتاب ''اسلام میں عفت و عصمت کا مقام'' میں ''آیت حجاب'' پر لکھا تھا، حضرت نے ملاحظہ فرمایا اور دیر تک اس موضوع پر گفتگو فرمائی، اس دن عصر کے بعد مجلس میں مجمع بھی زیادہ تھا، کئی اساتذۂ دارالعلوم بھی تشریف رکھتے تھے، پوری مجلس میں یہی

موضوع رہا، مغرب کی نماز ساتھ ادا کی، اس کے بعد بھی کئی منٹ اسی موضوع پر بات کی اور بہت نفیس نکتوں کی طرف توجہ دلائی، حوصلہ افزائی بھی کی، تحسین بھی فرمائی اور تربیت واصلاح بھی کی۔

(٤) حفظان صحت کے اصول کا اہتمام

حضرت کے ہاں حفظان صحت کے حوالے سے بھی خاص اہتمام اور توجہ تھی متعلقین کو اس پہلو سے توجہ دلاتے رہتے تھے، وقت پر سونا، کھانا پینا اور تمام کام، بہ جائے خود تحفظ صحت کے لئے بنیاد کا مقام رکھتے ہیں، حضرت اس پر پوری طرح کاربند رہتے تھے اور کبھی اس میں تخلف نہیں آنے دیتے تھے۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحبؒ کا مستقل معمول روزانہ بعد فجر کم از کم ایک گھنٹہ بہت تیز قدموں سے چلنے کا تھا (عموماً اس دورانیے میں وہ ۵ / کلومیٹر تفریح کر لیتے تھے اور چونکہ تفریح تنہا کرتے تھے اس لئے قرآن کے اچھے خاصے حصے کی تلاوت اور تسبیحات کا اپنا معمول اسی دوران مکمل کر لیتے تھے) میرے دورۂ حدیث کے سال (۱۹۹۶ء) میں حضرت والد صاحب کی حضرت مفتی صاحب سے سالہا سال کے بعد ملاقات ہوئی، والد صاحب نے اپنی تفریح اور چہل قدمی کا ذکر کیا تو پہلے مفتی صاحب نے ازراہِ مزاح فرمایا:

> ”آپ مہتمم آدمی ہیں، آپ کے پاس وقت ہے، میں تو مدرس ہوں، یہی مطالعے کا وقت ہوتا ہے، میں اتنی لمبی تفریح نہیں کر سکتا۔“

پھر فرمایا:

> ”میں دن میں ایک بار اور بعد مغرب ایک بار اپنے گھر سے (جو دار العلوم سے کافی فاصلے پر ہے) دار العلوم پیدل جاتا اور آتا ہوں، اس طرح اچھی خاصی چہل قدمی ہو جاتی ہے۔“

ظاہر ہے کہ حضرت کے پیدل آنے جانے کا یہ معمول (جو علالت اور امراض کے ہجوم سے پہلے تک سالہا سال جاری رہا) حفظانِ صحت کی رعایت کے پیشِ نظر ہی تھا۔

> ایک مرتبہ دیوبند حاضری کے موقع پر احقر نے اپنی کچھ تحریری کاوشیں پیش کیں، حضرت نے فرمایا:
>
> ”تم زمین پر بیٹھ کر لکھنے کا کام کرتے ہو یا کرسی اور میز کا استعمال کرتے ہو“۔
>
> میں نے کرسی کا ذکر کیا، حضرت نے فرمایا:
>
> ”مستقل بیٹھ کر کام کرنا بسا اوقات مختلف پہلوؤں سے صحتِ جسمانی کے لئے بہت مضر ہوتا ہے، اس لئے یا تو کرسی میز کا استعمال ہونا چاہئے، یا اگر زمین پر بیٹھ کر کام کرنا ہے تو پھر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وقفہ دینا چاہئے اور اٹھ جانا چاہئے“۔

مزید فرمایا:

> ”میں زمین پر بیٹھ کر کام کرتا ہوں اور مراجع (جن کی ہر دم ضرورت ہوتی ہے) اپنے قریب نہیں رکھتا، دو الماریوں میں رکھتا ہوں، اور اس بہانے بار بار اٹھتا ہوں، تاکہ صحت پر منفی اثر نہ پڑے“۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ روحانی صحت کے ساتھ اللہ نے حضرت کو جسمانی صحت کے تحفظ کی بھی خوب فکر عطا فرمائی تھی۔

(۵) تواضع

حدیث نبوی کی صراحت کے مطابق تواضع میں انسان کی رفعت کا راز چھپا ہوتا ہے، حضرت مفتی صاحب کو عالمی مقبولیت اور قافلۂ علم کی سالاری کا مقام بلند اور ”حسن قبول“ کا مرتبہ حاصل تھا، اس کی پشت پر دیگر محرکات کے پہلو بہ پہلو آپ کے اندرون کی تواضع بے نفسی اور خاکساری بھی کلیدی طور پر شامل ہیں۔

اپنے معاصرین کے فضل وکمال کا اعتراف انسان کی وسیع الظرفی، تواضع اور اخلاص باطن کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم (جو حضرت مفتی صاحبؒ کے معاصر بزرگوں میں ہیں اور علم وفضل کے حوالے سے پورے عالم کے علمی افق پر آفتابِ عالم تاب اور ''تو چیزے دیگری'' کا مصداق کامل ہیں) پر قاتلانہ حملے کے بعد حضرت مفتی صاحب نے اپنے دوسطری تأثرات کا اظہار فرمایا تھا، یہ تأثر ایک طرف طویل تأثراتی اور جذباتی مضامین پر ہزار درجہ بھاری بھی ہے اور دوسری طرف حضرت مفتی صاحب کے صفائے باطن، معاصر کے فضل کے بے لاگ اعتراف اور تواضعِ کامل کا نمایاں ثبوت بھی ہے۔

اس تأثر کا عنوان تھا ''ہزار جانیں آپ پر قربان''

اور مضمون یوں ہے:

> ''تہنیت بخدمت سید المسلمین شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ادام اللہ فضلہ آپ سرمایۂ ملت ہیں، اور مایہ پر ہمیشہ چوروں کی نظر رہتی ہے، مگر اَللّٰہُ خَیْرٌ حَافِظًا وَّھُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ، اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے حملے سے آپ کو بال بال بچالیا، اس پر ہم ارحم الراحمین کا شکر بجالاتے ہیں''۔

(البلاغ: شعبان ۱۴۴۰ھ
اپریل ۲۰۱۹ء: ص ۷۵)

حضرت مفتی صاحب کی رحلت پر تأثرات رقم کرنے والے ان کے متعدد تلامذہ نے نقل کیا ہے کہ مختلف تالیفی ذوق رکھنے والے علماء کو حضرت یہ مشورہ دیتے تھے کہ اپنی علمی اور قلمی کاوشیں حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوریؒ (جو حضرت کے ہم عصر بلند پایہ عالم اور استاذ الاساتذہ تھے) کو ضرور دکھایا کریں، اس لئے کہ زبان وادب کے حوالے سے موصوف کی شخصیت بہت اہم اور سند ہے، ظاہر ہے کہ معاصرین کے کمال کا یہ اعتراف و

اظہار بجائے خود حضرت مفتی صاحب کی خوئے متواضعانہ اور پاکیزگیٔ قلب واندرون کی بیّن دلیل ہے۔

(٦) غیبت اور بدگوئی سے مکمل اجتناب

حضرت کو اللہ نے یہ خوبی عطا فرمائی تھی کہ آپ کے دروس، خطابات، مجالس اور نشستیں ''غیبت اور بدگوئی'' کے رواجِ عام پاچکے رذائل سے بالکل محفوظ اور پاک رہتی تھیں، ذاتیات پر تبصرہ اور معائب کے پروپیگنڈہ سے وہ کوسوں دور رہا کرتے تھے، ان کو اپنے باتوفیق اور اہل دل اساتذہ کے فیض صحبت وتربیت سے، اپنے والدین کے صلاح وتدین اور حسن تربیت، متواتر دینی خدمت اور علمی اشتغال نیز اپنے مرتب اور جامع و منضبط نظام الاوقات کی برکت سے غیبت و بدگوئی جیسے سفلی کاموں سے نفرت تھی، انہوں نے علمی موسوعاتی کاموں کا ایسا بیڑا ہمیشہ اٹھائے رکھا کہ ان کی زندگی میں کبھی ان جیسے کاموں کی فرصت بھی نہیں تھی۔

ان کے مفسرانہ قلمِ فیض رقم نے ''غیبت'' کے ذیل میں لکھا ہے:

> ''پھر غیبت کی تغلیظ (بھاری گناہ ہونا بیان کرنے) کے لئے اس کو تشبیہ دی مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے، جس سے ہر کوئی گھن کرتا ہے، کوئی اس کو کھانے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور مردہ بھائی کے گوشت کے ساتھ تشبیہ اس لئے دی ہے کہ زندہ بھائی کا گوشت اول تو کوئی کھا نہیں سکتا اور کھانے کی کوشش کرے تو وہ مدافعت کرے گا اور لاش کو کھائے تو کون مدافعت کرے گا؟ اسی طرح دوسرے کی عدم موجودگی میں غیبت کرے تو وہ کیا مدافعت کرے گا؟ ہمت ہو تو سامنے برائی کر کے دکھائے اس صورت میں منہ کی کھائے گا''۔

(ہدایت القرآن: ۷/۵۰۶)

واقعہ یہ ہے کہ ان کا حال ان کے قلم وقال کے مطابق غیبت، بدزبانی اور بدگوئی

سے بالکل پاک اور سلامت تھا، وہ اپنے خوردوں کا بھی غائبانے میں ذکر خیر کرتے تھے اصلاح طلب امور کی اصلاح سامنے اور مشفقانہ مربیانہ اصولی لہجے میں فرماتے تھے، اور یہ ان کی عظمت کی بہت کھلی دلیل تھی۔

(۷) جادۂ اعتدال پر ثابت قدمی

حضرت کی کتاب زندگی کا نمایاں عنوان ’’اعتدال‘‘ ہے، یہ اعتدال دروس وخطابات میں بھی نمایاں رہتا تھا، شخصیات سے اظہار تعلق میں بھی دکھائی دیتا تھا، انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک، خلوت سے لے کر جلوت تک اور سفر وحضر ہر جگہ اس اعتدال کا عکس نظر آتا تھا، ان کی ’’حق گوئی‘‘ اور ’’تصلّب‘‘ کچھ ظاہر بینوں کو ’’غلو‘‘ نما معلوم ہوتے تھے، مگر یہ سطحی مشاہدہ کی وجہ سے ہوتا تھا، ان سے قریب ہوکر، ان کی مجالس میں شریک ہوکر اور ان کے ساتھ کچھ وقت گذار کر بخوبی اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ ’’غلو‘‘ سے کس قدر نفور اور ’’اعتدال‘‘ کے کس درجہ پیکر ہیں۔

حضرت کے اسباق علمیت کا مظاہرہ کرنے والے نو واردوں کی طرح اطناب وتطویل سے بھی پاک تھے اور حقِ علم ادا کرنے کے بجائے صرف ایک بوجھ اتارنے والوں کی طرح ایجاز واختصار اور سرسری انداز سے بھی محفوظ تھے، آپ کے دروس ’’اطنابِ مُمل‘‘ (اکتا دینے والی بلکہ بسا اوقات افادیت سے خالی تفصیل وتطویل) اور ’’ایجازِ مُخل‘‘ (مضمون کو خبط کردینے والے اختصار) دونوں سے پاک سراپا اعتدال تھے اور سال کی ابتداء سے انتہا تک یہ اعتدال اور یکسانیت باقی رہتی تھی۔

یہی اعتدال حدیث کی عبارت خوانی میں بھی ہوتا تھا، احادیث کے متون نہ اتنے تیز پڑھے جاتے کہ واضح نہ ہوسکیں اور نہ اتنے اطمینان سے پڑھے جاتے کہ ترتیل کا گماں ٹھہرے، بلکہ میانہ روی کا مکمل لحاظ رہا کرتا تھا۔

حضرت کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ ’’اکابر پرستی‘‘ اور ’’اکابر بیزاری‘‘ کی انتہاؤں سے الگ اور دور شاہراہ اعتدال پر گامزن رہتے تھے، عقائد وکلامیات میں انہیں اکابر کی

تشریح پر کامل اعتماد تھا، اور ان کا دل اکابر کے سچے احترام سے ہمہ وقت لبریز رہتا تھا، مگر اس کے باوجود وہ اکابر کی ہر ہر بات پر آنکھ بند کر کے یقین، دوسرے لفظوں میں اندھی تقلید کے قائل کبھی نہیں رہے، بصیرت ان کے علمی وفکری سفر میں ہمیشہ ان کا زادِ راہ رہی۔

اپنے بعض معاصرین (جن سے متعدد علمی وفکری مباحث میں ان کا اختلاف رائے رہا کرتا تھا) کے ساتھ ان کے معاملات اور سلوک ورویے ہمیشہ اعتدال کا نمونہ رہے اختلاف رائے انہیں معاصرین کی خوبیوں کے اعتراف سے کبھی نہیں روکتا تھا، وہ اپنی رائے پر قائم بھی رہتے تھے، اس کی وکالت بھی کرتے تھے اور مخالف دلائل کا جواب بھی دیتے تھے مگر مقابل کی تحقیر وتنقیص سے ہمیشہ اپنے قلب وقالب دونوں کو محفوظ بھی رکھتے تھے، اس جوہر اعتدال نے ان کو امتیازی خوبی عطا کر دی تھی، آج یہ خوبی نایاب ہوتی جارہی ہے حضرت کی حیات کا یہ ورق ان کے تمام اخلاف کے لئے اس حوالے سے خصوصیت کے ساتھ مشعل راہ ہے اور ہم سب کو ''ادب الخلاف'' (اختلاف رائے کا شائستہ طریق) سیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔

(۸) حق گوئی ، استقامت اور تصلّب

حضرت مفتی صاحب کی سیرت کا سب سے جلی اور روشن پہلو (جو انہیں اپنے معاصرین میں نمایاں امتیاز عطا کرتا ہے) ان کی حق گوئی، استقامت اور تصلّب کی خصوصیت ہے، وہ ہمیشہ حق کا اعلان ڈنکے کی چوٹ پر کرتے تھے، انہیں عواقب اور لومۃ لائم کی پرواہ نہیں ہوتی تھی، حق گوئی کی جرأت رندانہ رکھنے والے اور اس راہ میں ہر صعوبت انگیز کرنے کا جگر رکھنے والے اسلاف کی طرح ان پر نہ کبھی مرعوبیت طاری ہوتی تھی، نہ مصلحت آمیز اور معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنے کا خیال بھی آتا تھا۔

ان کی ساخت اور ترکیب جن عناصر سے ہوئی تھی ان میں اپنے کو صلح کل بنائے رکھنے اور ''متفق علیہ'' اور ''غیر متنازع'' بنے رہنے کے لئے تلخ کو شیریں اور غلط پر خاموش رہ جانے اور حق کو مشتبہ کر دینے کی ذرہ برابر گنجائش نہیں تھی، وہ انکار منکر اور ابطال باطل کو وقت

گذاری کا مشغلہ یا اپنی دلچسپی کا موضوع نہیں، اپنا مشن اور فرض منصبی باور کرتے تھے، جس چیز کے حق اور درست ہونے پر منصوص و مضبوط دلائل کی روشنی میں انہیں انشراح ہو جاتا تھا وہ اس کا اظہار کرنے سے نہ گریز کرتے تھے، اور نہ مخالفانہ رائے رکھنے والوں کی وجہ سے اس کے اعلان میں انہیں کوئی باک ہوتا تھا، ان کا مزاج یہ تھا کہ وہ کبھی زہر ہلاہل کو قند نہیں کہہ سکتے تھے، حق گوئی ان کی سرشت تھی، احقاق حق ان کی طبیعت تھی، ابطال باطل ان کا مزاج تھا اور انکار منکر ان کا ہدف تھا، وہ اپنی مثال آپ تھے، انکار منکر اور ابطال باطل کے حوالے سے جب وہ مجلس یا اجلاس میں گفتگو کرتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ ان میں کوئی فولادی قوت پیدا ہو گئی ہے، ان کا اسلوب بالکل بے لچک اور دلائل کے ہتھیاروں سے مسلح ہو جاتا تھا، ان کی زبان قال حق کا اعلان اور منکر کا انکار کر رہی ہوتی تھی اور زبانِ حال گویا یہ کہہ رہی ہوتی تھی ۔

یہ طرزِ خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا
جو ہم کہیں گے کسی سے کہا نہ جائے گا

اور ان کا انداز یہ صدا لگا رہا ہوتا تھا ۔

یہ بیانِ حال یہ گفتگو، ہے مرا نچوڑا ہوا لہو
ابھی سن لو مجھ سے کہ پھر کبھی نہ سنو گے ایسی کہانیاں

قبرستانوں میں لگائے جانے والے کتبوں کے تعلق سے حلقۂ دیوبند میں جو غلو پیدا ہوتا جا رہا ہے، وہ حضرت کے لئے بڑی فکر اور کڑھن کا باعث تھا، وہ کھل کر اس پر نکیر کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کا کہنا تھا کہ بریلویت اور دیوبندیت میں اب صرف ایک بالشت کا فرق رہ گیا ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ اب یہ فرق بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔

مروجہ تعزیتی جلسوں اور مجالس کے بارے میں حضرت کا موقف بالکل واضح تھا وہ ان کو غلط اور نامناسب باور کرتے تھے، ان کا موقف مختلف دلائل کی روشنی میں یہ تھا کہ اس

سلسلہ میں بعض پیش رو اکابر کی طرف سے اس طرح کے اجلاسات کے انعقاد اور شرکت کو دلیل نہیں بنایا جاسکتا، اکابر کے تمام تر احترام کے باوجود حضرت کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ یہ مسئلہ ان اکابر کے سامنے منقح نہیں ہوا تھا، اس لئے تنقیح سے پہلے کے ان کے عمل کو ثبوت میں نہیں پیش کیا جانا چاہئے۔

''چھوٹا منھ بڑی بات'' سہی، مگر یہاں یہ عرض کیا جانا ضروری ہے کہ تعزیتی مجالس کے سلسلے میں مسلک دیوبند کے نمائندگان کا باہم اختلاف حق و باطل، درست و نادرست، صحیح اور غلط کا نہیں ہے، بلکہ دراصل یہ اختلاف عزیمت و رخصت یا انسب و غیر انسب کے درجے کا ہے، حضرت مفتی صاحب راہِ عزیمت کے سالک بلکہ رہبر تھے، اس لئے بجا طور پر ان کا وہی موقف ہونا چاہئے تھا جو انہوں نے پوری قوت سے ظاہر فرمایا۔

جماعت تبلیغ میں اور بہ طور خاص اس سے متعلق دین کے عمیق علم سے ناآشنا پرجوش افراد کی طرف سے مختلف جہات میں پایا جانے والا غلو (جس کے ڈانڈے دین کے صرف ایک شعبہ کی تعظیم اور باقی شعبوں اور محاذوں کی قدر ناشناسی سے مل جاتے ہیں) اسی طرح ''فی سبیل اللہ'' کی اصطلاح کو کار تبلیغ پر منطبق بلکہ منحصر کر دینے اور جہاد و قتال جیسے اہم دینی شعبے کی حق تلفی پر مبنی بے اعتدالی، نیز بعض ذمہ دارانِ جماعت کی طرف سے تفسیر آیات اور تشریح احادیث وغیرہ میں صادر ہونے والی لغزشیں اور ان پر کسی نہ کسی صورت میں اصرار کی روش حضرت مفتی صاحب کے لئے بڑے قلق اور تشویش کی بات تھی، ایسے مواقع پر ان کا احقاق حق اور تصحیح غلط کا جذبہ خوب بیدار ہو جاتا تھا اور وہ اپنے تلامذہ کو بطور خاص دروس میں اور حسب ضرورت عمومی مجالس میں شرکاء کو متنبہ بھی فرماتے تھے اور اسے اپنی دینی مسئولیت سمجھتے تھے۔

قبرستانوں میں مراقبہ، قبروں پر تلاوت، تصوف کے نام پر افراط و تفریط اور اکابر پرستی میں غلو وہ امور ہیں جن پر حضرت مفتی صاحب نے کھل کر نکیر کی ہے، ان میں سے بعض معاملات میں بعض جزئیات پر حضرت مفتی صاحب کے نقد و احتساب سے متعدد علماء و مشائخ

کو اتفاق نہ ہوسکا، مگر حضرت مفتی صاحب نے دلائل کی روشنی میں جس عمل کو درست نہیں سمجھا اور خیر القرون میں جسے متوارث نہیں پایا اس پر احتساب کا فرض ضرور انجام دیا۔

حضرت کو حلقۂ دیوبند سے منسلک مدارس میں قرآن مجید سے بے اعتنائی پر بہت دکھ ہوتا تھا، واضح رہے کہ درس نظامی میں تفسیر کے نام پر صرف ایک کتاب ''جلالین'' داخل نصاب ہے، حضرت فرماتے تھے:

> '' ہمارے ہاں سب سے زیادہ مظلوم قرآن ہے، دیگر تمام فنون پر کئی کئی کتب داخل نصاب ہیں، مگر قرآن کے نام پر صرف ایک ہی کتاب پڑھائی جاتی ہے۔''

حضرت کی رائے یہ تھی کہ نفس قرآن شرح وبسط کے ساتھ اس طرح پڑھایا جانا چاہئے کہ استاذ کسی خاص تفسیر کو سامنے نہ رکھے، وہ تمام معتبر تفاسیر کو مرجع بنائے، ان کا مطالعہ کرے اور حاصل مطالعہ کو تمام نکتوں اور افادات ومباحث کے ساتھ طلبہ تک منتقل کرے، اس کے بغیر طلبہ میں قرآن میں تدبر کا ذوق پیدا نہیں ہوگا۔

اسی طرح دورۂ حدیث کے سلسلے میں حضرت کی رائے یہ تھی کہ اس کے لئے ایک سال کا دورانیہ بالکل ناکافی ہے، دو سال ہونے چاہئیں کیونکہ اس کے بغیر فہم حدیث نہیں ہوسکتا، نیز ہر کتاب سے بحث ودرایت کے لئے الگ الگ ابواب منتخب ہونے چاہئیں تاکہ کوئی پہلو تشنہ بھی نہ رہے، اور محض تکرار پر اکتفا بھی نہ ہو، (ایک سال سے دار العلوم دیوبند کے نصاب میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ دورۂ حدیث میں تمام کتب مکمل پڑھائی جائیں البتہ درایت و بحث کے لئے الگ الگ ابواب کا انتخاب کیا گیا ہے، خدا کرے کہ یہ تجربہ کامیاب ہو اور اس پر استقامت کے ساتھ اہل مدارس عمل کرسکیں)۔

کئی دہائی قبل دار العلوم دیوبند کے یوم تاسیس پر سالانہ جشن کی بات آئی، تو حضرت نے دلائل کی روشنی میں پوری قوت سے اس کا رد بھی کیا، اہل انتظام کو توجہ بھی دلائی

اور اسے بدعت کا پیش خیمہ بتایا بالآخر یہ بات ختم ہوئی۔

حضرت اپنے ان تلامذہ سے (جو مدارس اور اداروں میں اہتمام و انصرام کے منصب پر فائز ہوتے تھے) یہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ منصب آگ پر چلنے کے مرادف ہے، اگر یہ ہمت اور صلاحیت ہو تو اس پر باقی رہنا چاہئے ورنہ ع اگر خواہی سلامت بر کنار است (اس معنیٰ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا یہ فقرہ معروف ہے کہ منصب اہتمام مقامِ مبغوض ہے)۔

اسی رمضان ۱۴۴۱ھ میں وفات سے چند ایام قبل حضرت نے ''ثریا ستارہ اور کرونا وائرس'' کے حوالے سے جاری ایک بحث میں پوری وضاحت سے اپنا موقف پیش کیا اور ثریا کے طلوع کو کرونا کے خاتمے سے جوڑنے والی فکر کو قوت کے ساتھ رد فرمایا، آپ کا یہ رد اس درجہ مضبوط اور استدلالی تھا کہ مخالفانہ موقف رکھنے والوں کے لئے لمحۂ فکریہ ثابت ہوا بلکہ ایک مخلص اور راسخ العلم شخصیت نے حضرت کے خطاب و رد کی روشنی میں اپنے موقف سے رجوع بھی کیا اور تواضع کا ثبوت دیتے ہوئے رجوع کا اظہار بھی کیا۔

تصویر سازی اور ویڈیو گرافی کے منکر پر حضرت مفتی صاحب اپنی مجالس سے لے کر بڑے بڑے عوامی اجتماعات میں قوت کے ساتھ نکیر اور اظہار حق کا فرض انجام دیتے تھے ان کا کہنا تھا کہ ایک طرف اہل افتاء اس کے ناجائز ہونے کے فتوے صادر کرتے ہیں اور دوسری طرف ان کا اور دیگر متعدد اہل علم کا عمل اس کے خلاف سامنے آتا ہے، اس سے دین کی بے وقعتی اور شرعی احکام کی بے توقیری ہوتی ہے، ایسے ماحول میں جب اس حوالے سے بڑے بڑوں کا انداز سکوت کا ہو اور مصالح پیش نظر ہوں، حضرت اپنی جرأت رندانہ، عزیمتِ عالمانہ اور بصیرت فقیہانہ کا ثبوت دیتے ہوئے بار بار اس منکر کے خلاف اعلان حق کرتے تھے اور دعوتِ فکر و عمل دیتے تھے، گویا ان کا پیغام یہ تھا کہ ؎

کب سے ہوں نغمہ بلب، بزم کے سناٹے میں

کیا سنے ہے کوئی آواز، کوئی جاگے ہے

(۹) دلوں میں اتر جانے والا خطاب

حضرت مفتی صاحب باضابطہ اسٹیج کے آدمی نہیں تھے، ان کا خطاب جذباتی باتوں، شعلہ نوا انداز، تصنعات وتکلفات، آورد اور بناوٹ سے بالکل پاک ہوتا تھا، لب ولہجہ مجلسی ہوتا تھا، آمد ہی آمد کا منظر ہوتا تھا، الفاظ پر شکوہ نہیں ہوتے تھے، انداز پیشہ ورانہ نہیں ہوتا تھا، پھر بھی سامعین کا تأثر یہ ہوتا تھا۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

یہ ان کا امتیاز تھا کہ وہ اپنے خطاب میں موضوع (اور بالعموم موضوع علمی اور خشک ہوتا تھا) سے اِدھر اُدھر نہیں ہوتے تھے، نہ لطیفے سناتے نہ اشعار پڑھتے، سنجیدہ اسلوب میں باوقار خطاب ہوتا تھا، مگر تاثیر قیامت کی ہوتی تھی، یہ ان کے اخلاص اور پاکیزہ باطنی کا اثر تھا۔

(۱) لب ولہجہ کی انفرادیت

(۲) بات پیش کرنے، موقف ثابت کرنے اور مدعا بیان کرنے کی بے مثال و مستحکم قوت

(۳) علمی مضامین کو سہل ترین انداز میں اور خشک ترین موضوعات کو تر و تازہ اور دلچسپ بنا کر پیش کرنے کا خداداد سلیقہ

(۴) ایک مضمون کو ہر بار نئے پیرائے اور پیرہن میں بیان کرنے اور جدت پیدا کرنے کی خاص ادا

(۵) اس پر مستزاد موضوع کے تمام گوشوں کو سمیٹ لینے، حق ادا کرنے اور احاطہ و جامعیت کا ہنر

(۶) لب و لہجے میں اطمینان اور ٹھہراؤ اور عجلت سے گریز، ایک ایک حرف واضح ایک ایک جملہ نمایاں

(۷) استدلالی رنگ، معقول و منقول دلائل کا اجتماع

(۸) اور ان سب کے ساتھ اجتہادی نہ کہ تقلیدی منفرد انداز و طرز

(۹) مزید برآں ''قلندروں کے طریق'' کے مطابق زبان و دل کی رفاقت الفاظ دل کی آواز اور ''ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد'' کا مصداق

یہ سب حضرت کے خطاب کی خصوصیات تھیں۔

(۱۰) ان کے خطاب میں موضوع پر ارتکاز کے ساتھ سابق خطباء کی جادۂ اعتدال سے منحرف باتوں اور فکروں کا شائستگی کے ساتھ مدلل رد بھی ہوتا تھا اور اصلاح پر زور بھی، ہر خطاب حق گوئی کا شاہکار ہوتا تھا اور ہنگامی حالتوں میں تو آپ کے خطاب کا رنگ دو آتشہ ہو جاتا تھا۔

دار العلوم کے احاطہ میں ہنگامی احوال میں طلبہ کے درمیان ان کا خطاب ''مشتعل جذبات کی تسکین، دماغوں کی تسخیر، خیالات کی تطہیر، افکار کے تزکیہ، دلوں کی تسلی اور کایا پلٹ دینے'' کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہوتا تھا۔

فقہی، علمی اور کلامی مسائل میں بھی عوام کے درمیان آپ کا خطاب ایسے اسلوب میں ہوتا تھا جو ان کے ذہنوں کو اپیل کرتا تھا اور ان کے دماغوں کو حق پر مطمئن و منشرح کر دیتا تھا اور ان کا یہ تأثر ہوتا تھا کہ حضرت کی باتیں گویا ان کے دلوں میں اترتی اور دماغوں میں جاگزیں ہوتی جا رہی ہیں، گویا ایک نہر سلسبیل جاری ہوتی تھی جو سامعین کو اپنے ساتھ بہا لے جاتی تھی، ان کے یہ خطابات عوام اور عصری تعلیم یافتہ افراد کے دماغوں سے ''شریعت اسلامی، فقہ اسلامی، مسلک دیوبند، تقلید ائمہ وغیرہ'' کے بارے میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کی گرد بالکل صاف کر دیا کرتے تھے اور ان میں ''اطمینان و انشراح'' کا تازہ لہو دوڑا دیا کرتے تھے۔

محفل و مجلس کوئی بھی ہو، اگر حضرت موجود ہیں تو وہی جان محفل اور میر مجلس ہوتے تھے، انہیں کا خطاب کلیدی، سب سے اہم اور فیصلہ کن ہوتا تھا اور اب ان کے جانے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ ؎

ساتھ عاجز کے گیا سوزِ سخن، سازِ سخن
پھر کوئی ایسا غزل خواں نہ زمانے سے اٹھا

(۱۰) بے مثال تدریس

حضرت مفتی صاحب کا اصل شغل، موضوع، مذاق و مزاج اور غذا ''درس وتدریس'' تھی، بلاشبہ وہ عبقری اور نابغۂ روزگار علماء اور معلمین میں تھے، دارالعلوم دیوبند کے حلقۂ تدریس میں کئی دہائیوں سے وہی ''ریڑھ کی ہڈی'' کا مقام رکھتے تھے اور بلا مبالغہ پورے ملک میں علم و تحقیق کے کارواں کے سالار کا مرتبہ انہیں کو حاصل تھا، ان کی رحلت سے تدریس، علم اور تحقیق کی یہ مسند سونی ہی نہیں ہوئی ہے بلکہ ماتم کناں ہے، مگر حضرت گویا یہ کہہ کر رخصت ہو چکے ع

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں، ملنے
کے نہیں، نایاب ہیں ہم

حضرت جب حیات تھے، مسند درس کی رونق و آبرو تھے، پروانے ان کے گرد ہجوم لگاتے تھے، ان کا فیضان علمی مسلسل جاری رہتا تھا، ان کے سینے سے علوم و معارف کے موتی خوشہ چینوں کے سینوں اور سفینوں میں فروانی سے منتقل ہوتے تھے، ایک طبقہ اس وقت ان کے علمی اکتسابات اور نتائج تحقیق سے مطمئن نہ تھا، واہموں اور خدشوں کا شکار تھا (اگرچہ اس طبقے کے اخلاص اور فکر و تڑپ میں شک نہیں کیا جا سکتا) مگر حضرت ناقدین کے نقد کی پرواہ کیے بغیر ؎

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے

مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حدِ پرواز سے

کے مطابق ''وقت کم ہے اور کام زیادہ'' کے اصول کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے علمی اور تحقیقی سفر میں اپنے اصل ہدف و منزل کی طرف تیزی سے محو خرام رہے، ہاں مگر زبان حال سے یہ ضرور کہتے رہے۔

دلِ پرُغم نہیں ہوں گے، دیدۂ پرُنم نہیں ہوں گے
اندھیرا ہوگا اس محفل میں جس میں ہم نہیں ہوں گے
زمانہ قدر کر، ہاں قدر کر ہم کج کلاہوں کی
کہ پیدا اس نمونے کے جواں ہر دم نہیں ہوں گے

ذکر تھا حضرت کی بے مثال مدرسانہ اور معلمانہ شان کا، وہ ہر فن پر یکساں عبور رکھنے والے بے بدل عالم تھے، ہر فن کے مزاج شناس تھے، ہر فن کے مراجع ومصادر اور مآخذ واصول پر ان کی گہری نظر تھی، وہ درس نظامی کی تقریباً تمام کتب کا درس دے چکے تھے، نحو صرف، منطق وفلسفہ، بلاغت وادب سے لے کر فقہ وحدیث وتفسیر تک کوئی فن ایسا نہ تھا جس میں انہیں نبوغ ورسوخ کا مقام حاصل نہ ہو، تقریباً ہر فن پر انہوں نے خامہ فرسائی بھی کی ہے نحو وصرف ومنطق وفلسفہ پر انہوں نے درسی انداز کی ''سہل ممتنع'' اسلوب کی حامل نصابی کتب تیار کیں، الفوز الکبیر کا عربی ترجمہ کر کے اصول تفسیر کے موضوع پر خدمت انجام دی، ترمذی و بخاری وحجۃ اللہ البالغہ وسراجی کی مبسوط شروح تیار کر دیں، تفسیر پر وقیع کام انجام دیا، یہ خدمات ان کے ذوقِ علم وتدریس وتحقیق کی آئینہ دار بلکہ شاہ کار کہلائے جانے کی مستحق ہیں۔

ان کے درس کا رنگ کیا ہوتا تھا، وہ لکھنے، بیان کرنے اور سننے سے زیادہ دیکھنے اور براہ راست حاضری سے تعلق رکھتا تھا۔

(۱) اللہ نے انہیں گھول کر پلا دینے، پیچیدہ مباحث کی تسہیل اور سنگلاخ مباحث کو پانی کرنے کا بے مثال ملکہ اور ہنر ودیعت فرمایا تھا، مشکل سے مشکل بحث کو وہ انتہائی

آسان لفظوں میں اور چٹکیوں میں حل کر دیا کرتے تھے۔

(۲) علمی گہرائی و گیرائی اور عمق و بصیرت ان کی درسی تقریر کے ایک ایک فقرے سے نمایاں ہوتی تھی۔

(۳) متعلقہ موضوع کی جامعیت اور احاطہ و استیعاب ان کا خاص مزاج تھا۔

(۴) ان کا درس اعتدال کا نمونہ ہوتا تھا، پورے سال یکساں انداز، وہ اطناب وتطویل کے قائل نہیں تھے اور بہت اختصار وایجاز کو بھی مناسب نہیں سمجھتے تھے، میانہ روی کا رنگ ان پر چڑھا ہوا تھا، وہ موضوع کا پورا حق ادا کرتے تھے، کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑتے تھے، انہیں سمندر کو کوزے میں سمیٹنے کا ہنر آتا تھا، اور اس ہنر کو وہ درس میں کامیابی سے آزماتے تھے۔

(۵) ان کا درس روایت و درایت اور عقل ونقل کے امتزاج واجتماع کی خوب صورت مثال ہوتا تھا۔

(۶) موضوع پر ارتکاز، انحصار اور اِدھر اُدھر نہ بھاگنا ان کی خاص شناخت تھی۔

(۷) دوران درس ان کی گفتگو انتہائی مرتب ومدلل ہوتی تھی۔

(۸) وہ پوری تیاری اور مطالعے اور قابو یابی کے بعد ہی سبق پڑھاتے تھے رواروی اور بوجھ اتار پھینکنے کو وہ خیانت باور کرتے تھے۔

(۹) ان کے درس میں مخاطب کی ترکیز سو فیصد ان کی طرف ہی ہوتی تھی، یہ ان کا ساحرانہ کمال تھا، طلبہ کے دل ان کی طرف کھنچتے تھے، سماعتیں ان کی صدائے دل نواز کی عاشق رہتی تھیں اور بصارتیں ان کے سراپا کے دیدار کی آرزومند رہتی تھیں، ان کے اسباق میں طلبہ کی توجہ وسکون کا حال ''کَأَنَّ عَلٰی رُؤُوْسِہِمُ الطَّیْرَ'' (گویا ان کے سروں پر پرندے ہوں) کی منظر کشی کرتا تھا۔

(۱۰) ان کے درس میں گویا علم کی بارش ہوتی تھی، نفیس افادات، نایاب نکتے علمی جواہر، بیش قیمت فوائد اور دلوں کی کھڑکیاں کھول دینے اور دماغوں کے دریچے وا

کر دینے والے حقائق ومعارف، کیا کچھ نہ ہوتا تھا، اسی لئے تو وہ ’’درس وتدریس‘‘ کی سلطنت کے بے تاج بادشاہ کا مقام رکھتے تھے۔

(۱۱) ان کے درس کی سب سے منفرد ادا ان کا دل نشیں، مؤثر ترین اور بے نظیر انداز تفہیم تھا، وہ جس لہجے میں بات کہتے تھے، جس انداز سے موضوع پیش کرتے تھے اور جس اسلوب میں بحث کرتے تھے وہ بالکل جداگانہ ہوتا تھا، درس میں اول سے آخر تک ان کے دل نشیں انداز واسلوب کی شگفتگی باقی رہتی تھی، اور یہی رنگ نمایاں رہتا تھا، ہر ہر بات نہاں خانۂ دل میں اترتی اور دماغ میں محفوظ ہوتی چلی جاتی تھی۔

(۱۲) دوران درس مختلف مسائل میں اپنی رائے پیش کرنے کا مزاج بھی تھا ان کے یہ تفردات (جنہیں قبول کرنے کا پابند کسی کو نہیں بناتے تھے، بلکہ طلبہ کو معروف اور اجتماعی رائے اور مسلک کا پابند رہنے کی تلقین کرتے تھے اور یہ ان کے اخلاص کا بین ثبوت بھی تھا) اگر چہ دیگر اہل علم کے ہاں قابل قبول نہ بھی ہوں، ان کے علمی مقام بلند، وسعتِ مطالعہ، ذوقِ تحقیق وتدقیق اور وفورِ علم کے لوازم میں سے ہیں اور ان تفرادات پر بے جا نقد کرنے اور اپنا عدمِ اتفاق ظاہر کرنے کے بجائے انہیں اس تناظر میں دیکھا جانا چاہئے کہ علمی سفر میں کتنی صعوبت آزما گھاٹیاں عبور کرنے اور کتنی ریاضتوں کے بعد حضرت کو یہ مقام ملا ہوگا، ’’تفرداتِ علمی‘‘ باعثِ تنقید ہونے کے بجائے باعثِ تحقیق اور دعوتِ مطالعہ وجہدِ مسلسل ہونے چاہئیں۔

حضرت کے معاصرین تو ہم سب کے بڑے ہیں، ان کا مقام بہت اونچا ہے، مگر ہم خردوں کو اپنی سمتِ سفر درست رکھنے کے لئے ’’علمی تفردات‘‘ پر چیں بہ جبیں ہونے اور بے اطمینانی کا اظہار کرنے کے بجائے ان کے بین السطور میں مضمر ’’محنت اور مسلسل محنت‘‘ کے زندہ وتازہ پیغام کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

حضرت کے دروس اب صرف یادگار رہ گئے ہیں، جن کو ان سے تلمذ کی سعادت میسر نہیں آئی، ان کو تو ان دروس کا اصل رنگ دکھایا اور بتایا ہی نہیں جا سکتا، مگر جن کو تلمذ کا شرف حاصل ہوا اور جن کی سماعتیں حضرت کے دروس کی آوازوں سے شادکام ہوتی رہیں

یقیناً ان سب کا حضرت کے بارے میں یہی تأثر ہوگا کہ ؎

مسلسل یاد آئیں گے، پیہم یاد آئیں گے
کوئی موسم رہے، بے قیدِ موسم یاد آئیں گے

(۱۱) جہد مسلسل اور انضباط اوقات

حضرت مفتی صاحب کی علمی عظمتوں کا اصل راز آپ کی ’’جہد مسلسل‘‘ اور انضباط اوقات کی خصوصیات ہیں، ان کی زندگی متواتر محنت، مسلسل ریاضت، مستقل کوشش اور تعب نا آشنا ذوقِ مطالعہ کے حوالے سے اسوہ ونمونہ ہے، انہوں نے دور طالب علمی سے لے کر تا دمِ زیست علمی اشتغال کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا، انہیں محفل پسندی، عیش کوشی، تن آسانی اور کام چوری سے کبھی مناسبت ہی نہیں رہی، انہوں نے محنت اور جفاکشی میں کبھی کوئی کسر نہیں چھوڑی، کام اور صرف کام ان کا شعار رہا، دوران طالب علمی ’’افتاء‘‘ کی تعلیم کے ساتھ انہوں نے اپنے ذوق اور محنت سے خود مکمل قرآن حفظ کیا، ان کا شوق مطالعہ اور کتابوں سے عشق ’’وَخَیْرُ جَلِیْسٍ فِی الزَّمَانِ کِتَابُ‘‘ (زمانے میں سب سے بہتر ساتھی کتاب ہے) کی یاد تازہ کرتا تھا، عربی شاعر کے شعر ؎

بِقَدْرِ الْکَدِّ تُکْتَسَبُ الْمَعَالِیْ
وَمَنْ طَلَبَ الْعُلٰی سَهِرَ اللَّیَالِیْ

(محنت کے تناسب سے ہی عظمت ملتی ہے، عظمتوں کا طالب راتوں کو جاگتا اور محنت کرتا ہے) کے مطابق ان کی کاوش پیہم ہی ان کی عظمت ورفعت کا بنیادی سبب تھی۔

قرآن مجید کی آیت ’’وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا‘‘ (جب انہوں نے صبر سے کام لیا تب ہم نے ان کو پیشوا بنایا) سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کامل اور جہد مسلسل سے ہی پیشوائی اور امامت وسیادت کا مقام ملتا ہے، اسی لئے ’’قَبْلَ أَنْ تَسَوَّدُوْا‘‘

(مقام سیادت ملنے سے پہلے بھی) اور "بَعْدَ أَنْ تُسَوَّدُوْا" (مقام سیادت ملنے کے بعد بھی) مستقل محنت و علمی ریاضت کی تاکید آئی ہے۔ (بخاری: العلم)

حضرت نے مشکل حالات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے ہوئے صبر و جہد کی خو کبھی نہیں بدلی، ان کا یہ رنگ طالب علمی کے دور میں بھی رہا، مدرسی کے زمانے میں بھی رہا شیخ الحدیث بننے کے بعد بھی رہا، وہ کسی مرحلۂ حیات میں محنت و مطالعہ سے غافل نہیں ہوئے اور اسی وصف نے انہیں علمی سیادت و امامت کا یہ مقام بخشا کہ وہ ام المدارس کے صدر المدرسین بھی ہوئے، شیخ الحدیث بھی بنے، علماء کے لئے مرجع و مرکز بھی بنے، قافلۂ علم کے میر و سالار بھی بنے، علماء کے لئے وقار اور شان بھی ثابت ہوئے، ہر طرف ان کا طوطی بولتا رہا اور ہر جانب ان کا ڈنکا بجا، علامہ زمخشری کا یہ شعر حضرت کی علمی ریاضتوں کے حسب حال ہے اور ان پر پوری طرح راست آتا ہے۔

سَهَرِیْ لِتَنْقِیْحِ الْعُلُوْمِ أَلَذُّ لِیْ
مِنْ وَصْلِ غَانِیَةٍ وَطِیْبِ عِنَاقِ

(کسی علمی مسئلہ کی تحقیق اور عقدہ کشائی کے لئے پوری رات جاگنا
مجھے دنیا کی تمام لذتوں سے زیادہ لذیذ ہے)

اور پھر زمخشری کی زبان ہی میں حضرت کا یہ پیغام ہم جیسے کوتاہ علم و عمل خردوں کے نام ہے۔

أَأَبِیْتُ سَهْرَانَ الدُّجٰی وَتَبِیْتُهُ
نَوْمًا وَتَبْغِیْ بَعْدَ ذَاکَ لِحَاقِیْ

(میں رات بھر جاگتا رہوں اور تم رات بھر سوتے رہو، اور پھر تم چاہو
کہ تم کو میرا مقام مل جائے، ایسا نہیں ہوسکتا)

حضرت مفتی صاحب نے انضباط اوقات، حفظ اوقات، اصول کی پابندی اور

متواتر محنت، شبانہ روز مطالعہ وتحقیق اور علمی اشتغال بلکہ علمی انہماک واعتکاف کی برکات سے عظمت کا مقام بلند حاصل کیا تھا، ان کی سیرت کا یہ گوشہ ان کے اخلاف وتلامذہ کے لئے بہت نصیحت آموز اور فکر انگیز ہے اور یہ سبق دیتا ہے کہ راہِ علم کے مسافروں کو یہ مرحلے سر کئے بغیر منزل نہیں ملا کرتی اور عمل پیہم اور جہد مسلسل کے بنا رفعت اور سیادت کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

درد فراق

یوں تو حضرت کے جانے پر پورے کاروانِ علم نے اجتماعی یتیمی کی ٹیس محسوس کی مگر اس حقیر کے لئے قدیم، عقیدتمندانہ اور اٹوٹ تعلق اور رشتۂ محبت کی بنا پر حضرت کا سانحۂ وفات بے انتہا صاعقہ اثر ثابت ہوا، جس صبح کو یہ آفتاب علم وفضل غروب ہوا، اس سے پہلے کی رات شدید علالت کی خبروں کی وجہ سے بے قراری اور کروٹ بدلنے اور مسلسل دعا میں گزری، حضرت نے مسافرت اور غریب الدیاری میں وطن سے دور لاک ڈاؤن کے ماحول میں ”مہتاب سے تابندہ تر زندگی“ گزار کر صبح کے تاروں سے بھی خوب تر سفر آخرت شروع کیا، اللہ نے انہیں ایسے وقت اپنے دربار میں بلایا جب رمضان کا مقدس موسم بہار سایہ فگن تھا، عشرۂ اخیر کی رونقیں سب کو شاداب کررہی تھیں، رحمت کے انوار برس رہے تھے اور کرم نوازیاں عروج پر تھیں اور ایسے ماحول میں بلایا جب پورا ملک بند تھا، نقل وحرکت پر پابندی تھی، گنتی کے چندلوگ آخری آرام گاہ تک پہنچانے میں شریک ہوسکے، ان کا مزاج ہنگاموں سے نفور کا تھا، گویا اس سفر میں بھی منجانب اللہ ان کے اسی مزاج کی رعایت رکھی گئی ہو۔

ہم جیسے نہ جانے کتنے عقیدت مندان کی رحلت پر غمزدہ اور مزید برآں آخری مرحلے میں شرکت کی سعادت نہ مل سکنے پر دل مسوس کررہ گئے اور آج ایک ماہ سے زائد کی مدت گزر جانے کے بعد بھی قبر پر حاضر ہوکر دعا کی صورت عقیدت کی سوغات پیش کرنے کی راہیں مسدود ہیں، دل چاہتا ہے کہ عقیدت ومحبت کے پروں سے پرواز کرتے ہوئے ممبئی کے اس گورستان تک حاضری دوں جسے حضرت کی آخری آرام گاہ بننے کا شرف میسر آیا اور

وہاں پہنچ کر آنسوؤں اور دعاؤں کا نذرانہ پیش کرکے پہلے ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

اور پھر شاعر کی زبان میں خاکِ قبر کو مخاطب کرکے یوں گویا ہوں ؎

اے خاکِ تیرہ: دلبرِ ما را نگاہ دار
ایں نورِ چشم ماست کہ در بر گرفتہ ای

اور پھر یہ کہتے ہوئے بادیدۂ نم اور بادل پُرغم رخصت ہوں ؎

تری لحد پہ خدا کی رحمت
تری لحد کو سلام پہنچے

غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ وَأَنْزَلَ عَلَيْهِ شَآبِيبَ رَحْمَتِهِ وَأَسْكَنَهُ جَنَّاتِهِ الْعُلٰى وَنَعِيمَهُ الْمُقِيمَ.

* * *

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر

مفتی عمران اللہ صاحب قاسمی

استاذ ادب عربی دارالعلوم دیوبند

علمی گیرائی، فنی مہارت، تصنیف وتحریر کا نفیس ذوق، تفہیم کا عمدہ ملکہ، تدریس کا اچھوتا اسلوب، کسی بھی مضمون کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنا کر فہم مخاطب کے قریب تر کر دینے کا ہنر، بافیض وباتوفیق استاذ، گفتگو میں ٹھہراؤ، تہذیب وشائستگی، لہجہ میں وقار واعتماد، حدیثِ نبوی سے خصوصی مناسبت، تفسیر قرآن کا محبوب اشتغال، بلند پایہ محدث، مفسر، بالغ نظر فقیہ، کثیر المطالعہ، کثیر التصانیف، محنت وجد وجہد امتیازی وصف، ہمہ وقت علمی مصروفیت تلامذہ اور مستفیدین کا جم غفیر، عقیدت مندان ومحبین کی بہتات، مگر رہن سہن، لباس ووضع سادہ، آرام وتنعم سے دور، شانِ استغنائی نمایاں، ایسے ہی تھے ہمارے ہر دل عزیز استاذ محترم، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمہ اللہ، جو عالم اسلام کی عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین تھے، ان سے ربط وانتساب باعث فخر اور استفادے کے مواقع کو غنیمت شمار کیا جاتا تھا۔

۱۹۹۳ء کی بات ہے، راقم مادر علمی جامعہ عربیہ اعزاز العلوم ویٹ میں زیر تعلیم تھا، امتحان نزدیک تھے، امتحانات کی تیاری میں عمدگی اور تیزی لانے کی ترغیب دیتے ہوئے محترم اساتذہ کرام نے خبر سنائی، کہ اس مرتبہ امتحان کے لئے ہم لوگوں کے استاذ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری بھی تشریف لا رہے ہیں اسی لمحہ پہلے پہل حضرت والا کے نام سے آشنائی ہوئی، اس کے بعد دن بدن اساتذہ کرام کی مجالس میں حضرت والا کا محبت بھرا تذکرہ سننے کو ملتا، متعین تاریخ میں دیگر ممتحنین کے ساتھ حضرت مفتی صاحب رونق افروز ہوئے۔

سردی کا موسم تھا عربی رومال، گرم عبایا، پیروں میں پشاوری جوتا، رفتار وگفتار سے وقار جھلکتا ہوا۔ اساتذہ وطلبہ شاداں وفرحاں نظر آتے۔ حسن اتفاق ہماری جماعت سال دوم عربی کی ایک کتاب ہدایۃ النحو کا امتحان بھی حضرت سے متعلق ہوا، اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت والا نے احقر سے ہدایۃ النحو میں ایک مقام سے مکمل دو صفحہ کی عبارت پڑھوا کر ترجمہ سنا اور دوسرے مقام پر چند لائن عبارت وترجمہ کے بعد مطلب بھی دریافت کیا، امتحان کی یہ سعادت مدرسہ میں ہم لوگوں کے لئے باعث افتخار تھی، اسی وقت سے احقر کے ذہن میں حضرت والا کی پروقار شخصیت اور عظمت کا نقش قائم ہوگیا، جس میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہا۔ پھر چند سال بعد دارالعلوم میں داخل ہوکر حضرت والا سے ترمذی شریف اور طحاوی شریف پڑھنے کی سعادت ملی اوراس کے بعد تو قریب سے دیکھنے، برتنے کے کثیر مواقع ملے، یقیناً حضرت والا کی ذات متعدد اہم خصوصیات کا مرقع تھی آپ کی بدولت مسند حدیث کوعظمت واعتماد حاصل تھا، یہی وجہ ہے کہ آپ کی وفات کو محبین، تلامذہ ایک نہ پر ہونے والا خلا گردانتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ ۱۹۴۰ء مطابق ۱۳۶۰ھ کو موضع کالیڑا ضلع بناس کانٹھا گجرات میں پیدا ہوئے تھے، والد صاحب نے از خود تعلیم کا آغاز کرایا، مگر وہ اپنی مصروفیات کے سبب زیادہ توجہ نہ دے سکے اس وجہ سے انھوں نے آپ کو گاؤں کے مدرسہ میں ہی داخل کردیا، یہاں پر آپ نے مکتب کی تعلیم مکمل کی، اس کے بعد چند ماہ دارالعلوم چھاپی میں رہے پھر شہر پالن پور کے مدرسہ میں داخل کردئے گئے، وہاں تقریباً چار سال فارسی، عربی کی ابتدائی کتب پڑھیں، بعدازاں مزید تعلیم کے لئے سہارنپور کا رخ کیا، اور مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں چند سال داخل رہ کر اساطین علم وفن اساتذہ سے مختلف فنون کی تعلیم پائی، بالآخر فقہ وحدیث وتفسیر اور دیگر فنون میں اعلی تعلیم کے لئے ۱۳۸۰ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۳ء میں جو دارالعلوم کا سوواں سال ہے دورۂ حدیث سے فراغت پائی، اس کے اگلے سال اساتذہ کی تربیت میں رہ کر فتوی نویسی کی مشق کی، اس تعلیمی سلسلہ کی تکمیل کے بعد آپ نے اساتذہ کرام کے مشورے سے ۱۳۸۴ھ میں تدریس کا

آغاز کیا اور دار العلوم اشرفیہ راندیر میں آپ کا تقرر ہوا، جہاں پر نو سال تک مختلف فنون اور حدیث کی اعلی کتابیں زیر درس رہیں اس کے بعد اکابر واساتذہ کے مشورے سے ۱۳۹۳ھ میں دار العلوم دیوبند تشریف لے آئے، یہاں تقریباً ۴۸/ سال مسند علم کو زینت بخشی، یہ حضرت والا کی زندگی کا سوانحی اختصار ہے۔

حضرت والا کی زندگی کا قریب سے مشاہدہ کرنے والے سبھی اس بات کے معترف ہیں کہ حضرت مفتی صاحب کی زندگی تابندہ نقوش اور ایسے جلی عنوانات سے عبارت تھی جو علم کے متلاشی کے لئے لازم تقلید ہیں، کامیابی کی طلب رکھنے والوں اور سرخ روئی کے جویا کو ان عناوین کی روشنی میں ہی سفر شروع کرنا چاہیے۔

جد وجہد، علمی انہماک وہمہ وقتی مصروفیت

حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کی زندگی کا سب سے نمایاں اور امتیازی وصف محنت وجد وجہد ہے، بلکہ آپ کی پوری زندگی جد وجہد سے عبارت تھی، آپ کے ہاں اکثر اوقات تصنیف ومطالعہ اور درس کی مصروفیت رہتی، اپنے مقصد کو پانے کے لئے بہت جد وجہد کرتے کبھی فارغ نہ رہتے، مطالعہ، علمی مذاکرہ، درس وتدریس، خطاب وتقریر، تصنیف وتالیف، ہمہ وقت کوئی نہ کوئی شغل رکھتے تھے، محنت وجد وجہد کا یہ شغف زمانہ طالب علمی ہی سے تھا۔ استاذ محترم حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب پالنپوری جو حضرت مفتی صاحب کے چھوٹے بھائی بھی ہیں، حضرت کی دور طالب علمی کی کیفیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتلاتے ہیں۔"

> حضرت بھائی صاحب مجھ سے تقریبا دس سال بڑے تھے وہ شروع ہی سے محنتی مزاج واقع ہوئے تھے جس وقت وہ دار العلوم دیوبند میں تکمیل افتاء کے طالب علم تھے مجھے اپنے ساتھ دیوبند لے آئے اور میرا حفظ قرآن شروع کرادیا، بھائی صاحب اپنی درسی مصروفیت، کتب کے تکرار ومطالعہ اور فتاوی تحریر کرنے کے ساتھ مجھے حفظ کراتے تھے، میرا سبق اور آموختہ خود سنتے تھے اور خود بھی

حفظ کرتے تھے۔ مسجد قدیم سے متصل، باب قاسم سے باہر والا وہ کمرہ جس کا دروازہ باہر کی طرف کھلتا ہے اور جو آج کل شعبہ صفائی وچمن بندی کا دفتر ہے، آپ کی رہائش گاہ تھا، رات کو اس کے باہر والے چبوترے پر بیٹھ کر مطالعہ کرتے، وہیں پر پھر اپنے قرآن کریم کے حفظ کا سبق یاد کرنے لگتے، جسے صبح کو اپنے استاذ شیخ عبدالوہاب محمود مصری کو سناتے تھے، نیز اپنے تعلیمی امور، شعبہ افتا کی مصروفیات، میرے (مفتی محمد امین صاحب) اسباق حفظ وآموختہ کو سننے، اور خود اپنا حفظ قرآن کا سبق یاد کر کے سنانے کے ساتھ وہ بہت پابندی سے اساتذہ کرام خصوصاً حضرت مفتی سید مہدی حسن شاہجہاں پوری صدر مفتی دار العلوم دیو بند، حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی صدر المدرسین دار العلوم دیو بند اور شیخ عبدالوہاب محمود مصری استاذ عربی دار العلوم دیو بند کی خدمت بھی انجام دیتے تھے'' مذکورہ مصروفیات وقت اور محنت کی متقاضی ہوتی ہیں، حضرت مفتی صاحب اپنی محنت، لگن اور شوق کے ساتھ ضروری اشیاء کی فراہمی غذائی سامان کی خریداری کر کے لاتے، اور دوسرے کام بھی برضا ورغبت کرتے، اور ان میں عموماً ناغہ نہ ہوتا تھا۔

میرِ کارواں حضرت مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مہتمم دار العلوم دیو بند فرماتے ہیں: کہ ۱۳۸۲ھ میرا دار العلوم میں داخلہ کا سال ہے اور یہی حضرت مفتی صاحب کا دورہ حدیث سے فراغت کا سال ہے ۱۳۸۳ھ میں وہ تکمیل افتاء کے طالب علم تھے، ان کی محنت ویکسوئی مثالی تھی وہ اس وقت دار العلوم کے نمایاں ممتاز طلبہ میں شمار ہوتے تھے، یکسوئی کے ساتھ اپنے تعلیمی امور میں مصروف رہتے تھے، ایک کام پورا کر کے دوسرا شروع کر دیتے تھے اپنے مقصد کے علاوہ دوسری طرف بالکل متوجہ نہ ہوتے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ عید الاضحیٰ کے موقع پر ایک مرتبہ وہ اپنے کمرے سے دار جدید کی طرف جا رہے تھے، احاطہ مولسری میں

میری ملاقات ہوئی فرمانے لگے، ابوالقاسم جی چاہتا ہے کہ آج دار جدید دیکھ لوں، کئی ماہ سے ادھر آنا نہیں ہوا، یہ ان کی محنت ویکسوئی کا حال تھا۔ جب کہ ان کے رہائش والے کمرے سے دار جدید کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں ہے کہ وہاں تک پہنچنے میں کافی وقت صرف ہوتا ہو، اس لحاظ سے حضرت مفتی صاحب کا یہ واقعہ موجودہ وقت کے طلبہ کے لئے کسی استعجاب سے کم نہیں ہے۔ دور طالب علمی کی یہی محنت، یکسوئی اور جدوجہد حضرت مفتی صاحب کے کامیاب ہونے کی کلید اور علمی دینا میں عظمت ومحبوبیت کے حصول کا سبب ہے اسی محنت وجدوجہد کی بدولت آپ اعلی مقام پر فائز ہوئے۔

عموماً تعلیمی مرحلہ کی تکمیل کے بعد مزاج بدل جاتا ہے، طلب علم کے زمانے میں یکسوئی کے ساتھ محنت وجدوجہد کرنے والے بیشتر افراد تدریس کے میدان میں قدم رکھتے ہی محنت کا شغف باقی نہیں رکھ پاتے، آرام وراحت کے اسباب کا حصول یا دیگر مصروفیات فطرت ومزاج کو بدل دیتی ہیں، مشاہدہ اس کا گواہ ہے، مگر حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کا معاملہ مختلف تھا، یکسوئی اور جہد مسلسل فطرت اور مزاج کا حصہ بن گئی تھی آپ نے دور طالب علمی کی طرح تدریس کے زمانے میں بھی انہماک ویکسوئی، اور جدوجہد کو جاری رکھا اور کوئی بھی چیز کوئی بھی صورتحال آپ کی سعی پیہم میں خلل انداز نہ ہوئی، دارالعلوم اشرفیہ راندیر میں مدرسی کے زمانے کی کیفیت یہی بیان کی جاتی ہے، جبکہ دارالعلوم دیوبند میں تو اساتذہ وطلبہ سبھی اس کے شاہد ہیں۔

مہمانوں اور طلبہ سے ملاقات کے لئے عصر کے بعد کا وقت متعین تھا، اس وقت بھی عموماً علمی مشغلہ جاری رہتا، طلبہ کی طرف سے پیش کردہ سوالات کے جوابات یا شبہات کا ازالہ، کسی علمی مسئلہ کا مذاکرہ رہتا۔ دیگر اوقات میں ملنے کی اجازت نہ تھی البتہ کوئی اہم اور ضروری معاملہ درپیش ہونے کی صورت میں ملاقات ممکن تھی۔ کسی اہم وجہ یا سخت بیماری کی وجہ سے ہی علمی مشغلہ موقوف ہوتا ورنہ بیماری کے ایام میں بھی بقدر استطاعت مصروف رہتے اور اپنا مشغلہ جاری رکھتے تھے۔ راقم کو اچھی طرح یاد ہے کہ سن ۲۰۰۲ء میں حضرت مفتی

صاحب کی ایک آنکھ پر لقوہ کا اثر ہو گیا تھا، آنکھ پر ورم کی وجہ سے وہ آنکھ بند رہتی تھی، کھل نہیں پاتی تھی، علاج سے افاقہ نہیں ہو رہا تھا، عام تشویش اور بے چینی کی صورت تھی، ان ایام میں بھی آپ نے درس موقوف نہ کیا۔ انھیں دنوں استاذ محترم حضرت مولانا قاری شوکت علی صاحب مہتمم جامعہ عربیہ اعزاز العلوم ویٹ حضرت مفتی صاحب کی عیادت کے لئے دیوبند وارد ہوئے، عصر کے بعد حضرت مفتی صاحب کے در دولت پر حاضری ہوئی احقر بھی ساتھ تھا تو دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب ''رحمۃ اللہ الواسعہ'' کی کمپوز شدہ جلد پر ایک طالب علم کی مدد سے نظر ثانی فرما رہے ہیں، علیک سلیک کے بعد حضرت نے کاغذات ایک طرف رکھے مزاج پرسی کے بعد گفتگو کا بے تکلف دور چلا، حضرت قاری صاحب نے فرمایا کہ اس پریشانی کے وقت میں آپ کو آرام کی زیادہ ضرورت ہے، تصنیف وغیرہ کا یہ کام صحت یابی تک موقوف کر دیجئے، حضرت مفتی صاحب کا جواب تھا، قاری صاحب! ابھی ایک آنکھ سلامت ہے اس سے میں اچھی طرح دیکھ سکتا ہوں شاید اللہ تعالی نے اس آنکھ کو اسی لئے سلامت رکھا ہو کہ میں اپنے باقی ماندہ کام پورے کرلوں، لہذا میں اپنے بقیہ کاموں کو پورا کرنے میں لگا ہوں۔ پھر جلد ہی حضرت مفتی صاحب نے قاری صاحب سے اجازت لے لی اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے، بعد میں ڈاکٹر کی تبدیلی ہوئی دوسرے ڈاکٹر نے لقوہ تجویز کر کے علاج کیا اور جلد ہی شفا ہو گئی۔ احقر مذکورہ مجلس میں حاضر تھا، اس وقت بھی مفتی صاحب کے جواب سے سبھی متحیر ہوئے، اس کے بعد جب بھی اس مجلس کی یاد آتی ہے تو حضرت مفتی صاحب کے الفاظ کانوں میں کھٹکنے لگتے ہیں، اپنی کاہلی وسستی پر ندامت کے ساتھ حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کی جد وجہد، وقت کی قدر دانی اور سعی پیہم پر رشک آنے لگتا ہے۔

ایک مرتبہ ششماہی امتحان کے بعد وطن سے واپسی ہوئی تو ہم چند ساتھی حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت نے باری باری تعطیل کے ایام کی مصروفیت دریافت کی کہ ان دنوں میں تم نے کیا کیا؟ لاشعوری اور بے پرواہی کا غلبہ تھا، کسی کے پاس معقول جواب نہ تھا، حضرت نے اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے مختصر الفاظ میں وقت کی قدر دانی

کی تلقین کی پھر اس کے بعد بتلایا کہ ان تعطیل کے ایام میں میں نے کافیہ پر عربی حاشیہ کی تکمیل کی ہے، جو طباعت کے لیے گئی ہوئی ہے۔ درس نظامی سے وابستگی رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ کافیہ فن نحو کی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے، حضرت رحمہ اللہ نے درس کا سلسلہ موقوف ہونے کے ایام میں یہ وقیع حاشیہ تحریر فرمایا جو الوافیہ کے نام سے دستیاب ہے۔

تفہیم کا انفرادی اسلوب اور درس کی مقبولیت

تعلیم سے فراغت کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اصلاً تدریس کا مشغلہ ہی اختیار کیا، اور اپنی جد و جہد، علمی پختگی، حسن بیان کی بدولت علمی دنیا میں امتیازی مقام حاصل کیا۔ حضرت مفتی صاحب خطاب کے دوران اکثر یہ واقعہ بیان کرتے تھے کہ جب میں تدریس کے لئے راندیر جانے لگا تو استاذ محترم حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر ہوکر نصیحت کی درخواست کی، آپ نے چلتے وقت آخری نصیحت فرمائی: مولوی صاحب تین باتیں یاد رکھنا (۱) جو بھی پڑھانا فن دیکھ کر پڑھانا اس سے علم میں اضافہ ہوگا (۲) سنت کی پیروی کرنا عوام میں مقبولیت ہوگی (۳) طلبہ کو اپنی اولاد سمجھنا۔ حضرت مفتی صاحب فرماتے تھے کہ میں اپنے استاذ کی ان قیمتی نصائح پر زندگی بھر عمل پیرا رہا ہوں اور جو کتاب بھی پڑھانے کے لئے ملتی ہے میں اس کو فن دیکھ کر ہی پڑھاتا ہوں، چنانچہ حضرت مفتی صاحب پوری تیاری اور حسن ترتیب کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں درس دیتے تھے، وہ تفہیم کی انفرادی صلاحیت رکھتے، اس کے لئے تمہید اور اس طرح مقدمات قائم کرتے کہ اصل مقصود تک ذہن کی رسائی ہو جاتی، آسان و مختصر جملوں والی تعبیرات کے ذریعہ اپنی بات پیش کرنے کا عجیب ملکہ ان کو حاصل تھا۔ احقر نے ترمذی شریف اور طحاوی شریف حضرت والا ہی سے پڑھی، ان دونوں کتابوں کے درس میں ان کا محدثانہ طرز اور شانِ فقاہت خوب اجاگر ہوتی، حدیث پر مفصل کلام، مرتب گفتگو، متن پر کلام کے ساتھ سند پر بحث، دیگر مسالک کے دلائل، واردشدہ شبہات کا ازالہ اور مسلکِ احناف کے ترجیحی دلائل، ائمہ مذاہب کے نظریات و دلائل کی وضاحت کرنے کے ساتھ حضرت مفتی صاحب اقوال مختلفہ کا تجزیہ

ایسے اچھوتے اسلوب میں پیش کرتے کہ ہر قول حدیث شریف کے قریب نظر آتا اور بہ آسانی سمجھ میں آجاتا کہ یہ اختلاف نص فہمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ دھیمی آواز، باوقار لہجہ، گفتگو میں ٹھہراؤ کے ساتھ درس کی تقریر جاری رہتی اور پورے سال اسی طرح تسلسل رہتا، نص سے مسئلہ کے استنباط کی تفہیم پر کلام کرتے ہوئے ایسا سہل اسلوب اپناتے کہ کسی کے لئے کوئی دشواری نہ رہتی، انہیں خصوصیات کی بدولت آپ کا درس بے پناہ مقبول تھا، طلبہ جوق در جوق کھنچے چلے آتے اور ہمہ تن گوش ہوکر سیرابی حاصل کرتے، احقر نے غبی، لاپرواہ، سست ہر نوع کے طالب علم کو آپ کے درس میں شرکت کا حریص پایا، باہر سے آنے والے مہمانان جن میں دیگر مدارس کے طلبہ اور اساتذہ بھی ہوتے وہ بھی آپ کے درس میں شرکت کا شوق رکھتے تھے اور آپ کی شان محدثانہ کے قائل ہوتے۔ آپ نے تدریس کے پورے دورانیے میں جو تقریباً ساٹھ سالوں پر محیط ہے مختلف فنون کی متعدد کتابوں کا درس دیا مگر ترمذی شریف، طحاوی شریف، بخاری شریف اور حجۃ اللہ البالغہ کے اسباق کو خاص شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی۔

تقریر وخطابت

متعلقین واحباب کی طلب پر فارغ اوقات میں مختلف مقامات پر خطاب کے لئے بھی تشریف لے جاتے تھے، علمی اور بصیرت افروز خطاب فرمایا کرتے تھے۔ عام فہم لب ولہجہ، مجلسی انداز، تکلفات سے پاک، آورد سے خالی، انداز بیان سادہ، نہ پرشکوہ الفاظ اور نہ انوکھی تعبیرات کہ گفتگو سامعین کے سروں سے گذر جائے، موقع اور احوال کی مناسبت سے گفتگو کے معیار میں اتار چڑھاؤ رہتا تھا، اہل علم کی مجلس میں ان کے علم کے مطابق اور عوام الناس کے مجمع میں ان کے فہم کے مناسب۔ حضرت والا خشک عنوان کو تر وتازہ بنا کر پیش کرنے کا ہنر بھی جانتے تھے اور بعض مواقع پر تو صرف حضرت والا کا خطاب ہی بہتر اور مناسب معلوم ہوتا تھا۔ دار العلوم دیوبند میں تعلیمی سال کے آغاز پر اساتذہ کرام کی خصوصی نشست میں، مدرسہ ثانویہ میں تعلیمی سال کے آغاز پر ابتدائی جماعتوں کے طلبہ کے مابین پھر مسجد رشید میں تمام طلبہ کے مابین آپ کا خطاب ہی متعین طور پر ہوتا تھا، جس میں عموماً سورہ

علق کی ابتدائی آیات تلاوت فرما کر تعلیم کی اہمیت، طلب علم کے مراحل بیان کئے جاتے، اسی طرح رابطۂ مدارس عربیہ کے اجلاس اور دیگر مواقع پر بھی کلیدی خطاب آپ ہی کا ہوتا تھا اکثر منتخب آیات قرآنیہ کی تلاوت سے خطاب شروع ہوتا، آیات کی تشریح کرتے ہوئے مضمون کا حالات حاضرہ سے انطباق، ان سے ملنے والا سبق ورہنمائی بیان کرتے، معاشرے کی برائیوں اور کج روی کو اجاگر کرتے، اس سلسلے میں ان کی بے باکی بھی خوب دیکھنے میں آتی۔

حضرت مفتی صاحب کی تفہیم کا جوہر درس کے علاوہ، خطاب میں بھی خوب ظاہر ہوتا تھا، بعض فقہی مسائل، شرعی اصول بہت آسانی وسلیقہ سے عوام کے ذہن نشیں کردیتے تھے، پروگرام اور اجلاس کا مقصد واضح کردیتے۔ جب ایک مخصوص فرقہ کی ریشہ دوانی اور دریدہ دہنی پر بند لگانے کی نیت سے جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنی علیہ الرحمہ کی صدارت میں تال کٹورہ اسٹیڈیم نئی دلی میں تحفظ سنت کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا، عوام وخواص کا مجمع، علماء وعوام کا جم غفیر تھا، پروگرام کی تمہیدات کے بعد اظہار خیال وخطاب کا سلسلہ جاری تھا، ناظم اجلاس حضرت مولانا عبدالعلیم صاحب فاروقی مدظلہ نے حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری کا نام پکارا، آپ نے بڑے سلیقہ سے مقاصد اجلاس کو سمجھایا پھر مرتب ومدلل گفتگو کرتے ہوئے سنت کی وضاحت، اس کے تحفظ کی ضرورت، تقلید وعدم تقلید کی توضیح اور اہل السنہ والجماعہ سے اس مخصوص فرقے کے اصولی اختلاف کو ظاہر کرکے سامعین کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا، اس خطاب کے بعد سامعین کی تشنگی دور ہوئی، اس فرقہ کی ریشہ دوانیوں کے تدارک سے آگاہی ہوئی۔ حضرت کے خطاب کے بعد سامعین کے چہروں سے اطمینان کا احساس اور کسی مشکل بات کو سمجھ جانے کی خوشی صاف ظاہر ہوتی تھی۔

تصنیف وتالیف

تصنیف وتالیف بھی آپ کا محبوب مشغلہ تھا، تدریس کی طرح آپ کا اسلوب تحریر صاف، سادہ اور دل نشیں ہوتا تھا، تسہیل کو ہی ترجیح ہوتی تھی، آپ کے قلم سے نکلی ہوئی تمام کتابوں میں اسی ضرورت کو پیش نظر رکھا گیا ہے، جس کی بنا پر تقریباً سبھی کو قبول عام حاصل

ہے، چھوٹی بڑی تمام تصانیف پچاس کے قریب ہیں، اس اعتبار سے آپ کثیر التصانیف کی فہرست میں شامل ہیں، احقر کی کوتاہ نظر میں تدریسی مصروفیت کے ساتھ اتنا کثیر تصنیفی کام کرنے کی کوئی دوسری مثال ہمارے طبقہ میں نہیں ہے، درس نظامی کے فنون میں سے اکثر پر آپ نے خامہ فرسائی کی اور وقیع قابل قدر کتابیں تصنیف فرمائیں، بعض فنون میں ایک سے زائد کتابیں منظر عام پر آئیں، مثلاً تفسیر میں: ہدایت القرآن کی آٹھ جلدیں۔ اصول تفسیر میں: الفوز الکبیر کا عربی ترجمہ اور اس کی شرح العون الکبیر۔ فن حدیث میں: تحفۃ القاری شرح صحیح بخاری بارہ جلدیں، تحفۃ الالمعی شرح سنن ترمذی آٹھ جلدیں، ایضاح المسلم شرح صحیح مسلم تا کتاب الایمان، زبدۃ الطحاوی عربی شرح شرح معانی الآثار، محفوظات اول دوم سوم اصول حدیث میں: فیض المنعم شرح مقدمہ مسلم، تحفۃ الدرر شرح نخبۃ الفکر، شرح علل الترمذی۔ حکمت شریعت میں: رحمۃ اللہ الواسعۃ شرح حجۃ اللہ البالغہ پانچ جلدیں، تعلیق حجۃ اللہ البالغہ (حاشیہ عربی) دو جلدیں، کامل برہان الٰہی چار جلدیں۔ فقہ میں: حاشیہ امداد الفتاوی آپ فتوی کیسے دیں؟۔ اصول فقہ میں: مبادی الاصول، معین الاصول۔ نحو میں: آسان نحو ہادیہ شرح کافیہ، الوافیہ حاشیہ عربی بر کافیہ۔ صرف میں: آسان صرف، گنجینہ صرف شرح پنج گنج۔ منطق میں: آسان منطق، مفتاح التہذیب شرح التہذیب، ارشاد الفہوم شرح سلم العلوم۔ فلسفہ میں: مبادی الفلسفہ، معین الفلسفہ۔ تذکرہ وسوانح میں: حیات امام طحاوی، حیات امام ابو داؤد، تذکرہ مشاہیر محدثین۔ مذکورہ کتب کے علاوہ ’’دین کی بنیادیں اور تقلید کی ضرورت‘‘ ’’تسہیل ادلہ کاملہ‘‘ ’’ایضاح الادلہ‘‘ ’’آسان فارسی حصہ اول، دوم‘‘ وغیرہ قابل ذکر ہیں، حضرت کی تصنیف کردہ کتب کے جملہ صفحات کی تعداد تینتیس ہزار چھ سو بیس بنتی ہے جو ان کی مکمل زندگی کے جملہ ایام سے زائد ہے جبکہ کسی بھی انسان کی عمر کے ابتدائی بیس سال تعلیم وتربیت اور کھیل کود کی نذر ہو جاتے ہیں اگر یہ بیس سال نکال کر صرف عملی زندگی کے ساٹھ سال باقی رکھے جائیں اور ان کے ایام کا تقابل تصنیفات کے صفحات سے کیا جائے تو صفحات کی تعداد کافی بڑھ جاتی ہے۔ آج کل اس قدر کثیر صفحات کا مطالعہ بھی دشوار ہوتا

ہے، لہذا حضرت رحمہ اللہ کا تدریسی مصروفیت کے ساتھ اتنا تصنیفی کام کر دینا عظیم کارنامہ ہے۔

تصانیف کے ذیل یہ پہلو بھی نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ جہاں آپ کے قلم گہر بار سے، تحفۃ القاری، تحفۃ الالمعی، رحمۃ اللہ الواسعہ، کامل برہان الٰہی، ہدایت القرآن جیسے عظیم شاہکار وجود پذیر ہوئے وہیں ابتدائی اور مبادی حیثیت کی کتب بھی منظر عام پر آئیں جن میں محفوظات، آسان منطق، آسان نحو، آسان صرف، آسان فارسی، مبادی الاصول وغیرہ شامل ہیں، جبکہ عام طور پر عظیم وضخیم کتابوں کے مصنفین ابتدائی کتب کی طرف متوجہ نہیں ہو پاتے ان کا مطمح نظر زیادہ تر بڑی تصانیف ہوتی ہیں، اس حوالے سے آپ کی ذات میں جامعیت پائی جاتی ہے۔ کہ آپ نے مبادی، ابتدائی، متوسط اور اعلی ہر درجہ کی کتابیں تصنیف فرمائیں، مختصر کتابچے، متوسط معتدل کتابیں اور ضخیم مطولات بھی تحریر کیں۔ ایسی جامعیت کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

علمی مسائل میں چھوٹوں سے تبادلہ خیال

علم واستعداد کی پختگی، محدثانہ شان، فقیہانہ بصیرت، نصف صدی سے زائد تدریسی تجربہ، پچاسوں کتابوں کے مصنف، ہر فن پر بابصیرت نگاہ رکھنے کی بنا پر علمی دنیا میں آپ کو اعتبار واستناد حاصل تھا مگر پھر بھی بہت سوچ سمجھ کر رائے قائم کرتے تھے، آپ کی ایک عادت تو ہر کسی کے اپنانے کے قابل ہے وہ یہ کہ مطالعہ یا تصنیف کے دوران اگر کہیں ضرورت محسوس کرتے بلا تکلف اپنے چھوٹوں کے ساتھ تبادلۂ خیال کر لیتے اور بشاشت کے ساتھ چھوٹوں کی رائے کو بھی قبول کر لیتے، اس کا اظہار بھی کر دیتے تھے، حضرت مفتی خورشید انور صاحب ناظم تعلیمات دار العلوم دیوبند، مفتی اشتیاق احمد صاحب مفتی کلیم الدین صاحب اساتذہ دار العلوم، مفتی محمد نعمان مفتی دار العلوم دیوبند وغیرہ سے اکثر تبادلۂ خیال ہوتا رہتا تھا اسی طرح اساتذہ تجوید وقرأت سے بھی قواعد تجوید، اختلاف قرأت وغیرہ پر مذاکرہ کر لیتے اس میں ذرا بھی جھجھک کا اظہار کرتے نہ بڑا پن جتلاتے، اس کا مقصد اطمینان کا حصول اور دوسروں کو ترغیب دینا ہوتا تھا۔ موجودہ دور میں جبکہ تفوق وبرتری کا مزاج غلبہ پاچکا، کسی بھی

مسئلہ سے متعلق دوسروں سے گفتگو کرنا قصر شان تصور کیا جاتا ہے اور مسئول عنہ بھی تنقیص سائل میں مبتلا ہو جاتا ہے، ایسے دور میں حضرت والا کا یہ طرز عمل بہت معنویت رکھتا ہے، بلکہ علم کے ہر خوشہ چیں کیلئے حرز جان بنانے کے لائق ہے۔

استغناء وبے نیازی

آپ نہایت حلیم، قانع اور مستغنی واقع ہوئے تھے، آپ کے رہن سہن، لباس ووضع سے استغنائی شان نمایاں رہتی تھی، کثیر العیال ہونے کے سبب گھریلو مصارف زیادہ ہو گئے مگر کبھی کسی کے سامنے اس کا ذرا بھی اظہار نہیں فرمایا بلکہ استغنا کا دامن تھامے رکھا، جب وسعت وفراخی ہوئی تب بھی کبھی دولت وجائداد کو اہمیت نہ دی۔ کافی دنوں پہلے کی بات ہے جب آپ دیوبند میں اپنا مکان تعمیر کرا رہے تھے، آپ کے پڑوسی نے معمار سے کہا کہ اس دیوار میں ہماری طرف تھوڑی جگہ چھوڑ کر ایک طاق بنا دینا تا کہ ہم رات میں یہاں چراغ وغیرہ رکھ لیا کریں، معمار نے سنی ان سنی کر دی اور طاق نہیں بنایا، دیوار اوپر تک تعمیر ہو چکی تھی، اگلے روز پڑوسی نے حضرت مفتی صاحب سے کہا ہم نے اس معمار سے یہاں پر دیوار میں ایک طاق بنانے کو کہا تھا؟ حضرت والا نے معمار سے کہا کہ بھائی ان کے لئے جہاں پر یہ کہتے ہیں طاق بنا دو۔ معمار نے از راہ ہمدردی عرض کیا حضرت آپ بہت بھولے آدمی ہیں، یہاں کا ماحول نہیں سمجھتے ہیں کل کو اس طاق کی وجہ سے یہ لوگ دیوار پر دعوی کر دیں گے کہ یہ دیوار ہماری ہے اس لئے میں نے نہیں بنایا، یہ بات سن کر حضرت برہم ہو گئے اور کام موقوف کرا کر پہلے وہ طاق بنوایا اور پھر معمار سے بولے اگر یہ لوگ کل کو اس طاق کی وجہ سے دیوار پر مدعی ہوئے اور دیوار کا مطالبہ کرنے لگے تو میں اپنی اولاد سے کہہ جاؤں گا کہ ان کو یہ دیوار دے دینا۔

حضرت مفتی صاحب کی ابتدائی زندگی عسرت میں گذری تھی، بعد میں جب وسعت وفراخی ہوئی تو امور خیر میں خاموشی کے ساتھ حصہ لیتے اور بہت کثرت سے خرچ کرتے تھے، محلّہ کی مسجد، نادار طلبہ اور دیگر ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرتے

تھے، جب بچوں کی تعلیم وشادی اور ضروریات رہائش وغیرہ سے فارغ ہوگئے تو دارالعلوم اشرفیہ راندیر اور دارالعلوم دیوبند سے وصول کردہ اپنی مکمل تنخواہ کا حساب لگا کر واپس فرمادی، پھر حسبتاً للہ بلا تنخواہ درس دینے لگے اور تادم واپسیں یہی معمول رہا، اس پر صابر وشاکر رہتے۔ اسی طرح مکان وجائداد میں سب بچوں کے حصے متعین کر کے ہر ایک کو سپرد کر کے خود فارغ کرلیا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی ایسی ہی خوبیوں وکمالات کا مجموعہ تھی، وہ ایسے وقت میں رخصت ہوئے جبکہ ان کے متعلقین ومستفیدین اور ہم جیسے نااہلوں کو پہلے سے زیادہ ان کی ضرورت تھی، حضرت والا کی وفات سے دنیا ایک محدث، فقیہ اور عالم باعمل سے محروم ہوگئی، مگر یقین ہے کہ اللہ کے بندوں کے درمیان وہ سرخ رو اور باعزت رہے۔ آخرت میں اللہ تعالی کے نزدیک بھی سرخ رو اور دنیا سے زیادہ عزت یافتہ ہوں گے۔ اللہ تعالی درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا رات کے تاروں سے بھی تیرا سفر

☆☆☆

سلطان العلماءؒ

کی چند خصوصیات اور نمایاں اوصاف وکمالات

خلیل الرحمٰن قاسمی برنی

استاذ محترم حضرت مولانا مفتی سعید صاحب قدس سرہٗ کا تعلق نفوس قدسیہ اور کاملین کی اس جماعت سے ہے جس کا ہر فرد درِ بے بہا اور یگانۂ روزگار تھا۔ ایسے حضرات کی تمام ادائیں اور عادتیں بعد والوں کے لئے مشعل راہ اور نمونہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لیے ان کی قابل تقلید باتوں کو سامنے لانا بڑے نفع اور خیر کی بات ہوتی ہے۔ مناسب سمجھا کہ آج کی تحریر میں حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کی چند نمایاں خصوصیات اور اوصاف کو پیش کیا جائے، تا کہ ہمارے اندر بھی ان کو اپنانے کا جذبہ پیدا ہو سکے۔

(۱) ٹھوس استعداد اور علمی کمالات

حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ٹھوس علمی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ استعداد کی پختگی اور قابل رشک علمی گہرائی و گیرائی کے حامل تھے۔ آپ کو تمام علوم وفنون اور معقول ومنقول میں درجۂ کمال حاصل تھا۔ ایشیاء کی سب سے عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں کم وبیش ۴۷؍سال تک علوم وفنون کی تدریس میں مشغول رہے۔ اس عرصہ میں ایک طویل مدت تک حدیث کا درس دیا اس لئے احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ آپ کے ذہن میں محفوظ تھا۔ اور ہر طرح کے مسائل سے تسلسل کی وجہ سے آپ کو اس فن شریف میں مکمل دسترس حاصل تھا۔ آپ کے درس کی خصوصیات میں یہ بات خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ آپ حدیث کے مفہوم کو دوسری احادیث پیش کر کے اس کی حقیقی وصحیح مراد متعین فرماتے۔ یہ بات اسی وقت ممکن ہے جب ذخیرہ حدیث پر پوری نگاہ ہو اور اس مبارک فن پر بصیرت والی نگاہ حاصل ہو۔

حدیث اور متعلقات حدیث میں آپ کی قابلیت، تبحر اور تعمق کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے

کہ کئی ہزار علماء وفضلاء کے آپ استاذ حدیث ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے آپ کے لئے شیخ الحدیث کا لقب پسند کیا ہے۔ آج سینکڑوں علماء اور فضلاء کے پاس آپ کی درسی تقریریں ضبط کی ہوئی ہیں اور خود راقم کے پاس بھی درس ترمذی کئی ضخیم کراسات میں محفوظ ہے۔ ان کو دیکھ کر اہل علم سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت کا علم حدیث میں کیا مقام تھا اور اس مبارک فن میں آپ کو کس قدر وسعت اور بصیرت حاصل تھی۔

حدیث کے بعد فقہ کا درجہ آتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ دارالعلوم دیوبند میں درس حدیث کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں حدیث پر جامع بحث کی جاتی ہے جس میں ائمہ اربعہ کے فقہی مسائل، ان کے مستدلات اور طریقۂ استدلال پر بھی توجہ دی جاتی ہے اور پھر امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کی رائے کو ترجیح بھی مقاصد درس میں شامل ہے۔ ظاہر ہے اس حیثیت کا درس اسی وقت وقت ممکن ہے جب ائمہ اربعہ کے مسلک اور ان کی فقہ پر تفصیلی نگاہ ہو۔

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کو چاروں فقہ پر مبصرانہ و تفصیلی مطالعہ حاصل تھا۔ آپ کے درس میں طلبہ کو کامل تشفی حاصل ہوتی تھی، اور احاطۂ دارالعلوم میں آپ کے درس کو مقبولیت کا درجہ حاصل تھا۔ آپ ایک طرف دور حاضر کے محدث بے بدل تھے تو دوسری طرف وسیع النظر مضبوط فقیہ بھی تھے آپ کو مسائل فقہیہ پر پورا عبور حاصل تھا۔ اسی طرح ان مسائل کے استحضار پر قدرت تامہ بلکہ وسعتِ علم کی بنا پر اقوال مختلفہ میں مرجحانہ و ناقدانہ نظر رکھتے تھے، اور بعض جگہ تفرادت کے بھی حامل تھے۔

حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ عربی زبان و ادب میں بھی کامل عبور رکھتے تھے عربی زبان میں کئی تصانیف ومقالات اور عربی زبان میں خطابت وتقریر سے آپ کی اس زبان پر قدرت و کاملیت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح نحو وصرف اور تفسیر و کلام میں بھی آپ کو کافی درک حاصل تھا۔ علاوہ ازیں آپ نے حالات زمانہ کے پیش نظر گجراتی اور انگریزی زبان بھی سیکھی، گجرات میں تدریس کے دوران ایک غیر استاذ سے ڈبل اجرت دے کر گجراتی سیکھی اور دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے دوران ساؤتھ افریقہ کے ایک طالب علم سے باقاعدہ انگریزی زبان سیکھی۔

حضرت نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ:

’’آج الحمدللہ میں انگریزی زبان میں اپنی ضرورتیں پوری کرنے پر قادر ہوں‘‘۔

(۲) اوقات کی حفاظت

استاذ محترم علیہ الرحمہ کی زندگی کا بہت ہی قیمتی اور روشن پہلو اور آنحضرت کی بڑی خصوصیت آپ کا انضباط اوقات ہے۔ آپ نے اپنی عمر عزیز کے ایک ایک لمحہ قدر کی اور اس کو ضائع ہونے سے بچایا۔ آپ نے اپنے آپ کو ہر ایسے مصرف اور مشغولیت سے دور رکھا جس کی وجہ سے آپ کے علمی سفر میں کوئی خلل پڑ سکتا تھا۔

آپ کو دیکھنے اور جاننے والو کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے۔ سب اس بات کی شہادت دیں گے کہ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کی چوبیس گھنٹے کی پوری زندگی طبعی تقاضوں اور دنیوی ضروریات کے علاوہ کسی نہ کسی چیز اور فائدے کے کام ہی میں گذرتی تھی۔ دار العلوم میں آتے تھے تو تدریس یا بوقت ضرورت تعلیمی وانتظامی مشوروں میں وقت گذرتا گھر میں رہتے تو درس کی تیاری، مطالعہ یا تصنیف وتالیف میں دیر رات تک مشغول رہتے۔ درمیان میں گھر کے بچوں کو بھی چھوٹی بڑی کتابیں پڑھاتے۔ الغرض آپ نے پورا ماحول ایسا بنا رکھا تھا کہ آپ کی زندگی کا کوئی لمحہ فضول نہ جائے۔ اسی کی برکات تھیں کہ خدائے عظیم نے آپ سے تن تنہا وہ کام لیا جو بڑی بڑی اکیڈمیاں اور جماعت نہیں کر پاتیں۔

لیس علی الله بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

(۳) اتباع سنت

حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کی ایک قابل قدر خصوصیت یہ تھی کہ ان کی پوری زندگی اور زندگی کے ہر ہر پہلو میں اتباع سنت کا جذبہ نمایاں تھا۔ چھوٹی سی چھوٹی بات میں اس بات کا اہتمام فرماتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس موقعہ پر طرز عمل کیا تھا۔ گفتگو اور درسی تقریروں میں بھی آپ اتباع سنت کو پیش نظر رکھتے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم جب گفتگو فرماتے تو انتہائی صاف اور واضح ہوتی تھی۔ دیکھنے اور سننے والے جانتے ہیں کہ آپ کی گفتگو کا انداز اور تقریر کا اسلوب بھی یہی ہوتا تھا۔ کبھی آپ کی گفتگو اور طرز کلام میں یہ بات محسوس نہیں کی گئی کہ الفاظ وحروف سمجھے نہ جا سکیں۔

(٤) تقویٰ اور تدین

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ اپنے پیش رو اکابر و اسلاف کی طرح اعلیٰ درجہ کے متقی

اور صاحب ورع انسان تھے۔ ان کی پوری زندگی میں احتیاط کا پہلو بہت نمایاں تھا۔ دارالعلوم دیوبند میں آپ کی ۴۷ رسالہ زندگی میں کوئی ایک بھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا کہ جس سے آپ کے تقویٰ و تدین پر آنچ آتی ہو۔ آپ نے اپنی زندگی کے تمام شعبوں کے لئے احتیاط کو پسند کیا۔ حتیٰ کہ طہارت، نظافت، معاملات، اخلاق و معاشرت، سب میں آپ پر احتیاط والا رویہ غالب تھا۔ اسباق کی پابندی، وقتِ معین پر درس میں حاضری آپ کی ضرب المثل تھی۔ آپ کے یہاں اوقاتِ درس میں کتر بیونت بڑی خیانت اور معیوب عمل تھا۔

(۵) بے مثال انداز تفہیم

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کی ایک خصوصیت اور امتیازی خوبی آپ کا بے نظیر انداز تفہیم و تدریس تھا۔ اسی لئے آپ کو طلبہ کے درمیان بہت مقبولیت اور محبوبیت حاصل ہوئی۔ درس میں آپ کا انداز گفتگو اور طرز کلام ایسا دل نشیں ہوتا تھا کہ شروع سے آخر تک ہر شخص پوری توجہ کے ساتھ سنتا۔ کَاَنَّ علی رؤسهم الطیور کا سماں رہتا۔ ہر ایک بغور پوری دل جمعی کے ساتھ ہمہ تن گوش رہتا۔ آپ کے سبق میں علوم و معارف کا ایسا فیضان ہوتا کہ ہر نکتہ پر طبیعت عش عش کر اٹھتی۔ اکثر طلبہ آپ کے اسباق کاپیوں میں نوٹ کرتے تھے۔

(٦) عالمانہ وقار

علماء کے لئے عالمانہ وقار کے ساتھ زندگی گذارنا بہت ضروری ہے، اس لئے کہ وقار نہ ہونے سے وقعت ہی رخصت ہوجاتی ہے۔ اکابر و اسلاف میں علمی وقار کی حفاظت کا بہت اہتمام رہا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ: اگر اہل علم اپنے علم کے وقار کو بچایا کر رکھیں تو ساری دنیا کی سرداری انہیں اس علم کی وجہ سے حاصل ہوتی، لیکن وہ اہل دنیا سے مال و دولت کے حصول کے لئے اپنے علم کو استعمال کرتے ہیں، جس کی وجہ سے دنیا والوں کی نگاہوں میں ان کا مرتبہ گر جاتا ہے۔

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ اس صفت میں اپنے ہم عصروں سے ممتاز تھے۔ ان کی پوری زندگی مکمل عالمانہ شان کے ساتھ گذری۔ خدائے علیم نے جو علم آپ کے سینے میں ودیعت فرمایا تھا اس کی پوری لاج رکھی، اس سلسلے میں آپ اپنے اسلاف دیوبند کے نقش قدم پر تھے۔ ایک عالم

ربانی کی زندگی جیسی ہونی چاہیے اس کا نمونہ آپ کی حیات طیبہ میں نظر آتا تھا۔ آپ اپنے زمانے میں اعلیٰ درجہ کے صاحب وقار عالم دین تھے۔ آپ کی پوری زندگی اور زندگی کے تمام شعبے عالمانہ وقار کے آئینہ دار تھے۔

آپ جب گھر سے دارالعلوم میں درس کے لئے تشریف لاتے تو آپ کی باوقار رفتار ہی سے آپ کی عظمت کا اندازہ ہوتا تھا۔ ہمارے زمانۂ طالب علمی میں آپ پیدل تشریف لاتے تھے اکثر سر پر عمامہ اور اس پر سفید رومال، سنت کے مطابق نیچی نگاہیں جو بھی سامنے آئے اس کو سلام کی ابتداء آپ کی خاص عادت تھی۔

خودداری اور استغناء بھی عالمانہ وقار کے لئے ایک بہت ہی ضروری چیز ہے، دیکھا گیا حضرت والا رحمہ اللہ اس وصف سے بھی خصوصیت کے ساتھ متصف تھے۔ آپ میں خود داری اور استغناء کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ بارہا آپ نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ: کسی بھی شخص کو ’’عبدالدینار والدرہم‘‘ روپیہ پیسہ کا غلام نہیں بننا چاہیے۔ حدیث میں بھی اس کی ممانعت وارد ہے۔

(۷) تصلب فی المسلک

حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ اپنے فقہی مسلک یعنی فقہ حنفی پر بڑی مضبوطی اور ثبات قدمی کے ساتھ قائم تھے۔ کسی بھی مسئلے میں فقہی جزئیات اور اصول سے اعراض آپ کو گوارا نہیں تھا۔ اسی طرح اکابر دیوبند کے نظریات وافکار پر بھی پوری نظر رکھتے تھے۔ اسی لیے آپ کو دور حاضر میں جماعت دیوبند کا سب سے مضبوط ترجمان اور وکیل سمجھا گیا ہے۔ منہج اسلاف اور طریق اکابر سے ہرگز انحراف آپ کو منظور نہیں تھا اور اس سلسلے میں آپ کی حق گوئی اور جرأت والی شان بہت مشہور تھی۔

فرق باطلہ کے تعاقب کے سلسلے میں بھی آپ کی مساعی اور خدمات معاصرین سے کم نہیں ہیں۔ آپ اس طرح کے باطل فرقوں سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔ جب بھی اس موضوع پر گفتگو فرمائی تو بہت مضبوطی اور دلائل کے ساتھ فرمائی اور اس بارے میں کبھی کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کی۔ آپ کے یہاں آزادروی اور سلف صالحین کے منہج سے دوری ساری

خرابیوں کی جڑ تھی اسی لئے آپ فرقۂ غیر مقلدین اور جماعت اسلامی دونوں سے بہت نالاں تھے اوران کے افکار ونظریات پر سخت نکیر فرمایا کرتے تھے۔ آپ کا واضح موقف تھا کہ یہ آزادروی اور کج فکری آدمی کو اہل سنت والجماعت کے دائرے سے خارج کردیتی ہے۔ مسلک کی حفاظت کا آپ کو اس قدر خیال تھا کہ اپنے ہم مسلک لوگوں میں درآئی بے اعتدالیوں پر بھی آپ ہمیشہ تنقید فرماتے تھےاور مسلک دیوبند میں تطہیر کے لئے کوشاں تھے۔

خورد نوازی

اولوالعزم اور حوصلہ مندوں کا کام ہوتا ہے اپنے اچھوٹوں اور خردوں کو آگے بڑھانا اوران کی حوصلہ افزائی کرنا۔ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ اس وصف عالی سے بھی خاص طور پر آراستہ تھے۔ آپ اپنے اصاغر اور تلامذہ کی زبانی اور تحریری طور پر بہت حوصلہ افزائی فرماتے تھے جس کی بناء پر لوگوں کو آگے بڑھنے کا حوصلہ ملتا تھا۔ آپ اپنے تلامذہ کی علمی ودینی کاوشوں کو بہت سراہتے تھے اوران کی خدمات پر مسرت وخوشی کا اظہار فرماتے تھے۔ دوران سفر آپ کا ساتھیوں کے ساتھ بہت بے تکلفی کا معاملہ رہتا تھا۔ اپنے سے زیادہ دوسروں کا خیال فرماتے تھے، جس کی وجہ سے سفر میں کوئی کلفت اور پریشانی نہ ہوتی۔ راقم کو بھی ایک مرتبہ حضرت رحمہ اللہ کے ساتھ سفر کی سعادت حاصل ہوئی بلند شہر میں ایک جلسہ بعنوان ختم نبوت منعقد تھا۔ دیوبند سے حضرت اقدس قدس سرہٗ کے ساتھ والد محترم اور راقم الحروف شریک سفر تھے۔ پورے سفر میں حضرت بہت ہشاش بشاش اور مرنجا مرنج رہے۔ اس سفر میں کئی باتیں سیکھنے کو ملیں جو آج میرے لئے مشعل راہ ہیں۔

احقر کی سب سے پہلی تالیف خواتین کی تقریروں کے متعلق جب شائع ہوئی تو احقر کتاب لے کر حاضر خدمت ہوا۔ آپ نے کتاب بہت غور سے دیکھی، پڑھی اور کافی دیر کے بعد کئی طرح کی اصلاحات تجویز فرمائیں اور حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا اب جب نقش ثانی لاؤ تو نقش اول سے بہتر ہونا چاہیے۔

ان سطور میں چند اوصاف وکمالات کا ذکر کیا گیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی شخصیت نوع بنوع خوبیوں اور بے شمار محاسن وکمالات کا مجموعہ تھی۔

اللہ حضرت رحمہ اللہ کی مغفرت فرمائے۔ ان کی حسنات کو قبول فرمائے، اوران کی صفات حسنہ سے آراستہ ہونے کی ہم سب تلامذہ ومنتسبین کو توفیق عطا فرمائے۔

اکیسویں صدی کے ایک عظیم محدث وفقیہِ دوراں
حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحبؒ پالن پوری

سابق شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند

آپ پر خدا کی کروڑوں رحمتیں نازل ہوں

مولانا اخلاق الرحمٰن قاسمی......استاذ جامعۃ الطیبات بنگلور

19/ مئی 2020ء مطابق 25/ رمضان المبارک 1441ھ دوپہر سوشل میڈیا بطور خاص ''بہار نامہ واٹس ایپ گروپ'' کے معزز ممبران کے ذریعہ اطلاع ملی کہ علمائے دیوبند کے شجر سایہ دار، اکیسویں صدی کے عظیم المرتبت محدث، رفیع الشان مصنف، انقلابی مفکر ومثالی استاذ،، ہم سب کے محسن ومربی، سراپا حلیم وشفیق، نہایت متواضع ومنکسر المزاج، علوم ولی اللہی اور علوم قاسمی کے شارح وترجمان، اکابر ومشائخ کی روایات کے امین اور دورِ اوائل کے امتیاز کے پاسبان، فقہ وحدیث کے بحر ناپیدا کنار اور امام المعقول والمنقول استاذ محترم مفتی سعید احمد صاحبؒ پالنپوری شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند کئی دنوں کی شدید علالت کے بعد قضائے الٰہی سے دنیائے فانی کو خیر باد کہہ کر مالک حقیقی سے جاملے۔ انا لله وانا اليه راجعون، ان لله ما أخذ وله ما أعطى وكل شىء عنده بأجل مسمى۔

حضرت الاستاذؒ کے سانحہ ارتحال کی اندوہ ناک خبر سے دنیا بھر کے علمی حلقوں بالخصوص پوری جماعتِ دیوبند ووابستگانِ دیوبند میں شدید رنج وغم کی لہر دوڑ گئی آپ کی اچانک رحلت سے علمی دنیا سوگوار ہے، آپ کی رحلت یادگار اور ایک شاندار عہد کا خاتمہ ہے،

اور موت العالم موت العالم کا مصداق ہے۔ آپ کے اس طرح رخصت ہو جانے سے امت کو جو نقصان اور صدمہ پہنچا ہے اس کی تلافی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ آپ کے دم سے جو ایک علمی فضاء قائم تھی وہ اب ویران ہو چکی ہے۔

اوصاف و کمالات

آپؒ عصر حاضر میں گوناگوں محاسن وخوبیوں، متنوع اوصاف و کمالات، جامع الکمالات اور ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے، جن کو ہر علم وفن پر کامل دسترس حاصل تھا، مدارس عربیہ کے موجودہ نصاب تعلیم میں ابتدائی کتابوں سے لے کر امہات کتب تک بیشتر کتابیں آپ نے پڑھائیں، وہ تدریس کا بے پناہ ملکہ رکھتے تھے، کسی فن کی کتاب ہو، پانی کر دیتے تھے، علم کو گھول کر پلانے کا وہ ہنر جانتے تھے، دریا کو کوزے میں سمیٹنے کا ہنر ان کو آتا تھا، ان کا طریقہ فن میں اتر کر کلام کرنے کا تھا، وہ ہر فن کے مزاج سے بخوبی واقف تھے، گفتگو کسی موضوع پر بھی ہو بصیرت افروز، گہرائی وگیرائی میں ڈوبی ہوتی تھی، خاص طور پر حدیث اور فقہ ان کے ذوق کا حصہ تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ کے درس حدیث میں بڑااعتدال ہوتا تھا، آپ کے یہاں روایت ودرایت دونوں کا حسین امتزاج تھا، حقیقت یہ ہے کہ آپ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ، امام العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری صاحبؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحبؒ اورر علامہ ابراہیم بلیاویؒ کے علمی وارث بن کر ان کے مسند نشین ہونے کے لئے واقعی موزوں اور باصلاحیت تھے، البتہ آپ کے سبق میں حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی کا رنگ زیادہ غالب رہتا تھا، حضرت مفتی کا درس طلبہ میں ہمیشہ مقبول رہا ہے، نہایت شائستہ وشستہ لب ولہجہ تھا، مرتب اور جامع کلام فرماتے، اسی لئے بلا شدید مجبوری کے کوئی طالب علم ان کے درس سے غیر حاضر نہیں ہوتا تھا بلکہ طلبہ خصوصی اشتیاق رکھتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب کی درسی تقریریں عام فہم، مربوط ومسلسل اور مدلل ہوا کرتی تھیں۔ انداز بہت جاذب اور دلربا تھا، جس کی وجہ سے غبی سے غبی طلبہ کو بھی مضامین آسانی سے سمجھ میں آجاتے۔ بے جا تفصیل، یعنی تفصیل لا

حاصل، دراز بیان، مقررانہ شعر اور بلاضرورت کوئی بات طنز ومزاج جیسی چیزیں آپ کے درس میں نہیں ہوتی تھیں۔

حضرت الاستاذ کی ہر ہر ادا مثالی تھی، دارالحدیث میں منصب درس پر جب تشریف فرما ہوتے اور محدثانہ شان وشوکت سے جب درس شروع ہوتا تو زبانِ مبارک سے موتی جھڑتے ہوئے معلوم ہوتے، اور ''بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں'' کا سماں محسوس ہوتا تھا، دلکش وسحر انگیز ودلنشیں، ہر طالب علم سراپا سماعت بن جاتا، مکمل ذہنی وجسمانی حاضری کے ساتھ سبق سنتا۔ وہ ایسے استاذ تھے کہ ان کے سبق میں شاید ہی کوئی طالب علم ذہنی غیاب کا شکار ہوتا ہوگا، نہایت مفصل، مرتب اور جامع بحثیں ہوتیں، مسائل پر بصیرت افروز اور مدلل گفتگو کا موقع ہوتا تو تمام ائمہ کا احترام کرتے ہوئے ان کے دلائل اور اپنے اکابرؒ کی طرف سے دیئے گئے جوابات بہت مرتب انداز میں پیش فرماتے اور سال کے اخیر تک یہی انداز رہتا۔ ربع صدی سے زائد آپ نے اسی شان کے ساتھ ترمذی وبخاری کا درس دیا۔ اس عرصہ میں آپ کے ہزارہا شاگرد وتشنگانِ علوم ملک وبیرون کے مدارس اور دنیا کے چپہ چپہ میں دینی خدمات میں مشغول ہوکر اپنے استاذ کا نام روشن کررہے ہیں اور یہ ایک ایسا صدقۂ جاریہ ہے جو ان شاء اللہ العزیز قیامت تک باقی رہے گا۔

شاہ صاحب وحضرت نانوتوی کی کتابوں کی تسہیل

فقہ وحدیث کے علاوہ علوم حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور معارف حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ پر بھی آپ کا گہرا مطالعہ تھا، عصرِ حاضر کے طلبہ کے ذہنی مستوی کا ادراک کرتے ہوئے ان اکابرین کی متعدد کتابوں کی تسہیل فرمائی۔ نئی نسل خصوصاً ہم جیسے کند ذہن وغبی طلبہ کے لئے سہل الفہم بنایا۔ اس طرح آپ نے علمی دنیا وتشنگانِ علوم نبوت پر احسان عظیم کیا جس کا اعتراف دارالعلوم کے لیٹر پر شکریہ کے الفاظ کے ساتھ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰنؒ صاحب کے دستخط سے کیا گیا۔

دارالعلوم دیوبند سے رسمی طالب علم کا سلسلہ ختم ہوئے ۱۱ برس کا طویل عرصہ بیت

گیا، اس سے بھی تین برس پیچھے پلٹ کر چشم تصور سے دیکھتا ہوں تو ایک اجلا اجلا سراپا نظروں کے سامنے آتا ہے، رنگ وروپ، وضع قطع، چال ڈھال، اور بول چال سے لے کر انداز تدریس وتفہیم اور انداز تکلم وتبسم تک ہر چیز میں کچھ ایسی جاذبیت کے ساتھ ایک بار کے بعد دوبارہ دیکھنے اور برتنے کو دل مچلے۔

اب اسے فضل خداوندی کہئے یا میرے نصیبہ کی یاوری قرار دیجئے کہ کسی صلاحیت اور کسی کوشش کے بغیر ہی مجھے ایک سے ایک قابل اور کاملین اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تے کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، پھر ان کاملین میں بھی اپنی کمزور استعداد وصلاحیت کو ملحوظ رکھ کر کہوں تو آں استاذ محترم اس اعتبار سے ناقابل فراموش محسن رہے کہ ان کی کوئی بات کوئی درسی تقریر اور کوئی کتابی وضاحت فہم سے بالاتر نہ رہی۔ اللہ بہتر جانے کہ الفاظ کے انتخاب اور طرز ادا کا وہ کون سا سلیقہ حضرت رحمہ اللہ کو عطا ہوا تھا کہ جس فن کی جو کتاب پڑھاتے، لگتا تھا کہ بس یہ اسی کے ماہر ہیں۔

احادیث کے علمی ذخیرہ کی تسہیل اور اسے طلبہ کے فہم وفراست سے قریب تر کرنے کے لئے آپ نے کچھ مفید اصطلاحات وضع فرمائی تھی جو واقعی بہت کارآمد اور قابل توجہ ہیں۔

مفید اصطلاحات

١ حدیث وسنت میں فرق
٢ تشریع کے وقت کی ترخیص
٣ واقعات کے متعلقات کا اختلاف
٤ ناقص کو ناقص کی طرف کامل فرض کرنا
٥ استدلال خفی
٦ اختلاف دلائل یا اختلاف نص فہمی

ولادت

آپ کی تاریخ ولادت باسعادت محفوظ نہیں البتہ آپ کے والد محترم نے ایک

زمین کے بیع نامہ کی رو سے اندازے سے ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۰ء بتایا ہے آپ موضع کالیڑہ ضلع بناس کانٹھا (شمالی) گجرات میں پیدا ہوئے، بناس کانٹھا ایک ضلع ہے جس کا مرکزی شہر پالنپور رہے، جو آزادی سے پہلے مسلمان نواب کی اسٹیٹ تھی۔ موضع ''کالیڑہ'' پالنپور کی مشہور بستی ہے جو پالنپور سے جنوب مشرق میں تیس میل کے فاصلے پر ہے۔

آپ کا نام والدین نے صرف ''احمد'' رکھا تھا سعید احمد آپ نے اپنا نام خود رکھا ہے جب آپ نے ''مظاہر العلوم سہارنپور'' میں داخلہ لیا تو اپنا نام ''سعید احمد'' لکھوایا تھا اس وقت سے آپ سعید احمد کے نام سے مشہور ہیں۔

تعلیم و تربیت:

پانچ یا چھ سال کے ہوئے تو آپ کے والد محترم نے گاؤں کے مکتب میں تعلیم کے لئے بٹھا دیا۔ آپ کے مکتب کے اساتذہ یہ ہیں (۱) مولانا داؤد صاحب چودھریؒ (۲) مولانا حبیب اللہ صاحب چودھری (۳) اور حضرت مولانا ابراہیم صاحب۔ مکتب کی تعلیم کے بعد موصوف اپنے ماموں مولانا عبد الرحمٰن صاحب کے ساتھ ''چھاپی'' تشریف لے گئے، یہاں چھ ماہ تک اپنے ماموں اور دیگر اساتذہ سے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھتے رہے، چھ ماہ کے بعد ماموں چونکہ تدریس چھوڑ کر گھر واپس آ گئے تھے۔ اس لئے آپ بھی ماموں کے ساتھ گھر تشریف لے آئے اور چھ ماہ تک ماموں کے گھر ان سے فارسی کی کتابیں پڑھتے رہے، اس کے بعد چار سال تک پالنپور کے ایک مدرسہ میں حضرت مولانا ہاشم صاحب بخاری اور مفتی محمد اکبر میاں صاحب سے عربی درجات کی ابتدائی اور متوسط کتابیں پڑھیں۔

۱۳۷۷ھ میں مظاہر العلوم سہارنپور میں داخلہ لیکر تین سال تک نحو و منطق اور فلسفہ کی اکثر کتابیں پڑھیں، پھر فقہ، تفسیر، حدیث اور فنون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ۱۳۸۰ھ میں دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور حدیث و تفسیر اور فقہ کے علاوہ دیگر اہم فنون کی کتابیں آپ نے یہیں پڑھیں۔ اور ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء میں دورۂ حدیث شریف سے فارغ ہوئے۔ آپ بچپن ہی سے ذہین، فطین، کتب بینی اور محنت کے عادی تھے، دار العلوم دیوبند کی

طالبعلمانہ زندگی میں بھی کمال شوق، لگن اور یکسوئی کے ساتھ تعلیم میں مشغول رہے، اس لیے اساتذہ کرام کی توجہ اور تعلیم و تربیت نے خاص اثر کیا اسی لئے آپ نے دورۂ حدیث شریف میں اول پوزیشن حاصل کی، یہ دارالعلوم دیوبند کا سوواں (۱۰۰) سال تھا۔

دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد تکمیل افتاء میں داخلہ لیا اور پھر حضرت مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہاں پوریؒ کی خصوصی نگرانی میں فتویٰ نویسی میں ایسی کامل مہارت کی کہ اس کی وجہ سے ''معین مفتی'' کی حیثیت سے دارالعلوم میں آپ کا تقرر ہوا اور دارالافتاء کے ذمہ داران نے تحریری طور پر آپ کی تقرری کی سفارش کی۔ دارلعلوم دیوبند میں آپ کے اکابر اساتذہ میں استاذ و مربی حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ، مولانا سید محمد اختر حسین صاحب دیوبندی، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مولانا سید فخر الحسن صاحب مرادآبادیؒ، مولانا فخر الدین صاحب مرادآبادیؒ، مولانا مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہانپوریؒ، مولانا بشیر احمد خان صاحب بلند شہریؒ، حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب کیرانوی، حضرت مولانا اسلام الحق صاحب اعظمی، شیخ عبدالوہاب محمود صاحب مصریؒ اور حضرت مولانا ظہور صاحب دیوبندیؒ شامل ہیں۔

تدریسی خدمات

آپ کے محترم استاذ و مربی حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی خواہش تھی کہ آپ کا تقرر دارالعلوم دیوبند میں ہو، لیکن تقدیر خداوندی کچھ اور تھی اور آپ کا تقرر دارالعلوم دیوبند میں اس وقت نہ ہوسکا۔ اس موقع پر آپ کے محترم استاذ حضرت علامہ بلیاویؒ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے ایک مختصر اور پر اثر جملہ ارشاد فرمایا کہ: ''مولوی صاحب! گھبراؤ نہیں، اس سے اچھے آؤ گے!'' اور آپ کو اپنی دعاؤں اور نصیحتوں سے نوازتے ہوئے ''دارالعلوم اشرفیہ راندیر'' سورت جانے کا مشورہ دیا، جہاں درجۂ علیا کے مدرس کی حیثیت سے ذیقعدہ ۱۳۸۴ھ میں بحیثیت مدرس علیا آپ کا تقرر عمل میں آیا، آپ نے یہاں ''ابوداؤد شریف، ترمذی شریف، طحاوی شریف، شمائل، موطین، نسائی

شریف، ابن ماجہ شریف، مشکوٰۃ شریف جلالین شریف مع فوز الکبیر'' اور دیگر کتب کبیرہ پڑھائیں اور ساتھ ساتھ اردو، عربی اور گجراتی زبان میں تصنیف و تالیف اور مضمون نویسی کا بابرکت مشغلہ بھی جاری رکھا۔ اور مختلف کتابیں لکھیں، اِس سلسلے کی ایک کوشش ''اِفاداتِ نانوتوی'' کے نام سے قسط وار ''الفرقان'' لکھنؤ میں شائع ہوئی، جس کی اہل علم نے بہت پذیرائی کی۔ اور علمی حلقوں میں آپ کی شہرت اور طلبہ میں آپ کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی۔

دار العلوم دیوبند میں تقرر

اکابر واساتذہ کے ایماء او مناظر اسلام حضرت مولانا منظور نعمانی جیسے بلند پایہ عالم دین صاحب الرائی شخصیت کی تحریک وتجویز پر ۱۳۹۳ھ میں آپ کا تقرر دار العلوم دیوبند میں ہوا اس وقت سے وصال تک تقریباً نصف صدی دار العلوم دیوبند میں میں تسلسل کے ساتھ مسند علم کو زینت بخشی، جن میں آخری دس سال آپ دار العلوم دیوبند کے سب سے باوقار منصب شیخ الحدیث وصدر المدرسین کے منصب پر فائز رہے۔ شوال ۱۳۹۳ھ کو آپ دار العلوم دیوبند بحیثیت مدرس وسطی تشریف لے آئے اور تدریسی کام کا باضابطہ آغاز فرمایا۔

۹۷، ۱۳۹۸ھ میں باقاعدہ حدیث کا درس ارباب دار العلوم دیوبند نے آپ کے ذمے کیا، پہلے سال مشکوٰۃ شریف جلد ثانی مع نخبۃ الفکر، مسلم الثبوت، جلالین اور ہدایہ اول کے اسباق پڑھائے پھر اگلے سال مشکوٰۃ شریف کے ساتھ موطا امام مالکؒ اور نسائی شریف کا سبق متعلق ہوا، یوں آپ سال بہ سال ترقی کرتے ہوئے حدیث شریف کی کتابوں کی تدریس تک پہنچے۔ ۱۴۰۲ھ سے تقریباً ۱۴۳۰ھ تک ترمذی شریف کا سبق مکمل جاہ وجلال کے ساتھ پڑھاتے رہے۔ استاذ گرامی قدر حضرت مولانا نصیر احمد صاحب کی علالت کے بعد ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۰۰۸ میں بخاری شریف اول آپ سے متعلق کی گئی اور آپ کو شیخ الحدیث وصدر المدرسین کے عظیم منصب پر فائز کیا گیا اور تاحین حیات اس منصب جلیلہ پر فائز رہے۔

بلا تنخواہ تدریس اور سابقہ تنخواہوں کی واپسی ایک نایاب مثال

آپ کی زندگی روحانیت اور سادگی کا بہترین نمونہ تھی ۔ آپ کے بلند درجہ زہد و تقویٰ، سادگی و پاکیزگی، احتیاط اور خشیت و انابت کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کی تصانیف کو مقبولیت عامہ عطا کی، اور اپنے ذاتی کتب خانہ سے بقدر ضرورت آمدنی کی سہولت پیدا ہوئی، تو آپ نے ۱۴۲۳ھ میں حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد ہی دارالعلوم دیوبند سے تنخواہ لینے کا سلسلہ موقوف کر دیا، اور جو تنخواہ شوال ۱۳۹۳ھ سے ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ تک دارالعلوم دیوبند سے لی تھی، وہ تنخواہ بھی دارالعلوم دیوبند کو واپس لوٹا دی، اسی طرح دارالعلوم اشرفیہ میں تدریس کے دوران جو نو (۹) سال تک تنخواہ وصول فرمائی تھی، وہ بھی واپس کر دی، اور پھر اپنے وصال تک فی سبیل اللہ بغیر تنخواہ کے دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دیں، ایسی نظیریں ماضی میں خال خال ہی ملتی ہیں، اور آج جب کہ مادیت کا دور دورا ہے ہر شخص سراپا عبد الدینار والدرہم بنا ہوا ہے ایسے وقت میں تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس کی پوری تفصیل حضرت کے وصال کے بعد کسی واٹس ایپ گروپ سے مجھے حاصل ہوئی بھائی، جس کو بھائی عادل سعیدی نے اپنے ایک مختصر مضمون میں اس طرح بیان کی ہے:

دارالعلوم اشرفیہ عربیہ راندیر سورت گجرات کو واپس کی ہوئی تنخواہ کی تفصیل:

واپسی کی تاریخ: ۲۸/ اپریل ۲۰۰۳ء

☆ مارچ ۱۹۶۵ء سے جنوری ۱۹۶۸ء تک: مبلغ پانچ ہزار سات سو چالیس روپے فقط (۵۷۴۰)۔

☆ فروری ۱۹۶۸ء سے فروری ۱۹۷۰ء تک: مبلغ پانچ ہزار ایک سو پانچ روپے فقط (۵۱۰۵)۔

☆ مارچ ۱۹۷۰ء سے فروری ۱۹۷۲ء تک: مبلغ چھ ہزار چھ سو روپے فقط (۶۶۰۰)

☆ مارچ ۱۹۷۲ء سے اکتوبر ۱۹۷۳ء تک: مبلغ پانچ ہزار آٹھ سو پانچ روپے فقط (۵۸۰۵)۔

ٹوٹل: مارچ ۱۹۶۵ء سے اکتوبر ۱۹۷۳ء تک: مبلغ تیئیس ہزار دو سو پچاس روپے فقط (۵۱۰۵)۔

دارالعلوم دیوبند کو واپس کی ہوئی تنخواہ کی تفصیل

واپسی کی تاریخ: ۹/ صفر ۱۴۲۶ھ

☆شوال ۱۳۹۳ھ سے ذی الحجہ ۱۴۰۰ھ تک: مبلغ تینتیس ہزار دو سو ستر روپے فقط (۳۳۲۷۰)۔

واپسی کی تاریخ: ۱۷/ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ

☆از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۰۱ھ: مبلغ دس ہزار آٹھ سو اکیاسی روپے بارہ پیسے فقط (۱۲/۱۰۸۸۱)۔

☆از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۰۲ھ: مبلغ دس ہزار پانچ سو تین روپے اٹھائیس پیسے فقط (۲۸/۱۰۵۰۳)۔

☆از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۰۳ھ: مبلغ گیارہ ہزار چھ سو انہتر روپے چھہتر پیسے فقط (۱۱۶۶۹/۷۶)۔

☆از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۰۴ھ: مبلغ گیارہ ہزار نو سو انچاس روپے ساٹھ پیسے فقط (۴۰/۱۱۹۶۹)۔

☆از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۰۵ھ: مبلغ چودہ ہزار ایک سو اکتیس روپے چوالیس پیسے فقط (۶۶/۱۶۱۳۱)۔

☆از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ: مبلغ بارہ ہزار دو سو سولہ روپے تینتیس پیسے فقط (۳۳/۱۲۲۱۶)۔

☆از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ: مبلغ پندرہ ہزار ایک سو ستانوے روپے باون پیسے فقط (۵۲/۱۵۱۹۷)۔

☆از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ: مبلغ سترہ ہزار باسٹھ روپے پچاس پیسے فقط (۵۰/۱۷۰۶۲)۔

☆از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ: مبلغ بائیس ہزار دو سو ساٹھ روپے اڑتالیس پیسے فقط (۲۲۲۴۰/۴۸)۔

☆از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ: مبلغ چوبیس ہزار پانچ سو ستر روپے چوبیس پیسے فقط (۲۴/۲۶۵۷۰)۔

واپسی کی تاریخ: ۱۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ

☆از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ: مبلغ چھبیس ہزار نو سو چھپن روپے اسی پیسے فقط (۸۰/۲۶۹۵۶)۔

☆از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ: مبلغ انیتس ہزار چار سو بیس روپے سولہ پیسے فقط (۱۶/۱۹۴۲۰)۔

☆از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۱۳ھ: مبلغ تیس ہزار گیارہ روپے باون پیسے فقط (۵۲/۳۰۰۱۱)

☆از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ: مبلغ چوالیس ہزار آٹھ سو اڑتیس روپے فقط (۴۴۸۳۸)۔

☆از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ: مبلغ پینتالیس ہزار سات سو آٹھ روپے فقط (۴۵۷۰۸)۔

واپسی کی تاریخ: ۱۶/ رجب ۱۴۲۴ھ

☆از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۱۶ھ: مبلغ چھیالیس ہزار پانچ سو اٹھتر روپے فقط (۴۶۵۷۸)۔

☆از محرم تا ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ: اڑتالیس ہزار چار سو چوالیس روپے فقط (۴۸۴۴۴)

☆ازمحرم تاذی الحجہ ۱۴۱۸ھ: مبلغ پچپن ہزار آٹھ سو چھیانوے روپے فقط (۵۵۸۹۶)۔

☆ازمحرم تاذی الحجہ ۱۴۱۹ھ: مبلغ اکیاسی ہزار دو سو بیاسی روپے فقط (۸۱۲۸۲)۔

☆ازمحرم تاذی الحجہ ۱۴۲۰ھ: مبلغ اکیاسی ہزار دو سو بیاسی روپے فقط (۸۱۲۸۲)

واپسی کی تاریخ: ۲۲/ ذیقعدہ ۱۴۲۴ھ

☆ازمحرم تاذی الحجہ ۱۴۲۱ھ: مبلغ اٹھاسی ہزار تین سو چھپن روپے فقط (۸۸۳۵۶)

☆ازمحرم تاذی الحجہ ۱۴۲۲ھ: مبلغ اکیانوے ہزار آٹھ سو چھیانوے روپے فقط (۹۱۸۹۶)۔

☆ازمحرم تاذی الحجہ ۱۴۲۳ھ: مبلغ پچانوے ہزار چار سو چوبیس روپے فقط (۹۵۴۲۴)۔

ٹوٹل: شوال ۱۳۹۳ھ سے ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ تک: مبلغ نو لاکھ انچاس ہزار آٹھ سو چار روپے پچھتر پیسے فقط (۹۴۹۸۰۴/۷۵)۔

دارالعلوم اشرفیہ اور دارالعلوم دیوبند کو واپس کی ہوئی تنخواہ کا ٹوٹل: مبلغ نو لاکھ تہتر ہزار چون روپے پچھتر پیسے فقط (۹۷۳۰۵۴/۷۵)

دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم اشرفیہ سے لی ہوئی تنخواہ اسی سال واپس کی، جس سال دارالعلوم دیوبند سے تنخواہ لینی بند کی، اور محرم ۱۴۲۴ھ سے تا وفات دارالعلوم دیوبند میں بغیر تنخواہ کے پڑھا رہے تھے"۔

یقیناً تنخواہ کی واپسی ایک بہترین اور لائق تحسین مثالی قدم تھا، جسے اربابِ فضل و کمال نے قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ اپنے اس عمل سے گویا یہ بتا دیا کہ اساتذہ کو چاہیے کہ مدارس پر بوجھ نہ بنیں اور وسعت کے وقت محض حسبۃً للہ اپنی خدمات پیش کریں۔ جیسا کہ ماضی بعید کے اکابر علما درس وتدریس کے ساتھ تجارت سے بھی وابستہ تھے اور تجارت ہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ یہ مزاج تقریباً اب ختم سا ہو گیا ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ علمائے حضرت الاستاذ کے اس نمونہ کی روشنی میں تدریس کو ذریعۂ معاش بنانے کے بجائے پھر سے تجارت کی طرف مائل ہوں اور فی سبیل اللہ اپنی خدمات انجام دیں۔

سفرآخرت اور تدفین

زندگی کے ان ایام سے قبل بھی آپؒ مختلف عوارض میں مبتلا رہے۔ کئی مرتبہ آپ کا کامیاب آپریشن بھی ہوئے اور آپ باذن اللہ شفایاب ہو کر اپنے امور مفوضہ میں مصروف

عمل رہے، مگر کبھی کبھی بیماری کی وجہ سے آپ کی زبان مبارک رُک جاتی تھی، آخری درس میں بھی یہ کیفیت طاری ہوئی، اختتام درس کے بعد آپ علاج کے لیے عروس البلاد ممبئی تشریف لے گئے، جہاں آپ کا پہلے سے علاج جاری تھا اور ماشاء اللہ جب افاقہ ہوا تو رمضان المبارک میں بعد نماز تراویح درس قرآن کا آغاز کردیا لیکن اچانک طبیعت پھر سے خراب ہوگئی، تو فوری طور پر ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ لیکن طبیعت تشویشناک حد تک خراب ہوتی چلی گئی۔ بالآخر وقت موعود آ گیا۔ ۲۵/ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق 19/ مئی 2020ء بروز منگل بوقت چاشت اپنی آخری سانس لیتے ہوئے اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ،اور جوگیشوری کے معروف قبرستان میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

یقیناً حضرالاستاذؒ کے اس طرح چلے جانے سے پوری علمی دنیا سوگوار ہے اور ہر عالم دین اپنے آپ کو یتیم محسوس کر رہا ہے۔ آپ کی ذات گرامی اہل علم کے لیے خصوصا اور باشندگان عالم کے لئے عموماً نعمت غیر مترقبہ تھی اور ایک انجمن اور ایک ادارتھی آج علمی حلقوں کے ساتھ عوامی حلقے بھی حضرت کی وفات حسرت آیات کی وجہ سے آہ بلب اور اشک بار ہیں۔ علماء کی وفات کے ساتھ علم کے رخصت ہونے کا کھلی آنکھوں ایسا مشاہدہ پہلی بار ہوا ہے۔ اس لاک ڈاؤن کے عرصے میں بڑے بڑے جبال علم وعمل اس امت سے رخصت ہوگئے بڑے بڑے مشائخ اور اہل اللہ سے امت محروم ہوگئی، اللہ امت کے حال پر رحم فرمائے۔ اللہ سے دعا ہے کہ مفتی صاحب مرحوم کی روح کو اپنے الطاف وانعام سے نہال فرمائے ان کے آخری سفر میں اکرام کا معاملہ ہو، ان کی قبر نور سے منور ہو، وہ جنت الفردوس میں براجمان ہوں۔ خدا آپ کی حسنات کو قبول فرمائے، جملہ پسماندگان اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مادر علمی دارالعلوم دیوبند کو آپؒ کا نعم البدل عطا فرمائے (آمین)

الأستاذ العبقری

چند اوصاف وکمالات

مولانا احمد سعد قاسمی

خادم المعہد العلمی الاسلامی دیوبند

پوری علمی دنیا اس وقت سونی ہوگئی، آنکھیں نم ہوگئیں اور دل ودماغ کی دنیا میں ایک زلزلہ سا آگیا جب یہ خبر وحشت اثر ۲۵؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹؍مئی ۲۰۲۰ء کی صبح بہ وقت اشراق کانوں میں پڑی کہ عالم اسلام کے بڑے عالم دین دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس وشیخ الحدیث حضرت الاستاذ الکبیر حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری راہی آخرت ہوگئے نَوَّرَاللّٰہُ مَرْقَدَہٗ وَبَرَّدَمَضْجَعَہٗ۔

ھوکے اپنی بزم سے احباب مے خانہ مجھے
عمر بھر ڈھونڈا کریں گے کہہ کے دیوانہ مجھے
جان کر من جملۂ خاصان مے خانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ مجھے

آپ کی رحلت کوئی عام واقعہ نہیں بلکہ علمی دنیا کا بڑا حادثہ ہے ایک عظیم نقصان ہے، بہت سے اساتذہ اور شخصیات اٹھتی ہیں اور ان کا خلا کبھی ان کی لائق اولاد اور اکثر ان کے تلامذہ کے ذریعہ پیشگی پُر رہتا ہے مگر..... یہاں دیر تک اور دور تک سناٹا ہے حضرت الاستاذ العزیز کے اندر فیاض ازل نے وہب وکسب کے متعدد علمی عجائبات ونوادرات، عادات وصفات کے امتیازات ودیعت کئے تھے۔ ملکوں ملکوں ڈھونڈو گے ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

درازقد، خضاب سرخ سے ملون گھنی ڈاڑھی، نصف ساق تک کا جبہ دائمی لباس

سر پر کلاہ مدور، کبھی سر پر تاج عمامہ، زیادہ تر سفید رومال کا ہالہ، جس سے آنکھوں کا پردہ کرتے، چہرہ پر کشش، مگر وجاہت و رعب سے مالا مال، آواز بھاری اور مرعوب کن گفتگو نہایت فصیح و بلیغ و باوقار، حرف حرف واضح، ہر بات دل نشین مثالوں سے پُر، سوچ کر اور تول کر مرتب بولتے اور دل میں اتار دیتے، خورد و کلاں کو سلام میں سبقت کرنے میں ممتاز علم کے دھنی، انضباط وقت کی نادر مثال، کثرت علائق و مجلس آرائی سے بیزار، مزاج میں عالمانہ شان کا استغناء، تملق و خوشامد سے کوسوں دور اور بہت کچھ اوصاف اور خوبیاں، آپ کے گلشن حیات کے نمایاں اور خوش رنگ پھول تھے۔

ایک واقعی عالم کی پہچان صرف یہی نہیں کہ کسی مدرسے کی چہار دیواری میں مخصوص مدت اور مخصوص نصاب پڑھ لیا بلکہ علم کی چاشنی سے بہرور ہو، مطالعہ کا خوگر ہو، علمی اشتغال کو مادیت پر ترجیح دینے کا مزاج ہو، علم کے بقاو اضافہ کے لیے حالات کی تلخ کامیوں پر صبر وشکیب رکھتا ہو، علمی ترقی کے مواقع کا متلاشی ہو- یہ ایک عالم کی متوسط درجے کی کیفیت ہے ورنہ اہل علم وکمال نے تو سخت ترین شدائد میں صبر واستقامت کے ساتھ عجائبات ونوادرات کو وجود بخشنے میں ایسی تاریخ رقم کی ہے کہ قلم وزباں سے اس کی ترجمانی بھی ناممکن ہے مگر اب تو علم وعالم کا مفہوم حقیقت سے کوسوں دور صرف عرفی مفہوم میں باقی ہے چمکتے ضرور نظر آتے ہیں مگر سونا نہیں ہوتے۔

حضرت مفتی صاحب قدس سرہ میں چند خاص اوصاف ایسے تھے کہ سارے تلامذہ اس کو محسوس کرتے تھے اور ان کو قابل تقلید نمونہ سمجھتے تھے۔

قابل تقلید معلم

ان کی زندگی کا ایک نمایاں گوشہ یہ تھا کہ وہ ایک قابل تقلید باکمال نادر اور مثالی مدرس ومعلم تھے، یہ کلمہ اپنے وسیع تر مفہوم کے ساتھ ان پر منطبق تھا، ایک باکمال مدرس کی خوبی یہ ہے کہ عبارت کو پوری گہرائی سے سمجھ کر اس پر حاوی ہو جائے، شارحین کے قیل وقال کے منتشر جواہر کو چھان پھٹک کر کے مخاطب کی سطح کے مطابق لڑی میں پرو کر ایک پر کشش تمہید

کے ساتھ مسئلہ کا مالہ وما علیہ دل نشین مثالوں کے ذریعے طلبہ کے دل میں اس طرح اتار دے کہ غبی اور کم ذہن بھی بالکل محروم نہ رہے، ساتھ ہی وقت کا پابند ہو، دیر حاضری وغیر حاضری سے سختی سے مجتنب ہو، طلبہ کے ذہنوں میں وارد ہونے والے اعتراضات کے جوابات سے بھی نوازتا ہو، نصاب کو توازن سے لے کر چلتا ہو، ایسا نہ ہو کہ شروع سال میں (بطئ السیر) پنکچر ہو اور آخر میں (سریع السیر) سپر فاسٹ ہو۔

یہ ساری خوبیاں تو حضرت الاستاذ میں تھیں ہی مزید یہ کہ ان کا تکلم بڑا فصیح وبلیغ تھا، اس کے باوجود ہر بات سنت کے مطابق تین مرتبہ دہراتے یہاں تک اچھی طرح مفہوم سمجھ میں آجاتا تھا اور خداداد خاص چیز یہ تھی کہ ان کی بیان کردہ بات یاد ہو جاتی تھی، برسہا برس گزرنے کے بعد بھی آج تک ان کی بہت سی تعبیرات اور انداز سخن ذہن میں محفوظ ہے، درس میں ان کا ایسا ساحرانہ انداز تھا کہ تمام طلبہ گوش برآواز رہتے اور (كَأَنَّ عَلٰى رُؤُسِهِمُ الطُّيورْ) کا منظر ان کے درس میں سامنے آجاتا۔

دارالحدیث میں پہنچنے کے بعد مسند کے قریب پہنچ کر سب کو زور سے سلام کرتے سلام کی کثرت، خورد وکلاں کو سلام میں سبقت ان کے امتیازات میں تھی، حدیث کے درس سے پہلے وہ خطبہ پڑھتے، بعدہ دلنشیں تمہید قائم کرتے، حدیث کا پس منظر ذکر کرتے اور صاف وشفاف مفہوم سیاق وسباق، اقتضاء مقام کی رعایت سے دل میں بٹھا دیتے، واقعہ یہ ہے کہ حضرت الاستاذ تفہیم کے بادشاہ تھے، لوہے کو موم کر دیتے کوئی بات ایک بار کہہ کر نہ گزرتے بلکہ اکثر وہ تین مرتبہ بات دہراتے اور ہر دفعہ الفاظ بھی وہی رہتے جس سے طلبہ کو لکھنے میں بڑی سہولت ہوتی بلا مبالغہ سیکڑوں امالی ان کے درس کی طلبہ کے پاس محفوظ ہیں، بات کو سہل تر کرنے میں ان کے متعدد طریقے تھے: ایک تو یہ کہ وہ مضمون پہلے مرتب کر کے آتے دوسرے یہ کہ فصاحت کے ساتھ سنبھال کر بولتے اور مکرر سہ کرر دہراتے، تیسرے یہ کہ ہر مسئلہ کو دل نشیں مثال سے بدیہی بنا دیتے، مثال کے بغیر شاید ہی ان کی کوئی بات مکمل ہوتی ہو۔

چوتھے یہ بھی ان کی مؤثر خصوصیت تھی کہ درمیان کلام میں جب کوئی خاص محاورہ

یا ضرب الامثال آتیں تو یہ بھی بتاتے کہ اس محاورہ کا استعمال کب اور کیوں کیا جاتا ہے، اس مثل کا پس منظر اور مطلب کیا ہے، مثلاً اگر انہوں نے مثل استعمال کی ''نہلا پہ دہلا'' تو اس کی تشریح بھی کرتے کہ یہ جواریوں کی اصطلاح ہے، ایک جواری ایک تاش پھینکتا ہے جس پر نونشان ہوتے ہیں اس کو ''نہلا'' کہتے ہیں اور دوسرا جواری اس کے توڑ کے لئے اس سے طاقت ور دس نشان کا تاش پھینکتا ہے، اس کو ''دہلا'' کہتے ہیں، دوسرا کامیاب ہوجاتا ہے معترض کی دلیل سے زیادہ مضبوط دلیل جب دی جائے جس سے وہ لاجواب ہوجائے تو یہ محاورہ بولتے ہیں، اب بات پوری سمجھ میں آئی، محاورے کا صحیح استعمال سمجھ میں آیا۔

پانچوے یہ کہ ان سب کے بعد بھی اگر تشنگی باقی رہتی اور پرچیوں پر اعتراضات پہنچتے تو ان کا بھی اتنا ہی اطمینان سے جواب دیتے۔

چھٹا وصف یہ تھا کہ وہ طلبہ کی نفسیات تاڑنے میں ماہر تھے، طالب علم کو عبارت میں کسی جگہ دقت پیش آنے والی ہے اس جگہ اسی اعتبار سے وضاحت کرتے اسی لیے ان کا درس مقبولیت میں ضرب المثل تھا۔

ایک مرتبہ ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ: میں نے دو استاذوں کے طریقوں کو ملا کر درس کا طرز اپنایا ہے، ایک تو امام النحو حضرت مولانا صدیق احمد صاحب جمویؒ (استاذ مظاہر علوم سہارنپور) ان کی خصوصیت تھی کہ بات کو بالکل نیچے سے اٹھاتے (عام فہم مثالوں سے سمجھانا) شروع کرتے، دوسرے استاذ حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی قدس سرہ کہ وہ مسئلہ کے سب سے اہم پہلو کو مختصر جامع انداز سے بیان کرتے اور آگے بڑھ جاتے، میں نے دونوں کو ملایا کہ بات نیچے سے شروع کرتا ہوں پھر اہم بات بتا کر ختم کرتا ہوں جس سے ہر طالب علم کو کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔

کسی استاذ یا مؤلف کے مزاج واسلوب سے آشنائی ہوجائے تو اس کی تحریر وتقریر سمجھنا آسان ہوجاتا ہے، حضرت الاستاد کا انداز عام شارحین ومدرسین سے ہٹ کر تھا، قیل وقال کا مزاج بالکل نہیں تھا کہ فلاں نے یہ کہا، فلاں نے یہ کہا، فلاں نے یہ جواب دیا، فلاں نے یہ

جواب دیا الا ماشاء اللہ کبھی ضرورت ہوتی تو نام لے لے کر بھی بیان کرتے، لیکن ان کی خصوصیت یہ تھی کہ سب کچھ دیکھنے کے بعد وہ بذات خود مفہوم سمجھنے پر زور صرف کرتے، پھر جو منقح ہوتا اس کو شرح صدر سے بیان کرتے اور جو کچھ کہتے اس میں تشکیک بالکل نہیں ہوتی تھی، پوری بصیرت اور اعتماد کے ساتھ زور دیکر کہتے تھے (خواہ دوسروں کی تحقیق میں وہ قول راجح نہ بھی ہو)۔

یہ امر واقعہ ہے کہ استاذ اگر غیر یقینی اور ڈھل مل انداز سے بات کرے تو طالب علم کو قلبی اطمینان نہیں ہوتا اور محنت پر پانی پھر جاتا ہے، غرض وہ اقوال کے پھول بکھیرنے کے بجائے اس کا رس چوس کر شہد بنا کر پیش کرتے، پھر اس کی چاشنی کس کو محسوس نہ ہوگی؟! ان کا یہ جاذب انداز و اسلوب ہزاروں تلامذہ کے لیے نقش دوام ثابت ہوا۔

ہم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے

استاذ کی ظاہری وضع و ہیئت، نشست و برخاست، نظافت، متانت، نیز تخاطب کا انداز بھی ایک تاثیر رکھتا ہے، حضرت مفتی صاحب کے اندر یہ ساری چیزیں بھی بدرجۂ اتم تھیں، نصف ساق کا جبہ، گول ٹوپی، رومال تو دائمی لباس تھا۔ کبھی کبھی وہ عباء میں آتے کبھی عمامے میں، ان کی ظاہری وجاہت کی بھی دھاک بیٹھ جاتی۔

حضرت الاستاذ کے درس کی ایک خوبی جو دیگر درسی تقریروں میں نہیں ملتی تھی، یہ تھی کہ وہ صرف احکام و مسائل کی احادیث ہی پر کلام نہیں کرتے تھے بلکہ معاشرتی، معاملاتی حدیثوں پر بھی اسی اہمیت سے کلام کرتے تھے اور اس سے متعلقہ امور کی حالات حاضرہ کی روشنی میں وضاحت کرتے، اور حدیث کی عبارۃ النص کو خوب واضح فرماتے۔

طریقۂ درس یہ تھا کہ آنے والی عبارت کا مطلب پہلے سمجھاتے، خاص الفاظ و تعبیر کی وضاحت کرتے پھر حدیث کی تلاوت ہوتی تو حدیث قرأت کے ساتھ ہی سمجھ میں آجاتی۔

پورے سال میں کبھی ان کو نشست بدلتے نہیں دیکھا، چار زانو بیٹھ جاتے پھر

پورے درس میں (خواہ وہ دو گھنٹے بھی ہوا) ایک ہی ہیئت پر رہتے، چہرہ ایک ہی طرف نہ رکھتے بلکہ دائیں بائیں ہر طرف نظر رکھتے، درس بھی خشک تر کی مثال تھا، جب وہ پوشیدہ مسائل سے متعلق مسئلہ سمجھاتے تو کسی کو ہنسنے کی قطعاً گنجائش نہ تھی مگر وہ طلبہ کی نفسیات کی رعایت کرتے ہوئے درمیان میں لطائف وظرائف کا حصہ بھی رکھتے جس سے طلبہ میں ایک نشاط پیدا ہو جاتا۔

اب جو استاذ اسباق کے اتنے آداب برتتا ہو اس کو طلبہ کے لاابالی پن سے بھی سخت وحشت ہونا بھی طبعی بات ہے اس لیے حضرت کے درس میں سبق شروع ہونے کے بعد درسگاہ میں داخل ہونا جرم تھا، عبارت پڑھنے کے بھی آداب تھے، اس کی تعیین بھی وہ خود ہی کرتے تھے، درس حدیث کے دوران ادنی درجے کا خارجی عمل بھی انہیں بالکل برداشت نہیں تھا، دفتر اہتمام یا تعلیمات سے آئی ہوئی تحریر یا گشتی بھی درمیان میں دکھانی ممنوع تھی۔

انھیں صلاحیتوں کی وجہ سے جب وہ دارالعلوم آئے تو ان کے کئی اساتذہ اور دیگر قدآور شخصیات موجود تھیں مگر ان کے درس کا امتیاز اور اس کی کشش طلبہ کے دل ودماغ پر چھانے لگی مقبولیت کے پھریرے اڑنے لگے پھر وہی ہوا جو ہوتا آرہا ہے کہ محسود بھی ہوئے اور مسحور بھی مگر

”کوہ گراں بنے رہے کہ، تم تیر آزماؤ ہم جگر آزمائیں“

پھر جب دارالعلوم میں صدارت تدریس اور شیخ الحدیث کا منصب ان کی صلاحیتوں نے انھیں دلوایا تو پھر یہی سوغات حسد وسحر دوبارہ ملی اور تادم واپسیں وہ سحر کے اسی کرب کو بے شکوہ شکایت جھیلتے رہے یہاں تک کہ رورح کو حوالۂ اجل کر کے کاشانۂ فردوس کو نشیمن بنالیا، علیین سے ان کی روح کہتی ہوگی

تو مرا حوصلہ تو دیکھ داد تو دے کہ اب مجھے
شوق کمال بھی نہیں خوف زوال بھی نہیں

شان خودی

حضرت والا کی یہ ادا بھی معروف تھی، سچ تو یہ ہے کہ اس وصف کی کمی ایک عالم دین کی زندگی کا نقص ہے، حضرت والا کو اس سے بھی حظ وافر حاصل تھا، وہ یہ کہ وہ مزاج کے بڑے مستغنی تھے مال ہو کہ منصب انہوں نے دونوں سے ساری عمر پورا استغناء برتا، طلب اور حسن طلب سے کوسوں دور رہے بس وہ دور سے ہی شاہ و گدا سب سے صاحب سلامت رکھتے، سب سے الگ تھلگ ہونا گو مستغنی ہونے کے لوازم میں سے نہیں ہے لیکن انہوں نے اپنے کو علم میں ایسا فنا کیا تھا کہ علم کی لذت آشنائی نے ان کو سب سے بیگانہ کر دیا تھا، ان کی فرودگاہ بھی دارالعلوم سے اتنے فاصلہ پر ایسے گوشہ گم نام میں تھی کہ محض ارادہ نہیں بلکہ عزم وقصد کے بغیر وہاں تک رسائی کا سوال ہی نہ تھا پھر جناب والا کی طرف سے بعد عصر تا مغرب کے علاوہ ممنوع الدخول کا اعلان تھا۔ کیونکہ وہ وقت کا بھرپور خراج وصول کرتے تھے (بقول حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب علیہ الرحمۃ: مروت واصول جمع نہیں ہو سکتے) اس لئے غالباً باوجود سخاوت نفس کے ان کے یہاں وسعتِ دسترخوان اور لذت کام ودہن کا سلسلہ کبھی نظر نہیں آیا۔

تقوی کا بہت اہم پہلو جس کا تذکرہ بڑے اور پرانے اکابر کے یہاں سننے کو ملتا ہے اس میں بھی حضرت والا نے اتباع کی نظیر قائم کی کہ دارالعلوم اور اس سے پہلے مدرسے سے لی ہوئی تنخواہ مکمل حساب کر کے واپس کر دی، بات صرف یہی نہیں کہ ان کو وسائل حاصل ہو گئے تھے، وہ تو اوروں کو بھی ہوتے ہیں، بلکہ قابل عبرت ان کا جذبۂ اخلاص ہے، حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ''اِنْ اَیْسَرْتُ قَضَیْتُ'' اگر مجھے سہولت وسعت ہوگی تو میں بیت المال سے لیا ہوا مال و تنخواہ واپس کر دوں گا۔ (اسلام اور سیاسی نظریات ص ۲۹۳، مؤلفہ حضرت مفتی محمد تقی صاحب بحوالہ طبقات بن سعد)

تمام عمر اسی احتیاط میں گذری
کہ آشیاں کسی شاخ چمن پہ بار نہ ہو

ملنے ملانے میں ان کے یہاں فرق مراتب رہتا تھا، بعد عصر صلائے عام تھا خورد و کلاں اغیار احباب سبھی طرح کے لوگ وارد و صادر ہوتے، دار العلوم کے طلبہ واساتذہ بالخصوص مستفید ہونے جاتے، مدرسین پیچیدہ عبارتوں کے حل کے لئے بھی آتے، کتاب کا تعلق علم عقلی (منطق وفلسفہ) سے ہو یا نقلی (نصوص قرآنی یا حدیثی یا فقہی) چند منٹ میں چٹکی بجاتے وہ حل کرتے، اس وقت ان کی مشکل و مغلق عبارت پر گرفت کا اندازہ ہوتا اور مختلف فنون کی اصطلاحات کے استحضار کا پتہ چلتا سرعت فہم بھی مثالی تھی، کیا؟ کیوں؟ کیا مطلب؟ اس کی نوبت شاید ہی آتی ہو، ادھر سوال ہوا اُدھر جواب حاضر، لیکن اس کے ساتھ ہی ادّعاء کلی بھی نہ تھا بلکہ بہ کثرت وہ صاف صاف یہ بھی کہتے ''مجھے معلوم نہیں''، ''مجھے اس کی تحقیق نہیں''، ''میرے علم میں نہیں'' مطلب یہ کہ زبردستی کا جواب نہیں تھوپتے تھے۔

درس و خارج درس ان کی گفتگو میں پوست کم اور مغز زیادہ ہوتا (خیر الکلام ماقلَّ و دلَّ) کا مصداق، غالباً وجہ اس کی یہ ہے کہ اساتذہ میں جن کے اثر کو انہوں نے زیادہ قبول کیا اور جن سے ان کی طبیعت زیادہ ہم آہنگ ہوئی وہ نابغۂ روزگار و فخر زمانہ استاذ جن کو فضلا دہر نے علامہ کے لقب سے بجا طور پر ملقب کیا یعنی حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ (جو حضرت شیخ الہندؒ کے تلمیذ وخلیفہ تھے) حضرت مخدوم اکتساب فیض کے علاوہ ان کے خدمت گزار بھی رہے، زباں زد خاص و عام ہے کہ علامہ کی بات جوامع الکلم کے انداز کی ہوتی تھی، ان کے ایک جملہ میں پورا ایک مضمون پنہا ہوتا، حضرت مفتی صاحب ان کے اقوال عظمت واہمیت سے نقل کیا کرتے تھے۔

علمی مقام

ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ کسی کو مبدأ فیاض سے تفسیر وحدیث وفقہ تینوں میں درک حاصل ہو جائے اور ہر سہ علوم سے پوری مناسبت ہو مطالعہ ہو اور اس کی کسی بھی گتھی کو سلجھانے پر

قدرت ہو، یہاں تک بھی اشتراک آسان نہیں لیکن نادر بھی شاید نہ ہو، مگر منطق وفلسفہ پر بھی ویسا ہی عبور ہو اس کی عقلی وادیوں فلسفیانہ موشگافیوں کا بھی شناور ہو ان معقول ومنقول کے تلازم کے بعد قحط الرجالی سامنے آئی ہے مزید برآں ان سارے علوم کو زبان وقلم سے شگفتگی کے ساتھ مرتب کر کے قلب وقرطاس پر ثبت کر دے اور رب کے بخشے ہوئے ان انعامات کے شکر میں تادم زیست ان کی نشر واشاعت میں لگا رہا ہو، اور ان کو حسن طباعت کے اعلی ذوق سے چھاپ کر عام بھی کیا ہو، ان قیود کے ساتھ آں مرحوم ومغفور کی انفرادیت مسلمہ بن جاتی ہے۔

کچھ ایسے بھی پروانے ہیں اس بزم میں جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

اسی جامعیت کی وجہ سے ان کی تحریر وتقریر میں بعض بڑے پتے کی باتیں مل جاتیں ہیں جو ذہن کی گرہ کھول دیتی ہیں۔

مزاج وافتاد طبع

جہاں تک ان کے مزاج کی بات ہے طبیعت کھلی ہوتی تو معاصرین ہی نہیں اپنے عام تلامذہ سے بھی بلا تکلف گفتگو کرتے تبصرے، تجزیے، تجربے، لطیفے، چٹکلے سب ہوتے ،لیکن مزاجاً اصول پسند تھے اور مشاہدہ ہے کہ اصول پسند آدمی نازک مزاج ہوتا ہی ہے اور عام طلبہ کے ساتھ ان کا معاملہ (شاید طلب صادق دیکھنے کے لیے، یا موڈ نہ ہوتا تو) یہ بھی ہوتا کہ شروع میں خشونت آمیز انداز سے جواب دیتے جس سے طالب علم کو جھٹکا سا لگتا اب اگر عزت نفس کا مغلوب ہوتا تو بیک بني ودو گوش ایسا لوٹتا کہ پھر رخ نہ کرتا اور جو علم کے لیے اس تلخ کامی کو دواء طبیب سمجھ کر کڑوا گھونٹ پی لیتا وہ فائدہ اٹھاتا رہتا، ان کے اوقات کی رعایت سے ملاقات واستفادے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ بنیادی طور پر ان کے مزاج میں دو باتیں بطور خاص تھیں ایک محنت جفاکشی دوسرے اصول پسندی، محنت وجفاکشی کی مثال

ایک تو ان کا افتاء کے سال حفظ کرنا ہے جو عادۃً بڑی عمر میں بہت مشکل سے ہوتا ہے دوسرے باقاعدہ انگریزی زبان پڑھنا قدیم اساتذہ میں انگریزی میں ان جیسی استعداد کا حامل دارالعلوم میں کوئی نہیں تھا فراغت کے بعد (واضح ہو کہ مرحوم لفظ فراغت ہی کے مخالف تھے فرماتے تھے اس لفظ نے ریڑھ ماردی) ایسا ہاتھ پیر ڈالا جاتا ہے کہ اب آگے طلب گویا ممنوع ہے یا اب اس کا زمانہ ختم ہوگیا ایک مرتبہ حضرت نے دارالعلوم کے سالانہ انعامی جلسے میں جو ہمیشہ نہایت وقار کے ساتھ منعقد ہوتا ہے، کلیدی خطاب کرتے ہوئے (جو ہمیشہ انہی کا ہوتا تھا اور علم وتعلم کے حوالے سے بہت پر مغز ہوتا تھا، اتفاق کہ زندگی کا آخری خطاب بھی رجاب جامعہ میں انعامی اجلاس کا ہی ہوا) فرمایا تھا کہ آٹھ سال تو تمہارے اندر علم حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کی گئی ہے اب جا کر پندرہ سال پڑھاؤ اس کے بعد علم آنا شروع ہوگا۔

چونکہ اصول وضابطہ ان کے مزاج میں شامل تھا بلکہ بعض اصولوں میں وہ بہت مضبوط تھے، انہیں میں سے ایک یہ کہ وہ حدیث کی اجازت دینے میں محدثین کی شرائط معتبرہ کے سختی سے قائل تھے جب تک وہ حدیث کی قرأت اور اس کے فہم پر مطمئن نہ ہوجاتے بالکل اجازت نہ دیتے، ایک مرتبہ ملک قطر سے چند عرب اہل علم آئے، دیوبند، سہارنپور کے تمام بڑے علماء سے اجازت حدیث لی، حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں گئے مگر انہوں نے اجازت دینے سے معذرت کردی کہ جب تک میں حدیث دانی پر مطمئن نہ ہوجاؤں اجازت کا معمول نہیں ہے، چنانچہ انہوں نے حضرت کو قطر دعوت دی وہاں حدیث سنکر اور پڑھا کر اجازت مرحمت فرمائی اور وہاں عربوں میں حضرت کے حجۃ اللہ البالغہ کے دروس بھی ہوئے جس میں یہ بات بھی فرمائی کہ محدث ناصر الدین البانی نے حدیث کی سند اور اس پر حکم کے بارے میں حدیث ضعیف اور موضوع کو ایک ہی درجے میں کرکے اور صحاح ستہ کی حدیثوں پر اپنا حکم تھوپ کر ان کے مؤلفین سے اعتماد کو مجروح کیا ہے ان چیزوں کا نقصان دوسو سال تک رہے گا۔

اولاد کی تربیت میں بھی جو جدوجہد انہوں نے کی وہ بھی ایک ریکارڈ ہے عام طور

پر دیکھا گیا ہے کہ کسی بھی علم وفن میں جوفنا ہو جاتا ہے وہ اولاد سے غافل ہو جاتا ہے کسی مدرسے میں داخل کر دیا اور پدری ذمہ داریوں سے بری الذمہ، مفتی صاحبؒ تمام تر علمی تدریسی وتالیفی انہماک کے ساتھ اس فریضے سے مطلق غافل نہیں ہوئے بلکہ اس میں بھی نظیر قائم کی کہ تمام لڑکوں کو سال سوم تک کی تعلیم دینے کا انہوں نے بذات خود اہتمام کیا اپنے نظام الاوقات کا اہم جز بنایا، اس طرح نامناسب ماحول سے بھی بیت واہل بیت کو بچانے کی پوری سعی کی، حد یہ کہ اپنی زوجہ محترمہ مرحومہ کو انہوں نے گھر کی ذمہ داریوں کے ساتھ حفظ کروایا یہی نہیں پھر اہلیہ محترمہ نے اپنے اکثر صاحب زادوں اور دو صاحب زادیوں اور پانچ بہوؤں کو حفظ کروایا، ڈگریوں کی دوڑ میں سبقت لے جانے کے اس ماحول میں کتاب اللہ کی یہ قدر وعظمت اور اس کے لیے جفاکشی ایک نادر نمونہ ہے۔

دیوبندیت کیا ہے؟

مسائل شرعیہ، اعمال دینیہ کی تنقیح کر کے ما انا علیہ واصحابی کے ٹھیٹھ متوارث مفہوم پر افراط وتفریط سے بچتے ہوئے نظریہ اور عمل کو منطبق کرنا ہی دیوبندیت ہے حضرت مفتی صاحب قدس سرہ اس بارے میں بہت حساس واقع ہوئے تھے اب اس کی تنقیح وتفصیل کا وہ قطعی فیصلہ کر چکے تھے مگر پیغام اجل آ گیا اور یہ موضوع ''دیوبندیت کیا ہے'' تشنہ رہ گیا۔

دیوبندیت کے نام پر جو بدعت آمیز اعمال شروع ہوئے ہیں ان پر وہ بجا طور پر سخت برہم تھے جیسے ختم بخاری، مروجہ طرز کا اجتماعی اعتکاف، خواص کی قبر عمومی قبرستان سے ہٹ کر بنانا، وغیرہ۔ اس باب میں انہوں نے بے لاگ لپیٹ، لاخوف لومۃ لائم بدعت زدہ اعمال پر ڈٹ کے رد کیا، فرماتے تھے کہ میں اکابر کا متبع ہوں اکابر پرست نہیں ہوں، تبلیغی جماعت کے مروجہ نقائص و بے اعتدالیوں پر جتنے دوٹوک جرأت مندانہ بیانات انہوں نے دیے وہ کوئی اور نہیں دے سکا بلکہ اکثر حضرات مفاد ومصلحت کے خول میں ہی پناہ گزیں رہے ، اسی طرح مشائخ کے اور مروجہ تصوف کے انداز پر انہیں اعتراض تھا اس لیے بذات خود بھی انہوں نے محدثین کے طرز کا تصوف ومسلک اختیار کیا تھا، مشیخت کے عرفی لوازمات سے

بہت دور تھے۔

بحیثیت مؤلف

طبعاً وہ تالیفی مزاج کے حامل تھے اسی لئے شروع سے ہی انہوں نے تصنیف وتالیف کا سلسلہ رکھا مختصر و مطول، درسی، غیر درسی، شرح یا متن عربی میں یا اردو میں ان کے آہوئے قلم سے مفید و تحقیقی چیزیں سامنے آتی رہیں (تالیفات کا تعارف ان کی سوانح کا اہم باب ہے) ان میں چند کتابیں جو ان کی زندگی کی محنت کا نچوڑ تھیں ان کی شہرت کو بلندیوں تک پہونچایا اور ان کے علمی مقام کا ایک زمانے نے اعتراف کیا، وہ جامع ترمذی کی مفصل مکمل شرح جس کو انہوں نے تیس برس تک پڑھایا تھا، بخاری شریف کی مکمل شرح جس کو انہوں نے تیرہ برس پڑھایا (لیکن معلوم رہے کہ اس سے قبل بھی دو مرتبہ موصوف نے دار العلوم میں بخاری پڑھائی ہے ایک مرتبہ سن ۸۰ر کے انقلاب کے سال میں جس کو کیمپ کا سال کہتے ہیں، دوسرے حضرت الاستاذ شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب بلند شہریؒ نے علالت طبع کی وجہ سے خود ہی ایک سال کے لیے سپرد کر دی تھی)

اس کے علاوہ ان کی زندگی کا تالیفی شاہ کار، ''رحمۃ اللہ الواسعہ'' ہے جو ہندوستان کی تاریخ کی عظیم المرتبت کتاب بلکہ تصنیفی ذخیرہ کا گل سرسبد، یعنی حجۃ اللہ البالغہ، کی مفصل ومکمل شرح ہے، جو دور آخر کے قائم الزمان، موہوب ومنتخب مبعوث شخصیت، مسند الہند امام اکبر احمد بن عبد الرحیم المعروف بشاہ ولی اللہ الدہلوی کی فخر زمانہ تالیف ہے۔

جس کی تالیف کا حکم خود حضرت رسالت مآب - علیہ افضل الصلوات والتحیات نے فرمایا حضرات حسنین کریمین کے ذریعہ قلم عنایت کیا گیا تھا، جس کی تفصیل خود حضرت شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے شروع میں لکھی ہے، ملاء اعلی سے جس کتاب کی تصنیف اور مصنف کا فیصلہ کیا گیا ہو پھر اس کے کیا کہنے!! کتاب کے مصنف امام نے جو مجتہدانہ طرز واسلوب اختیار کیا تھا اسرار وحکم کے جو الہامی واردات بطون اوراق میں وریعت کیے تھے عربیت کے ذوق بلند کی رعایت سے ایک روشناس زبان نے جس بلیغ انداز میں نگارش کی

تھی اس کی فہم وتفہیم کے سامنے عام علماء نے تو پہلے ہی گھٹنے ٹیک دیے اور جو ماہرین جوہر شناس تھے چاہت کے باوجود ان کو فرصت میسر نہ آئی اس کی تشریح کی تمنا لیے ہوئے آسودۂ خاک ہوگئے۔

وَكَمْ مِنْ حَسَرَاتٍ فِيْ بُطُوْنِ الْمَقَابِرِ

اصل میں تقدیر کے قلم نے جس کے حصے میں جو چیز لکھ دی نگاہ ظاہر بین جو کچھ بھی دیکھے، اس کی تکمیل اسی سے ہوگی پھر کہا جائے گا کہ

ایں سعادت بزور بازو نیست ☆ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

غرض حضرت الاستاذ مرحوم نے پہلے تو دنیا کے مشہور مقامات سے اس کے مخطوطے حاصل کیے پھر اس میں مقارنہ کر کے متن کی تصحیح کی اب کہا جاسکتا ہے کہ ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا سب سے صحیح متن یہی ہے۔

ڈھائی سو سال کا یہ قرض جو خوان ولی اللّٰہی کے جرعہ نوشوں پر چلا آرہا تھا پوری جماعت اس کی جواب دہ تھی کاتب تقدیر حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کے نام اس اعزاز کو لکھ کر فارغ ہوچکا تھا، اس کا بیڑا اٹھانا بھی کچھ کھیل نہیں تھا، جوئے شیر نکالنی تھی جس کے لئے محض متداول علوم میں مہارت ہی کافی نہیں تھی بلکہ علوم ولی اللّٰہی سے گہری مناسبت اس کے معقولی ومنقولی فلسفیانہ پیچ وخم پر پوری دسترس ہو، مصنف کے اجمال سے تفصیل کو، کنایہ سے تصریح کو سمجھے، متن سے شرح کا استنباط کرے، ذہن آخاذ ہو وقت نظری ایسی ہو کہ زمین کے اوپر سے پانی اور پانی کی تہ میں موتی کو دیکھ لے اور پھر اس کو لڑی میں پرو کر ایسا ہار تیار کردے جو نور افزائے دیدۂ دل ہو ان سب کے بعد کام کی ایسی وارفتگی ہو کہ اس کو اوڑھ لے یہ کہہ کر پیچھے نہ ہٹ جائے کہ: ؎ ترے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

حضرت ممدوح نے طویل ترین عرصہ تک حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیا بعد اس کے کہ انہوں نے حکمت ریز زبان وقلم کے مالک حکمت قاسمی کے امین حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری طیب صاحب طاب ثراہ جیسے استاذ سے درس لیا، ایک دفعہ فرمایا کہ میں نے ایک مرتبہ

دوران درس اعتراض کیا گھنٹہ ختم ہوا اگلے دن پھر تیسرے دن میرا اشکال جاری رہا حضرت جواب دیتے رہے پھر حضرت نے فرمایا اور طلبہ کا نقصان ہوگا تم گھر پر پوچھ لینا۔

غرض ماہر فن سے پڑھنے سے ایک ذکی طالب علم کی صلاحیت دو آتشہ ہو جاتی ہے یہ چیز بھی حضرت شارح کو حاصل تھی پھر وقت آیا اور چھ ضخیم جلدوں میں ایک وقیع وعظیم شرح منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی برصغیر میں جس کا غلغلہ مچ گیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ سے منسوب تمام مکاتب فکر کی طرف سے نعرہ تحسین بلند ہوا سب نے اس گراں قدر نادر علمی خدمت کے انجام دینے پر ہدیہ تشکر پیش کیا۔

حضرت مفتی صاحب ممدوح بعض مسائل میں اپنی ذاتی رائے رکھتے تھے-لیکن واضح ہو یہ امر متفق علیہ ہے کہ تفردو انفرادی رائے صاحب رائے کی ذات تک محدود رہے گا خواہ کتنے ہی بڑے عالم وامام کا ہو پورے طبقے اور جمہور کا جو فیصلہ ہوگا وہی لائق اتباع قابل قبول ہوگا ، ذاتی رائے دوسرے پر حجت نہیں ہوتی واٹس ایپ پر حضرت علیہ الرحمہ کے غمگساران کی جو تحریریں آئیں ان میں مفتی صاحب کے کسی شاگر کی ایک تحریر آئی تھی (جو اگر چہ اس وقت سامنے نہیں ہے مگر) اس کا خلاصہ یہ تھا کہ: حضرت مفتی صاحب قدس سرہ نے دوران درس وضاحت سے فرمایا تھا جس کو میں نے جلی حرفوں میں لکھ رکھا ہے کہ : میری کسی بھی ذاتی رائے پر تمہارے لیے اس وقت تک عمل کرنا جائز نہیں جب تک دار الافتاء اس بات کی تصدیق نہ کردے،،۔ یہ بات نہایت دیانت پر مبنی ہے اور بعد والوں کے لئے ایک وصیت ہے۔

غرض حضرت الاستاذ رَحِمَہُ اللّٰہ نے ایک فعال ومتحرک مثالی زندگی گزاری حالات زمانہ سے بالکل نہیں گھبرائے کثیر العیال تھے مگر دست غیب کے منتظر نہیں رہے علمی انہماک کے ساتھ انہوں نے اپنے کو کتابوں کی تجارت سے جوڑا بغیر دکان کے ہی صرف گھر سے ہی اپنا کاروبار رکھا خود دار اصول پسند معاملات کے صاف تھے دیوبند کے مروجہ نظام سے ہٹ کر نقد لین دین کرتے خود دہلی جا کر کتابیں چھپواتے اللہ تعالی نے اس میں اتنی برکت

دی کہ سارے صاحبزادگان برسرروزگار، صاحب مکان، صاحب حیثیت ہیں۔

مضرت ردجمع کتب کے ذوق سے بطریق اختصاص بہرہ ور تھے ہزاروں کتابوں کا عظیم ذخیرہ نہایت سلیقے اور قرینے سے محفوظ کیا، اگراس سے استفادہ میں صلائے عام کیا جائے تو صدقہ جاریہ بھی ہو جو یان علم وتحقیق کے لئے نعمت کبریٰ بھی۔

وحید العصر استاذی حضرت مولانا وحیدازماں صاحب کیرانویؒ کے سانحۂ ارتحال کے بعد ملک میں بالعموم اور مادر علمی میں بالخصوص اتنا بڑا خلا محسوس نہیں کیا گیا۔

ام المدارس مادر علمی دارالعلوم دیوبند تاریخ اسلام کے بے شمار خدارسیدہ ہستیوں صدیقین وصالحین اقطاب وابدال کی دعائے نیم شبی، گریہ وابتہال کا مظہر بن کر وجود میں آیا پھراسی معدن سے ایسے شموس واقمار نکلے جن سے عالم کا عالم روشن ہوا۔

یقین واثق ہے کہ خدائے حی وقیوم نے جس طرح دارالعلوم پر نظر کرم فرمائی تھی ان کی لم یزل ولا یزال کریم ذات آئندہ بھی ستودہ صفات شخصیات سے اس عزیز ادارے کو نوازے گی۔

☆كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ☆

آسمان علم کا نیر تاباں غروب ہو گیا

مفتی محمد عفان صاحب منصور پوری

شیخ الحدیث وصدر المدرسین جامعہ عربیہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ

مشفق استاذ محترم، مادر علمی دار العلوم دیوبند کے مایۂ ناز شیخ الحدیث وصدر المدرسین، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری نور اللہ مرقدہ دنیائے فانی کو الوداع کہہ کر اپنے مزاج کے مطابق شان بے نیازی کے ساتھ جوار رحمت الٰہی میں پہنچ چکے ہیں، تاریخ تھی 25 / رمضان المبارک 1441ھ بوقت چاشت بروز منگل، یہ اتفاق نہیں بلکہ نظام قدرت ہے کہ سعید روح کے پرواز ہونے کے لئے مالک دو جہاں نے اس ماہ مبارک "رمضان" کے آخری عشرے کے لمحات کا انتخاب کیا ہوا تھا جس میں آخری سانس لینا اہل ایمان کے لئے اعلیٰ درجہ کی سعادت وخوش بختی اور علامت قبولیت ہے، طبیعت تو پہلے بھی متعدد مرتبہ تشویشناک حد تک آپ کی خراب ہوئی لیکن اللہ پاک کے خصوصی فضل وکرم اور بے شمار چاہنے والوں کی دعاؤں کی برکت سے پھر ایسے صحتیاب ہوئے کہ معمول کے مطابق درس وتدریس وعظ ونصیحت اور فیض رسانی کا سلسلہ جاری فرمادیا، اس مرتبہ بھی حضرت الاستاذ کی طبیعت کی ناسازی کا علم ہوا تو مجھ جیسے نہ جانے کتنے شاگردوں نے دعاؤں کا سلسلہ شروع کیا اور یہ امید کرتے رہے کہ ان شاء اللہ چند روز میں حضرت روبصحت ہو جائیں گے اور پھر علوم ومعارف کے موتی بکھیرنے شروع کریں گے لیکن تقدیر تدبیر پر غالب آئی اور اس مرتبہ ایسا نہ ہوا چند روز کی شدید علالت کے بعد آپ غریب الوطنی کی حالت میں (جو بجائے خود مقام سعادت وشہادت ہے) عروس البلاد ممبئی کے ایک شفاخانے میں واصل بحق ہو گئے اور پھر وصیت کے مطابق مقامی قبرستان ہی میں آسودۂ خواب ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت الاستاذ کے انتقال پر ملال کو دو دن گزر چکے ہیں لیکن طبیعت ایسی مغموم اور بجھی ہوئی ہے کہ نہ کچھ کہا جا رہا ہے نہ لکھا جا رہا ہے، یادوں کا ایک سلسلہ ہے جو تھمنے کا نام نہیں لیتا، آپ کا مخصوص لب ولہجہ، خوبصورت ومنفرد اور دلنشیں انداز بیان، جاذب نظر خط اور

تحریر، ہر چیز کو بہت اہتمام اور اہمیت کے ساتھ ذکر کرنا، قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کی عام فہم تشریح، اردو و عربی قواعد و محاورات کی بہترین وضاحت اور اس طرح کی بہت سی ایسی خصوصیات ہیں جو ذہن و دماغ میں ایسی نقش ہو چکی ہیں کہ مٹائے نہیں مٹ سکتیں۔

بلا شبہ آپ ایک قابل فخر، صاحب طرز، کہنہ مشق، طلبہ کی نفسیات کو سمجھنے والے ایک کامل استاذ تھے، خوش نصیب ہیں وہ تمام حضرات جن کو حضرت کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقع میسر ہوا۔

آپ صرف استاذ نہیں بلکہ استاذ گر تھے، آپ سے پڑھنے والا پڑھانا سیکھ جاتا تھا، نہ جانے کتنے شاگردوں نے آپ کے اسلوب کو اخذ کر کے اپنی تدریس کے انداز میں نکھار پیدا کیا ہوگا، بھر پور توجہ کے ساتھ تمام طلبہ پر نگاہ رکھتے ہوئے ایسی سبک رفتاری سے کلام فرماتے کہ لکھنے والا بہ آسانی آپ کی تقریر کو قلم بند کر لیتا اور ہر طالب علم گوش بر آواز ہوتا، امثلہ و نظائر کے ذریعہ مسئلہ کو سمجھاتے اور درمیان میں ایسے لطائف بھی سناتے یا ایسے جملے بولتے جس سے مجلس درس زعفران زار ہو جاتی اور نئی تازگی محسوس ہوتی، سبق میں شروع سے اخیر تک دلچسپی ایسی برقرار رہتی کہ مجال ہے کہ کوئی طالب علم غافل ہو جائے یا بے توجہی کا مظاہرہ کرنے لگے۔

ہم نے بھی سنن ترمذی کے تقریباً تمام دروس بالاستیعاب ضبط کئے پھر تکرار کے موقع پر اور بعد میں تدریس کے وقت کاپی پر ایک نگاہ ڈالنے سے غیر معمولی فائدہ محسوس ہوا۔

تفہیم کے تو آپ بادشاہ تھے، پیچیدہ سے پیچیدہ مباحث کو دلنشیں پیرایہ میں اس طرح پیش کرنا کہ غبی سے غبی طالب علم بھی مطمئن ہو جائے خدا کی طرف سے عطا کردہ آپ کا وہ امتیاز تھا جس کا ہر شخص قائل اور معترف ہے۔

ہمیں حضرت الاستاذ سے سنن ترمذی اور شرح معانی الآثار پڑھنے کا موقع ملا، صبح کے تیسرے گھنٹے میں اور مغرب کے بعد آپ کا درس ہوتا تھا، محلّہ بیرون کوٹلہ میں جو دار العلوم سے خاصے فاصلے پر واقع ہے آپ کا مکان تھا وہاں سے پیدل بڑی پابندی کے

ساتھ بروقت درس میں تشریف لایا کرتے تھے اور شروع ہی میں طلبہ کو یہ ہدایت فرمادی تھی کہ میرے آنے کے بعد کسی طالب علم کا درسگاہ میں آنا جرم ہوگا، چنانچہ طلبہ اس کا بھرپور خیال بھی کرتے اور آپ کے آنے سے پہلے درسگاہ کھچا کھچ بھر جاتی، اگر کبھی اتفاق سے آپ تشریف لائے اور طلبہ کی تعداد کم محسوس ہوئی تو ناراضگی کا اظہار فرماتے ہوئے واپس تشریف لے جاتے اور خاص طور سے ترجمان سے جواب طلب فرماتے، یہ مرحلہ طلبہ کے لئے بڑی تشویش اور فکر کا باعث بن جاتا تھا، عصر کی نماز کے بعد طلبہ ڈرتے ڈرتے آپ کے گھر مجلس میں حاضر ہوتے، غلطی پر نادم ہوتے، معافی طلب کرتے، آئندہ پابندی کے ساتھ حاضری کا عہد کرتے تو دو چار تنبیہی جملے کہہ کر معاف فرمادیتے اور اگلے وقت تشریف لے آتے، آپ کے اس عمل کا یہ اثر ہوتا کہ پھر طلبہ وقت سے پہلے درسگاہ میں موجود دکھائی دیتے۔

ہمارے سال بھی ایک مرتبہ ایسا ہی واقعہ پیش آیا ہم لوگ عصر کے بعد حاضر خدمت ہوئے، معافی مانگی، فرمانے لگے کہ تم لوگ کیوں آئے، تمہاری وجہ سے میں واپس تھوڑا ہی آیا تھا، جاؤ ان ہی طلبہ کو بھیجو جو درس گاہ میں موجود نہیں تھے، احساس تو ان کو ہونا چاہیے، چنانچہ پھر طلبہ کی ایک بڑی جماعت حاضر ہوئی حضرت اولاً ناراض ہوئے، فرمایا میں اتنی دور سے تیاری کرکے محنت کرکے سبق پڑھانے جاتا ہوں اور تم لوگ غائب رہتے ہو پھر اسباق میں پابندی سے حاضری کی تاکید فرمائی، اس کے فوائد وبرکات بتائے اور پھر شفقت فرماتے ہوئے معاف فرمایا اور اگلے دن سلسلۂ درس کا آغاز فرمادیا۔

ابتدائے سال میں مبادیات حدیث، علوم حدیث، مقام سنن ترمذی اور امام ترمذی کی مخصوص اصطلاحات پر سیر حاصل گفتگو فرماتے جو کئی کئی روز تک مسلسل جاری رہتی۔

آپ کے سبق میں عبارت خوانی کا مرحلہ بھی بڑا اہم ہوتا تھا، ہر طالب علم اس کی ہمت نہیں کرپاتا تھا، آپ باقاعدہ گھر بلاکر عبارت خوانی کے خواہشمند طلبہ کا امتحان لیتے اور پھر چند طلبہ کو سال بھر عبارت خوانی کے لئے متعین فرمادیتے، اطمینان کے ساتھ صاف صاف، متوسط آواز میں، صحیح عبارت پڑھنے کی تاکید فرماتے، آواز تھوڑی بھی تیز ہوتی تو

حضرت کو ناگوار گزرتی، ٹوکتے اور فرماتے مائک دور کر کے پڑھو، اعراب کی غلطیاں اگر آنے لگتیں تو عبارت خواں تبدیل فرما دیتے یا خود پڑھنا شروع فرما دیتے اس لئے عبارت خواں طلبہ بھر پور تیاری کر کے ہی سامنے آتے تھے۔

ہمیں بھی الحمدللہ کتاب کے معتد بہ حصہ کی عبارت پڑھنے کا موقع ملا ایک دفعہ پڑھتے ہوئے بار بار گلا صاف کرنے کے لئے کھنکھارنے کی نوبت آئی تو مجھے مخاطب کر کے فرمانے لگے: سنو! سب طلبہ متوجہ ہو گئے تو ارشاد فرمایا کل سے چمچہ لے کر آیا کرو اور جہاں آواز پھنسے، گلے میں چلا لیا کرو، سب ہنسنے لگے، حضرت بھی متبسم ہوئے اور فرمایا چلو آگے پڑھو۔

مغرب کے بعد تشریف لاتے تو باضابطہ سبق کا آغاز کرنے سے پہلے حفظ احادیث کی غرض سے ایک مختصر حدیث لکھواتے اور تین مرتبہ اس کو اجتماعی طور پر کہلواتے۔

شروع سال سے اخیر تک آپ کا انداز تدریس بلکل یکساں رہتا اواخر سال میں بھی اسی بسط و تفصیل کے ساتھ اطمینان سے پڑھاتے رہتے جس انداز سے شروع میں پڑھاتے، سب کے اسباق بند ہو جاتے اور آپ کے اسباق کا سلسلہ امتحان کے قریب تک جاری رہتا، کتاب کی تکمیل کے موقع پر آپ کی الوداعی نصیحت بھی بہت اہم ہوتی تھی جس کا طلبہ کو اشتیاق رہتا تھا اور جب آپ دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے تھے تو طلبہ کی روتے روتے یہ سوچ کر ہچکیاں بند جاتی تھیں کہ اب حضرت کی مجلسِ درس میں حاضری کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔

طلبہ کے درمیان مقبول ترین اساتذہ میں آپ کا شمار تھا، آپ کے شخصی رعب علمی مقام اور وجاہت کی وجہ سے طلبہ اگر چہ آپ سے بے تکلفانہ گفتگو نہیں کر پاتے تھے لیکن دل سے محبت اور قدر بہت کرتے تھے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ حضرت الاستاذ نے یہ علمی تفوق، رفعت مقام، اور

لوگوں کے دلوں پر دھاک کسی بیساکھی کے ذریعہ حاصل نہیں کی، بلکہ اس کے پیچھے صرف اور صرف اللہ کا فضل وکرم اور حضرت کی مقصد کے تئیں جفاکشی، وقت کا صحیح استعمال اور بے پناہ محنت وجدوجہد ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ دور طالب علمی سے لیکر زمانہ تدریس تک کیسے کٹھن اور صبر آزما حالات کا آپ نے خندہ پیشانی اور جذبہ شکر کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن اپنی علمی سرگرمیوں پر آنچ نہ آنے دی یہ رتبہ بلند اور علمی دنیا میں آپ کا سکہ اسی جہد مسلسل اور قربانی کا نتیجہ ہے۔

حضرت الاستاذ سے پڑھنے کا موقع تو ہمیں دورۂ حدیث میں ملا لیکن شعور کی آنکھیں کھولنے کے بعد ہی سے ہم نے حضرت الاستاذ کا نام سنا کیونکہ محلّہ بیرون کوٹلہ میں جہاں آپ کی رہائش تھی اسی کے پڑوس میں حضرت والد محترم دامت برکاتہم کے ساتھ ہم لوگوں کی بھی سکونت تھی، کچھ بڑے ہوئے تو بعد عصر آپ کی مجلس میں حاضری کا بھی موقع ملنے لگا، پھر تو قرب وتعلق اور عقیدت بڑھتی ہی چلی گئی۔

کتابیں اور علمی اشتغال آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا، مزاج میں یکسوئی اور زندگی میں انتہائی سادگی تھی، شہر میں زیادہ لوگوں سے آپ کے راہ ورسم نہیں تھے اور علمی اشتغال کی وجہ سے آپ کے پاس اس کا موقع بھی نہیں تھا، جب بھی خدمت میں حاضری ہوتی کچھ پڑھتے ہوئے، پڑھاتے ہوئے، لکھتے ہوئے، سنتے ہوئے یا نصیحت کرتے ہوئے ملتے، عصر کے بعد عمومی مجلس ہوتی اس میں طلبہ آپ کے سر پر تیل رکھتے، کچھ پوچھتے تو آپ تسلی سے جواب مرحمت فرماتے، دیر تک خاموشی رہتی تو خود فرماتے کچھ سوال کرو خاموش کیوں بیٹھے ہو، یہاں آیا کرو تو سوال سوچ کے آیا کرو۔

فرق باطلہ کا تعاقب، مسلک حق کی ترجمانی، منکرات پر برملا نکیر اپنے موقف پر خلوص نیت کے ساتھ جماؤ یہ چیزیں آپ کے مزاج کا حصہ تھیں۔

دیوبند جانا ہوتا تو حضرت الاستاذ سے ملاقات کے لئے حاضری ہوتی، بڑی محبت وشفقت کا معاملہ فرماتے، اسباق کی تفصیلات معلوم کرتے، دعائیں دیتے، مدرسہ کے احوال

دریافت فرماتے، کوئی نئی کتاب چھپ کر آتی تو عنایت فرماتے مزید دو نسخے دیتے اور فرماتے کہ یہ مفتی سلمان کو دینا وہ اس پر ندائے شاہی میں تبصرہ لکھ دیں گے، ندائے شاہی کا بھی پابندی سے مطالعہ فرماتے رسالہ اکثر آپ کی تپائی پر دکھائی دیتا، بارہا فرمایا کہ تمھارا مضمون پڑھا اچھا تھا لکھتے رہو ایک مرتبہ فرمایا کہ تمہارا اور مفتی سلمان کا مضمون ضرور پڑھتا ہوں۔

مدرسہ عربیہ اعزاز العلوم ویٹ کے جلسہ سالانہ میں اکثر و بیشتر حضرت کی شرکت ہوتی تھی، چند سال قبل ایسا اتفاق ہوا کہ حضرت اسٹیج پر تشریف فرما تھے اور آخری خطاب آپ کا ہونا تھا، حضرت مولانا قاری شوکت علی صاحب زید مجدہ کا حکم تھا کہ تجھے بھی کچھ کہنا ہے اس کے بعد حضرت بیان فرمائیں گے، میری ہمت بالکل نہیں ہو رہی تھی، میں نے عرض کیا حضرت آپ بیان فرمادیں، آپ کی موجودگی میں ہم کچھ نہیں بول سکتے، حکماً فرمایا کہ بیان کرو میں بیٹھا ہوں جب تک ایسے نہیں بولو گے تو بیان کرنا کیسے آئے گا۔

مدرسہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ سے آپ کا تعلق بہت گہرا اور پرانا تھا آپ مدرسہ کی مجلسِ شوریٰ کے ممبر بھی تھے اور پچھلے چند سالوں تک مسلسل ختم بخاری کے لئے تشریف بھی لاتے، مدرسہ کے سابق مہتمم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمہ سے آپ کی دیرینہ رفاقت تھی، جس کو آپ نے اخیر تک بخوبی نبھایا۔

چند ماہ بیشتر آپ کے صاحبزادہ گرامی کا انتقال ہوا تو مدرسہ کے ذمے داران کے ہمراہ آپ کی خدمت میں حاضری ہوئی، جاتے ہی پوچھا کیوں آئے ہو؟ ہم نے مرحوم صاحبزادے کا تذکرہ شروع ہی کیا تھا تو فرمانے لگے "جو گیا وہ سپنا اور جو رہا وہ اپنا" اللہ کو جو منظور تھا وہ ہو گیا، بس جانے والوں کے لئے دعا کرتے رہو، پھر تعزیت کے مروجہ طریقہ کے عدم ثبوت پر گفتگو فرماتے رہے، کچھ دیر کے بعد ہم نے عرض کیا کہ حضرت کئی سال سے آپ کی تشریف آوری مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں نہیں ہو سکی ہے اس سال تشریف لے آئیں مسکراتے ہوئے فرمانے لگے "اب اس نے موضوع بدل لیا حالانکہ آیا تھا یہ تعزیت ہی کے لئے" پھر فرمایا کہ جلسہ کی تاریخ کے لئے رجب کے شروع میں ملنا، پھر ملاقات ہوئی تو

کمزوری اور طبیعت کی ناسازگی کی وجہ سے معذرت فرمالی۔

حضرت الاستاذ کی شخصیت پر لکھنے کے بہت سے پہلو ہیں جن پر لکھنے والے انشاء اللہ خوب اور بہت خوب لکھیں گے یہ تو بروقت بے ترتیب کچھ تاثراتی سطور ایک ادنی شاگرد کی طرف سے حضرت الاستاذ کے لئے خراج عقیدت کے طور پر قلمبند کردی گئی ہیں۔

اس موقعہ پر ہم استاذ مکرم کے اہل خانہ بالخصوص آپ کے برادر گرامی استاذ نا حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری مدظلہ اور آپ کے جملہ صاحبزادگان واولاد واحفاد کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ پاک ہمارے حضرت کی مغفرت تامہ فرمائیں، جنت الفردوس میں اعلی مقام نصیب فرمائیں، آپ کی زریں وسنہری دینی خدمات کا اپنی شایانِ شان بدلہ مرحمت فرمائیں اور مادر علمی دارالعلوم دیوبند کو آپ کا نعم البدل عطا فرمائیں۔

مسلک دیوبند کے سب سے مضبوط ترجمان اور کسوٹی تھے حضرت پالن پوری رحمہ اللہ

مفتی خلیل الرحمٰن قاسمی برنی

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کے انتقال کو کئی دن گذر چکے ہیں لیکن طبیعت ایسی بجھی ہوئی ہے کہ نہ کچھ کہا جا رہا ہے نہ لکھا جا رہا ہے۔ یادوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جو تھمنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ حضرت الاستاذ کا سراپا، ان کا مخصوص لب ولہجہ، خوبصورت ودلنشیں انداز بیاں، جاذب نظر خط اور تحریر، اردو عربی قواعد وامثال کی بہترین انداز میں وضاحت، منکر پر نکیر، حق گوئی وبے باکی، فرق باطلہ کا تعاقب، مسلک دیوبند کی ایسی ترجمانی کہ لایخافون لومۃ لائم کے کامل مصداق اپنے موقف پر خلوص نیت کے ساتھ جماؤ اور اس طرح کئی بہت سی ایسی خصوصیات ہیں جو ذہن ودماغ میں نقش ہو چکی ہیں اور ان کو ضبط تحریر میں لانے کی ضرورت ہے۔ اس تحریر میں حضرت رحمہ اللہ کی وہ خصوصیت جس میں حضرت رحمہ اللہ منفرد تھے یعنی مسلک دیوبند کی صحیح ترجمانی اور اس کی تطہیر کی کوشش والی صفت وخصوصیت پر روشنی ڈالنے کی سعی کی گئی ہے۔

حضرت اقدس مفتی سعید احمد پالن پوری رحمہ اللہ جماعت دیوبند کے ترجمان اور مسلک دیوبند کی کسوٹی تھے، آپ ہر سال دوران سبق کئی دفعہ یہ بات فرمایا کرتے تھے کہ دیوبندیت میں تطہیر بمعنی اصلاح کی ضرورت ہے، آہستہ آہستہ بہت ساری بدعات ورسومات ہمارے یہاں بھی در آئی ہیں، حضرت رحمہ اللہ بڑی شدت کے ساتھ دیوبندی حلقوں میں پائی جانے والی بدعات کا رد فرمایا کرتے تھے اور اس سلسلے میں کسی سے مرعوب ہونا یا کسی کی ملامت کی پرواہ کرنا آپ کے یہاں بالکل نہیں تھا، یہی وجہ ہے کہ دار العلوم دیوبند سے وابستہ

بڑی بڑی شخصیات کے یہاں بھی جب کوئی نامناسب بات نظر آئی تو آپ نے برملا نکیر فرمائی اور روک ٹوک کرنے میں ذرہ برابر بھی توقف نہیں فرمایا۔ اس سلسلے کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

(۱) قدوۃ السالکین شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے ایک تفرد کی وجہ سے آپ کی اولاد اور متبعین کے یہاں آج تک رمضان المبارک میں باجماعت تہجد کا رواج ہے، بنگلہ دیش اور آسام کے اکثر علاقوں میں چونکہ حضرت شیخ الاسلام کے فیض یافتگان کی بڑی تعداد رہی ہے، اس لئے وہاں یہ رواج بہت کثرت اور شدت کے ساتھ دیکھنے کو ملا۔ دیوبند میں آپ کے خانوادہ میں بھی یہ عمل بڑی پابندی اور مواظبت کے ساتھ جاری ہے۔ بڑے بڑے حضرات اس مبارک خاندان کی رعایت میں خاموش رہے لیکن حضرت پالن پوری رحمہ اللہ نے بارہا برسرِ عام سخت نکیر فرمائی اور اسے بدعت قرار دیا۔

(۲) دیوبندی حلقوں میں کسی بزرگ کے انتقال کے بعد تعزیتی جلسوں کے عنوان سے پروگراموں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوگیا ہے جس کے تکلفات دیکھ کر اس کے بدعت ہونے میں شبہ نہیں رہ جاتا، چونکہ بڑے بڑے حضرات ان تعزیتی نشستوں میں رونق افروز ہوتے ہیں اس لیے بہت سے مفتیوں کے لیے چاہتے ہوئے بھی ان پر نکیر کرنا آسان نہیں تھا، حضرت الاستاذ رحمہ اللہ نے اس رسم پر کھل کر تنقید کی اور صرف تنقید ہی نہیں مستقل رسالہ تصنیف فرما کر ان پروگراموں کی خرابیوں کو خوب واضح کر دیا، جس وقت حضرت نے تعزیتی جلسوں کے خلاف فتویٰ دیا اس وقت دار العلوم دیوبند کی بڑی بڑی شخصیات ایک دوسری بہت بڑی شخصیت کے تعزیتی اجلاس میں شریک تھیں۔ اس فتوے کی وجہ سے بعض لوگوں کی جانب سے آپ کے خلاف طوفان بدتمیزی بھی برپا کیا گیا لیکن آپ پوری جرأت و استقامت کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔

(ماخوذ از دیوبندیت کی کسوٹی، مولانا عبدالاحد قاسمی)

(۳) ختم بخاری کے وقت دیوبندی مدارس میں پورے اہتمام و تداعی کے ساتھ

جلسوں کا سلسلہ چلتا ہے اور ہر سال یہ جلسے نئے نئے تکلفات کے ساتھ بڑھتے چلے جا رہے ہیں؛ کچھ حد تک یہی سلسلہ دارالعلوم دیوبند میں بھی شروع ہو گیا تھا لیکن حضرت الاستاذ رحمہ اللہ نے شیخ الحدیث بنتے ہی اس سلسلے کو بالکلیہ موقوف فرما دیا اور اسے بند کرنے کے لیے حضرت نے اتنی شدت فرمائی کہ جس سال آپ شیخ الحدیث بنے کسی بھی طالب علم کو آخری دن تک پتہ نہیں لگنے دیا کہ بخاری کب مکمل ہوگی اور اسی حالت میں ایک روز اچانک ختم فرما کر دعا کروا کر چلے گئے۔

(۴) چھتہ مسجد میں واقع جس انار کے درخت کے نیچے دارالعلوم دیوبند کی شروعات ہوئی وہ درخت کافی عرصے تک رہا، دارالعلوم کے اساتذہ وطلباء اس درخت کا بے حد احترام کرتے تھے اور پھر عوام بھی اس کی زیارت کے لئے آنے لگے، قریب تھا کہ اس درخت کے تعلق سے عوام وخواص میں بہت سے توہمات جنم لے لیں؛ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ نے اس خطرے کو بروقت بھانپ لیا اور ذمہ داران دارالعلوم کے سامنے بیعت رضوان والے درخت کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذریعے کاٹے جانے کی نظیر پیش فرما کر اس درخت کو بھی کٹوا دیا۔ کسی بزرگ کے خواب کی بنیاد پر دارالعلوم کے احاطۂ مولسری میں واقع کنویں کے پانی کو بڑی اہمیت دی جانے لگی تھی، طلبہ کے ساتھ بہت سے اساتذہ بھی اس پانی کو بڑے اہتمام کے ساتھ نوش فرمایا کرتے تھے اور پھر دھیرے دھیرے یہ بات عوام تک بھی پہنچ گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ دارالعلوم کی زیارت کے لئے آنے والے تمام مہمان اس کنویں کا پانی ضرور نوش کرتے، بعض لوگوں نے اسے زمزم کا نام دینا بھی شروع کر دیا تھا، یہ حالت دیکھ کر حضرت الاستاذ رحمہ اللہ نے اس مسئلے پر اتنا جارحانہ رخ اختیار فرمایا کہ پھر یہ کنواں اور اس کا پانی مذاق بن کر رہ گیا۔

(ماخوذ از دیوبندیت کی کسوٹی حضرت پالن پوریؒ، مولانا عبدالاحد قاسمی)

قبرستان میں بزرگوں کی قبروں پر کتبے لگانے کے آپ سخت خلاف تھے اور مزار قاسمی میں لگائے ہوئے کتبوں پر سخت نکیر فرمایا کرتے تھے؛ یہی وجہ ہے کہ آپ کی رحمہ اللہ کی

قبر مبارک باوجودیکہ ایک عوامی قبرستان میں ہے لیکن آپ کے سخت موقف کی وجہ سے کوئی کتبہ نہیں لگایا گیا۔ کسی دور دراز جگہ انتقال کے بعد بزرگوں کی نعش کو پورے اہتمام کے ساتھ وطن اصلی کی جانب منتقلی کے بھی آپ سخت خلاف تھے اور اسے میت کی بے حرمتی سے تعبیر فرمایا کرتے تھے؛ اپنے بارے میں بھی حضرت نے یہی وصیت فرمارکھی تھی کہ مرنے کے بعد میری بے حرمتی مت کرنا اور جہاں انتقال ہو وہیں دفن کردینا؛ چنانچہ آپ کی وصیت کے مطابق ہی آپ کو ممبئی میں دفنایا گیا۔ بزرگوں کو عوامی قبرستان میں دفن کرنے کے بجائے کسی خاص جگہ ان کے مدرسے یا خانقاہ وغیرہ میں تدفین کے بھی آپ سخت خلاف تھے؛ چنانچہ آپ کے مزاج وخواہش کے مطابق آپ رحمہ اللہ کو ممبئی کے ایک عام قبرستان میں دفنایا گیا۔ رائپور اور جھنجھانہ وغیرہ میں بزرگوں کی قبروں کے پاس دریاں بچھائی جاتی ہیں اور ہر کس وناکس مراقبے کے عنوان سے وہاں آنکھیں بند کرکے بیٹھا رہتا ہے، اس طرح کے مراقبوں پر آپ سخت نکیر فرمایا کرتے تھے اور اسے بریلویت کی جہالت اور قبر پرستی تک لے جانے والی رسم بد فرمایا کرتے تھے۔

الغرض؛ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ جماعت دیوبند کے اپنے معاصر علماء میں سب سے مضبوط ترجمان اور تصلب فی المسلک میں اپنی مثال آپ تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ آپ مسلک دیوبند کے ایک مجدد کی حیثیت سے متعارف ہوئے تو غلط نہ ہوگا۔ آپ مسلک دیوبند میں تطہیر کے لئے ہمیشہ بے چین رہتے تھے۔ سبق کے دوران آپ کی زبانی بارہا سنا کہ "اب دیوبندیت اور بریلویت میں بالشت بھر کا فاصلہ بچا ہے اور یہ بات آپ حضرت مولانا منظور نعمانی کے حوالے سے فرمایا کرتے تھے" آخر میں آپ "دیوبندیت کیا ہے؟" کے عنوان پر ایک مفصل تصنیف بھی رقم فرمانے والے تھے لیکن زندگی نے وفا نہ کی۔ فرحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

اعتراف فضل و کمال

شیخ الحدیث و صدر مدرس دارالعلوم دیوبند عالمِ یگانہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوریؒ

کچھ تأثرات، کچھ حالات

۱۳۶۰ھ/۱۹۴۰ء—۱۴۴۱ھ/۲۰۲۰ء

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں ’’کمیاب‘‘ ہیں ہم
جو یاد نہ آئے بھول کے پھر، اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم
(علی محمد شاد عظیم آبادی: ۱۸۴۶—۱۹۲۷ء)

بہ قلم: مولانا نور عالم خلیل امینی
چیف ایڈیٹر ’’الداعی‘‘ و استاذ ادبِ عربی دارالعلوم دیوبند

چہار شنبہ و پنج شنبہ (بدھ - جمعرات): ۲۲-۲۳/ رجب ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۸-۱۹/ مارچ ۲۰۲۰ء کی شب میں عشا کی نماز کے بعد مفتی صاحب نے بخاری شریف کا آخری درس دیا۔ جب درس گاہ یعنی دارالحدیث: دارالعلوم کے کتب خانے کی نئی عمارت کے زیریں ہال میں حاضری ہوئی، تو حسبِ معمول اُنھوں نے حمد و صلاۃ کے بعد، سبق کا خلاصہ ذکر کیا، اس کے بعد متعینہ طالب علم نے بخاری شریف کی متعلقہ حدیثیں پڑھیں۔ آپ نے حدیثوں کے مطلوب و مفہوم پر حسبِ توفیق گفتگو کی۔ پھر طالب علم نے آگے کی عبارت پڑھی اور آپ نے حسبِ منشا گفتگو کی۔ اُس کے بعد پھر طالب علم نے آگے کی حدیثوں کی خواندگی کی؛ لیکن اس کے بعد آپ نے جو کچھ کہنا چاہا، اُس پر قادر نہ ہو سکے، زبان و دماغ نے ساتھ نہیں دیا۔

خاصی دیر تک یہ ہوا کہ بخاری شریف کے صفحات آپ کے سامنے کھلے رہے؛ لیکن اُن کے اپنے اِرادے اور کوشش کے باوجود اُن کی زبان بندی ختم نہ ہو سکی، دیر تک خاموش نشستگی

کی حالت میں جب اُن کا دل بہت متأثر اور پرغم ہوگیا، تو یہ کیفیت چشمِ تر سے چہرے پر ٹپکتے ہوئے آنسوؤں سے عیاں ہونے پر ۱۵سو طلبۂ دورۂ حدیث کی جماعت، جو شریکِ درس تھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دارالعلوم دیوبند کے اُستاذ مولانا ڈاکٹر اشتیاق احمد قاسمی دربھنگوی نے (جو مفتی صاحب کے محبوب اور ہمہ وقت حاضر باش، دکھ درد میں شریک رہنے والے شاگردِ رشید ہیں) جو مفتی صاحب کی زندگی کے اس آخری درس میں موجود تھے؛ مفتی صاحب سے گزارش کی کہ آپ دعا کے لیے ہاتھ اُٹھالیں؛ تاکہ طلبہ خاموش طور پر آپ کے ساتھ دعا کرلیں؛ لیکن مفتی صاحب نے دھیمی آواز میں یہ آخری جملہ اِرشاد فرمایا ''اب جو اللہ چاہے گا وہی ہوگا''۔

گویا درس گاہ میں اُن کے آخری درس کا یہ آخری جملہ تھا، جو اَب طلبہ کی زبان پر عرصۂ دراز تک جاری رہے گا اور وہ بہ طور ہدیۂ ثمینہ ایک دوسرے کو پیش کرتے اور غم کُشی کا ذریعہ سمجھتے رہیں گے۔ پھر انتہائی شکستہ دلی کی حالت میں کتاب بند کرکے، فوراً کھڑے ہوگئے اور مسندِ درس سے اتر کر، ہال کے باہر کھڑی کار میں بیٹھ اپنے گھر آگئے۔ مولانا اشتیاق نے کار میں بیٹھتے ہی اُن سے عرض کیا کہ حضرت! ابھی دارالعلوم میں تعلیمی سال کے ختم پر ہونے والی سالانہ تعطیلِ کلاں نہیں ہوئی ہے، آپ کل ممبئی تشریف لے جارہے ہیں، اِن شاء اللہ چند ہی روز میں شفایاب ہوکر جب تشریف لے آئیں گے، تو اِس آخری درس کا باقی ماندہ مکمل فرمادیں گے اور طلبہ کو جو آخری نصیحت کرنی ہوگی وہ بھی ان شاء اللہ کردیں گے۔ یہ سن کر اُن کے چہرے پر اطمینان وانبساط کی لکیریں ابھر آئیں۔

گھر (جو اندرون کوٹلہ میں واقع ہے) پہنچ کر اپنے دیوان خانے میں کرسی پر بیٹھتے ہی غم زدہ واُداس لہجے میں فرمایا کہ لگتا ہے کہ میں آیندہ سال بخاری شریف کا درس نہیں دے سکوں گا۔ مولانا اشتیاق نے اُنھیں تسلی دی اور عرض کیا کہ حضرت! آپ خاطر جمع رکھیں، آپ اِن

شاءاللہ آیندہ سال بھی اپنی تعلیمی وعلمی ذمّے داریوں سے عہدہ برآ ہوتے رہیں گے، گزشتہ سال بھی آپ کو زبان بندی کا عارضہ لاحق ہوا تھا؛ لیکن دوا وعلاج سے آپ بحمد اللہ بہ عجلت صحت یاب ہوکر اپنے تدریسی وتحریری مشاغل اور دیگر واجباتِ زندگی میں سرگرم عمل ہوگئے تھے، تا آں کہ دوبارہ یہ صورتِ حال پیش آئی ہے، اِن شاءاللہ آپ اِس مرتبہ بھی جلد ہی شفایاب ہوں گے۔ مفتی صاحبؒ ہمت وحوصلے کے آدمی تھے، تسلّی دہندہ کی ان باتوں کو سن کر، بڑی حد تک مطمئن ہوگئے۔

آیندہ کل، یعنی جمعرات: ۲۳؍رجب ۱۴۴۱ھ = ۱۹؍مارچ ۲۰۲۰ء کو علاج کے لیے ممبئی تشریف لے گئے، جہاں اُن کی صاحب زادی، داماد، اُن کے اہل خانہ اور دیگر اعزا واقربا کی بود وباش ہے۔ دوسرے روز، یعنی جمعہ: ۲۴؍رجب = ۲۰؍مارچ کو اُن لوگوں کے مشورے سے، ممبئی کے ''مومن'' برادری کے ہسپتال ''ملت'' میں علاج کے لیے داخل ہوے۔ وہاں تشخیص ہوئی کہ کولسٹرول بہت بڑھا ہوا ہے اور موجودہ ساری پریشانیاں اسی کی وجہ سے ہیں وہاں بھرپور توجّہ کے ساتھ علاج ہوا اور ۴ روز بعد ہی، یعنی دوشنبہ: ۲۷؍رجب = ۲۳؍مارچ کو شفایاب ہوکر ممبئی کی قیام گاہ واپس آگئے۔

۲۸؍رجب = ۲۴؍مارچ کو ہندوستان کے وزیر اعظم نے ''کورونا وائرس'' کے پھیلاؤ پر قابو پانے کے لیے پہلے قدم کے طور پر ''جنتا لاک ڈاؤن'' کا اِعلان کیا، چناں چہ اُس دن باشندگانِ ملک نے اس فرمان کی مکمل تعمیل کی۔ اُسی روز، یعنی ۲۸-۲۹؍رجب = ۲۴-۲۵؍مارچ کی رات میں وزیر اعظم نے ملک گیر مکمل لاک ڈاؤن کا اِعلان کردیا اور ۱۲ بجے رات سے اُس کا نفاذ عمل میں آگیا؛ لہٰذا پورے ملک میں جو جہاں تھا وہیں پھنس گیا؛ کیوں کہ آمد ورفت کے سارے ذرائع بالکلیہ موقوف کردیے گئے۔

مفتی صاحبؒ کو مجبوراً ممبئی ہی میں مقیم رہنا پڑا۔ اُنھوں نے وہاں کے قیام کو طبی ہدایات کے تحت آرام اور محض وقت گزاری کی نذر نہیں ہونے دیا؛ بل کہ پردیس میں مُیَسَّر وسائل سے

کام لے کر علمی مشاغل کو بھی حتی الامکان جاری رکھا؛ کیوں کہ یہ اُن کی روح کی غذا اور بیماریوں کی دوا تھے۔ نیز رمضان مبارک کے آغاز سے ہی، اُنھوں نے نمازِ تراویح کے بعد، آن لائن مواعظ کا سلسلہ بھی شروع کیا، جس سے خلقِ خدا کو بہت فائدہ ہوا۔

دوشنبہ: ۱۷؍ رمضان = ۱۱؍ مئی کو اُنھیں بخار محسوس ہوا، جس سے خاصی کم زوری پیدا ہوگئی۔ جمعرات: ۱۸؍ رمضان = ۱۲؍ مئی کو اُنھیں ممبئی کے ”ملاڈ“ کے ”نیوسنجیونی“ ہسپتال میں داخل کر دیا گیا، وہاں تشخیص ہوئی کہ پھیپھڑے میں پانی بھر گیا ہے، جس کی وجہ سے سانس لینے میں پریشانی ہو رہی ہے، چناں چہ سخت نگرانی کے یونٹ ”آئی سی او“ میں اُنھیں منتقل کر دیا گیا۔ دو تین روز بعد اِفاقے کی کیفیت محسوس ہوئی؛ لیکن پھر بیہوشی کا عالم طاری ہوگیا اور بالآخر سہ شنبہ: ۲۵؍ رمضان = ۱۹؍ مئی کی صبح کو تقریباً 6:30 ساڑھے چھ بجے اُنھوں نے آخری سانس لی اور ربّ کریم کے جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

۲۵؍ رمضان ہی کو اُن کی پہلی نمازِ جنازہ مذکورالصدر ہسپتال کے قریب ایک مسجد کے باہر ادا کی گئی جس کی امامت اُن کے صاحب زادے مولانا وحید احمد نے کی۔ دوسری نماز، جو تدفین سے قبل قبرستان میں ادا کی گئی، کی امامت اُن کے ایک دوسرے صاحب زادے حافظ قاری عبد اللہ نے کی۔ شام کے سوا چھ بجے اس گنجینۂ علم وفضل کو ممبئی کے ”جوگیشوری“ کے ”اوشیورہ“ قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ لاک ڈاؤن کے باوجود معتدبہ تعداد نے نمازِ جنازہ اور تدفین میں شرکت کی۔ اللہ اُن کی قبر کو نور سے بھر دے اور شہدا وصالحین وصدیقین کے ساتھ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے اور تمام پس ماندگان ومحبین وتلامذہ ومتعارفین کو صبرِ جمیل واجرِ جزیل سے بہرہ یاب کرے۔

ذرائعِ ابلاغ کی برق رفتاری کی وجہ سے مفتی صاحب کی وفات کی خبر نہ صرف ہندوستان وبرِّصغیر میں؛ بل کہ پوری دنیا میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دارالعلوم اور

قاسمی برادری کے حلقے کو خصوصاً اور دینی و علمی حلقے کو عموماً اِس حادثۂ جاں گسل سے جو حزن و ملال ہوا، اُس کو کسی لفظی تعبیر کے ذریعے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ دار العلوم کو اُن کی وفات سے جو خسارہ لاحق ہوا ہے، اُس کی تلافی کی بہ ظاہر کوئی صورت دور دور تک نظر نہیں آتی، البتہ خداے قادر و وہّاب کی رحمت سے ہمیں نا امید نہیں ہونا چاہیے۔ دار العلوم میں شیخ الحدیث حضرت مولانا سیّد فخر الدین احمد نور اللہ مرقدہ (۱۳۰۷ھ/ ۱۸۸۹ء — ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۲ء) کے بعد سے ہی شیخ الحدیث کا منصب اُن جیسے عالی مقام محدث کے لیے ترستا رہا ہے، یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مفتی سعید احمد پالن پوری نے اپنے کئی پیش رووں کے بعد اپنے عہد میں اس خلا کو پُر کر دیا تھا؛ لیکن یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اُن کی وجہ سے اُن کے فیض یافتگان کو خاصی علمی و فکری تسلّی محسوس ہوتی تھی جس کی بنا پر اُن کے ذہنوں میں حضرت مولانا سید فخر الدین احمد قدس سرّہ العزیز جیسے عظیم الشان مشائخِ حدیث کی دھندلی سی تصویر گردش کرنے لگتی تھی۔

مفتی صاحب کی علمی شخصیت تعمیرِ ذات و صفات میں جہدِ مسلسل کے طفیل خاصی بھاری بھر کم اور باوقار و بااعتبار بن گئی تھی۔ وہ دار العلوم کے موجودہ ماحول میں علم و فضل کی ترازو کا بہترین پاسنگ تھے، جس کی غیر معمولی اہمیّت ہوا کرتی ہے؛ کیوں کہ وہ ترازو کے توازن کا ضامن ہوتا ہے۔

محنت، قدردانیِ اوقات، انہماکِ عمل، ذہانت و قوتِ حافظہ، سرعتِ فہم، کمال کی استنتاجی صلاحیت، مسائل کی تہوں تک زود رسی اور تقریر و تحریر میں ترتیب و انضباط اور تفصیل و تسہیل کا اہتمام جیسی صفات، اُن کو بہت سے معاصر علماء و مدرسین سے ممتاز کرتی تھیں۔ تاثیری انفرادیت، زبردست ترسیلی قوت اور تفہیمی لیاقت اُن کی شناخت تھی۔ وسعتِ مطالعہ (جس کو پیہم و نا آشناے تکان تدریسی و تحریری سرگرمیوں نے پختگی و استحضاری اور مزید وسعت پذیری عطا کی تھی) کی وجہ سے وہ علمی مسائل کے حوالے سے تازہ دم و تازہ کار رہتے تھے۔

خود اعتمادی و خدا اعتمادی، جرأت و بے باکی، صبر و استقامت، بیدار مغزی اور ہمت و حوصلے کی فراوانی؛ معرکۂ حیات میں اُن کی شمشیریں تھیں۔ کتاب و سنت کے گہرے مطالعے سے کشیدہ، اپنی علمی و دینی و اعتقادی آرا پر ثبات و اِصرار اور دلائل و براہین کی روشنی میں اہلِ علم سے اختلاف کا اِظہار اور بہ وقتِ ضرورت اُن کے علمی استنتاجات کی تردید و تصحیح میں وہ کبھی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ دینی و اعتقادی مسائل میں شخصی روایات کی تقلید پر، کتاب و سنت کی اصلی تصریحات اور واضح ہدایات کی علمی ترجیح و تایید اور عملی توثیق میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔

اپنی علمی بلند قامتی کی وجہ سے نہ صرف دارالعلوم کے ماحول میں؛ بل کہ سارے دیوبندی حلقے اور عام علمی و دینی برادری میں، علمی و عملی رویّوں کے حوالے سے، بعض دفعہ رونما ہونے والی ناہم واریوں اور عدمِ توازن کی کیفیتوں کے بالمقابل؛ وہ توازن کا واضح استعارہ تھے۔

اُن کی قدآور علمی شخصیّت کے طفیل، دارالعلوم میں جو علمی ہل چل تھی، تحقیق و جستجو کے باب میں خوب سے خوب تر حد تک پہنچنے کی جو تگ و تاز رہا کرتی تھی، اُن کی علمی تحقیق کی چٹان سے بعض دفعہ نتائج مطالعہ و فکری اکتسابات کی موجیں جس طرح ٹکرا کر پاش پاش ہوتی رہتی تھیں؛ اب اِس منظر کو دیکھنے کے لیے آنکھیں نہ جانے کب تک ترستی رہیں گی۔

درس گاہوں میں دیے گئے اُن کے تدریسی و علمی محاضرات، فِرَقِ باطلہ کی تردید میں کی گئی اُن کی علمی و تحقیقی تقریریں اور عام مجلسوں میں اُن کے واعظانہ ارشادات بھی علمی نکتہ آفرینیوں، عالمانہ ژرف نگاہیوں اور متکلمانہ دراز نفسیوں کا نمونہ ہوتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی عوامی تقریریں بھی خواص ہی کے لیے زیادہ مفید ہوتی تھیں۔ سنجیدگی و بالیدگی اور دانش ورانہ طرز ادا اُن کی ساری لسانی تخلیقات و بخشایشوں کی شناخت ہوتی تھی۔ اِس کے باوجود اُن کے عوامی خطابات سے عوام کو بہت فائدہ ہوا؛ کیوں کہ اُنھوں نے اُن میں سادہ و عام فہم الفاظ و

تعبیرات سے کام لینے کی کوشش کی۔

علمی مسائل کو حل کرنے، یا سائل کو اُن کا جواب دینے میں، کبھی عجلت پسندی، تاویلِ ناروا اور کھینچ تان سے کام نہ لیتے۔ اگر کوئی بات واضح طور پر معلوم نہ ہوتی، یا اگر اُس کا کوئی گوشہ اُن کے ذہن میں واضح نہ ہوتا، تو وہ توقف کرتے اور سائل سے فرماتے کہ مجھے اِس سلسلے میں تامّل ہے، یا میں اس سے ناواقف ہوں۔ پھر علمی مراجعے کے بعد ہی وہ تسلّی بخش جواب دیتے؛ اِسی لیے راقم کو اُن کے مطالعاتی اور علمی رویّے پر بڑا اعتماد تھا اور اُس کو اُن کے اِس طرزِ عمل سے بے حد خوشی ہوتی تھی۔

”اہلِ علم“ کی شناخت یا شہرت کے حامل افراد بالعموم علمی مسائل کا عاجلانہ جواب دینے اور مسائل کے گوشوں کے مُبہم یا نامعلوم ہونے کی صورت میں بھی سائل کو تاویلاتِ بے جا کے ذریعے مطمئن کرنے کی کوشش کے ذریعے اپنی شخصیت کے حوالے سے بھی غیر مطمئن بنا دیتے ہیں۔ عربی کا مقولہ ہے (جو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے): ”**إنَّ من العِلمِ إذا سُئِلَ الرَّجُلُ عَمَّا لا يَعْلَمُ أَن يَقُوْلَ: اللهُ أَعْلَمُ**“ (طبقات الحنابلة، ج ۱ ص ۱۰)۔ یعنی یہ بھی علم ہے کہ کسی آدمی سے ایسی بات معلوم کی جائے جس سے وہ لاعلم ہے، تو یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کا زیادہ علم ہے۔

مفتی صاحبؒ سے راقم نے بارہا بہت سی حدیثوں کے متن یا شرح یا کسی خاص لفظ کا مدلول جاننا چاہا، تو مُتعَدّد مرتبہ اُنھوں نے فوراً جواب دینے سے گریز کرتے ہوئے فرمایا: مولانا! میں آپ کو اِس سلسلے میں کل بتا سکوں گا؛ چناں چہ دوسرے دن یا اُس کے بعد وہ بہ ذریعہ فون راقم کو اس سلسلے میں اطمینان بخش جواب دیتے۔

خود راقم کا بھی اُن کے ساتھ یہی رویّہ رہا کہ اگر وہ کسی صرفی یا نحوی یا لغوی اِشکال کے متعلق تدقیق چاہتے، تو معلوم ہونے کی صورت میں، راقم اُنھیں اُسی وقت راہِ صواب بتا دیتا

ورنہ مطالعے کے بعد، وہ اس حوالے سے گرہ کشائی کی توفیق پاتا، سچ یہ ہے کہ ہم دونوں اِس مشترکہ طرزِ عمل سے ایک دوسرے سے بے انتہا مطمئن تھے۔

دارالعلوم میں الحمدللہ، ذی علم و باکمال واَصحابِ قال وحال اساتذہ کی کمی نہیں؛ لیکن مفتی صاحب کی ممتاز علمی شخصیت سے طلبہ کو اُن کے طویل تدریسی دورانیے میں جو علمی وفکری فائدہ ہوا، وہ مقدار ومعیار کے اعتبار سے مثالی رہا۔ دارالعلوم کا دارالحدیث، اُس کی درس گاہیں؛ بل کہ اُس کے در وبام اور وہاں وقتاً فوقتاً سجنے والے بڑے بڑے اجتماعات کے اسٹیج، اُنھیں عرصے تک ڈھونڈتے رہیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی ایسی علمی عظمت کا خمیر، بڑی مشکل سے، لیل ونہار کی دراز نفس گردشوں، غیر معمولی پاکیزہ پس منظروں اور والدین سمیت لاتعداد صلحا واتقیا کی دعاؤں اور نگاہ ہاے مومنانہ کے ساحرانہ فیضان اور سب سے بڑھ کر خداے کریم کی توفیقِ خاص سے اٹھتا ہے۔

اِس لیے اُن کی رحلت سے جو خلا دارالعلوم میں پیدا ہوا ہے، وہ غیر معمولی ہے اور آسانی سے پُر ہونے والا نہیں ہے؛ لیکن چوں کہ یہ درس گاہِ علم ودین خداے عظیم کے خصوصی فضل وکرم کا ثمرہ ہے، جو شب زندہ دار علماے ربّانیین کی آہِ سحر گاہی اور عرصۂ دراز تک اُن کی گریہ وزاری کی وجہ سے اِس خطۂ زمین کی طرف متوجّہ ہوکر ”مدرسہ اسلامی عربی دیوبند“ کی شکل میں مجسّم ہوا؛ اس لیے اللہ تعالیٰ کی رحمتِ واسعہ سے امید ہے کہ اِن شاء اللہ، اِس خسارے کی تلافی وہ غیب سے ضرور کرے گا۔ **وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ بِعَزِیز.**

مفتی صاحبؒ میں ایک بہت اچھی بات یہ تھی کہ علمی وقار واعتبار کے باوجود، اُن میں اِحساسِ برتری کی بُرائی نہ تھی، جو اہلِ علم میں عموماً پیدا ہوجاتی ہے، وہ تکلّفانہ رعب داب سے بھی کام نہ لیتے تھے؛ اِسی لیے طلبہ اُن سے خاصے مانوس رہتے تھے اور درس گاہوں کے علاوہ بھی، اُن کے لیے اُن سے استفادہ وفیض یابی آسان ہوا کرتی تھی۔ ہمہ وقتی مشغولیت کے باوجود عصر کے

بعد اور دوسرے اوقات میں بھی ملنے جلنے کے لیے آنے والوں کے لیے وقت نکال لیا کرتے تھے جو اُن کی وسعتِ ظرفی و تحمل مزاجی کی بات تھی۔

وہ عام زندگی میں بھی سادہ، بے تکلف اور حلیم الطبع تھے۔ سختی، کرختگی، ترش روئی، سخت گیری اور تلخ گوئی سے ہمیشہ بچتے تھے۔ بعض اہل علم بہ ظاہر خوش مزاج و خوش طبع و بذلہ سنج ہوتے ہیں؛ لیکن وہ نکتہ سنجیوں کے رویّے کی تہ داریوں میں مخاطب کو بعض دفعہ اپنی ناوک افگنیوں سے بُری طرح گھائل کر جاتے ہیں۔ مفتی صاحبؒ کا اندازِ کلام اور زندگی کا عام طریقۂ کار ایسا رہا کہ کسی کو کبھی بھی اُن سے دلی تکلیف نہیں پہنچی۔

اسی کے ساتھ وہ زود رس، زود حس، زود نویس اور زود فکر تھے۔ تردّد، اضطراب اور شش و پنج سے اُن کی بیاضِ حیات بالکل خالی تھی، پیش آمدہ کسی بھی مسئلے میں بروقت اور صائب فیصلہ لیتے اور اُس کو بروقت برپا کرنے کی کوشش کرتے۔ زود نویسی کا یہ عالم رہا کہ ہمہ گیر مشغولیتوں کے باوجود، انتہائی کارآمد و فیض بخش تصنیفات کا ڈھیر لگا گئے۔ راقم بھی چوں کہ قرطاس و قلم کی راہ کا ہی ناتواں مسافر رہا ہے؛ اِس لیے وہ بہ خوبی جانتا ہے کہ کام کی چند سطریں بھی تحریر کرنی کتنی مشکل ہوتی ہیں؛ بل کہ بعض دفعہ ایک صفحہ لکھنے کے لیے سیکڑوں صفحات کا مطالعہ بھی ناکافی ہوتا ہے۔ مفتی صاحبؒ پر یہ راقم اِس حوالے سے بہ طورِ خاص رشک کرتا تھا، وہ اُن سے ہمیشہ کہتا تھا کہ آپ ”رجل مُوَفَّق“ یعنی باتوفیق آدمی ہیں، آپ کے وقت اور قلم دونوں میں بے پناہ برکت ہے۔ یہ راقم تمام تر عزلت نشینی؛ بل کہ مردم بے زاری کی حد تک علائق سے بالکلیہ پرہیز کے باوجود، اِس سلسلے میں اُن کی گردِ راہ کو بھی نہ پا سکا؛ کیوں کہ وہ سست نگار اور مطالعہ و نتائجِ مطالعہ سے فائدہ اُٹھانے میں سست قدم واقع ہوا ہے۔

اپنے مشہور تدریسی کارناموں کے ساتھ، اُنھوں نے مفید تر تصنیفات و تحقیقات کا اپنے پیچھے ایک بھرا پُرا اسلامی کتب خانہ چھوڑا ہے، جو اُنھیں حیاتِ دوام دینے کے لیے کافی ہے اُس کے ذریعے اُن کی یادوں کے چراغ دل و دماغ میں روشن رہیں گے اور استفادہ کرنے

والوں کی زبانوں پر اُن کا تذکرۂ جمیل نغمۂ جاوید کی طرح مچلتا رہے گا اور وہ صدقۂ جاریہ بن کر اُن کی میزانِ حسنات کو باوزن بناتا رہے گا۔

اپنے سارے علمی و تعلیمی مشاغل کے باوجود، بال بچوں کے حقوق کی ادائیگی، اُن کی تعلیمی و تربیتی ذمے داریوں کی کما حقہ انجام دہی میں چست رہنا اور خانگی امور سے ماہرانہ طور پر نمٹنا، اُن کا وجہِ امتیاز تھا۔ دسیوں سال پہلے کی بات ہے یہ راقم اُن کی طرف سے طے کردہ وقت کے مطابق، اُن کے گھر پہنچا، تو ڈھیر سارے بچے اُن کے سامنے اُن کی بیٹھک میں اپنے اسباق بلند آواز سے یاد کر رہے تھے، ایسا لگتا تھا کہ بڑا مکتب یا چھوٹا موٹا مدرسہ اُن کی نگرانی میں اُن کے گھر میں چل رہا ہے۔ راقم کے ساتھ جو صاحب تھے وہ اُن کے یہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے، اُنھوں نے راقم کو بتایا کہ یہ سب مفتی صاحب ہی کے بچے ہیں، مغرب تا عشا مفتی صاحب خود ہی سب بچوں کو پڑھاتے ہیں، چوں کہ کثیر الاولاد ہیں؛ اِس لیے آپ کو محسوس ہوا کہ اُن کے یہاں کوئی باقاعدہ مکتب چلتا ہے، جس میں اُن کے اور محلے کے بچے بھی پڑھتے ہیں۔

یہ راقم، مشاغلِ خیر سے اُن کی بھری پُری زندگی پر، اُن کے حسنِ حیات بھی رشک کرتا تھا کہ توفیقِ اِلٰہی کے بغیر، اُن کی ایسی اِتنی پُر زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔ اہل علم کے ساتھ اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ علمی سرگرمیوں کا حق تو بہ قدرِ توفیق ادا کر لیتے ہیں؛ لیکن امورِ زندگانی میں پھوہڑ ہوتے ہیں؛ بل کہ جو جتنا بڑا ذی علم ہوتا ہے، وہ زندگی کے معاملات میں اتنا ہی بدسلیقہ و بے ہنر ہوتا ہے۔

مفتی صاحبؒ کی ایک انفرادیت، جو اُنھیں دیگر معاصر علما سے ممتاز کرتی ہے، یہ بھی ہے کہ اُنھوں نے اپنی اولاد کو اپنے بعد، لوگوں کا دستِ نگر نہیں چھوڑا؛ بل کہ اُنھیں ''اغنیا'' چھوڑا ہے۔ اِس طرح اُنھوں نے ارشادِ نبوی پر عمل کیا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ تم اپنی اولاد کو اغنیا (مال دار و بے نیاز) چھوڑ کر جاؤ، یہ اس سے بہتر ہے کہ تم اُنھیں محتاج چھوڑ کر جاؤ کہ وہ

لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے پھریں۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۵۶۶۸)۔

مفتی صاحبؒ کی یہ خصوصیت اِس لیے قابلِ ذکر ہے کہ اُنھوں نے بہت سے معاصر ”علماے دین“ کی طرح اپنے کو سیم وزر کا غلام نہیں بنایا اور زرکشی کے لیے وہ ہتھ کنڈے نہیں اپنائے جو عام طور پر غلامانِ مال وزر اپنایا کرتے ہیں۔ اُن کے کسی طرزِ عمل سے کسی کو کبھی یہ محسوس نہیں ہوا ہوگا کہ وہ مال ومنال اندوزی کے لیے اسباب سازی کی تگ ودو میں لگے رہے ہوں اور زندگی کے گراں مایہ لمحات کا کوئی حصہ اس کوشش میں پامال کیا ہو۔ اُن کی شناخت ہمیشہ ایک خوگرِ علم عالمِ صالح، مطالعہ وتحقیق کے رسیا، قرطاس وقلم کے ساتھی، وسیع النظر محدث دقیق النظر فقیہ ومفتی اور فنِّ تدریس کے ماہر مستری کی ہی رہی؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل وکرم سے، اُن کے لیے کشادگیِ رزق کے دروازے وا کر دیے، اُن کی تصنیفات بھی بہت مقبول ومتداول اور کثرت سے فروخت ہوتی رہیں، جو اُن کی آمدنی کا مستقل ذریعہ رہیں اور اُن کی وفات کے بعد، اُن کے بچوں اور پس ماندگان کے لیے بھی؛ اِن شاء اللہ خود کفالتی کا یقینی وسیلہ رہیں گی۔

اُنھوں نے کئی سال پہلے اپنے سارے بچوں کے لیے دیوبند ہی میں الگ الگ مکانات بنوا دیے جن سے ایک محلّہ سا آباد ہوگیا ہے۔ یہی نہیں؛ بل کہ اُنھوں نے دارالعلوم اشرفیہ راندیر (گجرات) جہاں اُنھوں نے ۱۳۸۴ھ سے ۱۳۹۳ھ تک تدریسی خدمت انجام دی اور دارالعلوم دیوبند جہاں شوال ۱۳۹۳ھ سے تاحیات ۱۴۴۱ھ تک سرگرم تدریس وفیض رسانی رہے، دونوں اِداروں سے جو تنخواہیں لی تھیں، وہ سب وَاپس کر دیں دارالعلوم دیوبند سے اُنھوں نے ۱۴۲۳ھ میں حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد، ۳۰ سال تین ماہ تک جو کچھ لیا تھا وہ ساری رقم لوٹا دی، اس کے بعد سے تاحیات دارالعلوم کے لیے اُن کی ساری خدمات بلامعاوضہ رہیں۔ دارالعلوم اشرفیہ راندیر سے انھوں نے نوسالہ مدتِ تدریس میں تئیس ہزار دو سو پچاس روپے (۲۳۲۵۰) تنخواہ لی تھی، جو اس کے خزانے میں ۲۸/اپریل ۲۰۰۳ء کو جمع کرادی۔

دارالعلوم دیوبند سے ۱۳۹۳ھ سے ۱۴۲۳ھ تک تنخواہ کی شکل میں، اُنھیں کل نو لاکھ انچاس ہزار آٹھ سو چار روپے پچھتر پیسے (۹۴۹۸۰۴/۷۵) ملے تھے، جو اُنھوں نے متعدد مرتبہ میں اُس کو واپس کر دیے۔ محرم ۱۴۲۴ھ سے وفات تک دارالعلوم سے کوئی تنخواہ لی نہ کوئی مادی فائدہ اُٹھایا۔ تَقَبَّلَ اللّٰهُ حَسَنَاتِه، وَ كَثَّرَ اَمْثَالَه.

ان کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اجتماعی دعوتوں میں شرکت سے بالکلیہ پرہیز کرتے تھے کہ اس سے وقت بہت ضائع ہوتا ہے اور طے کردہ التزامات و معمولات میں ضرور خلل واقع ہوتا ہے۔

اُن کی ایک قابلِ ذکر خوبی یہ تھی کہ وہ بڑے سے بڑے دل گداز و استخواں سوز حادثے کے وقت بھی، اپنے اعصاب پر جس طرح قابو یافتہ رہتے تھے، اُس کی نظیر راقم نے بہت کم دیکھی ہے۔ وہ مشکل حالات کا ایک سچے مومن کی طرح جواں مردی سے مقابلہ کرتے اور کبھی جزع فزع کی کیفیتوں کا شکار نہ ہوتے۔ راقم نے پہلے بھی کہا ہے کہ وہ اعصاب شکن نازک حالات میں بھی صحیح اور بروقت عملی رائے قائم کرتے اور چاک داماں ہونے اور سینہ کوبی کرنے کی بہ جائے مطلوبہ سمت میں پیش قدمی کر کے وہ کام کرتے جو وقت کا تقاضا اور مستقبل سازی کا ذریعہ ہوتا۔

۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء میں اُن کے سب سے بڑے صاحب زادے مولوی حافظ مفتی رشید احمد (جو ذی استعداد، ہونہار اور فرماں بردار ہونے کے ساتھ پہلی اولاد تھے) مظفرنگر کسی کام سے گئے واپسی میں ایک حادثے میں اچانک جاں بہ حق ہو گئے۔ مفتی صاحب اُس وقت لندن میں تھے، اُنھیں اس جاں کاہ حادثے کی خبر دی گئی، اُنھوں نے ٹھوس لہجے میں فرمایا: رشید احمد اللہ تعالیٰ کی امانت تھے، اللہ نے واپس لے لی۔ اہل خانہ کو ہدایت دی کہ اُن کی تجہیز و تکفین کا انتظام کرو اور علی الصباح نمازِ جنازہ و تدفین سے فارغ ہو جاؤ، میرے آنے کا انتظار نہ کرو میری آمد میں تاخیر بھی ہو سکتی ہے۔

دارالعلوم میں اور اُن کے اہلِ خانہ میں طبعی طور پر اس واقعے کا بڑا غم تھا، لوگوں کو اندازہ تھا کہ مفتی صاحب کو بے حد صدمہ ہوگا اور وہ اس کا اظہار بھی کریں گے اور لندن سے اپنی بہ عجلت واپسی تک تدفین کو مُعلَّق رکھنے کی بات کہیں گے؛ لیکن اُنھوں نے صبرِ جمیل کا ایسا اعلیٰ نمونہ پیش کیا جو اُن کے ہی ایسے صبر شعار علماے کاملین کا شیوہ ہوتا ہے۔

۱۴۳۲ھ/ ۲۰۱۱ء میں اُن کی اہلیہ محترمہ کی رحلت کا حادثہ پیش آیا۔ یہ حادثہ اِس لیے بھی بڑا دل گداز تھا کہ اِس سے نہ صرف اُن کا گھر اجڑ سا گیا؛ بل کہ امورِ خانہ داری کی جو ترتیب قائم تھی، وہ بالکل تِتَّر بِتَّر ہو جانے کے خطرے سے دوچار ہوگئی۔ اُن کے بڑھتے ہوئے علمی مشاغل کے پیشِ نظر، اُن کی سن رسیدگی میں، ہونہار و وفا شعار و پیکر انکسار و سمجھ دار اور امورِ خانہ داری میں ماہر حافظِ قرآن اور حفظ میں اپنے بچوں کی استاذ پڑھی لکھی بیوی؛ اُن کی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت تھی؛ لیکن اُنھوں نے اِس صبر شکن موقع سے جس صبر و قرار کا مظاہرہ کیا اور اپنی مُتَاَہّل و غیر مُتَاَہّل اولاد کو جس خوش اندازی و ہنرمندی سے سنبھالا اور خانہ بربادی کے منڈلاتے خطرے کو جس طرح خانہ آبادی؛ بل کہ خانہ سازی میں تبدیل کیا، وہ ایک قابلِ تقلید نمونہ ہے کہ ایک ذی علم اور علمی و تعلیمی و تالیفی مشاغل میں بے حد منہمک عالم بھی اپنی کثیر الاولاد فیملی کو سلیقہ مندانہ انداز میں چلا سکتا ہے؛ ورنہ بالعموم ماہرینِ علم علما، نہ صرف گھریلو معاملات میں؛ بل کہ سارے انتظامی امور میں کورے اور نابلد ہوتے ہیں؛ کیوں کہ علمی مصروفیات کی جکڑ بندی و ارتکاز خواہی و انہماک طلبی، دیگر سمتوں کی طرف جھانکنے کا موقع نہیں دیتی۔

مفتی صاحبؒ کی ایک انفرادیت یہ تھی کہ درسِ نظامی کے تحت چلنے والے مدارس (جن کا سرخیل اُمّ المدارس دارالعلوم دیوبند ہے) میں دینی عالم سازی کا جو مختلف العلوم نصاب رائج ہے، اُن کو اس نصاب کی تقریباً ساری کتابوں اور علوم میں دست گاہ حاصل تھی؛ کیوں کہ

اپنے بھائیوں اور اپنی اولاد کو از ابتدا تا متوسطات خود ہی یہ کتابیں اُنھوں نے پڑھائیں اور مدرسہ اشرفیہ راندیر اور دار العلوم دیوبند میں اُنھوں نے حدیث وفقہ کے علاوہ بھی متوسطات سے اوپر کی کتابوں کا درس دیا، نیز اس نصاب کی اکثر کتابوں کی تحریری تحقیق وتدقیق وشرح نگاری؛ اُن کی تالیفی زندگی کا اہم مشغلہ رہی؛ اِسی لیے منقولات ومعقولات اور عالیات وآلیات سے متعلق ہر طرح کے علوم وفنون، اُنھیں بالعموم مستحضر رہے، جس کی وجہ سے تدریسی وتالیفی عمل اُن کے لیے بہت آسان رہا۔

پھر یہ کہ توفیقِ الٰہی سے اُنھوں نے جہاں بھی جو کچھ بھی پڑھا، محنت اور لگن سے پڑھا اور رسمی فراغت کے بعد یا حصولِ تعلیم کے دوران، جس کو جو کچھ پڑھایا ہمہ تن مصروف رہ کر پڑھایا۔ اِس کے علاوہ اُن کی استعداد سازی میں ایک اور عامل نے بنیادی کردار ادا کیا، جس کا تذکرہ مفتی صاحبؒ کے برادرِ خُرد مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری استاذ دار العلوم دیوبند نے، اپنی کتاب ''الخیر الکثیر'' کے شروع میں، اُن کے تعارف میں کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اُن کے والد ماجد محمد یوسف صاحبؒ (متوفی ذی قعدہ ۱۴۱۱ھ = جون ۱۹۹۱ء) گو تعلیم مکمل نہ کر سکے؛ لیکن اُنھوں نے کچھ دنوں جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں اُس زمانے میں تعلیم حاصل کی جب وہاں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۷ء — ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۴۹ء) مولانا محمد یوسف بنّوریؒ (۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء — ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء) اور مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنیؒ (۱۳۱۶ھ/ ۱۸۸۹ء — ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۵ء) پڑھاتے تھے۔ اُن بزرگوں کے علم وعمل اور فضل وکمال سے وہ حد درجہ متاثر تھے، گھریلو حالات کی وجہ سے خود تو عالم نہیں بن سکے؛ لیکن یہ آرزو اُن کے دل میں موج زن رہی کہ اُن کی اولاد، اُن علمائے نام دار کے جیسے عالم بن جائے، اُنھوں نے اس کا اِظہار مولانا بدر عالم میرٹھی سے کیا، جن کے وہ خادمِ خاص تھے۔ مولاناؒ نے اُنھیں اُن کی آرزو کے بر آنے کی راہ سمجھائی اور یہ نصیحت فرمائی:

> ''یوسف! اگر تم اپنے لڑکوں کو اچھا عالم بنانا چاہتے ہو، تو حرام اور ناجائز مال سے پرہیز کرنا اور بچوں کو بھی ناجائز اور حرام مال سے بچانا؛ کیوں کہ علم ایک نور ہے، ناجائز اور حرام مال سے جو بدن پروان چڑھتا ہے، اُس میں یہ نور داخل نہیں ہوتا۔''

مولانا مفتی محمد امین صاحب لکھتے ہیں:

> ''یہ نصیحت حضرت مولانا نے والد ماجد کو اس لیے کی تھی کہ اُس زمانے میں ہماری ساری قوم بنیوں کے سود میں پھنسی ہوئی تھی، اُسی زمانے میں ہمارے دادا نے بنیے سے سودی قرض لے کر ایک زمین کرایے پر لی تھی، والد صاحب اُس زمانے میں ڈابھیل کے طالبِ علم تھے، والد صاحب نے اِس معاملے میں دادا سے اختلاف کیا، تو دادا نے والد صاحب کو الگ کر دیا، چناں چہ والد صاحب کو حرام سے بچنے کے لیے مجبوراً تعلیم چھوڑ کر اپنا گھر سنبھالنا پڑا اور تہیّا کیا کہ چاہے بھوکا رہوں گا مگر حرام کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا؛ تاکہ میں نہیں پڑھ سکا تو اللہ تعالیٰ میری اولاد کو علمِ دین عطا فرمائیں۔'' (الخیر الکثیر، ص۶۲)

الغرض اُن کے والد نے حرام غذا سے بچنے کا التزام کیا اور اپنی اولاد کو بھی اس سے بچائے رکھا، یقیناً نماز روزے کی پابندی، جو اُن کے والد کی خصوصیت تھی، کے ساتھ حرام خوری سے مکمل اجتناب کی وجہ سے اُن کی اولاد عموماً اور بڑی اولاد خصوصاً عالم باعمل بنی جو علم وعمل کی بھرپور حصول یابیوں کا گہرا نقشِ دوام ثبت کر کے دنیا سے رخصت ہوئی۔ اُن کے والد مرحوم کا یہ کارنامہ ان شاء اللہ اُن کی بخشش کا پروانہ ثابت ہوگا۔

مفتی صاحب اب اِس دنیا میں نہیں رہے؛ لیکن وہ اپنے علمی کارناموں کی وجہ سے

مرنے کے بعد بھی زندہ، تابندہ اور پائندہ رہیں گے؛ کیوں کہ اُن کے علمی و تعلیمی کارنامے سوختگیِ خونِ جگر کا نتیجہ تھے: ایسے کارنامے انسان کی موت کے بعد زیادہ یاد رکھے جاتے ہیں۔ نشورؔ واحدی نے کیا خوب کہا ہے:

خاک اور خون سے اِک شمع جلائی ہے نشورؔ
موت سے ہم نے بھی سیکھی ہے حیات آرائی

خاک میں خاکی جسم تو چھپ جاتا ہے؛ لیکن انسان کے علمی و فکری کارنامے تہِ خاک ہوجانے کے بعد اور درخشاں ہوجاتے ہیں:

لَعَمْرُکَ ما وَارَی التُّرَابُ فِعالَهُ
وَ لٰكِنَّهُ وَارٰی ثِـيَابًا وَ أَعْظُمَا

ہاں افسوس رہے گا تو اِس کا مفتی صاحب جیسے شمعِ علم پر قربان ہونے والے مثالی پروانے ایک ایک کر کے رخصت ہوتے جاتے ہیں:

فروغِ شمع تو باقی رہے گا صبحِ محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

مفتی صاحب باصلاحیت فضلا و علما کے لیے مادی و معنوی سطح پر بڑے ہم درد اور مددگار ہوتے تھے؛ اِسی لیے مفتی صاحب کی رحلت سے اُن سارے لوگوں کو بہ طورِ خاص بہت صدمہ ہوا ہے، جو جانتے ہیں کہ انسان ضعیف البنیان ہے اور نقائص و معایب سے پر ہے؛ اس لیے معاشرتی زندگی میں جو ہر قسم کے انسانوں کا مجموعہ ہوتی ہے، معاشرتی خرابیاں ضرور ہوتی ہیں اُن میں زیادہ عیاں حقوق رسانی کے حوالے سے ناہمواریاں ہیں، جس کے اندیشے سے بچنے کے لیے وہ مفتی صاحب کا سہارا لیتے تھے اور اُن کی عادلانہ ثالثی کے ذریعے، حق کی حق دار تک رسیدگی کا یقین رکھتے تھے؛ کیوں کہ محترم المقام ہونے کی وجہ سے، مفتی صاحب کی رائے وزن دار اور ہمیشہ مسموع ہوتی تھی اور ایسا شاید و باید ہی ہوتا تھا کہ وہ کوئی تجویز یا مشورہ پیش کریں اور متعلقہ لوگ اُس کو روبہ عمل لانے میں آنا کانی کریں۔ کسی بھی معاشرے میں ایسی واجب الاحترام ہستی کی غیر معمولی ضرورت ہوتی ہے۔

سوانحی نقوش

نام: مفتی صاحب کے والدین نے اُن کا نام ''احمد'' رکھا تھا؛ لیکن مفتی صاحب نے جب ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء میں مظاہر علوم سہارن پور میں داخلہ لیا، تو وہاں اپنا نام ''سعید احمد'' لکھوایا، اُس وقت سے آپ ''سعید احمد'' ہی سے جانے جاتے رہے۔ پورا نام سعید احمد بن یوسف بن علی بن جیوا (یعنی یحییٰ) بن نور محمد ہے۔

جاے پیدائش: موضع ''کالیڑہ''، ضلع ''بناس کانٹھا'' ہے، بناس کانٹھا نام سے کوئی شہر نہیں ہے؛ بل کہ یہ پورے علاقے کا نام ہے، ضلع کا صدر مقام شہر ''پالن پور'' ہے۔ ''کالیڑہ'' گاؤں پالن پور سے جنوب مشرق میں تقریباً ۴۸ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ کالیڑہ میں ''سلم العلوم'' کے نام سے ایک عربی مدرسہ بھی ہے، جہاں بہ وقتِ تحریر دورۂ حدیث تک تعلیم ہوتی ہے، مفتی صاحبؒ کی طالب علمی میں یہاں متوسطات ہی تک تعلیم ہوتی تھی۔

تاریخِ پیدائش: اُن کی صحیح تاریخِ پیدائش محفوظ نہیں ہے، اُن کے والد نے جب ''ڈبھاڈ'' میں زمین خریدی، تو بیع نامے کی روشنی میں تخمینے سے، اُن کا سن پیدائش اواخر ۱۹۴۰/ ۱۳۶۰ھ بتایا، زمین کی خریدگی کے وقت، مفتی صاحب ڈیڑھ پونے دو سال کے تھے۔ مذکورہ خریدی ہوئی زمین پر ''مجاہد پورہ'' نام سے ایک گاؤں آباد ہو گیا ہے، مفتی صاحب کے والد کی اولاد جو ''ڈھکا'' خاندان سے تعلق رکھتی ہے، اب اسی گاؤں کی باسی ہے، مفتی صاحبؒ کا خاندان پالن پور کے علاقے کی مشہور ''مومن'' برادری سے تعلق رکھتا ہے۔

مفتی صاحب کے اُن سے چھوٹے ۴ بھائی اور ۴ بہنیں ہیں، مفتی صاحب اُن سب سے بڑے تھے، گویا وہ نو بھائی بہن تھے، بہنیں سب حیات ہیں اور متاہل ہیں۔ بھائیوں میں سے دو بھائی فوت ہو چکے ہیں۔ ایک عبد الرحمٰن جو مفتی صاحب کے معاً بعد کے تھے اور اپنے گاؤں مجاہد پورہ میں کھیتی باڑی کرتے تھے، ۱۸؍ ربیع الآخر ۱۴۳۴ھ مطابق یکم مارچ ۲۰۱۳ء کو

اُن کا انتقال ہوگیا۔ اِن کے معاً بعد کے مولانا عبدالمجید تھے جو دارالعلوم اشرفیہ راندیر کے فارغ تھے، وہ ۹؍ربیع الاول ۱۴۳۶ھ مطابق یکم جنوری 2015ء کو وفات پاچکے۔ ان کے بعد کے مولانا مفتی محمد امین پالن پوری ہیں، جن کی تاریخ ولادت ۱۷؍ربیع الآخر ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۵؍جنوری ۱۹۵۲ء ہے، دارالعلوم کے فاضل ہیں، ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء سے دارالعلوم دیوبند میں استاذ ہیں، اِس وقت دورۂ حدیث اور درجۂ علیا کی کتابیں ان سے متعلق ہیں۔ ذی استعداد اور صاحب تصنیفات ہیں۔ اللہ صحت وعافیت کے ساتھ عمر دراز سے نوازے۔ دیوبند کے محلّہ قلعہ میں اپنے ذاتی مکان میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ اُن کی بود وباش ہے۔ ان سے چھوٹے مولانا حبیب الرحمٰن مولود ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء ہیں جو مظاہر علوم سہارن پور سے فارغ ہیں اور دارالعلوم اشرفیہ راندیر میں صحیح بخاری اور جامع الترمذی پڑھاتے ہیں۔

تعلیم: مفتی صاحب نے مکتب کی تعلیم اپنے آبائی گاؤں ''کالیڑہ'' کے مکتب میں حاصل کی، اس کے بعد اُن کے ماموں مولانا عبدالرحمٰن شیرؒ اُنھیں دارالعلوم چھاپی لے گئے، جہاں اُنھوں نے ماموں صاحب سے اور دیگر اساتذہ سے چھ ماہ تک فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، چھ ماہ بعد ماموں نے مذکورہ مدرسے سے رشتہ منقطع کرکے اپنے گاؤں میں سکونت اختیار کرلی تو اُنھوں نے ماموں سے اُن کے گھر پر ہی فارسی کی کتابیں پڑھیں۔

عربی کی ابتدائی اور متوسط تعلیم مولانا محمد نذیر میاں پالن پوریؒ کے ''مدرسہ اسلامیہ عربیہ'' پالن پور میں حاصل کی، یہاں آپ کے اساتذہ میں مولانا مفتی اکبر میاں پالن پوریؒ اور مولانا ہاشم بخاریؒ تھے، جو دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد گجرات کے کئی مدرسوں میں مدرس رہے، بعد میں کئی سال دارالعلوم دیوبند کے استاذ رہے، پھر مدینۂ منورہ ہجرت کرگئے اور اسی کی خاکِ پاک کا پیوند بنے۔

بعدہ ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء میں مظاہر علوم سہارن پور کا قصد کیا اور یہاں مسلسل تین سال تک تعلیم حاصل کی اور شرحِ جامی کے بعد اور جلالین سے پہلے کا مرحلہ طے کیا۔

۱۳۸۰ھ/ ۱۹۶۱ء میں دارالعلوم دیوبند میں جلالین اور ہدایہ اولین کی جماعت میں داخل ہوئے اور ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء میں دارالعلوم میں دورۂ حدیث کیا۔ دارالعلوم دیوبند میں مفتی صاحبؒ نے درجِ ذیل اساتذۂ کرام سے تعلیم حاصل کی:

مولانا سید اختر حسین دیوبندی (۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء-۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء) مولانا بشیر احمد خاں بلندشہری (متوفی ۱۳۸۶ھ/ ۱۹۶۶ء) مولانا سید حسن دیوبندی (متوفی ۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۱ء) مولانا عبدالجلیل کیرانوی (متوفی ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء) مولانا اسلام الحق اعظمی (۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء-۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۲ء) حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند (۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء-۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء) مولانا عبد الاحد دیوبندی (۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۹ء-۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء) مولانا فخر الحسن مرادآبادی (۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء-۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء) مولانا محمد ظہور دیوبندی (۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۰ء-۱۳۸۳ھ۱۹۶۳ء) علامہ محمد ابراہیم بلیاوی (۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۶ء-۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء) مولانا مفتی سید مہدی حسن شاہ جہاں پوری (۱۳۰۱ھ/ ۱۸۸۴ء-۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء) شیخ محمد عبدالوہاب محمود مصری مبعوث از جامعہ ازہر برائے دارالعلوم دیوبند، مولانا نصیر احمد خاں بلندشہری (۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۸ء-۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰ء) شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخر الدین ہاپوڑی ثم المرادآبادی (۱۳۰۷ھ/ ۱۸۸۹ء-۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۲ء)۔

دورۂ حدیث میں مفتی صاحب نے اول نمبر سے کام یابی حاصل کی، سوائے مسلم شریف کے جس میں اُنھیں ۴۵ نمبر ملے، حدیث شریف کی ساری کتابوں میں ۵۰-۵۰ نمبر حاصل کیے۔ یاد رہے کہ دارالعلوم میں اُس وقت نمبرات کی آخری حد ۵۰ تھی، ابھی چند سال پہلے دنیا کے عام علمی اداروں کی طرح آخری حد ۱۰۰ نمبر ہوگئی ہے۔

۱۳۸۲ھ-۱۳۸۳ھ کے تعلیمی سال میں اُنھوں نے دارالعلوم میں افتا کیا، مستحکم صلاحیت کی وجہ سے ۱۳۸۳ھ-۱۳۸۴ھ کے تعلیمی سال میں دارالافتا میں معاون مفتی کی حیثیت سے اُن کا تقرر رہا، حسنِ کارکردگی کی وجہ سے اُس وقت کے دارالعلوم کے مفتی، مفتی محمود حسن

نانوتوی نے ۱۳۸۴ھ میں اُن کے مستقل تقرر کی سفارش کی، مہتمم دارالعلوم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ نے سفارش کو قبول فرماتے ہوے، افتا کمیٹی کے ممبران کو تحریراً پیش رفت کا حکم دیا؛ لیکن متعلقہ کچھ حضرات نے اُس تحریر کو ٹھنڈے بستے میں ڈال دیا۔ علامہ محمد ابراہیم بلیاوی نے اُنھیں یہ فرماتے ہوے اِس صورتِ حال کی اطلاع دی کہ ''مولوی صاحب! گھبراؤ نہیں، اِس سے اچھے آؤ گے''۔ چناں چہ ۹ سال بعد وہ دارالعلوم دیوبند میں باقاعدہ خدمتِ تدریس کے لیے بلائے گئے اور دمِ واپسیں تک اِس سعادت سے بہرہ ور رہے۔

عملی میدان میں

ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ/ مارچ ۱۹۶۵ء سے شعبان ۱۳۹۳ھ/ ستمبر ۱۹۷۳ء تک ۹ سال اُنھوں نے دارالعلوم اشرفیہ راندیر سورت میں تدریسی خدمت انجام دی۔ وہیں سے تحریری وتالیفی کام کا آغاز بھی کیا اور مختلف کتابیں تصنیف کیں، نیز حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ (۱۲۴۸ھ/ ۱۸۳۲ء - ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) کے علوم ومعارف کی تفہیم وتشریح کا تحریری کام بھی شروع کیا، اِس سلسلے کی ایک کوشش ''اِفادات نانوتوی'' کے نام سے بالاقساط ''الفرقان'' لکھنؤ میں شائع ہوئی، جس کی اہل علم نے بہت پذیرائی کی۔

رجب ۱۳۹۳ھ/ اگست ۱۹۷۳ء میں منعقدشدہ مجلس شوریٰ نے مفتی صاحبؒ کو دارالعلوم کا استاذ منتخب کیا۔ شوال ۱۳۹۳ھ/ نومبر ۱۹۷۳ء سے آپ نے دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمت انجام دینی شروع کی، پہلے سال اُنھوں نے مسلم الثبوت، ہدایہ اول، سلم العلوم، ملا حسن، ہدیہ سعیدیہ، جلالین نصف اول مع الفوز الکبیر کے اسباق پڑھائے۔ سال بہ سال ترقی کرتے ہوے حدیث شریف کی کتابوں کی تدریس تک پہنچے۔

۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰ء میں شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر احمد خاں بلندشہری کی وفات کے بعد آپ دارالعلوم کے شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوے اور ۱۴۴۱ھ/ ۲۰۲۰ء کے تعلیمی سال کے ختم تک آپ نے مکمل بخاری شریف کا درس دیا؛ لیکن حضرت مولانا نصیر احمد خاں کی حیات

میں ہی ان کی وفات سے دوسال پہلے سے یعنی سال تعلیمی ۱۴۲۸ھ - ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۰۰۷ء - ۲۰۰۸ء سے ہی، آپ کے ذمے بخاری شریف کردی گئی تھی؛ کیوں کہ حضرت مولانا نصیر احمد خان بہت کم زور اور رہین فراش ہوگئے تھے۔ دارالعلوم میں آپ شیخ الحدیث اور صدر مدرس بھی رہے، اسی کے ساتھ متعدد ذمے داریاں بھی اُن کے سپرد رہیں، مثلاً: ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء اور ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء میں اُنھوں نے دارالافتا کی سرپرستی اور نگرانی کی خدمت انجام دی، نیز ''مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت'' کے ناظم اعلی رہے، اُنھوں نے اضافی خدمتوں میں سے کسی کا کوئی الاؤنس دارالعلوم کی پیش کش کے باوجود نہیں لیا۔

بیعت وخلافت:

اکابر واسلاف کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے، مفتی صاحب طلبِ علم کے زمانے سے اپنی باطنی اِصلاح کے لیے فکرمند رہے، چناں چہ تحصیلِ علم کے ساتھ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا قدس سرّہ (۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء - ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء) سے بیعت ہوکر اُن کی تعلیمات واِرشادات پر عمل پیرا رہے، نیز دیگر معاصر صالحین کی مجلسوں سے استفادہ جاری رکھا، بالخصوص حضرت مولانا عبدالقادر رائپوری نوراللہ مرقدہ (۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء - ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء) کی مجلسوں میں کثرت سے حاضر ہوتے رہے۔ ان بزرگوں کی وفات کے بعد حضرت مولانا مفتی مظفر حسین مظاہری رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۹ء - ۱۴۲۴ھ/ ۲۰۰۳ء) سے رجوع ہوئے اور اُنھی سے ۱۴۱۸ھ میں اجازتِ بیعت واِرشاد سے بہرہ مند ہوئے۔

تالیفات:

مفتی صاحب نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں جن میں مستقل تصنیفات اور شروحات اور مراجعات داخل ہیں، اُن کے صفحات مجموعی طور پر تینتیس ہزار چھ سو بیس (۳۳۶۲۰) ہوتے ہیں۔ ان میں بڑی، متوسط اور چھوٹی تقطیع کی کتابیں شامل ہیں، ان میں سے متعدد کتابیں کئی کئی ضخیم جلدوں میں ہیں، جب کہ اکثر کتابیں ایک یا دو جلدوں میں ہیں، جن کی فہرست

حسب ذیل ہے:

۱- تحفۃ القاری، یہ صحیح بخاری کی شرح ہے، ۱۲ جلدوں میں ہے، ہر جلد ۳۰×۲۰ کی تقطیع پر تقریباً چھ سو صفحے کی ہے، ساری جلدوں کے صفحات بہتر سو دس (۷۲۱۰) ہیں۔

۲- تحفۃ الالمعی، یہ جامع ترمذی کی شرح ہے، مذکورہ تقطیع میں ۸ آٹھ جلدوں میں ہے ہر جلد زائد از چھ سو صفحات پر مشتمل ہے، ساری جلدوں کے کل صفحات انچاس سو اکیاسی (۴۹۸۱) ہوتے ہیں۔

۳- تفسیر ہدایت القرآن، یہ قرآن پاک کی آسان تفسیر اور ترجمہ ہے، مذکورہ تقطیع میں اس کی آٹھ ۸ جلدیں ہیں، ہر جلد زائد از ۶۰۰ صفحات میں ہے، کل جلدوں کے مجموعی صفحات پینتالیس سو چھہتر (۴۵۷۶) ہوتے ہیں۔

۴- آسان بیان القرآن، یہ حکیم الامت حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ (۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳-۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) کی تفسیر مکمل بیان القرآن کی تسہیل ہے، جو دار العلوم کے ایک فاضل مولانا عقیدت اللہ قاسمی نے کی ہے، مفتی صاحب نے نظر ثانی کے بعد، اُس کی طباعت و اشاعت اپنے تجارتی مکتبہ: ''مکتبۂ حجاز'' دیوبند سے کی ہے، مذکورہ تقطیع پر یہ ۵ پانچ جلدوں میں ہے، ہر جلد تقریباً چھ سو (۶۰۰) صفحات کی ہے، پانچوں جلدوں کے کل صفحات (۲۸۶۸) اٹھائیس سو اڑسٹھ ہوتے ہیں۔

۵- رحمۃ اللہ الواسعہ، یہ محدث دہلوی (امام احمد بن عبد الرحیم معروف بہ ''شاہ ولی اللہ دہلوی'' (۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء-۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) کی مشہور تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی اردو شرح ہے، جو مفتی صاحب نے بڑی جاں فشانی سے کی ہے؛ اِسی لیے اِس سلسلے میں کی گئیں سابقہ ساری کوششوں سے فائق اور مفید تر ثابت ہوئی ہے اور اہل علم نے اس کی بہت پذیرائی کی ہے۔ یہ کتاب پانچ (۵) جلدوں میں مذکورہ تقطیع میں ہے، مکمل جلدوں کے مجموعی صفحات چھتیس سو چودہ (۳۶۱۴) ہیں۔

۶- تحقیق وتعلیق حجۃ اللہ البالغہ، یہ عربی زبان میں حجۃ اللہ البالغہ کی تحقیق وتعلیق ہے

اس کو بڑے سائز پر دار ابن کثیر دمشق نے ۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰ء میں بہت خوب صورت چھاپا تھا، یہ دو جلدوں میں ہے، پہلی جلد ۶۹۳ صفحات کی ہے اور دوسری جلد ۶۴۷ صفحات کی، دونوں جلدوں کے مجموعی صفحات (۱۳۴۰) تیرہ سو چالیس ہوتے ہیں۔ اِسی طباعت کا عکس مفتی صاحب کے ''مکتبۂ حجاز'' سے اسی انداز میں چھپا ہوا، دیوبند میں دست یاب ہے۔

۷- ایضاح المسلم، یہ صحیح مسلم کی شرح کی پہلی جلد ہے، جو کتاب الایمان پر مشتمل ہے مذکورہ تقطیع میں یہ جلد (۶۰۰) چھ سو صفحات میں ہے۔

۸- فیض المنعم، یہ مقدمۂ صحیح مسلم کی شرح ہے، بڑے سائز کے (۱۷۶) ایک سو چھہتر صفحات میں ہے۔

۹- شرح علل الترمذی، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ علل الترمذی کی عربی میں شرح ہے کتاب بڑے سائز کے اسی (۸۰) صفحات میں ہے، مکتبۂ حجاز سے شائع ہوتی رہتی ہے۔

۱۰- زبدۃ شرح معانی الآثار (کتاب الطہارۃ) یہ امام طحاوی (ابوجعفر احمد بن محمد بن سلامہ ازدی طحاوی: ۲۳۸ھ/ ۸۵۲ء - ۳۲۱ھ/ ۹۳۳ء) کی مشہور کتاب ''معانی الآثار'' کے کتاب الطہارۃ کی عربی شرح ہے۔ یہ متوسط سائز کے ایک سو انیس (۱۱۹) صفحات میں ہے۔

۱۱- مفتاح التہذیب، یہ منطق کی مشہور کتاب ''تہذیب المنطق'' مؤلفہ سعد الدین تفتازانی (۷۲۲ھ/ ۱۳۲۲ء - ۷۹۲ھ/ ۱۳۹۰ء) کی اردو شرح ہے، متوسط سائز کے (۱۵۲) ایک سو باون صفحات میں ہے۔ اس کتاب کی تدریس کی تقریر کو اُن کے پسرِ اکبر مولانا رشید احمد پالن پوری مرحوم (۱۳۸۶ھ/ ۱۹۶۶ء - ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء) نے جمع کیا تھا اور دار العلوم کے استاذ و ناظم تعلیمات مولانا خورشید انور گیاوی نے مرتب کیا تھا۔

۱۲- الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، یہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فارسی تصنیف کا عربی میں ترجمہ ہے، یہ ترجمہ ماضی میں ایک سے زائد لوگوں نے کیا تھا؛ لیکن وہ نقص آلود رہا، اِس لیے مفتی صاحب نے اس کی تہذیب و تصحیح کی اور حذف و تنقیح کے ساتھ، اس پر حاشیہ نویسی بھی کی۔ دار العلوم دیوبند اور ملحقہ مدارس میں مفتی صاحب ہی کا یہ عربی ترجمہ داخل نصاب ہے، یہ

کتاب متوسط سائز کے ایک سو بیس (۱۲۰) صفحات میں ہے۔

۱۳- العون الکبیر شرح الفوز الکبیر، یہ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر کی عربی میں شرح ہے یہ متوسط سائز کے تین سو بارہ (۳۱۲) صفحات میں ہے۔

۱۴- الوافیۃ بمقاصد الکافیۃ، یہ عربی زبان میں علامہ ابن الحاجب (ابو عمرو عثمان بن عمر بن ابی بکر بن یونس دوینی اَسنائی معروف بہ ''ابن الحاجب'': ۵۷۰ھ/۱۱۷۴ء - ۶۴۶ھ/۱۲۴۹ء) کی نحو میں معرکۃ الآراء کتاب ''الکافیہ'' پر حواشی وتعلیقات ہیں۔ یہ کتاب متوسط سائز کے دو سو پندرہ (۲۱۵) صفحات میں ہے۔

۱۵- ہادیہ شرحِ کافیہ، یہ اردو زبان میں کافیہ کی شرح ہے، چھوٹے سائز کے تین سو اٹھاون (۳۵۸) صفحات میں ہے۔

۱۶- مبادئ الفلسفہ، یہ کتاب دار العلوم کی مجلس شوریٰ کی طلب پر مفتی صاحب نے ترتیب دی ہے، جو دار العلوم میں داخل نصاب ہے، کتاب کا مقصد فلسفہ کی بڑی اور دقیق ومشکل کتابوں سے پہلے، طلبہ کو اس کے اصول ومبادی سے واقف کرانا ہے؛ تاکہ ان کے لیے ان کتابوں کا پڑھنا اور سمجھنا آسان ہوجائے۔ یہ کتاب متوسط سائز کے چالیس (۴۰) صفحات میں ہے۔

۱۷- معین الفلسفہ، یہ مبادئ الفلسفہ کی اردو شرح ہے، جس سے میبذی کے حل میں بھی مدد ملتی ہے اور فلسفہ کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنا آسان ہوتا ہے۔ یہ کتاب چھوٹے سائز پر (۱۶۴) ایک سو چونسٹھ صفحات میں ہے۔

۱۸- مبادئ الاصول، یہ اصول فقہ کی بنیادی اصطلاحات پر مشتمل ہے، عربی زبان میں اصول الشاشی، نور الانوار اور کشف الاسرار وغیرہ اُصول فقہ کی کتابوں سے استفادے کے ذریعے تیار کی گئی ہے۔ اِس کو پڑھ لینے کے بعد اصول فقہ کی مشکل کتابوں کو ہضم کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ یہ کتاب متوسط سائز کے چالیس (۴۰) صفحات میں ہے۔

۱۹- معین الاصول، یہ اردو زبان میں مبادئ الاصول کی شرح ہے، چھوٹے سائز کے

ایک سو بارہ (۱۱۲) صفحات میں ہے۔

۲۰- آپ فتویٰ کیسے دیں؟، یہ کتاب علامہ ابن عابدین شامی (محمد امین بن عمر بن عبد العزیز عابدین دمشقی معروف بہ ’’علامہ شامی‘‘ (۱۱۹۸ھ/ ۱۷۸۴ء-۱۲۵۲ھ/ ۱۸۳۶ء) کی مشہور کتاب ’’شرح عقود رسم المفتی‘‘ کا سلیس اردو ترجمہ ہے، مترجم نے مباحث کی ضروری وضاحت اور مفید عنوانات کے اضافے کے ساتھ، فقہا اور کتب فقہیہ کا مفصل تعارف بھی کتاب میں درج کردیا ہے۔ یہ کتاب متوسط سائز کے ایک سو ساٹھ (۱۶۰) صفحات میں ہے۔

۲۱- آسان صرف، یہ کتاب مفتی صاحب نے مبتدی طلبہ کے لیے لکھی ہے، یہ برصغیر میں اکثر مدرسوں میں داخلِ نصاب ہے۔ یہ کتاب تین حصوں میں ہے، چھوٹے سائز پر پہلا حصہ چالیس (۴۰) صفحے میں، دوسرا حصہ چونسٹھ (۶۴) صفحے میں اور تیسرا حصہ ایک سو چار (۱۰۴) صفحے میں ہے۔

۲۲- آسان نحو، یہ کتاب نحو کے مبتدی طلبہ کے لیے دو حصوں میں اردو میں لکھی گئی ہے، چھوٹے سائز پر، پہلا حصہ چالیس (۴۰) صفحے میں اور دوسرا حصہ ایک سو چار (۱۰۴) صفحے میں ہے۔

۲۳- آسان فارسی قواعد، یہ مبتدی طلبہ کو فارسی پڑھانے کے لیے بہت آسان کتاب ہے، دو حصوں میں ہے، پہلا حصہ چھوٹے سائز پر بتیس (۳۲) صفحے میں ہے اور دوسرا حصہ (۶۴) چونسٹھ صفحے میں ہے۔

۲۴- آسان منطق، یہ کتاب دراصل مولانا حافظ عبداللہ گنگوہیؒ کی تالیف تیسیر المنطق کی ترتیب وتسہیل ہے، جو مفتی صاحبؒ نے کی ہے۔ یہ چھوٹے سائز پر (۷۷) صفحے میں ہے۔

۲۵- تحفۃ الدرر شرح نخبۃ الفکر، یہ علامہ ابن حجر عسقلانی (شہاب الدین ابوالفضل احمد بن علی بن محمد کنانی عسقلانی مصری شافعی: ۷۷۳ھ/ ۱۳۷۱ء-۸۵۲ھ/ ۱۴۴۹ء) کی اصول حدیث کی مشہور کتاب ’’نخبۃ الفکر في مصطلح اہل الاثر‘‘ کی اردو میں شرح ہے، چھوٹے سائز کے (۸۴) چوراسی صفحے میں ہے۔

۲۶- مفتاح العوامل شرح مئۃ عامل، یہ کتاب امام عبدالقاہر جرجانی (ابوبکر عبدالقاہر بن عبدالرحمٰن بن محمد جرجانی: ۴۰۰ھ/ ۱۰۰۹ء-۴۷۱ھ/ ۱۰۷۸ء) کی فن نحو کی مشہور کتاب ''شرح مئۃ عامل'' کی اردو میں گراں قدر شرح ہے۔ یہ شرح دراصل شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخرالدین احمد ہاپوڑی ثم مرادآبادی نوراللہ مرقدہ نے کی تھی، اس کا مسودہ عرصے تک حضرت مولانا ریاست علی بجنوریؒ (۱۳۵۹ھ/ ۱۹۴۰ء-۱۴۳۸ھ/ ۲۰۱۷ء) کے پاس محفوظ رہا، مفتی صاحب نے وہ مسودہ ان سے لے کر اس پر دیدہ ریزی سے نظر ثانی کی اور مولانا خورشید انور گیاوی استاذ دارالعلوم نے اسے مرتب و مکمل کیا، النوع الاول کے نصف کے بعد کی ترکیب نحوی رہ گئی تھی، اس کا اضافہ کیا۔ یہ کتاب چھوٹے سائز پر دوسو بہتر (۲۷۲) صفحے میں ہے۔

۲۷- گنجینۂ صرف، یہ اردو میں صرف کی مشہور کتاب ''پنج گنج'' کی شرح ہے، یہ شرح بھی حضرت مولانا سید فخرالدین احمد کے قلم سے ہے، مفتی صاحب نے اس کا مسودہ بھی حضرت مولانا ریاست علیؒ سے حاصل کر کے اس پر نظر ثانی کی اور اس کو مرتب و مکمل کر کے اپنے مکتبہ، مکتبۂ حجاز سے شائع کیا، یہ کتاب چھوٹے سائز کے دوسو پچپن (۲۵۵) صفحے میں ہے۔

۲۸- علمی خطبات، یہ مفتی صاحب کی ان تقریروں کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے رمضان المبارک کے مہینے میں بیرون ملک بالخصوص برطانیہ، کناڈا وغیرہ میں کیں، ان کے صاحب زادوں نے انھیں مرتب کیا اور مفتی صاحب نے لفظ بہ لفظ ان کو پڑھا تھا، اس کے بعد یہ تقریریں شائع کی گئیں، گویا یہ بھی ان کی تالیف ہی ہے۔ پہلا حصہ چھوٹے سائز پر (۳۰۴) تین سو چار صفحات میں اور دوسرا حصہ (۲۷۱) دوسوا کہتر صفحات میں ہے۔

۲۹- تذکرۂ مشاہیر محدثین وفقہاے کرام اور تذکرہ راویانِ کتبِ حدیث، اِس کتاب میں خلفاے راشدین، عشرۂ مبشرہ، ازواجِ مطہرات، بناتِ طیبات، فقہاے سبعہ مجتہدین امت، محدثین کرام، راویان کتب حدیث، شارحین حدیث، فقہاے امت مفسرین عظام، متکلمین اسلام وغیرہ کا انتہائی اختصار کے ساتھ تذکرہ ہے۔ یہ کتاب چھوٹے سائز کے اَسّی (۸۰) صفحے میں ہے۔

۳۰- دین کی بنیادیں اور تقلید کی ضرورت، یہ کتاب مفتی صاحب کی ان تقریروں کا مجموعہ ہے، جو اُنھوں نے غیر مقلدین کے ردّ میں لندن میں اور جون ۲۰۰۴ء میں ہندو پور اور شہر مدراس میں کیں، پھر ان پر نظر ثانی کی اور رحمۃ اللہ الواسعہ سے دین کی بنیادی باتوں کا اضافہ کیا اب یہ مذکورہ نام سے چھوٹے سائز کے (۹۶) چھیانوے صفحے میں چھپتی رہتی ہے۔

۳۱- داڑھی اور انبیاء کی سنتیں، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کتاب میں داڑھی پر کیے جانے والے اعتراضات کے جوابات کے علاوہ انبیا کی سنتوں کو بیان کیا گیا ہے، جیسے ناخن تراشنا، بغل کے بال لینا، مسواک کرنا وغیرہ۔ یہ کتاب چھوٹے سائز کے ایک سو اٹھائیس (۱۲۸) صفحے میں ہے۔

۳۲- عصری تعلیم، ضرورت، اندیشے، تدبیریں، لڑکیوں کو سرکاری اسکولوں میں عصری تعلیم دلانے کے سلسلے میں مشکلات ونقصانات پر غور کرنے کے لیے، علاقۂ پالن پور میں قائم اِصلاحی جماعت نے ۱۰ر ربیع الآخر ۱۴۲۷ھ مطابق ۹ر مئی ۲۰۰۶ء کو ایک اجتماع منعقد کیا اور مفتی صاحب کو مذکورہ مسئلے پر خطاب کے لیے مدعو کیا۔ اُنھوں نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس کو کتاب کی صورت میں، شعبۂ نشر واشاعت دار العلوم چھاپی گجرات نے شائع کیا۔ یہ کتاب چھوٹے سائز کے پچپن (۵۵) صفحات میں ہے۔

۳۳- اسلام تغیر پذیر دنیا میں، یہ کتاب جو چھوٹے سائز میں ایک سو بارہ (۱۱۲) صفحات میں ہے، ان چار مقالات کا مجموعہ ہے، جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سمیناروں اور جلسوں میں پڑھے گئے۔ پہلے مقالے کا عنوان ''اسلام تغیّر پذیر دنیا میں'' ہے جو مفتی صاحبؒ کے قلم سے ہے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھا گیا۔ دوسرے مقالے کا عنوان ''فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کا مسئلہ'' ہے، یہ بھی مفتی صاحب ہی کا لکھا ہوا ہے، یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سمینار میں پڑھا گیا۔ تیسرا مقالہ بہ عنوان ''فقہِ حنفی میں فہم معانی کے اصول'' ہے، یہ حضرت مولانا ریاست علی بجنوری کا تحریر کردہ ہے، یہ بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سمینار میں پڑھا گیا۔ چوتھا مقالہ جو ''نبوت نے انسانیت کو کیا دیا؟'' سے مُعَنْوَن ہے، مفتی صاحب کا

نتیجۂ فکر ہے، یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جامع مسجد میں پیش کیا گیا۔

۳۴- حرمتِ مُصَاہَرَت، یہ کتاب چھوٹے سائز کے اسی (۸۰) صفحے میں ہے۔ اس میں سسرالی اور دامادی رشتوں کے مکمل احکام اور ناجائز انتفاع کا حکم ذکر کیا گیا ہے۔

۳۵- حیاتِ امام طحاوی، یہ کتاب چھوٹے سائز کے چھیانوے (۹۶) صفحات میں ہے۔ اس میں امام طحاوی کے تذکرے کے ساتھ، شرح معانی الآثار کا تعارف اور اس کی شروح کا جائزہ شامل ہے۔

۳۶- حیاتِ امام ابوداود، یہ کتاب چھوٹے سائز کے اسی (۸۰) صفحات میں ہے، اس کتاب میں امام صاحب کے حالات، سنن ابی داود کا تعارف، اس کی شرحوں اور متعلقات کا جائزہ شامل ہے۔

۳۷- جلسۂ تعزیت کا شرعی حکم، یہ کتاب چھوٹے سائز پر (۸۶) چھیاسی صفحات میں چھپی ہوئی ہے۔ رجب ۱۴۳۹ھ/ اپریل ۲۰۱۸ء میں حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ (۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۶ء- ۱۴۳۹ھ/ ۲۰۱۸ء) پر دارالعلوم وقف دیوبند نے سمینار کیا جس میں کبار اساتذہ و منتظمین دارالعلوم کو بھی مدعو کیا گیا، دیگر لوگوں نے شرکت کی لیکن مفتی صاحب نے دلائل کی روشنی میں مذکورہ سمینار کو جلسۂ تعزیت مانتے ہوئے، اس میں شرکت نہیں کی، جس سے علمی مناقشے کا سلسلہ شروع ہوگیا، مفتی صاحب نے اپنی عدم شرکت پر علمی انداز میں جو کچھ لکھا، نیز دیگر لوگوں نے تحریری طور پر جو کچھ کہا، اس کو اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے، جس سے کتاب دستاویزی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

۳۸- تسہیلِ ادلۂ کاملہ، یہ کتاب متوسط سائز کے دوسو بتیس (۲۳۲) صفحات میں ہے، یہ شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوتی ہے، یہ کتاب غیر مقلدوں کے دس سوالات اور ان کے تحقیقی جوابات پر مشتمل ہے، یہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ (۱۲۶۸ھ/ ۱۸۵۱ء-۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء) کی تصنیف ہے، مفتی صاحب نے اس کی تسہیل کی ہے اور اُن کے برادر خرد مولانا مفتی محمد امین پالن پوری نے اس کی ترتیب وتزیین کی ہے۔

۳۹- تحقیق وتحشیہ ایضاح الادلہ، یہ کتاب متوسط سائز کے (۶۷۱) چھ سو اکہتر صفحات میں شیخ الہند اکیڈمی سے طبع ہوتی ہے، غیر مقلدوں کے دس سوالوں کے جوابات کی شرح ووضاحت خود شیخ الہندؒ نے کی تھی، مفتی صاحب نے تحقیق وتحشیہ کا کام کیا ہے اور مولانا مفتی محمد امین پالن پوری نے ترتیب وتزیین کی ہے۔

۴۰- کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟، یہ کتاب حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کی کتاب ’’توثیق الکلام والدلیل المحکم‘‘ کی شرح ہے۔ یہ چھوٹے سائز کے ایک سو انسٹھ (۱۵۹) صفحے میں ہے۔

۴۱- اِرشاد الفہوم شرح سلم العلوم، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ قاضی محبّ اللہ بن عبد الشکور بہاری (متوفی ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء) کی فن منطق کی مشہور ومتداول غیر معمولی کتاب ’’سلّم العلوم‘‘ کی اردو شرح ہے۔ یہ چھوٹے سائز کے (۳۸۴) تین سو چوراسی صفحات میں ہے۔

۴۲- کامل برہانِ الٰہی، یہ کتاب متوسط سائز میں چار (۴) جلدوں میں ہے، پہلی جلد پانچ سو چھیاسٹھ (۵۶۶) صفحات کی ہے، دوسری پانچ سو ساٹھ (۵۶۰) کی، تیسری بھی پانچ سو ساٹھ (۵۶۰) صفحات کی، جب کہ چوتھی (۶۱۴) چھ سو چودہ صفحات کی ہے، کل صفحات تیئس سو (۲۳۰۰) ہوتے ہیں۔ اس کتاب میں وہ مضامین ہیں جو مفتی صاحب نے ’’حجۃ اللہ البالغہ‘‘ کی شرح ’’رحمۃ اللہ الواسعۃ‘‘ کے ہر مبحث کے شروع میں اس کے مشمولات کو سمجھانے کے لیے لکھے ہیں، قارئین کی خواہش پر ان کی رائے ہوئی کہ ان مضامین کو علاحدہ کتاب میں شائع کر دیا جائے، تاکہ جو لوگ ’’حجۃ اللہ البالغہ‘‘ میں شاہ صاحب کی عربی عبارت کی بہ جائے صرف شاہ صاحب کی مراد کو جاننا چاہیں وہ مفتی صاحب کے ان مضامین ہی کو پڑھ لیا کریں۔

۴۳- محفوظات، یہ کتاب چھوٹے سائز میں تین حصوں میں ہے، تینوں حصوں کے مجموعی صفحات (۱۱۲) ایک سو بارہ ہیں۔ اس میں مفتی صاحب نے طلبہ کو یاد کرانے کے لیے کچھ آیتیں اور احادیث مع ترجمۂ اردو درج کی ہیں۔ پہلے حصے میں چھوٹی چھوٹی آیتیں اور احادیث ہیں، دوسرے میں پہلے سے کچھ بڑی اور تیسرے میں ان سے بھی بڑی؛ تاکہ تدریجاً

طلبہ کی استعداد کے مطابق انھیں سمجھنا اور یاد کرنا آسان ہو۔

۴۴- مسئلہ ختم نبوت اور قادیانی وسوسے، یہ کتاب چھوٹے سائز کے چونسٹھ (۶۴) صفحات میں ہے، ردّ قادیانیت اور مسئلہ ختم نبوت پر یہ بہت قیمتی رسالہ ہے۔ دار العلوم کا ’’کل ہند تحفظ ختم نبوت‘‘ شعبہ اس کی اشاعت کرتا رہتا ہے۔

۴۵- تعددِ ازواجِ رسول پر اعتراضات کا علمی جائزہ، یہ کتاب مفتی صاحب کی دورانِ تدریسِ حدیث مذکورہ موضوع پر تقریر ہے، جو بنگلہ دیش کے ایک فاضل دار العلوم اور مفتی صاحب کے شاگرد مولانا کمال الدین شہاب قاسمی نے مرتب کر کے دار النشر ڈھاکہ بنگلہ دیش سے چھوٹے سائز کے تریسٹھ (۶۳) صفحات میں شائع کی ہے۔

۴۶- تہذیب المغنی، ’’المغنی‘‘ علامہ محمد بن طاہر بن علی پٹنی (۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء-۹۸۶ھ/۱۵۷۸ء) کی اسماء الرجال پر اہم کتاب ہے، مفتی صاحب نے اس کی عربی شرح لکھنی شروع کی تھی؛ صرف باب الراء تک لکھ سکے تھے؛ اِس لیے وہ شائع نہ ہوسکی۔

۴۷- زبدۃ الطحاوی، امام طحاوی کی ’’معانی الآثار‘‘ کی عربی تلخیص ہے، چونکہ مدارس میں یہ کتاب جہاں تک پڑھائی جاتی ہے، وہیں تک کام کرسکے تھے؛ اِس لیے اس کو شائع نہیں کیا۔

۴۸- مفتی صاحب کے بہت سے فتاوی اُن کے ذاتی رجسٹروں اور دار العلوم کے دار الافتا کے رجسٹروں میں محفوظ ہیں۔ اُنھیں دیگر علمی کاموں سے فرصت نہیں ملی اِس لیے اُنھیں مُدَوَّن کر کے شائع نہ کرسکے۔

پس ماندگان

۱۳۸۴ھ/ ۱۹۶۵ء میں مفتی صاحب کی شادی اپنے ماموں مولانا حبیب الرحمٰن شیرؔا کی بڑی صاحب زادی سے ہوئی، مفتی صاحب نے اپنی اہلیہ کی نہ صرف صلاح وتقوی اور صبر وشکر پر پرورش کی؛ بل کہ اُنھیں جیّد حافظ قرآن بنایا جس کی وجہ سے یہ ہوا کہ اُنھوں نے امور خانہ داری کو بہ خوبی انجام دیتے ہوئے اپنے بچے اور بچیوں کو؛ بل کہ اپنی بہووں کی بھی حفظ قرآن کی سعادت عظمی سے نوازا۔ قابل ذکر ہے کہ وقتِ تحریر مفتی صاحب کی ۱۳۱ اولاد وا حفاد واسباط اور

پانچ بہوویں حافظِ قرآن ہیں، یاد رہے کہ بہ راہ راست اولاد اور مفتی صاحب کے پوتوں پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی تعداد ۳۳ ہے۔

پہلے لکھا جاچکا ہے کہ مفتی صاحب کی اہلیہ کا ۱۴۳۲ھ/ ۲۰۱۱ء میں انتقال ہوچکا، دو صاحب زادوں کی بھی وفات ہوچکی ہے، ایک پسرِ اکبر مولوی مفتی رشید احمد مولود ۴؍ جمادی الاخری ۱۳۸۶ھ مطابق ۲۰؍ ستمبر ۱۹۶۶ء کی جن کی ایک حادثے میں ۵؍ شوال ۱۴۱۵ھ مطابق ۷؍ مارچ ۱۹۹۵ء کو شہادت ہوگئی۔ ان کے دو لڑکے ہیں: مولوی مفتی مسیح اللہ فاضلِ دارالعلوم دیوبند جو ممبئی کے ایک مدرسے میں مدرس ہیں اور اپنی والدہ (جن کی دوسری شادی ہوچکی ہے) کے ساتھ ممبئی ہی میں سکونت پذیر ہیں، دوسرا لڑکا سمیع اللہ حافظِ قرآن ہے، وہ ممبئی کے ایک مکتب میں معلم ہے اور ممبئی ہی میں اپنی والدہ کے ساتھ رہائش پذیر ہے۔

پسرِ ثانی مولانا حافظ سعید احمد مولود یکم ذی قعدہ ۱۳۸۷ھ مطابق یکم فروری ۱۹۶۸ء، ہدایہ تک تعلیم یافتہ تھے اور سورت کے ایک مدرسے میں حفظ کے استاذ تھے، مدرسے کا نام دارالعلوم محلّہ رام پورہ ہے۔ پانچ چھ سال سے راندیر کے کسی مدرسے میں مدرس تھے اور وہیں بہ روز منگل: ۲۸؍ ربیع الاول ۱۴۴۱ھ مطابق ۲۶؍ نومبر ۲۰۱۹ء وہ اللہ کو پیارے ہوگئے اور وہیں مدفون ہوے۔

ایک صاحب زادی، جو چوتھے نمبر کی اولاد تھی اور جس کی تاریخ پیدائش ۱۳؍ جمادی الاولی ۱۳۹۱ھ مطابق ۷؍ جولائی ۱۹۷۱ء ہے، بہت جلد بہ مقام راندیر، بہ روز جمعہ: ۱۶؍ ربیع الاول ۱۳۹۳ھ مطابق ۲۰؍ اپریل ۱۹۷۳ء، داغِ مفارقت دے گئی۔

باقی اولاد الحمدللہ زندہ بخیر ہیں، جو مندرجۂ ذیل ہیں:

۱- مولانا وحید احمد مولود ۱۷؍ جمادی الاولی ۱۳۸۹ھ مطابق ۲؍ اگست ۱۹۶۹ء، فاضلِ دارالعلوم ہیں، ۱۵ سال سے دمن کے مدرسہ نورالاسلام میں درس وتدریس میں مشغول ہیں۔

۲- مولانا حسن احمد مولود ۱۴؍ محرم ۱۳۹۳ھ مطابق ۱۸؍ فروری ۱۹۷۳ء، دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد مفتی صاحب نے انھیں اپنی کتابوں کی کمپیوٹر سے ٹائپ کرنے کی ذمے داری سپرد کی، اب وہ اس کام کے ماہر بن گئے ہیں چناں چہ اُنھوں نے ”روشن کمپیوٹر“ کے نام

سے کمپوزنگ کا باقاعدہ ادارہ قائم کرلیا ہے۔

۳- مولانا مفتی حسین احمد مولود ۲؍ جمادی الاخری ۱۳۹۴ھ مطابق ۲۴؍ جون ۱۹۷۴ء۔ دارالعلوم کے فاضل ہیں، ذی استعداد ہیں، مختلف مدرسوں میں تدریسی خدمت انجام دے چکے ہیں، جس کے دوران بخاری و مسلم و ترمذی شریف پڑھا چکے ہیں۔ مفتی صاحب کی ترمذی کی شرح ''تحفۃ الالمعی'' اور بخاری کی شرح ''تحفۃ القاری'' انھی نے مرتب کی ہے اور اب مسلم کی شرح کو مرتب کررہے ہیں، جس کی ایک جلد مفتی صاحب کی زندگی میں آچکی ہے، اب اس کے بعد کی جلدوں پر کام کررہے ہیں۔ اپنے ذاتی مکان میں ''معہد الفقہ النعمانی'' کے نام سے ایک ادارہ کے بانی و مدیر بھی ہیں، جس میں فضلاے مدارس کے لیے فقہ وافتا میں مہارت یابی کا انتظام ہے۔

۴- مولانا محمد ابراہیم سعیدی مولود شعبان ۱۳۹۶ھ/ اگست ۱۹۷۶ء، دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد سے ہی، ضلع ہاپوڑ کے ایک گاؤں ''کورانہ'' میں مدرسہ نافع العلوم میں تقریباً بائیس ۲۲ سال سے مدرس ہیں، وہاں کے صدر مدرس اور ناظمِ تعلیمات بھی ہیں اور فقہ وحدیث کی کتابوں کا درس بھی دیتے ہیں۔

۵- حافظ محمد قاسم مولود ۵؍ ربیع الآخر ۱۳۹۸ھ مطابق ۱۵؍ مارچ ۱۹۷۸ء درجہ سوم عربی تک تعلیم حاصل کی، اب تجارتی سرگرمیوں میں مصروف ہیں، دیوبند میں قاضی مسجد کے قریب ''مکتبۂ حجاز'' کے منیجر ہیں۔

۶- حافظہ عائشہ مولود صفر ۱۳۹۹ھ/ جنوری ۱۹۷۹ء، بڑی صاحب زادی کا نام بھی عائشہ تھا، ان کا دوڈھائی سال میں انتقال ہوگیا، تو مفتی صاحب نے اُس کے بعد متولد ہونے والی بچی کا نام بھی عائشہ ہی رکھا، جو اس وقت دو بہنوں میں بڑی بہن ہے، حفظِ قرآن کے بعد بنیادی دینی تعلیم حاصل کی، اپنی بچیوں کو عائشہ سلمہا نے خود ہی حفظ کرایا اور ان کی مزید تعلیم وتربیت کی ذمے داری ادا کررہی ہیں۔ مفتی اسامہ پالن پوری فاضلِ دارالعلوم کی اہلیہ ہیں، جو جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں درجاتِ متوسطہ وعلیا کی کتابیں پڑھاتے ہیں، فقہی ضوابط، مسائل

المیز ان، تحفۃ الفقہ، فقہی اصول اور ''تاسیس النظر'' کی شرح وغیرہ کے مصنف بھی ہیں۔

۷- مفتی محمد سعید مولود ربیع الآخر ۱۴۰۱ھ/ فروری ۱۹۸۱ء، دارالعلوم سے فراغت کے بعد، مفتی صاحب کے علمی خطبات کو مرتب کرنے کا کام کیا، مظفر نگر کے کشن پور کے مدرسہ بحر العلوم میں پانچ سال تدریسی خدمت کے بعد، گیارہ سال سے جامعۃ الامام محمد انور دیوبند میں درجاتِ علیا کی کتابوں کی تدریس ان کے سپرد ہے۔

۸- مولانا احمد سعید مولود ۴ر صفر ۱۴۰۳ھ مطابق ۲۱ر نومبر ۱۹۸۲ء، دارالعلوم کے فاضل ہیں پندرہ سال سے دیوبند کے مدرسہ جامعۃ الشیخ حسین احمد مدنی میں درجات علیا کے مدرس ہیں۔

۹- حافظہ فاطمہ سلمہا مولود ۱۱ر جمادی الاولی ۱۴۰۵ھ مطابق ۲ر فروری ۱۹۸۵ء، حفظِ قرآن کے بعد بنیادی دینی تعلیم سے بہرہ ور ہیں۔ ''گھٹا من'' پالن پور کے مدرسہ جامعہ نور العلوم کے بانی و مہتمم مرحوم جناب حنیف صاحب کھر وڈیہ کے صاحب زادے حافظ بلال کی اہلیہ ہیں، حافظ بلال کی بود و باش ممبئی میں ہے، جہاں وہ تجارت سے وابستہ ہیں۔ مفتی صاحب نے اپنی زندگی کے آخری ایام انھی صاحب زادی کے یہاں گزارے اور ممبئی کی خاک کا ہی پیوند بنے۔

۱۰- قاری حافظ عبداللہ سعید مولود: ۷ر رجب ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۹/ مارچ ۱۹۸۶ء، حفظِ قرآن کے بعد مدرسہ اسلامیہ ریڑھی تاج پورہ، سہارن پور سے تجوید وقراءت کی سند حاصل کی اِس وقت دیوبند میں تجارتی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔

۱۱- حافظ عبیداللہ مولود ۹ر صفر ۱۴۰۹ھ مطابق ۲۲ر ستمبر ۱۹۸۸ء، حافظ قرآن ہیں اور بنیادی دینی تعلیم سے بھی بہرہ یاب ہیں، مکتبۂ حجاز دیوبند میں تجارتی سرگرمیوں سے وابستہ ہیں۔

تحریر کردہ ۱۱ بجے صبح: جمعہ ۲۶ر شوال ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹ر جون ۲۰۲۰ء

انتہائی صدمے کی خبر

مفتی شبیر احمد صاحب قاسمی مرادآباد

خادم الافتاء والحدیث جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد

بہت ہی صدمے اور گہرے رنج کی خبر ہے کہ آج بتاریخ 25؍رمضان المبارک 1441 بروز منگل مطابق 19؍مئی 2020 دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز استاد استاذالاساتذہ حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند صبح چھ سات بجے کے درمیان جوگیشوری ممبئی میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔

ملک کے طول وعرض اور پوری دنیا میں ان کے تلامذہ کا جال پھیلا ہوا ہے آج ان کی وفات کو سن کر ہزاروں لاکھوں دل رو رہے ہوں گے۔

ہزاروں تلامذہ نے ان سے فائدہ اٹھایا ہے مگر احقر کا تعلق ان کے ساتھ استادو شاگردی میں ایک امتیازی اور نمایاں انداز کا رہا ہے اور کبھی کبھی احقر اور ان کے درمیان راء کے اختلاف کے ساتھ علمی بحث بھی ہوتی رہی ہے اور احقر نے ان سے بے شمار علمی ابواب و عنوانات حاصل کیے ہیں

احقر نے درس وتدریس میں ہمیشہ انہی کا انداز اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا سبق ہمیشہ مرتب ہوا کرتا تھا اس لیے طلبہ ان کے اسباق سے مطمئن ہوکر کے اٹھتے تھے ان کے زیر سایہ ہزاروں کی تعداد میں بہترین مفتی بہترین مدرس اور اچھے مصنفین تیار ہوئے۔ ان کا مشغلہ ہمیشہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے دائرے میں رہا اور تعلیمی سال کے دوران وعظ وتقریر اور ملی سرگرمی کے اسفار بہت ہی کم ہوا کرتے تھے، جس کی وجہ سے ان کے

یہاں سبق کا ناغہ اور نقصان بھی بہت کم ہوتا تھا اور ان کا درس انتہائی تحقیقی اور محققانہ ہوا کرتا تھا۔

وہ حل کتاب کے اعتبار سے ایک بہترین استاد تھے اسی لیے طلبہ کے درمیان وہ ایک متکلم عالم اور محقق کی حیثیت سے مشہور تھے، جس کی وجہ سے ان کے تلامذہ کے علاوہ دیگر علمی حلقوں میں بھی ان کی شہرت ایک بہترین محقق عالم کی حیثیت سے تھی۔

انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقے پالن پور میں حاصل کرنے کے بعد مظاہر علوم سہارنپور میں کئی سال تک تعلیم حاصل فرمائی اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں علوم عالیہ کی تعلیم حاصل فرمائی اور 1382 ہجری میں دورہ حدیث شریف سے فراغت حاصل کی۔ وہ فخر المحدثین شیخ فخر الدین احمد صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند اور علامہ ابراہیم بلیاوی صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کے مخصوص اور نمایاں تلامذہ میں سے تھے اور ان کے سبق میں حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی کا رنگ زیادہ غالب رہتا تھا۔

دورۂ حدیث شریف کے بعد انہوں نے ایک سال افتاء پڑھا اور پھر معین المفتی کی حیثیت سے بھی کچھ دن دارالعلوم میں کام کیا اس کے بعد جامعہ اشرفیہ راندیر میں نو سال تک تدریسی خدمات انجام دیں پھر اس کے بعد لگ بھگ اڑتالیس سال سے دارالعلوم دیوبند میں نمایاں استاد کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیں اور آج وہ ایک شیخ الحدیث کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

امسال بخاری شریف کے آخری سبق میں اچانک ان کی آواز بند ہو گئی اور طلبہ میں گریہ وزاری کی عجیب کیفیت پیدا ہوئی اطلاع ملنے پر احقر نے ان کے صاحبزادے حضرت مولانا مفتی حسین احمد پالن پوری سے حالات معلوم کیے تو انہوں نے فرمایا کہ یہ اس دن کی نئی بات نہیں ہے بلکہ ہفتے 2 ہفتے سے ان کی کیفیت یہی ہوتی رہی کہ اچانک ان کی آواز بند ہو جاتی اور بالکل خاموش ہو جاتے پھر جب وہ اصلی حالت میں ہوتے ہیں اور ان سے معلوم کیا جاتا ہے تو ان کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کیا ہوا تھا۔

انہوں نے بے شمار کتابیں تصنیف فرمائیں ان میں سے حجۃ اللہ البالغہ جیسی دقیق کتاب کی شرح بھی مکمل تحریر فرمائی اور ترمذی شریف کی مکمل شرح اسی طرح بخاری شریف کی مکمل شرح بھی حضرت کی درسی تقریر کی حیثیت سے شائع ہوکر مقبول ہوئی اور ہدایت القرآن کے نام سے قرآن کی تفسیر کی بھی تکمیل فرمائی۔ ان کا کوئی کام ادھورا نہیں رہتا تھا بلکہ شروع سے آخر تک مکمل ہوا کرتا تھا۔

آج ہزاروں تلامذہ اور لاکھوں متعلقین کو داغِ فراق دے کر اللہ کو پیارے ہو گئے آج دارالعلوم دیوبند کے درودیوار اساتذہ اور تلامذہ ان کے فراق میں پژمردہ ہیں۔

تعزیتی اجلاس سے متعلق ان کی رائے اکابر دیوبند میں بالکل الگ تھلگ رہی ہے وہ اس کے قائل نہ تھے اتفاق کی بات ہے کہ آج ایسے زمانے میں ان کی وفات کا درد ناک سانحہ پیش آیا ہے کہ پورے ملک میں لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ جا نہیں سکتے لاک ڈاؤن اور کرفیو کی ایسی شکل ہے کہ آزادانہ طور پر گلی کوچوں میں چل بھی نہیں سکتے ایسے حالات میں ممبئی میں آج ان کی وفات ہوئی دارالعلوم دیوبند کے طلبہ اور اساتذہ اوان کے تلامذہ کا جال پھیلا ہوا ہے ان میں سے کوئی بھی ان کے جنازے میں شرکت کے لیے نہیں جا سکتا۔

اللہ نے ان کو صاحب اولاد بنایا ہے دو بیٹیاں اور غالباً بارہ بیٹے اللہ نے ان کو عطا فرمائے سبھی حافظ قرآن ہیں دونوں بیٹیاں بھی حافظ قرآن ہیں انہوں نے اپنی اہلیہ محترمہ کو بھی حافظ بنایا تھا ان کے دوسرے نمبر کے بیٹے حافظ سعید صاحب مرحوم جلالین تک پڑھنے کے بعد آگے نہ پڑھ سکے اور باقی سارے صاحبزادگان حافظ ہونے کے ساتھ ساتھ عالم دین بھی ہیں ان کی وفات کے وقت ممبئی میں ان کے ساتھ صرف دو صاحبزادے رہے باقی سب دیوبند میں ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ جنازہ میں شرکت کے لیے کوئی بھی نہ جا سکا اور ان کے صاحبزادگان میں سے بڑے دو صاحبزادے مولانا رشید احمد اور حافظ سعید احمد حضرت کی زندگی میں وفات پا گئے اور ان کے دوسرے نمبر کے بیٹے حافظ سعید احمد اور تیسرے نمبر کے بیٹے مولانا وحید احمد دونوں نے احقر کی دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات کے زمانے

میں احقر سے نورالایضاح پڑھی ہے اس لیے دونوں صاحبزادگان کا احقر سے بہت ہی والہانہ تعلق رہا ہے، اگر چہ وہ آج اکیلے دورافتادہ علاقہ میں اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں لیکن ان کے ہزاروں تلامذہ اور متعلقین ان کے لئے ایصال ثواب میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ پاک ان کی بال بال مغفرت فرمائے۔

وہ پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کے ماہر تھے اور ابھی ابھی لاک ڈاؤن کے دوران رمضان سے قبل ثریا ستارے کے طلوع ہونے سے متعلق جو حدیث میں تبصرہ ہے اسکے متعلق بعض اہل علم کی طرف سے کچھ نامناسب تاویلات کی تشہیر پوری دنیا میں ہونے لگی اس سلسلے میں احقر بھی بہت تشویش میں رہا احقر تحریری طور پر اشکال وجواب کا قائل نہیں ہے اس سے عوام میں اچھے اثرات مرتب نہیں ہوتے اسی لیے خاموش رہا مگر اللہ نے حضرت الاستاذ کے دل میں بات ڈالی اور پہلی تراویح کے بعد انہوں نے اپنے بیان میں صاف الفاظ کے ساتھ ثریا ستارے کی غلط تشریحات پر تردید فرمائی اور ان کی تردید کے بعد وہ سلسلہ ختم ہو گیا اور لوگوں نے راحت کا سانس لیا۔

حضرت کی ولادت کے بارے میں حضرت سے زبانی معلوم ہوا کہ 1360 ہجری میں آپ کی ولادت ہوئی اس اعتبار سے اکیاسی سال کی عمر ہوگئی حضرت کو حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب سے اور احقر کے بچوں کے نانا حضرت مولانا سید محمود حسن صاحب سہارنپوری جو حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے اجل خلفاء میں سے تھے، سے بھی اجازتِ بیعت حاصل تھی، ان کی طرف سے اجازتِ بیعت کی تحریر احقر کے ذریعے سے پہنچائی گئی ہے۔

اللہ تعالی حضرت الاستاذ کی کروٹ کروٹ مغفرت فرمائے، اعلی علیین میں مقام عطا فرمائے اور ان کے سارے علمی کارناموں کو شرفِ قبولیت سے مالا مال فرمائے۔

احقر انھیں جملوں کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داران اور طلبہ کی خدمت میں اور ان کے تمام صاحبزادگان اور صاحبزادیوں کی خدمت میں اور ان کے تمام تلامذہ کی خدمت میں اور تمام پسماندگان کی خدمت میں تعزیت پیش کرتا ہے اور تمام احباب سے ایصال ثواب کی گزارش کرتا ہے۔

علم حدیث کا مہر تاباں غروب ہو گیا

مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی

آج صبح بتاریخ ۲۵؍ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ بروز منگل کو اچانک ایک ایسے حادثۂ فاجعہ کی اطلاع ملی جس کا اس سے پہلے تصور نہیں کیا جا سکتا تھا، یعنی دار العلوم دیو بند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری صدر المدرسین دار العلوم دیو بند کا ممبئی میں سانحۂ ارتحال پیش آیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس ناچیز سے مفتی صاحب کا پہلا تعارف ۱۹۷۶ء میں ہوا تھا، جب وہ مدرسہ اشرفیہ راندیر میں پڑھا رہے تھے، خاص طور سے ابوداود شریف کا سبق ان سے متعلق ہوا، اس وقت تک اس ناچیز کی ہندوستان کے مدارس میں شہرت ہو چکی تھی، میری کتاب ''محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے'' منصۂ شہود پر آ چکی تھی، اس لیے فلاح دارین کے مہتمم مولانا عبد اللہ صاحب کاپودروی جو مجھے ترکیسر لائے تھے، انہوں نے ایک روز راندیر کے سفر کا پروگرام بنایا، انہوں نے بتایا کہ مدرسہ حسینیہ میں مولانا شمس الدین افغانی بڑے فاضل آدمی ہیں، انہیں آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے، ان کے شاگردوں مولانا عبد الرحیم متالاؒ اور مولانا غلام محمدؒ پٹیل وغیرہ نے آپ کا ان سے بڑا ذکر خیر کیا ہے، اس کے علاوہ مولانا ہاشم بخاری اور مولانا سعید احمد پالن پوری ہمارے گجرات کے نوجوان اچھے مدرس اور عالم ہیں، انہوں نے اپنے یہاں آپ کو شام کے کھانے پر مدعو کیا ہے، اس لیے ہم مولانا کے ہمراہ راندیر گئے وہاں مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری کے یہاں مہمان رہے، رات کا کھانا اور قیام انہی کے یہاں رہا، مفتی سعید احمد سے ملاقات سے اندازہ ہوا کہ مولانا بہت ہی صاحب ذوق، کتابوں کے حریص پڑھنے لکھنے کا اعلی ذوق رکھتے ہیں، اس طرح مفتی سعید احمد صاحب مرحوم سے

تعلقات کی ابتدا ہوئی، پھر کثرت سے ترکیسر ان کی آمد ورفت رہی، مجھے بعض کتابوں کی ضرورت تھی، اس کو مفتی صاحب نے عاریۃً فراہم کیا، راندیر میں انہوں نے میرے بیانات بھی کرائے، زمانہ گزرتا گیا، وہاں سے میری سہارن پور ’’بذل المجہود‘‘ کی خدمت کے لیے ایک سالہ چھٹی لے کر حاضری ہوئی، سہارن پور کے قیام میں مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی کی جب بھی آمد ہوئی تو انہوں نے مفتی صاحب کا سلام وپیام پہنچایا، اس کے بعد میرا قاہرہ، حجاز مقدس اور پھر ابوظبی کا سفر ہوگیا۔

حرمت مصاہرت کے بارے میں ابوظبی میں حنفیہ کے مسلک کے بارے میں مجھ سے سوالات کئے گئے، اس سلسلے میں معلوم ہوا کہ مولانا کی کتاب ’’حرمت مصاہرت‘‘ طبع ہوچکی ہے، اس کو میں نے منگوایا اور استفادہ کیا، اس نازک مسئلہ میں جس طرح انہوں نے گفتگو کرکے اپنے مسلک کو واضح اور مدلل کیا ہے، اس کو پڑھ کر طبیعت باغ باغ ہوگئی، اس کے بعد جب وہ دارالعلوم دیوبند منتقل ہوکر آگئے، ان کا دورۂ حدیث کے بڑے اساتذہ میں شمار ہونے لگا، وہاں ترمذی شریف وغیرہ اونچی کتابیں ان کے ذمہ کی گئیں، اس زمانے میں میرا سہارن پور مظاہر علوم شوری میں جانا ہوا، دیوبند بھی حاضری ہوئی، حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرے میزبان تھے، مولانا بھی مہمان خانے میں تشریف لائے اور ملاقات ہوئی، انہوں نے اپنے بعض رسائل ہدیہ کیے، بعد میں بار بار سہارن پور اور دیوبند کا سفر ہوا، وہ مہمان خانہ تشریف لاتے، کبھی ان کے جائے قیام چائے کے لیے حاضری ہوتی ان کے کتب خانہ پر نظر ڈالی، بہت ہی خوشی ہوئی، انہوں نے اپنی مؤلفات مجھے ہدیۃً عنایت فرمائیں دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی اور شکر گزار رہا۔

ان کے اہم کارناموں میں ’’حجۃ اللہ البالغۃ‘‘ کی خدمت اور اس کا حاشیہ ہے حقیقت میں یہ علماء پر ایک قرض تھا جو انہوں نے پوری محنت کرکے پوری جماعت کی طرف سے ادا کردیا، یہاں تک کہ انہوں نے مولانا عبیداللہ سندھی کی تقریر جس کو اردو سے عربی میں منتقل کیا گیا ہے اس کو بھی حاصل کرلیا اور یہ کتاب بیروت دار ابن کثیر سے ۲؍جلدوں میں

شائع ہوئی، ہمارے لڑکوں نے اس کو شارقہ معرض سے خریدا اور لائے دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی مولانا سے میں نے دریافت کیا کہ اس کے حقوق بھی آپ کو دیئے یا نہیں؟ انہوں نے فرمایا مجھے معلوم نہیں، کتاب چھپ گئی الحمد للہ یہی بڑی بات ہے، بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے کچھ حقوق ناشر نے ان کو ادا کیے۔

انہوں نے اپنے پیچھے کتابوں کا ذخیرہ چھوڑا ہے، جو ان کی جامعیت ورسوخ علم پر بہت بڑی دلیل ہے، ایک طرف انہوں نے مقاصد شریعت اور اس کے اسرار کی عظیم کتاب کی شرح کی، دوسری طرف حدیث شریف پر بخاری شریف اور ترمذی شریف جیسی کتابوں کی تدریسی لحاظ سے بھی اور تالیفی لحاظ سے بھی خدمت کی، انہوں نے اپنے پیچھے بڑا سرمایہ چھوڑا ہے، ترمذی شریف کی شرح ''تحفۃ الالمعی'' ۸/جلدوں میں شائع ہوگئی ہے جو طلبہ اور علماء کے لیے رہنمائی کا کام کرتی رہے گی۔

مجھ سے انہوں نے فون پر بتلایا کہ آپ کی تحقیق سے جو بذل المجہود شائع ہوئی ہے اس کو میں پابندی سے اپنے مطالعہ میں رکھتا ہوں، میں نے کہا کہ اگر کوئی ملاحظہ ہو تو بتلایئے گا تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کردوں، انہوں نے جواب دیا کہ اب تک تو کچھ ملا نہیں، اخیر میں میں نے اپنی کتاب ''الجامع الکبیر (سنن الترمذی) ومعہ الکوکب الدری علی جامع الترمذی'' کو ہدیۃً بھجوایا تو اس پر بھی بہت مسرت کا اظہار کیا کہ الحمد للہ متن کے ساتھ ہمارے اکابر کی باتیں عالم عرب میں بھی آگئیں اور صاحب تحفۃ الاحوذی کا آپ نے جا بجا جواب بھی دے دیا۔ ان کی کتاب ''تحفۃ القاری'' جو بڑی محنت اور مشقت اور ان کی نظر ثانی کے بعد ۲۱/جلدوں میں شائع ہوچکی ہے، اس کے بعد میں نے اپنی ''الجامع الصحیح للإمام البخاری مع حاشیۃ السہارنفوری'' جو پہلے ۱۵ جلدوں میں اور بعد میں ۶/جلدوں میں شائع ہوئی دونوں کتابیں ان کی خدمت میں بھجوائی اس پر بھی بہت پسندیدگی کا اظہار فرمایا، اسی طرح ہمارے دوست مولانا محمد یونس صاحب جون پوریؒ اسی میرے نسخۂ بخاری میں پڑھاتے تھے، اس سے میری بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔

اسی طرح مولانا کی کتابوں پر نظر ڈالنے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ منطق وفلسفہ، علم کلام پر بھی بڑی گہری نظر رکھتے تھے، مبادی الاصول جو فقہ کی بنیادی اصطلاحات پر مشتمل ہے معین الاصول اس کی شرح، آپ فتوی کیسے دیں؟ یہی نہیں بلکہ ان کی آسان صرف، آسان نحو، آسان منطق، آسان فارسی قواعد، مفتاح العوامل یہ وہ سارے رسائل ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی کتابوں کو پڑھاتے وقت انہوں نے طلبہ کو سامنے رکھ کر ان کو سہل بنا کر ان کے سامنے پیش کیا، دوسری طرف دورۂ حدیث کے طلبہ وعلماء کے لیے ایسی عظیم الشان کتابیں تالیف کیں جن کا ذکر اوپر کر چکا ہوں، تیسری طرف ان کی فتاوی پر بھی گہری نظر تھی، انہوں نے امداد الفتاوی میں بھی بڑا تعاون کیا۔

علامہ طاہر پٹنی کی کتاب ''المغنی'' کی بھی تحقیق وتعلیق کی ہے جو رجال کی اہم کتاب ہے، نیز فرق ضالہ کے رد میں بھی ان کی کئی کتابیں ہیں، رد قادیانیت پر بھی ان کا ایک قیمتی رسالہ ہے۔

گذشتہ سال سہارن پور حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تعزیت کے لیے میری سہارن پور حاضری ہوئی، وہاں سے دار العلوم دیو بند کی زیارت کے لیے حضرت مولانا مفتی ابو القاسم صاحب کی ضیافت میں دیو بند حاضر ہوا، حضرت مفتی صاحب تشریف لائے، انہوں نے تفسیر ''ہدایت القرآن'' کا نسخہ مجھے دیا، دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، میں نے عرض کیا کہ: حضرت! اللہ تعالی نے آپ سے حدیث شریف اور قرآن کریم کی خدمت اور فقہ وفتاوی میں بھی بڑا کام لیا، میں نے ان کو اپنے مدرسہ جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ آنے کی دعوت بھی دی اور ان سے اپنے کتب خانہ کا ذکر کیا، میں نے عرض کیا کہ ہمارے یہاں ایک لاکھ کتابیں ہیں جن میں بہت سے قلمی مخطوطات بھی ہیں، ہمارے مولانا یونس صاحبؒ کئی مرتبہ تشریف لائے اور وہ کتابوں کو دیکھتے ہی رہ گئے، مخطوطات کو بھی اور مطبوعات کو بھی انہوں نے بہت شوق کا اظہار کیا مگر مقدر سے اس کا موقع نہیں آیا۔

اس سے پہلے بنگلور میں مولانا مفتی شعیب اللہ خان صاحب کی دعوت پر جوان

کے مدرسہ میں بہت بڑا اجلاس ہوا تھا، اس میں انہوں نے بہت سے اکابر علماء کو مدعو کر رکھا تھا، اس ناچیز کو بھی مدعو کیا تھا، ایک دن مغرب بعد پروگرام میں ناچیز کا بیان بخاری شریف کے افتتاح کے موضوع پر رکھا تھا، میں نے ۴۰؍منٹ بیان کر کے اپنی بات ختم کر دی، اس کے بعد حضرت مولانا سعید صاحب کا بیان تھا، زندگی کے تجارب، طلبہ وعلماء کو نصائح، ان کا یہ بیان بہت قیمتی تھا طلبہ کے لیے بھی اور علماء کے لیے بھی اور عامۃ الناس کے لیے بھی، اس میں سب سے اہم بات یہ فرمائی کہ اپنے اکابر کے مسلک سے ہٹنا یہ بہت خطرناک ہے، اس پر قائم رہیں، اس سے وابستہ رہنا یہ بڑی سعادت مندی کی بات ہے۔

اللہ تعالی کی مرضی ان کا وقت آ گیا، لیکن انہوں نے ہزاروں شاگردوں کی تعداد چھوڑی اور اپنی تصانیف بھی آئندہ کے لیے چھوڑی ہیں جو قیامت تک باقی رہیں گی ان شاء اللہ تعالی۔

مفتی صاحب نے کثرت اولاد کے باوجود سب کو علماء بنایا خود کفیل بنایا، درس وتدریس کی جو خدمت انجام دی وہ للہ فی اللہ، مدرسوں کی تنخواہ سے اپنے آپ کو مستغنی رکھا، یہ درحقیقت ان کے شیخ اول حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن کے دامن فیض سے وہ وابستہ رہے کی برکت تھی، ان کے مسلک وطریقے کو اپنایا تھا۔

امسال دہلی شاہ ولی اللہ ایوارڈ کے لیے اس ناچیز کے پاس خط آیا کہ آپ کسی کا نام اس کے لیے پیش کریں، اس ناچیز نے حضرت مولانا ہی کا نام پیش کیا تھا، اگرچہ وہ جائزہ کے خواہشمند نہیں تھے لیکن جائزہ کے لیے شرف کی بات تھی کہ ان جیسے آدمی کی طرف اس کا انتساب ہو جائے۔

اس قحط الرجال کے دور میں ایسے عالم ربانی محدث وفقیہ واصولی ومتکلم کا اٹھ جانا بہت بڑا خسارہ ہے، خاص طور پر دار العلوم دیوبند جوام المدارس ہے، اللہ تبارک وتعالی ان کا بدل عطا فرمائے، بلاشبہ دار العلوم دیوبند کا قیام اللہ کے غیبی نظام کے تحت ہوا اور ایسی جگہ پر ہوا کہ حضرت سید احمد شہید قدس سرہ جہاد پر جاتے ہوئے دیوبند سے گزرتے ہوئے جب

اس زمین پر پہنچے جہاں آج دارالعلوم کی عمارت کھڑی ہے تو ٹھٹھک کر فرمایا کہ مجھے یہاں سے علم کی خوشبو آرہی ہے، بقول حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ دارالعلوم مشرق ومغرب کے مسلمانوں کے لیے ایک عدیم النظیر درس گاہ ہے جو اس دور تجدید میں بھی اسلاف کی امانت کو سنبھالے ہوئے ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ یہاں سے ایسے افراد پیدا ہوتے رہیں گے جو اس کی روایات وخصوصیات کو باقی رکھیں گے۔

خود حضرت مولانا کے شاگردوں میں ان کے دو بھائی صاحب اور ان کی اولاد اللہ کرے کہ انہی کے راستے پر چل کر روحانی وعلمی کمال حاصل کریں۔

ان کے انتقال سے ۳؍دن پیشتر اچانک میں نے ان کے ٹیلیفون پر خیرت معلوم کرنی چاہی تو ان کے صاحبزادے نے بتلایا کہ والد صاحب ممبئی ہیں اور بیمار ہیں، تفصیل کا ذکر نہیں کیا تھا، لیکن مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ شدید بیمار ہیں، دو دن کے بعد دوبارہ پھر فون کیا اس کے دوسرے روز اس حادثہ کو سن کر بہت رنج ہوا اور اپنے مدرسہ کے طلبہ واساتذہ کو خصوصی ایصال ثواب کی تاکید کی اور خود بھی ایصال ثواب کیا۔

حضرت مفتی صاحب کے لیے ایک بڑا سرمایہ ان کی اولاد ہے، ماشاء اللہ ۹؍بیٹے بقید حیات ہیں، سب حافظ قرآن ہیں، اکثر عالم ہیں، اسی طرح ان کی کئی بہوویں حافظ قرآن ہیں، یہ سن کر رشک آیا، ہمارے ۶؍اولاد نرینہ ہے افسوس کہ صرف ایک صاحب عالم ہو سکے اور ایک پوتے، ہمارے کاموں کو سنبھالنے والا کوئی نہیں، دیکھ کر رنج وغم ہو رہا ہے، یہ بہت بڑی ابتلا ہے، بے شک جامعہ اسلامیہ مظفر پور کی تعمیر، مرکز ابوالحسن ندوی کی تعمیر اور مؤلفات اللہ کرے کہ یہ ہمارے لیے سرمایۂ آخرت بنیں، اللہ تعالیٰ غیب سے انتظام فرمائے۔

ع آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

شیخ الحدیث مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ

ایک مردم ساز شخصیت....لاثانی مدرس...یکتا مصنف

مفتی عبدالرؤف صاحب غزنوی
استاذ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

(اقبالؒ)

بروز منگل ۲۵ ر رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹ ر مئی ۲۰۲۰ء صبح ساڑھے چھ بجے (بہ وقتِ ہندوستان) محدث جلیل، مفسّر نبیل، فقیہ ممتاز، عالم ربانی، مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے علوم کا مستند شارح اور مسلکِ دارالعلوم دیوبند کا صحیح ترجمان، حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند نے ممبئ شہر کے ایک ہسپتال میں تقریباً اسی سال کی عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ آپ کی وفات کی خبر نے صرف برّصغیر ہی میں نہیں؛ بلکہ پوری دنیا میں آپ کے پھیلے ہوئے بے شمار شاگردوں، متعلقین، محبین اور آپ سے براہِ راست یا بالواسطہ استفادہ کرنے والوں کو تڑپا دیا، جنہوں نے اپنے غمگین اور ٹوٹے ہوئے دلوں کے ساتھ تقدیرِ الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے ماہِ مبارک کے آخری بابرکت عشرے میں حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کے لئے خوب ایصالِ ثواب کیا اور مغفرت ورفعِ درجات کی دعائیں کیں اور ساتھ ساتھ انہوں نے حضرت قدس سرہٗ کے پسماندگان اور دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داران کی خدمت میں تعزیتِ مسنونہ پیش کی۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی کا ایک اجمالی خاکہ

حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ کی پیدائش خود ان کے اندازے کے مطابق ۱۹۴۰ء مطابق ۱۳۶۰ھ کو ہوئی ہے، جس کی صراحت انہوں نے ''ہدایت القرآن'' جلد ششم کی ابتداء میں ''احوال واقعی'' کے عنوان کے تحت فرمائی ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی علاقے میں اور متوسط درجات کی تعلیم ''مظاہر علوم'' سہارنپور میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے ۱۳۸۰ھ کو ''دارالعلوم دیوبند میں'' داخلہ لیا، جہاں ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء کو آپ نے دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کرتے ہوئے سالانہ امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ دوران تعلیم آپ کو اپنے تمام اساتذۂ کرام اور بالخصوص حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی صاحب قدس سرہٗ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی خصوصی توجہ وشفقت حاصل رہی۔

دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد تکمیل افتاء میں داخلہ لیا اور فتویٰ نویسی میں اتنی مہارت حاصل کرلی کہ دارالافتاء کے ذمہ داران نے تحریری طور پر آپ کی تقرری کی سفارش کی۔ ادھر آپ کے محترم استاذ ومربی حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی بھی یہی خواہش تھی کہ آپ کا تقرر دارالعلوم دیوبند ہی میں ہو، لیکن تقدیر خداوندی کچھ اور تھی اور آپ کا تقرر دارالعلوم دیوبند میں اس وقت نہ ہوسکا۔ اس موقع پر آپ کے محترم استاذ حضرت علامہ بلیاویؒ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے ایک مختصر اور پر اثر جملہ ارشاد فرمایا کہ: ''مولوی صاحب! گھبراؤ نہیں، اس سے اچھے آؤ گے!'' اور آپ کو اپنی دعاؤں اور نصیحتوں سے نوازتے ہوئے ''دارالعلوم اشرفیہ راندیر'' سورت جانے کا مشورہ دیا، جہاں درجۂ عُلیا کے مدرس کی حیثیت سے ۱۳۸۴ھ کو آپ کا تقرر عمل میں آیا۔

''دارالعلوم اشرفیہ'' میں آپ نے نو سال تک خدمت کی۔ ان نو سالوں میں اپنی خداداد ذہانت، عزم و ہمت، مسلسل محنت اور اللہ تعالیٰ کی خصوصی توفیق سے ایک طرف تو نہایت کامیابی کے ساتھ مختلف فنون اور حدیث کی کتابوں کو پڑھاتے رہے اور دوسری طرف اردو، عربی اور گجراتی زبان میں تصنیف وتالیف اور مضمون نویسی کا مشغلہ بھی جاری رکھا اور ہر

میدان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا، علمی حلقوں میں آپ کی شہرت اور طلبہ میں آپ کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی۔

آپ کی مقبولیت ومختلف صلاحیتوں کے پیشِ نظر حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ سابق رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کی تحریک پر ۱۳۹۳ھ کو آپ کا تقرر اپنی مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند میں ہوگیا، جہاں آپ کی صلاحیتوں کو پروان چڑھنے کا بھرپور موقع ملا اور آپ کے استاذ محترم ومربی حضرت مولانا علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ (متوفیٰ: ۱۳۸۷ھ) کا اگرچہ اس وقت انتقال ہوگیا تھا؛ تاہم ان کا مذکورہ بالا جملہ ''مولوی صاحب! گھبراؤ نہیں، اس سے اچھے آؤ گے'' پورے نو سال کے بعد ہو بہو ثابت ہوگیا۔

حضرت مفتی صاحبؒ اس وقت سے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک جو اَڑتالیس سال کا عرصہ ہے، اپنی مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند سے منسلک رہے، جہاں آپ نے نصاب کے اندر شامل، فقہ، اصولِ فقہ، منطق، فلسفہ، عقائد، مناظرہ، ادب، میراث، تفسیر، اصولِ تفسیر، حدیث اور اصولِ حدیث کی مختلف کتابیں نہایت کامیابی کے ساتھ پڑھائیں اور طلبہ میں آپ کی مقبولیت اس حد تک بڑھ گئی کہ جس کتاب کا سبق آپ سے متعلق ہو جاتا، اس کتاب کے طلبہ بے حد مطمئن ہو کر اپنے آپ کو سعادت مند تصور کرتے۔

آپ نے دارالعلوم دیوبند میں بھی تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا مشغلہ جاری رکھا۔ دارالعلوم دیوبند جیسے ادارے میں بنیادی اور محنت طلب کتابوں کی تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا مشغلہ جاری رکھنا اگرچہ کوئی آسان کام نہیں تھا، لیکن عزم وہمت کے اس پیکرِ مجسم نے مختصر عرصے میں تدریس کے ساتھ ساتھ اسلامی کتب خانے کو اپنی ایسی ضخیم اور تحقیقی تصانیف سے معمور کر دیا جن سے علم وتحقیق کے میدان سے وابستہ حضرات حیرت زدہ ہو کر رہ گئے؛ چنانچہ مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کی عدیم المثال تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی ایک محقق ومفصل شرح کی ضرورت ہمارے اکابرین کے دور سے محسوس کی جا رہی تھی؛ تاہم اس اہم تحقیقی کام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے

حضرت مفتی صاحبؒ ہی کو منتخب فرمایا اور آپ نے پانچ ضخیم جلدوں میں ''رحمۃ اللہ الواسعۃ'' کے نام سے اس کی شرح لکھی، جسے علمی حلقوں میں بڑی پذیرائی ملی۔

''رحمۃ اللہ الواسعۃ شرح حجۃ اللہ البالغۃ'' کی اہمیت کو دیکھ کر دارالعلوم دیوبند کی مؤقر مجلس شوریٰ منعقدہ ۱۳/۱۴/صفر ۱۴۲۵ھ نے ایک تحریری تجویز پاس کی، جس میں حضرت مفتی صاحبؒ کے اس علمی کارنامے کو پوری جماعت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کرنے کے مرادف قرار دیتے ہوئے آپ کو مبارکباد پیش کی گئی ہے۔ احقر کے ناقص علم کے مطابق اس سے قبل کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے کسی کتاب سے متعلق تحریری تجویز پاس کی ہو، جس میں مصنف کو ان کی تصنیف پر مبارکباد پیش کی گئی ہو۔ واللہ اعلم۔

''رحمۃ اللہ الواسعۃ'' کے علاوہ آپ نے آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ترمذی شریف کی شرح ''تحفۃ الالمعی شرح سنن الترمذی'' کے نام سے، بارہ ضخیم جلدوں پر مشتمل بخاری شریف کی شرح ''تحفۃ القاری شرح صحیح البخاری'' کے نام سے اور آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل قرآن کریم کی تفسیر ''ہدایت القرآن'' کے نام سے تحریر فرما کر یہ ثابت کر دیا کہ آج کے پر آشوب و پرفتن دور میں بھی حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، علامہ جلال الدین سیوطیؒ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسے مصنفین کے نقش قدم پر چلنے والے اور اپنے آپ کو علمی و تحقیقی کاموں کے لئے وقف کرنے والے افراد موجود ہیں۔

متعدد ضخیم جلدوں پر مشتمل مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ آپ نے اپنی زندگی کے آخری حصے میں ایک کارنامہ یہ بھی انجام دیا کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مایۂ ناز تفسیر ''بیان القرآن'' کے تسہیل نگار حضرت مولانا عقیدت اللہ قاسمی صاحب زید مجدہم کی خواہش اور حضرت مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب مدظلہم العالی مہتمم دارالعلوم دیوبند کے مشورے سے تسہیل کا مسودہ آپ ہی کے حوالے کیا گیا، جس پر آپ نے شروع سے آخر تک نظر ثانی فرما کر اس میں مفید ترمیمات، تسہیلات اور اضافے کر دیے اور پانچ جلدوں میں ''آسان بیان القرآن'' کے نام سے شائع فرما دیا، جس سے ''بیان القرآن'' کا سمجھنا آسان ہو گیا۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے مذکورہ بالا تصانیف کے ساتھ ساتھ مختلف علمی موضوعات سے متعلق دیگر تصانیف بھی تحریر فرمائی ہیں جن کی مجموعی تعداد مذکورہ بالا تصانیف کے ساتھ ملا کر چھیالیس بنتی ہے اور ہر ایک کتاب اپنی جگہ پر اہمیت رکھتی ہے، یہاں تک کہ ان میں سے بعض کتابیں تو دارالعلوم دیوبند اور ہندوستان کے بعض دیگر مدارس اور اسی طرح ''وفاق المدارس العربیہ پاکستان'' کے نصابِ تعلیم میں بھی شامل ہوگئی ہیں ۔ آپ کے ہونہار صاحبزادے جناب مولانا احمد سعید پالن پوری فاضل دارالعلوم دیوبند (استاذ حدیث جامعۃ الشیخ حسین احمد مدنی دیوبند) زیدمجدہم کے ایک مراسلہ کے مطابق حضرت مفتی صاحبؒ کی کل تصانیف کے مجموعی صفحات کی تعداد تینتیس ہزار چھ سو چوراسی (۳۳۶۸۴) تک جا پہنچتی ہے۔

حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ کی مختلف صلاحیتوں ،طلبہ میں بے پناہ مقبولیت، علمی حلقوں میں محبوبیت اور آپ کے تقویٰ وطہارت کے پیش نظر دارالعلوم دیوبند کی مؤقر و با اختیار مجلس شوریٰ نے ۱۴۲۹ھ کو جب حضرت الاستاذ مولانا نصیر احمد خان صاحب قدس سرہٗ سابق شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند نے بوجہ علالت و پیرانہ سالی دارالعلوم کی خدمت سے ازخود سبکدوشی کی درخواست کی، شیخ الحدیث وصدر المدرسین کے اعلیٰ منصب کے لئے آپ ہی کا انتخاب فرمایا، جس پر آپ اپنی وفات ۱۴۴۱ھ تک فائز رہے۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حضرت مفتی صاحبؒ کی چند خصوصیات

حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری قدس سرہٗ سے احقر کا تعلق رواں صدی ہجری کے پہلے سال ۱۴۰۱ھ سے لے کر آپ کے وصال ۱۴۴۱ھ تک پورے

چالیس سال پر محیط رہا ہے، شروع کے گیارہ سال کا عرصہ تو وہ ہے جس میں احقر طالب علم اور پھر مدرس اور مسجد قدیم دارالعلوم دیوبند کے امام وخطیب کی حیثیت سے دارالعلوم ہی میں مقیم رہا اور حضرت مفتی صاحبؒ سے قدم قدم پر بالمشافہہ استفادہ کرتا رہا۔ اس کے بعد آپ کے وصال تک جو مزید انتیس سال کا عرصہ بنتا ہے، اس میں احقر کی دیوبند سے کراچی منتقلی کی وجہ سے بالمشافہہ استفادہ کرنے کا موقع تو ہاتھ سے نکل گیا، الاّ یہ کہ وقفے وقفے سے چند دفعہ آپ کی خدمت میں حاضری اور براہ راست استفادہ کرنے کی سعادت پھر بھی میسر رہی تاہم باقی عرصے میں خط وکتابت اور فون کے ذریعے آپ سے استفادہ کرنے اور موقع بموقع راہنمائی حاصل کرنے کا سلسلہ آپ کے وصال تک اللہ کی توفیق سے قائم رہا اور آپ نے احقر کو کبھی بھی اپنے علمی افادات اور مفید مشوروں سے محروم نہیں فرمایا۔

اس طویل عرصے کے اندر حضرت الاستاذؒ کو قریب سے دیکھنے اور آپ کی خصوصیات سے واقف ہونے کا ایک بھرپور موقع اللہ تعالیٰ نے نصیب فرمایا۔ مذکورہ طویل واقفیت وتعلق کی روشنی میں احقر پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ کی زندگی کے ہر پہلو میں اہل علم وفضل کے لئے مفید سبق اور آپ کے متعلقین کے لیے نشان راہ اور قابل تقلید بلکہ قابل رشک عملی کردار کے نمونے ہیں۔ آپ کی خصوصیات میں سے چند ہی خصوصیات قارئین کرام کے فائدے کے لئے قلمبند کی جا رہی ہیں:

۱۔ تدریس وتالیف کے لئے مکمل یکسوئی کا اہتمام

حضرت الاستاذؒ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے مطالعہ وتدریس اور تحقیق و تالیف کے لئے مکمل یکسوئی اختیار فرماتے ہوئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ وہ غیر ضروری ملاقاتوں، عام اجتماعات میں شرکت کرنے اور تعلیمی ایام میں سفر کرنے سے، اس لئے اکثر معذرت ہی فرماتے تھے، تاکہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے مشغلے میں خلل واقع نہ ہو۔ فرماتے تھے کہ ایک سبق کا ناغہ چالیس دن کی برکت کو ختم کر دیتا ہے؛ تاہم سالانہ چھٹیوں میں بیرون ملک مقیم ان مسلمانوں کے اصرار پر جو حضرت والاؒ کے اصلاحی وعلمی بیانات کو اپنی

اور اپنی نئی نسل کی اصلاح کے لئے نہایت مفید اور ضروری سمجھتے تھے، برابر سفر فرماتے رہے اور ان کے عقائد و اعمال کی اصلاح کے لئے نہایت عام فہم اور مدلل انداز میں بیانات فرماتے رہے، جن سے ان کو دیارِ غیر میں رہتے ہوئے اپنے لیے لائحہ عمل طے کر لینے اور اپنے عقائد و اعمال کی حفاظت کرنے میں مدد ملتی رہی۔ آپ کے بیانات عام خطیبوں کی طرح جوشیلے نہیں ہوتے تھے؛ بلکہ تدریس کے انداز میں قرآن وسنت کی تعلیمات پر مبنی اور فقہاء و محدثین و اکابر دیوبند کی تشریحات کے مطابق ہوا کرتے تھے۔

احقر نے اپنی زندگی میں دو ایسی شخصیات دیکھی ہیں کہ عالمی شہرت ومقبولیت کی بلندیوں تک پہنچنے کے باوجود ان کے علمی و تحقیقی مشاغل میں کوئی فرق نہیں آیا اور انہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو غیر علمی مشاغل سے دور رکھا۔ ایک شخصیت ممتاز عالم دین و محدث کبیر حضرت الاستاذ الشیخ عبدالفتاح ابوغدہ حلبی شامی قدس سرہٗ کی تھی جن سے ’’جامعۃ الملک سعود ریاض سعودی عرب‘‘ میں احقر نے پڑھا اور دوسری شخصیت حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری برد اللہ مضجعہ کی تھی جن سے احقر نے دارالعلوم دیوبند میں پڑھا اور پھر طویل عرصے تک استفادہ بھی کرتا رہا۔

عصر حاضر میں ایک عام مشاہدہ یہ رہا ہے کہ جب بعض علمی شخصیات کو شہرت و مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے اور اندرونِ ملک و بیرون ملک بے شمار لوگ ان کے بن جاتے ہیں، تو پھر ان کے لئے تقریبات واجتماعات میں شرکت سے معذرت کرنا، یا ان کی دعوت پر سفر سے اجتناب کرنا یا اسی طرح دینی و علمی اداروں میں انتظامی مناصب کی پیشکش کو رد کرنا ان کے لئے امتحان بن جاتا ہے اور بالآخر ان میں سے اکثر حضرات مذکورہ غیر تعلیمی سرگرمیوں میں ایک حد تک مشغول ہو ہی جاتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے علمی و تحقیقی کاموں کی رفتار میں ترقی کے بجائے سستی پیدا ہو جاتی ہے؛ لیکن کچھ حضرات اتنے باہمت و پرعزم اور اپنی علمی و تحقیقی مصروفیات میں اتنے مگن ہوتے ہیں کہ اپنی علمی مصروفیات کے مقابلہ میں کسی بھی ترغیب و مصلحت کا شکار نہیں ہوتے ہیں، ان ہی حضرات میں سے احقر کی

نظر میں ایک حضرت الاستاذ الشیخ عبد الفتاح ابو غدہؒ اور دوسرے حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ بھی تھے۔

۲۔ عزم و ہمت اور مسلسل محنت

حضرت والا قدس سرہٗ کی دوسری خصوصیت ان کی مسلسل محنت اور غیر معمولی عزم و ہمت تھی۔ آپ ایک طرف تو دار العلوم دیو بند میں ایک کامیاب و مقبول ترین مدرس کی حیثیت سے مختلف کتابیں پڑھاتے رہے، یہاں تک کہ شیخ الحدیث وصدر المدرسین کے اعلیٰ منصب پر آپ کو فائز کر دیا گیا، ادھر آپ اپنے بچوں کو جن کی تعداد بحمد اللہ ایک درجن سے زائد تھی، خود ہی حفظ قرآن اور ابتدائی کتابوں کی تعلیم اور خوشخطی کی مشق کراتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے مجموعی طور پر تینتیس ہزار چھ سو چوراسی (۳۳۶۸۴) صفحات پر مشتمل ایسی علمی و تحقیقی چھیالیس کتابیں بھی تصنیف فرمائیں جن کی تفصیل اوپر عرض کی جا چکی ہے۔ مذکورہ تمام علمی مشاغل کے باوجود عام مسلمانوں کی اصلاح کا جذبہ دل میں لیے ہوئے ایامِ تعطیل میں اندرون ملک و بیرونِ ملک آپ کے اصلاحی بیانات بھی ہوتے رہے، جن سے بے شمار خواص و عوام فیض حاصل کرتے رہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ قدس سرہٗ کے یہ تمام علمی کارنامے درحقیقت علومِ دینیہ سے ان کی اس سچی محبت کے کرشمے ہیں جو ان کے دل میں موجزن تھی۔ وہ ایسی محبت تھی جو منزلِ مقصود کی طرف گامزن ہو کر راستے کی مشقتوں کو نہ صرف یہ کہ برداشت کر لیتی تھی؛ بلکہ ان مشقتوں کو بھی اپنی منزلِ مقصود کا حصہ سمجھتی تھی ایسی ہی محبت کے بارے میں کسی شاعر نے کہا ہے:

رہ رواں را خستگی راہ نیست   عشق خود راہ است ہم خود منزل است

ترجمہ ومفہوم: ”منزلِ مقصود کی طرف جانے والا مسافر راستے کی مشقتوں سے پریشان نہیں ہوتا، کیوں کہ سچی محبت کی نظر میں منزلِ مقصود کا راستہ بھی منزلِ مقصود ہی کی طرح دلچسپ ہوتا ہے۔“

حضرت مفتی صاحبؒ کی تمام تصانیف اگر شائع شدہ نہ ہوتیں اور ان کی مذکورہ دیگر علمی مصروفیات کے لاتعداد چشم دید گواہ آج (ماہِ شوال ۱۴۴۱ھ) تک موجود نہ ہوتے تو شاید قارئین کرام کو یہ شبہ ہوجاتا کہ مضمون نگار اپنی عقیدت مندی میں حدِّ اعتدال سے آگے نکل چکا ہے؛ اس لئے کہ سہولت پسندی اور راحت طلبی کے موجودہ عصر میں کسی ایک ہی فرد کا بیک وقت اتنا ہی زیادہ علمی کام کرنا بظاہر ناممکن ہے۔

راقم الحروف جب بھی حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کی علمی مصروفیات ومحنتوں پر غور کرتا ہے تو یہ محسوس کرلیتا ہے کہ انہوں نے صحیح معنوں میں مندرجہ ذیل مشہور مقولے کا تقاضا پورا کیا ہے:

”العلم لایعطیك بعضه حتیٰ تعطیه كلك“ یعنی علم اپنی ذات میں سے کچھ بھی اس وقت تک تمہیں نہیں دے گا جب تک تم اپنی پوری ذات اسے نہیں دو گے۔“

عام طور پر لوگ مذکورہ بالا مقولے کا مخاطب طالب علم ہی کو قرار دیتے ہیں، جب کہ حضرت الاستاذؒ نے اپنے عمل سے یہ ثابت کردیا تھا کہ اس کا مخاطب خود مدرس بھی ہے۔

طلب علم کے لئے آپ کی قربانی کا ایک واقعہ

حضرت مفتی صاحبؒ کے عزم وہمت اور طلب علم کے لئے ان کی قربانی کا ایک واقعہ یاد آیا: ایک دفعہ احقر ان کی اجازت سے ان کے ذاتی کتب خانہ میں مطالعہ کررہا تھا، اس دوران ایک پرانی سی کتاب نکالی، جس کے سرورق پر حضرت الاستاذؒ کے قلم سے ان کے زمانۂ طالب علمی کا ایک فقرہ لکھا ہوا تھا، جس کا مفہوم یہ تھا کہ: ”والدہ محترمہ نے گاؤں سے کسی کے ساتھ میرے لئے گھی بھجوایا تھا، اسے بیچ کر میں نے یہ کتاب خرید لی۔“

اللہ اکبر! غور کیا جائے، آج کل کے طالب علم کے پاس اگر کتاب خریدنے کے لئے گھر والے پیسے بھیجتے ہیں تو وہ اسے کھانے پینے پر خرچ کردیتا ہے؛ لیکن حضرت مفتی صاحبؒ نے بہ زمانۂ طالب علمی جو خالص کھانے کی چیز تھی اور وہ بھی والدہ محترمہ کے ہاتھ کی بھیجی ہوئی اسے بیچ کر کتاب پر خرچ کیا۔

ببیں تفاوتِ راہ از کجا است تا بہ کجا

۳۔ افہام و تفہیم کا منفرد وسیلہ

راقم الحروف کو اپنی بے بضاعتی اور تہی دامنی کا پورا احساس و اعتراف ہے؛ لیکن یہ ایک تقدیری بات ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے طلبِ علم کی غرض سے چار مختلف ملکوں (افغانستان، پاکستان، ہندوستان اور سعودی عرب) کے بعض ایسے مایۂ ناز اہل سے استفادہ کیا ہے اور ان کے پاس پڑھا ہے جن کی نسبت اس کے لئے موجبِ سعادت و باعث افتخار ہے۔ میں اس وسیع واقفیت کی بناپر (جو میرا ذاتی کمال نہیں) شرح صدر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت والا کے افہام و تفہیم کا انداز ان سب سے منفرد اور ممتاز تھا۔ مشکل سے مشکل بحث ایسی ترتیب وعمدہ انداز سے بیان فرماتے تھے کہ اعلیٰ تو درکنار ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم کے لئے بھی سمجھنا آسان ہوجاتا اور مجھے یاد ہے کہ کبھی آپ دوسرے اساتذۂ کرام کے اسفار کی وجہ سے دو تین گھنٹے مسلسل پڑھاتے اور تمام طلبہ ہمہ تن گوش ہوکر سنتے اور ”کان علی رؤوسھم الطیر“ کا مصداق بن کر آپ کی علمی تحقیقات سے مسلسل کئی گھنٹوں تک انہماک کے ساتھ استفادہ کرتے رہتے۔

٤-تربیت و مردم سازی

حضرت الاستاذؒ کی تربیت اور مردم سازی کا انداز بھی نرالا تھا۔ وہ خود بھی ہمیشہ اپنے علمی، تصنیفی اور اصلاحی کاموں میں مصروف اور غیر ضروری ملاقاتوں اور ملنے جلنے سے دور نظر آتے تھے اور اپنے شاگردوں اور متعلقین کو بھی اسی کی تلقین کرتے تھے:

گرت ہوا است کہ باخضر ہم نشیں باشی

نہاں زچشمِ چو آب حیوان باش

ترجمہ و مفہوم: ”اگر تمہیں خضر کے ہم نشیں ہونے کا شوق ہے، تو سکندر (دنیا اور اہل دنیا) کی نگاہوں سے آبِ حیات کی طرح پوشیدہ رہو۔“

راقم نے دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ قیام میں اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ جن اساتذہ یا طلبہ کو حضرت والاؒ سے قرب و تعلق کی سعادت نصیب ہوئی، اللہ تعالیٰ نے ان کو ترقیوں سے نوازا اور انہیں استغناء، علمی انہماک، اعلیٰ ہمتی اور دنیوی زندگی کی پرخار وادیوں کو عبور کرنے کی صلاحیت عطا فرمائی۔ حضرت الاستاذ کی مردم سازی کے چند واقعات نمونے کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں:

آپ کی مردم سازی کا پہلا واقعہ

تعلیمی سال ۱۴۰۲ھ-۱۴۰۳ھ کے درمیان میں جب احقر کا دارالعلوم دیوبند میں مدرس کی حیثیت سے تقرر ہوا، تو اس وقت کے ناظم تعلیمات حضرت الاستاذ مولانا ریاست بجنوریؒ نے دفتر تعلیمات بلا کر مجھے دیے جانے والے اسباق سے متعلق میری رائے معلوم کی۔ میں چونکہ نیا نیا فارغ التحصیل تھا اور تدریس کے میدان میں پیش آنے والی مشکلات کا کوئی اندازہ یا تجربہ نہیں تھا، عمر بھی صرف بیس سال کے لگ بھگ تھی، ادھر شاید دماغ اس زعم میں بھی مبتلا تھا کہ ایک طرف میں نے دورۂ حدیث میں پہلی پوزیشن حاصل کی ہے اور دوسری طرف درسِ نظامی کے موجودہ نصاب میں شامل مروجہ کتابوں کے علاوہ منطق و فلسفہ اور دیگر فنون کی کچھ ایسی کتابیں بھی اپنے علاقے کے جید الاستعداد علماء کے پاس پڑھی ہیں جو آج کل کم ہی پڑھائی جاتی ہیں، لہٰذا درس نظامی کی کوئی بھی کتاب ان شاء اللہ میرے لئے مشکل نہیں ہوگی۔ بہر صورت! ناتجربہ کاری؛ بلکہ نادانی پر مبنی مذکورہ بالا زعم کے تحت میں نے حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوریؒ سے جواباً عرض کیا: حضرت! آپ جو بھی اسباق سپرد فرمائیں گے، میں ان شاء اللہ پڑھاؤں گا۔ نہ تو ابتدائی درجات کے اسباق سے مجھے کوئی دل شکنی ہوگی اور نہ ہی کچھ اوپر کے درجات کے اسباق سے گھبراہٹ ہوگی۔ میرا جواب سن کر حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ نے ''ملا حسن''، ''میبذی'' اور دو کتابیں ان کے علاوہ جن کے نام یاد نہیں رہے، مجھ سے متعلق کر کے اپنے پاس نوٹ کر لیں؛ تاکہ آگے ان کا اعلان آویزاں کیا جائے۔ میں دل دل میں خوش ہو رہا تھا کہ مجھے تو ابتداء ہی سے ترقی

ملنے لگی۔ اتفاق سے اسی وقت اچانک حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ دفتر تعلیمات تشریف لائے اور مجھے ناظم تعلیمات حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ کے پاس دیکھ کر اندازہ لگایا کہ انہوں نے مجھے اسباق کے سلسلے میں بلایا ہوگا، تو ناظم تعلیمات صاحبؒ سے دریافت فرمانے لگے کہ اس کو کون سے اسباق دے دیئے؟ حضرت ناظم صاحبؒ فرمانے لگے کہ اس کی رائے دریافت کرنے کے بعد میں نے مذکورہ بالا اسباق اس کے نام لکھ دیئے ہیں۔ مفتی صاحبؒ نے شدّت کے ساتھ اختلاف کرتے ہوئے فرمایا کہ ابھی سے یہ کتابیں اس کو ہرگز نہ دیں، ورنہ آگے چل کر یہ کامیاب مدرس نہیں بن سکے گا۔ مناسب یہ ہوگا کہ سال اول میں ''نحو میر''، سال دوم میں ''علم الصیغہ''، سال سوم میں ''شرح تہذیب'' اور سال چہارم میں ''اصول الشاشی'' یا سلم العلوم'' کے اسباق اس کو دے دیئے جائیں۔ پھر مجھے مخاطب بنا کر فرمایا:

''مولوی صاحب! دو باتیں سمجھ لو! ایک بات تو ہے کتاب کو سمجھنا اور دوسری بات ہے کتاب کو سمجھانا، کتاب سمجھانے کے لئے صرف اس کا سمجھنا کافی نہیں ہوتا؛ بلکہ مدرس کو سخت محنت اور ابتدائی درجات سے پڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے، تب جا کر وہ کامیاب مدرس بن سکتا ہے، تمہارا یہ خیال کہ جو کتاب میں خود سمجھ رہا ہوں وہ طالب علم کو بھی بہ آسانی سمجھا سکوں گا' غلط ہے۔''

حضرت ناظم تعلیمات صاحبؒ چونکہ حضرت مفتی صاحبؒ کی رائے کو بہت اہمیت دیتے تھے، اس لیے ان سے اتفاق کرلیا اور ان ہی کے بتائے ہوئے اسباق میرے نام کردیئے۔ مجھے بھی اپنی ناتجربہ کاری کا اندازہ ہوگیا اور دونوں کے اتفاق سے جو اسباق طے ہوگئے تھے اپنے لیے سعادت سمجھ کر شروع کرادیئے۔ اسباق شروع کرادینے کے بعد بہت جلد اندازہ ہونے لگا کہ حضرت مفتی صاحبؒ کا مشورہ میرے حق میں بے حد مفید رہا اور یقیناً خالی الذہن طلبہ کو سمجھانے کے لئے بڑی محنت اور تیاری کی ضرورت ہوتی ہے اور اس بات کا بھی یقین ہوگیا کہ اگر میں ابتداء ہی سے اوپر کی کتابیں لے لیتا تو بڑی مشکل میں پھنس جاتا۔

مردم سازی کے جذبات پر مبنی حضرت مفتی صاحبؒ کی مندرجہ بالا نصیحت و مشورے کا فائدہ آج تک محسوس کرتا رہتا ہوں اور فارغ ہونے والے طلبہ کو بھی ہر سال کے آخر میں اسی کی روشنی میں یہ مشورہ دیتا رہتا ہوں کہ کامیاب مدرس بننے کے لئے ابتدائی کتابوں سے تدریس کا آغاز کیجئے اور پھر بتدریج اوپر جانے کی کوشش کیجئے۔ اگر کوئی شخص شروع ہی سے اوپر کی کتابیں لینے کی کوشش کرتا ہے تو وہ مقبول مدرس نہیں بن سکتا، مولانا جلال الدین رومیؒ نے خوب کہا ہے:

مرغ پَر نارُستہ چوں پرّاں شود
طعمۂ ہر گربۂ درّاں شود

ترجمہ ومفہوم: ”پر نکلنے سے پہلے جو چوزہ اڑنے کی کوشش کرتا ہے، وہ پھاڑنے والی بلی کا لقمہ بن جاتا ہے۔“

حضرت مفتی صاحبؒ کی مردم سازی کا دوسرا واقعہ

دارالعلوم دیوبند میں مدرس کی حیثیت سے احقر کی تقرری کے بعد کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ امتحان ہال (دارالحدیث تحتانی) میں تحریری امتحان ہو رہا تھا اور مدرسین حضرات نگرانی فرما رہے تھے، میں بھی ایک حلقے کی نگرانی پر مامور تھا، اس دوران مجھے اپنے حلقے کے اندر یہ محسوس ہوا کہ امتحان میں شریک دو طالب علم آپس میں گفتگو کر رہے ہیں، میں نے اپنی ناتجربہ کاری اور فطری تیز مزاجی کے تحت کچھ سخت لہجے میں ان کی سرزنش کی، مجھے یہ اندازہ بھی نہیں ہوا کہ حضرت الاستاذؒ نے مجھے ان طلبہ کی سرزنش کرتے ہوئے دیکھا ہے؛ کیوں کہ وہ ایک دوسرے حلقے میں گشت فرما رہے تھے؛ لیکن آپ نے اپنی دور بین نگاہوں سے مجھے دیکھ لیا تھا؛ چنانچہ آہستہ آہستہ گشت کرتے ہوئے میرے حلقے کی طرف تشریف لائے اور مجھے ایک طرف کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ ذیل حدیث جو امام مسلم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت نقل کی ہے، سنائی:

"ان الرفق لایکون فی شئی الازانه ولاینزع من شئی الاشانه۔"

بے شک نرمی ایک ایسی چیز ہے کہ جب وہ کسی معاملے میں شامل ہوجاتی ہے تو اس کو خوبصورت بنادیتی ہے اور اگر اسے کسی معاملے سے الگ کردیا گیا ہو تو وہ معاملہ بگڑ جاتا ہے۔''

حدیث سنانے کے بعد حضرت الاستاذؒ نے فرمایا کہ: ''دیکھو! یہ بات تو اپنی جگہ پر درست ہے کہ استاذ کا رعب ووقار طلبہ کے ذہنوں میں قائم رہنا چاہیے اور وہ طلبہ کے ساتھ اتنا بے تکلف نہ ہو جس سے اس کا رعب ووقار جاتا رہے؛ لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ بلاضرورت سخت لہجہ یا سخت رویہ اختیار کرنا، استاذ وشاگرد کے درمیان قائم شفقت وعقیدت کے اس رشتے کے لئے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے، جس کا برقرار رہنا ضروری ہوتا ہے، جب کہ نرمی ورحم دلی اس رشتے کو مزید مضبوط بنادیتی ہے۔''

راقم الحروف کا مزاج فطری طور پر کچھ تیز واقع ہوا ہے؛ البتہ حضرت الاستاذ کی مذکورہ بالا نصیحت کا یہ اثر اس وقت سے آج تک محسوس کرتا ہوں کہ جب بھی کسی معاملے میں تیز مزاجی کا غلبہ ہونے لگتا ہے تو حضرت والا کی نصیحت یاد آتی ہے اور نرمی اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور اگر بروقت نرمی اختیار نہ کرسکا تو پھر ندامت وشرمندگی ضرور ہوتی ہے جو آئندہ کے لئے نرمی اختیار کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

حضرت الاستاذؒ کی مردم سازی کا تیسرا واقعہ

دارالعلوم دیوبند کے اسلاف واکابر کی طرح حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری قدس سرہٗ کی تربیت ورجال سازی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے شاگردوں کی پوشیدہ صلاحیتوں کو تلاش کرتے ہوئے ابھارنے اور بروئے کار لانے کی کوشش فرماتے تھے اس سلسلے کا ایک واقعہ سپرد قلم کیا جارہا ہے:

دارالعلوم دیوبند میں مدرس کی حیثیت سے جب احقر کا تقرر عمل میں آیا، تو دارالعلوم کے نظام کے مطابق تدریس کے ساتھ ساتھ دارالاقامہ کے ایک حلقے کی نظامت

بھی مجھ سے متعلق کر دی گئی، کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اپنے حلقے کے بعض انتظامی امور سے متعلق ایک مفصل تحریر میں نے حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے نام لکھی۔ میری اردو زبان چوں کہ کافی کمزور تھی؛ اس لئے مجھے اپنی اس ٹوٹی پھوٹی تحریر پر دل میں شرم بھی محسوس ہو رہی تھی کہ پتہ نہیں میری تحریر کا مقصد حضرت مہتمم صاحب کے سامنے واضح بھی ہو سکے گا یا نہیں؟ بہر صورت! اسی تردد کے ساتھ ہی میں نے اپنی تحریر پیش کار صاحب کے پاس جمع کرادی؛ تا کہ وہ مناسب وقت میں اسے حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں پیش کر دیں۔

اتفاق سے جس وقت میری مذکورہ تحریر پیش کار صاحب کے ذریعہ حضرت مہتمم صاحبؒ کے سامنے پیش ہو رہی تھی اس وقت حضرت مفتی صاحبؒ بھی وہاں موجود تھے اور انہوں نے بھی اسے ملاحظہ فرمایا تھا، جس کا مجھے کوئی پتہ نہیں چل سکا تھا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ نے ایک مناسب موقع پر مجھ سے فرمایا کہ؛ تمہارے اندر لکھنے کی صلاحیت موجود ہے تم اپنی اس صلاحیت سے کام لیتے ہوئے کچھ نہ کچھ لکھنے کا سلسلہ شروع کرو۔ میں حیران ہو گیا کہ میں نے آج تک نہ تو کوئی رسالہ لکھا ہے اور نہ ہی کسی مقالہ نویسی یا مضمون نگاری میں کوئی دلچسپی لی ہے اور نہ ہی اپنے اندر لکھنے کی ہمت محسوس کرتا ہوں، پتہ نہیں حضرت الاستاذ کس بنیاد پر میرے اندر لکھنے کی صلاحیت کا تذکرہ فرما رہے ہیں؟ میں اسی سوچ میں تھا کہ حضرت نے اگلا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ: کچھ عرصہ قبل تم نے مہتمم صاحب کے نام دارالاقامہ کے انتظامی امور سے متعلق جو ایک تحریر لکھی تھی وہ مہتمم صاحب نے مجھے بھی دکھائی تھی، جس سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ تمہارے اندر لکھنے کی صلاحیت موجود ہے، لہذا تم اس صلاحیت کو ضائع مت کرنا۔

حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری قدس سرہٗ کی مذکورہ بالا قیمتی نصیحت پر اگر چہ اپنی غفلت کی وجہ سے میں مکمل طور پر عمل پیرا نہ ہو سکا تاہم اس کی برکت سے میں نے اپنے اندر اتنی ہمت ضرور محسوس کی ہے کہ اس وقت سے آج تک اللہ کی توفیق سے

کچھ نہ کچھ کبھی تو عربی زباں میں اور کبھی اردو زباں میں لکھنے کی نوبت پیش آتی رہتی ہے۔

۵- دینی حمیت و حق گوئی

مصلحت پسندی کے موجودہ دور میں حضرت الاستاذؒ کی ایک خصوصیت ان کی دینی حمیت وحق گوئی تھی۔ وہ خلاف شریعت کسی عمل پر خاموشی اختیار کرنے کے قائل نہیں تھے۔ اپنے اکابر کے مسلک سے ہٹ کر عصر حاضر کے تقاضوں کے بہانے سے اگر کسی کی کوئی رائے سامنے آتی تو آپ مدلل اور پرزور انداز میں اس کی تردید فرماتے۔ دینی یا سیاسی جلسوں میں تصویر کشی کا مسئلہ ہو یا جاندار کی تصویر کے ساتھ سوشل میڈیا اور ٹی وی پر تبلیغ دین کا موضوع ہو، مزارات پر کتبے لگانے کا سلسلہ ہو یا مدارس دینیہ کے اندر مروجہ حیلۂ تملیک کا مسئلہ ہو، یا ان سے ملتے جلتے کچھ دیگر ایسے مسائل ہوں جن میں قرآن وسنت کی تعلیمات اور اپنے اکابر کے مسلک سے ہٹ کر تساہل سے کام لیا جا رہا ہو، آپ مضبوط دلائل کی روشنی میں ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر ان امور کی مخالفت فرماتے۔ آپ کی بعض آراء سے کچھ اہل علم حضرات اگر اتفاق نہ بھی کرتے، تب بھی اس بات کا اعتراف وہ ضرور کرتے کہ آپ ایک حق گو اور صاف گو عالم دین ہیں، جو کچھ فرماتے ہیں دینی حمیت کے تحت فرماتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ آپ حق گوئی میں شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کے مندرجہ ذیل شعر کے مصداق تھے:

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

احقر کے اوپر حضرت الاستاذؒ کے بے شمار احسانات

رواں پندرہویں صدی ہجری کے پہلے سال ۱۴۰۱ھ کو احقر بے سروسامانی کی حالت میں دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کے طالبِ علم کی حیثیت سے داخل ہوا۔ ظاہری بے سروسامانی، غریب الوطنی اور مقامی زبان سے ناواقفیت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اتنے انعامات سے نوازا جن کا تصور بھی مجھ جیسا تہی دامن و بے حیثیت طالب علم

نہیں کرسکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے انعامات میں سے ایک اہم انعام یہ تھا کہ اس نے میرے اساتذۂ کرام اور بالخصوص حضرت مفتی صاحبؒ کی خصوصی شفقتیں میری طرف متوجہ کرادیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے جہاں دارالحدیث میں اپنے دوسرے شاگردوں کے ساتھ ساتھ احقر کو بھی حدیث کی متعدد کتابیں پڑھائیں، وہاں اپنے خارجی اوقات میں نظام الاوقات کی رعایت کے ساتھ حاضر خدمت ہونے اور استفادہ کرنے کی خصوصی اجازت سے بھی نوازا۔ احقر کو دوران مطالعہ جو اشکالات درپیش ہوتے، ان کو خدمت میں جا کر پیش کرتا اور آپ نہایت توجہ کے ساتھ سماعت فرماتے اور اطمینان بخش جوابات سے نوازتے۔

اشارہ بالسّبابہ کے مسئلے میں راہنمائی

احقر نے فقہ کی کتابیں اپنے علاقے کے علمائے کرام سے پڑھی تھیں، وہ علمائے کرام تشہد کے وقت اشارہ بالسبابہ کے قائل نہیں تھے اور دلیل میں بعض فقہائے احناف کی عبارتیں اور بالخصوص حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے ایک مفصل مکتوب کو پیش کرتے تھے جس میں اشارہ بالسبابہ کی حدیث میں تاویل کرتے ہوئے فقہ حنفی کی مختلف کتابوں کے حوالوں کے ساتھ اس اشارے کو منع کیا گیا ہے۔ (مکتوبات امام ربانی، دفتر اول، مکتوب نمبر: ۳۱۲)

دارالعلوم دیوبند جانے سے قبل جہاں احقر نے درجہ موقوف علیہ پڑھتے ہوئے مشکوٰۃ شریف میں اپنے استاذ کے پاس اشارہ بالسبابہ والی حدیث پڑھی اور استاذ محترم نے اس حدیث کی روشنی میں اشارہ بالسبابہ کو سنت قرار دیا، تو میں نے طالب علمانہ اشکال پیش کرتے ہوئے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مذکورہ مکتوب اور اس میں درج شدہ تحقیق کا حوالہ دیا اور اس کا جواب اپنے استاذ محترم سے چاہا استاذ محترم نے جواب دینے اور مجھے سمجھانے کی کوشش فرمائی؛ لیکن میرے ذہن میں اس جواب سے متعلق مزید اشکالات پیدا ہوتے رہے اور یاد پڑتا ہے کہ سوال وجواب کا سلسلہ چند دنوں تک جاری رہا؛ لیکن میری محرومی تھی کہ میں پھر بھی مطمئن نہ ہوسکا۔

اگلے سال جب دار العلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کے طالب علم کی حیثیت سے احقر کو داخلہ ملا اور وہاں کے مایۂ ناز محدثین حضرات کے پاس حدیث پڑھنے کا موقع میسر ہوا تو حضرت الاستاذ مفتی سعید صاحب پالن پوریؒ نے حدیث کی متعدد کتابیں پڑھائیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے پاس پہلی بار جب اشارہ بالسبابہ والی حدیث پڑھنے کا موقع ملا تو احقر نے یہاں بھی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مذکورہ مکتوب کے حوالے سے اشکال پیش کیا، حضرت الاستاذ نے اس مسئلے کو تفصیل طلب قرار دیتے ہوئے سبق کے بعد اپنی رہائش گاہ پر مجھے ملنے کا حکم دے دیا۔

جب مقررہ وقت پر احقر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے اطمینان کے ساتھ میرا اشکال سنا اور پھر خداداد صلاحیت اور بے نظیر اندازِ تفہیم کے ذریعہ محققینِ احناف اور اکابرِ دیوبند کا مسلک بیان کرتے ہوئے مذکورہ مکتوب کا ایسا محققانہ جواب پیش فرمایا جس سے میرا ذہن بالکل مطمئن ہو گیا اور صرف یہی نہیں کہ میں نے اگلی ہی نماز میں اشارہ بالسبابہ کی سنت پر عمل شروع کیا؛ بلکہ آگے چل کر اللہ کی توفیق سے اپنے علاقے کے دوسرے بے شمار لوگوں کو بھی اس سنت پر عمل کرنے کے لئے آمادہ کرتا رہا اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

امامت و تدریس میں ان کی راهنمائی

احقر کو دورۂ حدیث کے سال دار العلوم دیوبند کی مسجد میں امامت و خطابت کی ذمہ داری اور فراغت کے بعد تدریس کی ذمہ داری بھی سپرد کر دی گئی۔ ان دونوں میدانوں میں اپنے تمام اساتذۂ کرام اور بالخصوص حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ کی راہنمائی قدم قدم پر شامل حال رہی۔ ان کی خصوصی توجہات و شفقتوں کی برکت سے مجھ جیسا مغفل و تہی دامن شخص بھی ایک طرف تو نحو میر سے تدریس کا آغاز کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور آج دورۂ حدیث کی کتابیں پڑھا رہا ہے اور دوسری طرف ایک بڑی مسجد میں امامت و خطابت کی ذمہ داری بھی انجام دے رہا ہے۔ اگر ان کی خصوصی عنایات و توجہات اور مبارک دعائیں شامل حال نہ ہوتیں تو بظاہر ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔

حفظ قرآن میں احقر کے اوپر حضرت مفتی صاحبؒ کا عظیم احسان

اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند ہی میں مدرس کی حیثیت سے احقر کا تقرر ہوا۔ تدریس کے دوران میں نے محسوس کیا کہ مدرس اگر حافظِ قرآن نہ ہو تو تدریس میں اسے دقت پیش آتی ہے، اس کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے ماحول میں حفاظِ قرآن کی کثرت کو دیکھ کر بھی حفظِ قرآن کا ایک ولولہ دل میں پیدا ہو چکا تھا، لہذا دل نے چاہا کہ تدریس اور مسجد دارالعلوم کی امامت اور دارالاقامہ کے ایک حلقہ کی نظامت کے ساتھ ساتھ خارجی وقت میں حفظِ قرآن شروع کروں۔ البتہ مذکورہ بالا مصروفیات کے باوجود حفظِ قرآن میں لگنا کوئی آسان کام نہیں تھا؛ اس لئے حسبِ معمول حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری قدس سرہٗ کی خدمت میں مشورہ کرنے کے لیے ان کی رہائش گاہ پر حاضر ہوا اور حفظِ قرآن کے لئے اپنی رغبت و ارادے کا اظہار کیا۔

حضرت الاستاذؒ نے ہمت افزائی فرماتے ہوئے میرے ارادے کی تائید فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ تم نے بہت عمدہ سوچا ہے؛ لیکن اس عمر میں مذکورہ بالا مصروفیات کے باوجود حفظِ قرآن کے لئے ایک پختہ نظام الاوقات بنانے، مسلسل محنت اور وقت کی پابندی کی سخت ضرورت ہوگی۔ اگر تم مذکورہ تین شرائط کو بجالانے کے لیے تیار ہو تو میں خود ہی روزانہ سبق اور آموختہ متعین اوقات میں سن لیا کروں گا اور تجھے اللہ کی توفیق سے حافظِ قرآن بنادوں گا۔

میں چونکہ صرف مشورہ کرنے کے لئے حضرت والاؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز استاذِ حدیث اپنی گوناگوں علمی مصروفیات کے باوجود اس حقیر کو اپنی اولاد کا درجہ دے کر اس کے لئے روزانہ وقت نکالیں گے! اس لیے میں نے عرض کیا کہ: حضرت والا! میں تو صرف مشورہ کے لئے حاضر ہوا تھا؛ لیکن آپ نے میرے ساتھ اتنا بڑا احسان کا معاملہ فرمایا جو میرے تصور میں بھی نہ تھا لہذا میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ آپ نے جن تین شرائط کی نشاندہی فرمائی ہے، میں اللہ

کی توفیق سے تینوں کی مکمل پابندی کروں گا۔ حضرتؒ نے فرمایا: جاؤ اور آج ہی سے قرآن کی آخری منزل سورۂ ''ق'' سے حفظ کرنا شروع کرو اور کل فلاں وقت کو ایک منٹ کی تقدیم و تاخیر کے بغیر میرے پاس آنا، میں سن لوں گا۔

حضرت الاستاذؒ کی ہدایت کے مطابق بروز یکشنبہ بتاریخ ۲۸؍صفر ۱۴۰۴ھ مطابق ۴؍دسمبر ۱۹۸۳ء سورہ ''ق'' سے احقر حفظ قرآن میں مصروف ہوگیا اور اللہ تعالیٰ کی توفیق اور حضرت الاستاذ کی خصوصی توجہ وعنایت سے ایک سال تین مہینے کے اندر مذکورہ بالا مصروفیات کے باوجود بروز دوشنبہ بتاریخ ۱۱؍جمادی الثانیہ ۱۴۰۵ھ مطابق ۴؍مارچ ۱۹۸۵ء حفظ قرآن مکمل ہوگیا۔ اس پورے عرصے میں روزانہ فجر کے بعد سبق اور شام کو آموختہ حضرت الاستاذؒ کو سناتا رہا اور وہ سنتے رہے، جمعہ کو بھی ناغہ نہیں ہوتا تھا؛ بلکہ جب قرآن کریم کی ایک منزل کا حفظ مکمل ہوگیا تو پھر جمعہ والے دن سبق کے علاوہ ایک پوری منزل بھی سنتے تھے۔

اس طویل عرصے کے اندر احقر نے یہ کبھی محسوس نہیں کیا کہ حضرت الاستاذؒ اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے کوئی گرانی محسوس فرمارہے ہیں؛ بلکہ حفظ مکمل ہونے کے بعد بھی روزانہ شروع میں ڈیڑھ پارہ اور پھر دو پارہ مجھ ناچیز سے سنتے رہے اور ماہِ رمضان ۱۴۰۵ھ تک تین دور کراتے ہوئے مجھے اس قابل بنادیا کہ ماہِ رمضان ۱۴۰۵ھ کو پہلی محراب ان ہی کے مشورے سے دارالعلوم کی مسجد میں سنادوں۔ رمضان کے بعد بھی شروع میں روزانہ ڈیڑھ پارہ اور بعد میں روزانہ تین پارے احقر سے سنتے رہے: یہاں تک کہ بروز یکشنبہ ۴؍صفر ۱۴۰۶ھ مطابق ۲۰؍اکتوبر ۱۹۸۵ء کو آپ نے فرمایا کہ اب ان شاء اللہ! تمہیں مجھ کو قرآن سنانے کی ضرورت نہیں رہے گی، تم خود پابندی کے ساتھ روزانہ کا ایک معمول بنا کر اپنی پوری زندگی قرآن پاک کی تلاوت سے وابستہ رہو اور ماہ رمضان میں محراب سنانے کی پابندی بھی کرو۔

پاکستان واپسی کے بعد بھی قدم قدم پر آپ کی راہنمائی

دارالعلوم دیوبند سے پاکستان واپسی کے بعد بھی تدریس کا معاملہ ہو یا امامت کا، اپنی زندگی کے لئے مناسب طریقۂ کار کی تلاش ہو یا کوئی علمی اشکال درپیش ہو، حالات

حاضرہ کے تحت کسی الجھن کا سامنا ہو یا زندگی کے نشیب و فراز میں کسی مشکل کا احساس دامن گیر ہو، پڑھنے لکھنے کا طرزِ عمل ہو یا اشاعتِ کتب کا ارادہ، غرض یہ کہ ہر ہر موقع پر حضرت الاستاذؒ سے احقر رابطہ کرتا رہا اور حضرت راہنمائی فرماتے رہے اور مجھے یاد نہیں کہ حضرت والا کا کوئی بھی مشورہ ایسا رہا ہو جس پر مجھے اطمینان نصیب نہ ہوا ہو یا اس کا نتیجہ مثبت نہ رہا ہو۔

آپ کے وصال کے بعد جہاں احقر سمیت بے شمار بہی خواہانِ دار العلوم دیوبند فکر مند ہیں کہ اب مادرِ علمی کو ایسا جامع المعقول والمنقول شیخ الحدیث اور ایسا متقی و باہمت صدر المدرسین کیسے میسر ہوگا؟ وہاں احقر ذاتی طور پر پریشان ہے کہ وہ اپنے علمی اشکالات کس سے حل کرائے گا؟ اور زندگی کے نشیب و فراز میں پیش آنے والے غور طلب امور سے متعلق مشورہ کس سے کرے گا؟ حافظ شیرازیؒ نے شاید ایسے ہی کسی موقع پر کہا ہے:

مرادِ دل ز کہ جویم کہ نیست دلدارے
کہ جلوۂ نظر و شیوۂ کرم دارد

ترجمہ و مفہوم: میں اپنا مقصد کہاں تلاش کروں؟ اس لیے کہ کوئی ایسا تسلی دینے والا تو رہا ہی نہیں، جس کی نگاہ میں جلوہ گری اور اس کی عادت میں ہمدردی ہو۔"

تاہم! ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں اللہ کی رحمتوں سے ناامید نہیں ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ دار العلوم دیوبند کی بھی حفاظت فرمائیں گے اور حضرت الاستاذ کی اولاد و اقارب اور متعلقین و محبین کو بھی صبر جمیل عطا فرمائیں گے۔ وماذٰلک علی اللہ بعزیز۔

آپ کی ترقی و مقبولیت کا راز

راقم الحروف کی نظر میں حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری قدس سرہٗ کی ترقیوں اور غیر معمولی مقبولیت کے دو اہم اسباب ہیں، جنہیں اختصار کے ساتھ قلمبند کیا جا رہا ہے:

۱- رزق حلال کی برکت

احقر جس زمانے میں حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ کے پاس حفظ قرآن کررہا تھا، اس زمانے میں ان کے والد ماجد جناب یوسف صاحب پالن پوری (متوفی ۱۹؍ذی قعدہ ۱۴۱۲ھ) جو اپنے گاؤں میں قیام پذیر تھے، چند دن کے لئے دیوبند تشریف لائے تھے اور اپنے صاحبزادے حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ کے ہاں مقیم تھے۔ احقر چونکہ روزانہ ان کے مکان پر قرآن سنانے کے لئے حاضری دیتا تھا؛ اس لیے ان کے والد ماجدؒ سے جب تک وہ حضرت الاستاذ کے پاس مقیم رہے چند ملاقاتیں میسر ہوئیں اور ان سے واقفیت کا موقع نصیب ہوا۔ وہ باضابطہ عالم دین اگرچہ نہیں تھے؛ لیکن ایک صاف دل، متقی پرہیزگار اور سنتوں کے پابند ضرور تھے۔ انہوں نے نامساعد حالات کے باوجود اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت پر اتنی توجہ دی تھی کہ صرف ایک بیٹے کے علاوہ سب کو حافظ وعالم بنادیا تھا۔

ایک ملاقات کے دوران میں نے جناب یوسف صاحب پالن پوریؒ سے عرض کیا کہ: آپ کتنے خوش قسمت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند جیسے صاحبزادوں کی نعمت سے نوازا ہے، جب کہ آپ خود باضابطہ عالم بھی نہیں ہیں، آپ یہ تو بتادیجئے کہ آپ کے صاحبزادوں کی کامیابی کا اصل راز کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی کا فضل وکرم ہے اور اللہ ہی اصل راز کو جانتا ہے، میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ الحمدللہ میں نے اپنے علم کے مطابق اپنے بچوں کو ایک لقمہ بھی حرام یا مشکوک روزی کا نہیں کھلایا ہے اور پھر اپنا ایک قصہ سنایا جس کا خلاصہ یہ تھا:

> ”جس زمانے میں شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھیؒ اور حضرت علامہ سید محمد یوسف صاحب بنوریؒ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل (گجرات) میں پڑھاتے تھے اس وقت میں وہاں پڑھتا تھا اور حضرت مولانا بدر عالم میرٹھیؒ کی

خدمت کرتا تھا۔ ایک دفعہ مجھ سے حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ نے فرمایا کہ: یوسف! تمہاری برادری کے لوگ بہت اچھے لوگ ہیں؛ لیکن ان میں ایک خامی ایسی ہے جس کی بنیاد پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں کوئی اچھا عالم پیدا نہیں ہوگا، وہ سب کے سب بنیوں کے سود میں پھنسے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے ان کی آمدنی حرام ہے، حرام اور ناجائز غذا کھا کر اچھا عالم پیدا نہیں ہوسکتا، لہٰذا اگر تم چاہتے ہو کہ آگے چل کر تمہارے بیٹے اچھے عالم بنیں تو حرام اور ناجائز مال سے خود بھی پرہیز کرنا اور اولاد کو بھی بچانا۔ میرے والد (حضرت مفتی صاحبؒ کے دادا) نے بھی چونکہ بنیوں سے سودی قرضہ لیا تھا؛ اس لیے حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ کی بات سن کر میں نے ان سے اس سودی قرضے سے جان چھڑانے کا تقاضا کیا؛ لیکن وہ اپنی مجبوری بتا کر میری بات نہ مان سکے اور مجھے الگ کر دیا، میں نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر یہ تہیہ کر لیا کہ چاہے بھوکا رہوں؛ مگر حرام یا مشکوک مال کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا، تاکہ میں نہیں پڑھ سکا، میری اولاد تو ان شاء اللہ تعالیٰ پڑھ کر اچھا عالم بن سکے گی؛ چنانچہ میں نے اپنی ہی محنت سے کمانا شروع کیا، خود بھی حرام و مشکوک آمدنی سے بچنے کی کوشش کی اور اولاد کو بھی اس سے بچایا اور ان کی تعلیم پر توجہ دی، جس کے نتیجے میں ایک بیٹے کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے سب کو حافظ و عالم بنا دیا۔"

راقم الحروف کہتا ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ کے والد ماجد کی تربیت و نیک

جذبات کا یہ اثر تھا کہ آپ نے بھی ہمیشہ قناعت و استغناء کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو مشکوک آمدنی سے دور رکھا۔ اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ آپ نے فارغ ہونے کے بعد نو سال تک ”دارالعلوم اشرفیہ“ راندیر میں پڑھایا اور ۱۳۹۳ھ کو دارالعلوم دیوبند میں آپ کا تقرر ہوا۔ آپ اس دوران ایک معمولی مشاہرے پر اکتفا کرتے ہوئے شب و روز مطالعہ، تدریس اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے۔ تدریس کے ابتدائی دور میں فاقوں کی نوبت بھی پیش آئی؛ لیکن آپ نے ہمیشہ صبر و توکل سے کام لیا اور جب اللہ تعالیٰ نے آپ کی تصانیف کو خوب مقبولیت عطا کی اور اپنے ذاتی کتب خانہ ”مکتبہ حجاز“ سے بقدر ضرورت ایک آمدنی کا سلسلہ بن گیا تو آپ نے ۱۴۲۳ھ کو حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد دارالعلوم دیوبند سے تنخواہ کا سلسلہ موقوف کر دیا اور جو تنخواہ ۱۳۹۳ھ سے ۱۴۲۳ھ تک وصول فرما چکے تھے وہ بھی واپس لوٹا دی اور دارالعلوم دیوبند میں تقرری سے قبل ”دارالعلوم اشرفیہ راندیر“ میں جو نو سال تک تنخواہ وصول فرمائی تھی وہ بھی دارالعلوم اشرفیہ کو لوٹا دی اور پھر اپنے وصال تک للہ فی اللہ دین کی خدمت میں مصروف رہے۔

ایک دفعہ حضرت الاستاذؒ نے خود مجھ سے فرمایا کہ: میرے والد ماجد کا منشا تو یہ تھا کہ میں ابتدا ہی سے بلا مشاہرہ پڑھاتا؛ لیکن میں نے یہ سوچا کہ میری طالب علمی کے دور میں تو والد صاحب ہی اپنی محنت کی معمولی آمدنی سے مجھ پر خرچ کرتے رہے، اب تدریس کے دوران بھی وہ ہی مجھ پر اور میری اولاد پر خرچ کرتے رہیں، یہ مناسب نہیں، لہذا میں مشاہرہ لینے کے لئے آمادہ ہو گیا تھا؛ لیکن یہ نیت کی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو اپنے والد کے منشا کا خیال رکھتے ہوئے سارا وصول کیا ہوا مشاہرہ واپس لوٹا دوں گا۔

۲- قرآن کریم سے والہانہ تعلق و محبت کا کرشمہ

حضرت الاستاذؒ کی مقبولیت عامہ اور کامیابیوں کا ایک اہم سبب احقر کی نظر میں قرآن پاک سے ان کی والہانہ محبت و وابستگی تھی، دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ قیام میں احقر

نے بارہا یہ مشاہدہ کیا ہے کہ جب کوئی شخص حضرت والا کے سامنے تلاوت شروع کرتا یا وہ خود تلاوت میں مصروف ہوجاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ آپ کا ظاہری و باطنی تعلق سب سے کٹ کر صرف اللہ تعالیٰ اور اس کی کتاب سے جڑ گیا ہے، آنسو رواں دواں اور چہرے کا رنگ بدلا ہوا نظر آتا۔ حضرت والاؒ کی مذکورہ کیفیت کو یاد کر کے آج تک میں سوچتا رہتا ہوں کہ اگر زندگی میں صرف ایک دفعہ بھی ہمیں ایسی کیفیت نصیب ہوجائے تو شاید ہمارا بیڑا پار ہوجائے ؛لیکن بات یہ ہے کہ ''ذٰلك فضل الله يؤتيه من يشاء''۔

احقر جب حضرت الاستاذؒ کے قرآن پاک سے تعلق کو نبی کریم صلی اللہ علی وسلم کی مندرجہ ذیل جیسی حدیثوں کی روشنی میں دیکھتا ہے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت الاستاذؒ کی ترقیوں اور بے مثال محبوبیت ومقبولیت کا ایک اہم راز قرآن پاک سے ان کی والہانہ محبت تھی ؛ کیوں کہ ان حدیثوں کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن سے تعلق ومحبت اللہ تعالیٰ کے قرب کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔

امام بخاریؒ نے بروایت حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے:

''لم يأذن الله لشئىء ماأذن لنبى صلى الله عليه وسلم يتغنىٰ بالقرآن''

یعنی ''اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز نہیں سنی جیسی اس نبی کی سنی جو قرآن پاک ترنم سے پڑھتا ہے''۔ (بخاری شریف، ج:۲،ص:۷۵۱)

اور امام ترمذیؒ نے بروایت حضرت ابو امامہؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

''وماتقرب العباد الى الله بمثل ما خرج منه يعنى القرآن''

یعنی ''اور بندوں نے اللہ کی نزدیکی اس قدر کسی چیز کے ذریعہ حاصل نہیں کی جس قدر اس چیز کے ذریعے حاصل ہوئی جو اللہ سے صادر ہوئی ہے، یعنی قرآن پاک''۔ (ترمذی شریف، ج:۲،ص:۱۱۹)

آپ کی ایک آخری خاموش تمنا جو پوری ہوگئی

حضرت الاستاذؒ نے اپنی زندگی کارآمد بنالی کہ موجودہ دور میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی ،آپ نے دین کی مسلسل خدمت کرتے ہوئے اپنی صحت کی بھی کوئی پروانہیں

کی۔ غالباً آپ یہ چاہتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جسم کے بارے میں مجھ سے سوال کریں کہ: ’’فیم ابلیتہ ؟یعنی اپنے جسم کو کن کاموں میں لگا کر آپ نے ناتواں کر دیا؟‘‘تو میں جواب دے سکوں کہ ’’فی خدمۃ کتابک وسنۃ نبیک‘‘یعنی تیری کتاب اور تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی خدمت میں لگا کر ناتواں کر دیا‘‘۔

آپ زیادہ محنت اور پیرانہ سالی کی وجہ سے اپنی عمر کے آخری سالوں میں شوگر اور دل کی مختلف بیماریوں کا شکار ہو گئے تھے، عمر کے اس حصے میں بظاہر ان بیماریوں سے صحت یاب ہونے کی امید کم اور ان کے مزید بڑھ جانے کا اندیشہ زیادہ ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت حال میں یقیناً حضرت والاؒ کی یہ خاموش تمنا رہی ہوگی کہ وہ ارذل عمر سے پہلے ہی قرآن و سنت کی خدمت کرتے ہوئے اپنے رب کے حضور میں حاضری دیں اور اپنے عزیز طلبہ کو بھی تعلیمی سال کے درمیان میں الوداع نہ کہیں جس سے ان کی کتاب بخاری شریف نامکمل رہ جائے اور نہ ہی دارالعلوم کو سال کے درمیان میں خیر باد کہہ کر اس کی مؤقر مجلس شوریٰ کو شیخ الحدیث وصدر المدرسین کی تعیین کے لئے غور کرنے کا موقع نہ دیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس نیک اور مخلص بندے کی مذکورہ خاموش تمنا اس طرح پوری فرمائی کہ آپ نے بخاری شریف کو اختتام تک پہنچاتے ہوئے اس جملے کے ساتھ اپنے طلبہ سے رخصت لی کہ: ’’اللہ جو چاہے گا وہ ہوگا‘‘ اور پھر رمضان المبارک میں سفر کے دوران نہایت کمزوری کی حالت میں آرام کرنے کے بجائے روزانہ تراویح کے بعد درس قرآن کا سلسلہ شروع فرما کر علمی اور اصلاحی گراں قدر نکتے بکھیرتے رہے، کمزوری اتنی کہ متعلقین نے (بشمول احقر کے بذریعہ فون) چند دن تک درس موقوف رکھنے اور آرام کرنے کی درخواست کی؛ لیکن آپ نے انکار فرماتے ہوئے ۱۵؍رمضان تک درس کا سلسلہ جاری رکھا، آپ کی کیفیت پر حافظ شیرازیؒ کا مندرجہ ذیل شعر منطبق ہو رہا تھا:

دست از طلب ندارم تا کام من برآید

یا تن رسد بہ جاناں یا جانِ زتن برآید

ترجمہ ومفہوم: ”میں اپنے مقصد کے حصول تک جد جہد جاری رکھوں گا؛ تا کہ یا تو محبوب حقیقی کا وصال نصیب ہو یا پھر میں اپنی جان اس کے سپرد کروں“۔

۱۵؍رمضان المبارک کے بعد زبان میں بولنے کی طاقت باقی نہیں رہی اور سفر آخرت شروع ہو گیا اور چند ہی دن کے اندر آخری عشرے میں ۲۵؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ کو داغِ مفارقت دے گئے۔ راقم الحروف جب حضرت الاستاذؒ کی پوری زندگی اور خاص کر زندگی کے آخری قابل رشک ایام پر غور کرتا ہے، تو بے اختیار زبان پر یہ الفاظ جاری ہوتے ہیں: ”عاش سعيداً ومات سعيداً وسيبعث يوم القيٰمة ان شاء الله سعيداً“۔ (آپ نے سعادت مندی کی زندگی بسر کی اور سعادت مندی کی موت نصیب ہوئی اور قیامت میں بھی ان شاء اللہ سعادت مندی کی حالت میں اللہ کے حضور پیش ہوں گے) اور اسی سوچ وفکر سے اللہ تعالیٰ مجھے اپنے عظیم مربی و استاذ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری قدس سرہٗ العزیز کے فراق پر صبر کی توفیق عطا فرماتا ہے، اور امید کرتا ہوں کہ ان بے ربط؛ لیکن دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے ٹوٹے پھوٹے کلمات سے قارئین کرام اور حضرت الاستاذؒ کی اولاد واقارب اور مخلصین ومتعلقین کو بھی صبر کی تویق نصیب ہوگی۔

احقر نے اپنے مضمون کو بار بار سمیٹنے کی کوشش کی؛ لیکن اپنی زبان حال سے مندرجہ ذیل مشہور شعر کو معمولی ترمیم کے ساتھ دہراتا ہوا آگے بڑھتا رہا:

اعد ذكر "سعيد" لنا ان ذكره
هو المسك ما كررته يتضوع

ترجمہ ومفہوم: ”شیخ سعید کا تذکرہ دہراتے رہنا؛ کیوں کہ ان کا تذکرہ جتنا دہراتے رہو گے اتنا ہی مشک کی طرح مہکتا رہے گا“۔

حضرت الاستاذؒ نے اپنے پیچھے نو صاحبزادگان اور دو صاحبزادیوں کو سوگوار چھوڑا، جو سب کے سب حافظِ قرآن اور دینی تعلیم سے آراستہ اور دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ دو صاحبزادوں کا آپ کی حیات میں انتقال ہوگیا تھا، وہ بھی حافظِ قرآن اور دینی تعلیم سے آراستہ تھے۔ اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذؒ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور آپ کی اولاد، اقارب و رشتہ دار، دارالعلوم دیوبند کے اربابِ انتظام اور اساتذۂ کرام وطلبہ اور حضرتؒ کے تمام تلامذہ و متعلقین و محبین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

حضرت مولانا سعید احمد پالن پوریؒ فکر ولی اللٰہی کے مستند شارح

مولانا زاہد الراشدی

حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحبؒ کی وفات کا صدمہ ابھی تازہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سعید احمد پالن پوری بھی ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے کے لگ بھگ حسب معمول نیند سے بیدار ہوکر موبائل فون کھولا تو کراچی کے ڈاکٹر ثناء اللہ محمود کے اکاؤنٹ پر حضرت مفتی صاحبؒ کے فرزند مولانا قاسم احمد پالن پوری کا میسج رنج وغم کا ایک نیا طوفان لیے نگاہوں کے سامنے موجود تھا کہ ”انتہائی رنج وغم کے ساتھ یہ خبر صاعقہ اثر لکھی جارہی ہے کہ ہمارے والد محترم حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند آج بتاریخ 19 مئی مطابق 25 رمضان المبارک بروز منگل بوقت چاشت اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مفتی صاحبؒ کی علالت کی خبریں کئی روز سے آرہی تھیں مگر گذشتہ روز ایک میسج نے تشویش میں اضافہ کردیا تھا جو آج حقیقت میں بدل گئی اور عالم اسلام کی یہ عظیم شخصیت، محدث، فقیہ، متکلم اور ہزاروں علماء کرام کے شفیق استاذ اپنا سفر زندگی مکمل کرکے دار باقی کی طرف روانہ ہوگئے۔

مولانا پالن پوریؒ کے تعارف کے لئے اس کے بعد کسی بات کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ وہ جنوبی ایشیاء کی سب سے بڑی علمی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث تھے اور انھوں نے سالہا سال تک اس مرکز علم میں ہزاروں تشنگان علوم کو مسلسل فیضیاب کیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کا یہ منصب ہمیشہ اپنے دور کی ممتاز ترین علمی شخصیات کے ساتھ مخصوص

رہا ہے جن میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ، خاتم المحدثین حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اور شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی جیسے اساطین علم وفضل کے نام آتے ہیں اور ان کے ساتھ کسی فہرست میں نام کا شمار ہونا بجائے خود کسی بڑے سے بڑے علمی اعزاز سے کم نہیں ہے، مگر حضرت مولانا سعید احمد پالن پوریؒ ہر صاحب علم وفضل کی طرح اپنے کچھ امتیازات اور خصوصیات بھی رکھتے تھے جن کے باعث وہ اپنے معاصرین میں ایک الگ شان کے ساتھ جلوہ گر دکھائی دیتے تھے اور ان کی آرا وافکار کو اہل علم کے حلقوں میں رہنمائی اور استفادہ کے لئے مرجع کی حیثیت حاصل تھی۔

مجھے متعدد بار ان کی زیارت وملاقات کا شرف حاصل ہوا اور ان کے ارشادات سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ لندن میں ورلڈ اسلامک فورم کے قیام کے بعد اپنے عہد کی جن ممتاز علمی وفکری شخصیات نے اس کے علمی پروگراموں کو رونق بخشی۔ ان میں حضرت پالن پوریؒ بھی شامل ہیں۔ لندن کے مرکز ختم نبوت اسٹال ویل گرین میں ورلڈ اسلام فورم کی ایک فکری نشست میں وہ تشریف لائے اور عصر حاضر میں علماء کرام کی ذمہ داریوں کے عنوان سے انہوں نے بلیغ خطاب فرمایا۔ دور حاضر کے فکری ونظریاتی فتنوں پر ان کی نظر بہت گہری تھی اور وہ علمائے کرام اور دینی حلقوں کو اپنے مخصوص انداز میں ان سے باخبر کرتے رہتے تھے۔ یہ خطاب بھی ان کے اسی ذوق کا آئینہ دار تھا۔ پھر ایک بار نیویارک میں ’’شریعہ بورڈ‘‘ کے مولانا مفتی نعمان احمد کے ہاں ان کی زیارت ہوئی اور کچھ دیر ان کی مجلس وگفتگو سے شاد کام ہونے کا موقع ملا ان دنوں والد گرامی حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ کا کچھ عرصہ قبل انتقال ہوا تھا اس لئے زیادہ دیر انہیں کی باتیں ہوتی رہیں بلکہ گوجرانوالہ کے ایک لوکل اخبار نے حضرت والد محترم کے حوالے سے خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا تھا جس کی ایک کاپی حضرت پالن پوریؒ کی خدمت میں پیش کی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر انہوں نے تبصرہ فرمایا۔ اس کے علاوہ بعض ممتاز اہل علم کے کچھ علمی وفقہی تفردات بھی زیر بحث آئے جن کے بارے میں انہوں نے فرمایا کہ تفردات اور انفرادی آرا کو اگر باقاعدہ موقف بنا کر سامنے نہ

لایا جائے تو بہت سی الجھنوں سے بچا جا سکتا ہے، خود میرا ذوق بھی ان معاملات میں یہی ہے اس لئے یہ گفتگو کافی دلچسپ رہی۔

میں نے ایک موقع پر کسی مجلس میں عرض کیا ہم درس نظامی کے نصاب میں علم کلام کے موضوع پر بنیادی کتاب ''شرح العقائد'' پڑھاتے ہیں جو یونانی فلسفہ کے پیدا کردہ اعتقادی وکلامی مباحث کے حوالے سے ہے اور اہل سنت کے عقائد کے بنیادی ڈھانچے سے آگاہی کے لئے وہ ازحد ضروری ہے، مگر آج کے دور میں ہمیں جن عقائد وافکار کا سامنا ہے ان کا بیشتر حصہ مغربی فلسفہ وثقافت کا پیدا کردہ ہے، اس لئے جدید مغربی فکر وفلسفہ نے جو مسائل کھڑے کیے ہیں ان کے بارے میں شرح العقائد کی دوسری جلد لکھنے کی ضرورت ہے جسے اس کے ساتھ ہی درسی طور پر پڑھایا جانا چاہیے۔ بعض دوستوں نے اسی مجلس میں سوال کیا کہ یہ لکھے گا کون؟ میں عرض کیا کہ میری نظر میں اس وقت تین بزرگ ہیں جو اس کام کو صحیح اور بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ (۱) حضرت مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم (۲) حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالنپوریؒ اور (۳) حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمودؒ۔ ان میں سے دو تو ہم سے رخصت ہو گئے ہیں جب کہ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی کے لئے بلا مبالغہ جسم کارواں رواں دعا گو رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں امت مسلمہ کی رہنمائی کے لئے صحت وعافیت کے ساتھ تادیر سلامت رکھیں۔ آمین یارب العالمین۔

حضرت مولانا سعید احمد پالن پوریؒ کا امت کے اصحاب علم پر ایک عظیم احسان یہ بھی ہے کہ انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی معرکۃ الآرا ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کی اردو و عربی دونوں زبانوں میں شرح لکھ کر علماء اور طلبہ کی رسائی اس عظیم علمی ذخیرہ تک آسان کر دی ہے جو یقیناً ان کے لئے صدقۂ جاریہ ہے۔

اللہ ان کی حسنات قبول فرمائیں، سیئات سے درگزر کریں اور ان کے خاندان، تلامذہ اور مستفدین کو ان کی حسنات کا سلسلہ تادیر جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یارب العالمین

حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری کی رحلت

مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ صاحب | **امیر عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت، کراچی**

عالم اسلام کی عظیم علمی شخصیت، محدث، فقیہ وقت، متکلم زمانہ، دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث وصدر المدرسین، کئی نسلوں کے معلم ومربی، ہزاروں علمائے کرام کے شفیق استاد استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری اس دنیائے رنگ وبو کی تقریباً اسی بہاریں دیکھنے کے بعد ۲۵ر رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹ر مئی ۲۰۲۰ء بروز منگل صبح چاشت کے وقت اپنا سفر زندگی مکمل کرکے عالم عقبیٰ کے سفر پر روانہ ہوگئے، انا لله وانا اليه راجعون، ان لله ما اخذ وله ما اعطى وكل شىء عنده باجل مسمى حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اکابر واسلاف کے عقائد ونظریات کے صحیح اور حقیقی امین وترجمان اور متصلب بزرگ تھے۔ اپنی پوری زندگی درس وافتاء، تصنیف وتالیف اور وعظ ونصیحت میں گزاردی۔ علم دین کی اشاعت اور اس کی ترویج آپ کی زندگی کا اوڑھنا اور بچھونا تھا۔

گزشتہ دوسالوں میں ہندوپاک کے کئی اکابر علمائے کرام ومشائخ عظام کی رحلتیں ہوئیں، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ دنیا علوم وحی کے حاملین سے خالی ہوتی جارہی ہے اور قیامت کی قربت کا سامان کیا جارہا ہے، جیسا کہ صادق المصدوق نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خبر دی ہے کہ: ’’إن الله لايقبض العلم انتزاعاينتزعة من قلوب العباد ولكن يقبض بقبض العلماء حتى إذا لم يبق عالما اتخذ الناس رؤسا جهالا فسئلوا فأفتوا بغير علم فضلوا وأضلوا‘‘ (مشکوۃ ص: ۳۳) ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ اس علم کو اس طرح قبض نہیں کرے گا

کہ بندوں کے سینوں سے چھین لے۔ بلکہ قبض علم کی صورت یہ ہوگی کہ اللہ تعالی علماء کو اٹھاتا رہے گا، یہاں تک کہ جب ایک عالم بھی باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو پیشوا بنالیں گے ان سے سوالات ہوں گے، وہ بغیر جانے فتوی دیں گے، خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ ایک اور حدیث میں ہے: ”عن مرداس الأسلمی رضی الله عنه قال: قال النبی صلی الله علیه وسلم: یذهب الصالحون الأول فالأول ویبقی حفالة کحفالة الشعیر أو التمر لایبالیهم الله بالةً۔ “(صحیح بخاری) کتاب الرقاق، ج:۲، ص:۹۵۲)

ترجمہ: حضرت مرداس اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نیک لوگ یکے بعد دیگرے اٹھتے جائیں گے اور انسانیت کی) تلچھٹ پیچھے رہ جائے گی، جیسا کہ ردی جو اور کھجور رہ جاتے ہیں، حق تعالی ان کی کوئی پروا نہیں کرے گا۔

حضرت مفتی سعید احمد پالن پوری ان اخیار امت اور طبقۂ صالحین میں سے تھے جن کی حیات اہل زمین خصوصا علمی حلقوں کے لیے آب حیات اور بہت سے فتنوں کے سامنے سدِّ سکندری سے کم نہ تھی۔ آپ کی وفات علم وعرفان کی موت ہے، آپ کا سانحۂ ارتحال ”موت العالِم موت العالَم “ کے مصداق انسانیت کا نقصان ہے، آپ کی وفات سے جہاں اہل علم کے حلقے ایک مفسر، محدث، فقیہ، محقق، مصنف اور قادر الکلام خطیب سے محروم ہو گئے، وہاں اہل قلوب عظیم روحانی پیشوا سے بھی محروم ہوگئے۔ حضرت مفتی صاحب کی پیدائش کالیڑہ، شمالی گجرات کے شہر پالن پور، ہندوستان میں جناب یوسف صاحب کے ہاں ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۰ء کے آخر میں ہوئی، آپ اپنے والدین کی اولاد میں سب سے بڑے تھے۔ والدین نے آپ کا نام ”احمد“ رکھا، جب آپ مظاہر علوم سہارن پور میں تعلیم پا رہے تھے تو آپ نے خود اپنا نام ”سعید احمد“ رکھا۔ آپ کی تعلیم کا آغاز والد صاحب سے ہوا ابتدائی فارسی اپنے ماموں سے پڑھی، پھر پالن پور شہر میں حضرت مولانا نذیر میاں کے مدرسہ میں شرح جامی تک کتابیں پڑھیں۔

۱۳۷۷ھ میں مظاہر علوم سہارن پور میں داخلہ لیا اور تین سال تک وہاں تعلیم حاصل کی۔ ۱۳۸۰ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں دورۂ حدیث کی تکمیل کر کے فاتحۂ فراغ پڑھا۔ آپ بچپن ہی سے نہایت ذہین وفطین، کتب بینی اور محنت کے عادی تھے، اس لیے اساتذہ کرام کی توجہ اور تعلیم و تربیت نے خاص اثر کیا اور آپ نے دارالعلوم دیوبند جیسی عظیم دینی درس گاہ کے سالانہ امتحان میں اول نمبر سے کامیابی حاصل کی۔ دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد آپ نے دارالعلوم دیوبند میں حضرت مفتی سید مہدی حسن شاہ جہاں پوریؒ کی زیر نگرانی افتاء کا کورس مکمل کیا اور افتاء کے ساتھ ساتھ جہاں آپ اپنے بھائی کو حفظ کراتے تھے، وہاں خود بھی آپ نے ان کے ساتھ حفظ مکمل کیا۔

تدریس کے لیے آپ کا پہلا تقرر حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی کی معرفت دار العلوم اشرفیہ راندیر (سورت) میں ہوا، ۹ سال تک وہاں آپ نے تدریس فرمائی اور تصنیف کا آغاز بھی آپ نے اسی زمانہ میں شروع کر دیا تھا۔ اسی عرصہ میں موصوف نے داڑھی اور انبیاء کی سنتیں، حرمت مصاہرت، العون الکبیر اور مولانا محمد طاہر پٹنی قدس سرہ کی ''المغنی'' کی عربی شرح وغیرہ تصانیف ارقام فرمائیں۔ اپنے استاذ حضرت مولانا محمد ہاشمؒ (جو دارالعلوم دیوبند میں پڑھاتے تھے) کی تحریک پر آپ نے دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے لیے درخواست لکھی اور اس کے ساتھ ایک خط حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دار العلوم دیوبند کے نام بھیجا، جس کے جواب میں حضرت مہتمم صاحب نے آپ کو لکھا:

> ''محترمی ومکرمی زید مجدکم! سلام مسنون، نیاز مقرون،
>
> گرامی نامہ باعث مسرت ہوا، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتب پر کام کرنے کی اطلاع سے غیر معمولی خوشی ہوئی، جو صورت آپ نے اختیار فرمائی ہے وہ مناسب ہے، خود میرے ذہن میں ان کتب کی خدمت کی مختلف صورتوں میں سے ایک یہ صورت بھی تھی۔ الفرقان میں پڑھنے کی نوبت نہیں آئی، ان شاء اللہ رسائل منگوا کر مستفید ہوں گا اور جو رائے قائم ہو گی وہ عرض

کروں گا۔ درخواست منسلکہ مجلس تعلیمی میں بھیج رہا ہوں، اس پر وہاں سے کوئی کارروائی ضرور کی جائے گی، اس کی اطلاع دی جائے گی۔ دعا کی درخواست۔ قاسم العلوم کے میرے پاس دو نسخے تھے، ایک نسخہ اسی ضرورت سے وہاں بھیجا گیا مگر واپس نہیں ہوا، اب ایک رہ گیا ہے، جو صاحب نقل کرنا چاہیں، وہ ایک وقت مقرر کر کے میرے کتب خانہ میں ہی بیٹھ کر نقل فرمالیا کریں اور یہاں بحمد اللہ خیریت ہے۔

والسلام:

محمد طیب از دیوبند

۷/۷/۱۳۹۳ھ

جب خط شوریٰ میں پیش ہوا تو حضرت مولانا منظور احمد نعمانی جو شوریٰ کے ممبر تھے، انہوں نے آپ کا نام پیش کیا اور اسی مجلس میں آپ کا تقرر ہو گیا، ۱۳۹۳ھ سے تا دم واپسیں تقریباً ۴۸ سال آپ نے دارالعلوم کی خدمت کی۔ دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کے مفتی، شیخ الحدیث اور صدر المدرسین کے منصب جلیل پر فائز رہے۔ آپ کے بافیض قلم سے درج ذیل کتابیں منصۂ شہود پر آئیں: ۱:۔تفسیر ہدایت القرآن، ۲:۔’الفوز الکبیر‘‘ کی تعریب جدید، ۳:۔العون الکبیر، یہ الفوز الکبیر‘ کی عربی شرح ہے۔ ۴: فیض المنعم: (مقدمۂ مسلم شریف کی اردو شرح)، ۵: تحفۃ الدرر: (’’نخبۃ الفکر کی اردو شرح)، ۶:۔ مبادی الفلسفہ، ۔: معین الفلسفہ (مبادی الفلسفہ کی اردو شرح)، ۸:۔ مفتاح التہذیب: تہذیب المنطق‘‘ کی شرح ہے، ۹:۔ آسان منطق، ۱۰: آسان نحو (دو حصے)، ۱۱:۔ آسان صرف (تین حصے)، ۱۲: محفوظات (تین حصے): یہ آیات واحادیث کا مجموعہ ہے، جو طلبہ کے حفظ کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔ ۱۳:۔ آپ فتویٰ کیسے دیں؟ (’’شرح عقود رسم المفتی‘‘ کا نہایت عمدہ ترجمہ مع

ضروری فوائد)، ۱۴:- کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟ (یہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کی کتاب ''توثیق الکلام' کی نہایت آسان و عام فہم شرح ہے)، ۱۵:- حیات امام ابوداؤد (امام ابوداؤد سجستانیؒ کی مکمل سوانح)، ۱۶:- مشاہیر محدثین وفقہائے کرام اور تذکرہ راویان کتب حدیث: ۱۷:- حیات امام طحاوی، ۱۸:- اسلام تغیر پذیر دنیا میں (چار قیمتی مقالوں کا مجموعہ)، ۱۹:- نبوت نے انسانیت کو کیا دیا؟، ۲۰: داڑھی اور انبیاء کی سنتیں، ۲۱:- حرمت مصاہرت، ۲۲: تسہیل ادلۂ کاملہ: حضرت شیخ الہند کی مایۂ ناز کتاب ادلۂ کاملہ کی نہایت عمدہ شرح ہے، اس میں غیر مقلدین کے چھیڑے ہوئے دس مشہور مسائل کی مکمل تفصیل ہے، یہ شیخ الہند اکیڈمی سے شائع ہوئی ہے۔ ۲۳:- حواشی وعناوین ایضاح الادلۃ: ایضاح الادلہ حضرت شیخ الہند کی شہرۂ آفاق کتاب ہے، اس پر موصوف نے نہایت مفید حواشی ارقام فرمائے ہیں اور ذیلی عناوین بڑھائے ہیں، یہ کتاب بھی شیخ الہند اکیڈمی سے شائع ہوئی ہے۔ ۲۴:- حواشی امداد الفتاوی، ۲۵:- افادات نانوتوی، ۲۶: افادات رشیدیہ ۲۷:- ''رحمۃ اللہ الواسعۃ: حجۃ اللہ البالغۃ'' کی مبسوط اردو شرح ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ کی تشریح ایک بھاری قرضہ تھا، جو ڈھائی سو سال سے امت کے ذمہ باقی چلا آرہا تھا۔ ۲۸:- تہذیب مغنی: مغنی علامہ محمد طاہر پٹنی قدس سرہ کی اسماء رجال پر بہترین کتاب ہے، موصوف نے اس کی عربی میں شرح لکھی ہے۔ ۲۹:- زبدۃ الطحاوی'': یہ امام طحاوی کی شہرۂ آفاق کتاب ''شرح معانی الآثار'' کی عربی تلخیص ہے۔ ۳۰:- کامل برہان الٰہی، ۳۱:- حجۃ اللہ البالغۃ عربی: (دو حصے)، ۳۲:- ہادیہ شرح کافیہ، ۳۳:- الوافیہ، شرح کافیہ: (کافیہ کی عربی شرح)، ۳۴:- تحفۃ الالمعی شرح سنن الترمذی، ۳۵:- تحفۃ القاری شرح صحیح البخاری، ۳۶: علمی خطبات (دو حصوں سے زائد پر مشتمل ہے)، ۳۷:- مفتاح العوامل شرح شرح مأۃ عامل، ۳۸: گنجینۂ صرف شرح پنج گنج، ۳۹:- ارشاد الفہوم شرح سلم العلوم، ۴۰:- دین کی بنیادیں اور تقلید کی ضرورت، ۴۱:- فقہ حنفی اقرب الی النصوص ہے، ۴۲:- آسان فارسی قواعد، ۴۳:- مبادی الاصول'' (عربی اصول فقہ میں ہے)، ۴۴: معین الاصول، ۴۵:- شرح علل الترمذی (ترمذی

شریف کی کتاب العلل'' کی عربی شرح)، ۴۶: مسلم پرسنل لاء اور نفقۂ مطلقہ۔

مذکورہ بالا تعلیمی، تدریسی اور تصنیفی خدمات کے علاوہ تبلیغ اور وعظ وارشاد کی غرض سے کئی بیرون ممالک مثلاً: برطانیہ، کینیڈا، افریقہ اور سعودی عرب کا سفر آپ نے کیا۔ آپ کی پہلی بیعت قطب الاقطاب شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی قدس سرہ سے تھی اور حضرت مولانا مفتی مظفر حسین مظاہری نے آپ کو بیعت کرنے کی اجازت دی۔ حضرت مفتی صاحب کے والد محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ جوڈابھیل میں کچھ عرصہ پڑھتے رہے اور ان کی تربیت سے حضرت مفتی سعید احمد پالن پوری اس مقام تک پہنچے، ان کے بارے میں حضرت مولانا مفتی محمد امین (استاذ حدیث وفقہ ومرتب فتاوی دار العلوم دیوبند نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ:۔

> ''جس زمانہ میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا بدر عالم میرٹھی اور محدث کبیر حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ ڈابھیل میں پڑھاتے تھے، اس وقت والد صاحب ڈابھیل میں پڑھتے تھے اور حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی قدس سرہ کے خادم خاص تھے مگر گھریلو احوال کی وجہ سے تعلیم مکمل نہیں کر سکے تھے، اس لیے اپنے صاحب زادوں کو علامہ شبیر احمد عثمانی مولانا بدر عالم میرٹھی اور محدث کبیر مولانا محمد یوسف بنوریؒ جیسا عالم بنانے کا عظیم جذبہ رکھتے تھے حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی قدس سرہ نے والد صاحب کو یہ وصیت کی تھی کہ یوسف! اگر تم اپنے لڑکوں کو اچھا عالم بنانا چاہتے ہو تو حرام اور ناجائز مال سے پرہیز کرنا اور بچوں کو بھی ناجائز اور حرام مال سے بچانا، کیونکہ علم ایک نور ہے، ناجائز اور حرام مال سے جو بدن پروان چڑھتا ہے، اس میں یہ نور داخل نہیں ہوتا۔ یہ نصیحت حضرت مولانا نے والد ماجد کو اس لیے کی تھی کہ اس زمانہ میں ہماری ساری قوم بنیوں کے سود میں پھنسی ہوئی تھی، اس زمانہ میں ہمارے دادا نے بنیے سے سودی قرض لے کر ایک زمین کرایہ پر لی تھی، والد صاحب اس زمانہ میں ڈابھیل کے طالب علم

> تھے، والد صاحب نے اس معاملہ میں دادا سے اختلاف کیا تو والد صاحب کو حرام سے بچنے کے لیے مجبوراً تعلیم چھوڑ کر اپنا گھر سنبھالنا پڑا اور تہیہ کیا کہ چاہے بھوکا رہوں گا مگر حرام کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا، تاکہ میں نہیں پڑھ سکا تو اللہ تعالی میری اولاد کو علم دین عطا فرمائیں۔ چنانچہ والد صاحب ناجائز اور حرام مال، بلکہ مشتبہ مال سے بھی پرہیز کرتے تھے اور اپنی اولاد کو بھی بچاتے تھے اور ان کی تعلیم و تربیت کی طرف پوری توجہ فرماتے تھے‘‘۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے سانحۂ ارتحال پر جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے رئیس حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر دامت برکاتہم، نائب رئیس حضرت مولانا سید سلیمان یوسف بنوری زید مجدہم اور جملہ اساتذہ کرام کی طرف سے مشائخ وارباب دارالعلوم دیوبند اور حضرت مفتی صاحب کے جملہ پسماندگان سے اظہار تعزیت کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالی حضرت مفتی صاحب کی کامل مغفرت فرمائے، آپ کی جملہ حسنات کو قبول فرمائے، پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور آپ کے جملہ متوسلین وتلامذہ کو حضرت کے مشن کو جاری وساری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین ’’بینات‘‘ کے باتوفیق قارئین سے حضرت کے لیے ایصال ثواب کی درخواست ہے۔ وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ سیدنا محمد وعلی الہ وصحبہ اُجمعین۔

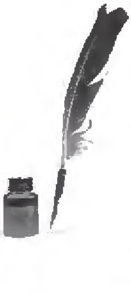

جاوداں وہ سایۂ دامانِ رحمت میں رہیں

مولانا مصلح الدین قاسمی

استاذِ تفسیر وادب دارالعلوم دیوبند

نصف صدی سے زائد عرصے تک ''دارالعلوم اشرفیہ راندیر سورت صوبہ گجرات ''اور''از ہر ہند دارالعلوم دیوبند'' کی مسند تدریس پر جلوہ افروز ہوکر تشنگان علوم نبوت کو اپنے علمی بحرِ زخّار سے سیراب کرتے ہوئے بالآخر ۲۵/رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹/مئی ۲۰۲۰ء بروز منگل بہ وقتِ چاشت ملت اسلامیہ کے سالارِ کارواں ،قافلۂ علماء کے حُدی خواں، محدثِ جلیل ،استاذ الاساتذہ حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری صدر المدرسین وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند اپنے ہزار ہا ہزار شاگردوں، متعلقین، محبین اور منتسبین کو روتا بلکتا چھوڑ کر ممبئی کے ایک ہاسپٹل میں مالکِ حقیقی سے جاملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، اللهم اغفر له وارحمه واسكنه فى فسيح جناتك۔

تیرے اعمال ابد تک نہ مریں گے ہرگز
رہنما ہے ترا نقش کف پا تیرے بعد

باقی رہنے والی ذات صرف اللہ کی ہے، دنیائے فانی کے ہر فرد؛ بلکہ شخصیت کو خواہ کتنی ہی دلکش اور کردار وعمل کی بنیاد پر کتنی ہی عزیز کیوں نہ ہو بالآخر اسے ایک نہ ایک دن رخصت ہونا ہے ؛ کیوں کہ ہر ایک جانے ہی کے لئے آیا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی جاتا ہے تو صرف چند لوگ آنسو بہاتے ہیں اور کوئی اس انداز سے جاتا ہے کہ پوری دنیا میں اس کے چاہنے والے اور اس سے انتساب پر فخر کرنے والے آنسو بہاتے اور غم میں ڈوب جاتے ہیں ،ایسے لوگ بہ ظاہر روپوش تو ضرور ہوجاتے ہیں؛ مگر ان کی روشنی باقی رہتی ہے ،پوری کائنات اس روشنی سے فائدہ اٹھاتی ہے اور اس کے اجالے میں اپنی متاع گم شدہ کو

ڈھونڈتی ہے۔

بلا شبہ استاذِ گرامی مرتبت، محدث جلیل، فقیہ بے نظیر حضرت اقدس مفتی سعید احمد پالن پوری نور اللہ مرقدہٗ کی ذاتِ گرامی ایسی ہی تھی، آپ کی رحلت نے علمی حلقے میں جو خلا پیدا کیا ہے، اس کا پر ہونا بہ ظاہر مشکل نظر آتا ہے، آپ بیک وقت ایک عظیم محدث، ممتاز فقیہ، باکمال مصنف، بے مثال، بافیض استاذ، علوم اسلامیہ کے شارح اور علماء کے مرجع تھے، فقہی سیمیناروں، علمی حلقوں، قابلِ ذکر علمی مجالس کے بادشاہ تھے ملک و بیرون ملک کے صف اول کے علماء میں نہ صرف یہ کہ آپ کا شمار تھا بلکہ اکابر علماء کی نگاہیں بھی لاینحل مسئلے کے حل کے لئے آپ کو ڈھونڈتی تھیں اور آپ بہت ہی آسان الفاظ اور سہل انداز سے چٹکیوں میں وہ مسائل حل کر دیا کرتے تھے، قدرت نے آپ کو علمی بصیرت، فراستِ ایمانی اور ایسی علمی جلالتِ شان سے نوازا تھا کہ آپ سے ملنے بلکہ آپ کو دیکھنے والا مرعوب ہو جاتا اور آپ کے حلقۂ درس میں شرکت کرنے والوں اور خوشہ چینوں کا تو کیا کہنا؟ وہ تو آپ کے گرویدہ اور آپ پر نچھاور ہونے کے لئے تیار رہتے تھے، کہنے کو تو طلبۂ دورۂ حدیث کے لئے آپ کا سبق ''حدیث شریف'' کا ہوتا تھا مگر آپ کے حلقۂ درس سے اٹھنے کے بعد طلبہ یہ محسوس کرتے کہ وہ ایک سبق نہیں؛ بلکہ بہت سے فنون اور اسباق پڑھ کر اٹھ رہے ہوں، ہر سبق میں احادیثِ مبارکہ کی تشریح موقع بہ موقع اسماء الرجال کی بحث، ائمہ کرام کے اقوال، فقہی مسائل اور ترجیح الراجح کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ نحو و صرف نیز موقعے کی مناسبت سے ایک طرح کے مضمون میں وارد احادیث مبارکہ میں پائے جانے والے مختلف الفاظ کے مابین فرق اور نکات پر بھی سیر حاصل بحث کرتے اور دیکھتے دیکھتے پورا گھنٹہ ختم ہو جاتا؛ بلکہ بسا اوقات حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں دو دو گھنٹے پڑھاتے رہتے اور یوں محسوس ہوتا جیسے ابھی سبق شروع ہوا ہو۔ آہ

دید کی پیاسی نگاہیں تجھ کو پائیں گی کہاں

زیارت و ملاقات

دارالعلوم الاسلامیہ بستی سے سالِ ششم (جلالین) کی تعلیم مکمل کر کے ۱۴۱۴ھ میں احقرام المدارس دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا۔ حضرت الاستاذ نوراللہ مرقدہٗ کے علمی جلالتِ شان کی گونج تو سابق مدرسے ہی میں احقر کے کان میں پڑ چکی تھی، داخلے کی کاروائی کی تکمیل کے بعد پہلی بار زیارت کا شرف اس وقت ہوا جب آپ ترمذی شریف کا درس دینے کے لئے دارالحدیث تحتانی میں تشریف لائے، دوسرے سال ۱۴۱۴ھ و۱۴۱۵ھ مطابق ۱۹۹۴-۱۹۹۵ء میں باضابطہ شرف تلمذ حاصل ہوا۔

آپ معتدل رفتار سے پیادہ پا تیسرے گھنٹے اور بعد نماز مغرب تشریف لاتے آپ کے آنے سے پہلے ہی پوری دارالحدیث کھچا کھچ بھر جاتی، آپ کے آتے ہی سنّاٹا چھاجاتا، آتے ہی سلام اور لا الٰہ الا اللہ کے ورد کے بعد سبق شروع فرمادیتے اور پھر تسلسل کے ساتھ خاص انداز اور لب و لہجے میں پورے گھنٹے اور عشاء کی اذان تک سبق جاری رہتا، اکثر طلبہ آپ کا سبق نوٹ کرتے، احقر بھی پورے سال نوٹ کرتا رہا اور ایک ضخیم مجلد کاپی اس کی برکت سے تیار ہوگئی۔ دورۂ حدیث کے سال گاہ بہ گاہ رفقاء کے ہمراہ عصر کے بعد کی عمومی مجلس میں حاضر ہوتا؛ مگر قریب ہوکر چاہت کے باوجود اپنا تعارف کرانے کی ہمت نہ ہوئی، دورۂ حدیث شریف کے بعد تکمیل ادب اور تخصص فی الادب کے سالوں میں کچھ تعارف ہوا اور قریب جانے کی ہمت ہوئی؛ مگر کئی ملاقاتوں میں نام اور سکونت دریافت فرماتے رہے۔

شفقت جو ہمیشہ یاد رہے گی

ماہ شوال ۱۴۱۷ھ میں احقر نے دارالعلوم دیوبند میں معاونت تدریس کی درخواست پیش کی، دعا کے لئے حاضرِ خدمت ہوا، اپنا ارادہ ظاہر کیا اور دعا کی درخواست کی دوسرے دن حضرت والا نوراللہ مرقدہٗ نے برادر گرامی مرتبت جناب ڈاکٹر مولانا اشتیاق احمد صاحب زید مجدہٗ استاذ دارالعلوم دیوبند جن کا زمانۂ طالب علمی سے آخر تک حضرت والا سے

والہانہ تعلق رہا- کی زبانی پیغام بھیجا کہ وہ لڑکا جو تخصص فی الادب پڑھ رہا تھا اور کل شام آیا تھا اسے کہو کہ ”کل صبح مجھ سے ملے“۔

صبح کو حاضرِ خدمت ہوا، عزیز محترم ”مولوی احمد سعید سلمہ“ (استاذ حدیث جامعۃ الشیخ حسین احمد المدنی دیوبند) ناشتہ لے کر آئے، ساتھ میں ناشتہ کیا، پھر فرمایا: ”میں سفر پر جا رہا ہوں، ایک ہفتے بعد واپسی ہوگی، یہ میرا بچہ ہے (بھائی احمد کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) میں اسے قصص النبیین اور کچھ کتابیں خود پڑھاتا ہوں، آپ انہیں میرے سفر سے واپسی تک پڑھائیں“، حکمِ عالی کے مطابق میں سفر کی واپسی تک سعادت سمجھ کر پڑھاتا رہا، اس طرح حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہٗ سے تعلق بہت پختہ ہوگیا۔ اس واقعے کے بعد سے جب بھی خدمت میں حاضری ہوتی تو خیریت اور مصروفیت ضرور دریافت فرماتے۔

دارالعلوم دیوبند میں معاونتِ تدریس کی مدت کی تکمیل کے بعد احقر کی تقرری ”جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرآداباد“ میں ہوگئی جہاں دس سال تک خدمتِ تدریس انجام دیتا رہا، اس دوران ایک مرتبہ حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہٗ جامعہ قاسمیہ شاہی تشریف لائے خدمت کے لئے احقر مہمان خانے میں حاضر ہوا، سر پر تیل کی مالش کر رہا تھا، فرمایا: ”ہاں بھائی! اور کیا حال ہے؟“ پھر زیر درس کتابوں کے متعلق دریافت کیا، بعد ازاں فرمایا: ”ندائے شاہی میں تمہارا مضمون پڑھتا رہتا ہوں، ٹھیک لکھتے ہو!“

دارالعلوم دیوبند میں تقرر کے بعد شروع کے سالوں میں عموماً جمعہ کو صبح دس بجے ملاقات کے لئے حاضر ہوتا، ہوا یہ کہ ایک جمعہ کو صبح فون کیا، بات نہ ہوسکی، پھر دس بجے فون کیا اور کہا کہ حضرت! صبح کو فون کیا تھا، حاضرِ خدمت ہونا چاہ رہا تھا، فرمایا: ”جمعہ کو فجر کی نماز کے بعد سوتا ہوں، سنو! جمعہ کو مولوی کی صبح نو بجے ہوتی ہے، آنا ہو تو نو بجے کے بعد فون کر کے آیا کرو“۔ ایک مرتبہ دورانِ ملاقات معلوم کیا کہ مکان کہاں ملا ہے؟ میں نے بتایا کہ حضرت اس دارالمدرسین میں جو شیخ الاسلام منزل کے پاس ہے، جہاں حضرت مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی زید مجدہم رہتے ہیں، تو فرمایا: ”وہ جگہ اچھی ہے، مگر یاد رکھو وہ مکان اپنا نہیں

پرایا ہے، اپنے مکان کی فکر کرو‘‘ کس قدر اپنائیت اور شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ آہ !اب ایسی عنایتیں اور شفقتیں کہاں ملیں گی؟

پیکر علم و عمل

طالب علمی اور مدرسی کے زمانے میں بہت سے اکابر علمائے دیوبند کو پڑھنے اور اپنے اساتذۂ عظام کی زبانی سننے کا موقع ملا جو یقیناً مجموعۂ کمالاتِ ظاہریہ و باطنیہ تھے، جنہوں نے اپنے اپنے دور میں کارہائے نمایاں انجام دیے، اللہ رب العزت ان کی خدمات جلیلہ قبول فرمائے۔ مگر احقر کی آنکھوں نے جن اساتذۂ کرام اور مشائخ عظام کو دیکھا ان میں حضرت الاستاذ حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو بھی علم و عمل کے اعتبار سے اکابر دارالعلوم کا پرتو اور عکس جمیل پایا، آپ علم و عمل، تصنیف و تالیف اور تحقیق و تشریح کے رسیا تھے، آپ کا بیشتر وقت، تدریس و تصنیف اور مطالعہ و تحقیق ہی میں گذرتا تھا یہی آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا جب بھی آپ کسی موقعے پر خطاب فرماتے ہمیشہ طلبہ کو جدوجہد، محنت اور تضییعِ اوقات سے بچنے کی تاکید فرماتے، عصر بعد کی عمومی مجلس میں بارہا یہ دیکھنے کو ملا کہ حضرت والا کسی کتاب کی تصحیح اور پروف ریڈنگ میں مصروف ہیں، درمیان میں کسی نے کوئی سوال کیا، آپ نے قلم روک کر جواب دیا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہوگئے، اکثر ملاقاتوں میں ہم جیسے شاگردوں کو محنت کرتے رہنے کی یہ کہتے ہوئے تاکید فرماتے ’’ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ دارالعلوم پہنچ گئے تو محنت کا سلسلہ ختم کر دیا‘‘ سچ ہے: ع

سمجھا کے پستیاں مرے اوج کمال کی
اپنی بلندیاں وہ دکھا کر چلے گئے

عزم و استقلال

علمی و عملی میدان میں آپ کا عزم و استقلال بھی مثالی رہا ہے، کوئی بھی اہم ترین اور ضخیم کتاب ہو اور آپ نے اس کی تحقیق و تشریح کا ارادہ کرلیا تو صفحات کی ضخامت اور کتاب

کی طوالت آپ کی راہ میں کبھی حائل نہ ہوئی، یہی وجہ ہے کہ رب کریم کے فضل وکرم سے آپ نے تن تنہاوہ علمی خدمات اور کارہائے نمایاں انجام دیے جن کے لئے اکیڈمیاں درکار ہیں؛ چناں چہ ”رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ، تحفۃ الالمعی شرح سنن ترمذی، تحفۃ القاری شرح بخاری، فیض المنعم شرح مقدمہ مسلم، تحفۃ الدرر شرح نخبۃ الفکر، مبادئ الفلسفہ جیسی چالیس سے زیادہ معرکۃ الآراء، اپنے نوک قلم سے لکھی ہوئی تصنیفات آپ کے عزم و استقلال اور وقت کی قدر و قیمت پر شاہد عادل ہیں، جن سے امت رہتی دنیا تک فیضیاب ہوتی رہے گی اور آپ کے درجات بلند ہوتے رہیں گے۔ ان شاء اللہ۔

صبر وتسلیم و رضا

یوں تو کئی سالوں سے حضرت والا نور اللہ مرقدہٗ مختلف اعذار وامراض سے دوچار تھے؛ مگر کبھی بھی بیماری کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیا، ہمیشہ آپ کا انداز بس یہی نظر آیا۔

ع

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

حتیٰ کہ بعض بیماریوں میں آپ کا آپریشن بھی ہوا؛ مگر بحالی صحت سے پہلے ہی آپ اپنے تدریسی وتصنیفی عمل میں منہمک ہوجاتے، ایسا عزم وحوصلہ، صبر ورضا وانہماک کم از کم احقر نے حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہٗ کے علاوہ کسی اور میں نہیں دیکھا۔

زبان بندش کی یہی بیماری جس کے علاج کے لئے آپ ”لاک ڈاؤن“ سے پہلے ممبئی تشریف لے گئے تھے ایک سال پہلے بھی آپ کو لاحق ہوئی تھی، عصر کی نماز کے بعد عیادت کے لئے حاضر خدمت ہوا، طلبہ کی ایک بڑی تعداد کے علاوہ متعدد اساتذۂ دار العلوم بھی عیادت کے لئے گئے ہوئے تھے، آپ بولنے کی کوشش کرتے؛ مگر زبان بند ہوجاتی اور آپ مسکرانے لگتے، پھر کچھ آواز کھلتی اور بولنا شروع کردیتے، متعدد مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ جب بھی زبان بند ہوتی آپ مسکراتے اور ذرا راحت ملتی تو ”لا الٰہ الا اللہ“ کے ورد کے ساتھ گفتگو شروع فرمادیتے، یہ صورت حال دیکھ کر احقر حیرت زدہ رہ گیا کہ ایسا عارضہ اگر کسی اور کو لاحق

ہوتا وہ بے چارہ گھبرا جاتا؛ مگر آپ پورے صبر وضبط کے ساتھ بیٹھے رہے۔

”مصائب میں الجھ کر مسکرانا ان کی فطرت تھی“

ایسے ہی ایک مرتبہ آپ کی آنکھ کا آپریشن ہوا، خبر ملی کہ حضرت تشریف لا چکے ہیں عیادت کے لئے حاضرِ خدمت ہوا خیال تھا کہ ابھی آپ آرام کر رہے ہوں گے؛ مگر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت کسی کتاب کی تصحیح میں مصروف ہیں، عرض کیا کہ: حضرت! آپ نے ابھی سے کام شروع کر دیا، فرمایا: ابھی سے، میں نے تو آنے کے بعد ہی کام شروع کر دیا ہے، پھر فرمایا: ”بیماری تو اصل میں وہ ہے جو عمل میں حارج اور رکاوٹ ہو“

عزم واستقلال اور صبر وضبط کے بہت سے واقعات آپ کی زندگی سے جڑے ہوئے ہیں جن کو ذکر کرنے اور دہرانے کا یہ موقع نہیں ہے؛ مگر آنکھوں دیکھے یہ چند واقعات و مشاہدات ہم جیسے شاگردوں اور وفا کیشوں کو یہ سبق ضرور دیتے ہیں کہ کامیابی محنت اور جد وجہد ہی میں ہے۔

ہزاروں رحمتیں ہوں اے میر کارواں تجھ پر
فنا کے بعد باقی ہے شانِ رہبری تیری

رب کریم بال بال مغفرت فرمائے، جنت الفردو میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ کی خدمات کو قبول فرما کر بہترین صلہ عطا فرمائے۔ آمین!

خدا کی رحمتیں تیری لحد پہ سایہ فرمائیں
ہمیشہ تربت پر فرشتے پھول برسائیں

حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ

نقوش وتاثرات

مولانا منیر الدین عثمانی نقشبندی
استاذ دار العلوم دیوبند

۲۴؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹؍مئی ۲۰۲۰ء کی صبح ۷؍بجے کورونا وائرس کی دہشت تھی، سناٹا تھا، دیوبند کی گلیاں اور شاہراہیں خاموشی کی چادریں اوڑھے ہوئے گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھیں کہ ایک صاعقہ اثر خبر پردۂ سماعت سے ٹکرائی کہ مسند حدیث کا مہتاب غروب ہوگیا، جس کی ضیا پاشیوں سے ہزاروں ستارے روشن ہوتے تھے، اس کے غروب ہونے سے ان گنت تاروں کی روشنی ماند پڑ گئی۔ کتنے گلشن حدیث اس کی ضیا باریوں سے سرسبز وشاداب دکھائی دے رہے تھے، اس کے غروب ہوجانے سے خزاں رسیدہ نظر آرہے ہیں، گلشن حدیث کے ہزاروں گلوں کو اس کی چمک سے خوشبوئیں فراہم ہوتی تھیں، اس کے ڈوبنے سے خوشبوئیں معدوم نظر آرہی ہیں، کتنی کلیوں کو اس کے وجود سے کھلنا نصیب ہوتا تھا، اس کے غروب ہونے سے بن کھلے مرجھا گئیں، اس کے وجود سے بے شمار احادیث نبویہ کے شجر ثمر بار ہوتے تھے، اس کے غروب ہونے سے وہ اشجار بے ثمر ہوکر رہ گئے، اس کے وجود سے ہزاروں تشنگان احادیث کو سیرابی ملتی تھی، اس کے عدم سے سیرابی کے لئے تڑپ رہے ہیں، وہ ماہتاب استاذ گرامی مرتبت، شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری کی ذات گرامی ہے، جس کے پردۂ عدم میں چلے جانے سے اس عاجز کی آنکھیں اشک بار ہیں، جگر پارہ پارہ ہے، طبیعت غم واندوہ کی مسموم ہواؤں سے جھلسی ہوئی ہے، پورا ماحول سوگوار ہے، آلام ومصائب اتنے شدید

ہیں کہ اگر وہ روشن دنوں پر ڈال دیے جائیں تو تاریک شب میں تبدیل ہو جائیں۔

صبت علی مصائب لوانها

صبت علی الایام صرن لیالیا

اس عاجز کی طرح ہزاروں تلامذہ اپنے مشفق استاذ گرامی مرتبت کی جدائیگی کے غم سے نڈھال ہیں، جو اپنے جملہ شاگردوں کے لئے نہ صرف استاذ؛ بلکہ ایک شیخ وقت اور پیر طریقت تھے، جو اپنے سالک کی ہر چہار سمت نظر رکھتا ہے، شفیق ایسے کہ ہر سو شفقت برستی تھی، اپنی اولاد میں سے ہر ایک کو دنیاوی اعتبار سے خود کفیل بنانے کے خواہشمند اور دینی لحاظ سے سب کو دیندار دیکھنے کے آرزومند رہتے تھے، اس عاجز پر تو حد سے زیادہ مہربان و کرم فرما تھے، یہ عاجز تقریباً تین سال محلّہ کوٹلہ دیوبند میں حضرت کے پڑوس میں رہا، حضرت نے جس طرح پڑوس کا حق ادا کیا وہ ایک مومن کامل کی مثال ہے، اس دوران حضرت والا کی شفقتوں سے خوب متمتع ہوا۔

مارچ ۲۰۰۱ء میں بچوں کی دل لگی کے لئے ایک گراں قیمت مرغا خریدا، مگر کچھ دنوں بعد کسی خیر خواہ کی نظر میں وہ مرغا بھا گیا اور اس نے اس کو غائب کر دیا، اس کے لئے حضرت اقدس گھر پر تشریف لائے، تعزیت فرمائی اور دیر تک تسلی کے کلمات ارشاد فرماتے رہے، جس سے دل کو بڑی تسکین نصیب ہوئی۔

جنوری ۲۰۱۹ء میں جب عاجز زادی کے عقد نکاح کا مسئلہ آیا تو یہ عاجز ڈرتے ڈرتے مفتی اشتیاق احمد صاحب، مدرس دارالعلوم دیوبند کی معیت میں حاضر خدمت ہوا، اور عقد نکاح میں شرکت کی درخواست پیش کی، حضرت والاؒ نے بہ طیب خاطر منظور فرمائی حالانکہ حضرت کی طبیعت علیل تھی، کسی قسم کی مجلس میں شرکت نہیں فرماتے تھے، فرمایا کہ میں ضرور شرکت کروں گا، ساتھ ہی فرمایا کہ تمہاری امی (اہلیہ مرحومہ) سے تمہاری اہلیہ اور اس بچی کا بڑا گہرا ربط تھا، چنانچہ بعد نماز عصر جامع رشید میں مجلس نکاح منعقد ہوئی، حضرت نے شرکت فرمائی اور بڑی جامع اور مستجاب دعا فرمائی۔

حضرت استاذ گرامی ان موفق اور بافیض علماء میں سے ہیں جن سے اللہ رب العزت نے تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف کا خوب کام لیا۔ شمالی گجرات کے مردم خیز اور متدین علاقہ پالن پور، ضلع بناس کانٹھا، مقام کالیڑہ میں ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۰ء میں حضرت کی ولادت باسعادت ہوئی، والد محترم نے بسم اللہ خوانی کی رسم ادا کی۔ پہلے گاؤں کے مکتب سے اکتساب فیض کیا۔ پھر گجرات کی معروف دینی درس گاہ دارالعلوم چھاپی تحصیل علم دین کے لئے اپنے ماموں جان مولانا عبدالرحمٰن کے ہمراہ تشریف لے گئے، مگر اللہ رب العزت نے حضرتؒ کے لئے کچھ اور ہی سعادتیں مقدر فرما رکھی تھیں، اس لئے صرف چھ ماہ کی مختصر مدت کے بعد مصلح الامت حضرت مولانا نذیر احمد صاحب پالن پوری کے ادارہ میں منتقل ہوگئے اور مولانا نذیر احمد صاحب کے مدرسہ کے فن کار ماہر اساتذہ کرام حضرت مفتی محمد اکبر صاحب پالن پوریؒ اور حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب بخاریؒ سے ابتداء سے شرح جامی تک کتابیں پڑھیں۔ ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء میں شمالی ہند کی بافیض درسگاہ جامعہ مظاہر علوم سہارنپور میں داخل ہوئے اور فن نحو میں دسترس رکھنے والے امام النحو علامہ صدیق احمد صاحب جمویؒ سے تین سال تک کسب فیض کیا، فن نحو کے علاوہ منطق اور فلسفہ میں بھی استفادہ کیا۔

مادر علمی دارالعلوم دیوبند میں اس وقت علم حدیث و فقہ کے آفتاب و ماہتاب موجود تھے جو حدیث و فقہ کی روشنی سے علمی دنیا کو روشن کر رہے تھے اور پوری دنیا ان کی ضیا پاشیوں سے چمک رہی تھی۔ حضرت اقدسؒ نے بھی ان سب کے علمی نور کو اپنے دامن میں سمیٹنے کے لئے ۱۳۸۰ھ مطابق ۱۹۶۰ء میں داخلہ لیا اور یکتائے روزگار ہستیوں سے علمی استفادہ میں مشغول ہوگئے۔ حدیث کے شناور، مسند حدیث کے شہ نشیں فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ سے بخاری شریف کی تکمیل کی۔ فن منطق و فلسفہ میں بے مثیل اور افہام و تفہیم میں منفرد شخصیت حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ سے مسلم شریف اور ترمذی شریف میں کسب فیض کیا۔

دورۂ حدیث کے بعد فقہ و فتاویٰ کے روشن ستارہ حضرت مفتی مہدی حسن صاحبؒ

سے فتویٰ نویسی کی تربیت حاصل کی۔ اس طرح اپنے زمانے کے یکتائے روزگار ہستیوں سے استفادہ کیا جس کی وجہ سے اللہ رب العزت کی ودیعت کی ہوئی صلاحیتوں میں خوب جلا پیدا ہوا اور آپ علیہ الرحمہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہو گئے۔

مادر علمی دارالعلوم دیوبند سے درس نظامی کی تکمیل کے بعد ۱۳۸۴ھ میں جامعہ اشرفیہ راندیر سورت گجرات میں بحیثیت علیا آپ کا تقرر ہوا، اور مختلف علوم وفنون کی تدریس کے ساتھ کتب احادیث آپ سے متعلق رہیں، جب تدریس کے لئے مادر علمی سے روانگی عمل میں آئی تو شیخ المعقول والمنقول حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے اور خصوصی نصیحت کی درخواست کی، اس پر حضرت علامہ نے فرمایا: صبح تشریف لائیے چناں چہ صبح حاضری کے موقع پر تین گراں قدر نصیحتیں فرمائیں۔ فرمایا:

(۱) فن دیکھ کر پڑھائیے، علم آئے گا۔

(۲) طلبہ کو اپنی اولاد سمجھئے، طلبہ محبت کریں گے۔

(۳) سنت نبوی ﷺ کی پیروی کیجئے، لوگوں کی الفت نصیب ہوگی۔

چنانچہ حضرت اقدسؒ نے تینوں نصیحتوں کو دل کے گوش سے سنا اور ان پر عمل کی گرہ باندھ لی۔ جامعہ اشرفیہ راندیر سورت میں تدریس کے دوران مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی عقابی نگاہ آپ پر پڑی اور آپ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں خدمتِ تدریس کی دعوت پیش کی۔ اولاً دعوت تدریس منظور فرمائی، پھر غور وفکر کے بعد جامعہ اشرفیہ کی خدمت تدریس کو ترجیح دی اور حضرت علی میاں ندویؒ کو (ممبئی حاضری پر) ممبئی میں جا کر معذرت پیش فرمادی۔

جامعہ اشرفیہ راندیر سورت میں دس سال خدمت تدریس کے بعد ۱۳۹۳ھ میں دارالعلوم دیوبند کی خدمت تدریس کے لئے آپ کا انتخاب عمل میں آیا، انتخاب کے بعد مختلف علوم وفنون کی کتابیں متعلق ہوتی رہیں اور آپ کامیاب تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ استاذ گرامی قدر حضرت مولانا نصیر احمد صاحب کی علالت کے بعد ۱۴۲۹ھ مطابق

۲۰۰۸ میں بخاری شریف اول آپ سے متعلق کی گئی اور آپ کو شیخ الحدیث وصدر المدرسین کے عظیم منصب پر فائز کیا گیا اور تا حین حیات اس منصب جلیلہ پر فائز رہے۔

منصب تدریس جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب ہے، اس منصب کا میسر آنا توفیق باری تعالیٰ ہے اور اس منصب کے حصول کے بعد اس کو غنیمت سمجھنا اتباع سنت ہے۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے اس منصب تدریس کو جان سے زیادہ عزیز سمجھا جب درس کا وقت ہو جاتا تو کوئی سخت سے سخت چیز بھی رکاوٹ نہیں بن پاتی، موسم سرما کی برفیلی ہوائیں ہوں، موسم گرما کی لوزدہ آندھی، زمانۂ مرض کی تکلیف بھی آپ کی تدریس میں حائل نہیں ہو پاتی؛ بلکہ ڈاکٹروں کی تدریس کو منع کرنے کے باوجود تدریسی خدمت میں عافیت محسوس کرتے اور گھنٹوں تدریس کے بعد تکلیف کے بجائے آرام وراحت محسوس کرتے، تدریس ایسی کہ جب حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے درس کا وقت ہوتا، تمام متعلقہ طلبہ بھاگ دوڑ کر اپنی اپنی جگہ حاصل کرتے، سکون سے بیٹھ جاتے، ماحول میں سناٹا چھا جاتا، اور ''کان علی رؤسھم الطیر'' کا منظر دکھائی دیتا اور تفہیم ایسی کہ ذکی، متوسط اور غبی تینوں طبقات کے طلبہ یکساں مستفید ہوتے، ایک نشست میں تین تین گھنٹے کا درس بالکل بھی گراں محسوس نہیں؛ بلکہ مزید استفادہ کے خواہشمند ہوتے، خاردار، شعلہ بار اور کٹھن راہوں سے گذر کر نرم و گرم جھیلتے ہوئے، موج حوادث میں ہنستے اور کھیلتے ہوئے شبانہ روز کی جدوجہد اور محنت ومشقت کے ذریعہ صبح تمنا کی کرن تک پہنچنے کے عادی تھے، جامعہ اشرفیہ راندیر میں تنخواہ کی مقدار قلیل تھی خرچ پورا ماہ کفایت نہیں کرتا تھا، پہلے عشرہ میں چائے وپان ساری چیزیں تکمیل تک پہنچتی تھی دوسرے عشرہ میں چائے رہتی، پان بند ہو جاتا اور تیسرے عشرہ میں چائے وپان دونوں چیزیں بند ہو جاتی تھیں مگر کبھی تدریس موقوف نہ ہونے پائی اور نہ ہی کبھی جگہ کی تبدیلی کا خیال ذہن میں آیا اور اپنے ماتحتوں کی ترقی کے لئے تڑپنا، پھڑکنا اور گھلنا اور اپنی تمام تر توانائیوں کو صرف کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا اور اپنی ۱۳؍اولاد کو خود کفیل بنانے کے لئے اسباب مہیا فرماتے اور اسباب میں مصروف کرنے کی فکر فرماتے؛ تاکہ ان لوگوں کو دشوار

گزار گھاٹیوں سے گذرنا نہ پڑے اور مشکل ایام دیکھنا نہ پڑے۔ آج -الحمدللہ- حضرتؒ کی ۱۳ر صلبی اولاد میں سے جو حیات مستعار سے لیث ہیں وہ بقدر کفایت اسبابِ معیشت سے بھی لبریز ہیں۔

تصنیف و تالیف اللہ رب العزت کی بیش بہا نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت ہے، جو استاذ گرامی مرتبت کے حصہ میں وافر مقدار میں آئی بعض تصانیف تو ایسی ہیں کہ سوچ کر دانتوں کو پسینہ آجاتا ہے۔ ”رحمۃ اللہ الواسعہ، شرح حجۃ اللہ البالغہ“ حضرت کی ایسی کاوش ہے جس نے علماء امت سے ایسا قرض اتارا ہے جو عرصہ سے چلا آرہا تھا۔ ”عمدۃ القاری شرح بخاری شریف“ بارہ جلدوں میں ”تحفۃ الالمعی شرح ترمذی شریف“ ۸ جلدوں میں۔ الغرض ہر فن میں آپؒ کی بیش قیمت تصانیف درجنوں کی تعداد میں کتب خانہ علمیہ کے ذخیرے ہیں جن سے دنیا ہمیشہ استفادہ کرتی رہے گی۔ ”مبادی الفلسفہ“ فن فلسفہ میں وہ گراں قدر تصنیف ہے جو فن فلسفہ کے شیدائیوں کے لئے بنیاد اور اصول کی حیثیت رکھتی ہے، جس کے بغیر فن فلسفہ کی تحصیل دشوار گذار اور مشکل ہے اور تقریباً تمام مدارس اسلامیہ میں داخل نصاب ہے۔

استاذ گرامی مرتبت ایسے خاندان کے فرد فرید تھے جو بزرگوں سے مضبوط رشتہ رکھتا تھا، آپ کے والد گرامی قدر الحاج حضرت یوسف صاحب متدین اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے خاص اور مقرب بندوں کے ارادت مند اور عقیدت مند تھے، اسی وجہ سے انہوں نے اپنی پانچوں نرینہ اولاد کو حصول علم دین میں لگایا ان میں سے تین حضرت مفتی سعید احمد صاحب حضرت مفتی محمد امین صاحب اور حضرت مفتی حبیب احمد صاحب خدمت علم دین کے لئے وقف ہوگئے، ان کا خلوص تھا کہ اللہ رب العزت نے ان تینوں کو دین مبین کی سعادت بھری خدمات سے بہرہ ور فرمایا، بلکہ ان میں سے اول الذکر دونوں مادر علمی دارالعلوم دیوبند میں حدیث کے ممتاز اساتذۂ کرام میں شامل ہیں۔ استاذ گرامی مرتبت کی پروقار شخصیت ہمارے لئے تمام امور میں مرجع کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کا وجود مسعود ایک مبارک گھنیرے اور پھلدار درخت کے مانند تھا اور ہر محفل کے لئے شمع تھے لیکن کسی چیز کی قدر و قیمت اسی وقت

سمجھ میں آتی ہے جب وہ باقی نہ رہے۔

آہ! اس شخصیت کے زندہ رہنے سے کتنے اقدار وروایات اور حوصلے وامنگوں کو فروغ ملتا تھا، آج اس کے اٹھ جانے سے کتنی شمعیں بے نور اور کتنی محفلیں سونی ہوگئیں۔

ع

کہاں ہے آج تو اے آفتاب نیم شبی
چلا جاتا ہوں ہنستا، کھیلتا موجِ حوادث سے

انسان کتنا ہی توانا وتندرست ہو مگر وہ ایک کمزور مخلوق ہے خود خالق کائنات نے فرمایا: وخلق الانسان ضعیفا ”انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے، اس مضمون کو مزید وضاحت کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ روم میں بیان فرمایا ہے:

”الله الذی خلقکم من ضعف ثم جعل من بعد ضعف قوة ثم جعل من بعد قوة ضعفا و شیبة یخلق مایشاء و هو العلیم القدیر“ (سورہ روم آیت ۵۴)

اس آیت میں اللہ رب العزت نے انسان کے تین مراحل ذکر فرمائے ہیں ابتدائی کمزوری، درمیانی توانائی اور انتہائی کمزوری، گویا انسان کمزور زیادہ ہے، توانا وطاقت ور کم۔

استاذ گرامی مرتبت صبر واستقامت کے پیکر جمیل تھے کتنے بھی حوادث آئے سب کو بسہولت انگیز کر لیتے تھے۔ عمر کی ۸۲/ بہاروں سے گذرنے کے باوجود ہشاش بشاش رہتے تھے دورۂ حدیث شریف کی جماعت میں تدریس کے طاقت ور اور مضبوط ستون تھے کسے معلوم تھا کہ یہ مضبوط ستون اتنی جلدی گر جائے گا وہ نکتہ آفریں درس جس کے سننے کے بعد ذہن ودماغ کو غذا ملتی تھی وہ درس جس کے سننے کے لئے ہر طالب علم سانس روکے گوش برآواز رہتا تھا کہ مبادا کوئی لفظ دل وکان میں پڑنے سے قبل ہوا کے دوش پر اڑ نہ جائے۔ ہر لفظ ہیرے جواہرات سے گراں، آتش فروزاں سے زیادہ پرسوز، درد وکرب سے لبریز، در یتیم

سے زیادہ صاف وستھرا، تختِ طاؤس سے زیادہ قیمتی، اخلاص ووفا سے دھلا ہوا، احتساب و للّٰہیت سے تاباں، خونِ جگر سے رنگین، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دل کی بے چینی وکرب وسوز الفاظ وعبارات کے جامہ میں تبدیل ہورہا ہے، کسے پتہ تھا کہ یہ آواز یک لخت خاموش ہوجائے گی۔

۱۶/رجب المرجب ۱۴۴۱ھ کی وہ گھڑی آگئی جس میں کمزوری تندرسی پر غالب آگئی، توانائی مغلوب ہوگئی، مجلس درس سونی ہے، صرف قاری روایات طالب علم کی آواز کانوں میں آرہی ہے مگر جس آواز کے لئے سماعت بے چین ہے، اس میں بالکل سکوت ہے یہی صورت حال پانچ دنوں تک برقرار رہتی ہے اور ۲۲/رجب المرجب ۱۴۴۱ھ بعد نماز عشاء درس کا آغاز ہوتا ہے، قاری روایات کی آواز گونجنے لگتی ہے، طلبۂ دورۂ حدیث سناٹے میں ہیں بخاری شریف کی تکمیل ہوتی ہے اور شیخ وقت کی زبان مبارک سے صرف ایک جملہ نکلتا ہے ''جو اللہ چاہے گا وہ ہوگا'' اس جملہ کا سننا تھا کہ طلبہ کی چیخیں نکل گئیں پورا مجمع زاروقطار رونے لگا اور روتے روتے محفل برخواست ہوگئی۔

۲۲/رجب المرجب ۱۴۴۱ھ شام میں اس عاجز کی خدمت میں حاضری ہوئی مگر کوئی بات نہ ہوسکی، پھر جب ۲۳/رجب ۱۴۴۱ھ صبح میں حاضری ہوئی تو حضرت کی زبان مبارک سے الفاظ صاف نکل رہے تھے، باتیں کیں اور فرمایا کہ تم کل آئے تھے لیکن میری زبان بندتھی اوراب زبان جاری ہے پھر بغرض علاج ممبئ جانے کا تذکرہ آیا اور فرمایا کہ دوپہر کی فلائٹ سے ممبئ کے لئے روانہ ہورہا ہوں، چناں چہ ۲۳/رجب المرجب ۱۴۴۱ھ میں ممبئ تشریف لے گئے ایک ہفتہ کے علاج کے بعد الحمدللہ صحت بحال ہوگئی اور مجلس وعظ و نصیحت کا آغاز فرمادیا، وہ دیوبند لوٹنا چاہتے تھے لیکن ملک میں لاک ڈاؤن کی وجہ سے ساری سواریاں مسدود ہوگئیں تھیں جس کی وجہ سے ممبئ میں قیام کرنا پڑا پھر ۲۳/ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ میں طبیعت بگڑ گئی، ایک نجی ہسپتال میں داخل کیا گیا مگر وقت موعود آپہنچا تھا جس کی وجہ سے ۲۵/رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ کی صبح کی اولین ساعتوں میں کلمہ پڑھتے ہوئے اپنے محبوب حقیقی اللہ رب العزت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس دارفانی کو خیرباد کہہ

دیا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

اب ہم تقدیری فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں، جس طرح رسول اکبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی وفات پر اپنے غم کا اظہار فرمایا تھا۔ اللہ رب العزت کی مرضی پر رضا ظاہر فرمائی تھی ''ان العین تدمع ، والقلب یحزن، ولا نقول الا ما یرضیٰ ربنا وانا بفراقک یا ابراھیم لمحزونون'' ہماری آنکھیں اشک بار ہیں، دل غمگین ہیں، ہم اپنی زبان پر وہی لاتے ہیں جو ہمارے رب کی خوشنودی کا سبب ہو اور اے ابراہیم! ہم تمہاری جدائی سے بے حد غمگین ہیں۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لئے

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری

ایک عہد آفریں شخصیت

مولانا محمد ساجد صاحب قاسمی ہردوئی — **استاذ تفسیر وادب دار العلوم دیوبند**

مؤرخہ ۲۵؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ (۱۹؍مئی ۲۰۲۰) کو حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری (شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند) کی رحلت کا افسوس ناک واقعہ پیش آیا، آپ ؒ ہم کنبۂ دار العلوم اور تمام وابستگان حلقۂ دیوبند، بلکہ عالم اسلام کے علمی حلقوں میں بھی معروف تھے اور وہ حلقے آپ کی علمی عظمت کے معترف تھے اسی لئے آپ کے انتقال پر پوری دنیا سے تعزیتی پیغامات کا سلسلہ بندھ گیا۔

ایک عہد آفریں شخصیت

واقعہ یہ ہے کہ آپ ایک عہد آفریں شخصیت کے مالک تھے، آپ اپنے درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور تربیت ورہنمائی کے لحاظ سے ایک فرد نہیں؛ بلکہ ایک انجمن تھے آپ کی وفات سے ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا اور یک انجمن سونی پڑ گئی، آپ کی پوری زندگی جہد مسلسل سے عبارت تھی اور نئی نسلوں کے لئے آپ کی زندگی میں بہت کچھ سیکھنے کی چیزیں ہیں

زمانۂ طالب علمی سے لے کر وفات سے چند روز قبل تک جہد مسلسل اور پیہم علمی اشتغال کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو علمی جامعیت سے نوازا تھا، آپ کو متداول اسلامی علوم پر بڑی دستگاہ تھی، ان میں سے ہر ایک میں آپ کا حصہ تھا، کسی بھی علمی موضوع پر آپ

بڑی بصیرت کے ساتھ گفتگو کیا کرتے تھے جس سے سامعین بھی مطمئن ہو جاتے اور اس موضوع پر ان کو بصیرت بھی حاصل ہوتی تھی، یہ آپ کی علمی جامعیت کی دلیل تھی۔ دار العلوم دیوبند میں وقتاً فوقتاً ہونے والے علمی و تربیتی اور اصلاحی پرگراموں میں آپ کا خطاب ہوتا تھا آپ کا خطاب بہت وقیع، پر مغز اور بصیرت افروز ہوتا، جو آپ کی علمی شخصیت کا عکاس ہوتا تھا۔

یکسوئی و علمی اشتغال

آپ وقت کے انتہائی پابند تھے۔ اسباق اور میٹنگوں میں ٹھیک وقت پر پہنچتے تھے اور وقت کی پابندی کی ہم مدرسین اور طلبہ کو نصیحت بھی کیا کرتے تھے۔ آپ اپنے معمولات کے بڑے پابند تھے، حتیٰ کہ کبھی کبھی بعد نماز عصر اپنے لکھنے پڑھنے کا معمول جاری رکھتے تھے البتہ اگر طلبہ یا اساتذہ آپ کے پاس عصر کے بعد جاتے تو ان سے پوری توجہ سے گفتگو کرتے تھے۔ آپ نے اپنے آپ کو تدریسی اور علمی مصروفیات کے لئے یکسو کر لیا تھا آپ نہ کوئی انتظامی ذمے داری سنبھالتے تھے اور نہ سیاسی یا نیم سیاسی مسائل میں پڑتے تھے اور نہ ہی اس قسم کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے؛ البتہ جمعیۃ علماء ہند کے زیر انتظام ادارۃ المباحث الفقہیہ کے فقہی سمیناروں میں تقریباً پابندی سے شریک ہوتے تھے، جب کہ جمعیۃ کے عمومی اجلاسات میں آپ شرکت نہیں کرتے تھے جو علمی و دینی خدمات آپ نے انجام دیں وہ یکسوئی اور زندگی کے ہنگاموں سے اپنے آپ کو دور رکھے بغیر ممکن نہیں تھیں۔

دو شخصیتوں کی کتابوں سے غیر معمولی دلچسپی

آپ نے تدریس و تعلیم کے ساتھ مدرسی کی شروعات ہی سے تصنیف و تالیف کا آغاز کر دیا تھا۔ آپ نے جن شخصیات کو زیادہ پڑھا ان میں سے ایک امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور دوسرے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی ہیں۔ آپ ان دونوں کے فکر و فلسفے سے زیادہ متاثر تھے؛ چنانچہ آپ نے اول الذکر کی کتابوں کا نہ صرف مطالعہ کیا؛ بلکہ آپ نے ان پر کام بھی کیا، آپ نے شاہ صاحب کی کتاب الفوز الکبیر کے فارسی نسخے کا عربی میں ترجمہ کیا اور العون الکبیر کے نام سے اس کی عربی شرح بھی لکھی۔ شاہ صاحب کی دوسری کتاب حجۃ اللہ

البالغہ جو آپ کا علمی شاہ کار ہے، آپ نے دار العلوم میں عرصۂ دراز تک اس کی تدریس کی خدمت انجام دی اور اس پر عربی میں حواشی بھی لکھے، نیز اس کی اردو زبان میں رحمۃ اللہ الواسعہ کے نام سے مبسوط شرح بھی لکھی جو آپ کا ایک اہم علمی کارنامہ ہے۔

ثانی الذکر حضرت نانوتوی کی کتابوں کا بھی آپ نے گہرائی و گیرائی کے ساتھ مطالعہ کیا اور اپنے حاصل مطالعہ کو ''افادات قاسمی'' کے نام سے مرتب کیا جو ماہنامہ الفرقان لکھنؤ سے قسط وار شائع ہوا۔ نیز اسی طرح آپ نے حضرت نانوتوی کی کتاب توفیق الکلام کی نہایت آسان شرح کے انداز میں (کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟) نامی کتاب بھی مرتب کی۔

اس کے علاوہ آپ نے متعدد درسی کتابوں بالخصوص قرآن کریم کی تفسیر اور حدیث کی کتابوں پر کام کیا، جن میں قرآن کی تفسیر ہدایت القرآن اور بخاری کی شرح تحفۃ القاری اور ترمذی کی شرح تحفۃ الالمعی قابل ذکر ہیں۔

تقریر و تحریر میں اچھوتا انداز

اللہ تعالیٰ نے آپ کو تقریر و تحریر کا بہت سہل و آسان اور اچھوتا انداز عطا فرمایا تھا، آپ اسباق کے مضامین کو بہت سہل و آسان اور دلنشیں انداز میں پیش کرتے تھے، چنانچہ مشکل سے مشکل مسائل کو عام فہم انداز میں پیش کرتے، جنہیں سننے والے بآسانی سمجھ لیتے تھے اور مشکل ہونے کے باوجود ان کو سمجھنے میں کسی قسم کی کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔

یہی حال آپ کی تحریر کا بھی تھا، آپ کا اسلوب سادہ، عام فہم اور بلا کی سلاست لیے ہوئے تھا، مشکل اور پیچیدہ مسائل کو آسان انداز میں پیش کرنے کا آپ کو بڑا ملکہ تھا آپ کے اسلوب کو سہل ممتنع کہا جا سکتا ہے، یعنی اسلوب اتنا آسان کہ اس سے آسان ممکن نہ ہو۔ حضرت شیخ الہند کی کتاب ادلۂ کاملہ کی آپ نے تسہیل کی اور اپنے خاص اسلوب میں اس کے مسائل کی توضیح کی۔ میرے وطن کے ایک بڑے عالم نے آپ کی اس کتاب کی زبان اور اس کے اسلوب تحریر کی بڑی تعریف کی جن کا ذوق ادب نکھرا ہوا ہے۔

قابل رشک زندگی

حضرت مولانا عمید الزماں صاحب (برادر خورد حضرت مولانا وحید الزماں صاحب) آپ کے رفیق درس تھے، فراغت کے بعد دار العلوم میں عربی زبان میں ترجمہ اور تحریری کاموں کے لئے ملازم رکھے گئے، کچھ مدت یہاں کام کیا، اس کے بعد دہلی چلے گئے اور سعودی سفارت خانے میں ملازم ہو گئے اس وقت سفارت خانے میں مولانا کی تنخواہ چالیس ہزار تھی، یہ اب سے تقریباً تیس سال پہلے کی بات ہے، جب کہ مدارس میں اس وقت تنخواہ تین ہزار سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ مفتی صاحب نے ایک بار ان سے کہا کہ بھائی عمید الزماں صاحب آپ اتنی تنخواہ کا کیا کرتے ہیں؛ اوڑھتے ہیں یا بچھاتے ہیں، منشاء یہ تھا کہ اتنی بڑی تنخواہ کا مصرف کیا ہے؟ جب کہ مفتی صاحب کی مدرسے سے قلیل تنخواہ تھی اور کتابوں کی معمولی سی تجارت تھی، آپ اسی پر گذر بسر کرتے تھے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کے یہاں مالی وسعت عطا فرمائی اور آپ نے بلا تنخواہ پڑھایا بلکہ ماضی میں جو تنخواہ لی تھی اسے واپس بھی کردی۔

مولانا عمید الزماں صاحب آپ کے بارے میں فرماتے تھے کہ ان کے پاس دین بھی ہے اور دنیا بھی اور وہ خود دار العلوم کی ملازمت چھوڑ کر سفارت خانے کی ملازمت اختیار کرنے پر افسوس کا اظہار کرتے تھے۔

عادات و اخلاق

آپ انتہائی خلیق اور ملنسار تھے اور اپنے خوردوں کے ساتھ خوش طبعی اور بے تکلفی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ لوگ اپنے اردگرد وقار کا ایک ہالہ بنا کے رکھتے ہیں، خوردوں کا ان کے پاس بے تکلفی سے کوئی بات کرنا یا ہنسنا گستاخی تصور کیا جاتا ہے حضرت مفتی صاحب کے یہاں اس طرح کی کوئی بات نہیں تھی؛ چنانچہ ہم لوگوں سے خوش طبعی کی باتیں کرتے، اور ہم لوگوں سے بھی کچھ سنانے کے لئے کہتے۔ آپ کی ایک خوبی سب کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کا معاملہ تھا، ہم لوگ جب بھی اپنی انتظامی یا ادارہ جاتی کوئی

ضرورت لے کر گئے تو اسے بغور سنا اور اس سلسلے میں ممکنہ تعاون بھی کیا۔

اصابت رائے

اللہ تعالیٰ نے آپ کو اصابت رائے سے بھی نوازا، علمی مسائل و معاملات میں آپ کی رائے بہت صائب ہوتی تھی اور بڑی جرأت کے ساتھ آپ اپنی رائے رکھتے تھے۔

خوردوں کی علمی رہنمائی و حوصلہ افزائی

آپ علمی کاموں میں رہنمائی اور بڑی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور مفید آراء سے بھی نوازتے تھے، چنانچہ بہت سے لوگوں نے آپ کی رہنمائی اور سرپرستی میں کتابیں تصنیف کیں اور مصنف بن گئے۔ ناچیز نے دارالعلوم میں آنے کے بعد حضرت نانوتوی کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ شروع کیا اور جب وہ تراجم شیخ الہند اکیڈمی کی جانب سے طبع ہو کر آئے تو میں نے آپ کی خدمت میں انہیں پیش کیا۔ آپ نے بڑی حوصلہ افزائی فرمائی اور اس وقت آپ نے حجۃ اللہ البالغہ کا ایک نسخہ دیا عربی زبان میں جس کی تحقیق و تعلیق کا کام آپ نے کیا تھا وہ ابھی ابھی طبع ہو کر آئی تھی اور کہا کہ اس کتاب کو اس قسم کا کام کرنے والے سمجھیں گے۔

ناچیز نے دارالعلوم میں آنے کے بعد جو کچھ تھوڑا بہت کام کیا وہ آپ کی خدمت میں پیش کیا، آپ نے اسے ملاحظہ فرمایا اور اس کے سلسلے میں کوئی مفید رائے اور مشورہ ضرور دیا۔ تحصیل علم کے موضوع پر میں نے اپنا مختصر رسالہ (تحصیل علم میں اسلاف کی قربانیاں) آپ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے اسے پورا پڑھا اور اگلی ملاقات پر فرمایا کتاب اچھی ہے؛ البتہ اس میں فلاں فلاں واقعہ مناسب نہیں ہے، اسے اگلے ایڈیشن میں نکال دینا۔

نیز جب میں نے ”تیسیر الانشاء“ کے سلسلے کا پہلا جزو مرتب کیا اور طبع ہونے کے بعد آپ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے اسے پسند فرمایا؛ البتہ بعض آراء بھی دیں اور فرمایا جب اگلے اجزاء مرتب کرنا تو طبع کرانے سے پہلے مجھے دکھانا، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ دوسرا جزو جب مرتب کیا تو اسے آپ کو دکھایا اور آپ کے مشوروں کے مطابق اس میں ترمیم کی، نیز تیسرے جزو کی ترتیب کے وقت بھی ایسا ہی کیا۔ طبع ہونے کے بعد جب میں

نے تیسرا جزء پیش کیا تو آپ نے مجھے ایک ہزار روپیہ دیا اور فرمایا کہ پانچ سو اس جزو کا ہدیہ ہے اور پانچ سو پچھلے جزو کا۔

جیسا کہ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ آپ کو حضرت نانوتوی کے فکر و فلسفے سے بہت گہرا لگاؤ تھا اور اس موضوع پر آپ نے کام بھی کیا تھا؛ چنانچہ اس موضوع پر آپ کی رائے بہت اہمیت کی حامل تھی، اسی طرح اس موضوع پر کام کو پسند بھی کرتے تھے۔ ابھی چند سال پہلے دارالعلوم وقف نے حضرت نانوتوی پر ایک سیمینار کرنے کا فیصلہ کیا تھا، حضرت نانوتوی کی شخصیت سے متعلق موضوعات کی فہرست آئی اور مجھے بھی ایک موضوع پر لکھنے کے لئے کہا گیا۔ میں نے اپنے لیے (فلسفۂ قاسمی: منہج اور اصول) کے موضوع کا انتخاب کیا۔

حضرت نانوتوی کی کتابوں کے ترجمہ کے دوران آپ کی کتابوں اور تحریروں کو غور سے پڑھنے کا موقع ملا، میں نے دیکھا کہ حضرت کے یہاں کچھ اصول ہیں کہ جن کی روشنی میں آپ گفتگو کرتے ہیں، آپ پہلے اصول ذکر کرتے ہیں اس کے بعد جزئیات ان پر متفرع کرتے ہیں۔ میں نے اپنے اس مضمون میں حضرت کے انہیں اصولوں کو اور ان کی تفریعات کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ مضمون مکمل کر کے سیمینار کے منتظمین کے حوالے کر دیا؛ لیکن سیمینار کسی وجہ سے ملتوی ہو گیا، تو میں نے مضمون اشاعت کے لئے ماہنامہ دارالعلوم میں دے دیا، چنانچہ وہ شائع بھی ہو گیا۔

ایک دن میں عصر کے بعد آپ کی مجلس میں گیا تو آپ نے ماہنامہ دارالعلوم میں شائع ہوئے میرے اس مضمون کا تذکرہ کیا اور فرمایا کہ میں نے ماہنامہ میں آپ کا مضمون پڑھا، وہ بہت اچھا ہے میں یہ سمجھتا تھا تمہارا عربی اردو میں ترجمہ کا ذوق ہے، مجھے نہیں اندازہ تھا کہ حضرت نانوتوی کی فکر سے متعلق تم ایسا مضمون لکھ سکو گے۔ تمہارا مضمون بہت اچھا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ترجمہ کے دوران حضرت نانوتوی کی کتابوں کو غور سے پڑھنے کا اتفاق ہوا، حضرت کے فلسفے سے متعلق یہ چیزیں میرے ذہن میں آئیں جنہیں میں نے مرتب کر دیا۔ اس کے بعد آپ نے حضرت نانوتوی کی کتابوں پر کام کرنے کا طریقہ

بتایا، غالباً آپ نے فرمایا کہ حضرت کی وہ کتابیں اور تحریریں جو قابل فہم ہیں ان کو موضوع وار مرتب کر کے عام قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے، اس موقع پر آپ نے حضرت نانوتوی کی جن کتابوں پر کام کیا ان کا بھی تذکرہ کیا اور آپ کے جو مضامین افادات قاسمی کے عنوان سے قسطوار ماہنامہ الفرقان میں شائع ہوئے ان کا بھی ذکر کیا۔

اساتذہ کے لئے قیمتی نصائح

آپ کو اپنے اساتذہ میں سے علامہ ابراہیم بلیاویؒ سے خصوصی تعلق تھا، آپ ان کی یہ وصیت ہم اساتذہ کی مجلس میں ہمیشہ نقل کیا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے دارالعلوم سے رخصتی کے وقت حضرت علامہ سے کہا کہ حضرت مجھے کوئی نصیحت کر دیجیے؛ چنانچہ علامہ نے تین باتوں کی نصیحت فرمائی، آپ نے فرمایا:

مولوی صاحب!

۱۔ فن دیکھ کر پڑھانا علم آئے گا۔

۲۔ طلبہ کو اپنی اولاد سمجھنا طلبہ تم سے محبت کریں گے۔

۳۔ سنت پر عمل کرنا مقبولیت حاصل ہوگی۔

نیز آپ اساتذہ کی مجلس میں یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ کسی بھی کتاب کی تدریس کے وقت اس فن کی چھوٹی بڑی تمام کتابوں کا مطالعہ کرو۔ مثال کے طور پر فقہ میں اگر کسی کتاب کی تدریس متعلق ہوئی ہے تو نیچے نورالایضاح اور اوپر ہدایہ اور درمختار تک کا مطالعہ کرو۔ یہ مطالعہ اپنے لیے ہوگا طلبہ کو صرف ضروری باتیں ہی بتانی ہے۔ آپ جو کچھ فرماتے تھے وہ بالکل صحیح تھا کسی فن پر استیعابی نظر اسی طرح کے مطالعہ سے ہو سکتی ہے۔

آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اپنے لیے کسی ایک فن کو منتخب کر کے اس میں مہارت حاصل کی جائے اور اسے اپنا اختصاصی فن بنایا جائے، اس سلسلے میں بعض اساتذہ کی مثال بھی دیتے تھے جو کسی فن میں اختصاص کے لئے مشہور ہیں۔

مطالعے کے سلسلے میں آپ کی یہ رہنمائی بھی بڑی قیمتی ہے جو آپ مجلس میں

اساتذہ کے سامنے ذکر کیا کرتے تھے کہ کسی کتاب/فن کا مطالعہ کیا جائے اس کے بعد استنتاج (نتیجہ اخذ کرنا) کیا جائے۔ یہی بات صحیح ہے کہ نتیجہ اخذ کرنا ہی حاصل مطالعہ ہے۔ محض معلومات اکھٹا کرنے اور اس کا ثمرہ حاصل نہ کرنے سے مطالعے کا عمل نامکمل رہتا ہے۔

مجھے یاد آیا کہ میں نے کسی جگہ پڑھا تھا کہ احمد امین نے کسی سے اس کے مطالعہ کے نظام الاوقات کے بارے میں معلوم کیا تو اس نے بتایا کہ صبح سے رات گئے تک میں مطالعہ کرتا ہوں تو احمد امین نے اس سے کہا کہ جب سارا وقت تم مطالعے میں لگاتے ہو تو جو مطالعہ کیا ہے اس میں غور وفکر کر کے نتیجہ کب حاصل کرتے ہو؟

ہم آپ کو رخصت نہ کرسکے

الغرض آپ ہمارے درمیان سے چلے گئے اور ایک ناقابل تلافی خلا اپنے پیچھے چھوڑ گئے، ہمارے درمیان آپ کی یادیں اور کتابوں کی شکل میں انمٹ نقوش باقی ہیں۔ شعبان میں آپ کی طبیعت ناساز ہوئی اور بغرض علاج ممبئی تشریف لے گئے، آپ کو افاقہ بھی ہوگیا، رمضان میں آپ نے تراویح کے بعد بیان کا سلسلہ بھی شروع کیا جو نشر ہوا اور لاکھوں لوگوں نے اس سے استفادہ کیا، اس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اب آپ کی طبیعت ٹھیک ہوگئی ہے؛ لیکن پھر طبیعت بگڑی اور علاج کے باوجود سنبھل نہ سکی اور ہم سب کو ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے کر چلے گئے۔ کیا معلوم تھا کہ دیوبند سے آپ کا یہ سفر آخری ہے اور اب دوبارہ کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ اس سے بھی زیادہ ہم سب کے لئے تکلیف دہ بات یہ ہے کہ کورونا جیسی وبائے عام اور بلائے ہمہ گیری کی وجہ سے ہم لوگ بلکہ آپ کے اہل خانہ (سوائے دو بیٹوں کے) بھی آپ کا آخری دیدار نہ کرسکے اور نہ جنازے میں شریک ہوسکے۔

ہم لوگوں کا حال حضرت مفتی صاحب کے سلسلے میں تقریباً وہی ہے جو کسی شاعر کا بغداد اور اس کے مکیں کے تئیں تھا:

لَعُمْرِیَ مافارقت بغداد عن قلبی   لوانی وجدت من فراق لها بدا
کفی حزنا ان رحت لم استطع لها   وداعاولم احدث بساکنہاعہدا

(بخدامیں نے بغداد کوکسی خفگی وناراضگی کی وجہ سے نہیں چھوڑا، اگر میں اس کو چھوڑنے کے علاوہ کوئی چارہ پاتا (تومیں اسے ہرگز نہ چھوڑتا)۔

میرے غم کے لئے یہ بات کافی ہے کہ میں اسے رخصت نہیں کرسکااوراس کے مکیں کے ساتھ کوئی عہدوپیمان نہ باندھ سکا۔

اتر گئے منزلوں کے چہرے امیر کیا؟ کارواں گیا ہے

رئیس المحدثین حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوریؒ

یادوں کے نقوش

مولانا اختر امام عادل قاسمی	مہتمم جامعہ ربانی منوروا شریف سمستی پور بہار

ایک سوگوار صبح

۲۵/ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ (۱۹/ مئی ۲۰۲۰ء) کی صبح کیسی سوگوار تھی کہ اس کے آسمان کا سورج ابھی نکلا ہی تھا کہ آسمان علم وفن کا روشن آفتاب غروب ہوگیا، ابھی صبح کلیوں نے کھلنا اور کوئل نے چہکنا شروع کیا تھا کہ گلشن اسلام کا ایک پھول مرجھا گیا اور باغ علوم نبوت کا ایک بلبل خاموش ہوگیا، یعنی علم وفن کا امام رئیس المحدثین حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند نے اس دنیائے فانی کو الوداع کہا، اناللہ وانا الیہ راجعون،

کئی دنوں سے آپ کی شدید علالت کی تشویشناک خبریں موصول ہورہی تھیں، ۲۴/ رمضان المبارک کو شام سے ہی حالت زیادہ خراب ہونے کی خبر ملی، ۲۵/ رمضان کی شب کشمکش میں گذری، رات بھر جاگنے کے بعد صبح کے تھکے ہوئے لمحات میں ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ اس حادثۂ جانکاہ کی اطلاع ملی، آخر زندگی بھر کا تھکا ہارا مسافر ابدی نیند سوگیا۔

کڑے سفر کا تھکا مسافر، تھکا ہے ایسا کہ سوگیا ہے
خود اپنی آنکھیں تو بند کرلیں، ہر آنکھ لیکن بھگو گیا ہے

ہمہ جہت شخصیت

حضرت مفتی صاحبؒ اس دور میں ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے، جن کو ہر علم وفن سے آشنائی تھی، مدارس کے نصاب میں رائج نیچے سے اوپر تک ہر کتاب کی تدریس کی ان کو سعادت حاصل ہوئی تھی، وہ تدریس کا بے پناہ ملکہ رکھتے تھے، کسی فن کی کتاب ہو، پانی کر دیتے تھے، علم کو گھول کر پلانے کا وہ ہنر جانتے تھے، ان کا طریقہ فن میں اتر کر کلام کرنے کا تھا، وہ ہر فن کے مزاج شناس تھے، گفتگو کسی موضوع پر بھی ہو بصیرت و گہرائی میں ڈوبی ہوتی تھی، خاص طور پر حدیث اور فقہ ان کے ذوق کا حصہ تھے، ان دونوں فنون کے مراجع و مآخذ پر گہری نظر تھی، حدیث وفقہ کے فطری مذاق کا نتیجہ تھا کہ ان کے درس حدیث میں بڑا اعتدال ہوتا تھا، وہ نہ اہل ظاہر کی طرح گفتگو فرماتے تھے اور نہ فقہی تشقیقات میں غلو کے قائل تھے، آپ کے یہاں روایت ودرایت دونوں کا امتزاج تھا، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے دارالعلوم دیوبند میں جس طرز تدریس کی بناڈالی تھی، مفتی صاحب اس دور میں اس کے بہترین نمائندہ تھے، وہ متصلب حنفی تھے، لیکن درس ایسا بصیرت افروز اور مدلل ہوتا تھا کہ مسلک حنفی دل ودماغ کی گہرائیوں میں اتر جاتا تھا، ان کا درس بڑا مقبول اور طرز افہام وتفہیم بہت مؤثر تھا، اسی لئے بلا شدید مجبوری کے کوئی طالب علم ان کے درس سے غیر حاضر نہیں ہوتا تھا۔

فقہ وحدیث کے علاوہ علوم حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور معارف حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ پر بھی آپ کا خصوصی مطالعہ تھا، ان بزرگوں کی کئی کتابوں کی تشریح وتسہیل آپ نے فرمائی۔

لب ولہجہ اور زبان وبیان

درس ہو یا عوامی خطاب ان کا لب ولہجہ ہمیشہ مجلسی ہوتا تھا، تکلفات اور آورد سے بالکل پاک، سیدھا سادہ انداز بیان اور سادہ وعام فہم الفاظ، وہ بہ تکلف پر شکوہ الفاظ اور حسین

تعبیرات کے درپے نہیں ہوتے تھے، اسی لیے ان کی گفتگو سامعین کے سروں کے اوپر سے نہیں بلکہ دل و دماغ کے اندر کو چھوتی ہوئی گذرتی تھی، خشک سے خشک موضوع کو تروتازہ اور دلچسپ بنا کر پیش کرنے کا جو سلیقہ انہیں حاصل تھا کہ اس دور میں شاید باید۔ گو کہ ان کی مادری زبان اردو نہیں تھی مگر وہ اہل زبان کی طرح اس پر قدرت رکھتے تھے، اردو اور عربی دونوں زبانوں پر ان کو یکساں عبور حاصل تھا، مختلف علوم وفنون پر ان کی تصنیفات اس کے لئے شاہد عدل ہیں، نادر موضوعات پر چالیس (40) سے زیادہ تصنیفات آپ نے یادگار چھوڑیں، جو ایک مستقل علمی لائبریری ہے، آئندہ محققین کیلئے وہ ماخذ کا کام کرے گی، ان شاءاللہ۔

شرف تلمذ اور رابطہ

مجھے (1407,1406ھ مطابق 1987,1986ء میں) آپ سے ہدایہ رابع اور ترمذی وطحاوی پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، آپ کی ترمذی وطحاوی کے درسی افادات بھی میں نے قلمبند کئے تھے، جو میرے ذخیرۂ کاغذات میں محفوظ ہیں، دارالعلوم دیوبند کے دوران قیام مجھے یاد نہیں کہ کسی استاذ کے سبق سے میں غیر حاضر ہوا ہوں، لیکن حضرت مفتی صاحب کے درس سے میں بہت متاثر تھا، وہ اس وقت دارالعلوم دیوبند کی درسگاہ کی آبرو تھے، بہت سے علمی مسائل میں لوگ ان کی طرف رجوع کرتے تھے، ہمارے دور میں طلبہ کے درمیان وہ سب سے زیادہ مقبول ترین استاذ تھے، بہت بارعب اور باوقار تھے، لیکن اس کے باوجود بڑی محبوبیت کے حامل تھے، طلبہ عصر کے بعد ان کے گھر پر حاضر ہوتے تھے، اس زمانہ میں مفتی صاحب گھر سے دارالعلوم پاپیادہ تشریف لاتے تھے، میرا قیام افریقی منزل قدیم میں تھا، اسی کے پاس سے گذر کر وہ معراج گیٹ سے دارالعلوم تشریف لے جاتے تھے، اس طرح اکثر آمنا سامنا اور ملاقات ہوتی تھی، مگر ہمت کی کمی کے سبب بہت دنوں تک آپ کے در دولت پر حاضری سے محروم رہا۔

سہ روزہ عالمی ختم نبوت کانفرنس میں مقالہ پیش کرنے کا قصہ

پہلی بار مجھے آپ کے گھر پر حاضری کا شرف دارالعلوم دیوبند میں پہلی سہ روزہ

عالمی ختم نبوت کانفرنس (۱۹۸۶ء) کے موقع پر حاصل ہوا، وہ قصہ بھی بڑا عجیب تھا، میں دارالعلوم دیوبند کا ایک گمنام طالب علم، ایک چھوٹے سے مدرسہ (مدرسہ دینیہ غازی پور یوپی) سے آیا تھا، حلقۂ احباب میں وہی دو چار طلبہ تھے جو غازی پور سے ساتھ آئے تھے، دارالعلوم کے عظیم اساتذہ کے درباروں تک ہم جیسے معمولی طلبہ کی رسائی نہیں تھی، میری طبیعت کی کم آمیزی اس پر مستزاد، طلبہ سے بھی بہت کم شناسائی تھی، درسگاہ اور کتب خانہ کے علاوہ کہیں آنا جانا نہیں تھا، دارالعلوم سے باہر کبھی کسی تفریح گاہ، جلسہ، مشاعرہ یا پروگرام میں شریک نہیں ہوا، اپنے ضلعی اور صوبائی انجمنوں میں بھی بہت کم شرکت ہوتی تھی، اسی زمانہ میں دارالعلوم میں ختم نبوت کانفرنس کی مہم شروع ہوئی، جس میں ملک وبیرون ملک سے بڑی علمی، ملی اور سیاسی شخصیات نے شرکت کی، امام حرم عبداللہ بن سبیل بھی تشریف لائے، اس موقع پر دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ نے طے کیا کہ کانفرنس کے پرگراموں میں ایک نشست طلبۂ دارالعلوم کی بھی رکھی جائے، تاکہ دارالعلوم کی نمائندگی اس میں شامل ہو، نشست میں پانچ (۵) طلبہ کے مقالات اور پانچ (۵) طلبہ کی تقاریر پیش کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور خواہشمند طلبہ کو اس میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی، تاکہ مسابقہ کے بعد بہتر سے بہتر انتخاب عمل میں آسکے، اس کا اعلان آویزاں ہوتے ہی خواہشمند طلبہ کا اژدحام دیکھنے کو ملا، دارالعلوم دیوبند تو علم کا بحر بیکراں ہے، یہاں ایک پر ایک باصلاحیت طلبہ ہر زمانے میں موجود رہے ہیں، دفتر تعلیمات کے پاس میں نے بھی یہ اعلان دیکھا، میری تمناؤں نے بھی انگڑائی لی، مگر یہ سوچ کر کہ دارالعلوم کے باصلاحیت اور ممتاز طلبہ کے درمیان میرے جیسے ایک معمولی اور گمنام طالب علم کی کیا حیثیت؟ ہمت نہیں ہوتی تھی، لیکن شوق کے ہاتھوں مجبور ہوکر میں نے بھی ختم نبوت کے موضوع پر مقالہ نویسی میں حصہ لینے کا عزم کرلیا، پھر وقت مقررہ کے اندر مقالہ تیار کرکے خاموشی کے ساتھ خریداران یوسف کی آخری صف کے امیدوار کی طرح دفتر میں جمع کرادیا جس کی اطلاع میرے قریب ترین ساتھیوں کو بھی نہ ہوسکی، حقیقت یہ ہے کہ مجھے ایک فی صد بھی امید نہیں تھی کہ میرا مقالہ کسی لائق ہوگا اور اس عظیم الشان کانفرنس کے

لئے اس کا انتخاب عمل میں آئے گا، اس مسابقہ میں کتنے طلبہ نے حصہ لیا یہ تو معلوم نہ ہوسکا لیکن میری خوش بختی کہ پانچ منتخب مقالات میں ایک میرا مقالہ بھی شامل تھا۔

گاہ باشد کہ کودکے ناداں　　　بہ غلط بر ہدف زند تیرے

دفتر کا چپراسی ڈھونڈتا ہوا میرے کمرے پر آیا اور تحریری حکم سنایا کہ اپنا مقالہ لے کر حضرت مفتی سعید احمد پالن پوری کے گھر پر حاضر ہو، اس طرح پہلی مرتبہ مجھے حضرت مفتی صاحب کے در دولت پر حاضری کی سعادت میسر ہوئی، مفتی صاحب نے کچھ ضروری ہدایات دیں اور رخصت کردیا، یہ پہلا موقع تھا جب میرا رابطہ حضرت مفتی صاحب کے ساتھ اتنے قریب سے ہوا۔

بہرحال عظیم الشان سہ روزہ کانفرنس ہوئی اور اس کی ایک نشست میں جس میں ملک وبیرون ملک کے اعیان وعلماء تشریف فرما تھے، اس حقیر کو بھی اپنا مقالہ پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

فقہ میں اختصاص اشتغال بالفقہ سے پیدا ہوتاہے، رسمی کورس سے نہیں

اس کے بعد مفتی صاحب سے میری مناسبت بڑھتی گئی اور وہ بھی شفقت فرمانے لگے، دورۂ حدیث میں مجھے امتیازی نمبرات حاصل ہوئے، تو نظر عنایت میں اور بھی اضافہ ہوگیا تھا، مگر افتاء کے سال میں اپنے اسباق اور کاموں میں ایسا مصروف رہا کہ مفتی صاحب کے یہاں بہت کم آمد ورفت رہی، مفتی صاحب کے پاس ہمارا کوئی گھنٹہ نہیں تھا، افتاء سے فارغ ہونے کے بعد فقہ میں مزید اختصاص کے لئے میں تدریب افتاء میں جانا چاہتا تھا، جس کو وہاں معین المفتی کہتے تھے، ایک دن دفتر اہتمام میں مجھے طلب کیا گیا، میں حاضر ہوا تو وہاں اس وقت حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ مہتمم دار العلوم دیوبند اور استاذ الاساتذہ حضرت مولانا معراج الحق صاحبؒ اور حضرت شیخ الحدیث مولانا نصیر احمد خان صاحبؒ کے علاوہ پوری مجلس تعلیمی موجود تھی، اس میں حضرت مفتی سعید احمد صاحب بھی تھے، ان بزرگوں نے

میرا نام دارالعلوم میں معین المدرس کے لئے تجویز فرمایا تھا، میں نے تدریب افتا کی خواہش ظاہر کی، تو مفتی سعید احمد صاحبؒ نے فرمایا کہ:

''تدریب افتا کا مقصد اختصاص فی الفقہ ہے اور یہ رسمی کورس سے نہیں بلکہ مسلسل اشتغال بالفقہ سے حاصل ہوگا''

مفتی صاحبؒ کے اس ارشاد کے بعد میں نے اپنی خواہش واپس لے لی اور بزرگوں کے فیصلہ کو قبول کر لیا، مفتی صاحب کا یہ جملہ فقہ کے ابواب میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے، یہ ان کی زندگی بھر کے تجربات ومشاہدات کا حاصل تھا، اس واقعہ (۱۹۸۸ء) کو قریب بتیس سال ہونے جارہے ہیں، مفتی صاحب کے اس جملہ کی صداقت ہر دن مشاہدہ میں ہے، اختصاص تو شاید مجھے حاصل نہ ہوسکا لیکن میرے اشتغال بالفقہ کا سفر آج تک موقوف نہیں ہوا، مفتی صاحب کے اس ایک جملہ نے میری زندگی کی ترتیب بدل ڈالی۔

میری پہلی تالیف "منصب صحابہ"

مفتی صاحب کا انکار اور اطمینان

حضرت مفتی صاحب سے وابستہ ایک اور یادگار واقعہ جو میری تصنیفی وتحقیقی زندگی میں سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے، ۱۹۸۹ء کا ہے، جب میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوکر وہاں معین المدرس تھا، میں نے افتا پڑھنے کے زمانے میں اپنی پہلی تالیف ''منصب صحابہ'' مرتب کی، میرٹھ میں فرق باطلہ کے بعض افراد سے میری علمی مڈبھیڑ نے اس کتاب کا مواد تیار کیا، جس کی بنیادی فکر حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کے ایک مضمون سے لی گئی ہے جو (غالباً ۱۹۵۸ء میں) رسالہ دارالعلوم میں کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا اور اس مضمون کی طرف رہنمائی استاذ مکرم بحرالعلوم حضرت مولانا وعلامہ محمد نعمت اللہ اعظمی صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند سے ملی تھی، معین المدرسی کے زمانے میں اس کتاب کی اشاعت کے بعض اسباب پیدا ہوئے، تو اس پر تقریظ کے لئے میں نے

اپنے اساتذہ سے رجوع کیا، اسی ضمن میں میں نے حضرت مفتی صاحبؒ کے آستانہ پر حاضری دی اور تقریظ کی خواہش کا اظہار کیا، اتفاق سے وہ سال کا آخری حصہ تھا اور ان دنوں اسباق کے علاوہ بہت سے اسفار اور پروگراموں کا بھی ان پر بوجھ تھا، لیکن حضرت مفتی صاحب نے ازراہ شفقت میری خواہش کو قبول فرمایا، آپ اس وقت بھی کسی پروگرام کے لئے ہی پابہ رکاب تھے، فرمایا کہ کتاب کا مسودہ دے دو، میں سفر میں اس پر ایک نظر ڈالوں گا، دو دن کے بعد آ کر ملاقات کرو، دو دن کے بعد حسب الحکم جب حاضر ہوا تو مجھے دیکھتے ہی فرمایا کہ میں نے تمہارے مسودہ کا ابتدائی حصہ دیکھا ہے، مگر مجھے اس کی بنیاد سے ہی اتفاق نہیں ہے، اس لئے کہ اگر تمہاری بات مان لی جائے تو علماء دیوبند کی پچاس سالہ خدمات پر پانی پھر جائے گا۔

میں نے کتاب میں صحابہ کے معیار حق ہونے کی تشریح لکھی تھی اور اس کو مذاہب اربعہ کی روشنی میں مدلل کیا تھا، پوری کتاب میں کہیں بھی اکابر دیوبند میں سے کسی بزرگ کا نام یا ان کی کسی عبارت کا اقتباس نقل نہیں کیا گیا تھا اور نہ فریق مخالف میں سے کسی کا نام یا ان کی کسی عبارت کا اقتباس شامل کیا گیا تھا، مسئلہ کو خالص مثبت، علمی اور غیر جانبدارانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی تھی، تاکہ لوگ اس مسئلہ کو مناظرہ اور مقابلہ کی عینک نکال کر خالص علم وتحقیق کی روشنی میں دیکھیں۔۔۔ اس موضوع پر اس انداز میں غالباً اس سے پہلے کوئی کتاب منظر عام پر نہیں آئی تھی، مفتی صاحب کو شاید یہ نیا انداز مطالعہ پسند نہیں آیا۔

حضرت مفتی صاحبؒ دارالعلوم دیوبند میں ایک بلند حیثیت عرفی کے مالک تھے، میرے استاذ تھے، میں ان پر اعتماد کرتا تھا، اس لئے ان کے اس ارشاد سے تھوڑی دیر کے لئے مجھے لگا کہ جیسے میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی ہو، گوکہ میری تحقیق کی بنیاد علماء متقدمین کی عبارتوں پر تھی، جس کی پشت پر خود ترجمان مسلک دیوبند حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کی تفکیر وتشریح موجود تھی، لیکن مفتی صاحب کا مطمئن ہونا بھی میرے حق میں ضروری تھا۔۔۔ میں نے نہایت ادب واحترام سے عرض کیا کہ علماء دیوبند کی

کس کتاب میں معیارحق کی تشریح کی گئی ہے؟ جو میری یہ تشریح اس سے متناقض ہے، کتابوں میں معیارحق کی صرف اصطلاح استعمال کی گئی ہے اور اس کا مفہوم ذہنی اب تک ہماری کسی کتاب میں صفحۂ قرطاس پر منتقل نہیں ہوا، جب کہ معیارحق کے اثبات سے قبل اس اصطلاح کی توضیح وتشریح ضروری ہے، اگر حضرت والا کے علم میں کوئی کتاب ہو تو رہنمائی فرمائیں۔ میری معروضات کو حضرت مفتی صاحبؒ نے بہت توجہ کے ساتھ سنا، اور تھوڑے تأمل کے بعد کل آنے کے لئے ارشاد فرمایا، ابھی وہ کسی سفر سے آئے تھے اور آرام کرنا چاہتے تھے، میں بہت مایوسی کے ساتھ اپنی قیام گاہ پر واپس آیا، اور تھوڑی دیر کے بعد دارالعلوم کے کتب خانہ کا رخ کیا، تاکہ اس مسئلہ پر مزید مطالعہ وتحقیق کرسکوں، پورے چوبیس گھنٹے میرے نہایت بے قراری میں گذرے، مفتی صاحب نے مجھے دوسرے دن عشاء کے بعد کا وقت دیا تھا جب وہ کھانا تناول فرماتے تھے، میں نے اس تعلق سے جو ممکنہ اعتراضات تھے، ان کو سامنے رکھ کر مختلف عبارتیں ایک الگ کاغذ پر جمع کی تھیں، اگلے دن میں حاضر خدمت ہوا تو حضرت دسترخوان پر بیٹھ چکے تھے اور بہت خوشگوار موڈ میں تھے میں نے گذشتہ روز کی گفتگو کے تناظر میں کچھ وضاحتی گفتگو پیش کرنی چاہی، حضرت مفتی صاحبؒ نے مجھے روکتے ہوئے فرمایا کہ اپنی اصل کتاب سنانا شروع کرو، میں نے کتاب شروع کردی، مفتی صاحب نے کوئی اعتراض نہیں کیا بس خاموشی کے ساتھ متوجہ رہے، مفتی صاحب کا کھانا ختم ہوا، تو فرمایا کہ بس، اب اگلا حصہ کل اسی وقت، اس طرح میں نے پوری کتاب کی خواندگی حضرت مفتی صاحب کے کھانے کے وقت قریب دس دنوں میں مکمل کی اور اس اثنا مفتی صاحب نے ایک آدھ جگہ جزوی مشورہ کے علاوہ کوئی کلام نہیں فرمایا، خواندگی مکمل ہونے کے بعد آپ نے فرمایا کہ میں اس پر تقریظ نہیں مقدمہ لکھوں گا، چنانچہ آپ نے اس پر قریب بارہ (۱۲) صفحات کا وقیع مقدمہ تحریر فرمایا، جس میں کتاب پر اپنے اعتماد کا اظہار فرمایا اور حقیر مؤلف کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

منصب صحابہ''پر مفتی صاحب کامبسوط مقدمہ

بطور نمونہ مقدمہ کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> "الغرض یہ ایک مناقشاتی موضوع بن گیا ہے، ضرورت تھی کہ اس مسئلہ پر ردو قدح سے علیحدہ ہوکر مثبت انداز میں کوئی مختصر کتاب لکھی جائے، تاکہ کھلے ذہن کے لوگ اس کا مطالعہ کریں اور ٹھنڈے دل و دماغ سے اس مسئلہ پر غور کریں۔ مجھے خوشی ہے کہ ہمارے دارالعلوم دیوبند کے ہونہار فاضل جناب مولانا اختر امام عادل سمستی پوری جو فی الحال دارالعلوم دیوبند میں تدریس کی مشق کررہے ہیں، اور معین المدرسین کی حیثیت سے پڑھا رہے ہیں، انہوں نے ایسی کتاب لکھی ہے جس کی عرصہ سے خواہش تھی، میں آج کل ایک عارضی بیماری میں مبتلا ہوں جس کی وجہ سے میں اسے بنظر غائر تو نہ دیکھ سکا ہوں، مگر میں نے پوری کتاب سنی ہے اور میں پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اس کتاب میں جس طرح اس مسئلہ کی تحلیل کی گئی ہے اور جس دلچسپ انداز میں دلائل قاری کے ذہن نشیں کرنے کی کوشش کی گئی ہے ان شاء اللہ یہ کتاب غیر مطمئن ذہنوں کے لئے بھی باعث تشفی ہوگی اور عام مسلمانوں کیلئے بھی زیادتی ایمان اور صحابہ کرام کی قدر شناسی کا ذریعہ ثابت ہوگی"

پھر حضرت مفتی صاحب ہی نے مجھے مشورہ دیا کہ ہمارے یہاں زبان وادب کے نقطۂ نظر سے حضرت مولانا ریاست علی بجنوریؒ کی شخصیت بہت اہم ہے، یہ مسودہ ایک نظر ان کو بھی دکھلا دو، دوسرے دن عصر کے بعد حضرت مولانا ریاست علی بجنوری کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا یہ مسودہ برائے تقریظ ان کی خدمت میں بھی پیش کیا، حضرت الاستاذ مولانا بجنوریؒ نے بھی نہایت محبت کے ساتھ تقریظ لکھی، حضرت بجنوریؒ کی تقریظ

کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''الحمد اللہ کہ اکابر دیوبند اور علماء دیوبند کے بروقت تنبیہ اور تعاقب سے امت اس بڑے فتنہ سے آگاہ ہوئی اور اس کا زور بھی کم ہوا، اب دارالعلوم دیوبند کے معین المدرسین عزیزم مولانا اختر امام عادل سلمہ اللہ نے ایک مفصل تحریر مرتب کی ہے۔۔۔۔۔۔ عزیزم کا یہ مفصل مضمون ایک ضرورت کی تکمیل اور مسلک دیوبند کے ایک مخصوص مسئلہ کی قابل اعتماد تشریح ہے''

اس کتاب پر حضرت الاستاذ علامہ محمد حسین بہاریؒ اور حضرت الاستاذ مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ کی تقریظات بھی ہیں، تفصیل کے لئے اہل ذوق کتاب کی طرف مراجعت فرمائیں، کتاب انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ اس تفصیل سے حضرت مفتی صاحب کی وسعت نظری اور خوردنوازی کا اندازہ ہوتا ہے اور کس طرح وہ کھلے ذہن ودماغ کے ساتھ مسائل کا مطالعہ کرتے تھے اور اگر کوئی بات سمجھ میں آجاتی، تو قبول کر لینے میں بھی کوئی دریغ نہیں ہوتا تھا، اس کا بھی پتہ چلتا ہے۔

مفتی صاحب "منصب صحابہ" کو شیخ الہند اکیڈمی سے شائع کرانا چاہتے تھے

اس کتاب کی اشاعت کا ایک زریں پہلو یہ بھی ہے کہ مفتی صاحب نے کتاب اور موضوع کی اہمیت کے پیش نظر یہ خیال ظاہر فرمایا کہ یہ کتاب دارالعلوم دیوبند کی شیخ الہند اکیڈمی سے شائع ہو تو اس کی استنادیت میں اضافہ ہوگا اور دارالعلوم کی علمی وفکری نمائندگی بھی ہوگی اور غالباً حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ کے پاس مجھے بھیجنے کا مقصد یہی تھا، حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ ان دنوں دارالعلوم دیوبند کے ناظم تعلیمات بھی تھے اور شیخ الہند اکیڈمی کے ڈائریکٹر بھی، حضرت مفتی صاحب کی یہ تجویز ان کی عالی ظرفی، وسیع القلبی اور چھوٹوں کو آگے بڑھانے کی شاندار مثال ہے، حضرت مولانا بجنوریؒ نے بھی اس

تجویز کو قبول کرلیا تھا اور ظاہر ہے کہ میرے لئے اس سے بڑی خوش نصیبی کیا ہوسکتی تھی، میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حضرت مفتی صاحبؒ میری ایک معمولی تحریر کو اتنی اہمیت دیں گے لیکن اتفاق جس ناشر نے طباعت کی تیاری کی تھی اور کتابت وغیرہ کے سارے مراحل مکمل کئے تھے، میں نے جب اس کے سامنے یہ تجویز رکھی تو وہ اس کتاب سے دستبردار ہونے پر راضی نہ ہوا، بلکہ یک گونہ فتنہ کی شکل پیدا کردی اور اتنی عجلت کا مظاہرہ کیا کہ اس نے خریداری کی بکنگ کے لئے ایک پوسٹر شائع کردیا اور کتاب کے منظر عام پر آنے سے قبل ہی کتاب کی بڑی تعداد بک ہوگئی۔ حضرت مفتی صاحبؒ مجھ پر اعتماد کرتے تھے اور میرا بھلا چاہتے تھے اس لئے پر امید تھے کہ میں ان کی تجویز کو ہر صورت میں قبول کروں گا، انہوں نے دارالعلوم کی دیواروں پر یہ پوسٹر دیکھے تو ان کو صدمہ پہنچا، پھر میں حاضر بارگاہ ہوا تو بے حد رنج کا اظہار فرمایا اور کہا کہ تم نے ایک سنہرا موقع کھودیا۔

شیخ الہند اکیڈمی کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی ملازمت کا مشورہ

اس کتاب کی بنا پر حضرت کو مجھ سے حسن تعلق اور حسن ظن اس قدر بڑھ گیا تھا کہ جب میری معین المدرسی کی مدت اختتام پذیر ہونے لگی (شعبان سے قریب ایک ماہ پیشتر) تو مجھ سے فرمایا کہ دارالعلوم دیوبند میں شیخ الہند اکیڈمی کو ایک اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی ضرورت ہے جو اس کے علمی اور قلمی کاموں میں معاونت کرے، ابھی اسی ہفتہ شوریٰ کی میٹنگ ہونے والی ہے، تم اس کے لئے ایک درخواست دے دو، میں نے عرض کیا کہ کیا قلمی خدمات کے ساتھ مجھے تدریسی خدمات کا بھی موقعہ مل سکے گا؟ مفتی صاحب نے فرمایا کہ نہیں، یہ قلمی کام کا عہدہ ہے، میں نے عرض کیا کہ آپ نے ہی ہمیں نصیحت کی ہے کہ فراغت کے بعد کم از کم دس سال تک تدریسی خدمت کرنا ضروری ہے، اس کے بغیر علم میں پختگی نہیں آتی، مفتی صاحب نے فرمایا، درست ہے، ایسا کرو کہ جزوی تدریس کی شرط کے ساتھ درخواست دے دو، شاید قبول کرلیں۔۔۔ بہرحال میں نے حضرت مفتی صاحبؒ کے حکم

پر درخواست دی، مگر شاید وہ قبول نہ ہوسکی، کہ ایک شخص دوشعبوں میں کام نہیں کرسکتا تھا، ۔۔۔ دیوبند سے رخصت ہوتے وقت مفتی صاحب سے الوادعی ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو مفتی صاحب نے تسلی دی اور فرمایا کہ " امید ہے کہ اللہ پاک اس سے بہتر صورت میں تمہیں دیوبند واپس لائیں گے "

وابستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

دیوبند سے نکل جانے کے بعد بھی مفتی صاحب سے میں مسلسل مربوط رہا اس لئے کہ میرا ایقان تھا کہ "وابستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ "میں نے ہمیشہ اپنے بزرگوں کی جوتیوں میں رہنا اپنے لئے باعث فخر سمجھا۔

دارالعلوم حیدرآباد میں میری ملازمت کی بات چیت

دیوبند سے میں سیدھے مدرسہ سراج العلوم سیوان (بہار) آ گیا تھا، یہاں عربی ششم تک تعلیم تھی، افتا کی ذمہ داری اور جمعہ کی خطابت بھی مجھے دی گئی تھی، لیکن یہاں کے ماحول میں بڑی گھٹن تھی، میں نے مفتی صاحب کو خط لکھا تو انہوں نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی میرے لئے دارالعلوم حیدرآباد والوں سے بات کرلی، ایک زمانہ میں دارالعلوم حیدرآباد کے ذمہ داران ہر کام میں مفتی صاحب سے مشورہ کرتے تھے اور مفتی صاحب کی رائے فیصلہ کن قرار پاتی تھی، اختتام سال پر میں دیوبند حاضر ہوا تو مفتی صاحب نے فرمایا کہ دارالعلوم حیدرآباد کے لوگ آئے تھے، ان کو ایک صاحب قلم مفتی کی ضرورت تھی، میں نے تمہارے لئے بات کرلی ہے، رمضان کے بعد سیدھے دیوبند آجاؤ، ان کا ایک وفد آئے گا ان کے ساتھ چلے جانا۔

علمی رہنمائی

حیدرآباد سے بھی مسلسل میرا رابطہ آپ سے قائم رہا، بعض علمی مشورے بھی آپ سے لیتا تھا، ایک بار مجھے فقہی مصطلحات کے لئے انگریزی لغت کی ضرورت تھی، تو آپ نے ہی معجم لغة الفقہاء (مرتبہ: ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی وڈاکٹر حامد صادق قنیبی، مطبوعہ دارالنفائس

بیروت ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء) کی طرف میری رہنمائی فرمائی، اس کتاب سے میں نے اسلامی قانون کے تقابلی مطالعہ کے موقع پر کافی استفادہ کیا، حضرت مفتی صاحبؒ کو انگریزی زبان کا بھی بہتر مذاق تھا۔ اللہ پاک ان کی روح کو اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت فرمائے آمین۔

جامعہ ربانی کا قیام – مشکلات، مشورے اور ہدایات

حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں بعض محرکات کے تحت جب میں نے اپنے وطن سمستی پور میں ایک دینی مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ کیا، تو اس موقع پر بھی میں نے مفتی صاحب کو پل پل سے باخبر رکھا، اور آپ سے ضروری مشورے اور ہدایات کا طالب رہا، چنانچہ ابتدا میں جب میں نے (۱۹۹۶ء میں) مدرسہ کا پلان بنایا، تو وہ بڑا پلان تھا، مفتی صاحب نے اس پر نکیر کی اور بالآخر وہ پلان بعض سازشوں کے تحت سولہ (۱۶) ماہ کے بعد فیل ہو گیا (جس کی ایک تلخ تاریخ ہے جو ان شاء اللہ کبھی زیر تحریر آئے گی) اس کی اطلاع میں نے حضرت مفتی صاحب کو دی تو آپ نے مجھے تسلی دی، حوصلہ بڑھایا اور تحریر فرمایا:

"برادر مکرم و محترم جناب مولانا اختر امام عادل صاحب زید فضلہ وعلمہ

سلام مسنون

> آپ کا خط ملا، جملہ احوال کا علم ہوا، غور کرنے کے بعد آپ کے لئے بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کوئی متبادل ادارہ قائم کریں اور اپنے علمی مشاغل بھی جاری رکھیں، مگر ادارہ قائم کرنے کی صورت میں زمام کار بدست خود رکھیں، ورنہ پھر وہی حشر ہوگا جو ہو چکا۔ بحمدہ تعالیٰ آپ پر مصارف کا کوئی خاص بوجھ نہیں ہے، اس لئے آزاد رہ کر کام انجام دے سکتے ہیں، میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے کاموں میں برکت عطا فرمائیں۔ ابھی آپ ناتجربہ کار ہیں، حوادث سے نہ گھبرائیں، کسی بھی اہم مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کٹھنائیوں سے گذرنا پڑتا ہے، تب جا کر منزل ملتی

ہے اور ملازمت تو ملازمت ہے، اس میں جورو بنا ہی پڑتا ہے اور زمانہ کی ناموافقت کا شکوہ ہمیشہ بڑے لوگ کرتے رہے ہیں، کشتی موجوں سے ٹکرا کر ہی ساحل مراد پر پہنچتی ہے۔ یہاں کے احوال بحمدہ تعالیٰ اچھے ہیں، دعوات صالحہ میں یاد رکھیں، بندہ بھی دعا گو ہے۔

والسلام

سعید احمد پالن پوری

۲/۹/۱۴ھ

مفتی صاحب نے یہ خط مجھے ۰۲/ ربیع الثانی ۱۴۱۹ھ مطابق ۳۱/ اگست ۱۹۹۸ء کو تحریر فرمایا اور بھی کئی اکابر کو میں نے خط لکھا تھا اور سب نے ہی تقریباً یہی بات لکھی، بالآخر اس خط کی تاریخ تحریر سے دو ماہ کے اندر ۸/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ مطابق یکم اکتوبر ۱۹۹۸ء کو شہر سے دور منورواشریف میں نہایت سادگی کے ساتھ جامعہ ربانی کا افتتاح عمل میں آیا اور اس کی اطلاع بھی حضرت مفتی صاحب کو دی گئی، تو آپ نے اظہار مسرت فرمایا اور یہ خط تحریر کیا:

"برادر مکرم ومحترم زید لطفہ سلام مسنون

آپ کا دو (۲) رجب کا مکتوب ہم دست ہوا، جامعہ ربانی کے افتتاح سے بہت مسرت ہوئی، ان الرقیٰ فی البدایة المتواضعة معمولی آغاز ہی میں کامیابی کا راز مضمر ہے، پہلے جو آپ نے ماسٹر پلان بنایا تھا وہ ایک سنہرا خواب تھا اور اس کا انجام آپ دیکھ چکے، وہ طریقہ صحیح نہیں تھا، جیسا کہ میں نے اس وقت آپ کو لکھا تھا اور غالباً وہ میرا لکھنا آپ کو ناگوار بھی ہوا تھا، مگر حقائق بہر حال حقائق ہوتے ہیں اور امانی کبھی بھی حصول مقصد کا ذریعہ

نہیں بنتے۔

اب آپ اس نونہال کی آبیاری کریں، ان شاء اللہ بہت جلد یہ مبارک درخت ثمر بار ہوگا۔۔۔۔۔ رہے علاقہ کے احوال جو آپ نے لکھے ہیں، وہ کوئی قابل تعجب اور لائق حیرت نہیں ہیں، اگر لوگوں کے یہ احوال نہ ہوں، تو ماضی میں انبیاء کرام کیوں مبعوث کئے جاتے اور حال میں اور مستقبل میں وارثین انبیاء کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے۔ آپ کے علمی کاموں میں اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمائیں، ہم ناکاروں کیلئے دعا فرمائیں کہ کچھ کرسکوں، والد ماجد سے سلام مسنون کہیں اور مدرسہ کی طرف پوری توجہ رکھیں، پچھلے ادارہ جیسا حال نہ کردیں، رہا کبھی کسی مناسب وقت میں علاقہ کا دورہ ہوا تو ان شاء اللہ اس سے دریغ نہ ہوگا۔

والسلام

سعید احمد پالن پوری

۱۵/ رجب ۱۴۱۹ھ

میری تالیف "قوانین عالم میں اسلامی قانون اسلام کا امتیاز۔۔"کو جامع انسائیکلوپیڈیا قرار دیا

جامعہ ربانی کے قیام کے بعد میری کئی کتابیں منظر عام پر آئیں، لیکن جب میری دستاویزی کتاب "قوانین عالم میں اسلامی قانون کا امتیاز" تیار ہوئی، تو میں نے یہ کتاب حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں پیش کی، مفتی صاحب اس کتاب کو پڑھ کر بے حد مسرور ہوئے، اور اس پر درج ذیل تحریر بطور تقریظ و تعارف کے رقم فرمائی:

” (بعد حمد وصلوٰۃ)

جناب مولانا مفتی اختر امام عادل قاسمی زیدمجدہم کی مایہ ناز کتاب ''قوانین عالم میں اسلامی قانون کا امتیاز ''پیش نظر ہے، دور حاضر میں اسلامی قانون اور اسلامی تمدن کو جس چیلنج کا سامنا ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں ہے، اس سے لوہا لینے کے لئے ہمیں بڑی تیاری کرنی ہے، مدارس اسلامیہ کے عام طلبہ اور شعبۂ افتاء کے مخصوص طلبہ کو اسلامی قانون کا تقابلی مطالعہ کرانا ضروری ہے، اس سلسلہ میں مراجع کی کمی تھی، عربی میں تو خیر کافی مواد موجود تھا، مگر اردو میں نہ کے برابر ہے، اب بفضلہٖ تعالیٰ یہ مفصل کتاب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو رہی ہے۔ یہ قیمتی کتاب پانچ (۵) بابوں پر مشتمل ہے۔

☆ پہلے باب میں اسلامی قانون کا تعارف، خصوصیات وامتیازات، تدریجی ارتقاء، مختلف ادوار اور ان کی خصوصیات کا بیان ہے اور آج تک ہونے والی متعدد فقہی مساعی پر روشنی ڈالی گئی ہے، نیز اسلام کے بین الاقوامی قوانین کا جائزہ لیا گیا ہے۔

☆ دوسرے باب میں مصنف نے اسلامی فقہ کے خلاف پیدا کی گئی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے اور دنیا کے دیگر قوانین نے جو اسلامی قانون سے خوشہ چینی کی ہے، اس پر روشنی ڈالی ہے اور مثالوں سے یہ بات واضح کی ہے۔

☆ تیسرے باب میں دنیا کے مشہور غیر مسلم ملکوں کے قوانین کا تعارف کرایا گیا ہے اور ان کی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے اور اسلامی قانون کی بہ نسبت وہ کتنے ناقص ہیں اس پر نظر ڈالی گئی ہے۔

☆ چوتھے باب میں قانون اسلامی پر لکھی گئی بنیادی کتابوں کا تذکرہ ہے، اس باب میں تقریباً پچیس سو (۲۵۰۰) فقہی

ماٰخذ کا ذکر آ گیا ہے۔

☆پانچویں باب میں فقہی اصطلاحات کی فرہنگ ہے جس کی ضرورت عالمی قوانین کے مطالعہ کے وقت پیش آتی ہے، اس باب میں تقریباً ایک ہزار (۱۰۰۰) فقہی اصطلاحات کا عظیم ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔

اس طرح یہ ایک جامع انسائیکلوپیڈیا بن گیا ہے اور یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کتاب اس موضوع پر حرف آخر ہے، لیکن یہ بات ضرور ہے کہ اس موضوع پر لکھی جانی والی کتابوں میں یہ کتاب سب سے زیادہ مبسوط اور جامع ہے۔ دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبول فرمائیں اور اس کا فیض عام و تام فرمائیں اور امت کی صلاح و فلاح اور بلند پرواز مصنف کے رفع درجات کا ذریعہ بنائیں (آمین)

سعید احمد عفا اللہ عنہ پالنپوری
خادم دار العلوم دیوبند
۲۱/صفر ۱۴۲۶ھ

میرے ایک عزیز جناب ڈاکٹر مولانا عبدالباری قاسمی (مقام لادھ کپسیا ضلع سمستی پور جو آج کل دہلی میں مقیم ہیں اور قندیل کے نام سے ایک چینل چلاتے ہیں) نے مجھے خط لکھ کر بتایا کہ ۲۰۰۹ء و ۲۰۱۰ء میں جب میں دار العلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھا، روزانہ عصر کے بعد حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، میں نے دیکھا کہ آپ کی کتاب "قوانین عالم میں اسلامی قانون کا امتیاز" ان کے سامنے ڈیسک پر رکھی تھی، ایک دن میں نے پوچھ لیا کہ حضرت یہ کتاب کیسی ہے اور اس کے مصنف کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کہنے لگے:

"بہت ہی قیمتی کتاب ہے ہمیشہ میرے سرہانے رہتی ہے جب سے آئی ہے اور

اس کے مصنف ایک معتبر پڑھے لکھے عالم ہیں اور بہت اچھا تحقیقی مزاج ہے“

اس سے حضرت مفتی صاحب کے صدق واخلاص، خورد نوازی اور علمی قدر دانی کا اندازہ ہوتا ہے۔

دیارِ غیر میں درس اور سوال وجواب کی عملی تربیت

اس طرح حضرت مفتی صاحب سے میرے استفادہ کا سلسلہ زمانۂ مابعد تک جاری رہا، میں چھوٹی سے چھوٹی چیز میں بھی اپنے اساتذہ کی رہنمائی کا طلبگار رہتا تھا۔ اس ضمن میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے، وہ یہ کہ ۱۴۲۶ھ/۲۰۰۵ء میں رمضان المبارک کے موقع پر میرا برطانیہ کا سفر ہوا، اور ''مسجد الرحمٰن بولٹن'' میں رمضان کے آخری عشرہ میں میرے درس قرآن کا پروگرام طے ہوا، اس سے پہلے عشرے میں حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوری سابق استاذ دارالعلوم دیوبند اسی مسجد میں درس پر فائز تھے، یہ بیرون ملک کسی باقاعدہ درس کا میرا پہلا تجربہ تھا، مجھے معلوم ہوا کہ لندن میں اسٹام فورڈ کی مسجد قبا میں حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد پالنپوریؒ تشریف لائے ہوئے ہیں اور عید تک یہیں قیام فرمائیں گے، میں نے اس ارادے سے کہ حضرت کے طریق کار سے رہنمائی حاصل کروں سیدھے لندن پہنچا، حضرت مسجد ہی کے ایک حجرہ میں آرام فرما رہے تھے، ان کو معلوم ہوا تو بہت خوش ہوئے، اپنے میزبان سے میرے کھانے پینے کے انتظام کا حکم فرمایا، لیکن میرا قیام اسی محلّہ میں محترم جناب یوسف بھائی پٹیل کے یہاں تھا، وہ بھی میرے ساتھ تھے، میں نے معذرت کی، دو تین دنوں تک میں آپ کے درس اور سوال وجواب کی مجالس میں شریک رہا، پہلے دن ازراہِ ادب میں نے پیچھے بیٹھنے کی کوشش کی، تو حضرت نے حکم دے کر مجھے آگے بلایا اور اپنے بازو میں بٹھایا اور لوگوں سے دوچار تعارفی کلمات بھی ارشاد فرمائے، بعض سوالات کے جوابات بھی دینے کو کہا۔ اس طرح ایک اجنبی ملک میں درس اور سوال وجواب کی عملی تربیت میں نے حضرت مفتی صاحبؒ سے حاصل کی۔

یہ واقعہ اگرچہ کہ بہت چھوٹا ہے لیکن میرے لئے بہت اہم ہے، میں برطانیہ میں

رہنے والے مسلمانوں کی نفسیات اوران کے مسائل اورتقاضوں سے واقف نہیں تھا، ان کوکیسے مطمئن کیا جائے، کون سی بات ان کے سامنے رکھنی چاہئے اورکون سی نہیں، اس کے لئے بھی بصیرت کی ضرورت ہے، مفتی صاحبؒ وہاں ایک عرصہ سے تشریف لے جارہے تھے اوران کی نفسیات اورضرورتوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے، اس لئے میرے لئے ان کا طرزعمل دلیل راہ بنا اور میں نے بولٹن (برطانیہ) کے دروس میں اس سے کافی استفادہ کیا۔

جوھر نایاب

یہ تمام واقعات حضرت مفتی صاحب کی وسعت قلبی، خردنوازی، حسن تربیت اور افرادسازی کی بے نظیر صلاحیت کے مظہر ہیں، آج جب لوگوں کے پاس ان چیزوں کے لئے وقت نہیں ہے اور بڑے لوگوں کے اندر چھوٹوں کو آگے بڑھانے کا جذبہ کم سے کمتر ہوتا جارہا ہے، مفتی صاحب جیسے انتہائی اصولی اور عدیم الفرصت شخص کے پاس یہ چیزیں فراوانی کے ساتھ موجود تھیں اورانہی بزرگوں کے طفیل دین اور علم کی امانت نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی چلی آرہی ہے، امت کی مائیں بانجھ نہیں ہیں، ضرورت ایسے مربیوں اور معلموں کی ہے جو ذرہ کو آفتاب اور خاک کو کیمیا بنانے کا ہنر رکھتے ہوں، حضرت مفتی صاحب اس دورزوال میں ایسے ہی جوہر نایاب تھے جواب ڈھونڈھنے سے نہیں مل سکتا۔

ڈھونڈوگے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
جو یاد نہ آئے بھول کے پھر اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم
(شاؔد عظیم آبادی)

فقھی سیمیناروں اور اجتماعات میں شرکت

حضرت مفتی صاحب گوکہ قدیم میخانوں کے بادہ خوار تھے لیکن ان میں شدت اور خشکی نہیں تھی، وہ ہر اچھی چیز کا خیر مقدم کرتے تھے، مجھے خوب یاد ہے، غالباً ۱۹۸۸ء کی بات ہے، جب میں دارالعلوم دیوبند میں معین المدرس تھا، دستاویزی فقہی رسالہ

بحث ونظر (پٹنہ) (زیرادارت فقیہ العصر حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ) کے پوسٹر دارالعلوم کی دیواروں پر جگہ بہ جگہ چسپاں نظر آئے، میں نے خیال کیا کہ اردو کے عام فہم اور دلچسپ رسالوں کا تو خریدار نہیں ہے، تمام اردو رسائل خسارہ میں چل رہے ہیں، اس فقہی دستاویزی رسالہ کا خریدار کون ہوگا؟ لیکن جب یہ رسالہ منظر عام پر آیا تو خریداروں کے ہجوم میں وقت کے ممتاز علماء وفقہاء بھی نظر آئے، یہی رسالہ فقہ اکیڈمی اور آئندہ فقہی سیمیناروں کا سنگ بنیاد بنا اور اس نے پورے ملک میں فقہی انقلاب کی لہر پیدا کردی، دوسرے فقہی سمینار (منعقدہ ۱۹۸۹ء بمقام جامعہ ہمدرد دہلی) میں حضرت الاستاذ مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ (سابق مفتی دارالعلوم دیوبند) کے خادم کی حیثیت سے میں پہلی بار شریک ہوا، تو استاذ مکرم حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوریؒ بھی تشریف فرما تھے، معلوم ہوا کہ مفتی صاحبؒ بحث ونظر کے تین سال کے خریدار بنے۔

مفتی صاحب اس رسالہ اور حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کے مداحوں میں تھے، قاضی صاحبؒ کے کئی سمیناروں میں وہ شریک رہے، بعد میں بعض وجوہات اور مصالح کے تحت انہوں نے سیمینار میں شرکت ترک کردی تھی۔

فقہی مسائل میں اتفاق واختلاف - ملامت کی پرواہ کئے بغیر اپنی رائے کا اظہار

حضرت مفتی صاحب کا فقہی ذوق کافی بلند تھا اور نئے مسائل میں بھی ان کا ذہن بہت تیزی کے ساتھ چلتا تھا، انہوں نے نکتہ رس ذہن پایا تھا، وہ اصول اور قواعد کی سخت رعایت کے ساتھ نئے مسائل میں اپنی رائے دیتے تھے، ان کے یہاں اسلاف کی احتیاط بھی تھی اور عہد حاضر کی ضرورتوں کا ادراک بھی، ادارۃ المباحث الفقہیۃ (جمعیۃ علماء ہند) کے اجتماعات میں وہ پابندی سے شریک ہوتے تھے، بلکہ روح رواں رہتے تھے، ان اجتماعات میں ہمیشہ آپ کے خیالات سے استفادہ کا موقع ملتا تھا اور مسئلہ کی مختلف شقوں تک رہنمائی

ہوتی تھی، کئی مسائل میں مجھے ان کی رائے سے اتفاق نہیں تھا اور کئی مسائل میں بہتوں کو ان سے اختلاف رہا، لیکن مفتی صاحب اپنی رائے میں کسی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے تھے، وہ پوری طاقت سے اپنی بات پیش کرتے تھے، میڈیکل انشورنس، منیٰ میں قصر و اتمام، اور تعزیتی جلسے وغیرہ کئی مسائل میں ان کی ایک الگ رائے تھی اور کئی علماء ان کے حامی بھی تھے اور بہتوں کو اختلاف بھی تھا، لیکن ان کی رائے کسی دباؤ کی پابند نہیں تھی، وہ جو اخلاص کے ساتھ سمجھتے تھے وہی بولتے تھے، خطا و صواب میں کلام ہوسکتا ہے، ان کے اخلاص میں نہیں، مگر اس کے ساتھ وہ وسیع النظر تھے، اختلاف کرنے والوں کے ساتھ بھی ان کا رویہ مخلصانہ اور مشفقانہ ہوتا تھا، اس دور میں ایسی مثالیں کمیاب ہیں، آج لوگوں کو اپنی رائے پر اتنا اصرار ہوتا ہے کہ اس سے اختلاف کرنے والے کو اپنا مخالف تصور کرنے لگتے ہیں، وہ اختلاف اور مخالفت کے فرق سے واقف نہیں ہیں، حضرت مفتی صاحب اس نقطۂ امتیاز کو سمجھتے تھے۔

حضرت سے آخری ملاقات کا منظر

حضرت سے میری آخری ملاقات ادارۃ المباحث الفقیہ کے پندرہویں فقہی اجتماع (۱۹ تا ۲۱ رجب ۱۴۴۰ھ مطابق ۲۷ تا ۲۹ مارچ ۲۰۱۹ء، دفتر جمعیۃ علماء ہند دہلی) میں ہوئی تھی، حضرت پروگرام میں تشریف فرما تھے، اور اجلاس جاری تھا، میں آگے بڑھ کر ملاقات کے لئے حاضر ہوا، تو بے ساختہ اپنی کرسی سے کھڑے ہوگئے، وہ بیمار اور کمزور تھے، میں نے ہر چند اصرار کیا کہ حضرت نہ اٹھیں تشریف رکھیں، لیکن وہ نہ مانے اور کھڑے ہوکر مجھ سے معانقہ فرمایا، میں شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ یہ تھی ہمارے بزرگوں کی تواضع اور اپنے معمولی سے معمولی شاگرد کی قدر افزائی، وہ قدرت کی طرف سے بہت اونچا دل، وسیع ظرف اور بلند اخلاق لے کر آئے تھے، وہ نفسانیت سے پاک اللہ سے ڈرنے والے بزرگ تھے۔

ولادت سے وفات تک - بہ یک نظر

حضرت مفتی صاحب کی ولادت ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۰ء میں موضع کالیڑہ ضلع

بناس کانٹھا (شمالی گجرات) میں ہوئی، کالیڑہ پالن پور سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے، گاؤں میں مکتب کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے ماموں مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے ساتھ دارالعلوم چھاپی میں داخل ہوئے، وہاں اپنے ماموں اور دیگر اساتذہ سے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، چھ (۶) ماہ کے بعد حضرت مولانا نذیر میاں کے مدرسہ چلے گئے اور وہاں چار سال تک مولانا مفتی محمد اکبر میاں پالن پوریؒ اور مولانا ہاشم بخاریؒ سے عربی کی ابتدائی اور متوسط کتابیں (شرح جامی تک) پڑھیں، اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸ء میں مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور میں داخل ہوئے، یہاں آپ نے تین سال تعلیم حاصل کی، ۱۳۸۰ھ میں آپ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء میں دورۂ حدیث شریف سے فارغ ہوئے اور اول پوزیشن حاصل کی، یہ دارالعلوم دیوبند کا سوواں (۱۰۰) سال تھا، فراغت کے بعد دو سال تک افتاء کا کورس کیا اور حضرت مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہاں پوریؒ سے فتویٰ نویسی کی مشق کی۔

فراغت کے بعد ذیقعدہ ۱۳۸۴ھ سے دارالعلوم اشرفیہ راندیر سورت گجرات میں تدریسی خدمات کا سلسلہ شروع کیا اور شعبان ۱۳۹۳ھ تک مسلسل نو (۹) سال دارالعلوم اشرفیہ میں پڑھایا، شوال ۱۳۹۳ھ/نومبر ۱۹۷۳ء میں آپ کا تقرر دارالعلوم دیوبند میں مدرس کی حیثیت سے ہوا، اور اس وقت سے تا وفات تقریباً سینتالیس (۴۷) دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دیں، جن میں آخری دس بارہ سال آپ دارالعلوم دیوبند کے سب سے باوقار منصب شیخ الحدیث وصدر المدرسین کے منصب پر فائز رہے۔ وفات ۲۵/ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹/ مئی ۲۰۲۰ء بروز منگل بوقت چاشت قریب سات بجے ممبئی کے ایک ہسپتال میں ہوئی، اور اسی دن شام میں جوگیشوری کے قبرستان میں مدفون ہوئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کی وفات صرف دارالعلوم دیوبند کا نہیں بلکہ پوری ملت اسلامیہ کا سانحہ ہے، آپ کے جانے سے ایسا خلا پیدا ہوا ہے، جس کا پر ہونا آسان نہیں ہے، اللہ پاک آپ

کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند فرمائے اور ہمیں آپ کے نقش جمیل پر چلنے کی سعادت عطا فرمائے آمین

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

”سلطان العلماء“

حضرت علامہ مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری علیہ الرحمہ

مولانا محمد فہیم الدین بجنوری قاسمی | **خادم دارالعلوم دیوبند**

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں
میر تقی میر

استاذِ گرامی، حضرت علامہ مفتی سعید احمد پالن پوری علیہ الرحمہ کی وفات سے دارالعلوم دیوبند ایک شیخ الحدیث اور صدر مدرس سے زیادہ، ایک باعظمت ہستی سے محروم ہوگیا، قحط الرجال کے اس دور میں یقیناً ہر دو خلا غایت درجہ اہمیت کے حامل ہیں؛ لیکن عظمتوں کے مینار جن عناصر سے تشکیل پاتے ہیں، وہ نایاب نہیں، تو ہر عہد میں کم یاب ضرور رہے ہیں، اس وقت تو خیر! آپ مادرِ علمی کے سالارِ قافلہ تھے؛ اس لیے بزمِ قاسمی کا ہنگامہ گیر ودار آپ کے نفسِ گرم کا، رہینِ منت تھا؛ مگر ہر دو مناصب سے قبل بھی، گلشنِ علم وعرفان کی بہار وسرسبزی، آپ ہی کی نغمہ سرائی سے منسوب ہوا کرتی تھی۔

اہل نظر کو اس بات کا ادراک ہے کہ چمن کی آہ وفغاں کا پسِ منظر محض ایک منصب کا خلا یا ایک عمل کا انقطاع نہیں ہے، حضرت کے ساتھ جن علمی، دینی، فکری اور ملی عظمتوں نے ہمیں الوداع کہا ہے؛ رونا اصل ان کے لیے ہے، بلاشبہ آپ کی جدائی سے، جہاں دارالعلوم نے اپنے اکابر ومشائخ کی روایات کا امین اور دورِ اوائل کے امتیاز کا پاسبان کھویا ہے، وہیں دارالعلوم کی مسندِ حدیث سے، خدا جانے کتنی مدتِ مدید کے لیے، اس کی زینت، رونق اور

شوکت چھن گئی ہے۔

اس آخری دور میں خالص علمی بنیاد پر، بین الاقوامی شہرت صرف آپ کے حصے میں آئی، برِ صغیر تو بتامہ آپ کی شاگردی پر نازاں ہے، بیرون میں بھی آپ کی شخصیت کو بڑے پیمانے پر پذیرائی حاصل ہوئی، آپ کے فیض نے کئی برِ اعظموں کا سفر طے کیا، عجم کے علاوہ عربوں نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، یورپ، افریقہ وامریکہ وغیرہ کے علمی اسفار نے، آپ کو دارالعلوم دیوبند کے علم وفکر کے سفیر کی حیثیت میں نمایاں کیا اور اسی نظریہ سے دنیا بھر میں آپ کو سنا اور پڑھا گیا۔

اس اجمالی تاثر کے بعد، اب میں مختلف عناوین کے تحت، حضرت کے ان کمالات کا عکس، سینۂ قرطاس پر اتارنے کی کوشش کروں گا، جو ہزاروں کفش برداروں کی مانند، میرے لیے بھی شنیدہ کے بجائے، دیدہ ہونے کی وجہ سے، ذاتی مشاہدات وتجربات کے درجے میں ہیں۔

امامِ تدریس

شاگرد ہیں ہم میر سے استاد کے راسخ
استادوں کا استاد ہے استاد ہمارا
راسخ عظیم آبادی

تدریس آپ کا اصل میدان تھا، اس جوہر کو آپ کے جملہ کمالات کی روح اور جان سمجھنا چاہیے، تدریس میں جو کمال وجمال آپ کو عطا ہوا تھا، اس کی نظیر ہر چہار سو مفقود تھی، اگر تدریس بہ ذات خود ایک فن ہے اور اس کے مقاصد ومحرکات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے خدوخال، خوب وزشت اور ظاہر وباطن کی تحدید ہوسکتی ہے، تو آپ کی تدریس اس کا مصداق اکبر تھی اور حد درجہ تنزل اختیار کرتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ سررشتہ تعلیم کے ”عالمی مہم جو“، اگر آپ کے درس سے ذاتی نیاز حاصل کرتے، تو تدریس کے نئے معنی وضع ہونے کا

نظارہ بہ چشم خود کرتے۔

پورے ماحول کا ہمہ تن گوش ہو جانا، حاضرین کی یکسوئی وانہماک، وسیع حلقۂ درس پر گرفت، سامعین کا جوش وخروش، حاضری میں طلبہ کے مابین سبقت کی فضاء، دقیق مضامین کا ایسا بیان کہ ذہین کو اکتاہٹ نہ ہو اور غبی محروم نہ ہو؛ یہ نظارے آپ کے تدریسی معجزات ہیں۔

صاحبِ طرز مدرس

تدریس میں آپ کا اسلوب نرالا، اچھوتا، نادر، طرح دار، پیارا، دل کش، سحر انگیز اور سامعین وحاضرین کے لیے نظر بندی کا سامان پیدا کرنے والا تھا، پھر آپ کے اسلوب کی انفرادیت بھی نوع بہ نوع تھی، طرزِ تکلم جدا، لب ولہجہ منفرد، آواز الگ، ترتیب البیلی، غرض! آپ کا صاحبِ اسلوب ہونا بھی متعدد پہلوؤں کا حامل تھا۔

آپ کے معجز نما لہجے میں بہ یک وقت عالمانہ شوکت اور ناصحانہ شیرینی دونوں ہوتی تھیں، جب آپ بولتے تھے، تو گویا بھینی بھینی خوش بو مہکتی تھی اور ہلکی ہلکی بارش کا احساس ہوتا تھی، ایک عجب اسلوبِ بیان تھا، جو خراماں خراماں شروع ہوتا، گاہے تیز ہو کر رواں دواں بھی ہوتا، کبھی موج در موج کا سماں ہوتا اور کبھی سیل در سیل کا، میں اس کا واقف کار نہیں کہ اس دل کش انداز کے آپ واضع تھے، یا اسے انھوں نے اپنے پیش رو اساتذہ سے مستعار لیا تھا، بہ ہر صورت اس انداز کی گونج دیر تک محسوس کی جائے گی۔

حضرت کے درس کا امتیاز اکابر کے جھرمٹ میں بھی قائم تھا

آپ کے درس کا امتیاز عہدِ قدیم کی یادگار ہے، سچ ہے کہ مشک افشانی کو کبھی قدردانوں کے شکوے کی نوبت نہیں آتی، میں جب جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم بنگلور میں پڑھاتا تھا، تو ندوۃ العلماء کے ایک استاذ آئے تھے، جنھوں نے دارالعلوم دیوبند میں بھی اکتسابِ فیض کیا تھا اور وہ حضرت قاری طیب صاحب علیہ الرحمہ کے عہد میں یہاں آئے تھے، انھوں

نے دیوبند کی یادوں میں بہ طور خاص حضرت والا کے درس کا ذکر کیا اور ہمیں یہ بتا کر حیرت میں ڈالا کہ اس وقت کے اکابر کے انبوہِ کثیر میں بھی آپ کے درس کی منفرد شناخت تھی اور طلبہ کے مابین غایت درجہ محبوبیت ومقبولیت تھی۔

درس کی مقبولیت

آپ کا درس کیا تھا، ایک شمع محفل کا سماں ہوتا تھا! طلبہ پروانہ وار ہجوم کرتے تھے ہمارا دور دارالحدیث تحتانی کا ہے، جو اس وقت کی تعداد کے لیے بھی بہ مشکل کافی ہوتی تھی حضرت کے گھنٹے میں کھچا کھچ بھر جاتی تھی، تاخیر سے آنے والے طلبہ بھی حوصلہ نہیں ہارتے تھے اور دروازوں پر یا دروازوں کے باہر رہ کر درس سنتے تھے، قابلِ ذکر ہے کہ اس دور کی چوکھٹ اور دروازے سے بھی بڑے کاملین نکلے۔

ہمارے دورے کا سال ۱۹۹۸ء-۱۹۹۹ء کا ہے، اسے نشأۃ ثانیہ کے عہد کا عروج سمجھنا چاہیے، اس وقت دورِ ثانی کے جملہ اکابر، نازک عوارضِ صحت سے محفوظ تھے اور تدریس کے لیے درکار قوت وتوانائی شباب پر تھی؛ بالخصوص حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کا کوکبۂ جلال بام عروج پر تھا، تدریس کا طوطی شباب پر تھا اور حضرت دارالحدیث کے دلہا ہوا کرتے تھے، آپ کے درسِ ترمذی میں ”**كأن على رؤوسهم الطير**“ کا منظر قابلِ دید ہوتا تھا۔

اسی قوت وتوانائی کا ثمرہ تھا کہ درس کا اہتمام دیدنی تھا؛ بالخصوص معرکۃ الآراء مباحث میں کلام کی کیفیت بیان سے باہر ہے، مجھے دارالحدیث کا وہ سناٹا یاد ہے، جو آپ کے خراما خراما لہجے میں دفعۃً تیزی آنے کی وجہ سے کسی بھی دن پیدا ہو جاتا تھا، اگر حضرت کا رعب دینی درس گاہوں کی تہذیب اور خاص رنگ کی تربیت کا ماحول عارض نہ ہوتا، تو ان بحثوں کے اختتام پر دارالحدیث کے در و دیوار نعرۂ تکبیر سے لرز اٹھتے اور اندرون کی مسرت سے مغلوب ہو کر طلبہ حضرت کو شانوں پر اٹھا لیتے، بعض مباحث کے اختتام پر میں نے یہ محسوس کیا، جیسے طلبہ آوازۂ تحسین بلند کرنے سے باز رہنے کے لیے، ضبط کی قوتیں بروئے کار لانے میں مصروف ہیں۔

دورہ کا سنسنی خیز سال

خامہ و دماغ کے مابین کا رشتہ بھی عجیب ہے، گفتگو کے بہاؤ میں مجھے اپنے دورے کا سال تازہ ہو گیا ہے، معلوم نہیں کب ان حسین اور شیریں یادوں کو قلم بند کرنے کا موقع ہو گا! دل کے ہاتھوں مجبور ہوں کہ زندگی کے سب سے خوب صورت تجربے پر ایک دو جملے لکھ کر آگے بڑھوں۔

دورے کے سال کو طلبہ کے عروسی کا سال سمجھنا چاہیے، دارالحدیث کے شرکاء گویا نوشئہ ذی جاہ ہوتے ہیں، کون کہتا ہے کہ دورے میں سال بھر بتانے کا موقع ملتا ہے؟ آغاز میں سامنے کی سیٹوں تک رسائی کے ہنگامے اور الوداعی ترانوں کی گونج کے درمیان کا زمانی فاصلہ ماہ و سال کی سست روی کے بجائے، لمحات و ساعات کی تیز گامی سے گذرتا محسوس ہوتا ہے: ع: ’’جلوۂ گل سیر نہ دیدم و بہار آخر شد‘‘ کا منظر ہوتا ہے، وہ شب و روز کے دروس، حدیث نبوی کے جاں فزاں زمزمے، پر کشش آوازوں کی نغمہ سرائی، حدیث ہی حدیث، مطالعہ ہی مطالعہ، میکدہ اور فقط مے نوشی، جام اور بادے، وہ لطف جو اس سال آیا پھر کبھی میسر نہ ہوا، زندگی کے اس حسین سال کی عکاسی کے تئیں قلم وفا سے قاصر ہے، اپنے ذاتی جذبات یاد ہیں کہ میں سال کے آخر میں بہت سنجیدگی سے اس پر غور کر رہا تھا کہ دورہ مکرر پڑھوں اور قال الرسول کے نغموں سے ایمان کی تازگی اور روح کی بالیدگی کا یہ سلسلہ کم از کم ایک سال اور دراز کروں۔

تصنیف و تالیف

تدریس ایک غیر معمولی ذمے داری ہے اور انسان کو بوجھل کرنے کے لیے تنہا کافی ہے، پھر درس نظامی کی تشکیل کچھ اس نوع کی ہے کہ ہر سبق کے لیے سابقہ تیاری امر نا گزیر ہے اور اس میں کوئی استثنا نہیں؛ یہی وجہ ہے کہ تدریس کی یہ ذمہ داری ہمہ وقت اعصاب پر سوار رہتی ہے، دن تمام پڑھانے کی نذر اور شب مطالعے اور تیاری میں محبوس، ایسی صورت حال میں ایک مدرس سے، دیگر علمی یا عملی امور کی انجام دہی کرامت سے کم نہیں؛ لیکن ہماری تاریخ ایسی کرامتوں سے پُر ہے، جفاکشی، ریاضت اور مجاہدے کی ایک داستان ہے، جو اہل علم نے اپنے

خونِ جگر سے رقم کی ہے، وہ جہاں منصبِ تدریس کے مسند نشین تھے، قاضی وقت تھے، میدانِ جہاد کے شہ سوار تھے؛ عین اسی وقت ان کے بافیض قلم، علم کے دریا بہا رہے تھے اور ان کی تصنیف وتالیف کی سرگرمیوں سے اسلام کی لائبریری تیار ہو رہی تھی۔

پھر علمی آثار کو صدقۂ جاریہ میں خاص مقام حاصل ہے اور کیوں نہ ہو کہ دین کی بقا اور شادابی میں سب سے بڑا کردار قرطاس وقلم نے ادا کیا ہے، آج اگر ہمیں دور افتادہ علاقوں میں، چودہ سو سال بیت جانے کے بعد بھی، دینِ اسلام سے مستفید ہونے کا موقع میسر ہے، تو اس کا سہرا اس دراز تر داستان کے سر ہے، جو سینوں اور سفینوں دونوں نے مل کر رقم کی ہے، آخر کوئی وجہ ہے کہ اہلِ نظر نے، علماء کے قلم کی سیاہی کو شہید کے خون سے برتر اور راہِ علم کی سعی کو قتال وجہاد کی سرگرمی سے افضل سمجھا ہے!۔

حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ انگلیوں پر گنے جانے والی، ان نادر وعبقری ہستیوں میں سے ایک ہیں، جن کے چشمۂ علم وعرفان کی فیاضی میں قلم اور زبان دونوں نے اپنا حصہ ڈالا اُس تاریخ ساز تدریس کے کوائف بیان کرنے کے بعد کہ جس کے سحر نے نصف صدی قلوب پر حکمرانی کی، یہاں ہم دادِ قلم کی داستان چھیڑتے ہیں:

مبدأ فیاض سے جو قلم آپ کو ہم دست ہوا، اس کی پیشانی توفیق وبامرادی کے تمغے سے درخشاں تھی، ایسے کتنے اہلِ قلم، قارئین کی فہرست میں ہیں، جنھوں نے کتاب اللہ کی تفسیر کا خاکہ بنایا اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا؟ صحیح بخاری کی شرح کا بیڑا اٹھایا اور اس کو مکمل کیا؟ سنن ترمذی پر طالع آزمائی کی اور اس کو بھی پورا کیا؟ حجۃ اللہ البالغہ کی تشریح کے دفاتر تیار کیے؟ ایسے کتنے قلم تاریخ نے محفوظ کیے ہیں، جن کی انفرادی کارگزاری میں مذکورہ بالا دواوین درج ہیں؟

اس کے برعکس پیشِ نظر مثالیں ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!'' کا منظر بیان کرتی ہیں، خاکے خوب بنائے گئے؛ لیکن رنگ بھرنے کے خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے اور اس صورتِ حال سے بڑے بھی مستثنیٰ نہیں، خود بخاری کی کتنی شروح ہیں، جن کی علمی قیمت اپنی

جگہ؛ لیکن اکثر ناتمام ہیں اور بعض تو ایک دو جلدوں تک محدود رہ گئیں، ان میں بکھرے جواہر پارے قدردانوں کے صبر کا امتحان لے رہے ہیں، کیسے جام ہیں جو چھلکائے گئے؛ لیکن بادہ خوار تشنہ ہیں، محفلیں سجائی گئیں مگر سیری نہیں ہوئی، حضرت الاستاذؒ کے علمی منصوبوں کو دستِ غیب کا یہ تعاون ہمیشہ حاصل ہوا کہ جس کام کی تحریک اٹھائی اس کو انجام تک پہنچایا۔

تدریس کی طرح تصنیف میں بھی آپ کا طرز جداگانہ ہے، جو یقیناً بہ یک وقت سہل اور ممتنع دونوں ہے، ان کا جو یہ طریقہ ہے کہ وہ درپیش بحث پر سیر حاصل گفتگو پہلے کرتے ہیں اور عبارت کے حل کی سمت بعد میں آتے ہیں، یہ جتنا کامیاب، مؤثر اور پرکشش ہے اتنا ہی مشکل اور دشوار بھی ہے، اس کی اولین شرط یہ ہے کہ متکلم کو بحث پر عبور حاصل ہونے کے ساتھ مضمون مرتب بھی ہو اور بیان کے لیے یہ درجہ حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

تحفۃ الالمعی اور تحفۃ القاری دونوں دواوین ہماری طالبِ علمی کے بعد کے نقوش ہیں، تحفۃ الالمعی سے استفادے کا موقع کم ہوا؛ تاہم تحفۃ القاری کا مستقل خوشہ چیں ہوں ایضاح البخاری سے تعلق کی وجہ سے قدیم مراجع کی طرح، اہم معاصر شروح بھی پیش نظر ہیں موجودہ پسِ منظر میں شرح پر پڑنے والی نظر، استفادے کے ساتھ ساتھ جانچ پرکھ اور نقد وتحقیق کو بھی شامل ہوتی ہے؛ اس لیے تحفۃ القاری سے متعلق تاثر اندھیرے کا تیر نہیں ہوگا؛ بل کہ ذاتی مشاہدے وتجربے کے حکم میں ہوگا۔

تحفۃ القاری کی خصوصیات

اس عظیم تصنیف کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ وہ اردو زبان میں بخاری شریف کی ایک مکمل شرح ہے، فی زمانہ ہمارے سامنے اردو زبان میں صحیح بخاری شریف کی متعدد شروح ہیں؛ لیکن ان میں سے بیشتر ناتمام ہیں؛ جب کہ بعض ایسی بیش قیمت اور نابغۂ روزگار ہیں کہ ان کا ناتمام ہونا حسرتِ آیات سے کم نہیں، جیسے محدثِ بجنور، علامہ احمد رضا بجنوری کی ''انوار الباری شرح صحیح بخاری''، جس کی سطر سطر میں علم کے خزانے پنہاں ہیں؛ لیکن بہ ہر حال وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے!۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حضرت والا نے اختصار کے ساتھ صحیح بخاری کو حل کر دیا ہے، حضرت کی شرح کے بعد نسبتاً کم استعداد والوں کے لیے بھی بخاری کے تراجم و مضامین اور احادیث کو سمجھنا ممکن ہو گیا ہے، حضرت کی شرح کے علاوہ اردو میں غالباً دو شرح اور دستیاب ہیں جو مکمل ہیں؛ لیکن دونوں ہی حل عبارت سے قاصر ہیں؛ بل کہ حضرت مفتی تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم کے دروس پر مشتمل جو انعام الباری آئی ہے، اس کو تو شرح سمجھنا ہی زائد بات ہے؛ اس لیے کہ اس میں حضرت کے درس کو من وعن کتاب کی شکل دے دی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں عین درس کی مانند صفحات کے صفحات بغیر کسی کلام کے گذرتے ہیں، حل عبارت کے نقطۂ نظر سے دوسری شرح کا حال بھی ناگفتہ بہ ہے؛ تاہم یہ ممکن ہے کہ ثانی الذکر کے شارح کے پیش نظر بھی کوئی دیگر مقصود ہو، جس میں وہ شرح کامیاب ہو؛ لیکن حل بخاری کے لیے وہ یقیناً کافی نہیں۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ حضرت نے کتاب میں جامعیت کے ساتھ اختصار کو پیش نظر رکھا ہے، حضرت نے کتاب کے حل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں رکھا؛ لیکن حضرت کو اس بات کا بہ خوبی اندازہ تھا کہ اگر شارحین کی بحثوں میں توسع کی جانب گئے، تو عمر عزیز کافی نہیں ہوگی؛ اس لیے بحثوں کو سمیٹتے ہوئے حل کتاب پر توجہ مبذول کی ہے، اس طریق کی تفسیر کرتے ہوئے، حضرت بے تکلف تعبیر میں یوں فرماتے تھے: ''میں پنچایت نہیں کرتا کہ فلاں نے یہ کہا اور فلاں نے یہ کہا، میں تو وہ بیان کرتا ہوں جو مجھے سمجھ میں آیا''۔

یوں ممکن ہے کہ تحفۃ القاری کے بعض مباحث و مقامات سے اہل علم کو اتفاق نہ ہو اور احقر نے بھی بعض مقامات پر نشان لگایا ہے اور ان کو حضرت سے سمجھنا تھا؛ گو اس کا موقع نہیں ہوا؛ لیکن اس تبصرے سے اختلاف، کسی کے لیے بھی آسان نہیں کہ حضرت نے عبارت کو حل کرتے ہوئے، صحیح بخاری کی تفہیم و توضیح کا حق ادا کر دیا ہے۔

چوتھی خصوصیت کو حضرت کی تمام تصانیف کی خصوصیت سمجھنا چاہیے کہ وہ عبارت کے ذکر سے قبل ہی بحث کو اس کے مبادی کے ساتھ ذہن نشین کر دیتے ہیں، اس طرح مضمون

ذہن نشین ہوجاتا ہے اور بات دل میں راسخ ہوجاتی ہے؛ تاہم یہ طرز اختیار کرنا آسان نہیں جیسا کہ اوپر آیا، ظاہر ہے کہ اس مشکل طریق کو اپنانے میں آپ کی کامیابی بھی کوئی سادہ بات نہیں ہوسکتی؛ یقیناً اس کے پس پشت ریاضت اور مجاہدے کی ایک داستان ہوگی۔

خطابت وموعظت

تدریس وتصنیف کی طرح خطابت میں بھی آپ کا اسلوب وانداز بالکل جداگانہ تھا، خاص رنگ، پیارا انداز، دل کو لبھانے والی ادا، بولنے میں ایک نوع کا ٹھہراؤ تھا، جس سے مضمون عام فہم ہو جاتا تھا، زبان کی سلاست وروانی مجمع کو باندھے رکھتی تھی، جو عموماً ازدحامِ عظیم کی شکل میں ہوتا، بیشتر خطاب دراز ہوتے؛ لیکن سامعین کی بشاشت میں تغیر ممکن نہیں تھا، ہمہ تن گوش کا منظر از اول تا آخر یکساں قائم رہتا۔

تدریس وتصنیف کی مانند، خطابت کی راہ سے بھی آپ نے ایک عالم کو فیض یاب کیا، اس نسبت سے دنیا بھر میں آپ کو یاد کیا گیا، مشرق ومغرب میں عوام وخواص نے آپ کو سنا، احاطۂ دار العلوم میں بھی منصبِ خطابت آپ ہی کے لیے محفوظ تھا۔

مادرِ علمی میں تعلیمی سال کے آغاز کی انتہائی خاص مجلس ہو کہ جس میں علمی دنیا کا کریم سامنے ہوتا تھا، یا انبوہِ عظیم پر مشتمل عوامی اجلاس، یا دانش گاہوں کے خالص علمی پروگرام، یا ملک بھر کے چنیدہ اہل فقہ وفتاوی کا اجتماع، ہر رنگ وآہنگ کے خطاب پر یکساں عبور تھا اور ہر ماحول کی نزاکتوں کو بڑی پُرکاری سے نبھالے جاتے تھے۔

آپ کے بیانات، دراصل علمی، فکری اور تربیتی مضامین وابحاث سے تعبیر ہیں، فی زمانہ بیانات کا رجحان عروج پر ہے، آپ کے سلسلے کو اس کا حصہ گردانتا کوتاہ بینی ہوگی، علمی وفکری خزانوں کے لحاظ سے آپ کے بیانات کا درجہ، آپ کی معرکۃ الآراء تصانیف اور شہرۂ آفاق دروس سے کم نہیں ہے، بہت اچھا ہوا کہ آپ کے بیانات پر ترتیب وتدوین کا کام ہوا اور ان کو کتابی شکل میں طبع کیا گیا، آج وہ ”علمی خطبات“ کے نام سے اہل ذوق کے لیے سامانِ شفا بنے ہوئے ہیں۔

فکر ونظر کا خاص ذوق

آپ نوع بہ نوع موضوعات پر تدبر وتفکر کا خاص ذوق اور متواتر شغل رکھتے تھے ممکن ہے یہ وصف اپنے استاذِ خاص حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی علیہ الرحمہ سے گہرے تاثر کا نتیجہ ہو، آپ کے اس ذوق کے دو ثمرات مرتب ہوئے: ایک یہ کہ بعض مسائل میں آپ نے ایک نئی رائے قائم کی اور اس نوع کی تخلیقی فعالیت نے، روایات کے گلشن میں، افکارِ تازہ کے، گلہائے رنگارنگ کھلائے، دوسرا یہ کہ قدیم مباحث کو نئی ترتیب حاصل ہوئی، اول الذکر ثمرہ اہل علم کے یہاں زیر بحث رہا ہے؛ لیکن دوسرا فائدہ نہایت انمول ہے، یعنی بات تو اکابر ہی کی ہے؛ لیکن اس کو ایک خاص انداز میں سمیٹا گیا ہے اور جدید ترتیب سے آراستہ کیا گیا ہے، آپ کے دروس اور آپ کی تصانیف میں یہ نگینے جگہ جگہ جلوہ گر ہیں۔

کئی سال قبل لبنان کے ایک بہت ہی ذی علم شافعی عالم دیوبند آئے ہوئے تھے انھوں نے بڑی جدوجہد سے باضابطہ تعلیمی ویزا لے کر داخلہ لیا تھا، اس پوری کارروائی میں میرے خاص دوست، حضرت مولانا مفتی محمد انوار خان بستوی قاسمی حفظہ اللہ نے ان کی مدد اور رہنمائی کی تھی، ان کی وساطت سے مذکورہ عرب عالم کے ساتھ میرا بھی قریبی تعلق رہا، ایک روز وہ شدید تاثر میں تھے، دریافت کرنے پر کہنے لگے کہ آج تو عجیب ہوگیا کہ حضرت مفتی سعید احمد صاحب علیہ الرحمہ نے، **إنما الاعمال بالنیات** کی ایسی تشریح کی جو میرے لیے بالکل نئی تھی اور نہایت علمی اور دل چسپ تھی، ان کو مطلع کیا گیا کہ حضرت کے علمی عجائب کا یہ ایک نمونہ ہے۔

آپ کے دروس، تصانیف، حواشی اور علمی خطبات کو بہت حد تک آپ کا نتیجۂ فکر سمجھنا چاہیے، اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے نقوش وآثار نے اسلامی لائبریری کی ثروت میں اضافہ کیا ہے اور علم کی سرسبزی اور اس کے سرگرم سفر کی روانی میں اپنا قیمتی حصہ شامل کیا ہے، بہت سے مباحث میں، آپ کا یہ شہرۂ آفاق موقف رہا کہ اختلاف نص فہمی کا ہے، اس خصوصیت کو بھی اسی خاص پس منظر میں دیکھنا چاہیے؛ بل کہ آپ اپنے خوردوں کو بھی

اس کی دعوت وترغیب دیتے تھے، مختلف مجالس میں فرمایا کہ میں تو خوب سوچتا ہوں، تم بھی سوچو اور اس علمی سفر کو آگے بڑھاؤ۔

بے تکلفی وسنجیدگی

حضرت کا مزاح بھی عالم آشکار ہے، جو آپ کے حسین جمالیاتی ذوق کا عکاس ہے اور آپ نے جس طرح اس کو نبھایا وہ کرامت سے کم نہیں؛ کیوں کہ عصر بعد کی مجلس ہو، عوامی جلسہ ہو، یا درسِ حدیث کی مسند ہو؛ آپ کے رکھ رکھاؤ، خاص وضع اور علمی وقار سے، ماحول پر ایک پُر ہیبت فضا طاری رہتی تھی؛ لیکن اسی مہیب سناٹے میں، خاص مناسبت سے کوئی لطیفہ سناتے اور ماحول زعفران زار ہو جاتا اور حاضرین تازہ دم ہو جاتے، مجمع کو علمی مضامین گھول کر پلانے کے لیے سنجیدہ ماحول بنانا اور اسی لمحہ لوٹ پوٹ کرنے کے لیے محفل کو باغ باغ کرنا؛ یہ دونوں متضاد کرامتیں آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھیں، آپ ہر ماحول میں ہنسانے پر قادر تھے، ہنساتے تھے اور خوب ہنساتے تھے اور بڑوں بڑوں کو لوٹ پوٹ ہونے پر مجبور کر دیتے تھے۔

مجھے تکمیل ادب کے سال کا، حضرت والا کا ایک شگفتہ بیان، بیس سال بعد بھی تازہ و مستحضر ہے، ہفتم اولی کی درسگاہ میں محاضرات سے متعلق کوئی اجتماعی پروگرام، استاذِ گرامی حضرت قاری عثمان صاحب دامت برکاتہم کی زیر صدارت جاری تھا، منصبِ خطابت پر حضرت پالن پوری علیہ الرحمہ جلوہ گر تھے، اس روز حضرت کی طبیعت خوب کھلی اور پورے رنگ میں نظر آئے، مجھے حضرت صدرِ جلسہ کا، ہنس ہنس کر بے حال ہونا اور گرتے گرتے سنبھلنا کل کی طرح یاد ہے۔

شگفتہ مزاجی میں بہت بے تکلف ہوتے ہوئے بھی دیکھا اور اس رو میں ایسے لطائف بھی سنے کہ اس امانت کو آگے بڑھانا، ہر کس وناکس کا کام ومقام نہیں، رفقائے درس میں حضرت کے ایک صاحب زادے بھی تھے اور وہ سامنے ہی بیٹھتے تھے؛ لیکن مزاج عالی اگر آمادۂ شگفتگی ہو جائے، تو پھر کسی کا خیال نہیں فرماتے تھے اور بے تکلفی اسی عروج پر ہوتی، جو

عروج کمالِ وقار کو کچھ وقت قبل حاصل تھا، ابراہیم بھائی جائے پناہ دیکھتے اور ساتھیوں کی شریر و معنی خیز نگاہیں ان کا تعاقب کرتیں۔

حضرت جب سنجیدگی کے موڈ میں ہوتے، تو اس کا اہتمام بھی حد درجہ فرماتے، پھر مجال نہیں کہ کوئی زیرِ لب بھی مسکرائے، ترمذی شرف کے سبق میں اس حوالے سے ایک تنبیہ میرے حصے میں بھی آئی، حضرت نے خاص لہجے میں فرمایا: ''سنجیدگی سے سن، کیا ہوں ہوں ہنستا ہے''!۔

دار العلوم کے مردِ بحران

سب جانتے ہیں کہ اختلاف کے ایام میں اضطراب و انتشار اپنے عروج پر تھا، دیگر مصیبتوں کے علاوہ طلبہ کا تعلیمی زیاں موجبِ قلق تھا؛ اس لیے اس وقت ایک عارضی نظامِ تعلیم کی تحریک ہوئی اور کیمپ لگایا گیا، اس نظام کے روحِ رواں آپ ہی تھے، اس کے قصے بڑوں کی زبانی بہت سنے گئے اور اس وقت شعبۂ تعلیم کی باگ ڈور، جس طرح آپ نے سنبھالی، وہ اپنے آپ میں ایک تاریخ ہے۔

بعد کے دور میں بھی جو فتنے رونما ہوئے، ان کی آگ بجھانے میں ہم نے آپ ہی کو پیش پیش دیکھا، ہماری طالبِ علمی میں بھی ایک بڑا ہنگامہ ہوا، تعلیم کی پر سکون فضا اچانک ہیجانی ماحول میں تبدیل ہوگئی اور ایک طوفان کھڑا ہوگیا، حضرت مہتمم صاحب علیہ الرحمہ کی طرف سے مسجدِ رشید میں طلبہ کو جمع کیا گیا، اس موقع پر حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ نے بہت مؤثر خطاب کیا، جس میں فتنے کے عواقب سے متنبہ کیا اور اس کو فرو کرنے کا جو نسخہ احادیث میں آیا ہے، یعنی دوڑنے والا اپنی جگہ کھڑا ہو جائے، کھڑا ہوا شخص بیٹھ جائے اور بیٹھا ہوا لیٹ جائے؛ اس کی نہایت دل کش تشریح کی، طلبہ مطمئن ہو گئے اور فتنہ سرد ہوگیا۔

فنا فی العلم

ایک خاص چیز جو آپ کو معاصر اساطین و اعیان سے ممتاز کرتی ہے، وہ علمی یکسوئی ہے، آپ نے خود کو علم کے لیے وقف کر لیا تھا، غیر علمی سرگرمیوں سے خود کو سمیٹ کر فنا فی العلم

ہوکر رہ گئے تھے، خلوت ہو یا جلوت، صرف اور صرف علمی شغل تھا اور کچھ نہیں، یہ رنگ اس درجہ غالب تھا کہ غیر علمی گفتگو بھی ناگواری کا موجب ہوتی تھی، بسا اوقات برملا اس کا اظہار بھی فرمادیتے تھے؛ حتی کے عصر بعد کی مجلس بھی اسی مزاج میں ڈوبی ہوتی تھی، طلبہ مختلف علمی سوال کرتے اور حضرت ان کی تشفی کرتے، اگر سکوت طاری ہوتا، تو خود تحریک کرتے اور فرماتے کہ کچھ پوچھو۔

فی زمانہ مجالس کا یہ رنگ علماء کے یہاں بھی مفقود ہے، ایک تو عصر کے بعد تفریحِ طبع کا ذہن ہوتا ہے، دوسرے بعض کے یہاں بالقصد علمی گفتگو کو غیر مستحسن سمجھا جاتا ہے، ان کے یہاں امورِ سیاست اور کوائف زمانہ کے واقف کار ہی مجلس پر حاوی رہتے ہیں، یہ چیز بھی قبیح نہیں؛ بل کہ امورِ زمانہ سے باخبر رہنا بھی اپنی جگہ اہم تر ہے؛ تاہم علمی مذاکروں کا، اہل علم کی مجالس سے یک لخت اٹھ جانا اور اس سے ہمارا صاف کترانا بھی لمحۂ فکریہ ہے، حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کے یہاں مجلس میں بھی علمی مذاکرے کی میراث زندہ وتابندہ دیکھی گئی۔

عرق ریزی وجانفشانی

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

علامہ اقبال

آپ کی زندگی عملِ پیہم کا بھرپور استعارہ ہے، آپ کے مسلک میں جہد مسلسل ”علت العلل“ کا جزو لاینفک تھی، ان کا ایقان یہ تھا کہ انسان کی مساعی ہی، قدرت کی پراسرار قوتوں کو مشکل کشائی اور سرپرستی کی جانب راغب کرتی ہیں۔

چنانچہ پیرانہ سالی میں بھی نوجوانوں سے زیادہ مصروفِ عمل دیکھا گیا، ولولۂ عمل سے بے تاب دل ہمیشہ جوان رہا، آپ کے جملہ آثارِ علمیہ کو انھیں شب وروز کی کاہشوں کا خون بہا سمجھنا چاہیے، کوہ کنی اور سنگ تراشی میں نازک مزاجی کا کوئی دخل نہیں، ہم نے اپنے

اکابر اور آپ کے معاصرین کو بھی کھلے دل سے اس جانفشانی کا اعتراف کرتے ہوئے دیکھا اور سنا اور حلقۂ احباب کو تو اس احساس پر غریق ندامت پایا کہ پیرانہ سالی، ضعف اور عوارضِ صحت کے علی الرغم، حضرت کی مساعی جلیلہ، ہماری کاوشوں سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی تھیں۔

حق گوئی وبیباکی

آئین جواں مرداں حق گوئی وبیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

علامہ اقبال

حق گوئی میں بے نظیر تھے، بہ بانگِ دہل اپنی بات رکھنے کے لیے جو جرأتِ ایمانی درکار ہے، وہ حضرت حق سے بہ افراط پائی تھی، اس کی ایک دو نہیں، درجنوں مثالیں ہیں، نیز اس کا مشاہدہ کرنے والے بھی ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔

مجھے یاد آرہا ہے کہ آپ کی بنگلور تشریف آوری ہوئی تھی، میں اس وقت مسیح العلوم میں مدرس تھا، شہر کی مشہور مسجد ''قادریہ مسجد'' میں آپ کا خطاب تھا، مسجد حاضرین سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، مجمع مرفہ الحال اور تعلیم یافتہ تھا، جس میں مختلف افکار وخیالات کے لوگوں کی نمائندگی تھی، حضرت والا کسی موضوع پر گفتگو فرماتے ہوئے مودودیت پر آگئے اور اس شان سے گفتگو کی جیسے دیوبند کی دارالحدیث میں تشریف فرما ہوں، مجمع پر سناٹا چھایا ہوا تھا اور مخلصین اس ڈر میں سانسیں روکے ہوئے تھے کہ مبادا کسی گوشے سے گستاخانہ ردعمل نمودار ہو لیکن آپ کے بیان وخطاب کا رعب بھی دیدنی ہوتا تھا، سب گردنیں بدستور خم رہیں اور ماحول کی خوشگواری میں فرق ڈالنے والا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا۔

اسی قبیل کا ایک اور قصہ یاد آیا اور وہ بھی شہر بنگلور ہی کی مرکزی مسجد سر اسماعیل سیٹھ فریزرٹاون کا ہے، حضرت ایک بہت بڑے مجمع کو خطاب کررہے تھے اور حسنِ اتفاق کے دارالعلوم کے اکابر اساتذہ میں سے، ایک دیگر استاذِ گرامی بھی تشریف فرما تھے اور وہ باہر

والے حصے میں ایک جانب تھے، میں بھی ان کے قریب بیٹھا تھا، واقفِ حال جانتے ہیں کہ اس مسجد سے مربوط طبقہ بہت حد تک وسیع المشرب اور جدید سوچ وخیال کا حامل ہے حضرت نے مجمع کی نبض دیکھ کر اسی کا علاج شروع کیا اور بہت صاف صاف سنائی، مجھے اس بیان کا ایک وقفہ مستحضر ہے، جس نے مسجد کے در و بام پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب موبائل کی آمد کی خبریں اخباروں تک محدود تھیں اور مواصلات کا انحصار لینڈ لائن پر تھا، متدین گھرانوں میں اس بات کا اہتمام ہوتا تھا کہ نئی کال گھر کا مرد ہی رسیو کرے، جب کہ جدید گھرانوں میں توسع تھا، مردوں کے ہوتے ہوئے بھی خواتین کی سبقت قبیح نہیں سمجھی جاتی تھی، حضرت نے اس پر تنبیہ کے لیے سخت تعبیر منتخب کی مزید کام لب و لہجے نے کیا، جملہ کیا تھا ایک بجلی تھی، جو پوری قوت کے ساتھ بلا استثناء سب پر گری، میرے قریب تشریف فرما حضرت الاستاذ نے بھی اس کی شدت کو محسوس کیا۔

نیز ان سب سے بڑھ کر وہ واقعہ ہے، جس کی شہرت دور دور تک ہوئی، بنگلور میں حضرت قبلہ مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم، بانی و مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم بنگلور نے ''تحفظ شریعت'' کے عنوان سے اپنی نوعیت کی سب سے بڑی اور تاریخی کانفرنس بلائی تھی، اس رات قدوس صاحب عید گاہ کے میدان میں پورا ہندوستان موجود تھا دارالعلوم کے اکابر، ندوۃ العلماء کے اکابر وغیرہ زینتِ اسٹیج تھے، اجلاس میں بنگلور کے ایک بزرگ عالم دین نے اپنے بیان میں بعض قابل اعتراض نکات شامل کر دیے، حاضرین دم بہ خود رہ گئے، مجمع میں ایک عجیب ہیجانی کیفیت طاری تھی، حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کا تفصیلی بیان پہلے ہو چکا تھا، حضرت دوبارہ خطاب کی کرسی پر تشریف لائے اور جملہ اکابر کی موجودگی میں مذکورہ بالا فکر کی گمراہی کا اعلان فرمایا، اس وقت کا ماحول دیدنی تھا؛ کیوں کہ شہر بنگلور کے وہ مالک ہوتے تھے، یوں علانیہ رد، ذاتی خطرات کو دعوت دینے سے کم نہ تھا اور ایسا ہوا بھی چناں چہ دھمکیاں بھی دی گئیں اور بنگلور میں داخلے کی پابندی کے عہد و پیمان بھی ہوئے۔

یہاں دو باتیں قابلِ ذکر ہیں: ایک تو یہ کہ برملا اظہارِ حق، آپ کا خاص ذوق تھا

دوسرے یہ کہ وہ حق گوئی میں کسی بھی حد تک جانے کا حوصلہ رکھتے تھے اور اس حوالے سے وہ ہر طرح کی ترغیب وترہیب سے بے نیاز تھے، یہ ایک دو واقعات محض مثالیں ہیں، حضرت کا یہ مزاج خاص تھا اور سینکڑوں لوگ اس جلوے کے شاہد ہیں؛ گویا مذہب ومشرب ہی حق گوئی تھا جس بات کو وہ اپنے نزدیک حق سمجھتے تھے، اس کو بلا تامل، بے کم وکاست، بدون ہموار کیے مصلحت وموقع کا انتظار کیے بغیر، بے ساختہ کہہ ڈالنا، ان کے یہاں معمولی بات تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے روح القدس یا دستِ غیب آپ کا مؤید ہے۔

قدامت پر اصرار

کیا عشق نے سمجھا ہے کیا حسن نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

متاعِ دین ہی اہل اللہ کا سرمایہ ہے، اس خرمنِ حیات کے پیچھے قربانیوں کی ایک داستان ہوتی ہے، جسے وہ اپنے خونِ جگر سے رقم کرتے ہیں، دورِ جدید کی بیشتر پیش رفت اسی متاعِ عزیز پر شب خون مارتی ہیں؛ اس لیے اہلِ نظر ان سے قربت بنانے میں محتاط ہوتے ہیں اس سے انکار نہیں کہ بسا اوقات اس احتیاط میں بھی تجاوز ہوجاتا ہے؛ لیکن کیا کریں قزاقوں کی نگری میں، شک مزاجی ہی سلامتی کی ضامن ہے؛ بعض جدید سہولیات سے اکابر کے ابتدائی نفور کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے، اس حوالے سے حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ بھی غایت درجہ ذکی الحس تھے، حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ اپنے استاذِ گرامی حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی علیہ الرحمہ کے حوالے سے بیان کرتے تھے کہ ایک مرتبہ ان کے خدام یا فرزندان نے پرانا فرش اٹھا دیا، تو بڑی حسرت سے فرمایا: سعید! ایک دن یہ فرش ہی تبدیل ہوجائے گا اور یہاں نئی نئی چیزیں در آئیں گی۔

حضرت ایک مرتبہ مسیح العلوم تشریف لائے، راستے میں کسی نے حضرت امام مالک کے مشہور ارشاد: ”**لن يصلح آخر هذه الأمة إلا بما صلح به أولها**“ کی تشریح

دریافت کی، حضرت نے سکوت اختیار فرمایا، جامعہ آمد پر دفتر تشریف لے گئے، جہاں کرسیوں کا نظام تھا، حضرت نے کرسی پر بیٹھنے سے گریز کیا اور دوسری جانب نیچے تشریف فرما ہوئے اور سائل سے مخاطب ہوئے کہ اس اثر کا مفہوم یہی ہے؛ گو کہ حضرت نے خود آخر میں بہ عذر کرسی استعمال کی اور ظاہر ہے کہ مسیح العلوم کے دفتر میں بھی کرسیوں کا نظم، عذر و ضرورت اور کاموں کی انجام دہی میں سہولت وغیرہ کے پیش نظر ہی کیا گیا تھا۔

یادوں کے صفحات

آئی جوان کی یاد تو آتی چلی گئی
ہر نقش ماسوا کو مٹاتی چلی گئی

مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند میں داخلے کا خواب ۱۹۹۷ء کو پورا ہوا؛ گو کہ میرا یہ ششم کا سال تھا؛ لیکن آپ کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا، اس وقت صحت بھی عمدہ تھی، گوشہ گوشہ آپ کے جمال و کمال کی خوشبو سے معطر تھا، سابقہ سال میرے برادرِ کبیر جناب مولانا فخرالدین قاسمی کی فراغت کا سال ہے، وہ ممتاز طلبہ میں تھے، اگر تدریس اختیار کرتے، تو ان کی بھی ایک شان ہوتی، خط نہایت صاف تھا، ترمذی شریف کا درس اہتمام سے ضبط کیا تھا، حضرت کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے، بالکل نو عمری میں بندے کے قلب پر اولین نقوش یہیں سے ثبت ہوئے۔

ایک خاص دل فریب ادا

احقر کو بعض پروگراموں کے لیے رابطہ کرنے کا بھی اتفاق ہوا اور بعض رابطہ کاروں کی تحریک دیکھنے کا بھی موقع ملا، اس سلسلے میں احقر نے ایک خاص ادا نوٹ کی، پروگرام کا لفظ سنتے ہی غایت درجہ بے رخی اختیار فرماتے اور ایسا جواب دیتے کہ سامنے والا قطعی مایوس ہو جائے، نو وارد کی تحریک یہیں اختتام پذیر ہو جاتی؛ لیکن اگر کوئی واقف کار ہوتا اور دعوتِ قدم رنجائی میں معقولیت شامل کرتا، تو مان بھی لیتے تھے، میں نے بعض کرتب بازوں کو بھی

کامیاب ہوتے دیکھا، ایک صاحب بہت ہی فن کار ہیں، وہ عصر کے بعد حاضر ہوئے حضرت نے ان کے نمودار ہوتے ہی دونوں ہاتھ اٹھا کر معافی کی خواستگاری کا اشارہ دیا انھوں نے جیسے ہی پروگرام کی بات چھیڑی، حضرت نے درمیان میں قطع کلامی کرتے ہوئے، ان کو مایوسی آمیز حتمی جواب دیا، وہ پہنچے ہوئے تھے، خاموش ہوگئے، قدرے توقف کے بعد دوبارہ سلسلہ جنبانی کرتے ہوئے کہنے لگے کہ حضرت سفر کے بارے میں آپ کی مرضی؛ لیکن مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ مسجد کے سنگِ بنیاد کا معاملہ ہے اور ایک صاحبِ خیر نے یہ کہا ہے کہ اگر حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم تشریف لاتے ہیں، تو تعمیر کے مکمل اخراجات میں دوں گا، بہ صورت دیگر میری طرف سے کوئی عہد نہیں، یہ تیر کام کر گیا اور حضرت نے فوراً فرمایا: ٹھیک ہے جمعہ کا دن رکھ لو، اس قسطوں والی ترکیب کو میں نے بھی آزمایا اور بخت آور رہا۔

اس سلسلے میں حضرت تعلق کو حد درجہ نبھاتے تھے، حضرت نے بعض ایسے مقامات کے لیے بھی زحمتِ سفر گوارا کی، جہاں نام اور کام خاص نہیں تھا؛ لیکن زمامِ کار کسی قدیم خادم کے ہاتھوں میں تھی۔

فضائی سفر سے متعلق میرا سوال اور آپ کا جواب

فضائی سفر میری خاص کمزوری ہے، ٹکٹ کنفرم ہوتے ہی پسینہ پسینہ ہو جاتا ہوں ائیر پورٹ کی سمت دوڑتی ہوئی سواری، مقتل کی جانب کشاں کشاں لے جائے جانے کا تصور پیدا کرتی ہے، میں نے دہلی ائیر پورٹ پر، حضرت کے سامنے اس کا شکوہ کیا، حضرت نے بے تکلف انداز میں تین سوال کیے کہ بتاؤ مرنے کا وقت مقرر ہے؟ جگہ مقرر ہے؟ طریقہ مقرر ہے؟ اثبات کے جواب پر فرمایا کہ پھر ڈر کس بات کا ہے؟ حضرت کے خاص انداز نے کم از کم اس وقت راحت پہنچائی اور وہ سفر نسبتاً آسان گذرا، دورانِ سفر فلائٹ میں حضرت کرسی سے اٹھ کر درمیان کے راستے میں کھڑے ہوگئے تھے، مسلسل بیٹھنے میں تکلیف محسوس ہوئی ہوگی کافی دیر کھڑے رہے، میرے اوپر نظر پڑی تو مسکرائے۔

دل چسپ فون کال

کئی سال قبل کی بات ہے، حضرت ایک مسئلے کی تحقیق فرما رہے تھے، میں نے سرسری طور پر عرض کیا کہ یہ بات ایک عرب عالم نے فلاں کتاب میں لکھی ہے اور اس موضوع پر مبسوط کلام کیا ہے، بات آئی گئی ہوگئی، پھر اس بحث نے زور پکڑا، تو ایک شب مجھے حضرت کا فون آیا، میرے پاس اس وقت حضرت کا نمبر نہیں آیا تھا، دوسری طرف سے آواز آئی کہ میں سعید احمد بول رہا ہوں، مجھے آواز کی شناخت نہیں ہوئی، تو میں نے لاپرواہی میں کہا: بولو کیا کہنا ہے! حضرت نے دوسری بار میں فرمایا کہ میں سعید احمد پالن پوری بول رہا ہوں، تب میں ناگاہ اپنی اوقات میں آیا، حضرت نے فرمایا کہ مجھے عرب عالم کی وہ بحث درکار ہے، سردی شباب پر تھی اور کہرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، حضرت نے کسی کو بھیجنے کی پیش کش کی؛ لیکن وہ کاغذات لے کر حاضرِ آستانہ ہونا میری سعادت تھی، اس لیے صبح سویرے میں لے کر حاضر ہوا اور دعائیں لیں۔

تعلیم میں لاپرواہی پر اولاد کی فہمائش

میری معین مدرسی کے دور میں حضرت کے ایک صاحب زادے کا سبق متعلق تھا، اس کو بسا اوقات سبق میں دل چسپی کم ہوجاتی تھی، ایک مرتبہ کئی دن کا ناغہ ہوگیا، میں اور رفیقِ محترم حضرت مولانا توحید عالم بجنوری قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند، حضرت کو آگاہ کرنے کے لیے دولت کدے پر حاضر ہوئے، اس وقت رہائش سابقہ مکان میں تھی، پہلی منزل پر کونے کا کمرہ مطالعے اور ملاقات کے لیے تھا اور وہیں سے ایک دروازہ زنانے حصے کی طرف بھی کھلا تھا۔

حضرت کی خاص ادا تھی کہ روز مرہ آنے والوں کے علاوہ کسی کو دیکھتے تو فوراً آنے کا سبب دریافت فرماتے، ہم نے معاملہ پیش کیا، کئی دن کی غیر حاضری کو سن کر حضرت بہت خفا ہوئے، فرطِ غضب میں اولاً تو ہماری خبر لی کہ اطلاع دینے میں اتنی تاخیر کیوں کی، پھر

صاحب زادے کو طلب کیا، حضرت حسبِ عادت بیٹھے ہوئے تھے؛ لہٰذا بیٹھے ہوئے ہی مارنا شروع کیا اور بہت مارا، وہ جان بچانے کے لیے کھڑا ہوا، تو حضرت بھی مارتے مارتے کھڑے ہو گئے، اس وقت حضرت نے بیٹے کو کتنا مارا؟ اس کے لیے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کسی باپ کو بہ دستِ خود اتنا مارتے ہوئے نہیں دیکھا، حضرت کے تنفس میں تغیر آ گیا حال برا ہو گیا، آخر گھر میں سے دخل ہوا اور آواز آئی، گفتگو کا وہ تبادلہ گجراتی میں تھا، ادھر مبتلا بہ کو یہ سمجھ میں آیا کہ کسی طرح گھر کے زنان خانے کی طرف پیش رفت کرنی چاہیے، وہ اُدھر بڑھا اور حضرت بھی اس کو مارتے مارتے ادھر تشریف لے گئے، کچھ دیر کے بعد واپس تشریف لائے، تو ہم اپنی باری کے منتظر تھے؛ لیکن ہمارے لیے تیز کلامی پر اکتفا فرمایا اور ہم بہت ہی ندامت لیے بہ سلامت اپنے حجروں کو پہنچے۔

شاگردوں کی حوصلہ افزائی

دورۂ حدیث میں اول آنے پر انعام کے سلسلے میں کچھ فرمانے کے لیے مجھے گھر طلب کیا، حضرت مہتمم صاحب علیہ الرحمہ کی طرف سے، انعامی کتب کے انتخاب کی ذمے داری آپ کو تفویض کی گئی تھی، میں عصر بعد حاضر ہوا تو مخصوص مہمانوں کا ایک وفد موجود تھا، مخصوص میں نے اس لیے کہا کہ حضرت بعد میں ان کو رخصت کرنے کے لیے باہر سڑک تک تشریف لائے تھے، آپ نے ان کی توجہ میری طرف مبذول کرائی اور بہت حوصلہ افزائی کی۔

ہمارے سال میں ترمذی شریف کے ششماہی نتیجے پر شاکی ہوئے تھے، فرمایا تھا کہ مجھے صرف دو کاپیاں پسند آئیں، اس وقت نمبرات کا منتہی عدد پچاس تھا، جس کو حاصل کرنے والے دو طالب علموں میں سے ایک میں تھا اور دوسرے رفیقِ محترم مفتی محمد مزمل صاحب بدایونی، استاذ دارالعلوم دیوبند تھے، جن کو حسبِ سابق ششماہی امتحان میں اول آنے کا امتیاز بھی حاصل ہوا تھا، اس امتحان میں عاجز نے اس خوشی پر اکتفا کیا تھا کہ کُل ممتحنہ چار کتابوں میں سے، بخاری اور ترمذی دونوں میں پچاس نمبر آئے تھے اور یہ امتیاز بھی فقط متذکرہ بالا دو طالب علموں تک محدود تھا۔

دل چسپ مذاکرے

ایک مرتبہ میں نے علاماتِ قیامت اور ظہور مہدی وغیرہ سے متعلق گفتگو کی حضرت کی رائے یہ تھی کہ ابھی اس کا وقت دور ہے، حضرت نے فرمایا کہ ظہور مہدی کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ ترکی پر غیروں کا قبضہ ہوگا؛ کیوں کہ احادیث میں آیا ہے کہ ظہور مہدی سے قبل مسلمان قسطنطنیہ فتح کریں گے اور اس کے لیے خون بہانے کی نوبت نہیں آئے گی؛ بل کہ نعرۂ تکبیر سے فتح ہوگا اور ابھی چوں کہ ترکی پر مسلمانوں کی حکومت ہے؛ اس لیے ظہور مہدی کا امکان نہیں ہے۔

بندے نے یہ عرض کیا تھا کہ مذکورہ واقعہ پیش آچکا ہے، جنگ عظیم اول کے بعد خلافت کا خاتمہ ہوا، ترکی بھر میں قرآن، اذان اور نماز سمیت، شعائر اسلام پر سخت ترین پابندی عائد کی گئی، یہ ترکی کا غیروں کے قبضے میں جانا تھا، پھر طیب اردگان وغیرہ کی سرکردگی میں، وہاں دوبارہ اسلامی شعائر اور دینی سرگرمیوں کی واپسی اور اسلام کی بہار سے ترکی کا سرسبز ہونا؛ یہ فتح قسطنطنیہ ہے، جو نعرۂ تکبیر یعنی پرامن راہ سے حاصل ہوئی، قتال کی نوبت نہیں آئی۔

میں نے جب قربِ قیامت پر اصرار کیا تو فرمایا کہ تو ایضاح البخاری لکھنا بند کردے، جب تیرے نزدیک قیامت بس آنے ہی والی ہے، تو اس کو لکھنے کا کیا فائدہ؟

میں نے ایک بار لکھنے پڑھنے کے عوارض بیان کیے؛ بالخصوص گھریلو موانع کا ذکر کیا، تو فرمایا کہ تیرے بس کی بات نہیں ہے، تم لوگ کچھ نہیں کر پاؤ گے، پھر فرمایا کہ میں نے زندگی میں ماچس تک خود نہیں خریدی، اولاً یہ امور امین کے ذمے تھے، بعد میں بچوں نے سنبھال لیے۔

تمام خاکے مکمل

ایک اور چیز جو آپ کو معاصرین ہی نہیں، بہت سے اکابرینِ امت سے بھی ممتاز کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ اپنے کرنے کا تمام کام کر گئے اور ہر کام بڑی آسانی سے، گویا ہنستے ہنستے کر گئے، بڑے بڑے منصوبے بنائے اور ان کو بہ خوبی مکمل کیا اور علم وفکر کا بڑا ورثہ چھوڑ گئے:

میں آج مر کے بھی بزم وفا میں زندہ ہوں
تلاش کر میری محفل، مرا مزار نہ پوچھ

علالت اور انتقال

شوگر کے قدیم عارضے کے باوجود مجموعی طور پر حضرت کی صحت وتوانائی ہمیشہ بہتر دیکھی گئی؛ اس لیے جب دو مواقع پر تشویش کی صورتِ حال بنی، تو اس کو ناگاہ سمجھا گیا، پہلا موقع دل کے عارضے کا تھا، جو کامیاب آپریشن پر منتہی ہوا، اس وقت بھی یاس کی لہر آئی تھی دوسرا موقع یہ تھا، جو دارِ فانی سے کوچ پر منتہی ہوا، یہ سلسلہ رجب میں دورانِ درس زبان بندی سے شروع ہوا تھا؛ لیکن چوں کہ زبان رکنے کی تکلیف سابق میں بھی کئی بار پیش آئی تھی اور علاج سے اس کا ازالہ ہوتا رہا تھا؛ اس لیے شاید کسی نے بھی اس میں خطرے کی علامت محسوس نہیں کی اور ان کا یہ ادراک درست تھا؛ چناچہ حسبِ سابق ممبئی کے علاج سے افاقہ ہوا؛ یہاں تک کہ آپ نے طویل خطاب بھی کیے؛ لیکن پھر طبیعت ناساز ہوئی اور اس بار مختلف عوارض نے ہجوم کیا؛ وقتِ موعود آ گیا تھا؛ اس لیے قضا غالب آئی اور تدابیر کارآمد نہ ہوئیں۔

عالمی وبا کورونا وائرس کی وجہ سے آمد ورفت کی راہیں مسدود تھیں؛ اس لیے سانحۂ جان کاہ نے دوہرا غم دیا، جو جہاں تھا وہیں تڑپ کر رہ گیا، نہ روئے مبارک کی زیارت ملی، نہ نماز کی سعادت، ایک غم نہیں تھا غموں کے پہاڑ تھے:

رہنے کو سدا دہر میں آتا نہیں کوئی
تم جیسے گئے ایسے بھی جاتا نہیں کوئی
کیفی اعظمی

حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ ہمارے درمیان نہیں رہے؛ لیکن ان کے چھوڑے ہوئے نقوش وآثار، اس ناقابلِ تسخیر سلسلۂ کوہ کی مانند، ہمارے سامنے پھیلے ہوئے ہیں کہ جس کی بلند وبالا اور دل کش چوٹیاں، آنے والی نسلوں کو دعوتِ شوق کے نظارے کے ساتھ

ذوق جادہ پیمائی بھی دیتی رہیں گی:

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

میر تقی میر

بہ حالتِ غنودگی آپ کی زیارت

بندے کو بہ حالتِ غنودگی دو بار آپ کی زیارت ہوئی اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہر دو دفعہ غنودگی، یعنی بین النوم والیقظہ ہی دیکھا، پہلی دفعہ روئے مبارک دیکھا، جو تازہ ہشاش بشاش اور درخشاں محسوس ہوا، حضرت حسبِ عادت تبسم فرما رہے تھے، بس اسی پر میں اٹھ بیٹھا، یہ ۲۷ رمضان کی بات ہے اور دوسرا واقعہ عید کے بعد کا ہے، اس بار آپ کو گفتگو کرتے ہوئے دیکھا، درمیان میں آپ نے پان تھوکا اور پھر سلسلۂ کلام شروع فرمایا۔

خاتمہ

عاجز کی داستان انجام کو پہنچی، میں زبان و بیان کا آدمی نہیں ہوں، حضرت کے کمالات کا بیان میری باریابی سے بالاتر ہے، اس مضمون میں شاید ہی کوئی بات ایسی ہو، جو قارئین کی معلومات میں اضافے کا سبب بنے، حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کی بارگاہ میں گلہائے عقیدت پیش کرنے کا سلسلہ جاری ہے، ہزاروں تاج دارانِ قلم کی گردنیں آپ کے حقوق سے گراں بار ہیں، جن کو حقِ تلمذ کی ادائے گی کے فریضے کا احساس بھی ہے؛ اس لیے بہترین تخلیقات آئندہ بھی نمودار ہوں گی؛ میں تو بہ صدق دل کہتا ہوں کہ ان سطور کی تسوید کے بہانے، کچھ وقت حضرت الاستاذ کی یادوں میں گزارنا چاہتا تھا، اللہ کا شکر ہے کہ غرض بالا کی تحصیل میں نامراد نہیں ہوا۔

تجھ بن تیرا شہر ویران بہت ہے
گلی چپ ہے بازار سنسان بہت ہے

تیری صدائیں ہیں چار سو بکھری ہوئی
تیری تلاش میں نگاہ پریشان بہت ہے

اور اخیر میں ان دو اشعار کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں:

نہ دید ہے نہ سخن اب نہ حرف ہے نہ پیام
کوئی بھی حیلۂ تسکیں نہیں اور آس بہت ہے
امیدِ یار نظر کا مزاج درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اداس بہت ہے
فیض احمد فیض

محسن ومشفق استاذ محترم اور عظیم مربی ومردم ساز انسان کامل

حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ

سابق شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند

مولانا قاری شفیق الرحمٰن صاحب بلندشہری

استاذ تجوید وقرأت دار العلوم دیوبند

یوں تو مجھے اپنے تمام ہی اساتذہ حضرات سے ہمیشہ محبت والفت رہی تاہم جن اساتذۂ کرام سے زیادہ قربت اور محبت رہی ان میں استاذ گرامی قدر حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب بلندی شہری سابق شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند اور حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری استاذ حدیث دار العلوم دیوبند ہیں۔ اللہ تعالیٰ دونوں حضرات اور تمام اساتذہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

حضرت مفتی سعید احمد صاحب سے میری قربت اس وقت سے بڑھی جب میں 1985ء میں مشکوٰۃ شریف کی جماعت میں تھا حضرت کے یہاں ہدایہ رابعہ کا سبق تھا میرے دو ساتھی مولوی صغیر احمد بلندی شہری (جو اس وقت ایک بڑے مدرسے کے علی گڈھ میں منتظم اعلیٰ ہیں) مولوی محمد عارف بلندشہری (جو آج کل بلندشہر کے قصبہ شکارپور ضلع بلندشہر کی جامع مسجد کے امام وخطیب ہیں اور وہاں تعلیمی اور تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف ہیں) ہم تینوں اکثر ایک ہی تپائی پر بیٹھ کر پڑھتے تھے ہم لوگ اگلی تپائی پر بیٹھنے کی کوشش کرتے تاکہ استاذ محترم کی مکمل توجہ حاصل ہوسکے۔ میں اس زمانہ میں محلّہ بیرون کوٹلہ کی مسجد شاہ ماہ رو میں امامت بھی کرتا تھا۔ حضرت اسی مسجد میں جمعہ کی نماز ادا فرماتے اور خطبے میں نماز میں قرأت میں ارکان نماز میں پیش آنے والی غلطیوں کی اصلاح بھی فرماتے اور میری قرأت کی حوصلہ افزائی بھی فرماتے تھے حضرت اقدس سے اسی طرح قربت بڑھتی رہی اور قربت میں اضافہ

ہوتا گیا اس زمانہ میں بعض شریر طلبہ حضرت کی درسی تقریر پر بھی بعض غیر مناسب باتیں کرتے تو مجھ کو شدید غصہ آتا اور ان کی ان باتوں سے سخت اذیت ہوتی۔ ظاہر ہے کہ یہ حضرت سے تعلق ہی کا نتیجہ ہوتا۔ اگلے سال دورۂ حدیث شریف میں داخلہ ہوا تو امسال اگلی تپائیوں پر بیٹھنے والے طلبہ بہت تھے اس لئے تین چار تپائیوں کے بعد بیٹھتے مگر سامنے ہی بیٹھتے اور ترمذی شریف کی مکمل تقریر لکھتے بھی تھے۔

درس میں حضرت کا انداز گفتگو:

حضرت کی سبق کی تقریر نہایت شاندار اور عمدہ ہوتی مدلل ہوتی مگر ساتھ ہی بہت آسان ہوتی گفتگو کی رفتار ایسی ہوتی کہ طلبہ بہ آسانی اس کو لکھ سکیں۔ چنانچہ دورے کے اکثر طلبہ حضرت کی تقریر مکمل لکھنے کی کوشش کرتے اگر کسی سے کچھ چھوٹ جاتا تو دوسرے ساتھی کی کاپی سے نقل کرنے کی کوشش کرتے۔ صبح تیسرا گھنٹہ مکمل اور شام مغرب کے بعد دونوں وقتوں میں ترمذی جلد اول ہی کا سبق ہوتا سال کے آخر میں طحاوی شریف بعد مغرب پڑھاتے مگر تفصیلی مباحث ترمذی شریف ہی کے اندر بیان فرماتے تھے سال جب ختم کے قریب تھا میری آمد و رفت حضرت کے یہاں بعد عصر زیادہ ہونے لگی۔

دورۂ حدیث شریف کے بعد قرأت میں داخلہ

دورہ کے سال ایک دن حضرت نے مجھ سے معلوم کیا کہ آئندہ کیا ارادے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ میں قرأت پڑھنا چاہتا ہوں مگر میرے حالات نہیں ہیں تو حضرت نے معلوم کیا کہ تمہاری شادی ہوگئی میں نے عرض کیا کہ حضرت میرے ۳ بچے بھی ہیں۔ اس پر حضرت نے تعجب کا اظہار بھی فرمایا اور غایت شفقت سے فرمایا کہ تم پڑھنے کا ارادہ کرلو انتظام ہوجائے گا اور پھر فرمایا کہ اپنے والد کو بلا کر لانا میں ان سے بھی بات کرلوں گا۔ خیر رمضان کے آخر میں میں نے اپنے دادا جان اور اپنی والدہ محترمہ سے مشورہ کیا اور قرأت میں داخلہ کی اجازت چاہی اور یہ بھی کہا کہ میرے لئے خرچ کی فکر نہ کریں اللہ تعالیٰ نظم فرمادیں گے۔ والدہ محترمہ نے اجازت دے دی اور میں نے قرأت سبعہ میں استاذ محترم جناب

مولانا قاری ابوالحسن صاحب مدظلہ کے یہاں داخلہ لے لیا اور حضرت مفتی صاحب نے مجھے فرمایا کہ تم میرے بچوں کو ایک گھنٹے پڑھایا کرو چنانچہ دوپہر چھٹی کے بعد میں نے حضرت کے فرزندان مولوی رشید احمد مرحوم اور سعید احمد مرحوم اور وحید احمد سلمھم کو پڑھانا شروع کیا اور حضرت نے ڈیڑھ سو روپے میرا وظیفہ شروع فرمایا جو میرے لئے ضرورت پوری کرنے کے لئے کافی تھا پھر اسی سال درمیان میں (یہ 1987ء کا سال ہے) دیوبند کے مشہور قاری جناب قاری جلیل الرحمٰن صاحب عثمانی اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے رٹائرڈ ہو گئے تھے ان کی جگہ سال پورا کرنے کے لئے طلبہ میں سے انتخاب ہونا طے ہوا جس میں میرا اور قاری زکریا صاحب گونڈوی کا انتخاب کرلیا گیا اور یہاں بھی ڈیڑھ سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا اس میں بھی حضرت مفتی صاحب ہی معین ثابت ہوئے۔ اگلے سال بحیثیت معین کے میرا تقرر شعبۂ تجوید میں ہو گیا وظیفہ میں اضافہ ہو گیا مزید یہ کہ مسجد قدیم کی امامت بھی مجھے دے دی گئی جو دو سالوں تک چلی۔ یہ 1988، 1989 ہے۔ دو سال مدرسہ افضل العلوم تاج گنج آگرہ میں تجوید وقرأت وغیرہ کی خدمت انجام دی اور جب میں آگرہ کے لئے ایک مدرس لینے آیا تو حضرت نے فرمایا دارالعلوم میں شعبۂ تجوید میں جگہ ہے قاری کی ضرورت ہے تم درخواست دے دو میں نے کچھ پس وپیش کیا تو حضرت نے کاغذ اور قلم اٹھایا اور درخواست کا مضمون اپنے مبارک ہاتھ سے لکھ کر مجھے عنایت فرمایا کہ اس کو نقل کر کے حضرت مہتمم صاحب مولانا مرغوب الرحمٰن کو دے دو۔ میں درخواست دے کر آگرہ چلا اور پھر شعبان کی شوریٰ میں میرا تجوید کے شعبہ میں باقاعدہ تقرر ہو گیا اس تقرر میں بھی حضرت مفتی صاحبؒ کی شفقتیں اور محبت مسلسل رہی اور پھر گھر پر بچوں کو تجوید پڑھانے کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ جو تقریبا ۵، ٦ سال تک چلتا رہا۔ اس ذریعہ سے روز حضرت سے ملاقات بھی ہو جاتی اور حضرت کام کے سلسلہ میں راہنمائی بھی دیتے رہتے ادھر کئی سالوں سے پابندی کے ساتھ جانے کا سلسلہ تو نہیں رہا تھا مگر جب بھی زیارت کے لئے جانا ہوتا تو پہلے ہی کی طرح محبت اور شفقت فرماتے۔

سفر میں حضرت باغ و بہار رہتے

حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ متعدد اسفار میں بھی جانے کا موقع ملا حضرت کا درسگاہ میں طلبہ پر بہت رعب رہتا تھا درس شروع ہونے کے بعد کوئی طالب علم درسگاہ میں آنے کی جرأت نہیں کرتا تھا آپ کے تشریف لانے سے پہلے ہی تمام طلبہ درسگاہ میں حاضر ہوجاتے تھے جہاں حضرت نے دارالحدیث میں قدم رکھا اور ایک سکوت طاری ہوگیا اور درس شروع ہونے کے بعد تو کان علیٰ رؤسھم الطیور کا مظہر ہوتا تھا۔ مگر جب آپ سفر میں جاتے تو اس کے برعکس نہایت خوش وخرم اور ساتھیوں کے ساتھ بلکہ اپنے چھوٹوں اور خدام کے ساتھ بھی بے تکلف ہوجاتے کبھی فرماتے کوئی واقعہ سناؤ کبھی فرماتے کوئی نظم سناؤ اور خود بھی کبھی کوئی واقعہ سناتے اس بے تکلفی کا آغاز خود فرماتے جس سے ہمراہیوں کی جھجک ختم ہوجاتی۔ درسگاہ والا معاملہ سفر میں نہیں رہتا۔ فرماتے درسگاہ کا معاملہ دوسرا ہے۔ درسگاہ میں نہایت سکینت اور وقار کے ساتھ پورے درس میں تشریف فرما ہوتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب اور ترمذی شریف کا درس

اہل علم جانتے ہیں کہ کتب حدیث میں جو حیثیت ابواب فقہ کی ترتیب کے لحاظ سے ترمذی شریف کی ہے وہ دوسری کتابوں کی نہیں ہے۔ اس کتاب کا انداز ہی نرالا ہے۔ اس میں ایک سے ایک اہم فقہی ابحاث آتی ہیں اوران پر کلام کے لئے حدیث اور اصول حدیث کے ساتھ ساتھ فقہ اور اصول فقہ اور اسی طرح محدثین اور فقہاء کے طبقات نیز اسماء الرجال پر کامل مہارت کی ضرورت ہوتی ہے اور الحمدللہ دارالعلوم دیوبند کا ہمیشہ سے امتیاز رہا ہے کہ یہاں کے حضرات اساتذہ نے شروع ہی سے نہ صرف اس کی حیثیت کو اور مرکزیت کو باقی رکھا ہے بلکہ اس میں ہمیشہ چار چاند لگائے ہیں۔ حضرت شیخ الہند پھر حضرت علامہ کشمیری رحمہما اللہ، اسی طرح شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ، حضرت علامہ ابراہیم صاحب بلیاویؒ ان حضرات کے یہاں جو بحثیں اور جو معرکۃ الآراء کلام ترمذی شریف کے ابواب پر ہوتا وہ دوسری کتب حدیث میں نہیں ہوتا تھا۔

آخر میں حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحبؒ کے یہاں بھی ترمذی شریف کے ابواب پر جو کلام اور بحثیں ہوتیں وہ نہایت عمدہ اور مدلل ہوتیں۔ حضرت لمبی لمبی اور نہایت پر مغز علمی بحثیں فرماتے جن کے ذریعہ سے مسلک حنفی خوب منقح ہو جاتا اور معلوم ہوتا کہ مسلک حنفی ہی سنت سے سب سے زیادہ قریب ہے جو ایک حقیقت بھی ہے چونکہ حضرت والا کو جہاں تمام فنون اسلامیہ پر دسترس حاصل تھی وہیں آپ اعلیٰ درجہ کے فقیہ بھی تھے اور آپ کے درس میں حدیث کے ساتھ فقہ کا رنگ خوب نمایاں ہوتا تھا۔ بعض مرتبہ ایک ایک مسئلہ پر کئی کئی روز سبق میں شاندار اور لاجواب تقریر فرماتے۔ جس سے طلبہ اور سامعین کو مکمل تشفی اور تسلی ہو جاتی اور درس کے بعد طلبہ کے چہروں پر عجیب خوشی اور مسرت ظاہر ہوتی آپ کی یہ تقریریں اور درس کی حلاوت ایک زمانہ تک اہل علم محسوس کر سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے درجات کو بلند فرمائے اور دنیا کو آپ کے علوم سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ نے دورۂ حدیث میں درس ترمذی اور اسی طرح بخاری شریف کے درس کو جو استحکام بخشا وہ آپ کا خصوصی امتیاز تھا آپ کا درس آغاز سال سے آخر سال تک یکسانیت کے ساتھ چلتا اور پوری کتاب اسی وقار کے ساتھ مکمل فرماتے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے درس کو اللہ تعالیٰ نے وہ مقبولیت عطا فرمائی تھی کہ جو علماء باہر سے دیوبند کی زیارت کے لئے آتے وہ ایک دو گھنٹہ ضرور آپ کے درس میں شامل ہوتے اور اس شمولیت کو اپنے لئے سعادت سمجھتے۔

حقیقت ہے کہ درس کی ان خصوصیات کے اعتبار سے آپ دارالعلوم دیوبند کے دورۂ حدیث کی عزت اور آبرو تھے اور دارالعلوم کے لئے سرتاج کی حیثیت رکھتے تھے آپ سے پورے دورۂ حدیث کا ایک بھرم تھا۔ ”ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے“۔

حضرت کے یہاں عبارت خوانی اور انداز تفہیم

دارالعلوم دیوبند کا یہ بھی ایک امتیاز رہا ہے کہ حدیث شریف کی عبارت عمدہ اور صاف پڑھنے ہمیشہ ترغیب دی جاتی ہے۔ حضرت مفتی صاحب کے یہاں اس پر بطور

خاص توجہ کی جاتی تھی۔ حضرت سال کے آغاز میں بچوں کو باقاعدہ اس کی تربیت دیتے تھے حروف کی ادائیگی ٹھیک کراتے تاکہ حدیث کے الفاظ صحیح ادا ہوں۔ صاف ادا ہوں۔ عبارت خوانی کی رفتار پر بھی تنبیہ فرماتے کہ تدویراً عبارت پڑھی جائے درمیانی رفتار سے، نہ بہت تیز ہو اور نہ بہت سست رفتاری سے ہو، اس کے لئے بچوں کو گھر بلا کر ان کو تیار کرنے اور پھر جو طلبہ حضرت کے ذوق کے مطابق تیار ہو جاتے تو پورے سال وہی عبارت پڑھتے۔ اس لئے حضرت کے درس میں عبارت خوانی کا منظر انتہائی خوبصورت اور دلکش ہوتا، اسی کے ساتھ حضرت کا انداز تفہیم بھی بہت عمدہ اور سہل ہوتا، غبی سے غبی بچہ بھی اس کو سمجھ جاتا۔ مشکل اور پیچیدہ مسائل کو نہایت آسان انداز میں سمجھانے کا اور حل کرنے کا ملکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا تھا دورۂ حدیث شریف میں بہت سے مسائل کا حدیث کی کئی کتابوں میں تکرار ہوتا ہے طلبہ انتظار کرتے کہ یہ مسئلہ حضرت کے یہاں کب آئے گا اور جب مسئلہ آتا آپ اس کو اس طرح سمجھاتے کہ طلبہ کو مکمل تشفی ہو جاتی۔

بہر حال! اب حضرت ہمارے درمیان نہیں رہے۔ اللہ کی طرف سے مقرر کردہ وقت آ پہنچا۔ یوں تو کئی سالوں سے آپ علیل تھے مگر آپ کی ہمت ہمیشہ جوان رہی۔ قلب کا عارضہ تھا اور کئی سالوں سے شگر بھی زیادہ رہتی تھی علاج و معالجہ بھی چلتا رہتا متعدد مرتبہ بولتے بولتے آواز رک جانے کا عارضہ بھی پیش آیا۔ اسی سلسلہ میں علاج کے لئے ممبئی تشریف لے گئے تھے اور اللہ تعالیٰ شفا نے بھی عطا فرمادی تھی، آن لائن تفسیر قرآن پاک کا درس بھی شروع فرمادیا تھا مگر چند دن آپ کی علالت شدت اختیار کر گئی اور ممبئی کے ایک ہسپتال میں آپ اللہ گھر پیارے ہو گئے اور ہزاروں متعلقین اور تلامذہ اور عقیدت مندوں کو روتا بلکتا چھوڑ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ چین و سکون نصیب فرمائے، درجات عالیہ سے نوازے۔ تمام ہی متعلقین سے حضرت کے لئے ایصال ثواب کی درخواست ہے۔

محرم اسرارِ دیں و مشیخت حدیث کے مسند نشیں

حضرت العلامہ مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری رحمہ اللہ

(1360ھ/1940-1941ھ/2020ء)

مفتی شکیل منصور القاسمی بیگوسرائے

یوں تو گلستاں علم وفن اور مرغزار دین ودانش ”دارالعلوم دیوبند“ میں کھلنے اور کھل کر شش جہات معطر کردینے والا ہر پہلو اپنے جلو میں الگ الگ رنگ وبو بسائے ہوا ہوتا ہے ”ہر گلے رارنگ و بوے دیگر است“ لیکن دارالعلوم دیوبند کی معاصر بلکہ ماضی قریب کی شخصیتوں میں جس قابل فخر سپوت کی حیثیت ”نابغۂ روزگار“ کے بطور مسلم رہی ہے ان میں ممتاز اور اہم نام حضرت الاستاذ علامہ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمہ اللہ کا بھی ہے۔

میکدہ فکروفن ”دارالعلوم دیوبند“ کے اس ساقی مستانہ کے جرعہ کش و بادہ نوش اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ گوناگوں خوبیوں اور کمالات کے جامع تھے، ذہین وفطین تھے، محرم اسرار دین تھے، مفسر قرآن تھے، وسیع النظر محدث تھے، گہرائی وگیرائی کے حامل بالغ نظر ودوراندیش فقیہ تھے، استنتاجی، استنباطی واستخراجی اوصاف سے مالا مال زودنویس مؤلف تھے، علم وعمل کے پیکر فیض رساں مقبول خطیب تھے، حق گو، جری اور بے باک مصلح تھے، نکتہ سنج نکتہ داں، حلیم المزاج، خوش طبع، خوش مزاج، باوقار، بلند حوصلہ، بلند نگاہ، زہدواستغناء صبروقناعت وخودداری کے پیکر محسن ومربی تھے، امانت و دیانت میں اپنی مثال آپ تھے، سادگی اور بے تکلفی کا مجسمہ تھے۔ جامعیت، اعتدال، جمال وکمال کا حسین امتزاج تھے، آپ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، آپ کی ہمہ جہت صلاحیت اور جوہر ذاتی کے ایک ایک پہلو پہ ہزاروں صفحات لکھے جائیں گے۔

ان تمام متنوع کمالات کے ساتھ آپ کی ایک انفرادی حیثیت اورامتیازی شناخت تفہیمی لیاقت اورترسیلی قوت ہے،تقریر ہو یا تحریر آپ کا انداز تدریس وتحریر البیلا،منفرد،اچھوتا،سحرانگیز اوردلفریب ہوتا تھا،مشکل سے مشکل ترین اورغامض و دقیق مباحث کواپنے اسلوب خاص اورترتیب دلکش سے چٹکیوں میں حل کردیتے تھے۔

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ اپنی اس مشک بار اثرانگیز اورممتاز وخداداد ترسیلی قوت و مؤثر پرکشش انداز تفہیم کے اعتبار سے اپنے ہم عصروں میں ممتاز نظرآتے ہیں۔

اس معجز اور کرشماتی انداز کا ہی اثر تھا کہ دارالحدیث تحتانی اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود آپ کے درس میں تنگ پڑجاتی،درس کا رعب اورآپ کا جاہ وجلال دیدنی ہوتا،بام و در پہ سکوت طاری ہوتا،طلبہ پروانہ وار نچھاور ہوتے۔آپ کے درس سے غیرحاضری کا شاید ہی کوئی طالب علم سوچتا،پورے عالمانہ وقار اورجاہ وجلال کے ساتھ مسند نشیں ہوتے،مجتہدانہ ومحققانہ شان سے درایت وروایت کی جامعیت کے ساتھ ایسے مرتب انداز میں حدیث پہ گفتگو فرماتے کہ مسائل دواوردوچار کی طرح نکھر کر ذہن نشیں ہوجاتے۔

یوں تو آپ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے،آپ کی ذات مختلف اوصاف و کمالات،محاسن اورخوبیوں کا حسین مرقع تھی،تاہم میرے مشاہدے اورمطالعے کی حدتک آپ کی شخصیت پہ دارالعلوم دیوبند کی تدریسی زندگی کی چھاپ نسبتاً گہری بلکہ غالب تھی،گلہائے رنگا رنگ میں سے آپ کی تدریسی شان اوررنگ وآہنگ سب سے جداوممتاز تھی،یعنی آپ کے دیگر تمام محاسن کے اعتراف کے علی الرغم بطور خاص آپ کی تدریسی خوبیاں بے مثال تھیں،پیچیدہ عبارت،مشکل مباحث اوردقیق مقامات کی ایسی دلچسپ تشریح،کیف افزااوردلنشیں تفہیم فرماتے کہ ذہن نارسا میں سارے مباحث گویاانڈیل دیتے تھے،آپ کا طریقہ تدریس وترسیل بڑاہی مثالی،مؤثر،دلچسپ اورماہرانہ تھا،آپ کے حلقۂ درس میں افتادگی یابوریت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی،موضوع کتاب کی تفہیم وتسہیل کے لئے اختیار کردہ آپ کا اچھوتا انداز واسلوب تقلیدی نہیں،بلکہ تخلیقی واختراعی ہوتا،ایک سال تک

پیہم استفادے کے بعد ہم نے آپ کی تدریسی امتیازات و خصوصیات جاننے کی جو اپنی سی ناتمام کوشش کی وہ کچھ یوں ہو سکتی ہے:

* زیر تدریس مضمون کتاب پہ آپ مکمل عبور، دسترس و مہارت رکھتے تھے۔

* پڑھائے جانے والے مضمون کو از بر و مستحضر، اعادہ و جائزہ کے ساتھ ذہن میں مرتب و منظّم بھی کر کے آتے۔

* درسی نصاب میں دستیاب مواد پہ اکتفا نہ کرتے؛ بلکہ دیگر منتشر و متفرق حقائق کے لئے غیر نصابی کتابوں سے بھی مراجعت کرتے۔ یعنی کہ پورے فن پہ حاوی ہو کر پڑھاتے۔

* معصوم اذہان پہ اپنی تبحر علمی، کثرت مطالعہ اور مرعوبیت کی دھاک بٹھانے کی بجائے، طلبہ کے ذہنی اور نفسیاتی تقاضوں سے ہم آہنگ، حشو زوائد سے پاک، قدر ضرورت، سہل و سبک مختصر و دلنشیں انداز میں مسائل کی تشریح کرتے۔

* پیش کردہ تقریر درس پہ طلبہ کے استدراکات، علمی اعتراضات و مناقشات کو خندہ پیشانی سے سنتے، مطمئن کرنے کی کوشش فرماتے۔ یہی انداز طلبہ میں اکتسابی دلچسپی کی نمو و فروغ اور شوق و دلچسپی کے اضافے کا باعث بنتا۔

* دوران درس طلبہ کی جذباتیت، احساس، دلچسپیوں اور ذہانت و استعداد کا خاص خیال رکھتے، حوصلہ شکن اور جذبات مجروح کرنے والے کرخت، درشت فقروں یا انداز ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔

* وقت کے حد درجہ پابند تھے، اپنی ذمہ داریوں اور متعلقہ فرائض کا آپ کو شدید احساس تھا۔

* آپ کے علم و عمل میں پوری مطابقت تھی۔

* نظم و ضبط، اخلاص، سچائی، امانت و دیانت، صبر و تحمل، محنت و استقامت کے پیکر تھے۔

ان خصوصیات و امتیازات کی وجہ سے آپ کی تدریس بے حد مقبول تھی، اس سے طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں میں وسعت و استحکام اور خود اعتمادی پیدا ہوتی تھی۔

ہمارا دورے کا سال 1999 عیسوی مطابق 1419 ہجری ہے، جب دورے کی درسگاہ دارالحدیث تحتانی ہوا کرتی تھی، سامنے کی سیٹ پر شیخ کے بالکل محاذات اور قاری العبارۃ والی مخصوص نشست کے بازو میں جگہ لینے میں بامراد ہوگیا تھا، ہمارے سال دورہ حدیث شریف میں درس کا نظام الاوقات کچھ اس طرح سے تھا:

مسلم شریف مع مقدمہ حضرت مولانا قمرالدین صاحب مدظلہ (پہلی گھنٹی، چھ ماہ)

مسلم شریف جلد ثانی حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی (پہلی گھنٹی، آخری چھ ماہ)

ترمذی ثانی حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب (دوسری گھنٹی)

ترمذی اول وطحاوی شریف (حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمہ اللہ (تیسری گھنٹی)

بخاری شریف اول حضرت شیخ نصیر احمد خان صاحب بلندشہری رحمہ اللہ (چوتھی گھنٹی)

شمائل ترمذی حضرت مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی (پانچویں گھنٹی، ہفتے میں چند دن)

سنن ابن ماجہ شریف حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری رحمہ اللہ (پانچویں گھنٹی)

سنن ابی داؤد شریف ثانی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ (چھٹی گھنٹی)

سنن ابی داؤد شریف حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی مدظلہ (چھٹی گھنٹی)

ترمذی شریف اول حضرت مفتی سعید صاحب پالن پوری رحمہ اللہ (بعد مغرب)

بخاری شریف ثانی حضرت مولانا شیخ عبدالحق صاحب اعظمی رحمہ اللہ (بعد عشاء)

موطا امام مالک حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان صاحب منصور پوری حفظہ اللہ (روز جمعہ)

موطا امام محمد حضرت مفتی محمد امین صاحب پالن پوری حفظہ اللہ (روز جمعہ)

ہر استاذ کی اپنی ایک شان اور اپنا مخصوص ومنفرد انداز تھا، کسی کے درس میں فقہی انداز غالب ہوتا تو کسی کے یہاں درایت حدیث پر زور دیا جاتا۔ کسی کا درس اسماء الرجال پر محققانہ نقد وتبصرہ کا مظہر ہوتا تو کسی کے یہاں عشق نبوی کا دلکش نظارہ دیکھنے کو ملتا، کہیں جلال تو کہیں جمال، کسی کی سادگی پر مرنے کو جی چاہتا، تو کسی کے رعب ودبدبہ سے استقامت اور عزم کا درس ملتا، غرضیکہ ایک سے ایک اصحاب فضل وکمال اور ارباب علم وتحقیق کا حسین

سنگم، جہاں سے تشنگانِ علوم اپنے اپنے ظرف کے مطابق نہایت ذوق وشوق کے ساتھ اسرار وحکم جمع کرنے میں مصروف کار نظر آتے۔

طلبہ کے ساتھ شفقت، مہربانی، خیرخواہی اوران کی جذباتیت، وجدان، احساس ، دلچسپیوں اور ذہانت واستعداد کا خاص خیال رکھنے کی ایک حسین یادگار ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

ہمارے دورے کا سال تھا، ہم نے اپنے رفقاء گرامی قدر مفتی شمشیر حیدر قاسمی اور مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی کے ساتھ اشتراک سے طالب علمانہ بساط کے مطابق حدیث شریف سے متعلق عربی کتابوں وشروحات کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع کرلیا تھا جن کتابوں تک رسائی ہماری دسترس سے باہر تھی، ان سے استفادہ کے لئے دارالعلوم دیوبند کے پرشکوہ کتب خانہ سے رجوع کیا جاتا، لیکن چونکہ کتب خانے کھلنے اور بند ہونے خصوصا عربی شروحات سے استفادے کے وہی اوقات ہوتے تھے جو درس کے اوقات تھے، جس کی وجہ استفادے کی کوئی شکل نہیں بن پا رہی تھی؛ اس لئے رفقاء سے مشورہ کرکے یہ طے پایا کہ حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب رحمہ اللہ سے رجوع کیا جائے ممکن ہے ان سے مل کر استفادے کی کوئی مناسب راہ نکل آئے؛ چناں چہ ایک درخواست تیار کی گئی اور اس کو لے کر حضرت استاذ محترم کے آستانے پر حاضری دی گئیں درخواست میں دو باتوں کی گذارش کی گئی تھی:

(۱) رات میں کم ازکم ایک بجے تک کتب خانہ کھولے جانے کا نظم ہو (تاکہ دورہ حدیث شریف کے جو طلبہ گیارہ کبھی ساڑھے گیارہ بجے تک حضرت شیخ ثانی سے بخاری شریف جلد ثانی کا سبق پڑھ کر مطالعہ کرنا چاہیں بہ آسانی مطالعہ کرسکیں)۔

(۲) مسلم شریف جلد ثانی کے لئے کسی حنفی محدث کی کوئی شرح کتب خانہ میں اب تک نہیں آئی ہے؛ لہذا ''تکملہ فتح الملہم'' کتب خانہ میں منگوادی جائے تاکہ باذوق طلبہ اس سے اپنی علمی تشنگی بجھاسکیں، حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے درخواست پڑھ کر ہماری حوصلہ افزائی فرمائی اور ارشاد فرمایا: مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی سے ملو! ہم بھی ان سے

کہہ دیں گے؛ چنانچہ ہم لوگ واپس آ گئے اور مغرب بعد مسجد رشید میں حضرت مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی مدظلہ کے پاس حاضر ہو گئے، حضرت والا دامت برکاتہم کی خدمت عالیہ میں اپنے مطالبات پیش کر دیے۔ حضرت والا دامت برکاتہم نے ہماری گذارش کی تحسین فرمائی اور دوسرے ہی دن سے حسب درخواست رات کے ایک بجے تک کتب خانہ کھلنے کا نظم فرما دیا، اور ایک سیٹ ''تکملہ فتح الملہم'' بھی کتب خانہ میں فراہم کر دیا گیا (ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ ''فتح الملہم'' کا وہ سیٹ حضرت کا ذاتی ہے جسے حضرت نے ہماری درخواست پر فوری طور پر کتب خانے میں دے دیا) پھر چند ہی دنوں کے بعد فتح الملہم کے متعدد نسخے کتب خانے میں آ گئے۔ یہ واقعہ آپ کی خردنوازی، حوصلہ افزائی اور افراد سازی کی بہترین صلاحیت کا حسین مظہر ہے جو آپ کے جوہر ذاتی کا طرۂ امتیاز تھا۔

آپ کی جامع الکمالات شخصیت کی دوسری انفرادی شان معارف ولی اللّٰہی اور علوم نانوتوی کی توضیح و ترجمانی ہے، ویسے تو آپ کی مستقل تصانیف، شروحات، مراجع و تعلیقات کی تعداد پچاس کے قریب پہنچتی ہے؛ لیکن ان تمام تحریری کاوشوں میں سب سے مشہور، فائق اور مفید ترین بے نظیر اور عظیم ترین علمی کارنامہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (1114ہجری-1176ہجری) کی ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی اردو اور عربی زبانوں میں شروحات لکھنا ہے۔

عربی زبان میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی محققانہ اور بصیرت افروز تحقیق، تعلیق و تحشیہ کے ساتھ تیرہ سو چالیس مجموعی صفحات پر مشتمل دو جلدیں دار ابن کثیر دمشق سے شائع ہو چکی ہے۔

اوپر میں مذکور آپ کی تدریسی امتیازات و خصوصیات کافی حد تک آپ کی تالیفات، تعلیقات و شروحات میں بھی جھلکتی ہیں، جن میں بحث و نظر کے لعل و یاقوت، دقیق تحقیقات کے ہیرے اور گہرے کاوشوں کے موتی پورے آب و تاب کے ساتھ چمک رہے ہیں، آپ کی تمام درسی شروحات وقیع اور بصیرت افروز معلومات اور انوکھے انداز تشریح و توضیح کا شاہکار ہیں، اللہ نے انہیں بے پناہ مقبولیت بخشی ہے، علماء و طلبہ کے مابین متداول ہیں۔

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ ابتداءً غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، عالمی اعتبار، استناد، مرجعیت، مشیخیت، محبوبیت، مقبولیت اور علمی فضل وکمال میں جو مقام بلند حاصل کیا وہ اپنی ذاتی محنت، لگن، قدردانی وقت، عشق مقصد، انہماک عمل، ریاضت، جفاکشی، انتھک محنت، سوز عشق، جستجوئے پیہم، جاں گسل وصبر آزما طویل مجاہدے، اوقات زندگی کی بامقصد تقسیم و انضباط اور استغناء وخودداری کے باعث حاصل کیا، شوق کمال اور خوف زوال سے یکسر عاری پانے کا خمار تھا نہ کھونے کا آزار!

عزم وہمت کے آپ کوہ ہمالہ اور فولادی اعصاب کے مالک تھے، روح فرسا اور جاں گسل حوادث ومصائب سے بھی آپ کے پائے صبر واستقامت میں تزلزل نہ آسکا۔ زندگی کے راز اور وقت کی قیمت کو آپ نے خوب اچھی طرح جان لیا تھا، شب وروز کے ایک ایک لمحے کی آپ کے یہاں تقسیم تھی۔ پیرانہ سالی اور عمر عزیز کی آخری منزل کو بھی آپ نے ایسا حوصلہ مندانہ اور مجاہدانہ گذارا جس کا ہم لوگ تصور بھی نہیں کرسکتے، فکر ونظر میں رسوخ وتصلب تھا، اظہار حق ورد منکرات میں مصلحت اندیشی آپ کے مسلک میں بالکل روا نہ تھی، جسے حق سمجھتے پورے دلائل کے ساتھ بے لاگ وبے باک، دوٹوک وبرملا اس کا اظہار فرماتے۔

آپ طبعاً سادگی پسند تھے، سادہ پہنتے، سادہ کھاتے، پر اوروں کو اچھا کھلاتے، مہمانوں کے لئے کشادہ دست وفیاض تھے، شاگردوں کی تخلیقی وتحقیقی علمی کاوشوں کو سراہتے، حوصلہ افزائی فرماتے، نقد انعامات دیتے اور دعاؤں سے بھی نوازتے۔ نکتہ سنج، دراندیش ومعاملہ فہم تھے۔ سادگی، خاکساری ومسکنت آپ کی شناخت تھی۔ علم دین سے دنیا کمانے کو معیوب سمجھتے معاشی بے چارگی کے ایام میں تدریس پہ جو مشاہرات وصول کئے تھے آسودگی حال کے بعد پائی پائی واپس فرمادیا جو ملینوں کی رقم بنتی ہے، اجتماعی غوغا اور ہاؤ ہو سے نفور تھا، جلسے جلوس میں خاص دینی ودعوتی داعیے کے بغیر شرکت سے گریزاں رہتے۔

25/رمضان 1441ہجری/مطابق 19/مئی 2020 کو صبح چھ بجے، ہشت

پہل ہیرا، علم وفضل کا آفتاب عالم تاب، تدریس وتالیف کا یہ لعل درخشاں طویل علالت کے بعد ہمیشہ کے لئے روپوش ہوگیا، انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

25؍ رمضان کو ہی نماز جنازہ ادا کی گئی اور ممبئی کے جوگیشوری کے اوشیورہ قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا، خدا آپ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آپ کے تلامذہ وفیض یافتگان کو خدا تعالیٰ انہی کے نقش قدم وخطوط پہ تدریس وتعلیم کی توفیق بخشے۔ آمین۔

دن رات مے کدے میں گذرتی تھی زندگی
اخترؔ وہ بے خودی کے زمانے کدھر گئے؟

حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری

...........جوارِ رحمت میں

مولانا حسین القاسمیؔ ڈھکہ، امروہہ

سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب
لعل باشد در بدخشاں، یا عقیق اندر یمن

زندگی جس یکسوئی، عزلت نشینی، ہجوم بے زاری اور خلوت پسندی کی شانِ استغنا کی مثال تھی، موت بھی اسی طرح بے نیازِ کرم نوازاں کا مظہر بن کر نقشِ دوام ہوگئی یعنی ہزار ہا ہزار شاگردوں کا استاد کیسی خاموشی کے ساتھ عروس البلاد ممبئی میں اپنے رب کے بلاوے پر لبیک کہتا ہوا حاضر ہوگیا، ۲۵/ رمضان ۱۴۴۱ھ - ۱۹/ مئی ۲۰۲۰ء بروز منگل صبح ۱۰/ بجے کے قریب بندہ جیسے ہی سوکر اُٹھا اور نیم بے داری کی سی کیفیت میں موبائل آن کیا تو سب سے پہلے اسی غم ناک خبر کا سامنا ہوا۔ تن بہ تقدیر ''اناللہ'' پڑھا اور پھر یوں لگا جیسے حضرت والا کی روحِ سعید آسمان کی بلندیوں سے ہم پستی کے مکینوں کو مخاطب کر کے کہہ رہی ہے

خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائے گی

آخری دیدار سے محرومی اور جنازے کی عدم شرکت کی حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئیں اور پھر بھیگی ہوئی پلکوں کے ساتھ زبان یہی مصرع دیر تک دہراتی رہی۔

خدائی فیصلوں پر دم مارنے کی کس کو مجال ہے، مگر دنیائے خیال کی حشر سامانیوں پر بھی تو انسان کا قابو نہیں ہے، کبھی لگتا کہ دیوبند میں حضرت الاستاذ کے واسطہ در واسطہ شاگردوں اور نیازمندوں کا جمِ غفیر ہے جو بہ صد شوق خود کو قربان کیے دینے کے جذبے سے سرشار ہے اور کبھی یوں لگتا کہ کاش لاک ڈاؤن کی صورت حال نہ ہوتی تو ممبئی جیسی فرصت نا

آشنا زمین بھی کسی یکتائے روزگار کے بے مثال اور تاریخی سفرِ آخرت کی گواہ بن کر نہال ہوجاتی؛ لیکن حقیقت کی دنیا میں ایسا کچھ بھی تو نہیں تھا۔

ع موت! بتلا دے کہ آخر کس طرح ماتم کروں

کسی تاثراتی اور صرف نیم سوانحی قسم کے مضمون میں تو کسی بھی شخص کی زندگی کا احاطہ دشوار ہوتا ہے تو پھر ایسی شخصیت جو بھر پور معنیٰ میں جامعیت کا پیکر ہو، صرف اپنے حلقے میں نہیں بلکہ فکر وفن اور علم و دانش سے رسم وراہ رکھنے والے ایک سے زائد حلقوں میں جس کی شناخت ''وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں'' کی صورت میں مسلّم ہو اور ہشت پہلو کی تعبیر جس پر اپنی تمام تر صداقتوں کے ساتھ جلوہ فگن ہو، ایسے مجموعۂ محاسن وکمالات کے پہلوؤں کو کیوں کر نمایاں کیا جاسکتا ہے۔

تکوینیات کے مظاہر میں غور کیا جائے تو کچھ فی صد ضرور یہ محسوس کیا جاسکتا ہے کہ زندگی برسوں سر پٹکتی ہے تب کہیں کوئی تاریخ ساز دانائے رازِ عالمِ ناسوت میں آشکار ہوتا ہے جو اپنے پچھلوں کے لیے اگلے کچھ سالوں تک تاریخ نگاری کا میدان فراہم کرجاتا ہے۔ مجھ کم سواد طالب علم کا اصرار کی حد تک یہ خیال ہے کہ حضرت الاستاذ کا بھی ایسی ہی چنیدہ اور منتخبِ روزگار شخصیات میں شمار ہے، جن کے شوقِ رہ نوردی نے دشت علم کے خارزاروں میں گلزار سجائے ہیں اور جن کی غواصی نے قناعت پسندی سے گریزاں رہتے ہوئے، بحر فکر وفن سے گوہرِ مراد کا ذخیرہ کیا ہے، حضرت والا کے میدان ہائے کار کا اگر ایک ایک لفظ میں اجمالی تذکرہ بھی کیا جائے تو اندیشہ رہتا ہے کہ ایک عام قاری اس کو کہیں مبالغہ آمیز بیان نہ سمجھ بیٹھے۔

خیر! تمہید بر طرف اس تحریر میں راقم الحروف نے صرف چند عنوانات کے تحت حضرت الاستاذ سے متعلق اپنا تاثر رکھنے کی کوشش کی ہے۔

علومِ اسلامی کا شناور

مدرسی زندگی گزارنے والا یا مدرسی زندگی سے واقف کار شخص جانتا ہے کہ اب تقریباً عرصہ سو سال ہونے کو ہے کہ ملت اسلامیہ کی بحیثیت مجموعی عالمی قیادت کے منصب

سے محرومی کے بعد ''مدرسہ'' ایک محدود معنیٰ پہن کر اپنے دائرے میں مصروفِ خدمت ہے اور حالات کی نزاکتوں نے مدرسے کو امت محمدیہ کے صرف اصل سرمائے میراثِ نبوت یعنی کتاب وسنت کی طرف پوری طرح متوجہ کیا ہوا ہے، کتاب وسنت کی تعلیم و تفہیم، تشریح و وضاحت اور تحقیق و تطبیق ہی اہل مدرسہ کے لیے شب وروز کا مشغلہ بلکہ عرفی حیثیت میں فرضِ منصبی ہے۔ اس کے علاوہ انھی دو بنیادی ماخذ دین وشریعت تک رسائی کی ضرورت کی وجہ سے یا انھی دونوں سے مستفاد نتائج کے طور پر، جو مزید علوم وفنون مدارس کی درس گاہوں میں زیر بحث رہتے ہیں، وہی علوم وفنون، امت کے عوام وخواص کے درمیان ''اسلامی علوم'' کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں، حضرت الاستاذ کی ان علوم وفنون میں مہارت کے ساتھ شناوری عالم آشکار ہے اور حضرت والا کو اپنی دور بینی اور خورد بینی کی منفرد صفات کی وجہ سے ان علوم اسلامی کے حریم قدس میں درونِ خانہ کے محرمِ راز کا درجہ حاصل ہے، حرف آشنائی اور کتاب شناسی نے حضرت والا کے ساتھ برسوں پہلے جو عہد وفا کیا تھا وہ اخیر عمر تک اس طرح استوار رہا کہ دونوں ایک دوسرے کے ہو کر رہ گئے، دماغ کی ایک ضرورت کے طور پر یہ سفر شروع ہوا اور بالآخر دل کے لیے وجہِ قرار کے مرتبے تک پہنچا، ابتدائے عشق میں تو ایک قطرہ بھی چہرے کو گل نار کر دیتا ہے اور انتہائے عشق میں سمندر پیے پر بھی سنجیدگی اور وقار دیدنی رہتا ہے۔ علوم اسلامی کے ساتھ شب وروز کی برسوں طویل اس رفاقت نے یوں کہیے کہ حضرت والا کو کسی اور کا نہیں رہنے دیا تھا، غیر ضروری مجلسوں کا تو تصور بھی نہ کیجیے، ضروری مجلسوں میں بھی برائے نام حاضری، دینی نسبت رکھنے والے ضروری اسفار بھی تناسب اور عرف کے اعتبار سے دیکھیے تو نہ ہونے کے درجے میں، مال خرچ کرنے میں کشادہ دست یہ سخی، وقت خرچ کرنے میں تاعمر دست کش اور بخیل ہی رہا؛ لیکن اپنے پس رووں کے لیے علم وادب اور فکر وفن کے ایسے آب دار موتیوں کا سرمایہ چھوڑ گیا ہے کہ نسلیں بھی اس سرمائے کے طفیل سرمایہ دار کہلاتی رہیں گی۔

اپنا خیال ہے کہ مطالعہ، تدریس اور تالیف وتصنیف یہ تینوں چیزیں اپنی سلسلہ وار

حیثیت میں وہ بنیادیں ہیں جن سے کسی بھی شائق علم وفن کی اس علم وفن سے واقفیت، اس میں گہری بصیرت اور پھر اس فن سے متعلق استنادی مرحلے میں اس شخصیت کے درجے کا تعین کیا جاسکتا ہے (بے پڑھے تدریس اور بے سمجھے تالیف اس سے مستثنیٰ ہے) حضرت مفتی صاحب کی شخصیتِ علمی کی تعمیر میں یہ تینوں معیار، بنیادی عنصر کے طور پر ساری زندگی حضرت کے ساتھ رہے، مطالعہ اور تدریس سے متعلق حضرت کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے شاید صرف یہ ایک نصیحت کافی ہو جو تعلیمی سال کے آخر میں آپ اپنے شاگردوں کو کیا کرتے تھے کہ (۱) جب کوئی کتاب پڑھاؤ تو صرف اس کتاب کی شرح دیکھ کر مت پڑھانا بلکہ اس کتاب کے فن کو بطور فن پڑھ اور سمجھ کر پڑھانا اور (۲) ابھی یہ مت سمجھنا کہ تمہیں علم آ گیا ہے بلکہ جب تم دس سال پوری محنت لگا کر اس طرح تدریس کرلو گے جس طرح میں نے بتایا ہے تو دس سال کے بعد تمہیں علم آنا شروع ہوگا۔

مطالعہ اور تدریس سے متعلق اپنے نو واردانِ بساطِ علم شاگردوں کو ایسی بیش قیمت نصیحت کا تحفہ دینے والا اپنے آپ میں ذوقِ مطالعہ کا کیسا لذت شناس اور شغلِ تدریس کا کیسا رمز آشنا ہوگا، راہِ تدریس کے مسافر اس کا بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں۔

اس سلسلے کی تیسری اہم ترین چیز تالیف وتصنیف کا عمل ہے جو اگر واقعی حق ادائیگی کے جذبے سے ہو تو نچوڑ کے رکھ دیتا ہے۔ مطالعۂ محض اور شیوۂ تسلیم میں مشہور شاگردوں کو تدریس اپنی جگہ؛ لیکن کسی بھی موضوع سے متعلق چار سطریں سیاہ کرنے کے تجربے کا اپنا الگ ہی مزہ ہے اور دل کی طاقت اور جگر کے حال کے بغیر یہ لہو رونا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ سیانوں کا کہنا ہے کہ تصنیف کرنے والا خود کو نقد ونظر کی بے رحم کسوٹی کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے، کبھی تحسین کی خوشبو اس کے مشامِ جان کو معطر کرتی ہے اور کبھی تنقید کے تیر اس کے مجموعۂ خیال کو لخت لخت کر ڈالتے ہیں۔ ہمارے ممدوح حضرت مفتی صاحب کے لیے یہ ہفت خواں سر کرنا بھی معمول کی خدمت کے درجے میں تھا اور آپ کی قلم رانی نے اس قلم رو میں بھی نمایاں مقام پالیا تھا۔ جن مدرسی علوم میں آپ کی شناوری کا ہم ذکر کر رہے ہیں، ان میں سے اکثر

میں آپ کے رسائل اور کتب ہمارے خیال کی تائید پر شاہد ہیں، یہاں آپ کی تالیفات کا احاطہ ہمارے پیش نظر نہیں ہے صرف اس آئینے میں آپ کے عکس جمیل کو دیکھنا مقصود ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تفسیر واصولِ تفسیر، حدیث واصول حدیث، فقہ واصول فقہ، نحو وصرف منطق وفلسفہ وغیرہ مدرسی علوم وفنون میں آپ کی قلمی سوغات اور علمی تحائف موجود ہیں اور الحمدللہ ان کو اس راہ کے رہ نوردوں کے درمیان قبول حاصل ہے، کارِ تدریس سے وابستہ علماء واقف ہیں کہ شارحین کی غالب اکثریت، متون کے پیچیدہ مباحث سے تیز گامی کے ساتھ گزرنے کی عادی ہوتی ہے مگر قربان حضرت مفتی صاحب پر کہ گتھیوں کا سلجھانا اور موجوں کے تلاطم میں کشتیٔ مراد کو ساحل تک پہنچانا ہی جیسے آپ کے لیے وجہِ قرار ہو، کیسا ہی تلخ آبہ کیوں نہ ہو، آپ کے جام سے گزر کر بادۂ شیریں اور صہبائے شوق بن جاتا ہے جو تشنگانِ علم و فن کے لیے سیرابی کا سامان ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ بطورِ خاص علوم نانوتوی کی تسہیل وتفہیم اور علوم ولی اللّٰہی کی تبیین و توضیح نے حضرت کو حکمت اسلام اور اسرار شریعت کے موضوع پر ایسا شرح صدر عطا کر دیا تھا کہ آپ کی چھوٹی بڑی ہر تحریر وتقریر اس نور سے مستنیر ہوتی اور اس میں دل ودماغ میں سے ہر ایک کا شیدا اپنے لیے تسلی کا پورا سامان موجود پاتا، حتی کہ بے تکلف مجلس میں آپ کے خوش مذاق کے جملوں پر بھی اس فکر کی چھاپ محسوس کی جاسکتی تھی، نانوتوی اور ولی اللّٰہی علوم کا ذکر جتنی آسانی سے ہم کر رہے ہیں، برتنے میں یہ معاملہ اتنا آسان نہیں ہے، یارانِ نکتہ داں کے لیے برسوں سے چلی آرہی اس صلائے عام پر حضرت مفتی صاحب نے لبیک کہا اور اپنے بہت سے اکابر اہلِ علم کی روحوں کو شاد کیا۔ ظاہر ہے کہ جذبۂ شناوری کو ساحل پر نہیں، کنارِ موج میں ہی آسودگی ملتی ہے۔ ہمارے دوست حفیظ اللہ حفیظ قاسمی بستوی کے بقول

کبھی جب بحرِ فن میں جا کے غوطہ زن وہ ہوتے ہیں
معارف یوں کہ گویا سلک میں موتی پروتے ہیں

یا یوں کہیے کہ آپ کے ناخنِ تدبیر کو گرہ کشائی کے بغیر کہاں چین تھا اور آپ کی زبانِ حال بقول غالبؔ یوں گویا رہتی تھی

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

بصیرت کی نظر رکھنے والا یہ مؤلف و مصنف بہت کم سفر کر کے بھی جہاں دیدہ تھا اور تغیر پذیر دنیا کی ہر آن بدلتی ضرورتوں سے بھی مکمل آگاہ تھا، اسی لیے اس کے قلم کی سیپ سے جو موتی بھی نکلے ہیں وہ سطحِ سمندر سے نہیں، تہہ در تہہ گہرائی سے حاصل کیے گئے ہیں اور یہ سب کچھ حضرت مفتی صاحب کی بے مثال محنت اور قابلِ تقلید استقامت کا ثمرہ ہے

یہ پھول مجھے کوئی وراثت میں ملے ہیں
تم نے مرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

مسند درس کا وقار و اعتبار

حضرت مفتی صاحبؒ کا بنیادی کام تدریس اور اصل شناخت ایک مدرس ہی کی تھی اور رسمی طالب علمی سے فراغت کے بعد تاحیات یہی کارِ استادی آپ کا وظیفہ اور ڈیوٹی رہا۔ کامیاب تدریس کی جو خصوصیات ہو سکتی ہیں وہ سب آپ کی ذات میں جمع تھیں، کامیاب تدریس کا مطلب، نوع بہ نوع مضامین کا صرف انبار لگا دینا نہیں ہے؛ بلکہ اپنی علمیت کے سمندر سے طلبہ کی آب جو کے بقدر آبِ حیات کی فراہمی اور عرشی مضامین کو فرشی اسلوب میں تحلیل کر کے اپنے حلقۂ سخن کے ادنیٰ ترین فرد کے لیے بھی قابل فہم بنا دینا، اصل معیار تدریس ہے۔ کسی قسم کے خوف تردید کے بغیر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ آپ اپنے ہم پیشہ افراد میں اس حیثیت سے ممتاز تھے کہ یک گونہ ادائے ناز و انداز اور کسی حد تک عتاب آمیز رویے کے باوجود طلبہ آپ کی خدمت میں سرگرم نیاز رہنے میں خوشی محسوس کرتے، وقت سے پہلے اپنے محبوب استاد کے لیے درس گاہ میں حاضر ہوتے اور ٹکٹکی باندھے آپ کے لیے سراپا انتظار بنے رہتے۔ اپنے ذاتی تجربے کی روشنی میں راقم کا تاثر یہ ہے کہ دورۂ حدیث شریف کے

سال صبح شام دو گھنٹے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کی سعادت میسر آئی اور اس پورے عرصے میں آپ کی دید ہم طلبہ کے لیے ہر بار عید کی طرح مسرت بخش ہی ثابت ہوتی رہی، وجہ ظاہر ہے کہ ہر طالب علم آپ کے سبق کے درمیان محسوس کرتا کہ اس کی سیرابی کا سامان ہو رہا ہے اور سبق کے اختتام پر یوں ملتجی نظر آتا۔

ع رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

یا

دیکھنا کیا کتنی وسعت میرے پیمانے میں ہے
سب الٹ دے ساقیا جتنی بھی مے خانے میں ہے

بقول کسے یہ بات نہیں تھی کہ آپ کے درس میں بہت زیادہ بلندیاں یا تہہ داریاں نہیں ہوتی تھیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ استادانہ مہارت کے فن سے واقف تھے اور طلبہ کو ماحول سے پوری طرح منقطع کر کے صرف اپنی طرف متوجہ کر لینا کا ہنر آپ کو بخوبی آتا تھا، سمت قبلہ کی تعیین کا فلسفہ یہی تو ہے کہ کہیں ظاہر کی بے سمتی باطن کی توجہ میں خلل انداز نہ ہو جائے، حضرت الاستاذ کے سبق میں بھی ظاہر کا پورا منظر نامہ سبق شروع ہونے سے پہلے ہی پوری طرح پُرسکون ہو جاتا اور پھر نہایت باوقار انداز میں آپ علم و فن کے موتی لٹاتے۔ اکثر طلبہ آپ کے جواہر پاروں کو قید تحریر میں لاتے اور اس سحر آفریں فضا کے ایسے اسیر ہو جاتے کہ اپنے گرد و پیش تو کیا، اس ایک گھنٹے کے لیے خود کو بھی فراموش کر دیتے۔ ضروری حد تک ظاہر کے رکھ رکھاؤ اور لازمی درجے میں مطالعے کی وسعت نے آپ کے درس کو وقار و اعتبار کی دولت بخشی تھی، نفسیات کی پرکھ اور مشاہدے کی قوت کے ساتھ تمثیلات و نظائر کے ذریعے نفس مضمون کی وضاحت اور زیر بحث مسئلے کو مرتب انداز میں پیش کرنے کی سلیقہ شعاری مزید برآں سونے پر سہاگا تھی۔

یادش بخیر ”سونے پر سہاگا“ کی تعبیر سے یاد آیا کہ اگر کبھی دورانِ تقریر اس قسم کے محاورے آجاتے تو آپ اصل مضمون کو باقاعدہ روک دیتے اور محاورے کے لفظی مفہوم اور

پس منظر کی روشنی میں اس کی محاوراتی مراد کو اچھی طرح واضح کرتے، اس جملۂ معترضہ سے طلبہ کا دہرا فائدہ ہوتا کہ دماغ کو تھوڑی راحت بھی مل جاتی اور ان ادبی چٹخاروں میں زبان کی باریکیاں سمجھنے کا موقع بھی فراہم ہو جاتا۔ یہی کچھ وہ عوامل ہیں جن کے سبب آپ مسند درس کی آبرو بن کر کام یابی کے ساتھ ممتاز اور نمایاں رہے اور آپ کی فیض رسانیاں ہر سطح کے ذہنوں کو آسودہ کرتی رہیں۔

مجتہدانہ بصیرت رکھنے والا محدث و فقیہ

مختلف علوم وفنون میں حضرت مفتی صاحب کی دست گاہی کے باوجود، اگر آپ کی خدمات کا تفصیلی تجزیہ کیا جائے تو شاید یہی نتیجہ نکلے کہ آپ کے یہاں دیگر علوم وفنون کو جز وقتی اور حدیث وفقہ کو کل وقتی درجہ حاصل تھا، حدیث وفقہ کے ساتھ آپ کی ہمہ وقتی مصاحبت، پابندیٔ حدود سے آزاد ہوگئی تھی اور اس باب میں آپ خلوت میں بھی ''انجمنے ساختہ اند'' کی کیفیت میں ہوتے تھے۔ فن کے مزاج سے واقفیت اور فن کا ہمہ جہتی وسیع مطالعہ، فن کے حدود کو اپنے قاری کے سامنے کف دست کی طرح قریب کر کے ظاہر کر دیتا ہے اور پھر اخاذ ذہن کا مالک اور استنتاج کی صلاحیت سے بہرہ مند شخص اپنی اجتہادی حس کو بروئے کار لاتا ہے اور اپنے حصے کے گل بوٹے کھلا کر اس فن کی خوش رنگیوں میں اضافہ کرتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب کو بھی حدیث وفقہ کے باب میں یہ مجتہدانہ بصیرت حاصل تھی اور ظاہر ہے کہ جب فکر ونظر کو یہ معراج نصیب ہوتی ہے تو اگلوں کے نشاناتِ قدم اس کو سمت سفر تو یقیناً دکھاتے ہیں؛ لیکن وہ سو فیصدی انہیں لکیروں کا محتاج محض نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کی رفتار کی انفرادیت کئی جگہ اپنے نئے نشاناتِ قدم بھی چھوڑتی جاتی ہے اور اس کے وہ نشانات بھی تاریخ کا حصہ بن کر بعد والوں کے لیے سنگ میل کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

مسئلہ کسی کی منفرد رائے کے صحیح یا غلط ہونے یا پھر اس رائے سے اتفاق کرنے یا نہ کرنے کا نہیں ہے، علم کی دنیا کا اپنا ایک نرالا رنگ ہے، یہاں ہر پس رو کو پیش رو سے، ہر چھوٹے کو بڑے سے اور ہر شاگرد کو استاد سے اختلاف کا حق ہے اور بارگاہِ علم میں کسی شخصیت

کو نہیں، صرف استدلال کی قوت کو حرف آخر کا درجہ حاصل ہوتا ہے، ہاں مسئلہ کوئی منفرد رائے اختیار کرنے کی اہلیت کا ضرور ہے۔ ہمارے حضرت مفتی صاحب کو معمول کے مطالعے کے علاوہ بطورِ خاص اسلامی تاریخ کے ذہین ترین مصنفین کو پڑھنے اور فلاسفۂ اسلام کو سمجھنے کی وجہ سے عقل و دانش کے صیقل کرنے کا جو موقعہ ملا اور مقصد شریعت سے آگاہی کا جو درجہ میسر آیا اس بلندی کو پہنچ کر نظریات میں بھی آورد کی زحمت نہیں رہ جاتی بلکہ کسی نہ کسی درجے میں آمد ہونے لگتی ہے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "مشتے نمونہ" ایک دو ایسی چیز کا ذکر کر دیا جائے جس سے حضرت مفتی صاحب کی مجتہدانہ بصیرت کے سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے یا جس کو آپ کی اس بلند قامتی کی علامت قرار دیا جا سکتا ہے۔

(۱) اثر پذیری: اثر پذیری انسانی فطرت کا حصہ ہے اور اپنے عہد کی مؤثر ترین شخصیات بھی اپنے بننے کے دور میں اثر پذیری سے بہرحال گزرتی ہیں اور اس اثر پذیری کا شعوری یا لاشعوری طور پر، مستقبل میں ان کے لیے سمت سفر کی تعیین میں بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب کے ذہن و دل پر یہ تاثر، عام علمائے امت کے بجائے مجتہدین ہی کا زیادہ رہا ہے۔ ایک موقع پر اپنے لیے مؤثر شخصیات کے بارے میں سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور اس سے اوپر مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے بہت زیادہ متاثر ہوں، اس کے اوپر لمبے تاریخی فاصلے کے بعد امام اعظم ابو حنیفہؒ کی شخصیت کا میرے دماغ پر گہرا تاثر ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ان کی عبقریت میرے لیے اور کھلتی گئی ہے۔ کئی مرتبہ آپ نصیحت کرتے ہوئے اکابر میں سے کسی کا حوالہ دے کر کہتے کہ ابن العربی، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو پڑھنے سے عقل میں اضافہ ہوتا ہے، پھر اپنے بارے میں بتاتے کہ میں نے سوچا ابن العربی مختلف فیہ شخصیت ہیں مجدد صاحب تصوف کے آدمی ہیں جس سے مجھے زیادہ مناسبت نہیں، اس لیے میں نے اپنے لیے شاہ صاحب کا انتخاب کیا۔

مؤثر ترین کتاب کے بارے میں سوال کے جواب میں آپ نے مقطع کہہ کر بات ہی ختم کر دی جس کے بعد گنجائش ہی نہیں رہتی کہ اس اعتبار سے تو میرے لیے ایسی کتاب صرف قرآن ہی ہے اور شروع میں تو میں بہت سی تفاسیر دیکھتا تھا مگر اب تو میں اپنے مطالعۂ قرآن کے دوران بھٹکنے سے بچنے کے لیے ''بیان القرآن'' یا ''فوائد عثمانیہ'' دیکھ لیتا ہوں ورنہ اصل میں تو میں اپنی تفسیر میں وہی لکھتا ہوں جو مجھے سمجھ میں آتا ہے۔

یہ ملفوظات حضرت مفتی صاحب کی شخصیت اور فکر ونظر میں آپ کی معراج کو بڑی حد تک واضح کر رہے ہیں۔

(۲) اپنی رائے پر شرح صدر: اجتہادی نظر کا ہی نتیجہ ہوتا ہے کہ بہت سے مسائل میں اپنی منفرد رائے قائم ہو جاتی ہے اور یہ اجتہادی حس جتنی مضبوط ہوتی ہے، اتنا ہی شرح صدر اور پھر استقامت کا سبب ہوتی ہے۔ حضرت مفتی صاحب کی کتابوں، درسی تقریروں اور مجلسی تبصروں کا اس حوالے سے استقراء کیا جائے تو بہت سے تفردات جمع ہو سکتے ہیں، جن میں سے گذشتہ قریبی زمانے کے دو مسئلے بڑے مشہور ہوئے اور سوشل میڈیائی دور کی وجہ سے بہت زیادہ ردو قدح کا موضوع بنے۔ ایک حجیت حدیث وسنت کی بحث میں صحیح تعبیر کے تعین اور دوسرے تعزیتی اجلاس کے جواز وعدم جواز کا مسئلہ۔ اسی طرح فقہی سیمناروں اور علمی مذاکروں میں حضرت مفتی صاحب کی اپنی رائے پر استقامت اور شرح صدر کا بھی بارہا تجربہ کیا جا چکا ہے مزید اس سلسلے میں یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ گزشتہ کافی لمبے عرصے سے حضرت مفتی صاحب کو ''فقیہ النفس'' کے لقب سے یاد کیا جا رہا ہے، فقاہتِ نفس، فہم شریعت میں جس کیفیت کا نام ہے، وہ ایسی بلند ہے کہ مجتہدانہ بصیرت کے بغیر اس لقب اور اس تعبیر کے کوئی معنیٰ ہی نہیں رہ جاتے، خلاصہ یہی ہے کہ کسی علم وفن سے زندگی بھر کے رشتے کے باوجود بھی اگر کوئی اپنا رنگ نکھر کے ظاہر نہ ہو، تو ایسا شخص اس فن کا ماہر اور مستند فن کار تو کہلا سکتا ہے مگر غیر معمولی دیدہ ور یا عبقری شان والا نہیں، صرف نکتہ شناسی، نکتہ آفرینی کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور جاننے والے جانتے ہیں کہ غیر معمولی ہونے کا یہ خاصہ حضرت الاستاذ کی شناخت کا حصہ بن چکا تھا۔

پھر تازہ کر لیجیے کہ مقصد صرف یہ نمایاں کرنا ہے کہ حضرت مفتی صاحب کو ان کی حکیمانہ نظر نے یہ مقام بلند عطا کیا ہوا تھا، جہاں تک منفرد آراء کے صواب اور خطا کی بات ہے تو یہ اپنے آپ میں موضوعِ بحث ہے اور دیگر اہل علم کو بھی اپنا نقطۂ نظر رکھ کر فیصلہ کرنے کا انہیں کی طرح پورا حق حاصل ہے۔ (اختلافی آراء کا تجزیہ یہاں موضوعِ سخن نہیں ہے)

(۳) شرح حدیث میں معتدل اسلوب: عامی مقلد اور عالم مقلد یا تقلید محض اور علی وجہ البصیرت تقلید کے فرق کو سمجھنے کے لیے دورِ آخر میں حضرت الاستاذ کی شخصیت معیار کا درجہ رکھتی ہے اور اس کی وجہ بھی وہی مجتہدانہ بصیرت ہے جس کا ہم تفصیلی ذکر کر رہے ہیں، یہ نظر اکتساب و استنتاج سے آمیز ہو کر، جہاں ایک طرف بہت سی جگہ اپنی منفرد آراء کی طرف لے جاتی ہے وہیں دوسری طرف دیگر اہل علم کی آراء کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے کا حوصلہ بھی بخشتی ہے منطقی سی بات ہے کہ جو خود صاحب الرائے نہ ہو، وہ دوسرے کی رائے سننے کا متحمل بھی بہت کم ہوتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب عام طور پر اپنی رائے رکھ کر فارغ ہو جاتے اور جواب الجواب کا سلسلہ دراز تر کرنے میں کبھی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ دور حاضر میں اعتدال کی یہ بہت ہی نایاب صفت، جو فکر کے بڑے ریاض کے بعد حاصل ہوتی ہے، وقت گزرنے کے ساتھ مفتی صاحب کی شخصیت میں نمایاں تر ہوتی چلی گئی اور دورانِ درس شرح حدیث کرتے ہوئے بھی آپ کا یہ امتیاز محسوس ہوتا، یہاں تک کہ بعض معرکۃ الآراء قسم کے مختلف فیہ فقہی مباحث میں بھی آپ کا ٹھہراؤ، سنجیدگی، لب ولہجہ اور مخالف نقطۂ نظر کا احترام سب کچھ مثالی نظر آتا، ظاہر ہے کہ قدرت ہر چیز کی اندازہ داں ہے اور جب جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے من جانب اللہ اس کے اسباب فراہم ہو جاتے ہیں، اب علم و فکر کے باب میں روز بروز ہم جس منہج کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں، اس میں فقہی مذاہب اربعہ کے درمیان ترجیح و تقابل کے بجائے تطبیق کا اسلوب نمایاں، متعارف اور مقبول ہو رہا ہے اور معاشرت و معاملات کی بہت سی حاجات و ضروریات نے مذہبِ غیر پر جوازِ عمل کی رفتار بھی نسبتاً تیز کر دی ہے، جس سے چاروں مذاہب کا درمیانی فاصلہ بہ تدریج کم ہوتا محسوس کیا جا رہا ہے۔ حضرت مفتی

صاحب کی شرح ترمذی ''تحفۃ الالمعی'' کی ایک نمایاں خصوصیت یہی ہے، جو مرتب نے سب سے پہلے نمبر پر درج کی ہے کہ جب چاروں مذاہب برحق ہیں تو پھر تقابل و ترجیح کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنے افادات میں محدثانہ طرز پر صرف اختلاف کی وجہ اور بنیاد کو نکھارنے پر اپنی زیادہ تر توجہ مرکوز رکھی ہے، جس سے مقابلہ آرائی کے سے ماحول میں نرمی آئی ہے اور یہ اختلافِ فقہاء صرف نص فہمی یا تعبیر کا فطری اختلاف نظر آتا ہے۔

خدا شاہد کہ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ حضرت مفتی صاحب کسی ایک متعین امام کی تقلید سے گریزاں تھے، بلکہ حیرت ہوتی ہے کہ اس علمیت کے ساتھ بھی فہمِ شریعت کے حنفی منہاج پر آپ کو شرح صدر تھا اور آپ نہایت سختی کے ساتھ اسی شخصی تقلید کے پابند تھے اور کسی قسم کے خوفِ ملامت کے بغیر عقل و دانش کے کسی بھی حلقے میں، اسی تقلید کے مفید پہلوؤں کو اجاگر کرنے کا جو کام آپ نے انجام دیا ہے، اس میں بھی شاید ہی کوئی آپ کا حریف ہو، اسی طرح حضرت الاستاذ کے اس امتیاز کی وضاحت کا مقصد- خدانخواستہ- دیگر اربابِ تدریس اساطینِ علم کی اہمیت کو کسی طور کم کرنا بھی نہیں ہے۔ میں واقف ہوں کہ

ع ہر جگہ اہل زباں ہیں، بے زباں کوئی نہیں

اور مجھے بخوبی احساس ہے کہ

ع ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است

لیکن قارئین مجھے بھی استاذِ محترم کے لیے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں

اپنے عہد کے حوالے کے لیے عنوان

مشہور ہونے یا برتری دکھانے کا جذبہ اپنی ذات کے لیے اگر کسی کے دل میں ہو تو یہ یقیناً ایک منفی جذبہ ہے؛ لیکن اگر مقدر کی یاوری اور عطیۂ الٰہی کی برکات سے کسی کے حصے میں نیک نامی اور کسی خاص طبقے یا خاص عہد کی نمائندگی کا شرف آجائے تو یہ سعادت کی بات

ہے۔ حضرت مفتی صاحب کو یہ شناخت تو بہت بعد میں ملی کہ آپ کو صدارتِ تدریس اور شیخ الحدیث کا منصب سپرد ہوا، اس منصب کا آپ کی ذات سے انتساب بھی ظاہر ہے کہ ایسا امتزاج تھا جو جنتِ نگاہ کا منظر پیش کرتا، اس خلعت فاخرہ نے اگر آپ کی موزوں قامتی کو نمایاں کیا تو آپ کی موزوں قامتی نے بھی اس خلعت کے حسن کو لازمی دوبالا کیا ہے؛ لیکن جہاں تک اپنے عہد کی نمائندگی کا سوال ہے تو دارالعلوم میں اپنی خدمات کے آغاز ہی سے، اس سمت میں آپ کی تیز روی اور پیش قدمی ظاہر تھی۔ اس کی وجہ بھی حضرت مفتی صاحب کے اسی قسم کے امتیازات ہیں جن کا ذکر کر کے ہم نے بھی حضرت الاستاذ کی خدمت میں اپنی عقیدتوں کا خراج پیش کیا ہے اور اپنے خاطر بے تاب کی کسی حد تک تسلی کی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کا عہد بہ عہد تجزیہ کرنے والا اگلا مؤرخ جب حضرت مفتی صاحب کے دور تک پہنچے گا تو اس کے تجزیے میں اس دور کا سرنام اور عنوان آپ ہی کا نام ہوگا اور اس طرح ''انور شاہی دور'' کی طرح ''سعیدی دور'' بھی جلی حروف میں نمایاں نظر آئے گا۔

سفر آخرت اور الٰہی حکمتوں کا ظہور

کائنات میں چھوٹا یا بڑا جو کچھ بھی ہوتا ہے، وہ سب طے شدہ خدائی منصوبہ بندی کا اظہار ہے، یہ الگ بات کہ ظلوم وجہول انسان کے لیے بہت سی چیزیں محض اتفاقات نظر آتی ہیں، ہاں کئی مرتبہ نکتہ بعد الوقوع کے طور پر بعض حکمتیں ذہن ودل کے پردے پر عکس ریز ہوجاتی ہیں، حضرت مفتی صاحب کے سانحۂ وفات میں بھی دو چیزیں بڑی واضح محسوس ہوئیں ایک آپ کے کاموں میں تکمیل اور دوسرے قول وعمل میں موافقت کی شان۔

اپنی علمی زندگی میں جس خدمت کی انجام دہی کا آپ نے ارادہ کیا اللہ تعالیٰ نے وقت میں ایسی برکت رکھی کہ وہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا، گزشتہ سالوں میں کئی مرتبہ آپ کی علالت خطرے کی حد تک پہنچی مگر پھر اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور صحت بخشی، یہاں تک کہ آپ کی شرح بخاری شریف کے علاوہ تفسیر ہدایت القرآن کی تکمیل کی خواہش بھی اللہ تعالیٰ نے پوری کرادی۔ آپ کے ساتھ خدائی عنایت کا یہ معاملہ اس سانحۂ وفات میں بھی اس طرح ظہور

پذیر ہوا کہ الحمدللہ تعلیمی سال کا بخیر اختتام ہوا اور شرکائے دورۂ حدیث طلبۂ دارالعلوم بخاری شریف کی آخری حدیث تک آپ کی برکتوں سے مستفید ہوئے۔ تدریس جس طرح آپ کے لیے غذا کا سامان تھی اس کی لاج اس طرح رکھی گئی کہ اگلا تعلیمی سال جس کا آغاز وقتِ مقررہ پر نہ ہو پانا مقدر تھا، اس بے کیف موسم کی ایک دن کی مشقت بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کے حصے میں نہیں رکھی اور آپ کا وصال ہو گیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

اسی طرح قول وعمل کی موافقت اور اپنی رائے پر عمل کے رشتے سے اختیاری طور پر جس طرح آپ نے زندگی بھر نباہ کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے آپ کے سانحۂ وفات میں بھی غیر اختیاری طور پر اس پر عمل درآمد کا سامان کر دیا۔ مثلاً فوٹو گرافی سے متعلق آپ کی رائے آخر تک بہت سخت رہی تو یہ صرف قال نہیں، حال بھی تھا۔ آپ نے نظریے کی شدت کے ساتھ عمل میں بھی اسی طرح شدت اختیار کیے رکھی اور امکان بھر اپنی رائے کی پاس داری کی۔ چنانچہ تعزیتی اجلاس سے متعلق جو آپ کی رائے تھی اس کی گرمی ابھی تازہ تھی کہ لاک ڈاؤن کے ماحول آپ کی تشریف بری ہو گئی اور آپ کی رائے پر خود آپ کے بارے میں تو عمل ہو ہی گیا، ورنہ تو شاید بے شمار اجلاس ہائے تعزیت ہوتے اور اس کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ لازمی اسفار کی نوبت بھی آتی۔

دیو بند کے مشہور ''قبرستان قاسمی'' نامی قبرستان میں تدفین نہ ہونے میں بھی راقم کو یہی بات محسوس ہوتی ہے، آپ کے شاگردان واقف ہیں کہ آپ قبروں کے اہتمام اور کتبوں میں مسابقت اور مبالغہ آرائی کی کیفیت سے نالاں رہتے اور اس سے اپنی ناپسندیدگی اور کراہت کا برملا اظہار کرتے، بلکہ بعض مرتبہ بہت سخت قسم کی تعبیرات میں تبصرہ اور نکیر فرماتے۔ قدرت نے آپ کی اس رائے کی بھی آبرو رکھی اور دیوبند سے بہت دور ممبئی کے گورِ غریباں میں آپ سپرد خاک ہوئے۔ اب دیکھتے ہیں کہ تاریخ میں دم ہو، تو آپ کے نام کو دھندلا کر کے دکھائے۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

صرف تاثراتی تحریر کا ظاہر ہے کہ مختصر ہونا ہی بہتر ہوتا ہے مگر قارئین سے معذرت کہ یہ حکایت راقم کے لیے چونکہ لذیذ تھی ، اس لیے تھوڑی دراز ہوگئی اور یہ بھی احساس تھا کہ کم ازکم یہی چند لمحے جو حضرت الاستاذ کے ذکر اور یاد سے منسوب ہو رہے رہیں زندگی بھر کی نارسائیوں کے لیے کچھ نہ کچھ تلافی ہو جائیں، اس قسم کی تحریروں میں تذکرہ نگار اپنی کچھ خاص یادیں اور ملاقاتیں بھی نذرِ قارئین کرتا ہے، مگر مجھ ادنیٰ ترین شاگرد کے پاس اپنے طالب علمانہ تاثر کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے، قابل رشک ہیں وہ احباب جن کی مے پرستی کو چشمِ ساقی کا خصوصی فیضان نصیب ہوا۔ میرے جیسے تو صرف مے خانے کے ہجومِ عام کا حصہ ہوتے اور اپنے پیمانے کے چند قطروں میں ہی دجلہ وفرات دیکھنے لگتے۔ خضر کی یافت تو بڑے پُرمشقت سفر کے بعد میسر آتی ہے، کاش میں بھی یہ ہمت کر پاتا تو اس خضر راہ کی رہنمائیوں سے دیدہ ودل کو کچھ اور روشن کر لیتا؛ لیکن اب تو صرف اس ’’کاش‘‘ کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔

یک حرف کاش کیست کہ صد جا نوشتہ ایم

اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کی خطاؤں سے درگزر کرے، حسنات کو قبول کرے پس ماندگان کو صبر جمیل اور اجرِ عظیم کی دولت بخشے اور ہم سب حلقۂ تلامذہ ومستفیدین کی طرف سے ہمارے استاذ اور امت کے اس عظیم محسن کو اپنے شایان شان بہترین بدلہ عطا فرمائے۔ (آمین)

رفتید ولے نہ از دلِ ما

نگہ بلند سخن دلنواز

(بروفات استاذ محترم مفتی سعید احمد پالنپوریؒ)

ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی..........مشکی پور، جمال پور، کھگڑیا۔ بہار

کرونائی نظر بندی کے اذیت ناک دور سے ہم گزر رہے ہیں۔ نظامِ کائنات یوں تھم سا گیا ہے کہ انسان کہیں آسکتا ہے نہ جا سکتا، نہ کسی کو کسی کی خوشی میں شرکت کی گنجائش ہے اور نہ کسی عزیز کے جنازے پر عقیدت کے دو آنسو نچھاور کرنے کا موقع، ذہن و دماغ بری طرح منتشر و مضطرب ہے، کہتے ہیں کہ مصیبت کے وقت خدا کو یاد کیا جاتا ہے لیکن یہاں تو میرے اللہ بھی روٹھے ہوئے ہیں۔ مسجدوں پر پہرا ہے، نہ جمعہ و جماعت نصیب ہے، نہ روزہ رمضان کا لطف ہے اور نہ ہی منبر و محراب کا دیدار۔ سب بے رونق، سب پھیکا پھیکا۔ یہی کیا کم غم تھا کہ غم والم کا ایک اور پہاڑ ٹوٹ پڑا اور ایک انتہائی محبوب اور مشفق و مخلص استاذ کا سایہ ہمارے سروں سے اٹھ گیا۔ ایک بار پھر ہمیں اپنی یتیمی کا احساس شدت سے ہو رہا ہے۔ استاذِ محترم مفتی سعید احمد پالنپوری علیہ الرحمہ کی ایک ایک ادا، ان کی رفتار و گفتار، ان کی نشست و برخاست، ان کی یادیں اور ان کی باتیں سب ایک ایک کر کے ذہن کی اسکرین پر رقص کر رہی ہیں۔ یقین نہیں ہو رہا ہے کہ مفتی صاحب اب اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف کوچ کر گئے اور اب دوبارہ لوٹ کر ممبئی سے دیوبند نہیں آئیں گے۔

اس کا غم کم ہے کہ ایک عظیم انسان راہی ملکِ عدم ہوا لیکن اس لمحے کو یاد کر کے کلیجہ منہ کو آتا ہے اور جسم پہ کپکپی طاری ہو جاتی ہے کہ اتنا بڑا انسان کیسی خاموشی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ایسی خاموشی کہ آخری وقت میں ان کے دو صاحبزادے اور ایک

صاحبزادی کے علاوہ چندلوگ ہی موجود تھے۔ ان کے دیگر بچے اور اہل خانہ دیوبند تھے۔ نہ خاندان والے ہیں، نہ متعلقین و منتسبین ہیں اور نہ ہی شاگردوں کا کوئی کارواں۔ مولیٰ یہ کیسا عذاب ہے کہ چاہتے ہوئے بھی ان کا کوئی چاہنے والا آخری دیدار نہ کرسکا، انھیں غسل اور کاندھا نہ دے سکا۔ آہ جب تک وہ زندہ رہا ہزاروں کے جھرمٹ میں رہا لیکن آج جب اس کی روح جسم سے آزاد ہوچکی ہے اور زندگی کا آخری سفر درپیش ہے تو اس کے اس قافلے میں گنتی کے چند افراد شامل ہیں۔ اس مختصر سے باراتی کے ساتھ جنت کا یہ دولہا بڑی سبک خرامی کے ساتھ اپنے ابدی حجلہ عروسی کی طرف اس تیزی سے لپکا گویا اسے برسوں سے اس خوبصورت لمحے کا بے صبری سے انتظار رہا ہو۔ ہاں ہاں کون آرام نہیں چاہتا مفتی صاحب دن رات محنت کرکر کے تھک جو گئے تھے۔ ہاں میرے مولی! تیرا ارشاد بھی تو ہے کہ میں اپنے بندوں کے ساتھ ان کے گمان کے مطابق معاملہ کرتا ہوں۔ تیرے اس پیارے بندے نے تو زندگی بھر بدعات وخرافات کو آنکھیں دکھائیں اور مسلم معاشرے سے انھیں گھر بدر کیا تھا۔ یہاں تک کہ غیر مسنون تعزیت کو بھی اس نے نوحہ گردانا تو اس کی رخصتی پر اس کے سامنے کیوں آہ وواویلہ ہوتا، کیوں میلہ لگتا؟ الٰہی! تیرا راز تیرے سوا اور کون جان اور سمجھ سکتا ہے؟

مفتی صاحب نرے ایک استاذ ہی نہیں تھے؛ وہ ایک بہترین شوہر، مشفق ومربی باپ، مخلص خسر، انصاف پرور دادا، ذمہ دار منتظم، شاندار مصنف اور جاندار واعظ بھی تھے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ تعلیم وتدریس میں گزرا، ساتھ ہی انھوں نے تبلیغ وارشاد اور تصنیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا لیکن تمام تر مصروفیات کے باوجود وہ اپنی خانگی ذمہ داریوں سے کبھی غافل نہیں رہے، مفتی صاحب کے نزدیک شوہر، باپ، خسر اور دادا نانا جیسے الفاظ محض الفاظ نہیں تھے؛ ان الفاظ کے گہرے معانی بھی تھے اور وہ معانی تھے حقوق وذمہ داریاں۔ حضرت مرحوم نے اپنے بڑے صاحبزادے کے ایک حادثے میں وفات کے بعد ان کے بچوں کی مکمل کفالت اپنے ذمے لی۔ ایک بار انھوں نے دورانِ درس فرمایا تھا کہ دادا کے رہتے ہوئے والد گزر جائے تو شرعا دادا کی جائیداد سے پوتے کا حصہ تو ساقط ہوجاتا ہے لیکن دوسری

طرف اس کی کفالت کی اخلاقی ذمہ داری بھی دادا پر عائد ہوجاتی ہے۔ اس ذمہ داری کو مفتی صاحب نے بحسن وخوبی نبھایا۔

مفتی صاحب نے ایک بار فرمایا کہ میرا اصل نام احمد تھا اور سعید کا اضافہ میں نے خود کیا ہے۔ کبھی کبھی اپنے ابتدائی زمانے کی عسرت کا حال بھی بتاتے، کہنے لگے ناندیر میں جب پڑھاتا تھا تو اس وقت تنخواہ معمولی تھی بمشکل پورے مہینے خرچہ چل پاتا تھا، ہم پان کے عادی تھے لیکن مہینے کی 20 تاریخ کو پان کھانا چھوڑ دیتے تھے۔

مفتی صاحب کی پہلی زیارت جامعہ عربیہ خادم الاسلام ہاپوڑ میں ہوئی جب میں وہاں تجوید کا طالب علم تھا۔ یہ 1997-98 کی بات ہے۔ اس وقت بس اتنا سمجھ سکا تھا کہ دیوبند کے حضرت تشریف لائے ہیں۔ وہ تو بعد میں دیوبند پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ اچھا وہ حضرت مفتی صاحب ہی تھے۔ اب مفتی صاحب کو دور دور سے دیکھتا رہتا، کبھی غلہ اسکیم کے جلسے میں اور کبھی کسی اور جلسے میں۔ اسفادۂ سالِ دوم عربی میں آسان منطق کے توسط سے پہلی بار مفتی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ پھر الفوز الکبیر اور مبادی الفلسفہ سے ملاقات کرتے ہوئے دورہ حدیث کے سال (فائنل یر) ترمذی شریف کے واسطے سے براہِ راست مفتی صاحب سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا۔ مفتی صاحب سے ہم نے (2007) ترمذی اور طحاوی پڑھی۔ ہمارے شیخ نصیر احمد خاں علیہ الرحمہ کی طبیعت جب زیادہ علیل ہوگئی تو بخاری شریف کے بھی کچھ حصے پڑھنا نصیب ہوئے۔ ہمارے زمانے میں دورہ حدیث شریف میں صفِ اول میں جگہ پانے کے لیے بڑی مارا ماری رہتی، دارالحدیث کھلنے کا واضح اعلان نہ کیا جاتا طلبہ بڑے بے چین رہتے، کہیں سے کوئی خبر مل جاتی کہ آج کسی وقت درسگاہ کھل سکتی ہے بس دروازوں پر لڑکوں کا تانتا بندھ جاتا، کئی کئی گھنٹے اور بسا اوقات پوری رات انتظار میں گزر جاتی، کبھی کبھی تو طلبہ دارالحدیث کی بالکنی سے بذریعہ رسی نیچے اتر کر اپنے ناموں کی پرچیاں پہلی صف کی تپائیوں پر چسپاں کر دیتے لیکن جب درسگاہ کھلتی تو عجیب ہنگامہ آرائی رہتی، بسا اوقات بحثہ بحثی شروع ہوجاتی اور اس تنازعہ کے تصفیے کے لیے انتظامیہ کو دخیل بننا پڑتا۔ میں

نے بھی مسندِ استاذ سے جانبِ جنوب کونے پہ جگہ پائی اس لیے کہ سامنے بیٹھنے کی اپنے اندر جرات نہیں پاتا تھا۔ مفتی صاحب کا درس ترمذی مغرب تا عشاء ہوتا۔ کیا مجال کہ درسگاہ خالی رہے، کتاب ساتھ نہ ہو گوارا لیکن طلبہ حاضر ضرور رہتے، چاہے دروازے کی چوکھٹ پر جگہ ملے یا چپلوں میں بیٹھنا پڑے۔

اس وقت مفتی صاحب کی عمر 67-68 سال تھی، محلّہ بیرون کوٹلہ سے پیدل تشریف لاتے، تقریباً آدھا کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا، بابِ قاسم سے جامعہ کے احاطے میں داخل ہوتے، بابِ امداد سے ہوتے ہوئے مولسری کے کوئیں پہ پہنچتے اور چاپا کل سے پانی لیتے اور منہ صاف کرتے، اس لیے کہ وہ پان کا شوق رکھتے تھے لیکن درس حدیث کے وقت منہ میں پان رکھے رہنے کو نامناسب سمجھتے تھے۔ مفتی صاحب حدیث پڑھاتے نہیں: گھول کر پلا دیتے تھے کہ ادنی سے ادنی ذہنی سطح کے حامل طلبہ کا ذہن و دماغ بھی مطمئن ہو جاتا اور استاذ محترم جو کچھ اپنے شاگردوں کو سمجھانا چاہتے ہیں وہ ان کے ذہنوں میں پیوست ہو جاتا۔

مفتی صاحب نے "محفوظات" کے عنوان سے تین چھوٹے چھوٹے کتابچے تیار کیے تھے جو منتخب آیات واحادیث اور اسمائے حسنیٰ پر مشتمل تھے۔ ہمیں اس بات کا پابند کرتے کہ ہم انھیں زبانی یاد کریں۔ مفتی صاحب انتہائی محنتی انسان تھے اور طلبہ کی لاابالی انھیں گوارا نہیں تھی وہ کبھی کبھی ہماری لاپرواہیوں سے بددل ہو کر ناراض بھی ہو جایا کرتے تھے اور یہ وقت شاگردوں بطور خاص محنتی اور پابند طلبہ کے لیے بڑی آزمائش کا وقت ہوتا اور بڑی مشکل سے حضرت الاستاذ مانتے اور دوبارہ درسگاہ میں تشریف لاتے۔ ہماری اصلاح وتربیت کے لیے ان کا ایک انداز یہ بھی ہوتا تھا۔ چھوٹے موٹے عوارض کبھی بھی مفتی صاحب کی تدریس کی راہ میں حائل نہ ہوتے۔ ایک دفعہ انھوں نے فرمایا کہ رات بھر سر چکراتا رہا اور بے خوابی کی کیفیت رہی، میں نے اپنا بی پی یا شوگر چیک کیا تو مشین نے کہا "پڑھانا وڑھانا چھوڑ اور آرام کر" میں نے کہا "اپنا فلسفہ تو اپنے پاس رکھ اور میں تو چلا پڑھانے ۔ یہ یا اسی طرح کے ملتے جلتے الفاظ مفتی صاحب کے تھے۔ کبھی میں نے انھیں ایسا نہیں دیکھا کہ وہ دورانِ درس سستی یا

تھکاوٹ کا اظہار کر رہے ہوں یا پڑھاتے پڑھاتے ان کے اندر اکتاہٹ پیدا ہو رہی ہو۔ وہ درس نہیں دے رہے ہوتے؛ عشق و جذب کے ایک عجیب و غریب عمل سے گزر رہے ہوتے۔ انتہائی اطمنان کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر مزے لے لے کر اور مچل مچل کر پڑھاتے۔ دو چار احباب پر مشتمل ہمارا ایک گروپ تھا، ہم انتہائی پابندی کے ساتھ اسباق میں حاضر رہتے مفتی صاحب کی تقریر سنتے اور کاپی بھی لکھتے لیکن سچی بات یہ ہے کہ حضرت الاستاذ کی بہت سی باتیں ہمیں ہضم نہیں ہوتیں تو ہمارا مذکورہ گروپ آنکھوں آنکھوں ہی میں تبصرہ کر ڈالتا تاہم الحمدللہ سنجیدگی کے جامے سے ہم کبھی باہر نہ ہوئے اور مفتی صاحب سے براہِ راست تو کبھی سوال کرنے کی ہمت ہی نہ ہوئی اس لیے کہ ان سے سوال کرنے یا سوالیہ پرچی پیش کرنے کی کچھ شرطیں تھیں اور ان شرطوں پر ہر کسی کا کھرا اترنا بہت مشکل تھا۔ مفتی صاحب علیہ الرحمہ کتنے محقق تھے اور کتنے ماہر تعلیم، اس پہلو پر گفتگو ہو سکتی ہے لیکن رب ذوالجلال نے انھیں بلا کی قوتِ تفہیم کی جو دولت بیش بہا عطا کی تھی اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس وصف میں وہ بلاشبہہ طاق اور اپنے معاصرین میں ممتاز تھے۔ ان کا انداز درس انتہائی مربوط و مرتب، پر کشش، سادہ، سہل اور رواں تو ہوتا ہی لیکن کبھی کبھی حسبِ حال لطائف و ظرائف سے بھی قہقہہ بکھیر دیتے اور پورا دارالحدیث زعفران زار ہو جاتا۔ ایک دفعہ کی بات ہے کہ طہارت کے باب کے ضمن میں پاکی ناپاکی بحث چل رہی تھی، مفتی صاحب نے اپنے زمانہ طالب علمی کا ایک قصہ سنایا جب وہ مظاہر العلوم سہارنپور میں زیر تعلیم تھے۔ فرمایا ایک بار گھومتا گھومتا اسٹیشن والی مسجد پہنچ گیا، استنجے کا تقاضہ ہوا، سامنے مٹی کا لوٹا نظر آیا، اسے لے کر استنجے خانے میں چلا گیا، فارغ ہو کر جب باہر آیا تو موذن ملک الموت کی طرح سامنے کھڑا تھا، اس نے مجھ سے لوٹا لیا اور غصے سے زمین پر دے مارا اور کرختگی کے ساتھ کہا لا آٹھ آنے تم نے لوٹا ناپاک کر دیا۔ بالآخر اس نے مجھ سے آٹھ آنے لیے۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ بھئی اس روز تو" ہگنا مہنگا پڑ گیا"۔ اس نادان کو یہی پتہ نہیں تھا کہ کوئی چیز کب ناپاک ہوتی ہے اور ہوتی بھی ہے تو اسے پاک کرنے کا طریقہ بھی ہوتا ہے۔ مفتی صاحب نے ایسے

اچھوتے انداز میں اس قصے کو بیان کیا کہ ہم لوٹ پوٹ ہو گئے۔ ایک بار انھوں نے فرمایا کہ تم میں سے پچاس فیصد کا پاجامہ ناپاک رہتا ہے اس لیے کہ تم اس سلسلے میں سنتوں کی پابندی نہیں کرتے۔

دعا کے سلسلے میں استاذ محترم نے فرمایا کہ جن نمازوں کے بعد نوافل نہیں ہیں ان میں تو نماز کے بعد ہی دعا کرو اور جن کے بعد نوافل ہیں ان میں نوافل کے بعد دعا کیا کرو اور جم کے کیا کرو۔

مفتی صاحب میدانی آدمی تو تھے نہیں؛ تاہم اپنے زبان وقلم اور علم وعمل سے طلبہ کی ایسی کھیپ تیار کرنا چاہتے تھے جو علم و دین میں تعمق وتصلب کے ساتھ ساتھ خدمت دین کے والہانہ جذبے سے بھی سرشار ہو، ایک پکا مسلمان اور سچا شہری بھی ہو۔

مفتی صاحب ہمیں کتابوں کے اسباق کے ساتھ زندگی کے اسباق بھی پڑھاتے تھے، فرماتے کہ رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد جب دن ورات دس سال تک مستقل مطالعہ کروگے تو کچھ کچھ علم آنا شروع ہوگا۔ علم ومطالعے کو اپنا مشغلہ بنانے کی شاگردوں کو ہمیشہ نصیحت فرماتے۔ وہ اس بات کی نصیحت فرماتے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد قرآن کریم کی چند آیات اور چند احادیث کا ترجمے کے ساتھ مطالعے کا معمول بنا لو اور اسے اپنی زندگی کا وظیفہ بنالو۔

حضرت عام طور سے طلبہ کی دو قسمیں بیان کرتے۔ (1) اعلیٰ ذہن کے مالک۔ (2) ادنیٰ ذہن کے حامل۔ ان کی خواہش ہوتی کہ اول الذکر دینی مدارس میں تدریسی لائن ہی سے وابستہ ہوں اور آخر الذکر تدریس کے علاوہ ذمہ داریاں سنبھالیں مدارس کے وہ اعلیٰ اذہان جو عصری جامعات کا رخ کر لیتے ہیں ان سے مفتی صاحب بہت نالاں رہتے اور کہتے کہ یہ طبقہ میرا مخاطب نہیں ہے۔ اس سلسلے میں مفتی صاحب کی نیت پر شک کی گنجائش نہیں ہے تاہم اپنے تخصصات کے ساتھ عصری اداروں میں علماء کی موجودگی بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ہمیں اس رویے پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے کہ پڑوس میں

آگ لگی ہوئی ہے اور ہم مطمئن ہیں کہ ہم محفوظ ہیں۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی کے آٹھ سالہ قیام کے دوران میں مجھے اچھی طرح اس کا تجربہ ہوا کہ اس طرح کے مخالف ماحول میں بھی اگر ایک عالم اپنی عالمانہ شان کے ساتھ رہتا ہے تو وہ خود روشن ہوتا بھی ہے، روشن رہتا بھی ہے اور دوسروں تک روشنی پہنچاتا بھی ہے۔

دار العلوم دیوبند میں بھی تبلیغی جماعت کا کام ہوتا ہے (عارضی طور پر ابھی کچھ دنوں سے موقوف ہے) اور علی گڑھ میں بھی، لیکن دونوں میں نوعیت کا فرق ہے۔ دیوبند میں اساتذہ کی شمولیت صفر ہے جب کہ علی گڑھ میں اساتذہ ہی کی نگرانی میں سارا کام انجام پاتا ہے۔ یہاں جماعت سے جڑے طلبہ کا خیال ہے کہ اصل مقصود عمل ہے اور علم عمل تک پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے اس لیے جماعت کا نمبر پہلے ہے اور تعلیم کا درجہ دوسرے نمبر پر ہے۔ وہاں والے کی فکر یہ ہے کہ وہ ایک پروسیس اور معاہدے کے تحت اس ادارے میں داخل ہوئے ہیں اس لیے اولین ترجیح تعلیم ہے لیکن عملی اور دعوتی زندگی کی عملی مشق بھی بہت ضروری ہے اس لیے اپنے خارجی اوقات کو یہ لوگ ضائع کرنے کے بجائے انھیں کام میں لگاتے ہیں۔ تعلیم ان کے یہاں پہلی ترجیح ہے اور تبلیغی سرگرمیاں ثانوی ترجیح۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ علی گڑھ میں جماعت کو عموماً مثبت نظریے سے دیکھا جاتا ہے اور دیوبند میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس تناظر میں مفتی صاحب کی رائے کی تفہیم آسان ہوسکتی ہے۔ ان کے نزدیک طلبہ کے لیے جماعت دیگر غیر درسی سرگرمیوں کی طرح کا ایک کام ہے اور اس کی حیثیت اضافی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اس جماعت میں بے اعتدالی اس لیے بھی آرہی ہے کہ مرکز نظام الدین اپنے مرکز دیوبند سے دور ہوتا جارہا ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ امیر جماعت مولانا محمد یوسف کاندھلوی جب بھی سہارنپور جاتے تو دیوبند ہوتے ہوئے جاتے اور اور وہاں سے واپسی پر بھی یہی معمول رہتا۔ وہ دار العلوم دیوبند اور وہاں کے اساتذہ سے پورے طور پر جڑے ہوئے تھے، اپنی کارگزاریوں سے انھیں آگاہ کرتے، ان سے مشورے لیتے اور اربابِ دیوبند کو بھی بہت سے معاملات میں مفید مشوروں سے نوازتے، لیکن ان کے بعد یہ

سلسلہ تقریباً منقطع ہو گیا۔ مفتی صاحب اس پر افسوس کا اظہار بھی کرتے۔

ہمارے زمانے میں دورہ حدیث میں تقریباً آٹھ سو طلبہ تھے۔ مفتی صاحب فرماتے تھے کہ اتنی بڑی درسگاہ اصولاً صحیح نہیں ہے، کم از کم اس کی چار ترتیبات (Sections) ہونی چاہئیں۔ وہ یہ بھی فرماتے کہ مدارس میں آج عموماً یہ ہو رہا ہے کہ شیخ الحدیث کا انتقال ہوا اور مہتمم ہی اس مسند پر قابض ہو بیٹھا چاہے اس کے اندر اس کی اہلیت ہو کہ نہ ہو اور طنزاً کہتے کہ گاؤ تکیہ لگایا، بغل میں ایک اگالدان رکھا اور بن گئے شیخ الحدیث کبھی یہ فرماتے کہ آج مدارس سے اچھے نتائج اس لیے برآمد نہیں ہو رہے کہ اہل مدارس نے اموال زکوٰۃ میں خرد برد شروع کر دی ہے اور اس کے مصرف میں بڑی بے اعتدالی آ گئی ہے

وہ برابر ہمیں محنت کی تلقین کرتے اور فرماتے کہ یہاں سے چلے جاؤ گے، شادی ہو جائے گی اور صغریٰ کبریٰ ملنے کے بعد نتیجہ بھی کھٹا کھٹ نکلنا شروع ہو جائے گا اور ہر سال سلام ابا سلام ابا بھی ہونے لگے گا۔ اس لیے ابھی ہی جو کرنا ہے کر لو۔ یعنی بعد میں بہت کچھ کرنا چاہتے ہوئے بھی نہیں کر پاؤ گے۔

مفتی صاحب کا چوں کہ ہر سال لندن و کناڈا وغیرہ بیرون ممالک کا سفر ہوا کرتا تھا اور ان کا سابقہ انگریزی سے بھی پڑتا تھا اس لیے ایک زمانے میں انھوں نے انگریزی اخبار پڑھنے کا آغاز کیا تھا لیکن الٹی سیدھی تصاویر کی بہتات کی بنا پر اسے ترک کر دیا۔

تصویر کشی کے جواز و عدم جواز کے بارے میں علمائے ہند اور علمائے عرب میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے یہاں شدت پائی جاتی ہے اور وہاں تساہل آج تو تقریباً سب برابر ہی ہو گئے ہیں۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پچاسی سالہ جشن کا موقع تھا، میں بھی شریک تھا، تصویر کشی دھڑلے سے ہو رہی تھی علمائے عرب اس عمل میں پیش پیش تھے اور میں گریزاں، پروگرام کے اختتام کے بعد ان سے گفتگو ہوئی لیکن انھوں نے اس عمل کو الگ اور حدیث میں آئی وعید کو دو علیحدہ شئی قرار دیا۔ میں نے دوسرے روز علی الصباح ان میں سے ایک صاحب کو صبح کی چہل قدمی کے بہانے سڑکوں

پہ گھمانے لے گیا اور ایک جگہ ہنومان مندر کے پاس ہم رک گئے جہاں ہنومان جی کی ایک قد آدم تصویر لگی ہوئی تھی اور لوگ اس کی پوجا کر رہے تھے۔ جب دوبارہ پروگرام میں میں پہنچا تو دیکھا کہ وہ بھی تصویر کشی سے گریزاں ہیں۔ مفتی صاحب نے اس عالم کا نام بھی بتایا تھا جو مجھے اب یاد نہیں رہا۔ مفتی صاحب اپنی رائے تھوپنے کے بجائے اسے مثبت اسلوب اور نرم لہجے کے ساتھ سمجھانے کی پرخلوص کوشش کرتے تاکہ مخاطب خود ہی سمجھ کر اس کا قائل اور اس پر عامل ہو جائے۔

ہمارے شیخ مولانا نصیر احمد خاں صاحب جب صاحبِ فراش ہو گئے تو دار العلوم کو شیخ الحدیث کا مسئلہ درپیش آیا، دار العلوم کے خوشہ چینوں اور بہی خواہوں کے لیے یہ وقت بڑی کشمکش کا تھا، اسی دوران جمعیۃ تنازعہ بھی طول پکڑ گیا تھا، اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ بڑی آسانی کے ساتھ شیخ الحدیث کے لیے حضرت الاستاذ کا نام متعین ہو گیا اور اللہ نے جتنے دن مقدر کیے تھے اتنے دن مفتی صاحب اس منصبِ عظیم پر فائز رہے۔

استاذ محترم کی خدمات کی کئی جہات ہیں۔ درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور دعوت و تبلیغ، لیکن میرے نزدیک ان کی دو خصوصیات ایسی ہیں جو کروڑوں میں کسی کو نصیب ہوتی ہیں۔ اول ان کا 2002 سے پہلے پہلے مدرسے سے لی ہوئی تنخواہوں کی واپسی، یعنی دار العلوم اشرفیہ راندیر سورت، گجرات میں نو سال (1973-1065) اور دار العلوم دیوبند میں تیس سال (2002-1973) کی لی ہوئی تنخواہ کی کل رقم (973054/75) نو لاکھ تہتر ہزار چون روپے پچھتر پیسے واپس کر دی۔ اس کے بعد تادم واپسیں تنخواہ نہیں لی۔ دوسرا بڑا امتیاز ان کا یہ تھا کہ رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد خود، شادی کے بعد اہلیہ اور صاحبِ اولاد ہونے کے بعد تمام بیٹوں اور بیٹیوں اور بیٹوں کی شادیوں کے بعد تمام بہوؤں کو حافظ بنانے کا ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔ مفتی صاحب کی یہ ایسی خوبی ہے کہ دور دور تک ان کا کوئی ہم پلہ نظر نہیں آتا۔ ذٰلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

سال کے اخیر میں یہ خبر سننے میں آئی تھی کہ اس بار مفتی صاحب ختم بخاری کے

موقعے پر نہ تو ناصحانہ کوئی کلمہ کہہ پائے اور نہ ہی دعاء کر پائے۔ آج الفاظ کے بجائے ان کے آنکھوں سے نکلے آنسو کچھ نہیں بہت کچھ بول رہے تھے اور مفتی صاحب یوں ہی اٹھے اور چلے گئے، استاذ کے ساتھ شاگردوں کی بھی گھگھی بندھ گئی۔ مجھے جب یہ خبر ملی تو ٹھٹھک سا گیا، یہ محض تشویش نہیں تھی بلکہ کسی طوفان کا شاخسانہ تھی جو 25/رمضان 1441ھ کو ان کی وفات کی صورت میں سامنے آئی۔ اللہ انھیں اعلی علیین میں جگہ عطا فرمائے اور ان کی جملہ خدمات کو شرف قبولیت سے نوازے اور دار العلوم دیوبند کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

ہائے! کہاں غروب یہ آفتاب ہو گیا

ظفر امام...... کھجور باڑی دارالعلوم بہادر گنج

عام دنوں کے مقابلے میں رمضان کے ایام میں دن چڑھے تک سونے کا معمول رہتا ہے، حسبِ سابق کل ۲/ رمضان بروز منگل {سحری کے بعد سویا اور اتنی گہری نیند سو گیا کہ نو بجے آنکھ کھلی، ہڑبڑا کر اٹھا، موبائل کھولا ہی تھا کہ ایک ایسی اندوہ گیں اور دلگیر خبر پڑھنے میں آئی کہ جسے پڑھ کر یک بیک نگاہیں ٹھر گئیں، ماتھے پر درد و کرب کی سلوٹیں ابھر آئیں، بڑھتے قدم زمین سے پیوست ہو کر رہ گئے، چہرے پر بے یقینی، رنجیدگی اور افسردگی کے کئی رنگ آئے اور رخصت ہو گئے، شیشہ دل پر کاری چرکہ لگا، آنکھوں کے سامنے رنج والم کے گہرے بادل چھا گئے، ہونٹ کپکپائے، یک دوجے سے علیحدہ ہوئے اور انا للہ الخ کے الفاظ بیربط جملوں کے سانچے میں ڈھل گئے؛

ویسے تو حضرت الاستاذ} مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری {رحمہ اللہ کی طبیعت کافی دنوں سے خراب چل رہی تھی، بیخوابی، شب بیداری، ورق گردانی، کثرتِ کتب بینی اور انتھک محنت ولگن نے آپ کو بیماریوں کا مجموعہ بنا کر چھوڑ دیا تھا، جب میں ۲۰۰۴ء میں عربی ہفتم میں تھا تو اس وقت ہی آپ پر ایک جان لیوا مرض نے یلغار کر دیا تھا، جس کے زیرِ اثر آپ مسندِ تدریس سے تقریباً ایک ماہ الگ رہے تھے، لیکن! آپ اپنے ہزاروں خوشہ چینوں اور زلہ رباؤں کی دعاؤں اور اپنے وقتِ موعود کے پورا نہ ہونے کی وجہ سے جانبر ہو گئے تھے، تب سے لیکر امسال شعبان تک نہایت ہی بہتر اور خوش انداز طریقے سے آپ اپنے فریضے کو انجام دیتے رہے کہ:-

امسال شعبان میں بخاری کے آخری درس میں آپ کے سر پر موت کی اولِ

بانگِ دراس طور پر بجی کہ یک بیک آپ کی قادر الکلام اور رواں زبان ہکلا گئی، چاہ کر بھی آپ بول نہ سکے، اپنے شیخ کی یہ حالتِ زار دیکھ کر پورا دارالحدیث گریہ کناں ہوگیا، طلباء کی سسکیوں اور آہوں سے دارالحدیث کے در و دیوار کپکپا اٹھے، کافی جد و جہد کے بعد بمشکل آپ کی زبانِ مبارک سے یہ جملہ ادا ہوسکا کہ ''اب جو کریگا اللہ ہی کریگا'' پھر آپ بغرضِ علاج ممبء کے لئے آخری سفر پر نکلے، اب کسے پتہ تھا کہ بلبل کے اپنے آشیانے سے اس کا یہ سفر آخری سفر ہے، پرندے اپنے آشیاں چھوڑتے ہیں واپس آنے کے لئے، لیکن آپ ہم سب کو بے سہارا و بے آسرا چھوڑ کر یہاں سے ایک ایسے سفر کی طرف رختِ سفر باندھ رہے ہیں جس کی مسافت کبھی ختم نہ ہوگی اور جس کی بھول بھلیاں اتنی وحشتناک کھنڈرات میں تاحدِ نگاہ بل کھاتی چلی گئی ہیں کہ کسی مسافر کی وہاں سے پسپائی ناممکن ہی نہیں بلکہ محال ہے؛

ممبئی میں بہتر طریقے پر آپ کا علاج چلا، آپ بیماری سے مکمل طریقے پر صحتیاب بھی ہوگئے کہ رمضان سر پر آ گیا، پھر آپ نے وہیں ممبئی میں ہی علمی نکات، فقہی لطائف اور تفسیری رموز پر مشتمل قرآنِ کریم کی نہایت ہی جامع، بلیغ اور شاندار تفسیر شروع فرمائی جو غالبا سترہ رمضان تک جاری رہی، لیکن! یہ تو بجھتے ہوئے چراغ کی آخری لَو تھی جو گُل ہونے سے پہلے تھرتھرا رہی تھی، اور پھر وہی ہوا جو ایک بجھتے ہوئے چراغ کا آخری مقدر ہوتا ہے کہ آپ اچانک لبِ بستر ہوئے اور پھر مختصر سی علالت کے بعد دنیا بھر میں پھیلے اپنے چاہنے والوں اور ہزاروں شاگردوں کے جم غفیر کو اشکبار کر کے یہ خوش نوا بلبل یہ کہتے ہوئے ہمیشہ کی میٹھی نیند سو گیا کہ

بڑے غور سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

آپ کی موت کسی ہمہ شما کی موت نہیں تھی، بلکہ ایک پائے کے محدث اور جلیل القدر فقیہ کی موت تھی، آپ کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پوری دنیا میں پھیل گئی، علمی حلقوں میں سوگواری اور رنجیدگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی، پچھلے چار پانچ دہائیوں سے آپ کے علم

کی جوت سے روشن و منور ہونے والا دارالعلوم اچانک یوں تاریک سا ہوگیا کہ مانو جیسے اس کی روشنی کو گہن لگ گیا ہو، دارالعلوم کے در و دیوار چیخ اٹھے اور بزبانِ حال یوں نغمہ سرا و سنج ہوئے کہ

کس کو سناؤں حالِ غم کوئی غم آشنا نہیں
ایسا ملا ہے دردِ دل جس کی کوئی دوا نہیں

بلا شبہ اس دورِ قحط الرجال میں آپ کی بلند پایہ، شہرۂ آفاق اور یگانۂ روزگار شخصیت بمثلِ اس آفتاب کے تھی جس کی ضیاء پاش کرنیں بیک وقت پورے عالم کو تابندگی عطا کرتی ہیں، اور جن کی جھلملاتی روشنی میں راہِ حق سے بھٹکا مسافر اپنی زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ ہوتے ہوئے اپنے کاروانِ حیات کو درست سمتِ سفر عطا کرتا ہے، آپ جہاں میدانِ علم و دانش کے ایک زبردست محدث، بلند پایہ فقیہ، مایہ ناز مفسر، باکمال مصنف، سحر طراز مدرس، منفرد عالم، ممتاز محقق اور عالی رتبہ مدقق تھے تو وہیں میدانِ اصلاحِ حال اور درستگیٔ قلوب کے ایک بہت بڑے مصلح نبض آشنا حکیم، خوش بیاں مقرر، خوش گفتار خطیب اور روشن دماغ رہنما تھے، مجلس کو لوٹنے کا ملکہ آپ کو خدا نے خوب عطا کیا تھا، آپ کی باتوں میں پروردگار نے وہ خمار اور سحر ودیعت کر دیا تھا کہ لوگ انہیں سن کر مسحور و مخمور ہو جاتے اور اس پر مستزاد یہ کہ آپ کے سراپے میں اتنی سادگی، بیساختگی، دلبری، دلکشی اور مقناطیسیت تھی کہ جو ایک بار آپ کی مجلس میں چلا جاتا یا آپ کو دیکھ لیتا تو وہ بار بار جانے اور آپ کو دیکھنے کی تمنا کرنے لگتا، بات کرنے کا اسلوب اور طور اتنا دلکش و دلنشیں کہ گھنٹوں آپ کی مجلس میں بیٹھنے کے باوجود نہ دل اکتاتے اور نہ ہی ذہن پژمردہ ہوتے؛

آپ کا شمار دارالعلوم کے ان مایہ ناز اور مقبول ترین اساتذہ میں ہوتا تھا} بلکہ آپ اس باب میں سرِ فہرست تھے { کہ جو مساویانہ طور پر دارالعلوم کے ہر چھوٹے بڑے درجے کے طالبِ علم کے منظورِ نظر اور ان کے دلوں میں رچے بسے ہوا کرتے ہیں، آپ کا درسِ اولِ

دن ہی سے دارالعلوم میں اتنا مقبول تھا کہ شاذ ہی کسی اور کے حصے میں یہ آیا ہو، اور اس کی بنیادی وجہ آپ کا ماہرانہ کلام، فقیہانہ گفتگو، منطقانہ اسلوب اور محققانہ طور تھا، آپ پوری بیدار مغزی اور کمالِ دقیقہ رسی ونکتہ سنجی سے پوری تشفی بخش بات کیا کرتے تھے، دارالعلوم کے دورۂ حدیث کے اکثر گھنٹے میں ایک پاؤ تپائیاں طلبہ سے فارغ رہتی ہیں، لیکن! یہ آپ کے تدریسی اسلوب اور تعلیمی تکنیک کا ہی کمال تھا کہ صرف طلبۂ دارالعلوم ہی نہیں بلکہ قرب و جوار کے مدارس کے طلبہ بھی آپ کے دریائے علم سے جرعہ نوشی کے لئے کشاں کشاں آپ کے گھنٹے میں حاضر ہوتے، اور پورے ہمہ تن گوش ہوکر آپ کے بتائے ہوئے ایک ایک نکتہ کو آویزۂ گوش بناتے اور اس ہجوم کا یہ عالم ہوتا کہ اتنی بڑی درسگاہ طلبہ کی کثرت کی وجہ سے اَٹ جاتی، حتی کہ تِل دھرنے کی جگہ بھی باقی نہیں رہتی، مجبورا بعد میں آئے طلبہ کو دروازے سے باہر ہی بیٹھ کر سننا پڑتا؛

دارالعلوم میں یہ قدیم روایت ہیکہ طلبہ دلفریب لحن، وجد آفریں لہجہ اور مخصوص نوع کی طرز کے ساتھ احادیث کی عبارت خوانی کرتے ہیں، اور مسند آراء اساتذہ موقع بموقع احادیث کی تشریح کرتے ہیں پہلے حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کا بھی یہی انداز تھا لیکن! ادھر کچھ سالوں سے { جس میں ہمارا بھی سال ۲۰۰۲ء بھی شامل ہے } حضرت کسی طالبِ علم سے ضیاعِ وقت کی وجہ سے عبارت پڑھوانا پسند نہیں فرماتے تھے بلکہ از خود پڑھتے تھے اور پڑھنے کا انداز اتنا شاداب وشگفتہ اور دلکش و دلنشیں ہوتا کہ سماں میں وجد طاری ہوجاتا، عبارت پڑھتے ہوئے آپ کی زبانِ مبارک سے ایسا نغمہ پھوٹنے لگتا جیسے کوئی رباب کے تاروں کو چھیڑ رہا ہو، جیسے کوئی بہتا دریا پتھر کی سلوں سے ٹکرا رہا ہو اور جیسے کوئی آبشار جلترنگ بجا رہا ہو؛

اس کے ساتھ ہی آپ فطری طور پر نہایت ہی بذلہ سنج، ظریف الطبع اور زندہ دل انسان واقع ہوئے تھے، طلبہ کے دلوں کو پرکھنے کا نہ جانے آپ کے پاس کون سا ایسا آلہ تھا کہ آپ طلبہ کی ہلکی سی اکتاہٹ کو بھی محسوس کرلیا کرتے تھے، جب مجلس میں ذرا اضمحلالی

کیفیت چھانے لگتی تب آپ کوئی ایسا خوش گوار، پُرلطف اور مسرت انگیز لطیفہ چھوڑ دیتے کہ پوری مجلس قہقہہ زار بن جاتی، یہی وجہ ہیکہ آپ کی مجلس کبھی بھی بیزاری یا انقباضیت کی شکار نہ ہوتی، پوری مجلس سراپا گوش بنی ہوتی، کہیں سے ذرہ بھر بھی سرسراہٹ کی آواز پیدا نہ ہوتی آپ طلبہ کے دلوں پر چھائے رہتے، کبھی تدریسی بانکپن اور بوقلمونی کی وجہ سے تو کبھی ظریفانہ نہج اور لطیفانہ اطوار کی وجہ سے؛

ان کے علاوہ خدا نے آپ کو معلمانہ وجاہت، فاضلانہ متانت اور مرعوبانہ وقار کی نعمتِ عظمیٰ سے بھی بہرہ ور کیا تھا، آپ جونہی درسگاہ میں قدم انداز ہوتے یک بیک پوری درسگاہ اس ٹھرے ہوئے جوہڑ{ تالاب} کی مانند ہوجاتی جو کنارے سے ابل چلنے کے بعد بھی پرسکون لہروں کی آغوش میں خاموش رہتا ہے؛

لیکن! افسوس کہ آج یہ لکھتے ہوئے دل خون کے آنسو رو رہا ہے، انگلیاں مائل بہ فگار ہیں، کلیجہ منہ کو آرہا ہے اور قلم سے لہو کی سیاہی اڈ رہی ہے کہ آج ہم سے وہ تاریخ ساز ہستی اتنی دور جا چکی ہے کہ بس اب کبھی ہوا تو خوابوں میں ہی زیارت ہو؛

جا بسا اڑ کر اچانک ہائے وہ طائر کہاں
گلستاں میں جو تھا اب تک نغمہ سنج و نغمہ بار
پیکرِ صدق و صفا نازشِ دانشوراں
خطۂ عالم میں جو تھا سلف کی یادگار

یقیناً آج اس بزمِ کون و مکاں سے سدا کے لئے وہ روشن چراغ بجھ گیا جو برسوں سے اپنی روشنیاں اصحابِ محفل پر لٹا رہا تھا، تاہم فضا میں اس کی بکھری ہوئی چنگاریاں بشکلِ کہکشاں یونہی تا قیامت جھلملاتی رہینگی، کیونکہ کسی فنکار کی موت صرف اس فنکار تک منحصر ہوتی ہے، لیکن اس کے چھوڑے ہوئے فن پارے ایک یادگار عناصر بن کر ہمیشہ کے لئے لوگوں کے دلوں میں زندہ اور تابندہ رہتے ہیں؛

اس موقع پر مجھے آپ کا ایک جملہ خوب یاد آتا ہے جو آپ بار بار درس میں فرمایا کرتے تھے، کہ" مسلمانوں کو گورِ غریباں میں دفن کیا جانا چاہیے، اب تو لوگ دفن کرنے میں بھی امتیاز برتتے ہیں اور اپنے مردوں کو جداگانہ قبرستان میں دفن کرنے کو فخر سمجھتے" ، یہ آپ کی تواضع کا اثر تھا یا انکساری کا نتیجہ کہ خدا نے آپ کی بات پر بارگاہِ مستجاب میں قبولیت کی مہر لگادی، اور آپ کی وفات اپنے چمن سے میلوں دور ایک ایسے دیارِ غربت میں ہوئی اور آپ کے جسمِ اقدس کو ایک ایسی قبرگاہ میں سپردِ خاک کیا گیا کہ نہ وہاں آپ کے منصب کا کوئی آدمی دفن تھا اور نہ ہی آپ کے پلے کا کوئی انسان، اگر تھے تو وہی گمنام لوگ تھے جو اپنی رحلت کے بعد لوگوں کے ذہنوں میں فقط بھولی بسری یاد بن کر زندہ رہ جاتے ہیں؛

آج جوگیشوری ممبئی کے مکیں بھی اپنی قسمت پر ناز کر رہے ہونگے کہ اس سے پہلے شاید کبھی اس سرزمین نے ایسی پُرنور صبح نہیں دیکھی ہوگی جیسی کل دیکھی تھی اور اس قبرستان میں مدفون مردے بھی خوشی کی بانسری بجارہے ہونگے کہ آج ان کے پہلو میں ایک ایسا آفتابِ عالم تاب محوِ خواب ہوا ہے کہ جس کی راہ دیکھتے ہوئے انہیں عرصہ بیت گیا تھا؛

بس دعا ہے کہ باری تعالیٰ حضرتِ والا کی مغفرت فرمائے، درجات کو بلند و بالا فرمائے، آپ کے پسماندگان، خوشہ چینان اور عقیدت مندان کی اشک شوئی فرمائے اور آپ کے جانے سے دارالعلوم کو جو خسارہ لاحق ہوا ہے اور جو نا قابلِ پُر انخلاء پیدا ہوا ہے اس کو پُر کرنے کے اسباب پیدا فرمائے .... آمین یارب العالمین

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحبؒ

شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند

مفتی امانت علی قاسمی......استاذ و مفتی دار العلوم وقف دیوبند

پچیس رمضان المبارک ﷺ (۱۴۴۱ھ) صبح سات بجے یہ اندوہناک خبر ملی کہ عالم اسلام کی ہر دل عزیز شخصیت، علم و عمل کی پاکیزہ روایت کے امین حضرت الاستاذ، حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحبؒ اب ہمارے درمیان نہیں رہے (انا للہ وانا الیہ راجعون)، کئی دنوں سے تشویش کی خبریں آرہی تھیں، تاہم اس خبر کے لیے دل و دماغ بالکل آمادہ نہیں تھا؛ لیکن تقدیر کے سامنے کس کی چلتی ہے، موت سے کس کو رستگاری ہے، میرے یا مجھ جیسے ہزاروں کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے، قدرت ہر آن اور ہر حال اپنا کام کرتی ہے، اور قدرت جس چیز کی مصلحت سے واقف ہے انسان اس کی تہہ تک نہیں جاسکتا ہے، ہر شخص کے آنے اور جانے کا وقت متعین ہے اس میں کوئی تاخیر نہیں ہوسکتی ہے، کسی کی موت کے وقت کو دنیا کا کوئی ماہر ڈاکٹر نہیں ٹال سکتا ہے، اس لیے نہ چاہنے اور دل کے نہ ماننے کے باوجود بھی اس خبر کا یقین کرنا پڑا۔

زندگی ہے اپنے قبضے میں نہ اپنے بس میں موت
آدمی مجبور ہے اور کس قدر مجبور ہے

جانے والے جاتے ہیں، آئے دن موت کی خبریں آتی ہیں، لیکن جسم واعصاب پر اور دل و دماغ پر، بسا اوقات کسی کے جانے کی خبر سے جنبش بھی نہیں ہوتی؛ لیکن جانے والوں کی فہرست میں کبھی ایسے نام آجاتے ہیں، جن کے جانے کا غم اور درد سہا نہیں جاتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی جگہ اگر میری موت مقدر ہوتی تو شاید اتنا دکھ نہ ہوتا، مفتی صاحب کی وفات کا رنج وغم صرف اس لیے نہیں ہے کہ آپ میرے استاذ تھے، صرف اس لیے تکلیف

نہیں ہوئی کہ مجھے آپ سے محبت تھی؛ بلکہ آپ کے منوں ٹن مٹی کے نیچے چلے جانے کا افسوس اس لیے بھی ہے کہ آپ دارالعلوم دیوبند کی زینت تھے، چمنستان قاسمی میں آپ سے رونق تھی ، آپ کے عالم آخرت کے سفر پر چلے جانے کا غم ، اندوہناک اس لیے بھی ہے کہ آپ علماء دیوبند کے ترجمان تھے، علوم نانوتویؒ کی توضیح وتشریح کرنے والے تھے، آپ کی وفات کی خبر دل پر بجلی بن کر اس لیے گری کہ آپ دارالعلوم کی مسند تدریس کی شان تھے، فکر ولی اللّٰہی کے امین ومحافظ تھے، آپ کی رحلت کا افسوس اس لیے بھی ہے کہ آپ علم حدیث کے نیر تاباں تھے آپ سے دارالعلوم کی درس گاہ میں تابانی تھی۔ سچ پوچھئے تو یہ بھرتی کے الفاظ نہیں ہیں، مبالغہ آمیزی نہیں ہے، الفاظ کی ہیرا پھیری نہیں ہے، تعبیرات کی کرشمہ سازی نہیں ہے : بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مشکل حالات میں آپ امت کے لیے سرمایہ تھے، جس وقت کہ باطل قرآن وحدیث کی بے جا تاویلیں کررہا ہے، حدیث کی من گھڑت تشریح کررہا ہے ان حالات میں آپ امت کے لیے نسخۂ شفا تھے، قوم کے دردِ دل کی دوا تھے، آپ کو کھو کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم نے بحر بیکراں کو کھو دیا ہو، آپ سے بچھڑ کر لگتا ہے کہ کشتی اپنے ناخدا سے بچھڑ گئی ہے سچ پوچھئے تو آپ کے جانے سے پوری قاسمی برادری سوگوار ہوگئی، ملت کے ہر طبقہ نے شدید کرب محسوس کیا، دارالعلوم کے بام ودر وہاں کے چمن وانجمن ، گنبد ومینارے، سڑک اور راستے، دارالحدیث کی مسند، مسجد رشید کا اسٹیج ہر ایک نے خاموشی سے تنہائی اور خلوت میں درد و کرب کا اظہار کیا ہے، یہ بھی سچ ہے کہ آپ اس وقت دارالعلوم کے گنج ہائے گراں مایہ اور چمنستان قاسمی کے گل سرسبد تھے۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت، علمی شخصیت تھی، آپ تقریر، تحریر اور تدریس تینوں فنون میں ممتاز تھے، سب میں نمایاں تھے، آپ کی تقریریں علمی ہوا کرتی تھیں لیکن انداز

اور طریقہ اس قدر سہل ہوتا کہ عوام وخواص ہر ایک یکساں مستفید ہوتے تھے، ہندوستان میں عام جلسوں میں آپ نہیں جایا کرتے تھے، اسی طرح ایام تعلیم میں اسفار سے مکمل گریز کیا کرتے تھے، لیکن جس پروگرام یا سمینار میں آپ تشریف فرما ہوتے وہ اس کانفرنس کی قسمت اور اس کے معیار کی ضمانت ہوا کرتی تھی، جس پروگرام میں آپ ہوتے اس کے میر محفل ہوا کرتے تھے اور سب سے اہم اور فیصلہ کن خطاب آپ کا ہوا کرتا تھا، دارالعلوم کے ہر اجلاس میں آپ کا خطاب ہوتا تھا، انعامی جلسہ میں آپ کے خطاب کی حلاوت اور ایک ہی مضمون کو ہر سال ایک نئے پیرہن میں بیان کرنے کی دل آویز ادا کبھی نہیں بھول سکتا ہوں، آپ کا انداز تقلیدی نہیں اجتہادی تھا، آپ کا لب ولہجہ منفرد تھا، آپ علمی باتوں کو جس سہل پیرائے میں بیان کیا کرتے تھے وہ آپ کا حصہ تھا بقول ڈاکٹر کلیم عاجزؒ

یہ طرز خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا
جو ہم کہیں گے کسی سے کہا نہ جائے گا

مفتی صاحبؒ کو تقریر کے علاوہ تحریر میں بھی بے پناہ ملکہ حاصل تھا، آپ کی کتابیں نئے اسلوب کے ساتھ تسہیل وترتیب کا حیرت انگیز شاہ کار ہیں، ماضی قریب میں حضرت مولانا قاری صدیق صاحب باندویؒ کو اللہ تعالی نے تسہیل کے فن سے نوازا تھا آپ نے مشکل کتابوں کو تسہیل کے پیرہن میں ڈال کر امت پر بڑا احسان کیا ہے، حضرت قاری صاحبؒ کے بعد اس میدان کی دوسری شخصیت میری نظر میں مفتی صاحبؒ کی ہے، آپ نے مختلف فنون کی مشکل کتابوں کی شرح اور تسہیل وترتیب کا کام کیا ہے اور مشکل کتابیں آپ کی تشریح وتوضیح سے آسان ہوگئی ہیں، درس نظامی کی کتابوں میں کافیہ مشکل ترین کتاب مانی جاتی ہے آپ نے ہادیہ لکھ کر اس کے ثقل کو ختم کر دیا، فن منطق میں تہذیب دقیق ترین کتاب سمجھی جاتی ہے آپ نے مفتاح التہذیب لکھ کر اس کے بوجھ کو کم کر دیا۔ اسی طرح شرح مأۃ عامل کی شرح مفتاح العوامل، فلسفہ میں معین الفلسفہ، طحاوی کتاب الطہارۃ کا خلاصہ زبدۃ

الطحاوی لکھ کر موجودہ وقت میں طالبین علوم نبوت کے لیے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حجۃ اللہ البالغہ جو اسرار شریعت پر مایہ ناز تالیف ہے، آپ نے رحمۃ اللہ الواسعۃ لکھ کر شاہ صاحب کے علوم وافکار سے استفادہ کو آسان بنا دیا۔ آپ نے حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کے علوم وافکار جس کا سمجھنا اور پڑھنا اس دور میں مشکل کام ہوگیا ہے اس کی تشریح وتوضیح کا بڑا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔

تقریری وتحریری خوبیوں کے علاوہ مفتی صاحبؒ کا اصل امتیاز آپ کی تدریس ہے آپ رجال ساز تھے، آپ باکمال اور بے مثال مدرس تھے، تدریس کے باب میں آپ نے کسی کی تقلید نہیں کی تھی؛ بلکہ ایک نئے انداز کی آپ نے طرح ڈالی تھی، اس لیے کہنا چاہیے کہ آپ امام تدریس تھے، مجدد تدریس تھے، آپ کا سبق بہت مقبول ہوا کرتا تھا اور آپ نے درس کو ہر چیز پر ترجیح دی تھی، درس وتدریس آپ کا محبوب ترین مشغلہ تھا، غیر حاضری کا آپ کے یہاں تصور نہیں تھا، اور نہ ہی دیر حاضری کا، آپ کے آنے سے پہلے تمام طلبہ کا درس میں حاضر ہونا ضروری تھا، آپ کے آنے کے بعد کسی کو درسگاہ میں حاضر ہونے کی اجازت نہیں تھی اگر کسی نے ایسی غلطی کی تو اس کا خمیازہ تمام طلبہ کو جھیلنا ہوتا تھا، مفتی صاحب اس اصول کی خلاف ورزی پر سبق موقوف کر کے ناراض ہو کر گھر چلے جاتے تھے، تمام طلبہ کو مفتی صاحب کا یہ مزاج معلوم تھا۔

مجھے مفتی صاحب سے ترمذی شریف اور طحاوی شریف پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ دس سالہ زمانہ تعلیم میں کون سی کتاب ہے جس میں ایک دن کی غیر حاضری نہیں ہے تو میرا جواب ہوگا کہ ترمذی شریف میں ایک بھی غیر حاضری نہیں ہوئی، اسی زمانہ میں دارالعلوم وقف دیوبند میں محدث عصر حضرت مولانا انظر شاہ صاحب کشمیریؒ کے درس بخاری کا بڑا چرچا رہتا تھا، ان کا عالمانہ اور فاضلانہ درس ہوا کرتا تھا، ہفتم کے سال ختم بخاری کی ایک مجلس میں شریک ہو چکا تھا شاہ صاحبؒ کا خطیبانہ انداز اور محققانہ درس واقعی مسحور کن ہوا کرتا تھا آپ ابن حجرؒ کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے؛ بلکہ درس بخاری

میں شاید سب سے زیادہ نقد ابن حجر پر ہی کیا کرتے تھے، دورۂ حدیث کے سال تمنا ہوتی تھی کہ شاہ صاحب کے درس بخاری میں شریک ہوسکوں لیکن مفتی صاحب کے درس کی عظمت اس قدر دل میں پیوست تھی کہ ان کا سبق چھوڑ کر کہیں اور جانے کا سوال ہی نہیں تھا، ہاں جمعہ میں مغرب کے بعد اگر مفتی صاحب تشریف نہیں لاتے تو کبھی کبھی شاہ صاحبؒ کے درس تک رسائی ہو جاتی تھی۔

مفتی صاحب کے درس ترمذی کا انداز بڑا نرالا تھا، حدیث کی تشریح پس منظر کے ساتھ اس طرح بیان کرتے تھے کہ تعارض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، بہت سی باتیں خود بخود حل ہو جاتی تھیں، آپ مذاہب ائمہ کے اختلاف میں اس پر ضرور روشنی ڈالتے تھے کہ یہ اختلاف نص فہمی کی بنا پر ہوا ہے یا دلائل میں اختلاف کی بنا پر، اس سے بڑا اطمینان ہوتا تھا، مفتی صاحب کے سمجھانے اور بیان کرنے کا انداز نرالا تھا اور انداز میں اس قدر ٹھہراو تھا کہ ہمارے ساتھیوں میں نوے فیصد آپ کی تقریر کو بہ آسانی لکھ لیا کرتے تھے؛ بلکہ بعض صاحب ذوق تو مفتی صابؒ کی تقریر کو عربی میں قلم بند کر لیتے تھے اور مفتی صاحب کے یہاں دلائل کی بہت زیادہ فراوانی نہیں ہوتی تھی، لیکن حدیث کی ایسی فقہی تشریح کرتے تھے کہ احناف کا مسلک بہت مضبوط انداز میں نمایاں ہو جاتا تھا، بعض مرتبہ صرف احناف کے دلائل بیان کرتے تھے اور فرماتے شوافع کے دلائل انہی سے معلوم کرلو میں کیوں بیان کروں۔ مفتی صاحب کی زندگی میں علم و عمل کا بڑا توازن تھا، درس سے آپ کو غایت درجہ محبت تھی، سبق کا تسلسل اور وقت کی بڑی قدر و قیمت تھی اور ان سب پر مستزاد آپ کا خلوص، آپ کی پاکیزہ زندگی تھی جس نے آپ کے درس کو حد درجہ مقبول بنا دیا تھا۔

جن کے کردار سے آتی ہو صداقت کی مہک
ان کی تدریس سے پتھر بھی پگھل سکتے ہیں

آپ کی بعض باتیں آج بھی دل کی انگوٹھی میں نگینے کی طرح سجی ہوئی ہیں اور حسین یادوں کی طرح بسی ہوئی ہیں، آپ مطالعہ کے بہت عادی تھے، آپ نے مطالعہ کو اپنی

زندگی کی غذا بنایا تھا لیکن صرف مطالعہ کی بنا پر سبق پڑھانے کے قائل نہیں تھے؛ بلکہ آپ کی رائے تھی کہ مطالعہ کے بعد حاصل مطالعہ کو ذہن کے خانوں میں ترتیب دینا ضروری ہے اس سے تفہیم کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، آپ کا نظریہ تھا کہ کسی کتاب کو پڑھانے کے لیے شروحات کا مطالعہ کافی نہیں ہے؛ بلکہ کسی کتاب کو پڑھانے کے لیے اس فن کو پڑھنا ضروری ہے، جب آدمی فن کو پڑھ لیتا ہے تو اس کے لیے اس فن کی کسی کتاب کو پڑھانا آسان ہو جاتا ہے، آپ کا نظریہ یہ تھا کہ متون کو حفظ کرنے کا اہتمام کیا جائے اس سے فن میں درک پیدا ہوتا ہے، دارالعلوم دیوبند میں معین المدرسین کا ایک شعبہ تھا لیکن مفتی صاحب اس کے خلاف تھے ان کا نظریہ تھا کہ فن کی ابتدائی کتابیں وہ پڑھائے جس نے فن پڑھ رکھا ہو، فراغت کے بعد جو معین مدرس ہو جاتے ہیں وہ بچوں پر تجربہ کرتے ہیں ان کا مطالعہ فن کا نہیں ہوتا ہے وہ شروحات دیکھ کر پڑھاتے ہیں اس لیے طلبہ کو اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوگا۔ آپ نے گو بہت سی اردو شروحات لکھی ہیں؛ اس لیے کہ طلبہ میں عربی شروحات کو سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہوتی جا رہی ہے لیکن آپ اکثر کہا کرتے تھے کہ سو سال بھی اردو شروحات پڑھتا رہے اس کو علم نہیں آئے گا۔ آپ کہتے تھے کہ طلبہ کے تین درجات ہیں اعلی صلاحیت، ادنی اور متوسط اعلی صلاحیت کے طلبہ کو فراغت کے بعد فورا تدریس میں لگ جانا چاہیے، تکمیلات میں رہ کر اپنی صلاحیت ضائع نہیں کرنی چاہیے اور متوسط طلبہ کو تکمیلات میں رہ کر اپنی کمزوری کی اصلاح کرنی چاہیے اور کمزور طلبہ کو خدمت خلق کے میدان میں لگ جانا چاہیے اور اپنے دین کے تحفظ کے لیے ایک سال کے لیے جماعت میں چلے جانا چاہیے۔ آپ کہا کرتے تھے کہ طلبہ دو طرح کے ہیں ایک جو اپنے لیے پڑھتے ہیں اور ایک ماں باپ کے لیے پڑھتے ہیں، ماں باپ کے لیے جو پڑھنے کے لیے مدارس میں آتے ہیں وہ پڑتے ہیں پڑھتے نہیں ہیں، یعنی صرف پڑے رہتے ہیں اس لیے طلبہ کو ماں باپ کے لیے نہیں اپنے لیے پڑھنا چاہیے۔

فراغت کے بعد بھی مفتی صاحب سے گاہے بہ گاہے ملاقات ہوتی تھی، آپ کی مجلس عام طور پر علمی مجلس ہوا کرتی تھی، آپ کبھی کبھی دارالعلوم حیدرآباد میں ختم بخاری کے لیے تشریف لاتے تھے، اسی طرح جمعیۃ علماء کے مباحث فقہیہ میں بھی آپ تشریف لاتے تھے

وہاں آپ کو دیکھ کر اور آپ کی باتیں سن کر بڑی خوشی ہوتی تھی، کبھی کبھی شوال میں بھی دیوبند میں آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا تھا، مفتی صاحب اپنے قریبی شاگردوں کو ہدیہ وغیرہ بھی دیا کرتے تھے، بعض مرتبہ کوئی کتاب ہدیہ میں پیش کی جاتی تو اس پر انعام سے بھی نوازتے تھے، ایک مرتبہ میں اپنی کتاب ''امام ابوحنیفہ سوانح وافکار'' لے کر مفتی صاحب کی خدمت میں گیا، مفتی صاحب بہت دیر تک اس کے مختلف اوراق کو پڑھتے رہے اور اخیر میں فرمایا ''تمہاری اردو اچھی ہے'' یہ جملہ صرف حوصلہ افزائی کے لیے تھا، میں نے محسوس کیا ہے یہ میرے لیے بہت بڑا انعام ہے، شاید ہزار روپے سے مجھے وہ خوشی نہ ملتی جتنی مفتی صاحبؒ کے اس ایک جملے سے ہوئی تھی، مفتی صاحب سے آخری ملاقات تین ماہ قبل ہوئی تھی، مفتی اشتیاق احمد صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند سے ملاقات ہوگئی کہنے لگے کہ مفتی صاحب کے پاس جارہا ہوں تم بھی چلو تعزیت ہوجائے گی، اس وقت مفتی صاحب اپنے سمدھی کے انتقال کے بعد ممبئی سے تشریف لائے تھے اور اسی دن واپسی ہوئی تھی، اس دن کافی دیر تک آپ کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا، بارش ہورہی تھی اس لیے مغرب کی نماز بھی آپ کے گھر میں پڑھی، دارالعلوم کے بعض اساتذہ بھی تشریف فرما تھے اس موقع پر مفتی صاحب نے فرمایا میں نے اپنا بھائی کھودیا۔ یہ آخری ملاقات تھی کسے معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ثابت ہوگی۔

آخری بات لکھ کر مضمون ختم کرتا ہوں، مفتی صاحب کی زندگی کی اہم بات یہ ہے کہ آپ نے فراغت کے بعد حفظ کیا تھا اس لیے کہ مفتی صاحب سمجھتے تھے کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے قرآن کا حفظ ہونا ضروری ہے، اسی طرح آپ کی اہلیہ محترمہ نے شادی کے بعد حفظ کیا تھا، پھر امی جان نے اپنے تمام بیٹوں بیٹیوں کو اسی طرح تمام بہوؤں کو اور تمام پوتوں کو حافظ بنانے کا اہتمام کیا تھا، گویا کہ حفظ قرآن کے تعلق سے ''این خانہ ہمہ آفتاب است'' کا مصداق ہے۔

مقبول جو ہوں شاذ ہیں، قابل تو بہت ہیں
آئینہ کے مانند ہیں کم دل تو بہت ہیں

وہ جانثارِ علمِ شریعت نہیں رہا

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند

مولانا وصی اللہ قاسمی سدھارتھ نگری

الفاظ کی دنیا میں لکھنے، پڑھنے اور کہنے کے لیے تو یہ چند حروف سے مرکب ایک نام ہے؛ لیکن معانی کی دنیا میں ”بحرِ علوم کا ماہر شناور، بیش قیمت ہیرہ، نکات ومفاہیم سے پُر خزینہ صدف، تحقیق وتفہیم کا آفتابِ ضوفشاں“ سے تشریح کیجیے تو شاید شخصیت کا ایک گونہ صحیح تعارف ہوسکے۔

لیکن اب یہ روشن آفتاب غروب ہوگیا، وہ دنیا سے اس طرح رخصت ہوا کہ متعلقین ومعتقدین کے اوسان گُم ہوگئے، کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس ناگہانی اور ناقابلِ یقین حادثے کی گزند اس طرح سہنی پڑے گی، زندگی بھر علومِ شریعت کا درس دینے والا انسان جاتے جاتے بھی درس دینا نہ بھولا، پر اس مرتبہ کسی کتاب کا بیانی درس نہ تھا، کوئی علمی اشکال بھی نہیں اور نہ ہی کوئی فقہی مسئلہ، اس دفعہ درس تھا آخرت کا، دنیا کی حقیقت کا، وہ بھی عملی طور پر، کہ:

یہ دنیا کھیل ہے اور کھیل بھی ہے چند لمحوں کا
نظر جو کچھ بھی آتا ہے اسے خوابِ گراں سمجھو

درس بھی عبرت سے بھرپور، نصیحتوں کا ایک جہان لیے ہوئے، زندگی بھر جس ذخیرۂ حدیث کی زبان سے تشریح کی، آج اُسی ذخیرہ سے چُن کر ایک حدیث کی بے زبانی تشریح کی، حدیث کچھ یوں ہے:"إن الله لا يقبض العلم انتزاعًا ينتزعه من

العباد، ولکن یقبض العلم بقبض العلماء"

یقیناً آپ نے سمجھا دیا کہ دنیا سے علم کیسے رخصت ہوتا ہے؟ اور بہت خوب سمجھایا کہ عالم کی موت صرف عالم کی موت نہیں؛ بلکہ عِلم کی بھی موت ہے، اور علم کی موت تیرگی ہی ساتھ لاتی ہے، چنانچہ:

تا بہ امکانِ نظر ہے تیرگی چھائی ہوئی
تیرگی اور تیرگی بھی موت کی چھائی

آپ اپنی ساری خصوصیات سمیٹے عالمِ ایں سے عالمِ آں کی سمت کوچ کر گئے، عالمِ فنا کو چھوڑ عالمِ دوام کو اپنا مسکن بنالیا، مسکراتے ہوئے ہنستی مسکراتی دنیا کے باسی بن گئے کیونکہ دعائے نبوی "نضر الله إمرأ سمع منی مقالتی فحفظها ووعاها و أداها كما سمع " کے آپ بجاطور پر مستحق ہیں؛ پر یہاں نہ جانے کتنے ایسے ہیں جو ماہیٔ بے آب کے مانند تڑپ رہے ہیں، رو رہے ہیں، بلک رہے ہیں، یہاں فرزانوں کی ایک دنیا ہے جن کے ہاتھوں میں اب نہ شمع ہے، نہ اس کے ملنے کے آثار، ان کی زبانوں پر بار بار یہ سوال آتا ہے:

کیا ہوا اے وقت! سناٹا ہے کیوں چھایا ہوا؟
زمزمہ کیوں رک گیا ہے، تا بہ لب آیا ہوا؟

جبکہ آنکھوں کا حال اور سوال یہ ہے کہ:

حسرتِ نظارہ بن کر آنکھ وقفِ جوش ہے
کس کی رخصت ہے یہ ہم سے، کون یوں روپوش ہے؟

اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ دنیا بھر میں پھیلے معتقدین ومستفیدین کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں تو صرف وہ طلبہ ہیں جنہوں نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور اب وہ آپ سے سیکھے ہوئے نقوش کو رہنما بنائے ہوئے عملی میدان میں ہیں، انہوں نے زندگی کی نہ جانے کتنی الجھی ہوئی گتھیاں لمحوں میں اس طرح سلجھتے ہوئے دیکھا اور سنا جس کی کوئی نظیر نہیں، نہ جانے کتنے علمی اعتراضات واشکالات کا حل آپ کی زبان سے اس انداز

میں سنا جیسے یہ ابتدائی درجات کے معمولی مسائل ہوں، آپ اُنہیں سادہ، سہل اور انتہائی پروقار زبان میں تفہیم کے وہ گُر سکھا گئے جو کسی اور در پہ نہیں ملتے .... اور آج یہ ساری چیزیں خواب بن گئیں نتیجتاً وہ بزبانِ حال وقال یوں شکوہ کناں ہیں:

رہنما بن کر حدِ منزل پہ لے جائے گا کون؟
بیکسانِ راہ بتلاؤ کہ کام آئے گا کون؟

اور

ہم گمرہانِ شوق کسے دیکھنے چلیں؟
کس راستے میں نقشِ قدم دیکھنے چلیں؟

یہ سب ایک طرف اور دارالعلوم دیوبند کا دردوغم ایک طرف جہاں قدرت نے علم وفن کی وہ فضا میسر کی جس نے آپ کو زندہ جاوید بنادیا، دنیا کے کونے کونے میں آپ کا نام گونجا، دلنشیں آواز پہنچی، دارالعلوم کے مسندِ حدیث کی حالتِ زار اس پر مستزاد، جس مسند پر بیٹھ کر "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" کی وہ تشریح کی کہ آج وہ 12/ ضخیم جلدوں میں قارئین کے لیے ایک تحفہ کی شکل میں منظر عام پر ہے، اسی مسند پر بیٹھ کر ترمذی شریف کا وہ محدثانہ درس بھی دیا کہ 8/ جلدوں میں اس کی تقریر زیرکوں کی زیرکی میں اضافہ کررہی ہے، یہ تو خاص مسندِ حدیث کی بات تھی، اس کے علاہ تقریباً نصف صدی تک پورا دارالعلوم آپ کے علمی زمزموں سے ایسا گونجا ہے کہ سننے والوں کے کان حیرت میں ہیں، ان کا سوال ہے کہ:

زمزموں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ آواز اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے؟

یہ الگ بات ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں آپ اپنی اس طویل بے لوث خدمت کے متعلق برملا یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں:

رنگیں ہے ہم سے قصہ مہر و وفا کہ ہم
اپنی وفا کا رنگ ترے رخ پہ مَل گئے

آپ کی قلمی و تصنیفی خدمات ہوں یا تقریری و بیانی، ایسا نہیں کہ صرف دارالعلوم دیوبند یا ہندوستان تک ہی اس کے فیوض محدود ہوں؛ بلکہ قدرت نے سات سمندر پار تک کے افراد کو ان سے محظوظ کیا، احادیث کا درس دیا، بیانات اور تقریریں کیں، ملحدین کے جوابات دیے، انہیں قرآن وسنت کے حقیقی مقام سے آشنا کیا، ان کے سامنے اسلام کا صحیح اور سچا تعارف پیش کیا، فریضہ دعوت وتبلیغ سے بھی کنارہ کش نہ ہوئے۔

تیرے لیے تھے مشرق ومغرب بچھے ہوئے
اے نافہ بہار، دل وجاں لیے ہوئے

قدرت نے علوم کا وافر حصہ، علوم کو پیش کرنے کا سلیقہ وانداز، اور استحضار وفطانت اتنی فیاضی کے ساتھ آپ کو عطا کیے تھے کہ جہاں تشریف لے گئے وہیں علم کے جلوے بکھیر دیے، طبیعت کی ناسازی کے عالم میں دیا گیا آپ کی زندگی کا آخری بیان سوشل میڈیا پر خوب وائرل ہوا اور ہو رہا ہے، آپ فرماتے ہیں "میرے ایک عزیز ہیں ایران میں مولانا حکمت اللہ سلمہ انہوں نے فون کیا کہ آج بیان نہ کیجیے گا، میں نے کہا: نہیں، بیان ہوگا میرے ایک دوست ہیں کراچی میں، مولانا عبدالرؤوف صاحب، انہوں نے فون کیا کہ آج مختصر بیان کیجیے گا، میں نے کہا: ہاں! یہ ٹھیک ہے، بیان مختصر ہوگا" ذرا غور کیجیے کہ طبیعت سخت ناساز ہے، پھر بھی دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا جذبہ صادق نہ صرف یہ کہ برقرار ہے؛ بلکہ پُر جوش بھی، یعنی:

میں جہاں بیٹھا، وہیں میخانہ بنے

لیکن ہائے افسوس کہ آج:

وہ جانثارِ علم شریعت نہیں رہا
وہ آشنائے جادہ حکمت نہیں رہا

آپ نے اپنی زندگی میں لکھا اور بہت لکھا، پڑھا اور بہت پڑھا، محنت کی اور خوب کی، بھلا بتائیے! دارالعلوم کے زمانۂ تعلیم میں افتاء کے سال حفظِ قرآن مکمل کیا، وہ بھی صدر گیٹ کے چبوترے پر بیٹھ کر، اب اِسے قرآن پاک کے تئیں سچی محنت اور محبت نہیں تو اور کیا

کہا جائے، اتنا ہی نہیں درسیات میں لگن، مطالعہ و مذاکرہ میں دلچسپی کا یہ عالم کہ دارالعلوم میں مسجد قدیم کے پاس رہائش ہے اور دار جدید کی شکل دیکھے ہوئے کئی مہینہ کا عرصہ بیت جاتا ہے، جبکہ مسجد قدیم اور دار جدید کے مابین صرف نودرہ کی عمارت حائل ہے۔

لکھا اتنا کہ تعداد میں تو تقریباً کتابیں آپ کے قلمِ گہربار سے شائع ہو چکی ہیں جن میں تفسیر قرآن، شرح بخاری، شرحِ ترمذی، شرح حجۃ اللہ البالغہ وہ کتابیں ہیں جو بلا مبالغہ تنہا کمّاً و کیفاً سیکڑوں کتب کے قائم مقام ہیں، لکھنے پڑھنے کا یہ سلسلہ زندگی کے آخری سانس تک جاری رہا، آپ کا ایک جملہ جہاں اس حوالے سے آپ کی زندگی کا آئینہ دار ہے وہیں طالبانِ علوم نبوت کے لیے نصیحت آمیز بھی، چنانچہ موقع بموقع آپ فرمایا کرتے تھے:

پڑھو... راتوں کو جاگ کر پڑھو..... نیند قربان کرو..... دیکھو میں رات کو نہیں سوتا اور طے کرلیا ہے کہ اب قبر میں ہی ٹانگ پھیلا کر سوؤں گا۔

اللہ اکبر کبیرا۔ اگر آپ نے طلبہ کو یہ نصیحت کی، تو سب سے پہلے خود اس پر عمل کیا، واقعتاً آپ نے دنیا میں آرام نہ کیا، راتوں کی نیند کو قربان کر دیا؛ لیکن اللہ کی ذات سے امید؛ بلکہ یقین کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلا شبہ آج آپ قبر ہی میں سکون کی نیند سو رہے ہوں گے، (اللهم اجعل قبره روضة من رياض الجنه .آمین)

گویا آپ کی پوری ذات تحریک وعمل سے عبارت تھی؛ لیکن آج نہ سراپا عمل شخصیت ہے، نہ تحریکی ذات:

آئے گا کون راہ دکھانے کے واسطے
سینے میں آرزو کو جگانے کے واسطے
اٹھے گا کون سوز بڑھانے کے واسطے
اک شمعِ جاں گداز جلانے کے واسطے

اللہ رب العزت ہم سب کو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس نصیحت پر عمل کرنے والا اور آپ کے فیوض کو عام کرنے والا بنائے! آمین یارب العالمین

مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ
ایک نادرۂ روزگار فقیہ ومحدث کی رحلت

مولانا محمد عارف جیسلمیری
ناظم اصلاح معاشرہ جمعیۃ علماء لدھیانہ پنجاب

کل رات مولانا قاسم صاحب پالن پوری منیجر مکتبہ حجاز دیوبند نے واٹس ایپ کے ذریعے اپنے والد ماجد اور کئی نسلوں کے کامیاب ومثالی استاذ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ کی شدتِ علالت کی خبر دی تھی، احقر ان دنوں مالیر کوٹلہ پنجاب کے الفلاح پبلک اسکول میں کورنٹائن کی میعاد پوری کر رہا ہے اور کتابیں ہم راہ نہ ہونے کی بنا پر واٹس ایپ کی برقی تحریریں ہی زیادہ تر زیرِ مطالعہ رہتی ہیں، مفتی صاحبؒ کی علالت کی اس خبر سے دل پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوئی اور مختصر مختصر وقفے سے محض اسی نیت سے واٹس ایپ کھولا کہ مفتی صاحبؒ کی صحت کی بابت شاید کوئی تسلی بخش وامید افزا خبر موصول ہو؛ مگر ہر دفعہ مایوس کن خبریں ہی موصول ہو کر دل کی دھڑکنیں تیز سے تیز تر کرتی رہیں، خلافِ معمول دورانِ تراویح بھی ایک دو ترویحوں میں اسی نیت سے واٹس ایپ دیکھا، غرض رات کے تقریباً بارہ ایک بجے تک واٹس ایپ سے چمٹے رہنے کے بعد، اللہ کا نام لے کر بستر کا رخ کیا، آخرش صبح سات بجے کے قریب جو موبائل کھولا، تو ہر طرف سے یہ کرب ناک خبریں آرہی تھیں کہ آج بہ روز منگل بہ وقتِ اشراق استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند ممبئی کے ہسپتال میں انتقال فرما گئے، اس خبر سے ان کے ہزارہا معتقدین ومتعلقین اور شاگردان ومریدین کی طرح اس عاجز کو بھی بے حد صدمہ ہوا اور حسبِ توفیق ایصالِ ثواب کا اہتمام کیا گیا۔

اس دورِ قحط الرجال میں مفتی صاحبؒ کا وجود واقعی ایک عظیم خدائی نعمت تھا، علم و عمل کے مقامِ بلند پر فائز ہونے کے باوصف تواضع وللّٰہیت اور شفقت و ہم دردی ان کی اصل شناخت و پہچان تھی، اس راقم کو دارالعلوم دیوبند کے تین سالہ زمانۂ طالب علمی میں بارہا ان کی قیام گاہ پر حاضری کا شرف حاصل ہوا، میں نے کچھ عرصہ بیرون کوٹلہ دیوبند کی شاہ مارو مسجد میں امامت کی تھی، مفتی صاحبؒ کا مکان یہاں سے قریب ہی واقع ہے اور اس زمانے میں وہ جمعہ کی نماز کے لیے اسی مسجد میں تشریف لایا کرتے تھے، ایک دفعہ نمازِ جمعہ کے بعد انھوں نے مجھے طلب فرمایا اور جمعہ کے دوسرے خطبے کے بعض جملوں کو آئندہ نہ پڑھنے کی نصیحت فرمائی، اسی پر اکتفا نہیں فرمایا؛ بل کہ جس کتاب کے حوالے سے یہ خطبہ پیش کیا گیا تھا، باضابطہ اس کتاب کو منگوایا اور اپنے دستِ مبارک سے ان تمام جملوں پر قلم کھینچتے ہوئے فرمایا کہ مؤلفِ کتاب نے یہ چند جملیں قال رسول اللہ کے بعد ایسے لکھ دیے ہیں، جن کا اصل حدیث سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہاں باقی جملے واقعی کتبِ حدیث میں منقول ہیں، اس لیے انھیں پڑھا جائے اور قلم زد جملوں کو پڑھنے سے اہتمام کے ساتھ بچا جائے؛ تاکہ غیر حدیث کا حدیث کے ساتھ التباس نہ ہو، مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ گرمی کا زمانہ تھا اور انھوں نے صحنِ مسجد کے کنارے دھوپ ہی میں کھڑے کھڑے یہ اصلاحات و گفتگو فرمائی اور پھر پانچ دس منٹ کے بعد اپنے قدیم معمول کے مطابق وہاں موجود سائل حضرات کی مدد فرماتے ہوئے اپنے مکان کی جانب بڑھ گئے تھے۔

ان کی خدمت میں حاضری سے علمی و روحانی بہر دو اعتبار سے بڑا فائدہ ہوتا تھا، بعد العصر منعقد ہونے والی ان کی اس مجلس میں طلبہ اور علماء بہ کثرت حاضر ہوتے تھے اور ہر شریکِ مجلس حسبِ توفیق دامنِ مراد بھر واپس ہوتا تھا۔ علمی، سماجی، معاشرتی، دعوتی و تبلیغی اور ملکی و بین الاقوامی ہر طرح کے سوالات ان کے سامنے پیش ہوتے اور حضرتؒ ان کے جواب میں بڑی گراں قدر اور چشم کشا باتیں اور نصیحتیں ارشاد فرماتے۔

تدریسی و تصنیفی اور دینی و دعوتی خدمات کے علاوہ ان کی حیات کا ایک حد درجہ

نمایاں پہلو امر بالمعروف ونہی عن المنکر تھا، وہ جس چیز کو دلائل کی رو سے غلط سمجھتے، اس کی کھل کر تردید فرماتے تھے اور اس کے لیے بڑے سے بڑے مجاہدات سے بھی گریز نہیں فرماتے تھے، ان کا یہ اصول اپنوں و بیگانوں اور شناسا و غیر شناسا سب کے ساتھ یکساں طور پر نافذ تھا، مسلکِ دیوبند کے منتسبین میں در آنے والی کمیوں پر پوری صفائی سے بولنا اور مسلک و مشرب کی صیانت وحفاظت کے طریقے سمجھانا ان کا ایک لائقِ تقلید کارنامہ ہے، اس سلسلے کے واقعات ان کی مطبوعہ تقریروں وتحریروں میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں، چند سال قبل ایک لائقِ صد احترام عالمِ دین نے قرآنی آیت ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلو علیھم ایاتہ ویزکیھم الخ کی تشریح کرتے ہوئے بڑے ہی مدلل ومبرھن علمی انداز میں سیاست اور اسلام کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالی تھی اور ملک بھر سے تشریف لائے ہوئے جید علماء نے اس خطاب کو دل کے کانوں سے سنا تھا، آخر میں صدارتی خطاب کے لیے حضرت شیخ الحدیث مفتی سعید احمد صاحبؒ کو دعوتِ اسٹیج دی گئی، آپؒ نے ان مرحوم بزرگ کے خطاب کو بلند الفاظ میں سراہنے کے ساتھ ساتھ، ان سے ہونے ہولی ایک فروگذاشت سے سامعین کو آگاہ کیا، یہ عمل خاصا مشکل طلب اور صبر آزما ہے؛ لیکن امرِ واقعہ یہی ہے کہ یہ مزاج و مذاق ہمارے اسلامی معاشرے میں زیادہ سے زیادہ عام ہونا چاہیے اور اس مزاج و مذاق کے حامل افراد کی دل سے قدر کرنی چاہیے، بر سرِ منبر حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی کے اپنی معروضات پر نقد کی اجازت دینے کے واقعات میں بھی ہمارے لیے اسی جانب دعوتِ عمل ہے۔

دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد احقر نے ایک سال کے لیے تحفظِ ختمِ نبوت کے شعبے میں داخلہ لیا تھا، حضرت مفتی صاحبؒ چوں کہ کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دار العلوم دیوبند کے ناظم اعلیٰ تھے؛ اس لیے برسہا برس سے یہ نظام چلا آ رہا تھا کہ اس شعبے میں داخلے کے خواہش مند طلبہ کو تقریری وتحریری امتحان کے لیے حضرت مفتی صاحبؒ کے گھر لے جایا جاتا اور پھر حضرتؒ تحریر کے ملاحظے اور تقریر سننے کے بعد متعلقہ طلبہ کے داخلے کو منظوری عنایت فرماتے تھے، جب میں نے اس شعبے میں داخلے کی درخواست داخل کی، تو مجھے بھی اس مرحلے

سے گزارا گیا، اللہ عمر دراز فرمائے امیر الہند حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب منصور پوری دامت برکاتہم استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند و صدر جمعیۃ علمائے ہند کی، وہ ہم چند طلبہ کو بعد العصر حضرت مفتی صاحبؒ کے گھر لے گئے اور پھر حضرتؒ کی تائید و تصدیق کے بعد ہمارے داخلے کو منظوری دی گئی، اس حقیر کے لیے یہ ایک سعادت کا موقع تھا کہ اس کی شکستہ تحریر کو حضرت مفتی صاحبؒ نے ملاحظہ فرمایا اور اس کی بے ربط و ضبط لسانی معروضات کو بھی سماعت فرمایا، اس یادگار مجلس میں دونوں بزرگوں کے بیچ شعبے کی سالانہ کارکردگی پر دیر تک تبادلۂ خیال ہوا تھا اور شعبے کو مزید فعال و مستحکم بنانے پر بھی غور و خوض ہوا تھا۔

کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند کے پلیٹ فارم سے انجام دی گئیں ان کی خدمات کا ذکر ایک مستقل مقالے کا متقاضی ہے، علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی طرح ہمارے حضرت مفتی صاحبؒ بھی فتنۂ قادیانیت کی تلبیسات و دسیسہ کاریوں سے مکمل طور پر واقف و آگاہ رہے اور زمانۂ صحت میں انہوں نے تحفظ ختم نبوت و ردقادیانیت کی نسبت پر ملک کے دور دراز کے متفرق علاقوں کے اسفار بھی فرمائے، انھوں نے یہ اہم کام مکمل احساسِ ذمے داری کے ساتھ انجام دیا اور مجلس شوری کی پیش کش کے باوجود اس اضافی خدمت کے عوض ایک پیسہ بھی دارالعلوم سے وصول نہیں فرمایا؛ جب کہ آپؒ کثیر العیال شخص تھے اور خود اپنے بیان و اعتراف کے مطابق ان کی اقتصادی پوزیشن اس زمانے میں اس درجہ کم زور تھی کہ دارالعلوم سے ملنے والی تنخواہ اخراجات کے تناسب سے کم پڑ جاتی تھی اور تقریباً ہر مہینے کے آخر میں انھیں ضروری اخراجات کی تکمیل کے لیے قرض لینا پڑتا تھا، جب بہ تدریج وہ آزمائشی دور رخصت ہوا اور مکتبہ حجاز دیوبند کے قیام کے بعد مالی حالات لائقِ رشک بنے تو آپؒ نے جامعہ اشرفیہ راندیر سورت اور دارالعلوم دیوبند سے لی ہوئی وہ تمام تر تنخواہیں بھی متعلقہ اداروں کو واپس کر دیں۔

فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ کی تحریک پر ۱۹۷۶ عیسوی میں دارالعلوم دیوبند میں تحفظ ختم نبوت کے عنوان سے ایک عالمی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا

تھا، مفتی صاحبؒ اس کانفرنس کے خصوصی مقررین میں سرِ فہرست تھے اور کانفرنس کی نتیجہ خیزی وکام یابی میں اس دور کے دیگر اکابر کے علاوہ آپؒ کے دوررس مشوروں اور ان کی مثبت تجاویز کا اساسی حصّہ رہا تھا، اس کانفرنس کے موقع پر کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کے نام سے دارالعلوم دیوبند میں ایک مستقل شعبے کا قیام عمل میں آیا اور بہ اتفاق آرا حضرت مفتی سعید صاحب اس کے ناظم اعلیٰ منتخب ہوے اور دنیا بھر میں اس انتخاب کو سراہا گیا، یہ شعبہ اپنے ناظمِ اعلیٰ حضرت مفتی سعید صاحبؒ اور ناظم حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب منصور پوری مدظلہم کی زیرِ نگرانی، شروع دن سے اپنے اہداف ومقاصد کی تکمیل میں سرگرمِ عمل ہے، مظاہر علوم سہارنپور اور دارالعلوم دیوبند سمیت ملک وبیرونِ ملک تحفظ ختم نبوت کے محاذ پر زریں خدمات انجام دینے والے مبلغین ومقررین کی ایک بڑی تعداد ہے، جس نے اس شعبے سے تربیت حاصل کی، ناظم اعلی، ناظم اور دیگر منتظمینِ دارالعلوم کے مشورے سے اس شعبے کے تحت ملک بھر میں بے شمار تربیتی کیمپ منعقد کیے جاچکے ہیں، جن میں حضرت مفتی سعید صاحبؒ اور فاتحِ قادیانیت مولانا محمد اسماعیل صاحب کٹکیؒ جیسے جلیل القدر اکابر علماء پورے اہتمام کے ساتھ شریک ہوتے رہے ہیں اور یقیناً یہ ان کی جہدِ مسلسل اور ان کے خلوص وللّٰہیت کا نتیجہ ہے کہ آج ملک کے ہر صوبے میں ایسے افراد واشخاص موجود ہیں، جنھوں نے تحفظِ ختم نبوت و ردقادیانیت کو اپنی زندگی کا اصل مشن بنایا ہوا ہے اور جن کی خدمات کے اثر سے قادیانیت کا غلیظ چہرہ قریب قریب ہر جگہ بے نقاب ہو چکا ہے۔

مفتی صاحبؒ نے اس میدان میں لسانی وقلمی دونوں اعتبار سے بھرپور حصّہ لیا، ۱۴۰۹ ہجری میں دارالعلوم دیوبند کی جانب سے تحفظ ختم نبوت کے موضوع پر دس روزہ تربیتی کیمپ منعقد کیا گیا تھا، جس میں زیادہ تر بیانات مولانا اسماعیل صاحب کٹکیؒ کے ہوے تھے، آخری روز کی آخری نشست میں مفتی سعید صاحبؒ کا خطاب ہوا تھا، جس میں قادیانیت کا تعارف اور اس کے تعاقب کا طریقہ شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، بیان کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے اسی وقت ٹیپ ریکارڈ سے نقل کر کے، کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت نے شائع

کر دیا تھا اور ''مسئلۂ ختم نبوت اور قادیانی وسوسے'' کے نام سے اب تک اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، جو اس کی عنداللہ وعندالناس مقبولیت کی دلیل ہیں۔ ۱۴۱۰ ہجری میں دارالعلوم میں منعقدہ دوسرے تربیتی کیمپ میں بھی مفتی صاحبؒ بہ نفسِ نفیس شریک رہے تھے اور حاضرین کو آپؒ کے بیانات سے بڑا نفع ہوا تھا، اس دوسرے کیمپ میں اصل مربی کی حیثیت سے پاکستان سے حضرت مولانا منظور احمد صاحب چنیوٹیؒ تشریف لائے اور انھوں نے اس موضوع پر کئی قیمتی محاضرات پیش فرمائے تھے، اس کیمپ کے اختتام پر حضرت چنیوٹیؒ کے افادات کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی بات سامنے آئی، تو یہ اہم کام بھی حضرت چنیوٹیؒ اور حضرت مفتی سعید صاحبؒ کی رہنمائی میں مفتی محمد سلمان صاحب منصور پوری دامت برکاتہم نائب مفتی واستاذِ حدیث جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد نے انجام دیا، کتاب کے شروع میں مفتی صاحبؒ کا معلوماتی پیش لفظ شامل ہے، کتاب کا نام ''ردمرزائیت کے زریں اصول'' بھی مفتی صاحبؒ ہی کا تجویز فرمودہ ہے، کتاب میں چند مقامات پر ترمیم بھی حضرت مفتی صاحبؒ کے قلم سے کی گئی ہے، یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک لاجواب کتاب ہے اور دنیا بھر میں ہر مبلغِ تحفظ ختم نبوت کے لیے خاصے کی چیز بنی ہوئی ہے۔ اس موضوع پر پمفلٹ بھی مفتی صاحبؒ کے قلم سے نکلے اور عوام وخواص میں وقعت و پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے، اس سب کے علاوہ علمی خطبات اور آپ کی دیگر تصانیف میں بھی اس عنوان پر بڑا قیمتی ذخیرہ موجود ہے۔ اللہ کی شان کہ اپنے آخری خطاب میں بھی وہ امت مسلمہ کو ایمان بالغیب و عقیدۂ ختم نبوت کی اہمیت کے ساتھ ساتھ فتنۂ قادیانیت کے دجل وفریب سے آگاہی دے کر اس فانی دنیا سے رخصت ہوے۔

قادیانیت کے علاوہ دنیا بھر میں جتنے ایسے فرقے و فتنے ہیں، جو شریعتِ محمدیہ سے کسی بھی اعتبار سے مزاحم ومتصادم ہیں، ان سب پر حضرتؒ کی بڑی گہری نظر تھی اور وہ وقتاً فوقتاً ان کا رد بھی فرماتے تھے۔

مفتی صاحبؒ کا شہرۂ آفاق ملکۂ تدریس، ان کی بے پناہ تفہیمی صلاحیت اور حدیث

وفقہ پر ان کی کامل و مکمل دسترس علمی و دینی دنیا میں معروف و مسلم ہے اور زیادہ تر آپ کے تعارف میں ان چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے؛ لیکن حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ ان کی ذات و شخصیت اس تعارف سے کہیں بلند تھی، مہمان نوازی، صلہ رحمی، دور قریب کے رشتے داروں کا مکمل خیال اور بہ وقتِ ضرورت ان کی مالی معاونت، اولاد واحفاد اور برادران و متعلقین کی تعلیم و تربیت کی بھرپور کوشش، اوقاتِ زندگی کی مکمل حفاظت، مشتبہ ذرائع آمد سے احتراز، مسلک و مشرب پر تصلب کی حد تک استقامت، حلقۂ بیعت میں شامل سینکڑوں مریدین کی اصلاح و تربیت، قرآن کریم کی تلاوت و تفہیم اور اس کی تشریح و تفسیر سے عشق کی حد تک تعلق؛ یہ اور اس جیسے متعدد عناوین ہیں، جن کے تفصیلی ذکر کی حاجت مستقل سوانح حیات ہی سے پوری ہو سکے گی، وہ حفاظ وقراء اور علماء ومفتیان اور مقررین و مصنفین سے بھرا پرا ایک لائقِ رشک خاندان چھوڑ گئے ہیں، امید ہے کہ ان کی مسقل سوانح عمری کا جلد ہی فیصلہ لیا جائے گا اور پوری ملت کی جانب سے یہ فرضِ کفایہ ادا کیا جائے گا۔ وہ صحیح معنوں میں مجموعۂ علوم وفنون تھے اور اسلامی علوم پر انھیں اعلیٰ درجے کا عبور حاصل تھا، شاید ہی کوئی دینی و علمی گوشہ ایسا ہوگا، جس پر انھوں نے بولا یا لکھا نہ ہو۔ علوم ولی اللّٰہی و نانوتوی کی تسہیل و تشریح کا کام مختلف اہلِ علم نے انجام دیا اور ان سب حضرات کی اس سلسلے کی کوششیں بڑی قابلِ قدر ہیں؛ مفتی صاحبؒ اس طبقے کے ایسے مثالی فرد ہیں، جنھوں نے شاہ ولی اللہ اور حضرت نانوتوی کی کتب و افادات کو زمانی اسلوب عطا کیا اور عہدِ حاضر کی علمی و دینی برادری کی سطح سے قریب تر رہ کر آپؒ نے ان اکابر کی کتب پر ایسی جامع تعلیقات یا عربی و اردو شروح قلم بند فرمائیں، جنھیں عالمِ اسلام میں قبولِ عام حاصل ہوا اور جن سے افادے و استفادے کا دائرہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے روز افزوں ہے۔ یہ تاثراتی مضمون آپ کی کتب پر تبصرے اور ان کے تعارف کا ظاہر ہے متحمل نہیں ہے؛ تاہم رحمۃ اللہ الواسعۃ کے شائع ہونے پر، دارالعلوم دیوبند کی جانب سے ان کے نام جو تہنیتی خط جاری ہوا، اسے یہاں درج کیا جاتا ہے کہ اکابر علماء کی نظر میں آپ کے مقامِ بلند کا پتہ لگانے کے لیے یہ مکتوب ایک عظیم تر شہادت ہے۔

مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب بجنوری قدس سرہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند آپ کے نام رقم طراز ہیں:

الجامعۃ الاسلامیۃ دارالعلوم دیوبند (الھند)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی ومحترمی حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجلس شوری منعقدہ ۱۳/۱۴۔ صفر المظفر ۱۴۲۵ ہجری کی منظور شدہ تجویز کا متن ارسالِ خدمت ہے۔

تجویز ۵ بہ اجازت صدر:

دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز استاذ حدیث حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدکم نے مسند الہند حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی شاہکار تصنیف حجۃ اللہ البالغہ کی تشریح وتوضیح بنام "رحمۃ اللہ الواسعۃ" کا جو عظیم کارنامہ انجام دیا ہے، مجلس شوری مولانا موصوف کو اس عظیم علمی خدمت پر مبارک باد پیش کرتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس شجر طوبی کے اصل اصیل ہیں، جس کے برگ و بار اکابرِ دیوبند اور منتسبین دارالعلوم دیوبند ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کی اس عدیم المثال تصنیف کی عظمت کا اعتراف کرنے کے باوجود اس سے استفادہ علماء کرام کے لیے بھی سہل نہ تھا۔

حضرت مفتی صاحب نے پوری جماعت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے اور پوری جماعت کی طرف سے شکریہ وتحسین کے مستحق ہیں۔

اللہ تعالی مولانا موصوف کی عمر میں برکت عطا فرمائیں اور ان کے ذریعہ دارالعلوم اور پوری امت کو فیض یاب فرمائیں۔

مرغوب الرحمٰن عفی عنہ

مہتمم دارالعلوم دیوبند...... ۱۲۔۔۲۔۔۱۴۲۵ ہجری

باتیں ان کی یاد رہیں گی

مفتی صاحبؒ کی طبیعت میں ہلکا پھلکا مزاح بھی شامل تھا، جس کا اظہار دورانِ درس بھی ہوتا تھا اور زیادہ تر آپ کی بعد العصر کی مجلس میں یہ چیز دیکھنے کو ملتی تھی، ایک دفعہ نمازِ عصر کے معاً بعد میں حاضرِ خدمت ہوا، تو آپؒ کے دو معصوم پوتے آپ کی گود میں کھیل رہے تھے اور آپ ان سے پیار بھری باتیں کر رہے تھے، جب آپؒ لیٹ گئے اور میں نے آپ کے پاؤں دبانا شروع کیے، تو وہی دونوں پوتے اندر سے پھر دوڑے ہوئے آئے اور آپؒ سے چمٹ گئے، اس وقت مفتی صاحبؒ کے ہنسنے اور اپنے پوتوں سے پیار کرنے کا منظر جیسے آج بھی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے، اللہ تعالی نے انھیں بڑے رعب داب سے نوازا تھا، ہر کہ و مہ ان سے گفتگو کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا؛ لیکن احقر کے چند رفقائے درس اس کلیے سے کافی حد تک مستثنی تھے، جنھیں دیکھ کر مفتی صاحبؒ کی طبیعت کھل اٹھتی تھی، ایک رفیق یوپی کے کسی ضلع کے باشندے تھے، جن کا نام و مقام اب محفوظ نہ رہا، وہ ملکی و عالمی اہم خبریں مفتی صاحبؒ کو سنایا کرتے تھے، مفتی صاحبؒ اپنی مجلس میں انھیں دیکھ کر مسکراتے ہوئے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مجھے تو روزمرہ کی خبریں پڑھنے کی فرصت نہیں، البتہ یہ میرا اخبار ہے، جو روزانہ آکر ساری اہم خبریں مجھے سناجاتا ہے۔ دوسرے رفیقِ گرامی مولانا عبدالوحید جیسلمیری حال مقیم پونے مہاراشٹر تھے، جو احقر سے پہلے ایک عرصے تک مسجد شاہ مارو کے امام رہے تھے، آپؒ ان سے کافی بے تکلف تھے، رفیق محترم شروع شروع میں کتاب دیکھ کر جمعہ کا خطبہ پڑھا کرتے تھے، مفتی صاحبؒ نمازِ جمعہ یہیں ادا فرمایا کرتے تھے اور ہر جمعہ کو وہ ہمیں کوئی نا کوئی نصیحت بھی فرمایا کرتے تھے، ممکن ہے ان کا یہ معمول قدیم سے چلا آرہا ہو اور ہم سے پہلے کے اس مسجد کے ائمہ و مؤذنین کو بھی ان کے ملفوظات و ارشادات سے استفادے کا شرف حاصل ہوا ہو، ایک دفعہ نمازِ جمعہ کے بعد رفیق محترم مولانا عبدالوحید جیسلمیری کو بلایا اور فرمایا کہ آئندہ جمعہ کو کتاب دیکھ کر خطبہ پڑھا، تو میں اپنی اس چھڑی سے تیری اچھی طرح مرمت کر ڈالوں گا اور یہ بھی فرمایا کہ آئندہ جمعہ کو میں منبر کے سامنے مؤذن کی جگہ پر بیٹھوں گا

اور میری اس بات کی عدمِ تعمیل کی صورت میں تنبیہ کا یہ عمل وہیں سب کے سامنے انجام پائے گا، رفیقِ محترم نے لگ لگا کر ہفتے بھر میں دو طویل خطبے اچھی طرح یاد کیے اور آنے والے جمعہ کو بہت اچھے انداز میں خطبہ پیش کیا، جمعہ کے بعد مفتی صاحبؒ نے خوشی کا اظہار فرمایا اور اپنی چھڑی کی طرف اشارہ کر کے ہنستے ہوئے فرمایا کہ یہ سب کچھ یاد کرا دیتی ہے، خطبہ تو معمولی چیز ہے، یہ تو تجھے قرآن کا حافظ بھی بنا ڈالے گی۔

ایک دفعہ رفیق محترم نے عصر کے بعد ان سے اپنے دو خوابوں کا ذکر کیا، ایک خواب پہاڑ پر چڑھنے سے متعلق تھا، جس کے جواب میں حضرتؒ نے فرمایا کہ یہاں پڑھنے آیا ہے یا پہاڑ پر چڑھنے آیا ہے اور مجلس زعفران زار بن گئی۔ رفیق محترم نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی غرض سے ”قل سیروا فی الارض“ قرآنی آیت کا یہ حصہ تلاوت کیا، تو آپؒ خوب ہنسے اور پھر ازراہِ مزاح فرمایا کہ یہ چیزیں اوالابصار کے لیے ہیں اور قرآن میں ”فاعتبروا یا اولی الابصار“ فرمایا بھی گیا ہے، تجھ جیسے بے وقوفوں کے لیے تھوڑی ہیں۔

دوسرا خواب یہ تھا کہ مفتی صاحبؒ نے اپنے گھر پر ایک لمبی چوڑی دعوت کر رکھی ہے اور دو بڑے بڑے پانی کے ڈرم رکھے ہیں، جن میں رفیقِ محترم نے اعلی درجے کا شربت بنایا ہے اور دسترخوان پر موجود مہمانوں کو پلا رہے ہیں، مفتی صاحبؒ فرمانے لگے کہ اس خواب کی تعبیر تو بعد میں کسی وقت بتائی جائے گی، فی الحال ایسا ہے کہ تو روز میرے یہاں آ جایا کر، جب تو آتا ہے، تو میں اپنی دن بھر کی ساری تکان بھول جاتا ہو۔ واقعی عجب معاملہ تھا، رفیقِ محترم پر نظر پڑتے ہی حضرتؒ کے چہرے بشرے سے مسرت کے آثار ظاہر ہو جاتے تھے اور مجلس کے آخر تک آپؒ بڑی بے تکلفی کے ماحول میں اپنے ملفوظات سے حاضرین کو محظوظ و مستفید فرماتے تھے۔ فراغت کے تین چار سال بعد جب آپؒ کے یہاں حاضری ہوئی، تو رفیقِ محترم سے فرمانے لگے کہ تمہارا وہ دسترخوان والا خواب آج شام کو شرمندۂ تعبیر ہوگا، شام کو آ جائیو، میرے یہاں تیری دعوت ہے، چناں چہ متعینہ وقت پر رفیقِ محترم حضرت

الاستاذؒ کے گھر حاضر ہوے اور حضرتؒ نے اپنے پاس بٹھا کر کھانا کھلایا اور فرمانے لگے تمہارے زمانۂ طالب علمی کے اس خواب کی یہ ہے تعبیر اور دسترخوان پر رکھے پانی کے دو جگوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ انھیں وہ دو ڈرم تصور کر لیجیے، جن میں شربت بنا کر تم نے میرے مہمانوں کو پلایا تھا۔ راجستھان نہ آنے کا شکوہ کیا گیا، تو فرمایا کہ مغربی راجستھان کے مدارس والوں کی جانب سے اب تک کوئی دعوت موصول نہ ہو سکی، ورنہ میں تو سال میں دو مرتبہ پالن پور جاتے اور وہاں سے آتے ہوے راجستھان ہی سے گزرتا ہوں۔

حضرت الاستاذؒ اگرچہ عالم بالا کے سفر پر چلے گئے، جہاں سے واپسی کا کوئی امکان وگمان نہیں؛ لیکن ان کے علمی احسانات اور ان کی یہ حسیں یادیں و باتیں انھیں ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رکھیں گی اور حسبِ توفیق ان کے لیے ایصالِ ثواب و دعائے مغفرت کا سلسلہ بھی ان شاء اللہ جاری رہے گا۔

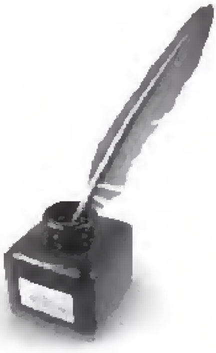

حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری

کچھ یادیں کچھ باتیں

مفتی محمد جاوید قاسمی باولوی......استاذ حدیث جامعہ بدر العلوم گڑھی دولت

۱۹۹۷ء کا سن تھا اور ہمارا عربی اول کا سال، مدرسہ امداد العلوم خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون میں ہم زیر تعلیم تھے، جب ہم نے محدثِ کبیر، فقیہ عصر، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری نور اللہ مرقدہ کا پہلی مرتبہ ذکر خیر سنا، ہمارے نحو میر کے استاذ حضرت مولانا مزمل صاحب دیناج پوری نئے نئے دار العلوم دیوبند سے فارغ ہو کر آئے تھے، وہ دورانِ درس دار العلوم دیوبند اور وہاں کے اساتذہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ دار العلوم میں حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری جب سبق پڑھاتے ہیں، کوئی بھی طالب علم غیر حاضر نہیں رہتا، سب طلبہ ہمہ تن گوش ہو کر سبق سنتے ہیں، ان کا سبق پڑھانے اور سمجھانے کا انداز ایسا دل نشیں ہے کہ دار الحدیث کے پاس سے جو بھی گذرتا ہے، خواہ پڑھا لکھا آدمی ہو یا ان پڑھ، رک کر ان کا سبق ضروری سنتا ہے۔ یہ حضرت مفتی صاحب کی عظمت، محبوبیت اور مقبولیت کا پہلا نقش تھا جو ہمارے دل پر اُس وقت قائم ہوا جب ہم عربی اول کے طالب علم تھے۔

۲۰۰۱ء میں ہم دار العلوم میں عربی ششم میں داخل ہوئے، ہماری درس گاہ (ششم ثانیہ) دنیا بھر میں دار العلوم کی شناخت بننے والی سرخ دار الحدیث کے برابر میں تھی درمیان میں صرف ایک راہ داری حائل تھی، حضرت مفتی صاحب کا دورہ میں تیسرا گھنٹہ تھا جب ہمارا تیسرا گھنٹہ خالی ہوتا یا استاذ محترم کے آنے میں دیر ہوتی، کبھی کبھی ہم دار الحدیث کے دروں میں بیٹھ کر حضرت مفتی صاحب کے سبق میں شریک ہو جایا کرتے تھے۔

۲۰۰۳ء میں ہم دورہ حدیث میں پہنچے، تو باضابطہ حضرت مفتی صاحب سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، اگرچہ ہفتم کے شش ماہی اور سالانہ دونوں امتحانوں میں اس حقیر کی دوم پوزیشن تھی؛ مگر مسندِ درس کے برابر میں دائیں جانب بیٹھنے کی جگہ ملی، اس وقت اگلی تپائیوں پر اوسط کے اعتبار سے بیٹھنے کا نظام نہیں تھا، پہلے دن جس کو جہاں جگہ مل جاتی وہی پورے سال کے لیے اس کی نشست گاہ متعین ہو جاتی۔ حضرت مفتی صاحب سے ”جامع ترمذی جلد اول“، ”علل الترمذی الصغیر“، اور ”شرح معانی الآثار“ (کتاب الطہارۃ) پڑھنے کا موقع ملا، تیسرے گھنٹے میں اور مغرب بعد سبق ہوتا تھا۔ حضرت مفتی صاحب کے درس کو اللہ تعالی نے بڑی مقبولیت اور نمایاں خصوصیات سے نوازا تھا۔

- جو طلبہ محنتی اور پڑھنے کے شوقین ہوتے تھے وہ تو آپ کے سبق کی پابندی کرتے ہی تھے؛ مگر جو طلبہ گھومنے پھرنے، ہوٹل بازی اور فضول کاموں میں وقت گزارنے کے عادی ہوتے اور امتحان میں کسی طرح پاس ہونے ہی کو کامیابی کی معراج سمجھتے تھے، وہ بھی اہتمام سے آپ کے سبق میں حاضر ہوتے تھے۔
- حضرت مفتی صاحب کی عادت شریفہ تھی کہ جس دن درس گاہ میں طلبہ کم ہوتے آپ ناراض ہو کر واپس تشریف لے جاتے، اس دن سبق نہ پڑھاتے، عصر بعد طلبہ ترجمان کے ساتھ حضرت کے مکان پر جا کر معافی طلب کرتے، تو آپ بعد مغرب سبق پڑھانے کے لیے تشریف لاتے۔ عموماً ہر سال ایک سے زائد بار اس کی نوبت آجاتی تھی۔
- آپ وقار کے ساتھ دارالحدیث میں تشریف لاتے، مسند درس کے سامنے کھڑے ہو کر بلند آواز سے طلبہ کو سلام کرتے، تھوڑا آگے جھک کر وقار کے ساتھ مسند پر بیٹھتے، وقار کے ساتھ بولتے، جس حالت میں شروع میں ایک بار بیٹھ جاتے، عموماً پورے سبق میں اسی حالت پر بیٹھے رہتے، دورانِ درس آپ کو پہلو بدلتے ہوئے کم ہی دیکھا گیا۔
- آپ کا درس بے فائدہ تکرار، غیر ضروری کلام اور غیر متعلق باتوں سے پاک ہوتا تھا۔ درس میں آپ کا کوئی خاص تکیہ کلام بھی نہیں تھا۔ ہاں! جب دارالحدیث میں آکر مسند

درس پر بیٹھتے یا کبھی پہلو بدلتے تو لا الہ الا اللہ ضرور کہا کرتے تھے۔

- سبق ہوتا یا اصلاحی بیان، وعظ و نصیحت ہوتی یا علمی بحث، اس کا دورانیہ کم ہوتا یا زیادہ، آپ کی آواز اور بولنے کا انداز ہمیشہ یکساں رہتا تھا۔ بسا اوقات آپ کے درس کا سلسلہ دو گھنٹے تک جاری رہتا؛ لیکن آواز اور لب و لہجے میں کوئی فرق نہ آتا۔
- ”جامع ترمذی“ کا درس شروع کرنے سے پہلے، آپ ایک تفصیلی مقدمۃ العلم بیان فرمایا کرتے تھے، جس میں وحی کی اقسام، حدیث کے وحی ہونے کے دلائل، حجیتِ حدیث، نبی ﷺ کے اجتہاد اور خواب کے وحی ہونے کا ثبوت، اجماع و قیاس کی حجیت، تدوینِ حدیث، کتبِ ستہ کے مصنفین کا زمانہ، تقلید شخصی کی ضرورت و اہمیت، مصنفات حدیث کی اقسام، مراتبِ جرح و تعدیل، صحاح ستہ کے رواۃ کے طبقات جامع ترمذی کا پورا نام، وجہ تسمیہ، امام ترمذی کے مختصر حالات، صحاح ستہ میں درج احادیث کی اجمالی اقسام، حدیث اور فن حدیث کی تعریف، موضوع اور غرض و غایت جیسے اہم مباحث تفصیل کے ساتھ بڑے دل نشیں پیرایہ میں بیان فرمایا کرتے تھے۔
- ”جامع ترمذی“ کے آخر میں امام ترمذی کی ”کتاب العلل الصغیر“ لگی ہوئی ہے جو دراصل ”جامع ترمذی“ کا مقدمہ لاحقہ ہے، جس میں امام ترمذی نے اپنی سنن کے متعلق سولہ باتیں بیان کی ہیں، حضرت مفتی صاحب کتاب شروع کرنے سے پہلے اسے بھی اہتمام سے پڑھاتے تھے۔
- جب کتاب شروع کرنے کا وقت آتا، تین حصوں میں تقسیم کر کے امام ترمذی تک اپنی پوری سند بیان فرماتے۔
- آپ کا درس نہایت جامع، مرتب اور عام فہم ہوتا تھا، اللہ تعالی نے آپ کو افہام و تفہیم اور اپنی بات سامعین کے دلوں میں اتارنے کا ایسا منفرد انداز اور خاص ملکہ عطا فرمایا تھا کہ آپ کے درس میں مشکل سے مشکل مباحث بھی آسان معلوم ہوتے تھے، غبی سے غبی طالب علم بھی آپ کے درس میں کتاب فہمی سے محروم نہیں رہتا تھا؛ بلکہ اگر کوئی عام آدمی بھی

سبق میں شریک ہو جاتا، وہ بھی آپ کا سبق سمجھ لیا کرتا تھا۔ آپ پڑھاتے نہیں تھے؛ بلکہ گھول کر پلاتے تھے۔

- آپ ہر مضمون کو چاہے وہ آسان ہوتا یا مشکل، ایسے خوب صورت انداز اور اہمیت سے بیان فرماتے کہ سامعین اس کو پورے انہماک، کامل دھیان اور مکمل توجہ سے سنتے، انھیں ایسا لگتا کہ جیسے آج پہلی بار یہ بات سنی ہے۔
- آپ کے یہاں درس کو ہر چیز پر اولیت حاصل تھی، تعلیمی اوقات میں سفر نہ فرماتے، جلسوں، اجتماعات اور عام پروگراموں میں شرکت سے گریز فرماتے، آپ کا درس پورے سال پابندی سے ہوتا تھا، گھنٹہ لگتے ہی درس گاہ میں تشریف لے آتے، اس کی پرواہ کیے بغیر کہ بات پوری ہوئی یا نہیں، گھنٹہ ختم ہوتے ہی سبق مکمل کر دیتے، دوسرے استاذ کا وقت نہ لیتے۔
- عام طور پر مدارس میں یہ ہوتا ہے کہ دورۂ حدیث میں شروع سال میں ہر حدیث پر تفصیلی کلام کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے سبق کی مقدار بہت کم ہوتی ہے اور آخر سال میں سرد اً کتاب پوری کرا دی جاتی ہے؛ لیکن حضرت مفتی صاحب کے درس کی یہ خصوصیت تھی کہ آپ کے یہاں پورے سال سبق کی رفتار ایک سی رہتی تھی، جتنا کلام شروع سال میں ہوتا اتنا ہی آخر سال میں بھی ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے آپ کے درس کا سلسلہ اکثر شعبان تک جاری رہتا تھا۔
- اختلافی مسائل میں ائمہ کے مذاہب، دلائل اور مذہبِ حنفی کی وجوہِ ترجیح بیان کرتے ہوئے، اعتدال، انصاف اور حق پسندی کا دامن کبھی نہ چھوڑتے، اس طرح کے مسائل میں مناظرانہ انداز کے بجائے آپ پر ہمیشہ مجتہدانہ رنگ غالب رہتا، اختلاف کے ساتھ وجہ اختلاف بھی لازماً بیان فرماتے، یہ ضرور بتاتے کہ زیر بحث مسئلے میں اختلاف نص فہمی کی وجہ سے ہوا ہے یا دلائل کے اختلاف کی وجہ سے۔
- سال کے آخر میں کتاب کے اختتام کے موقع پر آپ کی نصائح بھی بڑی اہم، مفید

اور کارآمد ہوتی تھیں، جن کی روشنی میں ہر فاضل اپنے تابناک اور روشن مستقبل کی بنیاد رکھ کر کامیابی کی منازل طے کرتا ہوا دینی، دنیوی، علمی، عملی ترقی کے بامِ عروج تک پہنچ سکتا تھا۔ ان پر عمل کرکے کامیاب مدرس، بافیض مبلغ اور بہترین مصنف ومؤلف بننے کی راہ ہموار ہوتی تھی۔

- درس میں اگر کسی طالب علم کو کوئی اشکال پیش آتا، تو وہ پرچی لکھ کر ترجمان کے پاس بھیج دیتا، جب مفتی صاحب سبق پڑھا کر فارغ ہوتے، ترجمان وہ پرچیاں آپ کو دے دیتا آپ گھر جا کر ان کو دیکھتے، جو اشکال اہم اور لائقِ جواب ہوتا، اگلے وقت میں سبق شروع کرنے سے پہلے اس کا جواب دیتے۔
- اس عاجز نے بھی دورہ حدیث کے سال متعدد بار اشکالات کی پرچیاں لکھیں حضرت نے نہ صرف یہ کہ ان کے تشفی بخش جوابات دیے؛ بلکہ بندے کے بعض اشکالات کو سراہا بھی، ایک بار فرمایا کہ “ایک طالب علم نے ایک اشکال کیا ہے، اس کا ابھی اجمالی جواب دے رہا ہوں، اسے صرف وہی سمجھے گا، تم نہیں سمجھو گے، اس کا تفصیلی بیان آگے آئے گا، وہاں تم بھی اس بحث کو سمجھ سکو گے۔”
- بندہ کی عادت مطالعہ کرکے سبق پڑھنے کی رہی ہے، ترمذی کے اگلے سبق کے مطالعہ میں “العرف الشذی”، “تقریر ترمذی حضرت شیخ الہند”، “الکوکب الدری” اور حاشیہ کے علاوہ رواۃ کے بنیادی حالات اور درجہ جاننے کے لیے “تقریب التہذیب” بھی مطالعہ میں رہتی تھی، ایک بار اگلا سبق دیکھتے ہوئے ایک جگہ مجھے شبہ ہوا کہ یہاں سند میں سقطہ ہے کوئی راوی ساقط ہوگیا ہے، میں انتظار میں رہا کہ شاید حضرت مفتی صاحب اس پر سبق میں روشنی ڈالیں گے، لیکن جب حضرت نے وہ روایت پڑھائی تو اس حوالے سے کچھ نہیں فرمایا میں نے پرچی لکھ دی کہ سند کے راویوں کے سنینِ ولادت و وفات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سند میں کوئی راوی ساقط ہے؟ مغرب بعد مفتی صاحب نے آکر فرمایا کہ “ایک طالب علم نے پرچی لکھی ہے، وہ کہتا ہے کہ یہاں کوئی روای ساقط ہے، وہ ٹھیک کہتا ہے، یہاں

فلاں راوی ساقط ہے، یہ کتابت کی غلطی ہے، ہندوستانی نسخے میں بہت اغلاط ہیں، میں تمہیں کہاں تک بتاؤں!!''

- قراءت خلف الامام کے مسئلے میں آپ نے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے حوالے سے یہ بیان کیا کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک امام واسطہ فی العروض ہوتا ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک واسطہ فی الثبوت، مفتی صاحب نے اس کی جو تفصیل بیان کی اُس پر مجھے اشکال ہوا، میں نے اپنا تفصیلی اشکال لکھ کر جو کاپی کے مکمل ایک صفحے پر مشتمل تھا، ترجمان (بھائی مفتی خلیل الرحمان برنی) کے توسط سے حضرت کو دیا، مغرب بعد جب سبق پڑھانے کے لیے تشریف لائے تو فرمایا کہ ''ایک طالب علم نے ایک صفحہ کا اشکال لکھ کر دیا ہے، وہ امام کے واسطہ فی الثبوت یا واسطہ فی العروض ہونے کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہے، میں نے اسے پڑھے بغیر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا، مجھے اتنی فرصت کہاں؟ کہ اتنی لمبی تحریر پڑھوں، اسے اگر کوئی اشکال ہے تو عصر بعد میرے گھر آئے، وہاں اپنا اشکال بتائے، جواب دوں گا۔'' لیکن یہ میری حرماں نصیبی رہی کہ میں عصر بعد بالمشافہ حضرت کے سامنے اپنا اشکال پیش کرنے کی ہمت نہ کرسکا۔

یہ حقیقت ہے کہ حضرت مفتی صاحب نہایت مشغولیت اور یکسوئی کی زندگی گذارنے کے عادی تھے، آپ نے خود کو ایک نظام الاوقات کا پابند بنایا ہوا تھا، آپ کے یہاں ہر کام کا ایک وقت مقرر تھا، اس میں صرف وہی کام کرتے تھے۔ عصر کے بعد آپ کی مجلس لگتی تھی، جس میں اکثر طلبہ اور علماء ہوتے تھے، اس وقت بھی آپ خالی نہیں بیٹھتے تھے ایک طالب علم سر پر تیل لگاتا یا بدن دباتا رہتا اور آپ مطالعہ یا ذکر میں مشغول رہتے، کوئی سوال کرتا، تو اس کا جواب دے کر پھر اپنے کام میں لگ جاتے۔ ادھر ادھر کی لایعنی اور فضول باتوں سے کلی طور پر اجتناب فرماتے۔ یہ حقیر اپنے طبعی شرمیلے پن اور آپ کے علمی رعب کی وجہ سے، اپنے آٹھ سالہ قیامِ دار العلوم کے زمانے میں چار پانچ مرتبہ سے زیادہ آپ کی اس بافیض مجلس میں شریک نہ ہوسکا اور جب بھی گیا، خاموش بیٹھ کر آپ کے علمی افادات اور

فیوض و برکات سے مستفیض ہوکر واپس آ گیا، کبھی براہ راست کوئی سوال کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

ہمارے دورۂ حدیث کے سال کا واقعہ ہے، مغرب بعد کا وقت تھا، حضرت مفتی صاحب سبق پڑھا رہے تھے، دارالحدیث کی باؤنڈری سے کسی نے کیمرہ سے مفتی صاحب کی تصویر لی، کیمرے کی لائٹ پڑنے پر حضرت کو اس کا علم ہوا، تو آگ بگولہ ہوگئے اور سخت غصہ میں فرمایا: ”کون ہے یہ؟ پکڑو اس نالائق کو“۔ کئی طلبہ دوڑ کر اوپر گئے؛ لیکن جب تک تصویر ساز نکل چکا تھا۔ تصویر لینے والا تو ہاتھ نہ آسکا؛ مگر حضرت مفتی صاحب نے اپنے اس عمل سے ہم سب طلبہ کو یہ پیغام ضرور دے دیا کہ بلاضرورت تصویر کشی حرام ہے اور یہ کہ جب تمہارے سامنے کوئی منکر کیا جائے، تو جتنا تمہارے بس میں ہو اس پر نکیر ضرور کرو۔ مفتی صاحب کے ہر عمل اور ہر ادا میں طلبہ کے لیے پیغام پنہاں ہوتا تھا۔

تخصص فی الحدیث کے دوسرے سال میں نے مفتی اشرف اعظمی کے ساتھ مل کر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ کی مشہور کتاب ”الاعتدال فی مراتب الرجال“ کی تحقیق وتخریجِ احادیث کا کام کیا تھا، اگلے سال جب بندہ دارالعلوم میں معین مدرس ہوگیا، وہ طبع ہوکر منظر عام پر آئی، میں اُس کا ایک نسخہ لے کر، عصر بعد حضرت مفتی صاحب کی مجلس میں حاضر ہوا، حضرت نے جب کتاب دیکھی، تو فرمایا کہ ”یہ ہیں کرنے کے کام، لوگ اردو شرحات لکھنے میں لگے ہوئے ہیں، اپنے اکابر کی کتابوں کو تحقیق وتخریج کر کے جدید طرز پر اپڈیٹ کرنا چاہئے، تم نے اچھا کام کیا ہے۔“ پھر کتاب کے ورق الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد فرمایا کہ ”جب کتاب اردو میں ہے، تو تم نے تخریج عربی میں کیوں کی؟ تخریج کی زبان بھی اردو ہی رہنی چاہئے تھی۔“ ابھی میں کچھ کہنا ہی چاہ رہا تھا کہ آپ نے خود ہی ہنس کر فرمایا کہ ”اصل میں اسے اردو میں تخریج کرنے کی مناسب تعبیر نہیں ملی ہوگی؛ اس لیے عربی میں تخریج کی۔“ پھر ایک جگہ نشاندہی کر کے فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ کمپیوزنگ کی غلطی ہے، صحیح لفظ یہ ہے، تو فرمایا کہ ”صحیح کہتے ہو، کمپیوٹر کتابت میں تصحیح

کی کتنی ہی کوشش کرلو، کمپیوزنگ کی غلطیاں پھر بھی رہ ہی جاتی ہیں۔ ‘‘

۲۰۰۸ء میں حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب سابق شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند کی جگہ آپ کو صدر المدرسین بنایا گیا، اس وقت میرا معین مدرسی کا دوسرا سال تھا، آپ نے دفتر اہتمام میں تمام اساتذۂ عربی کی میٹنگ بلائی، اُس میں دیگر معین المدرسین کے ساتھ یہ حقیر بھی شریک ہوا، اُس وقت آپ نے دیگر اہم قیمتی باتوں کے ساتھ یہ بھی فرمایا تھا کہ ’’ آپ سب حضرات سبق کی اچھی طرح تیاری اور مطالعہ کر کے سبق پڑھایئے اور اگر کسی کو کسی کتاب میں کوئی مقام حل نہ ہو، تو وہ مجھ سے پوچھے۔ ‘‘ حضرت مفتی صاحب خود محنت، مطالعہ اور تیاری کر کے سبق پڑھانے کے عادی تھے، آپ یہ چاہتے تھے کہ تمام اساتذہ ایسا ہی کریں۔

اسی زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ہمارے ایک معین مدرس ساتھی نے عربی دوم کے ایک طالب علم کی، سبق یاد نہ ہونے کی وجہ سے اچھی خاصی پٹائی کردی، جس سے اس کے دونوں ہاتھوں پر نشان پڑ گئے، اس نے حضرت مولانا مجیب اللہ صاحب (جو اس وقت نئے نئے ناظم تعلیمات مقرر ہوئے تھے) سے شکایت کردی، مولانا مجیب اللہ صاحب نے حضرت مفتی صاحب کو بذریعہ فون اس کی اطلاع کی، تو آپ نے اگلے روز چوتھے گھنٹے میں تمام معین مدرسین کو دفتر تعلیمات میں طلب کرلیا، اس وقت کل سات معین مدرس تھے، چار پہلے سال میں اور تین ہم دوسرے سال میں، سب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے نہایت نرمی سے ہمیں مخاطب کر کے فرمایا کہ ’’ یہ حقیقت ہے کہ تدریس کے دوران تنبیہ اور بسا اوقات پٹائی کی بھی ضرورت پیش آتی ہے؛ لیکن اب پہلے جیسے طلبہ نہیں رہے، زیادہ پٹائی کو برداشت نہیں کرتے، اس لیے محبت ونرمی سے پڑھاؤ، ضرورت پڑے تو پٹائی بھی کرو؛ لیکن ایسی پٹائی نہ کرو کہ جسے طالب علم برداشت نہ کرسکے۔ ‘‘ اس کے بعد فرمایا کہ اب جاؤ اور محنت سے پڑھاؤ۔ یہ نصیحت آپ نے ایسے انداز سے فرمائی کہ صاحب معاملہ کو تو معلوم ہوگیا کہ یہ نصیحت دراصل اسے کی جارہی ہے؛ البتہ باقی لوگوں کو یہ پتہ نہ چل سکا کہ پٹائی کس نے کی

تھی، بعد میں معلوم کرنے پر اُن صاحب کا پتہ چلا۔

حضرت مفتی صاحب کے بعض مسائل میں اپنے کچھ تفردات بھی تھے، جو آپ کے درسی افادات میں موجود ہیں، جن میں سے بعض پر آپ کی حیات ہی میں کافی بحث ومباحثہ اور مناقشات کی نوبت آئی، مجھے اُن تفردات سے کبھی مناسبت نہ ہوسکی، نہ زمانہ طالب علمی میں حضرت سے پڑھتے ہوئے اور نہ اس کے بعد، اس حوالے سے مزید کچھ کہنا مجھ جیسے ادنی طالب علم کے لیے چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔

آپ کو فقیہ الاسلام حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحبؒ سابق ناظم مظاہر علوم سہارن پور اور محی السنۃ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب ہردوئیؒ سے اجازتِ بیعت اور خلافت حاصل تھی؛ لیکن آپ نے درس وتدریس، تصنیف وتالیف، دیگر علمی مصروفیات اور خلوت پسند ہونے کی وجہ سے، بیعت اور تصوف وسلوک کے لیے کوئی خانقاہی نظام شروع نہیں کیا۔

آہ! ۲۵ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ، مطابق ۱۹ مئی ۲۰۲۰ء بروز منگل صبح ساڑھے چھ بجے، بہ عمر اسی سال، ممبئی میں، آپ اپنے متعلقین، محبین، متوسلین اور ہزاروں شاگردوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے وہاں چلے گئے جہاں سب کو جانا ہے۔ آپ کو سفر آخرت کے لیے رمضان کی مبارک ساعتیں ملنا یقیناً قابلِ رشک ہے؛ لیکن ہم جیسے آپ کے ہزاروں شاگردوں کے لیے یہ بڑے رنج، نہایت تکلیف اور افسوس کی بات تھی کہ لاک ڈاؤن کی بنا پر سفری پابندیاں عائد ہونے کی وجہ سے، ہزار تمناؤں کے باوجود آپ کا آخری دیدار کرسکے اور نہ جنازے میں شریک ہوسکے۔ اس کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔

اللہ تعالی حضرت مفتی صاحب کی مغفرت فرمائے، درجات بلند فرمائے، لغزشوں کو معاف فرمائے، آپ کے اعمال حسنہ اور محنتوں کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے، آپ کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے اور ہم تمام شاگردوں کو اوصافِ حسنہ اور علمی کمالات کی تحصیل میں آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

مولانا منظور احمد قاسمی ملوا

مدرس دارالعلوم میٹھے کا تلاباڑمیر راجستھان

۲۵ رمضان المبارک مطابق ۱۹ مئی منگل کا دن شروع ہو رہا تھا، ہر چیز معمول کے مطابق اپنے کام کی انجام دہی میں مشغول و مصروف تھی، ہر کوئی اپنے یومیہ معمولات پورا کرنے کی تگ ودو میں لگا ہوا تھا، کہ یکا یک ذرائع ابلاغ کی دنیا نے اس اندوہناک ووحشت ناک خبر کو پھیلا کر ہر کسی کو چونکا دیا کہ رئیس المحد ثین والمحققین علوم نانوتوی کے امین از ہر ہند دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث وصدر المدرسین حضرت اقدس مولانا ومفتی سعید احمد پالن پوری جوار رحمت میں پہنچ چکے ہیں، یہ صاعقہ اثر خبر سن کر جسم کا رواں رواں کانپ اٹھا، اور صدمے کی شدت سے دل چور ہو گیا اور کف افسوس ملنے لگا کہ، حضرت ہمیں ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے کر کبھی ختم نہ ہونے والے سفر پر روانہ ہو چکے ہیں، دل کو بالکل یقین نہیں آرہا تھا کہ حضرت ہم سے اس طرح اچانک بچھڑ جائیں گے، انا ﷲ وانا الیہ راجعون، ان ﷲ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل شئی عندہ باجل مسمیٰ۔

آج دارالعلوم دیوبند کے درودیوار نالہ وبکا کر رہے ہیں اور زبان حال سے دریافت کر رہے ہیں کہاں چل بسا میرا وہ سپوت جو تقریباً سینتالیس برس تک قال اللہ وقال الرسول کے نغمے گنگناتا رہا اور دارالحدیث چیخ چیخ کہ رہی ہے کہ اپنی سریلی وترنم خیز ودلآویز آواز میں بخاری شریف کی عبارت خوانی کرنے والی عظیم شخصیت کا دیدار مجھے کب نصیب ہوگا؟ دارالعلوم دیوبند پکار رہا ہے کہ اے لوگو! تم نے میرے اس لاڈلے کو کہاں چھپا دیا؟ جو تقریباً نصف صدی تک میری کوکھ میں طالبان علوم نبویہ کو اپنے علمی سمندر سے سیراب کرتا رہا

آج از ہر ہند کی منصب صدارت خالی پڑی آنسوں بہا رہی ہے، احاطۂ مولسری غم کی تصویر بنا ہوا ہے کہ مادر علمی کے ہر سپوت کا آخری دیدار مجھے نصیب ہوتا تھا، لیکن ہائے میرے حضرت مفتی سعید احمد کا مجھے آخری دیدار نصیب نہیں، ہوا، آج قاسمی گیٹ بھی افسوس میں ہے کہ آج کے بعد حضرت سعید احمد کا کبھی یہاں سے گذر نہیں ہوگا، حضرت اقدس مفتی سعید صاحب پالن پوری کے وصال پر مسجد رشید بھی اشک باری کر رہی ہے کہ حضرت سعید احمد نے میرے در و دیوار کو بھی قال اللہ وقال الرسول کی صداؤں سے منور کیا تھا۔

حضرت اقدس مفتی صاحب قدس سرہ کے سانحۂ ارتحال سے علمی دنیا میں ایسا مہیب خلا پیدا ہوگیا ہے کہ جس کا پر ہونا نا مشکل ہے، حضرت کی شخصیت ان یگانۂ روزگار شخصیات میں تھی، جن کو ہر فن میں مہارت تامہ اور مکمل دسترس حاصل ہوتی ہے، حضرت جیسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے، جن سے اللہ تعالی علم دین کی حفاظت واشاعت کے حوالے سے تجدیدی کام لیتے ہیں، بلا شبہ حضرت کی بے شمار تصنیفات وتالیفات اس بات پر شاہد عدل ہیں کہ اللہ نے حضرت سے تجدیدی کام لیا ہے، اللہ حضرت کو غریق رحمت فرمائے، ان کو جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے۔

حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کی ذات والا صفات موجودہ دور میں کبار علماء کے لئے بھی مرجع کی حیثیت رکھتی تھی، برصغیر ہی نہیں بلکہ عالم اسلام میں حضرت کا ایک ایسا علمی مقام ومرتبہ تھا، جو صدیوں میں اللہ اپنے کسی خاص محبوب بندہ کو عطا فرماتے ہیں، حضرت مفتی صاحب اپنے دور شباب میں ہی اپنی علمی قابلیت کا لوہا منوا چکے تھے، مناظر اسلام حضرت مولانا منظور نعمانی جیسی بلند پایہ عالم دین صاحب الرائی شخصیت نے مجلس شوری دار العلوم دیوبند کے سامنے حضرت مفتی صاحب کی تقرری کی پیشکش کی تھی، حضرت نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کو دیکھتے ہوئے اکابر دار العلوم نے آپ کو بحیثیت مدرس مدعو کر لیا تھا، اس وقت سے لے کر تادم واپسیں تقریباً سینتالیس اڑتالیس سال تک مادر علمی دار العلوم میں تدریسی خدمات کے ساتھ بڑی اور اہم کتب کی عربی وار دو شروحات تالیف فرمائیں، حجۃ اللہ البالغہ کی اردو

شرح لکھ کر پوری امت کی طرف سے ایک فرض کفایہ ادا کیا۔

حضرت مفتی صاحب کی دینی خدمات کا زمانہ نصف صدی سے زائد مدت پر محیط ہے، آپ نے صوبہ گجرات کے قدیم ادارہ اشرفیہ راندیر میں بھی آٹھ سال تک مسند تدریس کو زینت بخشی اور حدیث کی اہم کتابوں کا درس دیا، اس کے بعد بحیثیت مدرس دارالعلوم تشریف لے آئے، اللہ پاک نے آپ کو جوہر خطابت سے بھی خوب نوازا تھا، آپ کے خطبات ملک وبیرون ملک میں بڑی دلچسپی سے سنیں جاتے ہیں، کئی سالوں سے رمضان المبارک بیرون ملک گزارنے کا معمول تھا اور پورے ماہ رمضان میں بعد نماز تراویح اپنی موہوبی خطابی صلاحیت سے سامعین کو علمی نکات اور دین کی باتوں سے مستفید فرماتے تھے، حضرت کا بیان خالص علمی ہوتا تھا اور پورے بیان میں دھیمی آواز رہتی تھی، لیکن ایسی پر کشش اور دل موہ لینی والی ہوتی کہ سامعین از اول تا آخر اس طرح جم کر سنتے تھے، گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں اور بیان ختم ہونے کے بعد سوال وجواب کی بھی مجلس لگتی تھی، جس میں ہر ایک سائل کو خندہ پیشانی سے جواب دیا کرتے تھے، حضرت کی کچھ تقاریر "علمی خطبات" کے نام سے شائع ہو کر مقبول خاص وعام ہو چکی ہیں۔

حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کو اللہ پاک نے بے شمار خوبیوں وکمالات سے نوازا تھا، جن کا احصا مجھ سے کم مایہ طالب علم کے لیے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے، کسی بھی شخصیت کو علمی میدان میں اس وقت امامت کا درجہ نصیب ہوتا ہے، جب اس شخصیت کے اکابرین اور ہم عصر علماء اس کے علمی مقام کے قائل ہوں اور اس کے علمی کاموں اور دینی خدمات کی مدح سرائی کرتے ہوں، یقیناً مفتی صاحب علیہ الرحمہ کے تمام اکابرین اور معاصرین حضرت کے علمی مقام کے معترف ہی نہیں بلکہ حضرت کے علوم سے مستفید ہو کر علم حدیث ودیگر فنون میں مفتی صاحب مرحوم کی امامت کو تسلیم کر چکے تھے اور حضرت کو تدریسی وتالیفی میدان کا شہسوار مانتے تھے۔

بندہ ناچیز کو سن 1432/31 ہجری میں حضرت سے دورۂ حدیث کے سال میں

بخاری شریف کا درس لینے کی عظیم سعادت نصیب ہوئی ہے، یہ حضرت کے سامنے بیٹھ کر ان کے علوم سے مستفید ہونے کا پہلا موقع تھا، اس سے پہلے غائبانہ طور پر حضرت کی کتب سے استفادہ کرنے کے مواقع بہت میسر ہوئے، چنانچہ عربی اول کے سال حضرت کی تالیف کردہ ’’آسان نحو‘‘ و" آسان صرف "اور عربی دوم کے سال " آسان منطق "اسی طرح سال عربی سوم میں نحو کی مشہور و معروف کتاب " کافیہ " کی اردو شرح "ہادیہ شرح کافیہ " سے بھی خوب خوب استفادہ کیا، الغرض عربی تعلیم کے ابتدائی سالوں میں ہی حضرت کے علوم ومعارف سے مستفیض ہونے کا موقع ہاتھ آیا اور غیر شعوری طور پر حضرت کی عظمت دل میں جاں گزیں ہوتی چلی گئی۔

جب عربی کے منتہی درجات میں جا پہنچے تو حضرت کا تذکرہ اساتذہ کے زبانی بہت سننے کا موقعہ ملتا تھا، اور جب ہمارا جلالین کا سال تھا، جو دارالعلوم پوکرن میں عربی تعلیم کا آخری سال تھا، اس وقت حضرت کا عربی زبان میں تالیف کردہ رسالہ " مبادی الفلسفہ "جو میبذی سے پہلے پڑھایا جاتا ہے، پڑھنے کا موقع ملا، اس رسالہ کو پڑھ کر حضرت کی علمی قابلیت وصلاحیت کا سکہ مزید دل میں پیوست ہو گیا اور حضرت کی دید کا اشتیاق بڑھنے لگا، اور حضرت مفتی صاحب کے سامنے بیٹھ کر استفادہ کا شوق پروان چڑھنے لگا، اللہ کے فضل وکرم اور اساتذہ کرام کی دعاؤں سے دارالعلوم دیوبند میں سال ہفتم میں داخلہ ہوا اور بالآخر دورہ حدیث میں بخاری شریف کا درس لینے کی سعادت سے بہرہ ور ہوا۔

قارئین حضرات سے عاجزانہ گزارش ہے کہ تمام حضرات، حضرت کے لیے جنت الفردوس میں رفع درجات کے لیے دعا کریں اور ایصال ثواب کا اہتمام کریں۔

انگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا!

(استاذِ محترم کی یاد میں)

مولانا نایاب حسن قاسمی

دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور کئی نسلوں کے معلم و مربی، استاذ الاساتذہ حضرت مفتی سعید احمد پالن پوری آج صبح قضائے الٰہی سے وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دل مغموم ہے، آنکھیں نم ہیں، ذہن پر رنج وغم کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ میں نے ان کی وفات کی خبر قدرے تاخیر سے دیکھی اور دیکھتے ہی ان سے منسوب زمانۂ طالب علمی کی کتنی ہی یادیں ذہن کے پردے پر جھلملانے لگیں۔ کیا شگفتہ وشاندار انسان تھے اور خدا نے ان کی شخصیت میں کیسی دلکشی رکھ دی تھی! مفتی صاحب ہندوستان؛ بلکہ دنیا کے ایسے چیدہ وخوش نصیب لوگوں میں سے ایک تھے جنھیں کم وبیش نصف صدی تک مسلسل علمِ حدیث کی تدریس کا موقع ملا اور انھوں نے ہزارہا طالبانِ علومِ نبوت کی علمی تشنگی بجھائی۔ وہ دارالعلوم دیوبند کے احاطے میں ان منتخب ترین اساتذہ میں سے ایک تھے جنھیں تمام طلبہ کے درمیان یکساں مقبولیت ومحبوبیت حاصل تھی اور اس کی وجہ صرف ان کا تدریسی کمال، افہام وتفہیم کا اثر انگیز انداز اور پڑھانے کا ایسا دلنشیں طور تھا، جو شاذ ہی کہیں دیکھنے کو ملے۔ لگ بھگ گیارہ سال قبل جب ہم وہاں دورۂ حدیث کے طالب علم تھے، تب اس جماعت میں کم وبیش آٹھ سو طلبہ ہوتے تھے، اسی سال انھیں صحیح بخاری کی تدریس کی ذمے داری ملی تھی، سنن ترمذی وہ پہلے سے پڑھا رہے تھے۔ دوسرے اساتذہ کے گھنٹوں میں عموماً آدھی یا دو تہائی درس گاہ خالی

ہوتی تھی، مگر مفتی صاحب کی کلاس میں پاؤں رکھنے کو جگہ نہ ہوتی، جو طلبہ کلاس میں ان کی آمد کے بعد پہنچتے وہ عموماً آدھے اندر اور آدھے باہر رہ کر سبق سنتے۔ ان سے استفادے کے لیے دیوبند کی دوسری درسگاہوں کے طلبہ بھی جوق در جوق آتے تھے۔ جب حدیث کی عبارت خوانی ہوتی اور اس کے بعد مفتی صاحب کی تقریر شروع ہوتی، تو ایک عجیب ہی سماں ہوتا، ہر طالب علم سراپا سماعت بن جاتا، مکمل ذہنی وجسمانی حاضری کے ساتھ سبق سنتا۔ وہ ایسے استاذ تھے کہ ان کے سبق میں شاید ہی کوئی طالب علم ذہنی غیاب کا شکار ہوتا ہوگا، ان کے اسلوبِ کلام اور اندازِ بیان میں ایک مقناطیسیت تھی، جو طالب علموں کو ہمہ تن اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی۔ مفتی صاحب کی خوبی یہ تھی کہ وہ پڑھاتے ہوئے اپنا ارتکاز موضوع پر رکھتے اور اس کی تفہیم میں تمام متعلقہ دلائل و براہین کو اس خوب صورتی اور منطقی ترتیب سے بیان کرتے کہ طالب علم عش عش کرنے لگتا۔ کم و بیش تیس سال تک انھوں نے فضیلت (دورۂ حدیث شریف) کی اہم کتاب سنن ترمذی کا درس دیا اور 2009 سے تاحیات صحیح بخاری بھی ان کے زیرِ درس رہی۔

ان کی ظاہری شخصیت میں بھی مخصوص نوع کی وجاہت تھی، جو ایک محدث کے شایانِ شان ہوتی ہے۔ سادگی و بے تکلفی ہوتی، مگر اس میں کشش ایسی کہ دل ونگاہ کو اپنا اسیر بنا لے۔ اپنے گھر سے دارالعلوم تک کی مسافت عموماً رکشے سے طے کرتے، صدر دروازے سے دارالعلوم میں داخل ہوتے، احاطۂ مولسری میں پہنچ کر دو تین بار کلی کرتے، چوں کہ وہ پان کھانے کے عادی تھے تو تدریسِ حدیث سے قبل اہتمام سے کلی ضرور کرتے، پھر درس گاہ (دارالحدیث) میں داخل ہوتے، مسندِ تدریس پر بیٹھتے، ایک طالب علم بلند وخوش الحان آواز میں حدیث پاک کی عبارت پڑھتا، اس کے بعد اس حدیث پر مفتی صاحب کی گفتگو ہوتی میں یہ سطور لکھتے ہوئے اس لذت کو پھر سے محسوس کر رہا ہوں، جس سے ان کے درس میں ہم لطف اندوز ہوتے تھے۔ مفتی صاحب پڑھاتے نہیں تھے، جادو کرتے تھے، طالب علم اور سامع کے حواس پر چھا جاتے تھے، وہ بولتے نہیں تھے موتی رولتے تھے، ان کی نگہ دلنواز تھی اور

ادا دلفریب، ان کی امیدیں قلیل تھیں اور مقاصد جلیل، وہ اقبال کی تعبیر ”نرم دمِ گفتگو اور گرم دمِ جستجو“ کی نہایت ہی تابناک مثال تھے۔

جب ہم دورۂ حدیث شریف میں تھے، تو ششماہی امتحان میں ترمذی و بخاری میں پچاس پچاس نمبرات (تب دار العلوم میں کل نمبرات پچاس ہوا کرتے تھے) حاصل کرنے والوں کی مفتی صاحب نے خصوصی حوصلہ افزائی کی اور ایسے طلبہ چند ایک ہی تھے۔ اللہ کے فضل سے ان میں سے ایک میں بھی تھا، مفتی صاحب نے ایسے سب طالب علموں کو بعد نماز عصر اپنے گھر بلا کر دعائیں دیں، تحسین آمیز کلمات سے نوازا، حوصلہ افزائی کی اور انعام کے طور پر سنن ترمذی کی شرح عنایت فرمائی۔ انھیں یہ شکایت رہتی تھی کہ اب طلبہ محنت نہیں کرتے اور اس کا وہ ہمیشہ اپنی کلاسوں میں اظہار کرتے۔ پرانے محدثین و علما اور خود دار العلوم کے اساتذۂ متقدمین کے واقعات و حالاتِ زندگی سے چیدہ چیدہ واقعات سناتے اور طلبہ کو مہمیز کرتے۔ وہ طلبہ و اساتذہ کے راست تعلق اور رابطے پر زور دیتے تھے؛ تاکہ افادہ و استفادہ کا عمل تیز اور نتیجہ خیز ہو؛ اس لیے ہم نے ہمیشہ ان کی زبان سے سنا کہ ایک ایک جماعت میں کئی کئی سو طلبہ کا ہونا درس و تدریس کے نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے، مگر پھر وہ یہ بھی کہتے کہ چوں کہ دار العلوم کو اس کے معیار کے مطابق اساتذہ نہیں ملتے، اس وجہ سے مجبوری میں ایسا کرنا پڑتا ہے۔ اب تو دورۂ حدیث میں غالباً پندرہ سو یا اس سے بھی زیادہ طلبہ ہوتے ہیں۔

سال کے آخری دن ہونے والی ان کی پند و نصائح سے معمور تقریر بھی یادگار ہوتی تھی۔ اس دن وہ خود بھی جذبات سے لبریز ہوتے اور طلبہ پر بھی ایک عجیب کیفیت طاری ہوتی۔ آخری حدیث کا سبق ہوتا، تشریح کی جاتی اور پھر وہ باتیں ہوتیں جو فضیلت کی تکمیل کرنے والے طلبہ کے لیے زندگی بھر کام آنے والی ہوتیں۔ وہ اپنے طلبہ کی تین جماعتوں میں تقسیم کرتے: اعلی، متوسط اور ادنی اور پھر ان میں سے ہر ایک کو عملی زندگی کا ٹاسک بتاتے اسی کے مطابق سرگرمِ کار ہونے کی تلقین کرتے۔ جب طالب علم آخری دن ان کی کلاس سے اٹھتا تو گرچہ اسے اس بات کا غم ہوتا کہ مفتی صاحب جیسے عظیم استاذ سے جدا ہونا پڑ رہا

ہے، مگر ساتھ ہی اسے خوشی بھی ہوتی کہ اس کا دامن علم وفکر کے جواہر ریزوں سے بھرا ہوا ہے۔ مفتی صاحب نہایت ذہین انسان تھے اوران کا دماغ گویا ایک وسیع وعریض کتب خانہ تھا جس میں مختلف علوم وفنون کی ہزاروں کتابیں ہر وقت موجود و مستحضر رہتیں۔

مفتی صاحب کا کارنامہ صرف یہی نہیں ہے کہ انھوں نے کم وبیش نصف صدی تک علم حدیث پڑھایا اور ہندو بیرون ہند کے ہزارہا طلبہ ان سے سیراب ہوئے، ان کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ عصرِ حاضر کے طلبہ کے ذہنی مستوی کا ادراک کرتے ہوئے درسِ نظامی کی کئی اہم کتابوں کی لسانی تہذیب وتسہیل کا کام کیا اور انھیں نئے لباس میں شائع کیا۔ بانیِ دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی کی متعدد کتابوں کی تسہیل فرمائی اور انھیں نئی نسل کے لیے سہل الفہم بنایا، درسِ نظامی کی متعدد اہم کتابوں کی آسان اردو زبان میں اور جامع ترمذی کی آٹھ جلدوں میں، جبکہ صحیح بخاری کی بارہ جلدوں میں اور امام ولی اللہ دہلوی کی معرکۃ الآرا کتاب حجۃ اللہ البالغہ کی منفرد وممتاز شرح رحمۃ اللہ الواسعہ لکھ کر علمی دنیا پر احسانِ عظیم کیا۔ ان کے علاوہ بھی مختلف درسی کتابوں کی دسیوں شروح تحریر کیں اور دیگر موضوعات پر بھی اہم کتابیں لکھیں۔

الغرض مفتی صاحب کی پوری زندگی نہایت ہی سرگرم وماجرا پرور رہی۔ ان کی پیدائش 1940 میں گجرات کے ضلع پالن پور میں ہوئی تھی، 1962 میں دارالعلوم دیوبند سے فضیلت کی تکمیل کی اور 1972۔73 میں دارالعلوم دیوبند میں استاذ مقرر ہوئے اور تاحیات علمِ حدیث وفقہ کی امہاتِ کتب کی تدریس کی خدمت انجام دی۔ لگ بھگ اسی سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اللہ پاک حضرت مفتی صاحب کی کامل مغفرت فرمائے، پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہم جیسے ان کے ہزارہا شاگردوں کی طرف سے انھیں بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائے۔ (آمین)

رحلت پہ تری غلغلۂ آہ وفغاں ہے

مفتی محمد اسجد قاسمی ہریدواری سابق معین مدرس دارالعلوم دیوبند

استاذ مولانا حسین احمد مدنی مدرسہ انبہٹہ پیر سہارنپور

۲۵/ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ کو ادھر افق مشرق سے صبح کے اجالے ابھر رہے تھے ادھر عروس البلاد ممبئی میں ایک مہر تاباں اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ غروب ہو رہا تھا۔ دنیا بھر میں حضرت کے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں محبین و معتقدین اور علماء وطلبہ پر غموں کا کوہ گراں ٹوٹ رہا تھا۔ عرب وعجم کی آنکھوں سے اشک ہائے فراق مترشح ہو رہے تھے جو ابھی تک جاری ہیں۔ ہندوستان کے ساحلی شہر ممبئی سے ایسی غمناک،، المناک اور افسوسناک خبر پھیلی جس نے دنیا کے آخری سرے تک پھیلے ہوئے حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے اہل تعلق و اہل محبت کی آنکھوں کو نمناک کر دیا۔ چمنستان علم وفن دارالعلوم دیوبند کی مسند درس پر اڑتالیس سال تک نغمہ سرائی کر کے یہ بلبل خوش نوا کچھ اس ادا سے خاموش ہوئی کہ اس کو دیکھنے، سننے اور جاننے والا ہر شخص آبدیدہ ہے۔ اہل علم کے طبقے میں ادنی طالب علم سے لے کر دنیا کے چوٹی کے علماء وصلحاء تک حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات پر مغموم ومحزون ہیں جن کے نثرا ونظما تعزیتی پیغامات کثیر تعداد میں سامنے آرہے ہیں۔

موت تو خیر ایک اٹل اور ناقابل انکار حقیقت ہے، لیکن حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اس عجیب انداز سے ہمیں چھوڑ کر چلے جانا حد سے زیادہ حزن وملال کا باعث بن گیا۔ یہ صرف ایک شخص کا موت کی آغوش میں چلے جانا نہیں تھا، بلکہ اپنی علمی کرنوں سے دنیا بھر میں روشنی بکھیرنے والے ایک نیر تاباں کا روپوش ہونا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے رخصت ہو جانے سے عالم اسلام ایک قیمتی سرمایہ اور گوہر گراں مایہ سے محروم ہو گیا۔ انا للہ وانا

الیہ راجعون، ان لله ما اخذ وان له ما اعطی وکل شیء عنده باجل مسمی

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر اظہار درد و غم اور آپ کی یادوں کے نقوش کو محفوظ کرنے کے لئے آپ کے خوان علمی سے ریزہ چینی کرنے والے دیگر بہت سے تلامذہ کی طرح احقر نے بھی کیف ما اتفق کچھ باتیں اور یادیں سپرد قرطاس کردی تھیں، جن کا بنیادی مقصد ماضی کی حسین یادوں کو حیطۂ تحریر میں لاکر محفوظ کرنا تھا۔

وہ پہلی نظر پہلی ملاقات کا عالم

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کے نام نامی اسم گرامی سے تو میں بچپن ہی میں آشنا ہوگیا تھا، والد صاحب زید مجدہم حضرت مولانا حسین احمد صاحب ہریدواری چوں کہ دارالعلوم دیوبند کے استاذ ہیں، اس لیے وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی بہانے سے مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر خیر ہوتا ہی رہتا تھا۔

خوبیِ تقدیر سے اللہ تعالیٰ نے اس ناچیز کو 1999 میں پہلی مرتبہ دارالعلوم دیوبند حاضری کا شرف بخشا، اس وقت میری عمر آٹھ سال تھی اور میں سیقول کا پارہ پڑھتا تھا، اس وقت رشید مسجد، رواق خالد اور آسامی منزل زیر تعمیر اور اعظمی منزل کی تیسری بلڈنگ تکمیل کے مرحلے میں تھی۔ جدید لائبریری اور دارالقران کی جگہ خالی میدان تھے، جہاں عصر کے بعد طلبہ کھیلا کرتے تھے۔

اسی کمسنی میں ایک دن والد صاحب زید مجدہم فرمانے لگے کہ آج بعد عصر مفتی سعید احمد صاحب سے ملاقات کے لیے چلیں گے، چنانچہ عصر کے بعد حضرت والد صاحب حضرت مولانا محمد علی صاحب اور احقر حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے در دولت کی طرف چل دیے۔ یہ دونوں حضرات آگے آگے بات کرتے ہوئے جاتے اور میں ان کے پیچھے پیچھے بچوں کی طرح دوڑتا ہوا چلتا، یہ وہ زمانہ تھا جب مفتی صاحب پرانے مکان کی بالائی منزل میں فروکش تھے۔ حضرت کے گھر سے چند قدم پہلے والد صاحب نے میرا حلیہ درست کیا، بال اور

ٹوپی ٹھیک کی، گریبان اور بٹن وغیرہ درست کر کے کچھ سلیقہ مند سا بنا دیا۔ اوپر کمرے میں پہنچے تو دیکھا کہ حضرت اپنی مطالعہ گاہ پر نصف دراز ہیں، ایک طالب علم سر کی مالش کر رہا ہے، دوسرا پیر دبا رہا ہے اور حضرت ہاتھ میں کتاب لیے دقت نظر کے ساتھ کتاب بینی میں مشغول ہیں۔

والد صاحب زید مجدہم سے علیک سلیک کے بعد معلوم کیا کہ یہ بچہ کون ہے؟

والد صاحب:

میرا بڑا بیٹا ہے۔

مفتی صاحب:

اتنی کم عمری میں اس کو ماں سے جدا کر دیا؟

والد صاحب:

بہت زیادہ کم عمر بھی نہیں ہے۔

مفتی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ کھڑے ہو کے دکھاؤ۔

میں نے کھڑے ہو کر دکھایا۔

حضرت مفتی صاحب نے نظر اٹھا کر دیکھا اور فرمایا:

ہاں بہت زیادہ چھوٹا تو نہیں ہے۔

آٹھ سال کا ناظرہ پڑھنے والا بچہ اس جلیل القدر اور عظیم المرتبت، کتابوں کے درمیان محبوس اور مطالعہ میں مصروف شخصیت کو مافوق الفطرت نہ سمجھتا تو اور کیا سمجھتا؟

خوش منظر و دلآویز شخصیت

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کا ظاہر و باطن بالکل سنت کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ انوارات سے منور حسین و جمیل چہرہ، سر پر خوبصورت سفید عمامہ، اس پر مزید عربی انداز میں سفید و چمکدار رومال، چال ڈھال، رفتار و گفتار اور نشست و برخاست میں غایت درجہ سنجیدگی و متانت کا پاس رہتا تھا۔ آپ کا سراپا ایسا دلکش اور سجیلا تھا کہ ایک مرتبہ نظر پڑ جائے تو دیر تک سیری نہیں ہوتی تھی، آپ اپنے انداز و ادا اور عادات و اخلاق سے اسلاف کی نہ صرف

حقیقی یادگار تھے بلکہ انکے علوم کے امین و پاسبان بھی تھے۔ آپ کی شخصیت جوش و ہوش کا حسین آمیزہ تھی۔ آپ کی ذات والا صفات میں حق جل مجدہ نے بہت سے ایسے ہیرے جواہرات ودیعت کیے تھے جو طلبہ وعلماء کے لئے انتہائی کشش کا باعث اور محبت کا سامان تھے، جن کی وجہ سے آپ کو عالم گیر شہرت اور مقبولیت ومحبوبیت حاصل تھی۔

لاثانی درس بخاری

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کا درس بخاری بلکہ اس سے پہلے درس ترمذی بھی بڑی آب وتاب اور شان وشوکت کے ساتھ ہوتا تھا۔ ابتدائی ایام میں یومیہ تین اسمائے حسنیٰ یاد کرانے کا اہتمام فرماتے، آپ ہی کی برکت سے ہم گناہ گاروں کو بھی یہ مبارک اسمائے خداوندی یاد کرنے کی سعادت نصیب ہوگئی۔ آپ کا درس بخاری سطحیت سے پاک اور جلد بازی و رواروی سے منزہ ہوتا تھا۔ انتہائی سکون کے ساتھ گفتگو کا آغاز ہوتا اور اسی سکون واطمینان کے ساتھ بات مکمل ہوتی تھی۔ دوران درس اگر کوئی خاص موضوع زیر بحث آجاتا تو اس پر مالہ وما علیہ کے ساتھ کلام کر کے ہی دم لیتے تھے۔ آپ کے درس میں وعظ و نصیحت، تزکیہ اور اصلاح وارشاد کے پہلو ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ سبق کا اتنا آسان حل پیش فرماتے کہ کوئی بھی عقدہ حل ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔ آپ مشکل سے مشکل مسائل اور پیچیدہ ترین مباحث کو اپنی عمدہ تفہیم وتوضیح سے نہایت آسان بنانے پر مکمل قدرت رکھتے تھے۔ درس کی تقریر نپی تلی دریا بکوزہ کا صحیح مصداق ہوتی تھی۔ نہ اتنی مفصل کہ پورے گھنٹے میں چند ہی لائن سبق ہو پائے

نہ اتنی مختصر کہ صفحات کے صفحات گزرتے چلے جائیں اور کوئی کلام ہی نہ ہو۔ آپ کا لب ولہجہ البیلا تو تھا ہی ساتھ ساتھ نرالا اور منفرد بھی تھا۔ ہم نے ایسا پرسکون اور ٹھہراؤ والا انداز اور طرز کلام آج تک نہ دیکھا نہ سنا۔

آپ خود فرماتے تھے کہ مجھے جلدی جلدی اور تیز بولنے کی عادت تھی، مہینوں محنت و کوشش اور مشق وتمرین کے بعد میں نے اس طرح آہستہ آہستہ بولنا سیکھا ہے۔

تنگ آجائے گی اپنے چلن سے دنیا
تجھ سے سیکھے گا زمانہ ترے انداز کبھی

الحمدللہ میں تو پورے سال حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں حاضر رہا لیکن طلبہ کی خاصی تعداد ایسی ہوتی تھی جو صرف حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں حاضر ہوتے تھے اور دیگر گھنٹوں میں یا تو آرام کرتے یا افتاء میں داخلے کے لئے امتحان کی تیاری میں مصروف رہتے اور وہ طلبہ یہ خیال ظاہر کرتے تھے کہ اس ایک گھنٹے کے سبق سے دیگر تمام کتب کے امہات مطالب حل ہوجاتے ہیں۔

مستزاد یہ کہ طلبہ کی عدم موجودگی پر مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے سخت تنبیہ ہوتی تھی۔ طلبہ کی قلت کو محسوس کر کے ہر سال متعدد مرتبہ آپ درسگاہ سے غصہ ہو کر واپس تشریف لے جاتے۔ اس تنبیہ کا دو تین ماہ تک طلبہ پر اثر رہتا تھا۔ حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ اس کبرسنی کے زمانے میں بھی سال کے اخیر میں جب تیسرا گھنٹہ خالی ہوجاتا تو مسلسل چار گھنٹے سبق پڑھاتے تھے۔ ہمارے دورے کے سال دل کا آپریشن ہونے کی وجہ سے ششماہی امتحان تک بخاری کے صرف انچاس صفحے ہوپائے، کسی مجلس میں حضرت نے بطور ظرافت یہ جملہ بول دیا تھا کہ اگر سالانہ امتحان تک بخاری مکمل نہ ہوئی تو رمضان میں مکمل کراؤں گا۔

یہ جملہ اتنا مشہور ہوا کہ ہر کس و ناکس کی زبان زد ہوگیا۔ حتیٰ کہ کے احقر نے دارالعلوم کے درجۂ ناظرہ کے دو نہایت کم عمر بچوں کو بھی یہ کہتے ہوئے سنا کہ اس سال بخاری رمضان میں مکمل ہوگی۔ لیکن حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کا درس و تدریس کا نصف صدی پر محیط تجربہ اور غیر ضروری مشاغل سے یکسوئی کا انداز ایک نعمت ثابت ہوا۔ جمعہ ہو یا جمعرات یا کوئی اور چھٹی کا موقع، حضرت نے کسی بھی موقع کو خالی نہیں جانے دیا اور الحمدللہ رجب کے اخیر میں بخاری شریف اپنے وقت پر ہی مکمل ہوئی۔

دل کا کامیاب آپریشن

ہمارے دورے کے سال 1435ھ میں عید الاضحیٰ کی تعطیل میں حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کسی مرض کے علاج کے لیے ممبئی تشریف لے گئے، وہاں جا کر اچانک دل کا سخت دورہ پڑا اور انہیں ایام میں ڈاکٹروں کے مشورے سے بائی پاس سرجری کرانی پڑی، اس لیے آپ عید الاضحیٰ کے بعد قدرے تاخیر سے دیوبند تشریف لا سکے۔ جس دن آپ دیوبند جلوہ فرما ہوئے اس سے اگلے روز فجر سے قبل احقر، مولوی جمیل امریکی اور ترجمان مولوی شاہ جہاں حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات اور درسگاہ میں تشریف لانے کے متعلق پوچھنے کے لئے گیے، نماز فجر حضرت ہی کی مسجد میں ادا کی اور بعد فجر ملاقات کا شرف حاصل ہوا، آپ نے سبق پڑھانے کی آمادگی ظاہر کی۔ طلبہ میں اعلان کر دیا گیا۔ بلکہ جب آپ چوتھے گھنٹے میں مولوی جمیل امریکی کے ساتھ بذریعہ کار تشریف لائے تو طلبہ نے مدنی گیٹ سے مسجد رشید تحتانی تک دورویہ قطار بنا کر آپ کا استقبال بھی کیا۔ (اسی کار سے دورے کے اساتذہ کو کار میں لانے کی طرح پڑ گئی) اگرچہ ابھی آپ مکمل صحتیاب نہیں ہوئے تھے، لیکن تدریس کے شوق سے مغلوب ہو کر آپ نے آہستہ آہستہ سبق پڑھانا شروع کر دیا۔ ابھی چند ہی دن گزرنے پائے تھے کہ طبیعت دوبارہ بگڑنی شروع ہو گئی اور بہی خواہوں نے آپ کو ممبئی جانے کا مشورہ دے دیا۔

دار العلوم اور درس و تدریس سے غیبوبت یقیناً آپ کے لیے نہایت رنج و غم کا باعث تھی، اس لیے جب ہم طلبہ آپ کی عیادت و زیارت کے لئے آپ کے گھر پہنچے تو آپ آنکھوں سے اشکوں کے ترشح کے ساتھ باہر تشریف لائے وہ انتہائی غم کا سماں تھا۔ آپ دہلی ایرپورٹ جانے کے لئے کار میں بیٹھ گیے، کچھ دیر کار آہستہ آہستہ چلتی رہی، طلبہ بھی کار کے دائیں بائیں اور پیچھے پیچھے چلتے رہے، لیکن جونہی آپ کی گاڑی مسجد کے پاس سے مڑی تو طلبہ پر ایک قیامت سی ٹوٹ پڑی، سسکیاں نکلنے لگیں۔ دیگر ساتھیوں نے بتایا کہ ہمارے پیچھے آرہے دار العلوم دیوبند کے استاذ محترم اور حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خادم خاص جناب مولانا اشتیاق احمد صاحب بھی بلک بلک کر رو دیے۔ لیکن اس دن جہاز کی ٹکٹ

نہ ملنے کی وجہ سے مفتی صاحب واپس تشریف لے آئے اور بعد عصر ہم طلبہ نے دولت کدے پر حاضر ہوکر جی بھر کے زیارت کی۔ اگلے روز آپ ممبئی تشریف لے گئے اور ایک ماہ سے زائد وہیں مقیم رہے۔ اس عرصے میں حضرت اقدس جناب مولانا مفتی ابو القاسم نعمانی صاحب دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم دیوبند نے تدریس بخاری کے فرائض انجام دیے۔

جہد مسلسل کا پیکر محسوس

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا یہ ایسا نمایاں وصف تھا جو ہم طالبان علوم نبوت کے لئے سبق آموز اور قابل تقلید ہے، آپ کسی موجودہ پونجی پر قناعت کے عادی نہیں تھے۔ آپ کی ایک ایک ادا سے تعلیم و تعلم اور افادہ واستفادہ کی پیاس نمایاں ہوتی تھی۔ کبھی کسی منزل یا کسی ایک کتاب کی اشاعت پر ہی بس نہ کرتے۔ کبھی کسی بڑے یا چھوٹے نے انہیں وقت ضائع کرتا ہوا نہیں پایا۔ آپ کے دل میں ہر آن کوئی نہ کوئی تصنیفی کام کرنے کی آگ لگی رہتی تھی۔ مطالعہ وکتب بینی تو اکابر کی طرح آپ کی زندگی کا جز و لاینفک بن چکا تھا۔

آپ نے زمانۂ طالب علمی میں بعض پیش آمدہ واقعات کے بعد جس آب وتاب کے ساتھ محنت وجد وجہد کا آغاز فرمایا تھا، دم اخیر تک اس میں کوئی کمی نظر نہیں آئی۔ زندگی کے دشوار گزار مراحل کو عزم و ہمت سے طے کیا اور تحصیل علم میں آنے والی ہر پریشانی کا سد سکندری بن کر مقابلہ کیا۔ آپ نے سدا علمی ذوق وشوق سے سرشار رہ کر علمی عظمتوں کو سر کیا۔ اس سلسلے میں آپ کا عظیم کردار حیرت انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ ولولہ انگیز بھی ہے۔ بالآخر آپ نے تدریسی و تصنیفی میدانوں میں اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیے اور علمی دنیا پر اپنے گہرے نشانات ثبت کیے۔ اسی جہد مسلسل اور سعی پیہم کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے آپ پر علمی حقائق ودقائق کے نئے نئے افق کھولے اور آپ کے قلم گہر بار سے حجۃ اللہ البالغہ جیسی دشوار اور کٹھن کتاب کی مبسوط شرح رحمۃ اللہ الواسعہ وجود میں آئی۔

صحیح بخاری وجامع ترمذی جیسی عظیم کتابوں کی شہرۂ آفاق شروحات تحفۃ القاری اور تحفۃ الالمعی منصۂ شہود پر آئیں۔ اصح الکتب بعد کتاب اللہ کی اس شرح کے بارے میں آپ

خود فرماتے تھے کہ علمائے دیوبند میں بخاری کی مکمل شرح صرف میں نے لکھی ہے۔

ان مذکورہ بالا تین کتابوں کے علاوہ آپ کے کے قلم فیض رقم سے علم حدیث اور دیگر علوم آلیہ وعالیہ میں پچاسوں گراں قدر تصنیفی شاہکار دنیا کے اہل علم حضرات سے سند قبولیت حاصل کر چکے ہیں اور وسیع پیمانے پر مقبول ومتداول ہیں۔ علمی شغف ہی کی وجہ سے اوقات مختلف تدریسی وتصنیفی کاموں میں اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ درمیان سال میں اسفار کی گنجائش نہیں ہوتی تھی، البتہ سالانہ تعطیلات میں امت مسلمہ کو دعوتی، اصلاحی اور فقہی رہنمائی فراہم کرنے کے لئے دنیا کے مختلف دور دراز ممالک کا سفر کرتے اور تشنہ کاموں کو سیرابی عطا فرماتے تھے۔ آپ کی مجلس بھی علمی نوعیت کے سوال وجواب سے مہکی ہوتی تھی کبھی آپ از خود کوئی قیمتی علمی نکتہ بیان کر دیا کرتے تھے۔

ایک روز معین مدرسی کے زمانے میں احقر بعد عصر حاضر خدمت ہوا۔ آپ نے اپنی بائیں جانب بلایا اور کہا کہ قلم کھولو، میں حیران ہوا کہ آج کس امتحان کی تیاری ہے؟

بہر کیف میں نے قلم کھولا اور حضرت نے اپنی میز پر رکھے ہوئے کاغذات میرے ہاتھ میں تھما کر فرمایا۔ لکھو:

یا ایھا المزمل۔
اے چادر میں لپٹنے والے الخ۔
یہ تفسیر ہدایت القرآن کے تصنیفی سلسلے کی کڑی تھی۔

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ غیر معمولی رفتار سے سورۂ مزمل کی آیات، ترجمہ اور تشریحی کلمات کا املاء کراتے جاتے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا علمی استحضار دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سامنے نہ قرآن نہ کوئی کتاب، آپ کی نظر دیوار پر جمی ہوئی تھی اور اس تیزی کے ساتھ املا کرا رہے تھے کہ اس جوانی کے عالم میں بھی احقر کا قلم حضرت کی زبان کی بمشکل ہمنوائی کر پا رہا تھا۔ وہاں موجود طلبہ بھی خاموش محو حیرت بیٹھے رہے اور میں متحیر بھی تھا اور خائف بھی کہ کہیں کسی لفظ کا دوبارہ معلوم کرنا حضرت کے لئے باعث تکدر نہ ہو جائے۔ اس پوری

سورت میں صرف ایک دو جگہ ایسی آئی جہاں حضرت نے کسی جملے کے کاٹنے کا حکم دیا۔ ورنہ مکمل سورت اسی طرح بے تکلف املا کرادی۔

ولایت پادشاہی علم اشیاء کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہے فقط ایک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

(وجل ثناء ک) پر حسین توافق

معین مدرسی کے زمانے میں چند مہینوں تک احقر فرائض ونوافل کے ثناء میں بھی ''وجل ثناءک'' کا اضافہ کرتا رہا۔ پھر ہدایہ میں دیکھا کہ مصنف نے نماز جنازہ کے علاوہ دیگر نمازوں میں اس جملے کے اضافے سے منع کیا ہے۔ میں نے اسی دن سے اس جملے کا اضافہ بند کردیا۔ کچھ روز بعد حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ بعد عصر مجلس میں فرمانے لگے کہ میں عام نمازوں میں جل ثناءک کا اضافہ کرتا تھا، کیوں کہ یہ جملہ لفظ اور معنیٰ دونوں اعتبار سے اچھا لگتا ہے۔ لیکن آج ایک کتاب میں دیکھا کہ مصنف منع کرتے ہیں، تو انہوں نے آخر یہ کس دلیل سے منع کیا؟ آیا کوئی حدیث یا اثر ان کے سامنے ہے؟ ہم نے وہیں بیٹھے بیٹھے موبائل پر بھی اور خارج میں اعلاء السنن اور ابوداؤد وغیرہ میں تلاش کیا، تو نماز جنازہ میں جل ثناءک کا اضافہ تو ملا لیکن اس مجلس میں دیگر نمازوں میں ممانعت کی دلیل نہ مل سکی۔ حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ تو چوں کہ علم وعرفان کے عظیم آفتاب تھے، اس لیے فرمایا کہ اس طرح کی باتوں کو میں بغیر دلیل کے تسلیم نہیں کرتا ہوں۔

دارالعلوم کی تین سنہری روایتیں

پہلی روایت

دارالعلوم دیوبند میں انعامی جلسے کا جو معیار ہے وہ شاید و باید ہی کسی دوسرے مدرسے میں ہو۔ دارالعلوم سالانہ امتحانات میں کامیاب ہونے والے تمام طلبہ کو حسب مراتب خصوصی اور تشجیعی انعامات سے نوازتا ہے۔ اس روح پرور موقع پر تمام طلبہ اور اساتذہ

کی موجودگی میں حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کا خصوصی پر مغز اور علمی نکات پر مشتمل بیان ہوتا تھا، جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ طلب علم کے زمانے کا مضبوط ترین لائحۂ عمل پیش فرماتے، نہ صرف طلبہ کے لیے بلکہ اساتذہ کی تدریسی و تصنیفی ترقی کے طور طریقے بھی واضح کرتے تھے۔

دوسری روایت

تعلیمی سال کے آغاز پر تمام طلبہ کو رشید مسجد میں جمع کر کے ان کے مقام و مرتبہ سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ اس مبارک موقع پر بھی گزشتہ دہائی میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کا خطاب ہوتا رہا اور آپ طلبہ کو درس کی پابندی، پیشگی مطالعہ، تکرار و مذاکرہ، ہفتہ واری آموختہ اور ذاتی محنت و لگن پر خوب ابھارتے اور تعلیمی مزاج و مذاق کی آبیاری کی کوشش کرتے۔

تیسری روایت

تیسری روایت نہایت اہم اور قابل صد رشک ہے۔ آغاز سال ہی کے موقع پر دفتر اہتمام میں ایک خوبصورت و دلکش تقریب منعقد ہوتی ہے، جس میں بشمول دیگر اساتذہ کے مادر علمی کی مسند حدیث کو رونق بخشنے والی، میدان علم و دانش کی قد آور شخصیات اپنے وجود مسعود سے اس مجلس کے حسن کو دوبالا کر دیا کرتی تھیں۔ اس موقع پر بھی خطاب کا سہرا آپ ہی کے سر سجایا جاتا تھا، جس میں آپ اپنے طویل ترین علمی تجربات سے کشید کردہ حکمت و دانائی کی زریں باتیں اور نفع بخش اصول و نقوش تمام اساتذہ کے سامنے رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے معین مدرسی کے دوسرے سال کے آغاز پر اس ناچیز کو بھی اس علمی و نورانی محفل میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ جس وقت میں دفتر اہتمام پہنچا تو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کرسی کے سامنے پہلی لائن میں جگہ خالی تھی، میں وہیں بیٹھ گیا اور خوب توجہ سے حضرت کے افادات سے مستفید ہوا۔

اس بیان کے ایک اہم اقتباس سے میں آپ کو روشناس کرانا مناسب سمجھتا

ہوں، فرمایا:

میں علامہ بلیاوی قدس سرہ کے سر میں تیل لگا رہا تھا، حضرت فرمانے لگے کہ طلبہ تین قسم کے ہوتے ہیں، پلنے والے، پڑنے والے اور پڑھنے والے۔ میں نے حضرت قدس سرہ کی اس تقسیم کے بعد کہا کہ اساتذہ بھی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ حضرت پوچھنے لگے کہ وہ تین قسمیں کیا کیا ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ بڑے میرے سے زیادہ جانتے ہیں۔

پھر حضرت الاستاذ مفتی سعید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دفتر اہتمام ہی میں وہ تین قسمیں بیان فرمائی۔

(1) ایسے اساتذہ جو بغیر مطالعہ کیے درسگاہ میں چلے جاتے ہیں اور جتنی دیر طلبہ عبارت پڑھتے ہیں اتنی دیر یہ حاشیہ کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر سبق کی زوردار تقریر کر کے چلے آتے ہیں۔

(2) وہ اساتذہ جو رات بھر جتنا مطالعہ کرتے ہیں صبح کو سارا طلبہ کے سامنے قے کر دیتے ہیں، کہ فلاں نے یہ کہا، فلاں نے یہ لکھا، فلاں کی رائے یہ ہے۔

(3) وہ اساتذہ جو رات کو مطالعہ کرتے ہیں، پھر اس میں سے حل درس کے متعلق جو باتیں طلبہ کے لیے ضروری ہیں، انہیں ایک کاغذ پر لکھ کر جیب میں رکھ لیتے ہیں اور سبق میں جانے سے پہلے، راستے میں آتے جاتے، اٹھتے بیٹھتے، بار بار اس لکھے ہوئے کو دہراتے رہتے ہیں، پھر درسگاہ میں جا کر ایک ہی انداز و اسلوب میں پیرایۂ بیان بدلے بغیر متعدد مرتبہ طلبہ کو سمجھاتے ہیں اور پورے ہفتے جو اسباق انہوں نے لکھے انہیں ہفتے میں ایک مرتبہ بطور آموختہ پڑھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ اساتذہ سب سے زیادہ کامیاب ہیں۔ حضرت الاستاذ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کی پرنور دعا پر مجلس برخاست ہوگئی۔

دفتر اہتمام ہی میں اساتذہ کے ناشتہ کا انتظام تھا، کچھ اساتذہ دسترخوان پر بیٹھ گئے اور کچھ وہیں کھڑے ہو کر آپس میں باتیں کرنے لگے، اسی اثنا میں ایک استاذ میرے پاس آئے کہ آپ کو مفتی سعید احمد صاحب بلا رہے ہیں، میں گھبرایا ہوا حضرت کے پاس گیا کہ خدا

جانے آج کیا چیز خلاف ادب سرزد ہوگئی جس پر آج برسر مجلس اکابر اساتذہ کے سامنے ڈانٹ پڑے گی؟ میں نے جا کر سلام کیا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مصافحہ کیا اور ہنستے ہوئے فرمایا:

تم کون ہو بھائی بہت غور سے تم نے بیان سنا؟

میں نے جواب دیا: محمد اسجد ہریدواری۔

حضرت نے پھر دوبارہ غور سے میرا چہرہ دیکھا اور فرمایا:

اچھا وہ ہریدوار والے معین مدرس؟ میں نے کہا: جی حضرت!

دعاؤں کے ساتھ مجھے رخصت کیا۔

یادگار حوصلہ افزا کلمات

جس روز معین مدرسی کا انٹرویو ہوا اور شام کو دفتر تعلیمات سے ہم دو طلبہ کی کامیابی کا اعلان آویزاں کیا گیا، اسی روز احقر بعد عصر متصلا حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں حاضر ہوا، اس وقت کمرے میں حضرت مفتی صاحب، احقر اور آپ کے خادم خاص ہمارے تکمیل افتاء کے ساتھی مولوی محمد فائز سلمہ بھی موجود تھے۔ سلام کے بعد حضرت نے فرمایا:

تیرا نام اسجد ہے؟؟؟

میں نے اثبات میں جواب دیا،

فرمایا:

تیرا انتخاب ہو گیا۔

اور ہم نے تمہارے ساتھی کے نام پر نتیجہ لکھا تھا

۔۔۔۔۔اچھا۔۔۔۔۔۔۔،

اور تیرے نام پر لکھا تھا

۔۔۔۔بہت اچھا۔۔۔۔۔،

اب محنت کرو اور پڑھاؤ۔ پھر لوگ آتے گئے اور کمرۂ ملاقات بھرتا گیا۔ مغرب سے کچھ پہلے دوسرے ساتھی بھی آگئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے مخاطب ہو کر کچھ اضافہ کر کے یہی

کلمات دوبارہ ارشاد فرمائے۔

آخری دیدار

ماہ رجب کے آغاز میں دار العلوم حاضری ہوئی۔ اچانک یاد آیا کہ جمعرات کو بعد مغرب حضرت الاستاذ مفتی سعید صاحب بخاری کا سبق پڑھاتے ہیں، تو کیوں نہ اس البیلے انداز درس سے مستفید ہوا جائے جس کو سنے اور دیکھے ہوئے چھ سال کا عرصہ بیت چکا ہے میں نے مغرب کی نماز مسجد رشید میں ادا کی اور وہاں سے سیدھا عظیم الشان جدید لائبریری میں واقع دار الحدیث پہنچا۔

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ اسی پہلے کی سی آن بان اور شان کے ساتھ بخاری پڑھا رہے تھے اور دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے بادہ کشوں کے ساغر میں جام و مینا بھر رہے تھے۔ اذان عشا سے کچھ دیر پہلے میں دار الحدیث سے واپس ہوا۔ وہم و گمان میں بھی دور دور تک یہ بات نہ آئی کہ فن تدریس کا یہ چمکتا دمکتا آفتاب اور علم حدیث کا درخشندہ ستارہ اب بہت جلد اپنے لاکھوں شیدائیوں کو سوگوار کر کے اس جہان رنگ و بو سے رخت سفر باندھنے والا ہے

آخری گفتگو اور وہ خواب جو نتیجۃً سچ ثابت ہوا

ماہ شعبان کے آخر میں احقر نے خواب دیکھا کہ دورۂ حدیث کی تعلیم مسجد رشید کے تہ خانے میں ہو رہی ہے۔ میں اکیلا رشید مسجد سے باہر آ رہا ہوں اور حضرت الاستاذ مفتی سعید صاحب تن تنہا، نہایت ضعف کے ساتھ ہاتھ میں عصا لیے مدنی گیٹ کی طرف سے مسجد میں داخل ہو رہے ہیں، درمیان میں میری حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی، سلام مصافحہ ہوا (میرا شعبان و رمضان میں عمرے کا ارادہ تھا، جو لاک ڈاؤن اور کورونا وائرس کی وجہ سے منسوخ ہو گیا تھا)

حضرت نے فرمایا: تم عمرے کے لیے جا رہے ہو؟ میں نے کہا جی، آپ نے فرمایا:

جاؤ اور میں بھی آؤں گا، پھر میں وہیں سے پوری دنیا میں گھوموں گا اور واپس نہیں آؤں گا، میں بیدار ہوا تو بڑی تشویش اور بے چینی محسوس ہوئی، علاج ومعالجہ سے اگرچہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت نارمل ہوگئی تھی، لیکن اس خواب کے نہایت واضح ہونے کی وجہ سے مجھے رہ رہ کر تشویش ہوتی رہی۔ تحصیل اطمینان کی خاطر احقر نے رمضان المبارک ہی میں حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ سے بذریعہ فون گفتگو کی۔ بڑی خوش مزاجی کے ساتھ بات ہوئی، اخیر میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میرا آن لائن بیان سنا کرو اور ان الفاظ میں دعا کیا کرو اللهم انی اعوذ بك من كورونا ومن كيد الكائدين، الا لعنة الله على الظالمين۔

گفتگو ختم ہوگئی اور آپ کی خوش گفتاری سے محظوظ ہوکر مجھے سکون مل گیا، چند ہی ایام کے بعد آپ کے صاحبزادہ محترم کا واٹس ایپ پر گردش کرتا ہوا میسیج موصول ہوا، جس میں بیماری کی اطلاع اور دعائے صحت کی درخواست کی گئی تھی، اس پیغام کو پڑھتے ہی تشویش عود کر آئی، میں رمضان کے اخیر عشرہ کے اعتکاف میں تھا، بیماری کی اطلاع ملنے پر دعائیں کی گئیں۔۔ لیکن۔۔۔ سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ۔

بالآخر ۲۵؍رمضان المبارک کی صبح یہ خبر الم اثر ملنی شروع ہوگئی کہ حضرت الاستاذ شیخ الحدیث وصدر المدرسین مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری اس دار فانی سے دار باقی کی طرف کوچ کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، یہ قضا وقدر کے فیصلے کب کسی کی تمناؤں سے ٹلے ہیں۔

ایک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

مولانا اسجد عقابی...... استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

دل بوجھل ہے، قلم خاموش ہے، آنکھیں اشکبار ہیں، زبان گنگ ہے، ذہن معطل ہے، اعضاء وجوارح ساکت وصامت ہیں، لب سلے ہوئے ہیں، الفاظ کا دامن تنگ ہے اور خیالات اس ذات گرامی کی فرقت سے رنجور ومنتشر ہیں، جو تنہا ایک ملت کی حیثیت رکھتا تھا جس کے الفاظ و بیان نے ہزاروں لاکھوں گم گشتہ راہ لوگوں کو دین مستقیم کا راستہ دکھایا تھا جس کی ذات گرامی اہل اسلام اور عالم اسلام کے لئے نعمت مترقبہ اور جس کا وجود مسعود رحمت وبرکت کا سرچشمہ تھا۔ جس کی شخصیت جامع علم وکمالات کا حسین سنگم تھی۔ جس کی ذات سے فضائل ومعارف کے سوتے پھوٹتے تھے۔ جس کا ایک عالم دیوانہ تھا۔ جس کے دیدار کے لئے گوشۂ عالم سے منتسبین جوق در جوق در پر حاضر ہوا کرتے تھے۔ وہ مرجع الخلائق تھے۔ ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کو وقت کے مشائخ اور ارباب علم وادب باعث فضیلت تصور کیا کرتے تھے۔ ایک ہمہ جہت جامع شخصیت علم کا بحر بیکراں عالم باعمل سنت محمدی کا شیدا محدث دوراں ۱۹ر مئی ۲۰۲۰ کے روز ہم سے جدا ہو کر اپنے محبوب حقیقی کے دربار عالیہ میں پہنچ گیا ہے۔

روٹھا وہ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
ایک شخص سارے شہر کو ویران گر گیا

حضرت الاستاذ شیخ الحدیث مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی کے اوصاف وکمالات اور ان کی خدمات کو قلمبند کرنے کیلئے ہزار ہا صفحات کے دفاتر بھی کم ہیں۔ آپ کی کثیر الجہات خدمات کے کسی ایک پہلو کو اگر موضوع بنایا جائے، تو بھی

اس کا کما حقہ احاطہ کرنا بعید ہے۔

بحیثیت مدرس، آپ کا درس قابلِ ستائش اور قابل ذکر ہی نہیں، بلکہ ملک اور بیرون ملک میں آپ کے بے شمار فیض یافتگان اس نرالے انداز درس کو اپنائے ہوئے ہیں اور اس بات کا فخریہ اظہار کیا کرتے ہیں کہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انداز کی کوشش ہے۔ آپ کا درس بے حد مقبول تھا۔ طلبہ کا اژدحام آپ کے درس میں ہوا کرتا تھا۔ زائرین کی بڑی تمنا یہ بھی ہوا کرتی تھی کہ، حضرت مفتی صاحب کے درس میں بیٹھنے کی سعادت حاصل ہو جائے۔

انداز بیان نہایت شیریں تھا، دوران تقریر افہام و تفہیم کے ایسے اچھوتے انداز کو اپناتے جس سے عام فہم انسان بھی مسائل کی تہہ تک بہ آسانی پہنچ جایا کرتا۔ آپ دوران سال اسباق کی پابندی کے پیش نظر اسفار سے حتی المقدور گریز کیا کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اخیر عمر تک آپ سے متعلق کتاب (بخاری شریف) ہمیشہ درایت کے ساتھ پڑھائی گئی ہے اور یہ آپ کا وہ بے نظیر کارنامہ ہے جس کی مثال دور حاضر میں شاید و باید ہی کہیں اور کسی کے متعلق دریافت ہو سکے۔ طرز تدریس نے آپ کو طلبہ کرام کے لئے مشعل راہ بنا دیا تھا۔ آپ سے طلبہ کا والہانہ لگاؤ، ایسا امر بدیہی ہے، جس کیلئے کسی مثال یا واقعہ کی ضرورت نہیں ہے ملک و بیرون ملک کے طول و عرض میں پھیلے علماء کرام کی ایک بڑی جماعت، حدیث کی تفہیم کے لئے براہ راست آپ سے رابطہ کرتی، بلکہ بعض تو طویل سفر طے کر کے دیوبند پہنچ جایا کرتے تھے اور اپنے مسائل کو حل کراتے۔

دارالعلوم کے زمانہ تدریس میں یوں تو تقریباً تمام کتابیں آپ سے متعلق رہی ہیں اور بیشتر کتابوں پر آپ نے از سر نو کچھ تسہیلی یا تشریحی کام کئے ہیں، لیکن چار اہم کتابیں ایسی ہیں جن کو پڑھانے کے ساتھ آپ نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جنہیں الفاظ کے سانچے میں پرویا نہیں جا سکتا۔ آپ نے ان یاقوت و زمرد اور جواہر کو یکجا کیا ہے، جسے تتبع بسیار کے باوجود دریافت کرنا جوئے شیر لانے سے کچھ کم نہ تھا۔

دارالعلوم دیوبند میں ترمذی شریف آپ سے ایک طویل زمانہ تک متعلق رہی ہے

اور آپ نے اس کتاب کا وہ حق ادا کیا ہے، جسے آج آپ کے ہزاروں فیض یافتگان مسلسل لکھ رہے ہیں یا کہہ رہے ہیں۔ دوران درس آپ نے ترمذی شریف کی اردو شرح (تحفۃ الالمعی) کی ترتیب کا ذہن بنایا، اور اچھوتے انداز پر، جس میں محدثانہ گفتگو کے ساتھ، اسماء الرجال پر کلام، صحت حدیث کے متعلق دیگر ائمہ فنون کی بیش قیمتی آراء اور ان سب سے بڑھ کر، فقہی مباحث کو اُجاگر کیا ہے۔ فقہی مباحث میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت سلیس وشستہ اور شائستہ انداز بیان کو اپناتے ہوئے مسائل کو مجلی ومنقح کیا ہے۔

بعد ازاں، جب صحیح بخاری آپ سے متعلق ہوئی، تو آپ نے ترجمۃ الباب ترتیب بخاری، فقہ بخاری اور دیگر فقہاء کرام خصوصاً ائمہ اربعہ کے مسائل واختلافات کو بھی اپنے کلام کا محور بنایا، جس سے قاری کا ذہن پیچیدگی میں الجھنے کے بجائے بسہولت معاملہ کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔ درس بخاری کو بنام (تحفۃ القاری) باضابطہ مرتب فرما کر، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی حیات مبارکہ میں ہی مکمل کرا دیا تھا۔

ہندوستان کے مسلمانوں کا ہر طبقہ اپنے آپ کو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے جوڑتا ہے۔ ہر کوئی ان کے نام کو فخریہ بیان کرتا ہے۔ اور اپنا علمی سلسلہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے مکمل کرتا ہے۔

لیکن حضرت محدث دہلوی کی کتابوں سے استفادہ کا جو حصہ محدث دار العلوم حضرت مفتی سعید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو نصیب ہوا ہے، وہ بہت کم افراد کے حصے میں آیا ہوگا۔ آپ نے حضرت محدث دہلوی کی کئی کتابوں پر کام کیا ہے اور آپ کا یہ کام مقبول عام و خاص ہے لیکن ایک ایسا کارنامہ جس سے اب تک پورا ہندوستان گزشتہ کئی سو سالوں سے محروم تھا اور علمی دنیا جس کی صدیوں سے مقروض تھی اور جس کی وجہ سے حضرت محدث دہلوی کی معرکۃ الآراء کتاب (حجۃ اللہ البالغۃ) سے استفادہ محض عربی زبان وادب کے ماہرین تک محدود تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے اس کتاب کی بہترین طرز تحریر اور سہل انداز اردو زبان میں (رحمۃ اللہ الواسعۃ) کے نام سے مفصل شرح لکھی۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ

علیہ کا یہ علمی کارنامہ پورے عالم اسلام کے لئے عظیم اور نایاب تحفہ ہے۔ حضرت محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے نسبت کا جو حق اس کتاب کے ذریعہ ادا کیا گیا ہے، وہ رہتی دنیا تک آنے والوں کے لئے انمول تحفہ ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ، علماء طبقہ کے علاوہ کالج اور یونیورسٹی سے متعلق افراد کیلئے بھی یہ سب سے موزوں اور معتبر مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔

قرآن کریم، جو مذہب اسلام کے لئے سرچشمۂ ہدایت ہے۔ قرآن کے اعجاز و معارف ہر دور اور ہر زمانے میں یکساں رہے ہیں۔ اس کی افادیت تا قیامت یوں ہی جاری و ساری رہے گی۔ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حالات حاضرہ، عوامی رجحان اور عام لوگوں کی استعداد کے پیش نظر نہایت شیریں اور بار آور تفسیر بنام (ہدایت القرآن) اپنے اخیر زمانے میں مرتب فرمائی۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اب عوام تو عوام علماء کے طبقہ (طلباء) میں بھی اتنی صلاحیت نہیں رہ گئی ہے کہ وہ بیان القرآن سے براہ راست کما حقہ استفادہ کر سکیں، اس لیے طلبہ کو چاہیے کہ وہ (ہدایت القرآن) کا مطالعہ کریں کیونکہ اس کی زبان سہل ہے۔

مرور زمانہ نے اردو زبان پر جو اثر ڈالا ہے اور جس طرح اردو زبان کے محاورے اور تمثیلات کی جگہ عام فہم الفاظ نے لی ہے، اکابرین عظام کی بے شمار کتابیں عوام الناس کی سمجھ اور فہم سے کوسوں دور ہوگئی ہیں۔ اس بات کے پیش نظر، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت نانوتوی اور دیگر اکابرین کی کتابوں کی تسہیل کا ایک نیا سلسلہ جاری فرمایا تھا جس کی بدولت آج الحمدللہ کئی کتابیں تسہیل کے مراحل طے کرنے کے بعد توجہ کا مرکز بنی ہیں۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس کارنامے کو سراہتے ہوئے، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ یہ ان چند طریقوں میں سے ایک ہے، جس پر ہم نے بارہا غور کیا ہے، اور کام کرنے کا ارادہ کیا ہے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علمی کارناموں اور تحریری افادات اور تقریری خطبات کا عظیم سرمایہ ملت کے پاس موجود ہے اور حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

سے وابستگی کا حقیقی حق یہ ہے کہ آپ کے علمی ورثہ کو کما حقہ محفوظ رکھا جائے، تاکہ آنے والی نسلوں کے لئے علم کا یہ بیش بہا خزینہ موجود رہے۔

عملی میدان میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہایت متقی اور مشفق رہے ہیں۔ اتباع سنت میں بے نظیر اور حد درجہ اہتمام کرنے والے تھے۔

اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کی خواہشات کی یوں بھی تکمیل فرمایا کرتا ہے۔ جب حضرت شاہ وصی اللہ الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے بعض متوسلین و منتسبین نے بعد از مرگ مزار پر پھول وغیرہ چڑھانے اور دیگر افعال کی خواہش ظاہر کی تو حضرت شاہ وصی اللہ الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کو شاق گزرا اور آپ بکثرت یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

پھول کیا ڈالو گے تربت پر میری
خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائے گی

چنانچہ ہوا بھی یہی، پانی جہاز میں حج کے سفر کے دوران آپ کا انتقال سمندر کے ایسے علاقے میں ہوا، جہاں سے خشکی تک پہنچنا متعینہ مدت میں ممکن نہیں تھا۔ اللہ نے اپنے ولی کی زبان کی یوں لاج رکھی اور نماز کے بعد جنازہ دریا برد کر دیا گیا۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تعزیتی اجلاس، قبر کی شناخت، میت کو بغرض تدفین ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا عمل وغیرہ پسند نہیں تھا۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بارہا دوران درس اور کبھی اپنے خطاب میں بھی ان موضوعات پر اپنی رائے اور ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا۔ اللہ کی قدرت، اللہ نے اپنے اس ولی کامل، فنا فی اللہ اور متبع سنت کی رائے کی ایسی لاج رکھی کہ، ہزاروں وابستگان آبدیدہ آنکھوں سے جنازہ کے دیدار کو ترس گئے اور وہ بندۂ خدا ایک عالم کو اپنے پیچھے زندگی بھر کا رنج و غم اور حزن و ملال دے کر خاموشی کے ساتھ سرزمین ممبئی کو اپنے باسعادت و بابرکت وجود سے منور کر گیا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے

مولانا احمد نور عینی

خادم تدریس: المعہد العالی الاسلامی حیدر آباد

یہ دنیا فانی ہے، رب ذوالجلال کے سوا ہر ایک کو فنا آشنا ہونا ہے، كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (الرحمٰن:26، 27) كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ (القصص:88)، یہاں حیات سرمدی کسی کے نصیب میں نہیں، وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ أَفَإِنْ مِتَّ فَهُمُ الْخَالِدُون (الانبیاء:34) كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (آل عمران:185) یہاں آنے والا ہر شخص جانے کے لیے آتا ہے؛ مگر ہر جانے والے کا جانا ایک جیسا نہیں رہتا:

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آتے ہیں مرنے کے لیے

ہر جانے والا جاتے جاتے اپنے جانے کا غم دے جاتا ہے، دلوں کے طاقچوں میں رنج وملال کی قندیل جلا جاتا ہے، جو جانے والا جتنے زیادہ دلوں کے طاقچوں میں غم کی قندیل اور یادوں کے چراغ رکھ جاتا ہے وہ اتنا ہی عظیم اور ہر دل عزیز ہوتا ہے، حضرت الاستاذ شیخ الحدیث مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری رحمہ اللہ تعالی ان عظیم اور ہر دل عزیز بندگان خدا میں سے تھے جن کے جانے کے غم میں نہ جانے کتنی آنکھیں اشک بار اور کتنے دل سوگوار ہیں:

ویراں ہے میکدہ، خم وساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

حضرت الاستاذ کی زندگی بھی قابل رشک تھی اور موت بھی قابل رشک ہے رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں داعیِ اجل کی دعوت پر لبیک کہا، ہمیں خدا کی ذات سے پوری امید ہے کہ کہنے والے نے کہا ہوگا: يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً (الفجر: 27، 28)، حضرت الاستاذ اب اس جہاں میں نہیں رہے مگر ان کی یادوں کی قندیل ہمارے دلوں میں سدا ضوفشانی کرتی رہے گی۔

جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے

حضرت الاستاذ شیخ الحدیث ضرور تھے؛ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف حدیث اور علوم حدیث کے ہی ماہر تھے، حضرت مختلف الجہات صلاحیتوں اور مختلف علوم وفنون کی مہارتوں کے حامل تھے، حضرت کی تصنیفات پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوگا کہ حضرت کی شخصیت کتنی عبقری تھی، تفسیر میں ہدایت القرآن، اصول تفسیر میں الفوز الکبیر کی تعریب اور اس کی عربی شرح العون الکبیر، اصول حدیث میں نخبہ کی اردو شرح تحفۃ الدرر، مقدمۂ مسلم کی اردو شرح فیض المنعم، شروح حدیث میں بخاری کی اردو شرح تحفۃ القاری، ترمذی کی اردو شرح تحفۃ الالمعی، شرح معانی الآثار کی عربی تلخیص زبدۃ الطحاوی، اصول افتا میں شرح عقود رسم المفتی کی شرح آپ فتوی کیسے دیں، اسرار شریعت میں حجۃ اللہ البالغۃ کی شرح رحمۃ اللہ الواسعۃ، منطق میں آسان منطق، تہذیب المنطق کی شرح مفتاح التہذیب، فلسفہ میں مبادی الفلسفہ اور اس کی اردو شرح معین الفلسفہ، اسماء رجال میں المغنی کی عربی شرح تہذیب المغنی، نحو میں آسان نحو اور صرف میں آسان صرف وغیرہ، یہ تو درسیات سے متعلق تصنیفات ہیں، اس کے علاوہ درسیات سے خارج اور کئی کتابیں ہیں۔

حضرت کو انگریزی زبان سے بھی کافی حد تک واقفیت تھی، دوران درس الفاظ کے معنی کبھی انگریزی زبان میں بھی بتاتے تھے، ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ایک انگریز سیاح دار العلوم وزٹ کرنے کے لیے آیا، دار الحدیث میں آکر اپنے مخصوص کیمرے سے ویڈیو بنانے

لگا، حضرت نے اسے اردو میں ٹوکا تو وہ سمجھ نہیں پایا، حضرت نے اسے قریب بلا کر انگریزی میں سمجھایا، مجھے اس وقت انگریزی نہیں آتی تھی اس لیے حضرت کی بات میں سمجھ نہیں سکا؛ مگر اس سیاح کے سمجھ میں آ گئی اور وہ معذرت خواہانہ مسکراہٹ کے ساتھ دار الحدیث سے باہر چلا گیا۔

حضرت کی پوری زندگی جہدِ مسلسل سے عبارت ہے، حضرت حافظ قرآن بھی تھے مگر آپ نے حفظ کسی مدرسے یا مکتب میں بیٹھ کر نہیں کیا؛ بل کہ افتا کرتے ہوئے خود سے حفظ کیا، یقین محکم، عزم مصمم اور عمل پیہم ہو تو انسان اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے، افتا کرنے والے طلبہ جانتے ہیں کہ افتا کرتے ہوئے حفظ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے، مگر حضرت نے اپنے وقت کی حفاظت کر کے حافظ بننے کی اپنی خواہش پوری کی۔ درس وتدریس تصنیف وتالیف، تحقیق وتعلیق، مطالعہ وکتب بینی حضرت کا اخیر تک معمول رہا، حضرت اپنے شاگردوں کو بھی مسلسل لکھنے پڑھنے میں مصروف رہنے کی تلقین فرماتے تھے، آخری درس میں اپنا دل نکال کر رکھ دیتے تھے، حضرت فرماتے کہ فاضل اور فارغ کے الفاظ دھوکے کے سوا کچھ نہیں ہیں، ابھی تو تمھیں پڑھنے کی شد بد پیدا ہوئی ہے، مدرسہ نے تمھیں علم حاصل کرنے کا راستہ دکھایا ہے، یہاں سے جانے کے بعد تم دس بیس سال تک مسلسل مطالعہ وکتب بینی اور درس وتدریس میں لگے رہو گے تب جا کر تمھیں محسوس ہوگا کہ اب علم آ رہا ہے۔

حضرت کا ایک نمایاں وصف شہرت ودولت سے دوری اور استغنا وبے نیازی ہے آج جب کہ شہرت ودولت ہی مقصد زندگی بن گیا ہے، الا ماشاء اللہ اور اسٹیج کی ''ہوس'' نے ایک بڑی خلقت کے خلوص پر ڈاکہ ڈال رکھا ہے ایسے زمانے میں اپنے آپ کو حب شہرت وحب دولت سے دور رکھنا خود اپنے آپ میں ایک بہت بڑی کرامت ہے، حضرت کو یہ کرامت حاصل تھی، حضرت کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ بلا تن خواہ خدمت انجام دیتے تھے اور یہ بات بھی ہم نے سنی ہے کہ حضرت نے ماضی کی لی ہوئی تن خواہیں بھی حساب کر کے دار العلوم کو واپس کر دیں، یہ ایک بہت بڑی قربانی ہے اور ساتھ ہی ساتھ خلوص وللّٰہیت کی

دلیل بھی۔ حضرت کا عام معمول تھا کہ ایام درس کے دوران کہیں کا سفر نہیں فرماتے تھے استثنائی صورتیں ہوسکتی ہیں؛ لیکن عام معمول یہی تھا، ہم نے ایک سے زائد مرتبہ حضرت کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میرے پاس مستقل دعوت نامے آتے رہتے ہیں؛ لیکن میں تم لوگوں کی وجہ سے سفر نہیں کرتا؛ کیوں کہ تم لوگ ہم اساتذہ کی وجہ سے یہاں آتے ہو، حالاں کہ اسفار کرنے میں ہمارا دوہرا فائدہ ہے، ایک یہ کہ شہرت ہوتی ہے، آو بھگت ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ لفافے ملتے ہیں اور ہدیے تحائف ملتے ہیں؛ مگر اس کے باوجود میں اس لیے اسفار نہیں کرتا کہ کہیں تمہارا نقصان نہ ہوجائے۔ حضرت الاستاذ کے یہ جملے بہ ظاہر بہت معمولی لگ رہے ہوں مگر یہ جملے اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ حضرت ان اسلاف کی یادگار تھے جو قوم کی نسلوں کو بنانے کے لیے اپنے دنیاوی فائدے کو تیاگ دیتے ہیں۔

حضرت نزاعی مسائل سے اپنے آپ کو دور رکھتے تھے، تقسیم دار العلوم کے قضیۂ نامرضیہ میں حضرت کی کیا پوزیشن تھی میں اس بابت کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا؛ کیوں کہ اس وقت عالمِ وجودِ عدم نما میں میرا وجود نہیں تھا؛ البتہ جمعیۃ کے اختلاف کے وقت میں دیوبند میں ہی تھا، حضرت الاستاذ ان معدودے چند اساتذہ میں سے ایک تھے جو عملا بالکل غیر جانبدار تھے، اختلاف کے انہی ایام میں جب کہ دونوں جمعیتوں کی طرف سے اجلاس عام منعقد کیے جارہے تھے، ایک دن دلی میں کسی ایک جمعیۃ کی طرف سے اجلاس عام تھا، اس اجلاس کا اثر دار العلوم پر بھی پڑا اور درس گاہوں میں مغرب بعد والے گھنٹے نہیں ہوئے، مگر حضرت الاستاذ حسب ضابطہ تشریف لائے اور حسبِ معمول عشا تک درس دیا، اسی دن کچھ شرپسند لڑکوں نے جمعیۃ کے جھگڑے کو لے کر موقع پا کر قریب نصف شب کو فساد و انتشار برپا کیا اور صورت حال قابو سے باہر ہوگئی، حضرت کو اس کی اطلاع ملی تو آدھی رات گذر جانے کے باوجود حضرت گھر سے مدرسہ پیدل تشریف لائے اور دار الحدیث میں طلبہ کو جمع کر کے بہت پیار سے سمجھایا تب کہیں جا کر حالات قابو میں آئے ورنہ تو شرپسندوں نے ایسی اودھم مچا رکھی تھی کہ پولیس کو طلب کیے بغیر حالات کا قابو میں آنا مشکل تھا۔

آج ہماری قوم اکابر پرستی اور اکابر بیزاری کی دو انتہاؤں پر ہے، حضرت ان دونوں انتہاؤں کے بیچ اعتدال کی راہ پر گامزن تھے، وہ اکابر کا پورا احترام کرتے تھے اور عقائد کے باب میں خاص کر اپنے اکابر کی تشریحات پر اعتماد کرتے تھے، مگر اکابر کے ہر قول وفعل کو آنکھ بند کر کے تسلیم کرنے کے قائل نہ تھے، انھیں جو بات یا جو عمل غلط لگتا اس پر تنقید کرتے، جماعت اسلامی کے بارے میں ان کی سخت گیری تو مشہور ہے ہی؛ مگر انھوں نے تبلیغی جماعت پر اور خود دار العلوم پر بھی تنقیدیں کیں، مزار قاسمی میں لگے ہوئے کتبے پر وہ ہر سال درس میں تنقید کرتے تھے، دیوبندیت کے بارے میں فرماتے تھے کہ مجھ سے حضرت مولانا منظور نعمانیؒ نے فرمایا تھا کہ بریلویت اور دیوبندیت کے درمیان صرف ایک بالشت کا فرق رہ گیا ہے، پھر فرماتے کہ اب یہ ایک بالشت کا فرق بھی ختم ہو گیا ہے۔ تبلیغی جماعت میں فی سبیل اللہ کے مفہوم کو جو عام کر دیا گیا ہے اس پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے کہ یہ شریعت میں معنوی تحریف ہے۔ مدارس کے مروجہ نصاب پر تنقید کرتے ہوئے کہتے تھے کہ اس نصاب میں سب سے مظلوم کتاب خدا کا کلام یعنی قرآن ہے، اس نصاب میں نحو وصرف کی تو ایک ایک درجن کتابیں ہیں مگر قرآن سمجھنے کے لیے صرف ایک کتاب ہے اور وہ جلالین جو قرآن کا عربی ترجمہ ہے، حضرت کہتے تھے کہ میں یہ باتیں کہتے کہتے تھک گیا ہوں؛ لیکن کوئی نہیں سنتا تفسیر کا جو نظام درس ہے اس پر بھی حضرت کو اطمینان نہیں تھا، حضرت فرماتے تھے کہ تفسیر کا درس اس طرح ہونا چاہیے کہ استاذ کے سامنے صرف قرآن کا متن ہو، وہ تفسیر کی مراجع کی کتابیں مطالعہ کر کے آئے اور قرآن سامنے رکھ کر اپنے مطالعہ کی روشنی میں درس دے حضرت فرماتے تھے کہ یہ جو طریقہ رائج ہے کہ نصاب میں تفسیر ابن کثیر رکھ دی، قرطبی رکھ دی، روح المعانی رکھ دی، یہ طریقہ صحیح نہیں ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ میں بخاری پڑھانے کے بجائے فتح الباری پڑھاؤں کہ پورا وقت فتح الباری کی عبارت حل کرنے میں چلا جائے گا۔ دورۂ حدیث کے نصاب کے بارے میں حضرت کی رائے تھی کہ فہم حدیث کا دورانیہ ایک سال کے بجائے دو سال ہونا چاہیے، دوسرے یہ کہ بحث کے لیے حدیث کی ہر کتاب سے

ابواب مختص ہونے چاہئیں، تاکہ تکرار نہ ہو اور وقت کا ضیاع نہ ہو، یعنی کتاب الطہارت کو مثلا ابوداؤد سے لے لیا جائے، کتاب الصلاۃ کو مثلا ترمذی سے لے لیا جائے وغیرہ، ایسا نہ ہو کہ بخاری پڑھانے والا بھی کتاب الطہارت پر بحث کر رہا ہو، ترمذی پڑھانے والا بھی کتاب الطہارت پر بحث کر رہا ہو اور ابوداود پڑھانے والا بھی کتاب الطہارت پر بحث کر رہا ہو، جیسا کہ اکثر مدرسوں کا حال ہے۔

حضرت ایک بے باک محقق تھے، ان کی تحقیق انھیں جس نتیجہ تک پہنچاتی اسے اختیار کرتے اور پھر اس پر جم جاتے، انھیں نہ کسی کی ملامت کی پروا ہوتی اور نہ کسی کو خوش کرنے کی خواہش، ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ان کا تحقیقی مزاج اپنے اندر ایک طرح کی سختی لیے ہوئے تھا؛ مگر حاشا وکلا ہم ان کی نیک نیتی پر شبہ نہیں کر سکتے۔ ان کے مزاج میں تصلب تھا ان کی رائے میں پختگی تھی، وہ دونوں ہاتھ میں لڈو لینے کے شوقین نہیں تھے، وہ جسے ناجائز سمجھتے اس کے ناجائز ہونے کا برملا اظہار کرتے، خواہ ان کے اس اظہار کی زد میں خود ان کا ادارہ آ رہا ہو، تصویر کشی اور ویڈیو گرافی کو وہ ناجائز سمجھتے تھے اور خود بھی اس پر سختی سے عمل کرتے تھے، دار العلوم کے احاطہ میں جب دہشت گردی مخالف کانفرنس کا انعقاد عمل میں لایا گیا تو اس میں پریس والوں کو بھی بلایا گیا، پریس والوں نے پوری کانفرنس کی ویڈیو گرافی کی دوسرے دن جب حضرت درس گاہ میں آئے تو کافی غصہ میں تھے، حضرت نے فرمایا کہ یا تو دار العلوم کا دار الافتاء تصویر کی حرمت کا فتوی دینا بند کرے یا دار العلوم تصویر کشی یا ویڈیو گرافی کا عمل بند کرے، ہمیں حضرت الاستاذ کی رائے سے اختلاف ہو سکتا ہے؛ لیکن کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت اپنا موقف رکھنے میں نہ کسی کی ملامت کی پرواہ کرتے تھے اور نہ کسی کو خوش رکھنے کی فکر، نیز حضرت کے قول وعمل میں کوئی تضاد نہیں تھا، وہ جسے ناجائز سمجھتے تھے عملاً اس سے دور رہتے تھے، ایسا نہیں کہ فتوی تو ناجائز کا دے رہے ہوں اور مصلحتاً اس عمل کو کر بھی رہے ہوں۔ حضرت کی تحقیقات کا مطالعہ کرنے والے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ حضرت رسم ورواج، بدعات وخرافات اور ظاہری شان وشوکت کے کافی خلاف رہتے تھے، اس سلسلہ

میں اس قدر احتیاط برتتے تھے کہ بسا اوقات مسئلہ کی نوعیت کچھ اور ہو جاتی تھی اور جو شخص حضرت کے اس مزاج سے ناواقف رہتا تھا تو وہ سمجھ نہیں پاتا تھا اور بدگمان ہونے کا امکان بھی پیدا ہو جاتا تھا۔

حضرت سے ہم نے (2007-2008 کے بیچ میں) تین کتابیں پڑھی ہیں: ترمذی شریف اول، طحاوی شریف، بخاری شریف اول، بخاری کو میں نے اخیر میں اس لیے ذکر کیا کہ اصلاً یہ کتاب حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق تھی؛ مگر آپؒ کی طبیعت مسلسل ناساز ہونے کی وجہ سے تقریباً نصف تعلیمی سال کے آس پاس یہ کتاب حضرت پالنپوریؒ کو دی گئی، اس طرح ہماری بیچ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ہم نے حضرت الاستاذ سے ایک ہی سال میں حدیث کی تین اہم کتابیں پڑھیں، بخاری شریف کے لیے میقات اولی کا آخری گھنٹہ مقرر تھا، حضرت گھنٹہ ختم ہونے کے بعد بھی ایک گھنٹہ پڑھاتے تھے، یعنی تقریباً دو گھنٹے مسلسل درس دیتے تھے، ترمذی شریف کے لیے میقات ثانی کا آخری گھنٹہ مقرر تھا، حضرت عصر کی نماز تک پڑھاتے تھے، طحاوی شریف کا درس حضرت مغرب کے بعد عشا تک دیتے تھے، حضرت کے مکان کی دوری دار الحدیث سے تخمیناً لگ بھگ ایک کیلو میٹر ہوگی، حضرت پیدل ہی تشریف لاتے تھے، ادھر چند سالوں سے رکشہ پر جانے لگے تھے گویا روزانہ تین مرتبہ اتنی لمبی مسافت پیدل طے کرکے آتے تھے، حضرت پان کھاتے ہوئے آتے، احاطۂ مولسری کے نل کے پاس آکر کلی کرتے، پھر درس گاہ میں تشریف لاتے حضرت کو کبھی پان منہ میں رکھ کر درس دیتے ہوئے نہیں دیکھا، درس گاہ آنے کے بعد اگر طلبہ کی تعداد کم نظر آتی یا طلبہ بے ہنگم ادھر ادھر بیٹھے نظر آتے تو حضرت درس گاہ کے دروازے سے واپس گھر کی طرف لوٹ جاتے، حضرت کا ’روٹھنا‘ بہت مشہور تھا، سال میں ایک دو مرتبہ ضرور روٹھتے تھے، اخیر کے سالوں میں کیا صورت حال رہی نہیں معلوم، حضرت کا یہ روٹھنا طلبہ کے لیے بہت پریشان کن ہوتا تھا۔ طلبہ کو ایک تو اس بات کا افسوس ہوتا کہ ہم نے حضرت کو ناراض کر دیا دوسرے اس بات کا ٹینشن رہتا کہ حضرت اب آئیں گے یا نہیں، آئیں گے

تو پہلے کی طرح دل لگا کر پڑھائیں گے یا نہیں، نئے طلبہ خاص کر کچھ زیادہ پریشان ہو جاتے تھے، پرانے طلبہ ان کو دلاسا دیتے کہ حضرت کا یہ محبت بھرا روٹھنا ہر سال ہوتا ہے، حضرت پھر آئیں گے اور پہلے کی طرح پڑھائیں گے، ہمارے سال بھی حضرت ایک مرتبہ روٹھے تھے طلبہ کی تعداد معمول سے کچھ کم تھی تو حضرت دروازے سے ہی واپس ہو گئے، ہمارے ترجمان مولانا عبدالرزاق قاسمی نے یہ اعلان کیا کہ حضرت کو منانے کے لیے سارے طلبہ حضرت کے مکان کی طرف چلیں؛ چناں چہ کئی سو طلبہ حضرت کے گھر پہنچے، اتنی بڑی تعداد تھی کہ ایسا لگ رہا تھا کہ عید کی نماز پڑھنے عید گاہ جا رہے ہوں، ترجمان کے ساتھ چند ساتھی اندر گئے، حضرت اس شرط پر راضی ہوئے کہ آئندہ سے تم لوگ ایسی حرکت نہیں کرو گے، محبوب استاذ اور بے پایاں محبت کرنے والے شاگردوں کے درمیان روٹھنے کے اس رشتہ میں محبت کا جو لطف ہے اسے ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

حضرت ایک ماہر اور کامیاب مدرس تھے، حضرت کا درس کافی مقبول تھا، مشکل سے مشکل بات کو بہت آسانی سے مرتب انداز میں ذہن نشین کر دیا کرتے تھے، حضرت کا منہج تدریس یہ تھا کہ پہلے ترجمۃ الباب یا باب کا عنوان سمجھاتے اور اس کے مشمولات کی طرف مختصرا اشارہ فرماتے، پھر طالب علم باب کا عنوان پڑھتا، پھر سند پر کچھ کلام کرنا ہوتا تو حضرت کلام کرتے ورنہ طالب علم ترجمۃ الباب کے بعد سند بھی پڑھتا، سند کے جس راوی پر کلام کرنا ہوتا عام طور پر اس راوی کے نام سے پہلے عبارت خواں کو روکتے، حضرت کا مزاج سند پر باریک اور پیچیدہ بحثیں کرنے کا نہیں تھا، حضرت سند سے زیادہ متن کی تشریح پر زور دیتے تھے سند کی عبارت خوانی ہو جانے کے بعد طالب علم رک جاتا، اب حضرت متن کی تشفی بخش شرح فرماتے، اگر اس کا تعلق کسی فقہی مسئلہ سے ہوتا تو صورت مسئلہ بتا کر حکم مسئلہ کی وضاحت فرماتے، ائمہ کا اختلاف بھی ذکر کرتے، اختلاف نص فہمی کی وجہ سے ہوا ہے یا دلائل کے تعارض کی وجہ سے اس کی نشاندہی کرتے، اگر دلائل کا اختلاف ہوتا تو متن کس کا مستدل ہے واضح کرتے، اگر احناف کا نہیں ہے تو دو باتوں کی وضاحت فرماتے: ایک یہ کہ احناف کا مستدل کیا

ہے؟ دوسری یہ کہ احناف نے اسے مستدل کیوں نہیں بنایا؟ اور اگر نص فہمی کا اختلاف ہوتا تو دو باتوں کی وضاحت فرماتے: ایک یہ کہ اس سے ہر امام نے اور خاص احناف نے کیا سمجھا؟ دوسری بات یہ کہ احناف نے ایسا کیوں سمجھا؟ اختلاف ائمہ کا ذکر کرتے ہوئے ادب الاختلاف کی پوری رعایت کرتے، ہر امام کا نام پورے احترام کے ساتھ لیتے، طنزیہ انداز کے بجائے معروضی انداز اختیار کرتے، عام طور سے فقہ کی اختلافی بحثیں اس انداز سے کی جاتی ہیں کہ دوسرے مسلک والے کے جذبات کو ٹھیس پہنچ ہی جاتی ہے، مگر حضرت الاستاذ پوری بحث اس انداز سے کرتے کہ کسی دوسرے مسلک والے کو تکلیف نہ پہنچے، حضرت فرماتے بھی تھے کہ میری جماعت میں شافعی مسلک کے شاگرد بھی رہتے ہیں، میں ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتا۔ جن مسائل میں غیر مقلدین احناف کو حدیث مخالف باور کراتے ہیں، ان مسائل پر سیر حاصل بحث کرتے، فکری مسائل پر خاص کر وہ مسائل جن پر مغرب کو اعتراض ہے تشفی بخش کلام کرتے، متن کی تشریح ہو جانے کے بعد عبارت خواں اس متن کی عبارت پڑھتا، متن میں کوئی لفظ وضاحت طلب ہوتا تو عبارت خواں عبارت پڑھتے ہوئے جب اس لفظ کے پاس آتا تب اس لفظ کی توضیح کرتے، متن کے شروع میں ہی اس لفظ کو نہ چھیڑتے، درس کی اخیر حدیث تک بل کہ کتاب کی اخیر حدیث تک یہی منہج برقرار رہتا، حضرت کا منہج اُس منہج سے مختلف تھا جو مدارس میں عام طور سے رائج ہے، رائج منہج میں پہلے طالب علم عبارت پڑھتا ہے اور پھر استاذ تشریح کرتے ہیں، جب کہ حضرت الاستاذ پہلے تشریح کرتے پھر طالب علم عبارت پڑھتا، حضرت نے یہی منہج اپنی تمام شروحات میں بھی اختیار کیا ہے، اس منہج کی خصوصیت یہ ہے کہ طالب علم پہلے پوری بات سمجھ لیتا ہے پھر عبارت پڑھتا ہے، بات سمجھنے کے بعد عبارت پڑھنا عبارت فہمی میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ عام طور سے درس نظامی کے دورۂ حدیث کے بارے میں یہ تاثر ہے کہ وہاں عبارت خوانی زیادہ ہوتی ہے، حدیث پر کلام بہت کم ہوتا ہے اور سال کے آخری ایام میں تو کلام تقریباً ہوتا ہی نہیں، یہ تاثر کتنا صحیح ہے بتانے کی ضرورت نہیں ہے؛ مگر جہاں تک حضرت الاستاذ کے درس کی بات ہے تو یہ تاثر سراسر غلط ہے، حضرت

الاستاذ کوئی بھی حدیث تشنۂ تشریح نہیں چھوڑتے تھے، سال کا آغاز ہو یا اختتام، حضرت کے درس کا انداز یکساں ہوتا، نیز حضرت عبارت خوانی کی رفتار میں میانہ روی کو پسند فرماتے، تیز رفتاری کی قطعاً اجازت نہیں دیتے۔

دیوبند کے زمانۂ طالب علمی میں ایک مرتبہ میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ حضرت کے دولت کدہ پر عصر کی بعد کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا، حضرت کے کوئی مہمان بھی وہاں تشریف فرما تھے، حضرت نے دورانِ گفتگو کسی بات پر بہادر شاہ ظفر کی طرف منسوب یہ شعر پڑھا:

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

پھر حضرت نے ظریفانہ انداز میں ہنستے ہوئے فرمایا کہ اور دراز مانگ لیتے، چار ہی دن کیوں مانگے؟ حضرت نے یہ تبصرہ کچھ اس انداز سے فرمایا کہ محفل زعفران زار بن گئی مگر اس وقت کسی کے دل میں یہ خیال نہ آیا ہوگا کہ جب حضرت اپنی عمر طبیعی مکمل کر کے داغ مفارقت دیں گے تو ہر شخص سنجیدگی سے تمنا کر رہا ہوگا کہ اے کاش حضرت کی عمر کچھ اور دراز ہوتی تاکہ امت اور خاص کر تشنہ گان علوم نبوت ان سے مزید استفادہ کر پاتے۔ مگر ذرہ ذرہ دہر کا زندانی تقدیر ہے، فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ (النحل:61)۔

خدائے تعالی حضرت کی قبر کو نور سے بھر دے، حضرت کو جنت الفردوس میں اعلی مقام نصیب فرمائے، پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے:

مثلِ ایوانِ سحَر مرقد فرُوزاں ہو ترا
نُور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

آئی جوان کی یاد.......!

پروفیسر محمد فیضان بیگ صاحب

شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

دارالعلوم دیوبند سے قدیم پشتینی تعلق کی وجہ سے وہاں کے اکابرین ومشائخ اور اساتذہ سے یک گونہ عقیدت ہم سب گھر والوں کو رہی ہے، اگرچہ مجھے براہ راست کبھی کسی دینی ادارہ میں پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن اس کے باوجود من جملہ اور حضرات کے حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری نوراللہ مرقدہ کے نام سے کان نا آشنا نہیں تھے لڑکپن میں جب میں جامعہ ملیہ ہائر سیکنڈری اسکول میں پڑھتا تھا تبلیغ والوں کی برکت سے دین میں کچھ کچھ دلچسپی شروع ہوئی تھی تو ہدایت القرآن کے نام سے ایک پارے کا ترجمہ تشریح وتفسیر حضرت اقدس مفتی صاحب کا کاپی سائز میں چھپا تھا، وہ نظر سے گزرا، پڑھ کر بہت مفید لگا، اس سے مفتی صاحب سے غائبانہ تعلق میں ایک درجہ کی مزید زیادتی ہوئی اور اگلے پاروں کی تلاش شروع ہوئی لیکن دیوبند سے براہ راست تعلق نہ ہونے کی وجہ سے مزید پارے جو نہ معلوم چھپے تھے کہ نہیں، دستیاب نہ ہوسکے، پھر لڑکپن کے کھیل کود میں بات ذہن سے محو ہوگئی۔

مفتی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی پہلی زیارت غالباً ۱۹۸۰ء میں ہوئی، جامعہ ملیہ کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کی طرف سے اسلامی فکر کی تشکیل جدید کے اوپر ایک قومی سیمینار منعقد ہوا تھا، جس کی جگہ ہمارے جامعہ کے ہائر سیکنڈری اسکول کا کومن روم تھا، ملک کے بڑے بڑے دانشوروں اور علماء کا اجتماع تھا، دینی شوق میں ہم بھی چلے گئے، ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ایک کونے میں کھڑے ہونے کی جگہ لی، سنجیدہ علمی مذاکرات تو ہمارے پلے کیا پڑتے، البتہ

ایک دلچسپ لطیفہ ذہن سے چسپاں رہ گیا، قدیم وجدید کا تنازعہ تھا، ملک کے مشہور دانشور پروفیسر سید طاہر محمود صاحب جو بعد میں مانیرٹی کمیشن کے صدر بھی رہے، مناقشہ میں حصہ لیتے ہوئے شکایتی انداز میں بولے کہ آپ علمائے کرام تو جب ہم کچھ کہتے ہیں تو ہماری بات پر کان دھرتے ہی نہیں، ہم کو تو آپ لوگ شیطان سمجھتے ہیں، بس پھر کیا تھا، اس کے اوپر اگلا جملہ مفتی صاحب نے چپکایا کہ ’’نہیں جناب ایسا نہیں ہے‘‘ اگر ہم آپ کو شیطان سمجھتے تو فوراً لاحول پڑھتے اور آپ یہاں سے بھاگتے نظر آتے مفتی صاحب کی اس حاضر جوابی پر پورا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا، ہم لڑکوں کو بہت اچھا لگا کہ علماء بھی اتنے بذلہ سنج ہوتے ہیں، اس کے بعد پھر سالہا سال تک دیوبند کی طرف کوئی رخ نہیں رہا مفتی صاحب کو بھی تقریباً بھول گئے عمر ذرا کچھ اور بڑھی تو جماعتوں میں آنا جانا شروع ہوا، اس درمیان مفتی صاحب کا شمار دار العلوم کے حدیث کے بڑے اساتذہ میں ہونے لگا تھا، میں اس درمیان تعلیمی مراحل سے گزر کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں استاذ ہوگیا تھا، اپنے تبلیغی حلقوں میں کبھی کبھی یہ بات کانوں میں پڑتی تھی کہ دار العلوم میں جو مفتی سعید احمد صاحب ہیں، وہ اپنے درس میں مجلس میں برملا تبلیغ کی بعض باتوں پر تنقید کرتے ہیں، سن کر اچھا نہیں لگتا تھا، سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا کہ کیوں کرتے ہیں، پھر سلسلہ علی گڑھ سے دیوبند جماعتوں میں جانے کا شروع ہوا، بھائی جان حضرت پروفیسر محمد سلمان بیگ صاحب رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ مجاز حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو خود بھی تبلیغ کے کام میں بہت سرگرم تھے بلکہ گویا تبلیغ ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا ان کو بھی دیوبند سے بہت عقیدت تھی، دیوبند میں وہاں کے بہت سے حضرات ان کو جانتے مانتے بھی تھے، مفتی محمود حسن گنگوہی صاحب، مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب اور مولانا ارشد مدنی صاحب وغیرہ سے ان کا خاص تعلق تھا، دیوبند کی حاضری کے دوران جماعت کے اصول کے مطابق علماء کی خدمت میں بھی حاضری ہوتی تھی، اسی سلسلے میں کسی وقت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں بہت ڈرتے ڈرتے اور خدا جھوٹ نہ بلوائے اور معاف کرے بادل ناخواستہ حاضری دی، جا کر دم بخود باادب بیٹھ گئے لیکن ذرا ہی

دیر گزری تھی کہ مفتی صاحب کی شفقت اور دلچسپ باتوں علمی نکتوں اور مزاحیہ چٹکلوں سے طبیعت کا تکدر بالکل دور ہو گیا اور اپنی نالائقی اور بدگمانی پر دل خود کو ملامت کرنے لگا، پھر جب بھی علی گڑھ سے دیوبند حاضری ہوتی تھی حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں بھی ضرور حاضر ہوتے تھے، ہم نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہمارے تایا زاد بھائی مولانا محمد رضوان قاسمی صاحب مقیم مکہ مکرمہ جو مفتی صاحب کے درسی ساتھی یا ہمعصر ہیں ان کا حوالہ دے کر اپنا تعارف کرایا مفتی صاحب بہت خوش ہوئے، ہاتھ کے ہاتھ کئی قصے ان کے سنا ڈالے اور مانوسیت اور بڑھ گئی۔

تعلقات کی یہی حدود در ہیں، جب بھی دیوبند حاضری ہوتی تو حضرت والا سے بھی شرف ملاقات حاصل کر لیتے، پھر اللہ کی توفیق سے یہ سعادت نصیب ہوئی کہ میرے بچوں محمد حبان ارشد حسان کا داخلہ بہت نوعمری میں دارالعلوم میں ہو گیا، اب دارالعلوم میں بار بار حاضر ہونا ایک ضرورت بن گیا، ظاہر ہے کہ وہاں کے حضرات سے عقیدت و تعلق میں بھی اضافہ ہوا اور جب جہاں موقع ہوا ان حضرات کی مجالس سے خوشہ چینیوں کے مواقع بھی زیادہ فراہم ہونے لگے۔ خاص طور سے میاں محمد حبان سلمہ کو مفتی صاحب سے اور مفتی صاحب کو ان سے تعلق بڑھنے لگا فراغت کے بعد تحقیق شامی اور ترتیب فتاوی کے سلسلے میں ان کا قیام مستقل دیوبند ہی میں ہو گیا تو انہوں نے حضرت مفتی صاحب کی عصر بعد کی مجلس کو گویا اپنے اوپر لازم کر لیا کسی بزرگ سے اپنا اصلاحی تعلق قائم کر لینے کی ترغیب پر مفتی صاحب کے علاوہ کسی اور کے لئے تیار نہیں ہوئے، ان کے میلان کی پختگی کو دیکھتے ہوئے میں نے مفتی صاحب سے تنہائی میں یہ بات عرض کر دی اور یہ التجا بھی پیش کی کہ اب میں ان کو آپ ہی کے سپرد کرتا ہوں، جس پر مفتی صاحب نے حامی بھری، میں سمجھ رہا تھا کہ اس قسم کی درخواستیں مفتی صاحب کے یہاں شب و روز کا قصہ ہیں، حضرت کو کب اس کا موقع ہوگا لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ حضرت مفتی صاحب- اللہ ان کی تربت کو ٹھنڈا رکھے- یا تو کسی بات کے لئے ہاں نہیں کرتے تھے اور اگر کر لیتے تھے تو واقعی اس کا حق ادا کر دیتے تھے، یہ گویا ان کی

خردنوازی، عالی ظرفی اور پختگی کردار کا جزو لاینفک تھا۔ مفتی صاحب مجھ کو تھوڑا بہت تو پہچانتے ہی تھے اب اور بھی محبت فرمانے لگے، میں جب بھی حاضر ہوتا حضرت بہت والہانہ انداز میں نہایت بشاشت کے ساتھ ’’آؤ بھئی بیگ صاحب، آگے آجاؤ‘‘ کہہ کر آگے بلا لیتے لیکن یہ ساری محبت اور سارا تعلق صرف عصر کے بعد کی مجلس ہی تک محدود تھا، اگر اپنی حماقت سے کسی اور وقت حاضری کی اجازت مانگی تو ایک آدھ بار کے علاوہ سوکھا صاف جواب انکار ہی میں ملا۔ ایک بار حاضر ہوا تو فرمایا کہ میں آجکل اعتکاف میں ہوں، تفسیر ہدایت القرآن مکمل فرمارہے تھے، فرمایا کہ بغیر اعتکاف کے کوئی کام مکمل نہیں ہوتا، اس لئے جب بھی مجھے کوئی اہم کام کرنا ہوتا ہے تو میں معتکف ہو جاتا ہوں، اس سے مراد حضرت کا تعلقات کے سلسلے کو یکسر منقطع کر کے اپنے تصنیفی کام کو مکمل کرنے کے لیے یکسو ہو جانا تھا، میں نے بھی سوچا کہ واقعی بات تو یہی ہے۔

چند ماہ کے بعد پھر حاضری ہوئی تو تفسیر ہدایت القرآن کا کام تقریباً نمٹ چکا تھا عصر کے بعد کی مجلس میں حاضری کے بعد ایک جلد ہدایت القرآن کی از راہ عنایت مجھے بھی عطا فرمائی مجلس سے اٹھ کے آنے لگا تو فرمایا کہ بیگ صاحب اس کے اوپر کچھ لکھ دیجیو! میں سناٹے میں آگیا، کہ نہ میرا امیدان اور نہ مجھ میں اتنی اہلیت، تاہم علی گڑھ واپس آنے کے بعد امتثال امر میں تفسیر کو دیکھنا شروع کیا تو واقعی بہت اچھوتی، دلچسپ اور نہایت مفید معلوم ہوئی کچھ تاثرات فی البدیہ قلمبند کروا کے ڈرتے ڈرتے حبان میاں کے ذریعہ حضرت کی خدمت میں بھجوادیے، بیس پچیس صفحے کا ایک چھوٹا سا مقالہ سا ہو گیا۔ حضرت کو پیش کیا گیا تو اول سے آخر سب پڑھا اور بہت خوش ہوئے اور بہت تعریف کی، ظاہر ہے کہ میری تحریر اس قابل کہاں تھی، اس کو حضرت کی خردنوازی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے، جب میں حاضر ہوا تو مجلس میں دوبارہ اپنی مسرت کا اظہار کیا، فرمانے لگے کہ لیکن تم نے اس میں تعریف ہی تعریف لکھی ہے، کچھ خامیوں کی نشاندہی بھی کرنی چاہیے۔ میں نے تو دیا ہی اس لیے تھا کہ کچھ تنقید لکھ کر لاؤ تاکہ میری خامیاں مجھے معلوم ہوں، حالانکہ کچھ تھوڑی تجاویز میرے ذہن میں آئی تھیں، لیکن احتراماً میں نے ان کو حذف کر دیا تھا، خیر مجلس کے اختتام پر تفسیر کا پورا سیٹ

مجھ کو عنایت فرمایا اور فرمایا کہ ان پر بھی لکھنا، خاص طور پر آخری جلد کے بارے میں فرمانے لگے کہ اصل مسالہ تو اس میں ہے، اس کو بھی دیکھیں، چنانچہ میں نے آکر اس بے ربط تحریر میں نئی جلدوں کی روشنی میں اور کچھ اضافے بھی کر دیے۔

ظاہر ہے کہ حضرت سے بہت قریب کا اور براہ راست شب و روز والا تعلق تو مجھ پردیسی کا تھا نہیں کبھی کبھی ٹیلی فون پر گفتگو ہو جاتی تھی، وہاں بھی حضرت کی بے تکلفی اور ذرہ نوازی کا یہی حال رہتا تھا، اس سال حضرت کی ختم بخاری کی کیفیت معلوم کر کے بہت تشویش پیدا ہوئی تھی، علاج کے بعد جیسے ہی پتہ چلا کہ حضرت کی طبیعت اب بہتر ہے میں نے فوراً ٹیلیفون پر خیریت معلوم کی تو تعجب کی انتہا نہ رہی کہ حضرت بالکل ہشاش بشاش تھے فرمانے لگے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں، کورونا لاک ڈاؤن شروع ہو گیا تھا، میرے سب بچوں کو فرداً فرداً پوچھنے لگے، یہاں تک کہ ایک بچی جو لکھنو میں تھی اس کو بھی پوچھا کہ لکھنؤ والی آگئی کہ نہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت جب کسی سے تعلق قائم کرتے تھے تو اس میں کتنی سچائی خلوص اور اپنائیت ہوتی تھی۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ حضرت اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ ان کی رحلت کے بعد میری کیفیت کچھ اس عرب شاعر کی طرح سے ہے جس نے اپنے قریبی دوست کی وفات پر اپنے مرثیے میں کہا تھا:

عجبا أتوحشني وأنت إزائي
وضياء وجهك مال سودائي

(میں بڑے تعجب میں ہوں، کہ تو مجھے شدید احساس تنہائی اور وحشت میں مبتلا کر رہا ہے حالانکہ تو میرے سامنے موجود ہے اور تیرے چہرے کی تابانی میری سواد قلب کو پرکے ڈال رہی ہے۔)

حضرت پر تو قریبی تعلقات والے تفصیل سے لکھیں گے، میں نے تو یہ چند سطور دوسروں کے لئے نہیں بلکہ اپنے اندرونی جذبے کی تسکین کے لئے تحریر کی ہیں۔

فقہی بصیرت

اور

تنقیدات

حضرت مفتی سعید احمد پالن پوری قدس سرہٗ اوران کی

اصلاحی تنقیدات

مفتی خلیل الرحمٰن قاسمی برنی بنگلور 9611021347

حضرت اقدس مفتی سعید احمد پالن پوری قدس سرہ یگانۂ روزگار مبصر عالم دین تھے، انھوں نے اپنی ذاتی محنت ولگن کثرت مطالعہ اور علوم شریعت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرنے کے بعد علوم وفنون میں جو مقام بلند حاصل کیا تھا وہ کم ہی لوگوں کے حصہ میں آتا ہے وہ تمام علماء دیوبند کے مرجع اور علمی سہارا تھے۔ موصوف جہاں فن حدیث میں عبقری شان رکھتے تھے وہیں فقہ وکلام میں بھی گہرائی وگیرائی اور بصیرت والی نگاہ کے حامل تھے. اسی لئے انھوں نے جو تنقیدیں کیں وہ بروقت اور ضروری تھیں اور یہ کہ آپ کی تمام تنقیدات برائے اصلاح وارشاد تھیں- اس تحریر میں ہم آپ کی ایسی ہی برائے اصلاح تنقیدات کے کچھ نمونے پیش کررہے ہیں-

پبلک مقامات میں عورتوں کے لئے علٰحدہ نماز کا انتظام ہونا چاہیے

تحفۃ الالمعی میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

یہ جو مسئلہ ہے کہ عورتوں کو مسجد میں نہیں جانا چاہئے، اس کا ردعمل یہ ہوا کہ عورتیں بازار میں یا اسٹیشن پر یا پبلک مقامات میں ہوتی ہیں اور نماز کا وقت ہوجاتا ہے اور نماز پڑھنے کے لئے کوئی جگہ میسر نہیں ہوتی تو وہ نماز قضا کردیتی ہیں، مگر مسجد میں جا کر نماز نہیں

پڑھتیں، کیونکہ ذہن یہ بن گیا ہے کہ عورتوں کو مسجد میں نہیں جانا چاہئے، حالانکہ مسجدیں مردوں کی جاگیر نہیں ہیں، ایسی مجبوری میں عورتوں کو مسجد میں جا کر کسی علیحدہ جگہ میں نماز پڑھنی چاہیے بلکہ پبلک مقامات میں جو مسجدیں ہیں ان میں عورتوں کے لئے علیحدہ نماز پڑھنے کا انتظام ہونا چاہئے، ان کا دروازہ الگ ہو، ان کے وضو وغیرہ کا انتظام الگ ہو، تاکہ عورتیں اپنے دروازے سے آئیں اور نماز پڑھ کر چلی جائیں۔ (تحفۃ الالمعی ص۴۱۶/ ۴۱۷ ج۲)

حکایات اولیاء آنکھ بند کر کے نہیں مان لینی چاہییں

حکایات اولیاء اور واقعات اکابر و بزرگاں کے بارے میں ہمارے معاشرہ میں بڑی افراط وتفریط ہے۔ بیشمار بے سروپا واقعات وکرامات زبان زد عوام وخواص ہیں جن کا شرعی ثبوت ہے اور نہ عقلی، اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی ایسی حکایات بیاں کرتے اور لکھتے نظر آتے ہیں- ایسی ایک مشہور حکایت کے تعلق سے آپ نے فرمایا: یہ واقعہ حکایات اولیاء میں سے ہے اور حکایات اولیاء آنکھ بند کر کے نہیں مان لینی چاہیے ملاحظہ ہو:

حدیث شریف میں ہے کہ: جو شخص اپنا سر امام سے پہلے اٹھاتا ہے اس سے نہیں ڈرتا کہ اللہ تعالی اس کے سر کو گدھے کے سر سے بدل دیں۔

ایک محدث نے اس حدیث کو آزمایا اور بالقصد نماز کے کسی رکن میں امام سے پہلے سر اٹھایا، تو ان کا سر گدھے کی طرح ہوگیا، پھر وہ نقاب ڈال کر حدیث پڑھاتے تھے۔ یہ بے صفحہ کا قصہ ہے۔ طالب علم سوال کرتا ہے کہ: کیا ایسا نہیں ہوسکتا؟ جواب یہ ہے کہ ایک بار نہیں ہزار بار ہوسکتا ہے، مگر ایسا ہوا اس کی کیا دلیل ہے؟ یہ انوکھا اور عجیب و غریب واقعہ اگر ظہور پذیر ہوا ہوتا تو تواتر کے ساتھ منقول ہوتا اور تاریخ کی کتابوں میں اس کا تذکرہ ہوتا اسماء الرجال کی کتابوں میں اس کا ذکر آتا، جبکہ کسی کتاب میں اس کا تذکرہ نہیں، یہ دلیل ہے کہ یہ بے صفحہ کا قصہ ہے۔

سجدۂ سہو کے دو مسئلوں کے مروج عمل پر تنقید

تمام ائمہ متفق ہیں کہ سجدۂ سہو قبل السلام بھی جائز ہے اور بعد السلام بھی، اختلاف صرف اولی اور افضل کا ہے، مگر چونکہ مسئلہ میں خوب بحث ہوئی ہے، اس لئے احناف کے ذہنوں میں قبل السلام سجدے کی گنجائش نہیں رہی۔ اور شوافع بعد السلام سجدے کو جانتے ہی نہیں۔ یہ جو ذہن بن گئے ہیں وہ ٹھیک نہیں۔

(تحفۃ الالمعی ص۲۲۰ ج۲)

سجدۂ سہو کا اصل طریقہ یہ ہے کہ قعدۂ اخیرہ میں سب کچھ پڑھ لے: تشہد بھی، درود بھی اور دعا بھی، اس کے بعد سلام پھیرے، پھر دو سجدے کرے، پھر صرف تشہد پڑھ کر سلام پھیر دے، مگر جماعت کی نماز میں عارضی مصلحت سے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ صرف تشہد پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے، پھر سجدے کئے جائیں اور درود و دعا سہو کے قعدہ میں تشہد کے بعد پڑھے جائیں اور ایسا اس لئے کیا جاتا ہے کہ مسبوق جان لیں کہ یہ ایمر جنسی سلام ہے اور وہ کھڑے ہونے میں جلدی نہ کریں۔ مگر اب طریقہ یہ چل پڑا ہے کہ ہر نماز میں صرف تشہد پڑھ کر سلام پھیر دیتے ہیں، بلکہ بعض کتابوں میں یہی مسئلہ لکھ دیا ہے۔ حالانکہ امام اعظم رحمہ اللہ کے قول کی صحیح صورت وہ ہے جو میں نے بیان کی۔ ائمہ کے اختلاف کو اور احادیث کے مطلب کو سمجھنے کے لئے مذہب کی اصل صورت سے واقف ہونا ضروری ہے۔

(تحفۃ الالمعی ص۲۱۹ ج۲)

حدیث کی صحت کے لئے اس کا کتب فقہ یا تفسیر یا بزرگوں کے ملفوظات میں پایا جانا کافی نہیں

آج کل احادیث کے حوالے کے سلسلے میں ایک کوتاہی یہ ہو رہی ہے کہ حوالہ دیتے وقت اس کتاب کا نام ذکر کر دینا کافی سمجھا جاتا ہے جہاں وہ مذکور ہوتی ہے خواہ وہ کتاب فقہ کی ہو یا وعظ و نصیحت کی یا ارشادات و ملفوظات کی حالاں کہ یہ غلط ہے اس پر تنبیہ کرتے ہوئے مفتی صاحب فرماتے ہیں:

کسی حدیث کا کتب فقہ میں یا کتب تفسیر میں یا بزرگوں کے ملفوظات میں یا کسی اور جگہ پایا جانا حدیث کی صحت کے لئے کافی نہیں یہاں تک کہ وہ حدیث کی کسی کتاب میں نہ ملے اور اس کے تمام روات ثقہ بھی ہوں۔

(تحفۃ الالمعی ص۲۴۶/۲۴۷ ج۲)

قنوت کی دعائیں دو منقول ہیں اس لئے ایک ہی پر اکتفا ٹھیک نہیں

قنوت کی دعائیں روایات میں دو آئی ہیں، ایک ''اللھم اھد نی فیمن ھد یت الخ'' دوسری ''اللھم انا نستعینک، الخ'' پہلی کو شوافع نے اختیار کیا ہے اور دوسری کو احناف نے، اس اختیار کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلی دعا احناف کو عموماً یاد نہیں ہوتی اور دوسری دعا شوافع کو یاد نہیں ہوتی، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ دونوں دعائیں آپ ﷺ سے مروی ہیں۔ پس دونوں دعائیں یاد کرنی چاہئیں اور پڑھنی چاہئیں، کبھی یہ کبھی وہ۔ اور دونوں کو ایک ساتھ پڑھے تو سبحان اللہ۔

(تحفۃ الالمعی ص۳۲۰ ج۲)

دعوت و تبلیغ والوں کا جہاد کے فضائل اپنے کام پر چسپاں کرنا صحیح نہیں

یزید بن ابی مریم کہتے ہیں: عبایہ بن رفاعہ پیچھے سے آکر مجھ سے ملے، میں نماز جمعہ کے لئے جا رہا تھا، انہوں نے کہا: خوشخبری سن لو، آپ کے یہ قدم راہ خدا میں ہیں میں نے حضرت ابوعبس انصاری رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث سنی ہے کہ جس کے قدم راہ خدا میں گرد آلود ہوں وہ جہنم پر حرام ہیں۔

''کتاب الجہاد'' میں آنے والے فضائل ایک خاص کام کے لئے ہیں، لیکن تبلیغی جماعت کے حضرات ان روایات کو عام رکھتے ہیں، بلکہ اپنے ہی کام کو اس کا مصداق

ٹھہراتے ہیں اور ان حضرات نے ''مشکوۃ'' سے جو ابواب منتخب کئے ہیں ان میں پوری ''کتاب الجہاد'' شامل کی ہے، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان کا کام بھی جہاد ہے، میری اس موضوع پر حضرت مولانا محمد عمر صاحب قدس سرہ سے گفتگو بھی ہوئی ہے اور مکاتبت بھی ہوئی ہے، حضرت قدس سرہ کا موقف یہ تھا کہ ہمارا کام بھی جہاد ہے، حضرت نے ایک خط میں اپنی دلیل کے طور پر ''ترمذی شریف'' کی یہی روایت مجھے لکھی تھی کہ عبایہ نے مسجد میں جانے کو فی سبیل اللہ کا مصداق ٹھہرایا ہے، پھر دعوت و تبلیغ کا کام اس کا مصداق کیوں نہیں ہوسکتا؟ میں نے جواب لکھا کہ:

اول تو...... عبایہ صحابی نہیں ہیں، صحابہ کے اقوال حنفیہ کے نزدیک حجت ہیں اور تابعین کے بارے میں خود امام اعظم رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: ''ھم رجال ونحن رجال'' یعنی ان کے اقوال ہم پر حجت نہیں، اگر کسی صحابی نے اس اصطلاح کو عام کیا ہوتا تو بات بھی تھی۔

ثانیا...... دعوت و تبلیغ ہی اس کا مصداق کیوں؟ آپ اگرچہ ''ہی'' نہیں استعمال کرتے ''بھی'' کہتے ہیں، مگر جماعت تبلیغ کے عوام نے تو اس ''بھی'' کو ''ہی'' سے بدل دیا ہے، یعنی وہ اپنے ہی کام کو جہاد کہتے ہیں، بلکہ وہ حقیقی جہاد کو بھی شاید جہاد نہیں مانتے، جہاد (کے فضائل) ان کے نزدیک دعوت تبلیغ میں منحصر ہیں۔

ثالثا...... دیگر دینی کام کرنے والے مثلاً تعلیم و تدریس میں مشغول اور تصنیف و تالیف میں منہمک لوگ اپنے کام کے لئے فی سبیل اللہ اور جہاد والے فضائل ثابت نہیں کرتے، پھر جماعت ہی یہ روایات کیوں استعمال کرتی ہے؟ اس کے بعد حضرت کا اس موضوع پر کوئی خط نہیں آیا۔

البتہ ایک دوسرے خط میں حضرت قدس سرہ نے یہ عقلی دلیل لکھی تھی کہ جہاد حسن لغیرہ ہے، فی نفسہ تو جہاد فساد فی الارض ہے اور دعوت و تبلیغ کا کام فی نفسہ حسن لذاتہ ہے، یہ دعوت الی اللہ اور دعوت الی الاعمال الصالحہ ہے، پس جو فضیلت اور ثواب حسن لغیرہ کا ہے وہ حسن لذاتہ کا کیوں نہیں؟ میں نے جواب میں عرض کیا کہ یہ ثواب میں قیاس ہے اس لئے

معتبر نہیں، کیونکہ قیاس احکام شرعیہ میں چلتا ہے دیگر امور توقیفی ہیں، یعنی ان کے لئے نص چاہئے۔ نیز اجر بقدر مشقت ہوتا ہے اور یہ بات اللہ تعالی ہی بہتر جانتے ہیں کہ کس کام میں کتنی مشقت ہے؟ اور کس کام کا کتنا ثواب ہونا چاہئے؟ بندے یہ بات نہیں جان سکتے اور یہاں تو بات بدیہی ہے، جہاد اصطلاحی کی مشقت کے پاسنگ کو بھی مروجہ تبلیغ کا کام نہیں پہنچ سکتا، پھر وہ اجر وثواب اور وہ فضائل اس کام کے لئے بلکہ کسی بھی دینی کام کے لئے کیسے ہوسکتے ہیں؟ اور آج تک کسی نے یہ روایات دیگر کاموں کے لئے بیان نہیں کیں۔

ملحوظہ...... میں دعوت وتبلیغ کا مخالف نہیں ہوں، میں تمام دینی کاموں کی اور ان کے کارکنان کی قدر کرتا ہوں اور دعوت وتبلیغ سے تو بطور خاص تعلق رکھتا ہوں، مگر میرے لئے اللہ تعالی نے تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف مقدر کی ہے، یہ اپنا نصیب ہے، اس لئے میری بات کو کسی مخالفت پر محمول نہ کیا جائے، بلکہ میں نے جو بات عرض کرنی چاہئے تھی وہ کی ہے۔ (تحفۃ الالمعی ص۵۶۴ ج۴)

تحفۃ القاری جلد سوم صفحہ نمبر 822 پر ارقام فرماتے ہیں:

تبلیغی جماعت کے حضرات اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ ان کا کام جہاد ہے، کیونکہ جب جمعہ کے لئے جانا فی سبیل اللہ ہے تو تبلیغ کے لئے نکلنا فی سبیل اللہ کیوں نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ تبلیغ کے لئے نکلنا فی سبیل اللہ (راہ خدا میں نکلنا) ہے مگر یہ الحاق ہی اس کی فضیلت ہے، جہاد فی سبیل اللہ کے تمام فضائل تبلیغ کے لئے ثابت نہیں کئے جائیں گے، جیسے ”مشکوۃ“، ”کتاب العلم“ میں حدیث ہے: ”من خرج یطلب العلم فھو فی سبیل اللہ حتی یرجع“ جو شخص علم دین حاصل کرنے کے لئے گھر سے نکلا وہ جب تک گھر لوٹ نہ آئے اللہ کے راستہ میں ہے، یعنی طالب علم: مجاہد فی سبیل اللہ کے ساتھ لاحق ہے اور یہ الحاق ہی اس کی فضیلت ہے۔ یا جیسے ایک مرتبہ صحابہ کا سپہ گری میں مقابلہ ہو رہا تھا، نبی ﷺ بھی موجود تھے، دونوں پارٹیوں کے لیڈروں نے اپنے لئے آدمیوں کا انتخاب کیا، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بچ گئے، نبی ﷺ نے ان کو اپنے پاس بٹھالیا اور فرمایا: ”سلمان منّا اھل

البیت'' سلمان ہمارے گھرانے کے فرد ہیں۔ یہ الحاق ہی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے لئے فضیلت ہے، اہل بیت کے تمام فضائل حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے لئے ثابت نہیں کئے جائیں گے۔

مگر تبلیغی احباب کو اصرار ہے کہ ہمارا کام ہی فی سبیل اللہ ہے، پھر وہ جہاد فی سبیل اللہ کے سلسلہ کی تمام آیات واحادیث کو اپنے کام کا مصداق قرار دیتے ہیں، یہ ان کی غلطی ہے، اس لئے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ جو آیات واحادیث جہاد کے ساتھ خاص ہیں تبلیغی کام ان کا مصداق نہیں۔ حدیث شریف میں طالب علم کو فی سبیل اللہ قرار دیا گیا ہے مگر کوئی شخص طالب علم کے لئے جہاد کی آیات واحادیث استعمال نہیں کرتا، اور اہل بیت کے تمام فضائل حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے لئے ثابت نہیں کرتا، اسی طرح تبلیغی کام بے شک دینی کام ہے، مگر اس کام کو ان آیات واحادیث کا مصداق قرار دینا جو مجاہدین کے لئے ہیں، سخت غلطی ہے۔

(تحفۃ القاری ص ۲۲۸ ج ۳)

تبلیغ والوں کا نمازیوں کا خیال رکھے بغیر نماز کے بعد اعلان شروع کردینا

مسجد دراصل نماز پڑھنے کے لئے ہے، پھر دیگر دینی کاموں کے لئے ہے لہذا جب تک لوگ نماز پڑھ رہے ہیں جماعت خانہ میں دیگر دینی کام نہیں کرنے چاہئیں۔ تبلیغ والے نمازوں کے بعد خاص طور پر مغرب کے بعد جلدی دو سنتیں پڑھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اعلان کرنے لگتے ہیں: ''نمازیوں کا خیال کرکے آگے آجائیں'' حالانکہ وہ خود خیال نہیں کر رہے ہیں۔ ابھی لوگ سنتوں میں مشغول ہیں اور وہ یہ اعلان شروع کر دیتے ہیں، اس سے نمازیوں کی نماز میں خلل پڑتا ہے، لہذا ان کو اس سے احتراز کرنا چاہئے، جب لوگ سنتوں سے فارغ ہو جائیں تو دین کے دوسرے کام مسجد میں کرنے کی اجازت ہے۔

(تحفۃ الالمعی ص ۱۴۰ ج ۲)

تبلیغی احباب کہتے ہیں: دعوت کے کام پر جہاد کاثواب ملے گا، یہ صحیح نہیں

تحفہ القاری جلد دوم صفحہ نمبر 215 پر فرماتے ہیں

تبلیغی احباب کہتے ہیں: جہاد حسن لغیرہ ہے، اور دعوت کا کام حسن لذاتہ ہے، پس جو ثواب حسن لغیرہ کے لئے ہے وہ ثواب ہمارے کام کے لئے بھی بدرجہء اولی ہوگا۔ ان کی یہ بات صحیح نہیں، ثواب کا مدار حسن پر نہیں، نماز بھی حسن لذاتہ ہے، مگر اس کے لئے جہاد کا ثواب کوئی ثابت نہیں کرتا، بلکہ اجر کا مدار مشقت پر ہے، اور جہاد کی مشقت میں اور دعوت کی مشقت میں آسمان و زمین کا فرق ہے، پس دونوں کا ثواب ایک نہیں ہوسکتا، اور آیات واحادیث جہاد کا تبلیغ کے کام کے لئے پڑھنا درست نہیں۔

(تحفۃ القاری ص۵۱۲ ج۲)

بزرگوں کی قبروں پر جانا دیوبندیت نہیں

آج کل امت میں بزرگان دین اور اولیاء کرام کی قبروں پر جانے کا جو سلسلہ ہے وہ بہت گمراہ کن اور دین کے لیے بہت بڑے خطرہ کی گھنٹی ہے۔ کئی لوگ اسی سے شرک کی دلدل میں پھنس جاتے ہیں ۔ مردوں سے زیادہ عورتوں کی بڑی تعداد مزاروں پر نظر آتی ہے اور وہ اپنے لین مزاج کے باعث جلد خرافات کا شکار ہو جاتی ہیں. دیوبندی حلقے سے وابستہ ایک بڑا طبقہ بھی جب اس طرح کی خرافات میں مبتلا ہوتا نظر آیا تو اس پر آپ نے تنبیہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اب لوگوں میں زیارت قبور کا سلسلہ تقریبا ختم ہو گیا ہے، سال گذر جاتا ہے، مگر قبرستان کوئی نہیں جاتا، زیارت قبور مامور بہ ہے، اس میں اموات کا بڑا فائدہ ہے، اور زندوں کا بھی فائدہ ہے، اپنی موت یاد آتی ہے، اور دنیا سے دل اکھڑتا ہے، پس گاہ بہ گاہ عام قبرستان میں جانا چاہئے، اس کی طرف سے غفلت ٹھیک نہیں۔ اور یہ جو بزرگوں کی قبروں پر جانے کا

سلسلہ بڑھتا جارہا ہے، یہ دیوبندیت نہیں، یہی سلسلہ بڑھ کر قبر پرستی کی شکل اختیار کرے گا پھر اس زیارت میں زندوں کا کوئی فائدہ نہیں، اولیاء کی قبور پر جا کر اپنی موت کو کوئی یاد نہیں کرتا، یہ مقصد تو (عام) قبرستان میں جا کر پورا ہوتا ہے، پس ہر مہینہ میں کم از کم ایک مرتبہ زیارت کے لئے جانا چاہئے۔

(تحفۃ الالمعی ص466 ج3)

قبروں پر مراقبہ، اور ذکر جهری یه سب باتیں غیر ثابت هیں

حضرۃ الاستاذ علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی قدس سرہ (صدر المدرسین دار العلوم دیوبند) کے ساتھ میں کئی مرتبہ قبرستان قاسمی میں گیا ہوں، جہاں سے قبرستان شروع ہوتا ہے حضرت بجلی کے کھمبے کے پاس رک جاتے تھے، اور تقریبا دس منٹ کھڑے ہو کر کچھ پڑھتے تھے پھر واپس لوٹ جاتے تھے، بس یہی سنت ہے۔

بعض لوگ قبروں پر مراقبہ کرتے ہیں، گھنٹوں سر جھکائے بیٹھے رہتے ہیں، اور بعض لوگ ذکر جہری کرتے ہیں، یہ سب باتیں غیر ثابت اور بدعت ہیں، ان سے احتراز کرنا چاہئے، اور اس سلسلہ میں کسی بھی بزرگ کا عمل حجت نہیں، حجت قرآن وحدیث اور قرون ثلاثہ کا تعامل ہے۔

جب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کا رسالہ ''فیصلہ ہفت مسئلہ'' چھپا اور وہ حضرت گنگوہی قدس سرہ کی خدمت میں پہنچایا گیا تو آپ نے اس کو ہاتھ نہیں لگایا، بلکہ طالب علم سے فرمایا: اس کو حمام میں جھونک دو، اور فرمایا: ''ہم نے حاجی صاحب کے ہاتھ پر بیعت طریقت میں کی ہے شریعت میں نہیں کی''۔

اور یہ واقعہ ہے کہ بعض حضرات انتہائی کبرسنی میں کچھ بدعات کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، اس لئے اگر بزرگوں کا عمل کتاب وسنت کے مطابق ہے تو سر آنکھوں پر، ورنہ

کالائے بد بہ ریش خاوند

(تحفۃ الالمعی ص462 ج۳)

دیوبندیت کا امتیاز مٹ رہا ہے، اکابر کی قبروں پر کتبوں کا رواج

آج مسلمانوں کے قبرستان عیسائیوں کے قبرستان کے مثل نظر آتے ہیں۔ جہاں دیکھو کتبے پکی قبریں اور تو اور دیوبند میں بھی اکابر کے مزارات کتبوں سے پر نظر آتے ہیں۔ اکابر کے ساتھ لوگوں کے اس رویہ اور ان کے مزارات پر کتبوں پر آپ بہت برہم ہوتے اور گاہ بگاہ اس پر تنقید فرماتے۔ چنانچہ (جلسہ تعزیت کا شرعی حکم) نامی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں:

دیوبندیت کا امتیاز انبیاء، اولیاء اوران کی قبور کو صحیح مقام دینا ہے، ان کے بارے میں غلو سے بچنا ہے، مگر اب ہم بھی اولیاء کی قبور کے ساتھ وہی معاملہ کرنے لگے ہیں جن کو بدعات کے دائرے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ اکابر کی قبروں پر کتبوں کا رواج عام ہوگیا ہے جبکہ ''ترمذی شریف'' میں حسن صحیح حدیث ہے، اس میں قبروں پر لکھنے سے منع کیا گیا ہے، ہاں یہ جزئیہ فقہ میں ضرور ہے کہ بڑوں کی قبر پر لکھ سکتے ہیں، مگر بڑا کون ہے؟ اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ پس ماندگان کے نزدیک تو ان کا مرحوم بڑا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ نہ مقبرہ قاسمی میں کوئی کتبہ تھا، نہ حضرت گنگوہی قدس سرہ کی قبر پر، نہ حضرت تھانوی قدس سرہ کی قبر پر، مگر اب مقبرہ قاسمی میں ہم جاتے ہیں تو عیسائیوں کے قبرستان کا سماں نظر آتا ہے۔

(جلسہ تعزیت کا شرعی حکم ص: ۳۹/۴۰)

مسجد کے احاطہ اور مدرسہ میں بزرگوں کی تدفین منع ہے

اب دیوبندیوں میں بزرگوں کی مسجد میں تدفین کا اور مدارس کے بانیان کا مدرسہ میں تدفین کا عام رواج ہو چلا ہے، جبکہ حدیث شریف میں اس کی صاف ممانعت ہے، اپنی ملکیت میں تدفین تو جائز ہے، یا گور غریباں میں تدفین ہو، مسجد اور مدرسہ کسی کی ملکیت نہیں مدرسہ اس کے بانی کا ذاتی وقف نہیں، چندے سے قائم کیا گیا ہے، پھر بانی کی مدرسہ میں

تدفین کا کیا مطلب؟ کل جب جہالت کا دور شروع ہوگا تو انہی قبروں کی پوجا شروع ہوجائے گی۔ (جلسۂ تعزیت کا شرعی حکم ص: ۴۱)

فجر و عصر میں ائمہ کو مقتدیوں کی طرف پوری طرح منہ کرکے بیٹھنا چاہئے

نماز کے بعد مقتدیوں کی طرف منہ کرکے بیٹھنے کا طریقہ عرب ائمہ کا صحیح ہے، وہ پوری طرح گھوم کر لوگوں کی طرف منہ کرکے بیٹھتے ہیں، اور ہمارے یہاں جو طریقہ ہے وہ کعبہ کے احترام میں اور اس کے ادب میں ایسا کرتے ہیں، دائیں بائیں مڑ کر بیٹھتے ہیں تاکہ کعبہ کی طرف پیٹھ نہ ہو، حالانکہ کعبہ کی طرف پیٹھ کرنے کی ممانعت صرف مخصوص حالات میں ہے، پس عصر و فجر کے بعد ائمہ کو لوگوں کی طرف پوری طرح متوجہ ہوکر بیٹھنا چاہئے۔

(تحفۃ القاری ص ۳۵۲ ج ۳)

طلبہ مہمانان رسول ہیں یا سارے مسلمانوں کے مہمان ہیں؟

لوگوں میں مشہور ہے کہ طلبہ مہمانان رسول ہیں، حالانکہ "ترمذی شریف" کی حدیث (۲۴۷۴) میں ان کو "اضیاف اھل الاسلام" مسلمانوں کا مہمان کہا گیا ہے، یعنی تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ دین حاصل کرنے والوں کی کفالت کریں۔

(تحفۃ القاری ص ۱۷۰ ج ۳)

اب مسجدمیں ذراسی تاخیر پر بھی امام کا انتظار نہیں کرتے ، یہ صحیح نہیں ہے

ہمارے معاشرے کی ایک کوتاہی پر فرمایا:

اب ٹن کی نمازیں شروع ہوگئی ہیں جونہی گھڑی میں وقت ہوتا ہے امام کو نماز پڑھانی پڑتی ہے، وہ تاخیر نہیں کرسکتا، اور امام حاضر نہیں ہے تو کوئی بھی پڑھا دیتا ہے، امام کا

انتظار نہیں کرتے، یہ صحیح طریقہ نہیں۔ دور اول میں ائمہ کا مسجد پر کنٹرول تھا، ان کی مرضی کے خلاف نمازیں نہیں ہو سکتی تھیں، یہی سنت ہے۔

(تحفۃ القاری ص ۴۲۵ ج ۲)

ہم نے سحری میں لوگوں کو بیدار کرنے کے لئے نبوی طریقہ چھوڑ دیا

عہد رسالت میں رمضان المبارک کی راتوں میں جو دو اذانیں دی جاتی تھیں ان میں سے پہلی اذان سحری کے وقت کی اطلاع دینے کے لئے تھی، اور دوسری اذان فجر کے لئے تھی، ہم لوگ سحری میں لوگوں کو بیدار کرنے کے لئے دوسرے طریقے اختیار کرتے ہیں، اور جو طریقہ آپ ﷺ کا تھا اس پر عمل نہیں کرتے، یہ ٹھیک نہیں، گھنٹہ، ڈھول اور سائرن وغیرہ نہیں بجانا چاہئے، بلکہ آپ ﷺ کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔

(تحفۃ القاری ص485ج2)

نماز کے بعد دعا کا ترک صحیح نہیں ہے

سلفی کہتے ہیں: اب نمازوں کے بعد دعا کا التزام ہو گیا ہے، اس لئے اس کو بند کر دینا ضروری ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ آپ لوگوں نے عدم دعا کا التزام شروع کر دیا ہے، لہذا اس کو بھی بند کرنا ضروری ہے۔

اصلاح کا یہ طریقہ نہیں کہ اللہ تعالی سے مانگنا بند کر دیا جائے، یہ تو دوسری غلطی ہے، پہلی غلطی التزام دعا تھی، دوسری غلطی ترک دعا ہے، بلکہ اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ امام صاحب وقتاً فوقتاً لوگوں کو مسئلہ سمجھائیں، اور گاہ بہ گاہ اس پر عمل کر کے بھی دکھائیں، ان شاء اللہ ایسا کرنے سے لوگ صحیح بات سمجھ لیں گے۔

(علمی خطبات ص ۵۳ ج ۲)

مدارس میں دار الافتاء کا جال

آج کل ہمارے ملک اور پڑوس کے ملک دونوں میں دار الافتاء کا جال بچھا ہوا ہے

بلکہ اب نئے مدارس دارالافتاء سے شروع ہوتے ہیں، اور داخلہ کے لئے کوئی استعداد ضروری نہیں، ہر فارغ داخلہ لے سکتا ہے، اور چند ماہ میں مفتی بن جائے گا، اور خوش فہمی میں مبتلا ہوجائے گا کہ اسے سب کچھ آ گیا۔ اور لوگ بھی اس سے مسائل پوچھنے لگیں گے اور وہ ”ضلَّ واضلَّ“ کا مصداق بن جائے گا، مگر مدارس میں استعداد سازی پر محنت کرنے والا کوئی نہیں، اس مدرسہ کو چھوٹا مدرسہ سمجھا جاتا ہے (جس میں دارالافتاء نہیں ہوتا) چندہ بھی اس کو کم ملتا ہے، اس لئے ہر شخص دورہ یا دارالافتاء کھول کر بیٹھ جاتا ہے، یہ جو طریقہ تیزی سے چل پڑا ہے یہ بھی تباہی کا پیش خیمہ نظر آتا ہے۔

(علمی خطبات ص۲۷۰ ج۲)

ایک غلط نظریہ کی تردید

لوگ یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند امت کو متحد نہیں ہونے دیتا اس پروپیگنڈہ کی کچھ حقیقت نہیں، دارالعلوم دیوبند مسلک حق کا محافظ ہے، اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ کوئی بھی اشتباہ پیدا نہ ہونے دے تاکہ راہ حق کے راہ رو منزل مقصود تک پہنچ جائیں۔

اور اگر دارالعلوم دیوبند کو یہ الزام دیا جاتا ہے تو یہ الزام تو آقائے مدنی ﷺ تک پہنچے گا، تہتر فرقوں والی حدیث میں یہی تفریق تو کی گئی ہے، پھر یہ الزام حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تک پہنچے گا، آپ نے آیت کریمہ: (کنتم خیر امۃ اخرجت للناس) کی تفسیر میں فرمایا: ”خاصۃ فی اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم“ یہ آیت کریمہ صرف صحابہ کرام کی شان میں نازل ہوئی ہے، اگر قیامت تک کی ساری امت مراد ہوتی تو اللہ تعالی ”انتم“ فرماتے ”کنتم“ نہ فرماتے، پھر فرمایا کہ: صحابہ کے بعد جو لوگ آئیں گے ان میں سے جو لوگ صحابہ کے عقائد واعمال پر ہوں گے وہی آیت کا مصداق ہوں گے۔

پس حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بھی امت میں تفریق کی ہے، یہ الزام تو ان کے سر بھی جائے گا۔

ملت کے اتحاد کی کیا صورت ہوگی؟

ایک سوال......امت کا انتشار امت کی کمزوری کا باعث ہے، اوران کا اتحاد ملت کی قوت کا سبب ہے، پھر ملت کے اتحاد کی کیا صورت ہوگی؟

جواب......اس سلسلے میں یہ قاعدہ جاننا چاہئے کہ ملکی مسائل میں ملک کے تمام باشندوں کو مل کر بیٹھنا چاہئے، اور ملک کی سالمیت کے لئے متفقہ فیصلہ کرنا چاہئے، جنگ آزادی کے وقت ہندو مسلم اتحاد اس کی مثال ہے۔

اور ملی مسائل میں ملت کے تمام فرقوں کو مل کر بیٹھنا چاہئے، اور ملت کی سلامتی کے لئے ایک آواز بلند کرنی چاہئے، مسلم پرسنل لاء کا اتحاد اس کی مثال ہے، مسلم پرسنل لاء میں قادیانیوں کے علاوہ تمام جماعتیں شامل ہیں۔

اور مسلک ومشرب کے اختلاف میں ہر ایک کو اپنی رائے پر رہ کر نزاع سے بچنا چاہئے، اس وقت زیر بحث یہ تیسری صورت ہے، حق اور باطل روشنی اور تاریکی، ہدایت اور گمراہی ایک ساتھ جمع ہوں گے تو نقصان اہل حق کا ہوگا، باطل فرقے اپنی دعوت جاری رکھیں گے اور اہل حق کا میدان تنگ ہوتا جائے گا۔

(جلسہ تعزیت کا شرعی حکم ص:۸۴/۸۵/۸۶)

حضرت مفتی سعید صاحب اور ان کی

فقہی بصیرت کی چند مثالیں

مفتی خلیل الرحمٰن قاسمی برنی

استاذ الاساتذہ، فخر العلماء اور رئیس المحدثین حضرت مفتی سعید احمد صاحب قدس سرہٗ اگر ایک طرف عالم اسلام کے بلند پایہ محدث تھے تو دوسری طرف وہ میدان فقہ کے بھی شہسوار تھے۔ فقہ کے اصول و جزئیات پر ان کو کامل دسترس حاصل تھی اور اس سلسلے میں ان کی فقہی بصیرت اور مہارت کو معاصرین نے بھی تسلیم کیا تھا۔ ان کی فقہی بصیرت کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

قبور پر پھول اور سبز پتے چڑھانا

مسئلہ:…… قبور پر پھول اور سبز پتے درخت کے چڑھانے میں اختلاف ہے، احوط ترک ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: اختلاف پھول پتے رکھنے میں ہے، چڑھانا تو حرام ہے، کیونکہ وہ تو عبادت ہے۔ (فتاوی دار العلوم دیوبند ص ۲۶۸ ج ۱۴)

مسجد میں بچوں کو اجرت لے کر تعلیم دینا

مسئلہ:…… مسجد میں بچوں کو اجرت لے کر تعلیم دینا بہتر نہیں۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: اور اب جب کہ تعلیم قرآن پر جواز اجارہ کا فتوی ہو گیا ہے، کراہیت کی یہ وجہ تو باقی نہیں رہی کہ مسجد میں کوئی بھی ایسا کام کرنا مکروہ ہے جس پر اجرت لی جائے، البتہ ناسمجھ بچے جو مسجد کا احترام ملحوظ نہ رکھ سکتے ہوں ان کو مسجد سے دور رکھنے کا جو حکم

حدیث میں آیا ہے، وہ وجہ باقی ہے، اور نمازیوں کے سکون کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔

(فتاوی دار العلوم دیوبند ص۲۰۴ ج۱۴)

مسئلہ:...... مسجد میں بچوں کو اجرت لے کر تعلیم دینے میں جواز ہی راجح ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: اس مسئلہ میں کچھ اختلاف اس زمانہ میں تھا جب طاعات مقصودہ پر اجارہ کے بطلان کا فتوی تھا، مگر اب جب کہ متأخرین نے جواز کا فتوی دے دیا تو اب جواز میں کچھ شبہ باقی نہیں رہا۔

(فتاوی دار العلوم دیوبند ص۲۰۶ ج۱۴)

لائف انشورنس جائز نہیں، املاک کا انشورنس جائز ہے

مسئلہ:...... بیمہ کرانا مکان وجان کا شرعاً ناجائز ہے، اور یہ قمار ہے جو بنص قاطع حرام ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: بیمہ کی حرمت اس وجہ سے ہے کہ وہ واقعی سود اور قمار پر مشتمل ہے، پہلے زندگی اور املاک کے بیمے ان دونوں باتوں پر مشتمل ہوتے ہوں گے، اس لئے حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے دونوں کو ناجائز لکھا ہے، مگر اب زندگی کا بیمہ تو ان دونوں خرابیوں پر مشتمل ہوتا ہے، اور املاک کے بیمہ میں یہ دونوں باتیں نہیں ہوتیں، اس لئے لائف انشورنس تو حرام ہے، مگر املاک (کار، دکان، سامان وغیرہ) کا بیمہ جائز ہے، میڈیکل انشورنس میں یہ دونوں خرابیاں نہیں پائی جاتیں، اس لئے وہ بھی شرعاً جائز ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ لائف انشورنس میں اگر آدمی مدت بیمہ پوری کرنے سے پہلے مرجائے تو بیمہ کی رقم ملتی ہے، اور مدت بیمہ پوری کرلے اور حادثہ پیش نہ آئے تو بھری ہوئی رقم مع سود کے واپس ملتی ہے، پس اس میں ربا بھی ہے اور قمار بھی کہ معلوم نہیں: بیمہ کی رقم ملے گی یا بھری ہوئی رقم؟ اس لئے زندگی کا بیمہ ناجائز ہے۔

اور املاک کے بیمہ کا طریقہ یہ ہے کہ مثلا کار کا بیمہ کرایا اگر مدت بیمہ میں حادثہ پیش آیا تو حسب قرارداد بیمہ کی رقم ملے گی جو کمپنی کی طرف سے ایک طرح کا تعاون ہوگا۔ اور مدت بیمہ پوری ہوگئی اور کوئی حادثہ پیش نہ آیا تو بھری ہوئی رقم گئی، پس وہ گویا ایک انجمن کی منبری فیس ہے، اور بیمہ کی رقم حادثہ پیش آنے کی صورت میں کمپنی کی طرف سے تعاون ہے، غرض اس میں نہ قمار ہے نہ سود، اس لئے املاک کا بیمہ جائز ہونا چاہئے۔ مفتیان کرام غور فرمالیں۔

اسی طرح جو مال ڈاک وغیرہ سے روانہ کیا جاتا ہے اور اس کا بیمہ کرایا جاتا ہے، اس کا طریقہ بھی املاک کے بیمہ کا طریقہ ہے، اس میں بھی نہ سود ملتا ہے نہ وہ قمار ہے، بلکہ بیمہ کی رقم سیکورٹی (حفاظت) کا معاوضہ ہے، اگر مال مطلوبہ جگہ پر پہنچ گیا تو بیمہ کی رقم یعنی حفاظت کا معاوضہ گیا، اور نہ پہنچ سکا تو ڈاک خانہ وغیرہ معینہ رقم ادا کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے، یہ بھی کمپنی کی طرف سے ایک طرح کا تعاون ہے، مال کا ضمان نہیں ہے، اس پر بھی مفتیان کرام غور فرمالیں۔

(فتاوی دار العلوم دیوبند ص ۵۰۹ ج ۱۴)

جھینگا حلال ہے یا حرام؟

مسئلہ:...... جھینگا دریائی جس کو جھینگا مچھلی کہتے ہیں وہ اقسام مچھلی میں سے ہے اور مچھلی کی تمام اقسام جائز ومباح ہیں۔ اور یہ جھینگا جو ان دیار میں خشکی میں ہوتا ہے یہ ناجائز ہے، کیونکہ یہ حشرات الارض اور خبائث میں سے ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: جھینگا حلال ہے یا حرام؟ یہ مسئلہ اختلافی ہے، حضرت گنگوہی قدس سرہ نے حرام لکھا ہے: فرماتے ہیں:

جھینگا خشکی کا حشرات میں (سے) ہے حرام ہے، اور دریائی غیر ماہی کا ہے (یعنی مچھلی نہیں ہے اور) سوائے ماہی کے سب دریائی جانور حنفیہ رحمہم اللہ کے نزدیک ناجائز ہیں۔

(فتاوی رشیدیہ ص ۵۵۱)

اور ''فتاوی دار العلوم'' کے مذکورہ فتوی میں جائز فرمایا ہے، اور حکم کا مدار اس پر ہے

کہ جھینگا مچھلی ہے یا نہیں؟ علامہ دمیری رحمہ اللہ نے ''حیاۃ الحیوان'' میں اس کو مچھلی قرار دیا ہے چنانچہ ساحل سمندر پر رہنے والے مفتیان کرام نے اس کی حلت کا فتوی دیا ہے، اور ساحل کے رہنے والے مسلمان اس کو کھاتے ہیں۔

''فتاوی رحیمیہ'' میں ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

جھینگا دریائی جانور ہے اور دریائی جانوروں میں مچھلی حلال ہے، اور جو مچھلی نہیں ہے وہ حرام ہے، جھینگا میں اختلاف ہے، بعض علماء نے مچھلی سمجھ کر حلال کہا ہے، اور بعض نے کیڑا خیال کر کے منع کیا، تو یہ جانور مشکوک ہوا اور مشکوک اپنی اصل پر محمول ہے، جھینگا میں اصل مچھلی ہونا ہے، کیڑا ہونے میں شبہ ہے، لہذا ابنا بر اصل کے حلال ہے، حرام قرار دینا صحیح نہیں۔ اور یہ بھی صحیح نہیں کہ جھینگا کیڑا ہے، اس لئے کہ کیڑا پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، اور جھینگا مچھلی کی طرح انڈے سے پیدا ہوتا ہے، نیز مچھلی کی دیگر علامتیں بھی جھینگے میں پائی جاتی ہیں اس لئے جھینگا حرام اور واجب الترک نہ ہوگا، یہ فتوی ہے، اور بچنے میں تقوی ہے، اور تقوی مرتبۂ کمال ہے۔

(فتاوی رحیمیہ ص ۲۵۷ ج ۶، سوال نمبر: ۱۷۹۶)

مگر ڈابھیل کے حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری مدظلہ العالی نے- جو ساحل سمندر کے رہنے والے ہیں- عدم جواز کا فتوی دیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

''تذکرۃ الخلیل'' ص ۲۰۰ر میں عدم جواز کا فتوی ہے، یہی راجح ہے، نیز جب کہ اس میں حرمت کا قول بھی ہے تو اس سے اجتناب ہی بہتر ہے۔ (محمود الفتاوی ص ۳۰۷ ج ۳)

اور حضرت تھانوی قدس سرہ نے اس مسئلہ میں بہت احتیاط کی بات لکھی ہے:

اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ سمک بجمیع انواعہ حلال ہے، اب صرف شبہ اس میں ہے کہ یہ سمک ہے یا نہیں؟ سو سمک کے کچھ خواص لازمہ کسی دلیل سے ثابت نہیں ہوئے کہ ان کے انتفاء سے سمکیت منتفی ہوجائے، اب مدار صرف عدول مبصرین کی معرفت پر رہ گیا ہے، اور اگر مبصرین میں اختلاف ہوگا تو حکم میں بھی اختلاف ہوگا، چنانچہ اسی وجہ سے جریث

میں امام محمد رحمہ اللہ مخالف ہیں، کما نقلہ الشامی، اس وقت میرے پاس ''حیاۃ الحیوان'' دمیری کی جو کہ ماہیات حیوانیات سے بھی باحث ہے موجود ہے، اس میں تصریح ہے ''الروبیان ھو سمک صغیر جدا'' اور اس کے مقبول نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں، پس یہ مقتضی حلت کو ہے، مخزن جو کہ نیز باحث ہے ماہیات ادویہ سے، اس میں گو اس کو ماہی سے تعبیر کرنا حجت نہیں، مگر آگے اس کو حلال کہنا صاف قرینہ ہے کہ اس نے اس کو ماہیت ماہی میں داخل کیا ہے، پس اس سے اور بھی تائید ہوگئی، بہر حال احقر کو اس وقت تو اس کے سمک ہونے میں بالکل اطمینان ہے، ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا، واللہ اعلم۔

(امداد الفتاوی ص ۱۰۳/۱۰۴ ج ۴، سوال: ۸۶)

مگر امام بخاری رحمہ اللہ نے ''بخاری شریف'' ''**کتاب الصلوۃ، باب ما یذکر فی الفخذ** '' میں ایک بہت اچھا اصول لکھا ہے: ''**قال ابو عبد الله : و حدیث انس اسند و حدیث جرھد احوط حتی نخرج من اختلافھم** '' (۵۳/۱) ران ستر ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث اقوی ہے کہ ران ستر نہیں ہے، اور حضرت جرہد رضی اللہ عنہ کی حدیث پر عمل کرنا احتیاط کی بات ہے کہ ران ستر ہے تاکہ ہم علماء کے اختلاف سے باہر نکل آئیں، یعنی بچ جائیں۔ یہی اصول جھینگے میں اپنانا چاہئے، کیونکہ ہر حلال چیز کا کھانا ضروری نہیں، اور ہر حرام سے بچنا ضروری ہے۔

(فتاوی دار العلوم دیوبند ص ۴۶۵ ج ۱۵)

میٹھا اور نمکین دونوں طرح کے کھانے ہوں تو ابتدا کس سے کرے؟

مسئلہ: ...... اگر میٹھا اور نمکین دونوں طرح کے کھانے ہوں تو جس کی رغبت ہو اس سے شروع کرے، شرعا ان امور میں وسعت ہے کچھ تنگی نہیں، البتہ ''شرح شرعۃ الاسلام'' میں لکھا ہے کہ: ابتدا نمکین کھانے سے کرنا بہتر ہے کہ اس میں شفا ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: ''شرح شرعۃ الاسلام'' میں نمک سے ابتدا و انتہا کو لکھا ہے، نمکین

کھانے کو مفتی صاحب رحمہ اللہ نے نمک کے حکم میں لیا ہے۔

(فتاوی دار العلوم دیوبند ص۵۳ ج۱۶)

عورتوں کے لئے غیر محرم مرد کا جھوٹا کھانا اور پانی

مسئلہ:...... غیر محرم مرد کا جھوٹا کھانا اور پانی عورتوں کو اچھا نہیں ہے، لیکن بزرگوں اور صلحاء کا جھوٹا تبرکا درست ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: مہمانوں کا بچا ہوا کھانا گھر میں آیا اور عورتوں کو معلوم نہیں کہ کس کا بچا ہوا ہے تو اس کا کھانا جائز ہے، کیونکہ علت استلذاذ منتفی ہے۔

(فتاوی دار العلوم دیوبند ص۵۷ ج۱۶)

جیٹھ ، دیور ، بہنوئی، چچا ، ماموں اور پھوپھی کے لڑکوں سے پردہ

مسئلہ:...... جیٹھ، دیور، بہنوئی، چچا، ماموں اور پھوپھی کے لڑکے بھی غیر محرم ہیں کیونکہ ان سے نکاح جائز ہے، مگر ہمارے معاشرہ میں ان سے کامل پردہ مشکل ہے۔

اول...... تو ہندوستانی مسلمانوں کی معیشت کمزور ہے، ہر ایک کا گھر علیحدہ نہیں ہوسکتا۔

دوم...... ہندو معاشرہ کا مسلمانوں کے معاشرہ پر اثر پڑا ہے، اور اختلاط عام ہوگیا ہے، اس لئے اس معاملہ میں بھی دو شرطوں کے ساتھ تخفیف مناسب معلوم ہوتی ہے:

(۱)...... بغیر اجازت لئے یہ لوگ اچانک گھر میں نہ آئیں، جب بھی آئیں پہلے آگاہ کریں تا کہ عورت خود کو سنبھال لے اور اعضاء (یعنی: چہرہ، ہتھیلی اور پیر) کے علاوہ باقی جسم ڈھانک لے۔

(۲)...... یہ لوگ تنہائی میں جمع نہ ہوں، اور بے تکلفی سے باتیں نہ کریں۔ حدیث میں ہے کہ: عورتوں کے پاس تنہائی میں جانے سے بچو، ایک انصاری نے پوچھا: جیٹھ، دیور کا کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جیٹھ، دیور تو موت ہیں، یعنی بڑا فتنہ ہیں، کیونکہ جیٹھ، دیور کی بھاوج سے بے تکلفی ہوتی ہے، اس لئے فتنہ پیش آنے میں دیر نہیں لگتی، اور یہی حکم سالیوں کا ہے، ان

کے ساتھ بہنوئی کی بے تکلفی ہوتی ہے، اس لئے فتنہ پیش آتا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جیٹھ، دیور اگرچہ غیر محرم ہیں، مگر چونکہ ان کے ساتھ ہر وقت رہنا ہوتا ہے، اس لئے ان کے ساتھ تنہائی اور بے تکلفی تو جائز نہیں، مگر باقی پردے میں تخفیف ہے۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند ص۲۰۰ ج۱۶)

دوسری بات بلاضرورت جیٹھ، دیور، اور سالی کے ساتھ بے تکلفی اور بے پردگی کی فضا عام ہوگئی ہے، اور علماء وارباب افتاء اور اہل دعوت اور اہل خانقاہ سے وابستہ ایک طبقہ بھی اس میں بہت کوتاہی کر رہا ہے، اس کی اصلاح بہر حال ضروری ہے۔ اہل علم کو اپنے بیانات میں اس پر خصوصی توجہ دلانی چاہئے، اور بار بار دلاتے رہنا چاہئے۔

اہل علم بھی اپنی سالیوں کے ساتھ حرمین شریفین میں عمرہ یا حج کے مواقع پر بے پردگی برتتے ہیں، ان مبارک مقامات پر اہل علم وفضل کا یہ عمل قابل صد حسرت وافسوس ہے

مسئلہ:...... ستر مرد وعورت کا ایک ہے، ناف سے لے کر گھٹنے کے نیچے تک ستر ہے، یعنی چھپانے کا بدن ہے، اس کو بے ضرورت کسی کے سامنے کھولنا جائز نہیں، ایک عورت دوسری عورت کے سامنے جسم کا یہ حصہ بے ضرورت نہیں کھول سکتی، مجبوری کی بات الگ ہے، جیسے بچہ کی ولادت ہے یا کوئی آپریشن کرانا ہے تو وہ الگ مسئلہ ہے، لیکن بے ضرورت نہیں کھول سکتی، مرد وعورت دونوں کا یہی ستر ہے۔

جماعت ثانیہ کی مختلف صورتیں اور ان کا حکم

مسئلہ:...... جماعت ثانیہ کی چند صورتیں ہیں: صورت اولی: مسجد محلّہ میں غیر اہل نے نماز پڑھ لی ہو۔ صورت ثانیہ: مسجد محلّہ میں اہل نے بلا اعلان اذان یا بلا اذان بدرجۂ اولی [۱] نماز پڑھی ہو۔ صورت ثالثہ: وہ مسجد طریق [۲] پر ہو۔ صورت رابعہ: اس مسجد میں امام ومؤذن معین نہ ہوں۔ صورت خامسہ: مسجد محلّہ ہو، یعنی اس کے نمازی اور امام معین ہوں اور انہوں نے اس میں اعلان اذان کی صورت سے نماز پڑھی ہو۔ پس صورت رابعہ اولی میں تو

بالاتفاق جماعت ثانیہ جائز بلکہ افضل ہے، جیسا کہ افضلیت ۳؎ کی تصریح موجود ہے، اور صورت خامسہ ۴؎ میں اگر جماعت ثانیہ بہیئت اولی ہو تب بالاتفاق مکروہ تحریمی ہے، جیسا کہ ”درمختار“ میں تحریمی ہونے کی تصریح ہے، اور اگر ہیئت اولی پر نہ ہو پس محل کلام ہے، امام ابویوسف رحمہ اللہ کے نزدیک مکروہ نہیں اور امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک مکروہ ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں:

۱؎...... یعنی صورت ثانیہ کی ایک شکل تو یہ ہے کہ مسجد محلّہ میں اہل مسجد نے اذان تو دی ہو، لیکن آہستہ دی ہو۔ اور دوسری شکل یہ ہے کہ انہوں نے بغیر اذان دیئے نماز پڑھی ہو، پس جو حکم شکل اول کا ہے وہی حکم -بدرجہ اولی- شکل دوم کا بھی ہوگا۔

۲؎...... یعنی جس کا کوئی امام اور مؤذن مقرر نہ ہوں۔

(فتاوی دارالعلوم جدید: ۲۴/۳)

۳؎...... افضلیت کی تصریح فقط تیسری اور چوتھی صورت میں ہے..... پہلی اور دوسری صورت میں افضلیت کی تصریح نظر سے نہیں گذری۔

۴؎...... یعنی صورت خامسہ کی پھر دو شکلیں ہیں:

اول...... جماعت ثانیہ بہیئت اولی یعنی اذان واقامت اور قیام امام فی المحراب کے ساتھ ہو تو بالاتفاق مکروہ تحریمی ہے، خواہ دوبارہ جماعت اہل مسجد کے علاوہ لوگ کریں یا بعض اہل مسجد کریں۔

دوم...... جماعت ثانیہ ہیئت اولی بدل کر ہو، ہیئت اولی نام ہے تین چیزوں کے مجموعہ کا: یعنی اذان، اقامت اور قیام فی المحراب کا، پس یہ تین باتیں نہ رہیں گی تو پوری طرح ہیئت اولی بدل جائے گی۔ اور اگر دو باتیں مرتفع ہو جائیں (خواہ وہ کوئی سی دو ہوں اذان واقامت ہوں یا اذان وقیام فی المحراب ہوں، یا اقامت وقیام محراب ہوں) تو بھی ہیئت اولی بدل جائے گی، اس لئے کہ اکثر کے لئے کل کا حکم ہوتا ہے، اسی طرح جب ایک بات مرتفع ہو جائے گی تو بھی ہیئت اولی بدل جائے گی، کیونکہ کسی بھی جزو کے ارتفاع سے ہیئت کلی مرتفع ہو جاتی ہے۔

(القطوف الدانية: ص٦/٧/ملخصا)

بہر حال یہ دوسری شکل محل بحث ہے، پہلی بحث تو یہ ہے کہ اس شکل میں صاحب درمختار نے خزائن الاسرار (جو درمختار کا نقش اول ہے) میں تکرار جماعت کو اجماعا جائز کہا ہے۔ چند دیگر حضرات نے بھی یہی لکھا ہے۔ لیکن علامہ شامی رحمہ اللہ نے اس شکل میں تکرار جماعت کو مکروہ کہا ہے۔ پھر انہوں نے اپنے استنباط کو ظہیریہ کی روایت سے (جو ظاہر روایت ہے) مؤید کیا ہے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ اس شکل کے متعلق خود ائمہ مذہب کی روایات بھی مختلف ہیں، امام صاحب رحمہ اللہ سے ظاہر روایت مطلقا کراہت کی ہے، جس میں یہ شکل بھی داخل ہے۔ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک کراہت نہیں ہے۔

(امداد الفتاوی جدید ص۱۴۵ج۲)

مسواک مرد اور عورت دونوں کے لئے سنت ہے

مسئلہ:...... میرے نزدیک مسنونیت مسواک کی عام ہے (یعنی مسواک مرد اور عورت دونوں کے لئے سنت ہے)۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: ابن حجر رحمہ اللہ نے محدث احمد بن منیع رحمہ اللہ کے مسند سے ''المطالب العالیۃ'' (۱/۲۳) میں حدیث نقل فرمائی ہے:

حضرت واثلہ رضی اللہ عنہ (جو صحابی ہیں) ارشاد فرماتے ہیں کہ: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی مسواکوں کو تلوار کی موٹھ کے ساتھ باندھا کرتے تھے، اور عورتیں اپنی اوڑھنیوں میں باندھا کرتی تھیں۔ اس حدیث سے صحابیات رضی اللہ عنہن کا مسواک استعمال کرنا صراحۃً ثابت ہوتا ہے۔ (امداد الفتاوی جدید ص۲۰۱ج۱)

عمل کثیر کی تعریف میں پانچ قول میں سے اصح قول

مسئلہ:...... عمل کثیر کی تفسیر میں اختلاف مشہور ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: عمل کثیر کی تعریف میں پانچ قول ہیں، اصح یہ ہے کہ ”دور سے دیکھنے والا اس نمازی کو یہ خیال کرے کہ یہ نماز میں نہیں ہے“۔

(امداد الفتاوی جدید ص۲۴۲ ج۲)

کپڑے پر دھبا اور وجوب غسل کی چودہ صورتیں

مسئلہ:...... نیند سے بیدار ہونے پر کپڑے میں دھبا ہونے اور خواب کے یاد ہونے و نہ ہونے میں غسل کے وجوب و عدم وجوب کی چودہ صورتیں ہیں:

نمبر	صورت	حکم
۱	منی کا یقین ہو اور خواب یاد ہو............	بالاتفاق غسل واجب ہے..............
۲	مذی کا یقین ہو اور خواب یاد ہو............	بالاتفاق غسل واجب ہے..............
۳	ودی کا یقین ہو اور خواب یاد ہو............	بالاتفاق غسل واجب نہیں ہے..........
۴	منی کا یقین ہو اور خواب یاد نہ ہو..........	بالاتفاق غسل واجب ہے..............
۵	مذی کا یقین ہو اور خواب یاد نہ ہو..........	بالاتفاق غسل واجب نہیں ہے..........
۶	ودی کا یقین ہو اور خواب یاد نہ ہو..........	بالاتفاق غسل واجب نہیں ہے..........
۷	منی اور مذی میں شک ہو اور خواب یاد ہو..	بالاتفاق غسل واجب ہے..............
۸	مذی اور ودی میں شک ہو اور خواب یاد ہو.	بالاتفاق غسل واجب ہے..............
۹	منی اور ودی میں شک ہو اور خواب یاد ہو.	بالاتفاق غسل واجب ہے..............
۱۰	منی، مذی اور ودی میں شک ہو اور خواب یاد ہو	بالاتفاق غسل واجب ہے..............
۱۱	منی اور مذی میں شک ہو اور خواب یاد نہ ہو	طرفین کے نزدیک غسل واجب ہے، امام ابو یوسف کے نزدیک غسل واجب نہیں ہے

۱۲ منی اور ودی میں شک ہو اور خواب یاد نہ ہو طرفین کے نزدیک غسل واجب ہے، امام ابو یوسف کے نزدیک غسل واجب نہیں ہے

۱۳ منی، مذی اور ودی میں شک ہو اور خواب یاد نہ ہو، طرفین کے نزدیک غسل واجب ہے، امام ابو یوسف کے نزدیک غسل واجب نہیں ہے

۱۴ مذی اور ودی میں شک ہو اور خواب یاد نہ ہو بالاتفاق غسل واجب نہیں ہے……….

(امداد الفتاوی جدید ص ۲۴۰ ج ۲)

مرغی کو ذبح کے بعد گرم پانی میں جوش دینا

مسئلہ:……بکری، مرغی یا اور جانوروں کے سر اور پیروں وغیرہ پر ذبح کرنے کے بعد جو خون مسفوح لگا ہوا ہوتا ہے وہ جلا دینے سے پاک ہو جاتا ہے، جب کہ اس کا اثر بالکل زائل ہو جائے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: لیکن سائل کا منشاء غالباً یہ نہیں ہے، بلکہ وہ یہ پوچھ رہا ہے کہ مرغی وغیرہ پرندوں کو ذبح کر کے سرد ہونے کے بعد پر اکھاڑنے کی زحمت سے بچنے کے لئے آگ پر جھلس لیتے ہیں اور کبھی بڑے بڑے پر اکھاڑ کر جو چھوٹے چھوٹے پر جسم پر رہ جاتے ہیں، ان کو جھلس لیا جاتا ہے تو چونکہ ہنوز اس کے پیٹ سے آلائش نہیں نکالی گئی، اس لئے اس کا حکم اس مرغی کے مانند ہوگا جسے ذبح کر کے آلائش صاف کئے بغیر پانی میں جوش دے دیا گیا ہے، یا کچھ اور حکم ہوگا؟

تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس جھلسنے سے وہ مذبوح ناپاک نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ جھلسنا معمولی ہوتا ہے جس کا اثر صرف چمڑی تک رہتا ہے، اندر نجاست تک اس کا اثر نہیں پہنچتا اور جوش دادہ مرغی کے ناپاک ہو جانے کی جو علت تشرب نجاست بیان کی گئی ہے وہ یہاں مفقود ہے، اس لئے وہ پرندہ پاک اور حلال ہے۔

(امدادالفتاوی جدید ص۳۹۱ج۱)

غیر معتدل ممالک میں غروب و شفق کا مسئلہ

مسئلہ:...... فقہی نقطۂ نظر سے دنیا دو خطوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے:

(۱)...... جہاں: ۲۴/ گھنٹوں میں ایک بار طلوع اور ایک بار غروب ہوتا ہے، ان خطوں کی پھر دو قسمیں ہیں:

(الف)...... معتدل ممالک یعنی جہاں رات دن کے اوقات مساوی ہوں، یا اعتدال کے ساتھ کم وبیش ہوئے ہوں۔ (۴۵/ عرض البلد کے اندر کے علاقے)۔

(ب)...... غیر معتدل ممالک: یعنی وہ علاقے جہاں رات دن کے اوقات میں فاحش (بہت زیادہ) کمی بیشی ہوتی ہو، مثلاً برطانیہ جہاں گرمیوں میں: ۱۸/ گھنٹے دن اور چھ گھنٹہ کی رات ہوجاتی ہے۔

(۲)...... جہاں: ۲۴/ گھنٹوں میں ایک بار طلوع اور ایک بار غروب نہیں ہوتا، خواہ وہاں ۲۴/ گھنٹوں میں کئی کئی بار طلوع وغروب ہوتے ہوں، یا: ۲۴/ گھنٹوں سے زائد وقت ایک بار طلوع وغروب کے لئے لگتا ہو...... (امدادالفتاوی جدید ص۴۵۰ج۱)

جوممالک: ۴۵/ عرض البلد سے اوپر واقع ہیں، وہاں شفق دیر سے غائب ہوتی ہے، اور صبح صادق جلدی ہوتی ہے، موسم گرما کے بعض مہینوں میں غروب شفق اور صبح میں بہت ہی کم فاصلہ رہتا ہے، بطور مثال: ۴۵/ عرض البلد کے طلوع وغروب کا نقشہ یہ ہے:

طلوع آفتاب......	۴/۳۵	غروب........	۹/۴۱	دن کی مقدار....	۱۷/۶
غروب شفق بحری..	۱۲/۲۹	صبح صادق....	۱/۵۸	درمیانی فاصلہ...	۱/۳۸

پھر جس قدر اوپر جائیں گے وقت کم ہوتا رہے گا، حتی کہ: ۵۶/ عرض البلد (گلاسگو) میں ۲۰/ جون سے: ۱۲/ جولائی تک بحری شفق غائب ہی نہیں ہوگی۔ اور: ۵۸...۶۰/ عرض البلد (بالائی اسکاٹ لینڈ) میں: ۱۲/ مئی سے: ۲۵/ جولائی تک شفق مذکور غائب ہی نہیں ہوتی

ان دنوں میں ساری رات شفق پر اجالا رہتا ہے۔.......... یہاں مندرجہ ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں:

(۱)...... جو ممالک: ۴۵ رعرض البلد پر ہیں وہاں شفق ابیض اور صبح صادق میں بہت کم فاصلہ رہتا ہے، اس لئے شفق ابیض کے بعد عشاء ادا کرنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

(۲)...... جب ان اوقات میں رمضان آجائے تو تراویح، سحری وغیرہ مسائل بھی حل طلب ہو جائیں گے، یعنی جہاں شفق ابیض اور صبح صادق میں فاصلہ ہی نہیں ہوتا وہاں سحری کب ختم کی جائے گی؟

(۳)...... مثلین کے بعد غروب تک سردیوں میں صرف گھنٹہ بھر کا فاصلہ رہتا ہے، تو کیا حنفی المسلک مثل ثانی میں نماز عصر ادا کرسکتا ہے؟..... (امداد الفتاوی جدید ص ۴۵۶ ج ۱)

بینک کی ملازمت کی تنخواہ جائز ہے

جس ریسٹورنٹ میں حرام گوشت یا شراب بیچی جاتی ہو وہاں نوکری نہیں کرنی چاہئے، دوسری نوکری تلاش کرے، جب مل جائے تو یہ کام چھوڑ دے۔

یہی حکم بینک کی ملازمت کا ہے، اس ملازمت کی تنخواہ جائز ہے، کیونکہ بینک کے پاس صرف سود ہی نہیں ہوتا، اور بھی ذرائع آمدنی ہوتے ہیں، بینک ڈرافٹ بناتا ہے، اور فیس لیتا ہے، یہ جائز ہے۔

(علمی خطبات ملخص ص ۲۹۸ ج ۱)

بطور مشتے نمونہ از خروارے چند مثالیں پیش کی گئی ہیں ورنہ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کی فقہی بصیرت اور نکتہ رسی کے بے شمار نمونے اور مسائل آپ کی تحریروں میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں ۔حضرت مولانا مرغوب احمد لاجپوری مدظلہ العالی نے ایسے اور بہت سے مسائل جن میں حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کی فقہ اور اصول فقہ میں مہارت تامہ کے بہت سارے مسائل وشواہد اپنے ایک مستقل رسالہ ''مفتی سعید احمد پالن پوری کی فقہی بصیرت'' میں جمع کیے ہیں۔ ناظرین وہاں ملاحظہ کرسکتے ہیں۔

مفتی سعید احمد پالن پوری کی فقہی بصیرت

مرتب: حضرت مولانا مرغوب احمد صاحب لاجپوری زید مجدہم

تلخیص وتہذیب : مفتی خلیل الرحمٰن قاسمی برنی

پہلا باب: حضرت کے معمولات

اگر پانی اور مٹی نہ ہوں تو نماز کا حکم اور آپ کا عمل

اگر کسی کے پاس اسباب طہارت (پانی اور مٹی) نہ ہوں تو کیا کرے؟ چونکہ یہ مسئلہ منصوص نہیں بلکہ اجتہادی ہے اس لئے اس میں بہت اختلاف ہوا ہے، ہر امام کی رائے الگ ہے، امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''لا یصلی و یقضی '' فی الحال نماز نہیں پڑھے گا بعد میں قضا کرے گا، اس لئے کہ حدیث میں ہے: ''لا تقبل صلوۃ بغیر طھور '' اور جب آلۂ پاکی موجود نہیں تو فی الحال نماز نہیں پڑھے گا، بلکہ جب پانی یا مٹی پر قادر ہوگا تب وضو کرکے یا تیمّم کرکے نماز قضا کرے گا۔

اور صاحبین رحمہما اللہ فرماتے ہیں: ''لا یصلی بل یتشبہ بالمصلین و یقضی '' فی الحال نماز نہیں پڑھے گا، البتہ نماز کی شکل بنائے گا، یعنی پاک جگہ پر کھڑا ہوگا، قبلہ رو ہوگا، تکبیر تحریمہ کے لئے ہاتھ اٹھائے گا، رکوع سجدہ کرے گا، سلام پھیرے گا، مگر پڑھے گا نہیں، بس نمازیوں کی مشابہت اختیار کرے گا، اور بعد میں قضا کرے گا، اور فتوی صاحبین رحمہما اللہ کے قول پر ہے۔ مگر میں جب کبھی ایسی نوبت پیش آتی ہے تو (بس یا ریل میں ازدحام کی صورت میں) تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول پر عمل کرتا ہوں، اور بعد میں قضا کرتا ہوں۔ (تحفۃ الالمعی ص ۱۸۶ ج ۱)

کیا رکوع سے اٹھتے وقت امام تسمیع اور تحمید دونوں کہے؟ اور آپ کا عمل

رکوع سے کھڑے ہوتے وقت امام صرف تسمیع کہے گا اور مقتدی صرف تحمید۔ یہ رائے امام اعظم، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ کی ہے۔ اور صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک امام تسمیع وتحمید دونوں کو جمع کرے گا اور مقتدی صرف تحمید کرے گا۔ میرا عمل صاحبین رحمہما اللہ کے قول پر ہے۔ اور یہ اختلاف صرف جماعت کی نماز میں ہے، تنہا نماز پڑھنے والا دونوں کو جمع کرے گا خواہ وہ فرض پڑھ رہا ہو یا نفل۔ (تحفۃ الالمعی ص ۶۱ ج ۲۔ تحفۃ القاری ص ۱۱۹ ج ۳)

دعائے قنوت رکوع سے پہلے پڑھنی چاہئے یا بعد میں؟ اور آپ کا عمل

دعائے قنوت رکوع سے پہلے پڑھنی چاہئے یا بعد میں؟ اس سلسلہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل مختلف تھا، اور یہ اختلاف جواز وعدم جواز کا نہیں ہے، بلکہ افضلیت اور غیر افضلیت کا ہے۔ میرا عمل یہ ہے کہ جب میں رکوع سے پہلے دعا پڑھنا بھول جاتا ہوں تو رکوع کے بعد قومہ میں دعا پڑھ لیتا ہوں، اور سجدۂ سہو نہیں کرتا، اگر چہ فقہ میں اس صورت میں سجدۂ سہو ضروری لکھا ہے۔ (تحفۃ الالمعی ص ۳۲۱ ج ۲)

حضرت کا قرآن کریم کے تمام نشانات رکوع پر غور کرنا اور نتیجہ نکالنا

قرآن کریم میں رکوع کی علامات مشائخ بخارا نے لگائی ہیں، پورے قرآن میں پانچ سو چالیس رکوع ہیں، اور حاشیہ پر رکوع کی علامت ''ع'' بنائی گئی ہے۔ اور یہ تقسیم معنی کے لحاظ سے کی گئی ہے تاکہ بے پڑھے لوگ جان سکیں کہ کہاں مضمون پورا ہوتا ہے اور کہاں سے نیا مضمون شروع ہوتا ہے۔ (فتاوی تاتارخانیہ ص ۴۷۹ ج ۱)

میں نے تمام رکوعوں میں غور کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ سب رکوع ٹھیک جگہ پر لگائے گئے ہیں۔ صرف سورۂ واقعہ کا پہلا رکوع صحیح جگہ نہیں لگا، کیونکہ آیت ﴿ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ

وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴾ اصحاب یمین کے تذکرے کا آخری حصہ ہے، اس لئے رکوع ایک آیت کے بعد لگنا چاہئے تھا، باقی تمام رکوع ٹھیک جگہوں پر لگے ہیں، ہاں بعض ایسی جگہیں ضرور ہیں جہاں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اگر رکوع یہاں کے بجائے وہاں لگتا تو بہتر ہوتا۔ (تحفۃ الالمعی ص ۱۰۷ ج ۲)

باوضو مسجد جانے کی فضیلت میں شاہ صاحب کی تحقیق، اور آپ کا معمول

باوضو مسجد جانے کی فضیلت میں ہے کہ: اللہ تعالی ہر قدم پر ایک گناہ معاف فرماتے ہیں ایک درجہ بلند ہوتا ہے۔

اس حدیث پر فرمایا کہ: ایک زمانہ تک میرا خیال تھا کہ اس حدیث میں وضو کی قید بمنزلہ شرط ہے، یعنی مذکورہ ثواب اسی صورت میں حاصل ہوگا جبکہ وضو کر کے مسجد جائے، اگر بے وضو گھر سے نکلا ہے، چاہے مسجد میں جانے ہی کے لئے نکلا ہو، مذکورہ ثواب حاصل نہیں ہوگا چنانچہ طالب علمی کے زمانہ سے میرا معمول یہ ہے کہ میں گھر سے وضو کر کے مسجد جاتا ہوں طالب علمی کے زمانہ میں بھی کمرہ سے وضو کر کے جاتا تھا، پھر میں نے علامہ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کی یہ صراحت پڑھی کہ: حدیث میں وضو کی قید عربوں کے عرف کے اعتبار سے ہے چونکہ عربوں کی مسجدوں میں وضو کا انتظام نہیں ہوتا، لوگ گھر سے وضو کر کے آتے ہیں، اس لئے حدیث میں یہ قید ہے، (فیض الباری ۲:۷۳) اس لئے میرا خیال بدل گیا، مگر طالب علمی کے زمانہ سے جو عادت پڑی ہے وہ آج بھی باقی ہے، میں اب بھی گھر سے وضو کر کے مسجد جاتا ہوں۔ (تحفۃ الالمعی ص ۴۹۴ ج ۲)

یوم الشک کا روزہ، اور حضرت کا اپنے آپ کو عوام میں شمار کرنا

یوم الشک میں عوام کے لئے روزہ رکھنا مکروہ ہے، البتہ خواص رکھ سکتے ہیں، پھر اگر اتفاق سے وہ رمضان کی پہلی تاریخ ہو تو یہ روزہ فرض ہو جائے گا، مگر ضروری ہے کہ یوم الشک کا روزہ

نفل کی نیت سے رکھا جائے، رمضان کا کوئی تصور نہ ہو، اور یہی خاص اور عام کا معیار ہے، جو شخص نفل کی پختہ نیت کرسکتا ہے وہ خاص ہے، اور نیت پختہ نہ ہو، یہ خیال آئے کہ اگر رمضان ہوگا تو روزہ ہوجائے گا وہ عامی ہے، میں پہلے خود کو خواص میں شمار کرتا تھا، مگر جب عقل آئی تو اب خود کو عوام میں شمار کرتا ہوں اور یوم الشک کا روزہ نہیں رکھتا، کیونکہ نیت نہ ملے یہ بات میرے لئے ممکن نہیں۔ (تحفۃ الالمعی ص۵۴ ج۳)

دعائے قنوت اور حضرت کا عمل

قنوت کے معنی ہیں: دعا، کوئی بھی دعا پڑھ لی جائے، چھوٹی یا بڑی، قنوت کا تحقق ہوجائے گا، کوئی متعین دعا پڑھنا ضروری نہیں۔ مجھے کبھی جلدی ہوتی ہے تو میں صرف ﴿ ربنا اتنا فی الدنیا حسنة ، الخ ﴾ پڑھتا ہوں۔ (تحفۃ الالمعی ص۳۲۰ ج۲)

احرام کی دو رکعت اور تلبیہ پڑھنے میں آپ کا معمول

احرام شروع کرنے سے پہلے دو رکعت سنت ہے، اور دو رکعت ادا کرنے کے بعد فورا احرام شروع کرنا (تلبیہ پڑھنا) ضروری نہیں، اگر تلبیہ پڑھنے میں کسی وجہ سے تاخیر ہوجائے تو بھی کوئی حرج نہیں، میرا معمول یہ ہے کہ جہاز میں سوار ہونے سے پہلے دو رکعت پڑھ لیتا ہوں اور جہاز روانہ ہونے کے بعد تلبیہ پڑھتا ہوں۔

(تحفۃ الالمعی ص۲۱۲ ج۳)

دن کی نماز میں قرائت سری اور رات کی نماز میں جہری کیوں؟

فرمایا: ٹورنٹو (کینیڈا) میں ایک نوجوان نے مجھ سے سوال کیا کہ: تین نمازیں جہری اور دو نمازیں سری کیوں ہیں؟ میں نے اس کو یہ حدیث سنائی کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کسی نے ایسا ہی سوال کیا تھا، آپ نے فرمایا: جو نمازیں آپ ﷺ نے جہراً پڑھائی ہم بھی

جہرا پڑھاتے ہیں اور جو نمازیں آپ ﷺ نے سراً پڑھائی ہیں ہم بھی سراً پڑھاتے ہیں۔

پھر میں نے اس سے پوچھا: بتا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وجہ جانتے تھے یا نہیں؟ اگر تیرا خیال ہے کہ نہیں جانتے تھے تو کیا میرا علم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بڑھا ہوا ہے کہ تو مجھ سے یہ سوال کرتا ہے؟ اور اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وجہ جانتے تھے مگر سائل کی علمی صلاحیت اتنی بلند نہیں تھی کہ وہ اس سوال کا جواب سمجھ سکے، اس لئے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے وجہ نہیں بتائی، پس تیری علمی صلاحیت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے شاگردوں سے بڑھی ہوئی ہے؟ وہ خاموش ہو گیا، پھر میں نے اس سے پوچھا تیری شادی ہوئی ہے؟ اس نے کہا: ہاں، میں نے پوچھا: تم میاں بیوی گپ کب کرتے ہو دن میں یا رات میں؟ وہ کہنے لگا: رات میں کرتے ہیں، دن میں تو ضروری بات چیت کرتے ہیں، میں نے کہا: آپ کے سوال کا یہی جواب ہے، دن کے مزاج میں انقباض ہے اور رات کے مزاج میں انبساط، چنانچہ دنیا میں جتنی محفلیں اور مشاعرے ہوتے ہیں: سب رات میں ہوتے ہیں.....اس لئے رات کی نمازیں جہری ہیں اور دن کی نمازیں سری۔

وہ کہنے لگا: پھر جمعہ اور عیدین میں جہری قرائت کیوں ہے؟ میں نے کہا: تمہارے ملک میں زفاف رات ہی میں ہوتا ہے یا دن میں بھی ہوتا ہے؟ یورپ اور امیریکہ میں دن میں بھی رخصتی ہوتی ہے، میاں بیوی پہلی بار دن میں ملتے ہیں۔ اس نے جواب دیا: کبھی دن میں بھی رخصتی ہوتی ہے، میں نے کہا: یہ آپ کے سوال کا جواب ہے، جمعہ اور عیدین خاص مواقع ہیں اور خاص موقعوں کی بات الگ ہے، جمعہ اور عیدین میں صبح سے لوگ تیاری کرتے ہیں، نہا دھو کر صاف ستھرے یا نئے کپڑے پہن کر اور خوشبو لگا کر بڑے مجمع میں حاضر ہوتے ہیں تا کہ دو رکعت ادا کریں، مجمع کے بڑے ہونے سے بھی طبیعت میں انبساط پیدا ہوتا ہے، اور بازاروں میں شور وشغب نہیں رہتا، لوگ جمعہ کے وقت اور عیدین میں کاروبار بند کر دیتے ہیں، اس

لئے مجمع کو قرآن سنانا ممکن ہوتا ہے، ان وجوہ سے جمعہ اور عیدین میں جہری قرأت ہے۔ (تحفۃ القاری ص ۹۰/۹۱ ج ۳)

اذان ثانی کا جواب زبان سے یا دل سے؟ اور آپ کا عمل

جمعہ کے خطبہ کی اذان یعنی اذان ثانی کا جواب زبان سے دینا چاہئے یا دل سے؟ اس پر فرمایا کہ: احناف کے یہاں مسئلہ یہ ہے کہ مقتدی دل میں جواب دیں، جیسے خطیب جب درود شریف والی آیت پڑھے تو لوگ سراپا جہرا درود نہ پڑھیں، بلکہ دل میں درود پڑھیں، پس جیسے وہاں دل میں درود بھیجنا ہے یہاں بھی دل میں اذان کا جواب دینا ہے۔ میرا یہی طریقہ ہے کہ میں اذان ثانی کا جواب دل میں دیتا ہوں۔ (تحفۃ القاری ص ۲۳۵ ج ۳)

تکبیر تشریق سنتوں اور نفلوں کے بعد بھی کہنی چاہئے، اور آپ کا عمل

تکبیر تشریق لوگ صرف فرض نمازوں کے بعد ایک مرتبہ کہتے ہیں، حالانکہ سنتوں اور نفلوں کے بعد بھی زیادہ سے زیادہ تکبیر کہنی چاہئے۔ امام باقر رحمہ اللہ کا اسی پر عمل تھا۔ میں بھی اس پر عمل کی کوشش کرتا ہوں، مگر کبھی بھول جاتا ہوں۔ (تحفۃ القاری ص ۲۹۶ ج ۳)

حجاج عرفات جاتے ہوئے تلبیہ پڑھیں یا تکبیر تشریق؟ اور آپ کا عمل

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ: آپ نے جب نبی کریم ﷺ کے ساتھ حج کیا تو آپ لوگ عرفات کی طرف جاتے ہوئے تلبیہ پڑھتے تھے یا تکبیر؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم میں سے بعض تلبیہ پڑھتے تھے اور بعض تکبیر، اور تلبیہ پڑھنے والا تکبیر پڑھنے والے پر نکیر نہیں کرتا تھا، اور تکبیر پڑھنے والا تلبیہ پڑھنے والے پر نکیر نہیں کرتا تھا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دونوں عمل برابر ہیں، یعنی حاجی ان ایام میں تلبیہ بھی پڑھ سکتا ہے اور تکبیر بھی۔

اس حدیث کے ذیل میں فرمایا: میں جب حج میں جاتا ہوں تو تلبیہ پڑھتا ہوں، اور جب تلبیہ پڑھتے پڑھتے طبیعت تھک جاتی ہے تو تکبیر شروع کر دیتا ہوں۔

(تحفۃ القاری ص ۲۹۷ ج ۳)

سجدۂ سہو میں بوقت ضرورت امام شافعی رحمہ اللہ کے مسلک پر عمل

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک سجدۂ سہو کی حقیقت ہے صرف دو سجدے بغیر تشہد اور سلام کے، چنانچہ ان کے یہاں طریقہ یہ ہے کہ قعدہ اخیرہ میں سب کچھ پڑھ کر سلام پھیرے بغیر دو سجدے کرتے ہیں، پھر معاً سلام پھیر دیتے ہیں۔

پھر اپنا عمل بیان کرتے ہوئے فرمایا: میں حنفی ہوں اور جب کبھی سجدۂ سہو کی ضرورت پیش آتی ہے اپنے امام کے مذہب پر عمل کرتا ہوں، مگر مجھے جب کسی وجہ سے جلدی ہوتی ہے تو امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب پر عمل کرتا ہوں، کیونکہ اس میں تشہد ایک ہی مرتبہ پڑھنا ہے، اس لئے آدمی جلدی فارغ ہو جاتا ہے۔ (تحفۃ الالمعی ص ۲۲۰ ج ۲)

آپ پر حدیث کو حجت نہ ماننے کا بہتان

حضرت رحمہ اللہ نے جب حدیث اور سنت کا فرق بیان کیا تو اس پر ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا، اور صحیح معنی میں ہنگامہ کھڑا کر دیا گیا، اس ہنگامہ میں ایک بہتان یہاں تک لگایا گیا کہ آپ حدیث کو حجت نہیں مانتے، مجھے اس پر اس قدر تعجب ہوا کہ جو آدمی ''بخاری'' اور ''ترمذی'' کی شرح لکھ رہا ہو، اور پچاس سال سے زیادہ اس کی زندگی کے ماہ و سال حدیث کی تدریس میں گذرے ہوں، ان کے بارے میں اس طرح کا بہتان کس طرح لگایا گیا؟

یہاں حضرت رحمہ اللہ کے چند اقتباسات نقل کرتا ہوں، جنہیں پڑھ کر اہل انصاف اور اہل حق خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آپ حدیث کو حجت مانتے ہیں یا نہیں؟

دراصل حجیت حدیث کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں جو رسول (اللہ ﷺ) کی حیثیت سے واقف نہیں ہیں، اور ان کا صحیح مقام نہیں پہچانتے۔ قرآن کریم میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی حیثیت صرف ایک پیغامبر کی نہیں ہے، بلکہ وہ مطاع، متبوع امام، ہادی، قاضی، حاکم اور حکم وغیرہ بہت سی صفات کے حامل ہیں، اس لئے ماننا پڑے گا کہ دین کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کا ہر امر و نہی، ہر حکم و فیصلہ اور ہر قول و عمل ناطق، واجب التسلیم اور لازم ہے۔ (رحمۃ اللہ الواسعۃ شرح حجۃ اللہ البالغہ، ۶۹ ج ۱)

جاننا چاہئے کہ احادیث کی سندوں کی تعداد کے اعتبار سے دو قسمیں ہیں: متواتر اور آحاد اور دونوں حجت (قابل قبول) ہیں، اول حجت قطعیہ ہے، اور ثانی ظنیہ۔ متواتر وہ خبر ہے جس کے راویوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ ان سب کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا، یا اتفاقا ان سے جھوٹ کا صادر ہونا محال ہو، اور اس خبر سے علم یقینی حاصل ہو، اور جو خبر ایسی نہ ہو وہ خبر واحد ہے، پھر اگر اس کے راوی قابل اعتماد ہیں تو اس سے علم ظنی حاصل ہوگا اور وہ بھی حجت شرعیہ ہے۔

اہل حق کے نزدیک وہ حدیثیں جو خبر واحد ہیں یعنی متواتر نہیں، اگر چہ اس کی سندیں متعدد نہ ہوں وہ بھی حجت ہیں، اگر چہ ان سے علم ظنی حاصل ہوگا۔

(تحفۃ القاری ص ۵۷۱ ج ۱۲، کتاب اخبار الآحاد)

''تحفۃ القاری'' اور ''تحفۃ الالمعی'' کے مقدمہ میں حضرت رحمہ اللہ نے تفصیل سے حدیث کے حجت ہونے پر بحث فرمائی ہے، کیا اب بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ آپ حدیث کو حجت نہیں مانتے۔

اور جہاں حضرت نے حدیث کے حجت نہ ہونے کا اظہار کیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟ اس کی صراحت بھی خود فرمائی ہے:

اہل قرآن کے مقابلہ میں ہمارا دعوی یہ ہے کہ قرآن کی طرح حدیثیں بھی حجت ہیں

قانون سازی کا مصدر ہیں، اس لئے ہمارا عنوان ہوگا کہ حدیثیں بھی حجت ہیں.....اور اہل حدیث (غیر مقلدین) کے مقابلہ میں ہمارا مسلکی عنوان حجیت سنت ہوگا، ہم نے اپنا نام اہل السنۃ رکھا ہے، اور غیر مقلدین نے اہل حدیث۔ ان کے نزدیک ہر حدیث حجت ہے خواہ منسوخ ہو یا مخصوص، اور ہمارے نزدیک مطلق حدیث حجت نہیں بلکہ وہ حدیث حجت ہے جو سنت بھی ہے، جو حدیثیں سنت نہیں وہ مسائل میں حجت نہیں، اسی وجہ سے ہمارا نام اہل السنۃ ہے۔ (تحفۃ القاری ص ۶۸/۶۹ ج ۱)

حکیم الاسلام رحمہ اللہ کا آپ کی بات پر آغاز دار العلوم کا جشن ملتوی فرمانا

امر منکر پر نکیر ضروری ہے، دار العلوم میں انقلاب سے پہلے حضرت حکیم الاسلام قدس سرہ کی سرکردگی میں یہ پروگرام بنا تھا کہ مسجد چھتہ میں پندرہ محرم الحرام کو آغاز دار العلوم کا جشن منایا جائے، سب اکابر اس پر متفق ہوگئے تھے، اگر یہ سلسلہ شروع ہوتا تو آج کیا نوبت آتی اس کا اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں، اس وقت میں چھوٹا مدرس تھا، پھر بھی حضرت حکیم الاسلام قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس سلسلہ میں طویل گفتگو کر کے یہ سلسلہ رکوایا، اور حضرت نے بنا بنایا پروگرام ملتوی کر دیا۔ یہ حضرت کی وسعت ظرفی تھی کہ مجھ ناچیز کی بات آپ نے قبول فرمالی اور آئندہ کا خطرہ ٹل گیا۔ (جلسۂ تعزیت کا شرعی حکم ص: ۴۲)

آپ کی درخواست پر حکیم الاسلام رحمہ اللہ کا رجوع

اسی طرح الہ آباد کے ایک بزرگ روپے کے پانچ سکے لے کر آئے اور حضرت حکیم الاسلام قدس سرہ کو دیئے اور کہا: نبی ﷺ میرے پاس بیداری میں آئے اور یہ روپے دیئے اور فرمایا: ایک اجلاس صد سالہ میں دینا، ایک حکیم الاسلام کو دینا، الخ۔ اسی شام کو دار الحدیث تحتانی میں جلسہ منعقد ہوا اور حضرت مولانا سالم صاحب قدس سرہ نے تقریر فرمائی اور خوب چندہ ہوا، میں دوسرے دن صبح میں کتابیں لے کر حضرت حکیم الاسلام کے پاس گیا اور

''التعلیق الصبیح'' میں بیداری میں حضور ﷺ سے ملاقات کے لئے جو شرائط تھیں وہ دکھائیں اور میں نے عرض کیا کہ: اب نبی ﷺ دوسری دنیا میں (آرام فرما) ہیں، اور دوسری دنیا کی چیز اس دنیا میں آسکتی ہے، حجر اسود کے بارے میں روایت ہے کہ وہ جنت کا پتھر ہے، مگر انڈیا کی ٹکسال میں ڈھلا ہوا سکہ جن پر تین شیروں کا فوٹو بھی ہے، آپ ﷺ نے ان بزرگ صاحب کو کیسے عنایت فرمائے؟ ضرور ان کو دھوکہ لگا ہے۔

حضرت حکیم الاسلام قدس سرہ نے میری بات قبول فرمالی اور دوسرے دن مغرب کے بعد دار الحدیث فوقانی میں جلسہ ہوا، اور حضرت مولانا سالم صاحب قدس سرہ نے تقریر کی اس میں صاف فرمایا کہ کل کی بات ہم نے غلبۂ محبت میں مان لی تھی، اس کو آگے نہ بڑھایا جائے۔ (جلسۂ تعزیت کا شرعی حکم ص: ۴۲/۴۳)

نوٹ...... حضرت نے ''التعلیق الصبیح'' کا جو حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے: ص ۷۸/۷۹ ج ۵، کتاب الرؤیا، ط: المکتبة العثمانیة۔ مرغوب احمد

مولانا اشرف علی باقوی اور مولانا محمد سالم صاحب کی تقریر اور آپ کا رد

بنگلور میں تحفظ شریعت کانفرس ہوئی، اس میں حضرت مولانا اشرف علی باقوی قاسمی اور حضرت مولانا محمد سالم صاحب رحمہما اللہ نے تقریریں کیں کہ دین منزل من اللہ ہے، مسلک منزل من اللہ نہیں، اور جس چیز میں انسانی اجتہاد کا دخل ہو وہ قابل ترجیح تو ہوسکتی ہے قابل تبلیغ نہیں، یہ تقریریں جلسہ کے موضوع کے خلاف تھیں، میں نے دونوں حضرات کی موجودگی میں ان تقریروں کا رد کیا، میں نے کہا: یہ بات اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے خلاف ہے، سورۃ الانعام کی آیت: ۱۵۳/ ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ، وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهِ ، ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾۔

ترجمہ:...... اور یہ کہ دین میرا راستہ ہے جو کہ مستقیم ہے، سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر

مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی، اس کا تم کو اللہ تعالیٰ تاکیدی حکم دیتے ہیں تاکہ تم اس کے خلاف کرنے سے احتیاط رکھو۔

تفسیر...... اللہ تعالیٰ کا راستہ یعنی اسلام کا راستہ، اور اہل السنہ والجماعہ کا راستہ، اور دوسری راہیں یعنی دوسرے دھرم، اور مسلمانوں میں گمراہ فرقوں کی راہیں، پس متعین طور پر مسلمانوں کو اہل السنہ والجماعہ کی راہ پر چلنا چاہئے، دوسرے دھرموں سے اور گمراہ فرقوں کی راہوں سے بچنا چاہئے۔ تہتر فرقوں والی حدیث میں بھی یہی مضمون ہے۔ اور اجتہاد کا دخل فروعات میں ہوتا ہے، اصول میں نہیں ہوتا، اسی لئے چاروں فقہی مکاتب فکر کو برحق مانا جاتا ہے۔

پھر میں نے کہا کہ اگر اہل السنہ والجماعہ کے مسلک کی دعوت نہیں دی جائے گی اور گمراہ فرقوں کی گمراہی نہیں کھولی جائے گی اور سبھی فرقوں کو صحیح مان لیا جائے گا تو گمراہی پھیلتی رہے گی اور اہل حق سمٹتے چلے جائیں گے۔......

غرض دعوت تو بے شک دین کی دی جائے، مگر مسلک حق کی حفاظت بھی ضروری ہے جب بھی مسلک حق پر حملہ ہوا تو دارالعلوم کے اکابر نے اس کی مدافعت کی۔......

آپ کی بات پر حکیم الاسلام رحمہ اللہ کا فیصلہ تبدیل فرمانا

جب دارالعلوم دیوبند میں اجلاس صد سالہ ہوا تو حضرت حکیم الاسلام قدس سرہ مہتمم تھے انہوں نے درجۂ علیا کے اساتذہ اور وسطیٰ الف کے اساتذہ کو مدعو کیا، میں اس وقت وسطیٰ الف میں تھا، اس مجلس کا موضوع تھا کہ اجلاس صد سالہ میں کن لوگوں کو دعوت دی جائے؟ تمام اساتذہ متفق ہوئے کہ صرف اہل حق کو دعوت دی جائے، گمراہ فرقوں کو دعوت نہ دی جائے، پھر سب سے پہلے غیر مقلدین کا تذکرہ آیا، تمام اساتذہ متفق ہوئے کہ وہ اہل حق میں شامل نہیں، ان کو دعوت نہ دی جائے، پھر جماعت اسلامی کا تذکرہ آیا، صاحبزادۂ محترم حضرت مولانا محمد سالم صاحب قدس سرہ نے حکیم الاسلام قدس سرہ سے عرض کیا کہ وہ اہل حق

میں شامل ہیں، ان کو دعوت دی جائے، ان کی بات سن کر تمام بڑے اساتذہ خاموش رہے جب کوئی نہ بولا تو میں نے حضرت حکیم الاسلام قدس سرہ سے عرض کیا کہ مودودی جماعت اہل حق میں شامل نہیں، ہمارے اکابر نے اس کو گمراہ قرار دیا ہے، لہذا ان کو دعوت نہ دی جائے۔ جب میں نے یہ بات کہی تو حضرت مولانا محمد سالم صاحب قدس سرہ میری طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا کہ وہ کیوں گمراہ ہیں؟ میں نے وجہ بیان کی تو انہوں نے اس کا جواب دیا، میں نے دوسری وجہ بیان کی تو آپ نے اس کا بھی جواب دیا، پھر میں نے تیسری وجہ بیان کی تو وہ خاموش ہوگئے، یہ گفتگو آدھا گھنٹہ چلی، آخر میں حضرت قدس سرہ نے فرمایا: میں نے آپ دونوں حضرات کی گفتگو غور سے سنی، میری رائے یہ ہے کہ ان کو دعوت نہ دی جائے حضرت قدس سرہ کی بات فیصلہ کن ہوتی تھی، چنانچہ اہتمام سے مولانا اسلم صاحب قاسمی قدس سرہ (ناظم اعلی اجلاس صد سالہ) کے نام حکم گیا کہ مودودی جماعت کو بک اسٹال لگانے کے لئے جو جگہ الاٹ کی گئی ہے وہ منسوخ کردی جائے۔

غرض دارالعلوم دیوبند مسلک کی دعوت نہیں دیتا، اہل السنہ والجماعہ کے مسلک کی حفاظت کرتا ہے، چار فقہی مذہب مختلف مسالک ہیں، دارالعلوم دیوبند میں ہر مسلک کے طالب علم پڑھتے ہیں، جنوب کے شوافع بڑی تعداد میں ہیں، مگر دارالعلوم کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں ایک بھی شافعی طالب علم دارالعلوم میں پڑھ کر حنفی نہیں ہوا، اس لئے کہ دورۂ حدیث کے اساتذہ مسلک کی دعوت نہیں دیتے۔

(جلسۂ تعزیت کا شرعی حکم ص: ۷۷/۷۸/۷۹/۸۱/۸۲)

عرفات میں جمع بین الصلوتین اور حضرت کی رائے

عرفات میں جمع بین الصلوتین یعنی ظہر اور عصر کو ظہر کے وقت میں پڑھنے میں فقہاء کا اختلاف ہے، حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اہل خیمہ کے لئے جمع بین الصلوتین

مشروع نہیں، اور صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک مشروع ہے۔

اس مسئلہ میں حضرت رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ ہم نے خیمہ میں ظہر کی نماز باجماعت پڑھی، پھر وقوف شروع کیا، جب عصر کا وقت ہوا تو وقوف ختم کر کے عصر باجماعت ادا کی، پھر وقوف شروع کیا مگر جو کیفیت عصر سے پہلے حاصل تھی وہ لوٹ کر نہ آئی، بہت رونے کی صورت بھی بنائی مگر اس کا کچھ بھی حصہ لوٹ کر نہ آیا۔ پس میرے خیال میں صاحبین رحمہما اللہ کے مسلک پر عمل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ (امداد الفتاوی ص۳۶۰ ج۴۔ انوار مناسک ص ۴۲۷)

دوسرا باب...... حضرت کے علمی آراء

اولیاء کی قبروں کی زیارت کے لئے جانا اور حضرت کی رائے

کسی مسجد میں نماز ادا کرنے کے لئے لمبا سفر کر کے جانا، یا اولیاء کی قبروں کی زیارت کے لئے جانا بعض مباح کہتے ہیں اور بعض حرام....... (اور آپ ﷺ نے تین مساجد کے علاوہ کے لئے سفر ممنوع قرار دیا) اور مقصد یہ ہے کہ غیر شعائر اللہ' شعائر کے ساتھ نہ مل جائیں، اور یہ سلسلہ غیر اللہ کی عبادت کا ذریعہ نہ بن جائے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ کی رائے یہی ہے، اور میرے نزدیک بھی یہی برحق ہے، کیونکہ حضرت ابو بصرہ رضی اللہ عنہ نے طور پر جانے سے منع کیا ہے۔ (تحفۃ الالمعی ص ۱۴۸ ج ۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کوہ طور پر اس جگہ کی زیارت کے لئے گئے جہاں موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے تھے، واپسی میں ان کی ملاقات حضرت بصرہ بن ابی بصرہ غفاری رضی اللہ عنہ سے ہوئی، حضرت بصرہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کہاں سے آرہے ہو؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: طور سے، حضرت بصرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر طور پر جانے سے پہلے آپ سے میری ملاقت ہوتی تو میں آپ کو نہ جانے دیتا۔

(رحمۃ اللہ الواسعۃ ص ۳۴۴ ج ۳)

سفر میں سنت مؤکدہ کا حکم اور آپ کا تجربہ پر مبنی ایک مشورہ

حالت سفر میں سنت مؤکدہ پڑھنی چاہئے یا نہیں؟ تو حضرات ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ: مسافر کو سنن مؤکدہ پڑھنی چاہئیں، اور ائمہ احناف سے اس سلسلہ میں کچھ مروی نہیں متأخرین احناف نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ حالت قرار میں سنتیں پڑھے، اور حالت فرار میں نہ پڑھے۔ مثلاً ایک شخص دہلی گیا اور وہاں پہنچ کر ٹھہر گیا اور مطمئن ہوگیا، آگے روانگی یا واپسی دو دن بعد ہوگی، پس یہ حالت قرار ہے، ایسی صورت میں سنتیں پڑھنی چاہئیں، اور اگر سفر جاری ہے، ریل میں نماز پڑھ رہا ہے، یا اسٹیشن پر نماز پڑھ رہا ہے اور ریل آنے والی ہے تو یہ حالت فرار ہے، اس حالت میں سنتیں نہ پڑھے۔ اور میں نے تجربہ کی بنیاد پر اس میں یہ اضافہ کیا ہے کہ سفر شروع کرنے سے پہلے اور سفر ختم کرنے کے بعد متصلا جو حالت ہے وہ بھی حالت فرار ہے، مثلاً ایک شخص دہلی گیا، وہاں جا کر ٹھہر گیا، تو یہ حالت قرار ہے، مگر وہ تھکا ہوا ہے، نیند کا غلبہ ہے اور نماز بھی پڑھنی ہے تو صرف فرض پڑھ لے، سنتیں نہ پڑھے، اسی طرح روانگی کا وقت ہے، سامان تیار کرنا ہے، وقت پر اسٹیشن پہنچنا ہے، ٹکٹ لینا ہے اور نماز کا وقت آگیا تو فرض نماز پڑھ لینا کافی ہے، سنت نہ پڑھے۔

(تحفۃ القاری ص۴۳۰/۴۳۱ ج۳)

حرمین شریفین میں عورتوں کا جانا اور آپ کی رائے

آپ ﷺ کے زمانے میں مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے علاوہ نو مسجدیں اور بھی تھیں، مگر عورتیں صرف مسجد نبوی میں آتی تھیں، مدینہ منورہ کی دیگر مساجد میں شاذ ونادر ہی جاتی تھیں۔ اور آپ ﷺ کے زمانہ میں عورتیں مسجد نبوی میں تین وجہ سے آتی تھیں: ایک: اخذ شریعت کے لئے۔ دوسری: آپ ﷺ کی زیارت کے لئے۔ تیسری: جگہ کی برکت کی وجہ سے۔ اور مسجد حرام میں دو مقصد سے آتی تھیں: بیت اللہ کا طواف کرنے کے

لئے اور جگہ کی برکت کی وجہ سے، مسجد حرام میں آج بھی وہ دونوں باتیں متحقق ہیں، اور مسجد نبوی میں اب پہلی وجہ باقی نہیں رہی، کیونکہ دین مکمل ہو چکا اور وہ کتابوں میں محفوظ ہے، البتہ جگہ کی برکت اور آپ ﷺ کی قبر اطہر کی زیارت: یہ دونوں مقصد آج بھی باقی ہیں، اس لئے عورتیں ان دونوں مسجدوں میں جاسکتی ہیں، بلکہ جانا چاہئے۔ ہماری عورتیں بھی نہ صرف جاتی ہیں بلکہ ہم ان کو ترغیب دیتے ہیں کہ حرم شریف میں جائیں، اس لئے کہ ان کو زندگی میں ایک بار یہ موقع ملا ہے، بار بار یہ موقع ان کو ملنے والا نہیں، اور وہاں فتنہ کا اندیشہ بھی نہیں، اس لئے حرمین شریفین کا حکم دوسری مساجد سے مختلف ہے۔

آپ کا استنباط کہ: حج کرنے سے ایمان پر مہر لگ جاتی ہے

"باوجود استطاعت کے حج نہ کرنے والا یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر" اس حدیث سے میں نے یہ بات مستنبط کی ہے کہ حج کرنے سے ایمان پر مہر لگ جاتی ہے، اب اس کے ارتداد کا خطرہ ٹل جاتا ہے، اور جو شخص استطاعت کے باوجود حج نہیں کرتا وہ معرض فتن میں رہتا ہے وہ کسی بھی وقت فتنہ کا شکار ہو سکتا ہے، بلکہ اسلام ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے ایسا بھی ممکن ہے، پس جس میں استطاعت ہو اسے پہلی فرصت میں حج کر لینا چاہئے تا کہ اس کے ایمان پر مہر لگ جائے۔ (تحفۃ الالمعی ص۲۰۴ ج۳)

تہجد کے وقت کامل اور ہلکے وضو کی روایت اور آپ کا رجحان

ایک حدیث میں ہے کہ: آپ ﷺ نے رات میں بیدار ہونے کے بعد ہلکا وضو فرمایا اور ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے کامل وضو فرمایا۔

اس کی شرح میں فرمایا: میرا رجحان یہ ہے کہ: جب آپ ﷺ تہجد کے لئے بیدار ہوئے تب کامل وضو فرمایا، پھر دوران تہجد جب آپ ﷺ سوئے ہیں تو اٹھ کر ہلکا وضو فرمایا کیونکہ یہ وضو پر وضو تھا۔ (تحفۃ القاری ص۳۲۰ ج۳)

پختہ قبریں بنانے، ان پر کتبے لگانے، ان پر گنبد بنانے کی ممانعت کی وجہ

قبریں پختہ بنانا اور ان پر کتبہ لگانا اور ان پر گنبد بنانا تعظیم کی وجہ سے ممنوع ہے، اور ان کو روندنے کی ممانعت ان کی اہانت کی وجہ سے ہے، قبور کی نہ غایت درجہ تعظیم کرنی چاہئے نہ توہین، ان کے ساتھ معتدل معاملہ کرنا ضروری ہے۔

اور میرے نزدیک پختہ قبریں بنانے کی، ان پر کتبے لگانے کی، اور ان پر گنبد بنانے کی ممانعت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قبرستان بار بار استعمال ہوتا ہے یا ہونا چاہئے، پس اگر قبریں پکی بنائی جائیں گی اور ان پر کتبے لگائے جائیں گے تو وہ جگہ متعین ہو جائے گی، اس کو دوبارہ استعمال کرنا جائز نہ ہوگا، اور اگر قبریں پختہ نہیں ہوں گی، نہ ان پر کتبے ہوں گے تو ایک وقت کے بعد قبر کا نشان مٹ جائے گا اور وہ جگہ دوبارہ تدفین میں استعمال ہو سکے گی۔ مکہ معظّمہ کا قبرستان حجون اور مدینہ منورہ کا قبرستان بقیع اسلام سے پہلے کے ہیں، ان میں اربوں کھربوں انسان دفن ہوئے اور آج بھی دفن ہو رہے ہیں، وہاں طریقہ یہ ہے کہ ایک طرف سے قبریں بناتے چلے جاتے ہیں جب آخر تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر شروع سے قبریں بنانے لگتے ہیں، اس طرح وہ قبرستان بار بار استعمال ہوتے ہیں۔ اور ہندوستان میں مسلمانوں کے جو پرانے شہر ہیں ان کے چاروں طرف قبرستان ہی قبرستان ہیں، کیونکہ جب قبریں پکی بن گئیں اور ان پر کتبہ لگ گیا تو اب وہ جگہ دوبارہ استعمال نہیں ہو سکتی، چنانچہ قبرستان کے لئے دوسری جگہ خریدی جاتی ہے، اور پرانے قبرستان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا، ان میں جانور گھومتے ہیں، لوگ پاخانہ کرتے ہیں، کیا یہ بہتر ہے یا ان کو دوبارہ تدفین کے لئے استعمال کرنا؟ پھر آبادی بہر حال بڑھے گی، کدھر بڑھے گی؟ چاروں طرف بڑھے گی، اس وقت قبرستان میں سڑکیں بنیں گی، لوگ ناجائز قبضے کر کے مکانات بنائیں گے، اور مُردوں کی جو توہین ممکن ہے وہ ہوگی، پس کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ایک قبرستان بار بار استعمال ہو تا کہ وہاں

آمد و رفت رہے، اور اس کی حفاظت ممکن ہو، مگر ہندوستان کا مسلمان تو سمجھتا ہی نہیں، اس کو سب کچھ گوارہ ہے مگر دوبارہ قبرستان کا استعمال اس کے گلے نہیں اترتا، اللہ تعالی سمجھ عطا فرمائے، آمین۔

فائدہ: ...... لوگ قبروں پر کتبہ کے تعلق سے کہتے ہیں کہ اس کا امت میں تعامل ہے، اور فقہ کی کتابوں میں اس کو جائز لکھا ہے کہ بڑے آدمی کی قبر پر کتبہ لگا سکتے ہیں، اس سلسلہ میں جاننا چاہئے کہ ''العرف الشذی'' میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کا قول ہے کہ: لوگ قبروں پر کتبے لگاتے ہیں اور حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے، پس جو نیا طریقہ شروع ہوا ہے اس میں جواز کی کوئی دلیل نہیں، یعنی تعامل اس وقت حجت ہوتا ہے جب وہ نص کے خلاف نہ ہو جیسے سود اور شراب کا بھی تعامل ہو گیا ہے مگر وہ نص کے خلاف ہے اس لئے وہ حجت نہیں اسی طرح جب کتبے لگانے کی ممانعت کے سلسلہ میں اعلی درجہ کی صحیح حدیث موجود ہے تو تعامل کیسے حجت ہوسکتا ہے؟ اور بڑا آدمی کون ہے؟ یہ کیسے طے کیا جائے گا؟ یعنی اس کا معیار کیا ہوگا؟ ہر شخص کے نزدیک اس کا مورث بڑا آدمی ہے، چنانچہ ہر شخص کتبہ لگاتا ہے، بلکہ بعض تو صرف اس لئے کتبہ لگاتے ہیں کہ جگہ متعین ہو جائے، وہ دوسری مرتبہ استعمال نہ ہو۔

رہا فقہی جزئیہ تو ہماری کتب میں بہت سی ایسی جزئیات ہیں (بہتر ہے بعض جزئیات کہا جائے، مرغوب) جن پر ہم اس لئے فتوی نہیں دیتے کہ یا تو ان کا کچھ ثبوت نہیں، یا وہ نص کے خلاف ہیں، جیسے: تثویب کا تذکرہ کتب فقہ میں ہے، اور نمک سے کھانا شروع کرنے کا تذکرہ بھی ''شامی'' میں ہے، مگر اس پر ہم اس لئے فتوی نہیں دیتے کہ ان کا کچھ ثبوت نہیں، ...... اسی طرح کتبہ کا جزئیہ اگرچہ موجود ہے، مگر وہ نص صحیح صریح کے خلاف ہے، اس لئے اس پر نہ فتوی دینا چاہئے اور نہ اس پر عمل کرنا چاہئے، آج مسلمانوں کے قبرستان میں جا کر دیکھیں، عیسائیوں کے قبرستان اور مسلمانوں کے قبرستان میں کچھ فرق نہیں رہا، یہ اس

حدیث پر عمل نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالی مسلمانوں کو سمجھ عطا فرمائیں اور حدیث پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وضاحت:...... تطیین القبور یعنی قبر تیار ہونے کے بعد پانی ڈال کر مٹی کو جمانا تا کہ ہوا سے مٹی اڑ نہ جائے، یہ تجصیص القبور نہیں ہے، یہ جائز ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تطیین القبور جائز ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تطیین القبور میں کوئی مضائقہ نہیں۔ (تحفۃ الالمعی ص۴۶۳/۴۶۵ ج۳)

میرے نزدیک محرم وِکس لگا سکتا ہے

دوا میں خوشبو ہو تو محرم ایسی دوا نہیں لگا سکتا، کیونکہ محرم کے لئے خوشبو ممنوع ہے، اور وِکس میں میرے نزدیک بدبو ہے، محرم اسے لگا سکتا ہے۔ (تحفۃ الالمعی ص۳۵۸ ج۳)

کسی نو مسلم کے نکاح میں چار سے زائد عورتیں ہوں یا دو بہنیں ہوں تو کیا حکم ہے؟ اور اس مسئلہ میں آپ کی رائے

اگر کوئی اسلام لے آئے اور اس کے نکاح میں چار سے زیادہ بیویاں ہوں یا دو بہنیں ہوں تو وہ کیا کرے؟ ائمۂ ثلاثہ رحمہم اللہ تخییر کے قائل ہیں کہ اپنی پسند سے چار بیویوں کو روک لے اور جو بہن پسند ہو اسے رکھ لے، اور باقی کو علیحدہ کر دے۔ اور حضرات شیخین رحمہما اللہ کے نزدیک جو چار پہلے نکاح میں آئی ہیں اور جس بہن سے پہلے نکاح ہوا ہے وہ نکاح میں رہیں گی، باقی خود بخود نکاح سے علیحدہ ہو جائیں گی۔ میری رائے اس مسئلہ میں یہ ہے کہ: اگر یہ واقعہ مسلمان کا ہے یعنی کسی بددین مسلمان نے (یا کسی ایسے مسلمان نے جو مسئلہ سے بالکل ناواقف تھا) دو بہنوں سے نکاح کیا، یا چار سے زیادہ بیویاں کیں تو اس کے لئے تخییر کا حکم نہیں ہے، بلکہ پہلے جن سے نکاح ہوا ہے ان کے نکاح صحیح ہیں اور بعد کے نکاح باطل ہیں۔ اور اگر

یہ واقعہ کسی نومسلم کا ہے تو اس کو اختیار ہوگا کہ جن کو چاہے رکھے اور باقی کو علیحدہ کردے۔ اور وجہ ظاہر ہے کہ مسلمان کے بعد والے نکاح ہوئے ہی نہیں، اور غیر مسلم کے اس کے مذہب کے مطابق سب نکاح درست ہیں، پس اس کو اختیار ہوگا کہ جن کو چاہے رکھے۔ (تحفۃ الالمعی ص ۵۵۹ ج ۳)

آپ کی رائے کہ: منیٰ مکہ سے خارج ہے

آج کل ایک مسئلہ یہ بھی زیر بحث ہے کہ منیٰ مکہ میں داخل ہے یا خارج؟ چند سال پہلے مکہ مکرمہ میں مدرسہ صولتیہ میں ہندوپاک کے چند اکابر کا اجتماع ہوا اور اس میں طے کیا گیا کہ اب منیٰ مکہ میں داخل ہو چکا ہے، پس مقیم ومسافر ہونے میں نزول منی سے پہلے مکہ کی مدت اقامت ہی کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ منیٰ عرفات اور منی کا قیام اور اس کے بعد مکہ کے قیام کا مجموعہ دیکھا جائے گا، اگر: ۱۵؍ دن ہو جائے تو حاجی مقیم ہوگیا، ورنہ نہیں۔ اور اس فیصلہ کا مدار دو باتوں پر تھا: ایک ابنیۂ مکہ کا منی کے ساتھ اتصال، دوسری: منی کا مکہ کی فناء ہونا۔ مگر دوسری رائے یہ ہے کہ ابنیہ کا اتصال ابنیہ کے ساتھ ہونا چاہئے، جبکہ منیٰ صحراء ہے اور منیٰ مکہ کی فناء نہیں ہوسکتا، کیونکہ فناء وہ جگہ ہے جو شہر کی مصالح کے لئے ہو اور منیٰ مزدلفہ اور عرفات مناسک کی جگہیں ہیں، وہ مکہ کے مصالح کے لئے نہیں ہیں، اس لئے چاہے ابنیہ کا اتصال ہوگیا ہو، سفر واقامت میں ان کا قیام محسوب نہیں ہوگا۔ میری ناقص رائے یہی ہے۔

(تحفۃ الالمعی ص ۲۸۱ ج ۳)

متبرک چیزوں کی توہین مؤمن کی شان نہیں، اور کعبہ کی تصویر والے مصلے

متبرک چیزوں کی مثلاً کعبہ شریف کی اور روضۂ اقدس کی اصل یا قلمی تصاویر کی توہین کرنا مؤمن کی شایان شان نہیں، اس سے دل میں ان مقامات کی بے قدری پیدا ہوگی، البتہ ان کی تعظیم، ان سے توسل اور تبرک بھی جائز نہیں، کیونکہ اصل کعبہ اور اصل روضہ اقدس ہزار برکتوں کا محل ہے، مگر کیمرے سے ان کا جو فوٹو لیا جائے یا قلم سے ان کی جو تصویر بنائی جائے

اس میں بھی وہی برکتیں پیدا ہو جائیں، یہ بات نا معقول ہے، اور نہ اس کی کوئی دلیل ہے، اسی طرح جن مصلوں پر کعبہ وغیرہ کی فرضی تصویریں بنی ہوئی ہوتی ہیں ان کو بھی استعمال نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ آدمی کبھی ان پر بیٹھتا بھی ہے، اور یہ بات مناسب نہیں۔

(تحفۃ الالمعی ص۹۹ ج۵)

اگر خوف فتنہ نہ ہو تو عورت تنہا سفر کر سکتی ہے

عورت کے لئے تنہا سفر کرنے کا جواز یا عدم جواز خوف فتنہ پر مبنی ہے، اگر خوف فتنہ نہ ہو تو ایک رات دن کا سفر عورت تنہا کر سکتی ہے، اور اطمینان ہو تو تین دن سے زیادہ کا سفر بھی کر سکتی ہے، یہ بات علامہ کشمیری قدس سرہ نے ''فیض الباری'' (۲:۳۹۷) میں فرمائی ہے، اور فتنہ کا اندیشہ ہو تو مسجد اور مارکیٹ بھی تنہا نہیں جا سکتی، جیسے آج کل ہوائی جہاز سے مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔ اور تجربہ یہ ہے کہ درمیان میں کوئی فتنہ پیش نہیں آتا، پس ایسی پر امن صورت میں عورت تنہا سفر کر سکتی ہے۔ (تحفۃ القاری ص۴۲۰ ج۳)

ریل، بس اور کار میں نفل نماز بیٹھ کر اور بلا قبلہ رو پڑھنے کا مسئلہ

جانور پر (بیٹھے ہوئے سفر کی حالت میں) نفل نماز پڑھ سکتے ہیں، اس کی پیٹھ کا پاک ہونا اور استقبال قبلہ ضروری نہیں، جانور جس جانب بھی متوجہ ہو اس پر نماز صحیح ہے، اور رکوع و سجود کے لئے اشارہ کرنا کافی ہے .... اور بس اور کار جانور کے حکم میں ہیں، ان میں بیٹھ کر نفلیں پڑھنا جائز ہے، اور سنن مؤکدہ بھی نفل ہیں .... ریل گاڑی میں نوافل کے لئے اگرچہ قیام ضروری نہیں مگر استقبال قبلہ اور رکوع و سجود ضروری ہیں، ریل میں کیف ما اتفق اور اشارہ سے نفل پڑھنا جائز نہیں، اور بس اور کار میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ ہی نہیں سکتے، اس لئے وہ دابہ کے حکم میں ہیں، اور ٹرین میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا ممکن ہے، اور بھیڑ عارضی عذر ہے اس لئے اس میں استقبال قبلہ اور رکوع و سجود کے ساتھ ہی نماز پڑھنا ضروری ہے، چاہے وہ نفل

نماز ہو۔ (تحفۃ القاری ص ۳۲۶/۳۲۷ ج ۳)

نوٹ:...... بس میں قیام ممکن ہے، اس لئے بس کا حکم بھی دابہ کا ہونا چاہئے، خصوصا برطانیہ میں تو بسیں اکثر بھری ہوئی بھی نہیں ہوتیں، اور کھڑے ہو کر نماز آدمی پڑھ سکتا ہے۔ راقم نے دوران سفر بس میں کھڑے ہو کر نماز پڑھی ہے۔ مرغوب احمد

رجوع

حدیث جساسہ کے بارے میں رجوع کرتے ہوئے فرماتے ہیں: پہلے ''تحفۃ الالمعی (۵:۶۲۸/۶۳۰) میں جو حدیث کی تشریح کی گئی تھی وہ صحیح نہیں تھی، وہ نہایہ والے حاشیہ سے متأثر ہو کر لکھی گئی تھی، پھر غور کرنے پر اس کی غلطی ظاہر ہوئی تو وہ ساری تشریح حذف کردی گئی اور اس کی جگہ نئی تشریح لکھی گئی ہے۔ (ماخوذ از: رجوع نامہ)

ترمذی کی شرح میں ہے کہ: نبی ﷺ حج کے لئے: ۵/ذی الحجہ کو مکہ پہنچے تھے۔

بخاری شریف کی شرح میں آپ نے اس سے رجوع فرمالیا، اس میں ہے کہ: آپ ﷺ مکہ مکرمہ: ۴/ذی الحجہ کو پہنچے۔

اور اس کے حاشیہ میں ہے کہ: ''تحفۃ الالمعی'' (۲:۴۲۶) میں پانچ ذی الحجہ کو مکہ پہنچنے کی بات ہے وہ غلطی ہے، آپ ﷺ: ۴/ذی الحجہ کو مکہ پہنچے تھے۔ (تحفۃ القاری ص ۴۱۶ ج ۳)

حق کی پیروی کریں، میرے لکھے ہوئے پر بھروسہ نہ کریں

''تحفۃ القاری'' کے آخر میں ''تقریب اختتام'' کے عنوان سے حضرت کا ایک مضمون ہے وہ قابل مطالعہ ہے، اس میں تحریر فرماتے ہیں:

''علمی خطبات'' اور تحفۃ الالمعی'' اور ''تحفۃ القاری'' کی شروع کی جلدیں سبق کی تقریریں ہیں، اور تقریر میں مسامحات ہو جاتے ہیں، پھر ''تحفۃ الالمعی'' کی آٹھ جلدیں اور ''تحفۃ القاری

’’ کی بارہ جلدیں تقریبا تین تین سال میں لکھی گئی ہیں، ایسی صورت میں تسامحات لا بد ہیں، اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائیں، اور بھی تسامحات ہوں گے، جہاں شبہ ہو تحقیق کریں اور حق کی پیروی کریں، میرے لکھے ہوئے پر بھروسہ نہ کریں۔

(تحفۃ القاری ص ۳۸۱ ج ۱۲)

متفرقات

امام ترمذی رحمہ اللہ نے دو مقامات پر ایسا کیا ہے کہ ایک کتاب کے درمیان دوسرے ابواب قائم کئے ہیں، ایک ’’ابواب الرضاع‘‘ یہ ’’کتاب النکاح‘‘ کے درمیان لائے ہیں اسی طرح ’’کتاب البیوع‘‘ میں ’’ابواب الاحکام‘‘ لے آئے ہیں۔

(تحفۃ الالمعی ص ۵۸۱ ج ۳)

ترمذی شریف ’’کتاب الحج‘‘ میں ایک باب ہے بلاعنوان، اس پر آپ نے ایک باب قائم کیا ’’باب ما جاء فی الاحرام المُبهَم‘‘ یعنی: گول مول احرام باندھنے کا بیان۔

(تحفۃ الالمعی ص ۳۶۲ ج ۳)

حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب کا کبھی کبھی مغرب سے پہلے نفل پڑھنا

مغرب سے پہلے نفل کے بیان میں فرمایا:

’’بخاری شریف‘‘ (کتاب التھجد، باب ۳۵، حدیث: ۱۱۸۳) میں حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ’’صَلُّوا قَبْلَ صَلٰوۃِ المَغْرِبِ‘‘ مغرب سے پہلے نفلیں پڑھو، یہ بات دو مرتبہ فرمائی، پھر تیسری مرتبہ ’’لمن شاء‘‘ ’’بڑھایا‘‘ یعنی مغرب سے پہلے کوئی نفلیں پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے، راوی عبداللہ مزنی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: آپ ﷺ نے ’’لمن شاء‘‘ اس لئے بڑھایا کہ لوگ اس کو سنت نہ سمجھ لیں: ’’کَرَاهِیَةَ اَنْ یَّتَّخِذَهَا النَّاسُ سُنَّةً‘‘ اس بات کو ناپسند کرتے ہوئے کہ لوگ اس کو سنت بنالیں، اس سے معلوم ہوا کہ حدیث اور سنت میں فرق

ہے، اور ارشاد پاک ’’ صَلُّوا قَبلَ صَلٰوۃِ الْمَغْرِب ‘‘ یہ مسئلہ کی وضاحت کے لئے تھا، عصر کے فرضوں کے بعد جو نفلوں کی ممانعت ہے، وہ غروب شمس تک ممتد ہے، سورج چھپتے ہی کراہیت ختم ہو جاتی ہے، اب کوئی نفلیں پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے، مگر اس وقت میں نفلیں پڑھنا سنت نہیں۔ رمضان میں دس منٹ کے بعد نماز کھڑی ہوتی ہے، پس کوئی کھجور سے افطار کر کے نفلیں پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے، لیکن اس کو سنت نہ بنالیا جائے کہ پورے سال دس منٹ کے بعد مغرب کی نماز کھڑی ہو، مغرب کی نماز میں تعجیل (جلدی کرنا) مطلوب ہے پس یہ حدیث: صرف حدیث ہے، سنت نہیں۔ نہ نبی ﷺ نے مغرب سے پہلے کبھی نفلیں پڑھی ہیں اور نہ چاروں خلفاء نے۔

جب میں مظاہر العلوم میں پڑھتا تھا تو میں نے حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب قدس سرہ کو جو حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے خلیفہ تھے اور مظاہر علوم کے ناظم تھے دیکھا کہ وہ کبھی مغرب کی اذان شروع ہوتے ہی نفلوں کی نیت باندھ لیتے تھے اور امام کے مصلے پر آنے سے پہلے سلام پھیر دیتے تھے۔ (تحفۃ القاری ص ۵۸ ج ۱/ وص ۵۰۴ ج ۳۔ ص ۳۵۹ ج ۲)

مسیح ہدایت اور مسیح ضلالت

مسیح دو ہیں: ایک مسیح ہدایت ہیں اور ایک مسیح ضلالت۔ مسیح ہدایت حضرت عیسی علیہ السلام ہیں، اور مسیح ضلالت کانا دجال ہے، مسیح: فعیل کا وزن ہے جو اسم فاعل کے معنی میں بھی آتا ہے، اور اسم مفعول کے معنی میں بھی، مسیح بمعنی ماسح کے ہیں: ہاتھ پھیرنے والا۔ حضرت عیسی علیہ السلام مسیح اس لئے ہیں کہ وہ ہر طرح کے بیماروں پر ہاتھ پھیرتے تھے، اور ان کے ہاتھ پھیرنے سے اللہ تعالی شفا بخشتے تھے۔ اور مسیح بمعنی ممسوح کے ہیں: ہاتھ پھیرا ہوا۔ کانا دجال مسیح اس لئے ہے کہ اس کی ایک آنکھ چوپٹ ہوگی، گویا وہاں کسی نے ہاتھ پھیر دیا ہے اور وہ جگہ مٹ گئی ہے اور آنکھ نہیں رہی۔ (علمی خطبات ص ۴۹ ج ۱)

تیسرا باب......تنقیدات

سجدۂ سہو کے دو مسئلوں کے مروج عمل پر تنقید

تمام ائمہ متفق ہیں کہ سجدۂ سہو قبل السلام بھی جائز ہے اور بعد السلام بھی، اختلاف صرف اولی اور افضل کا ہے، مگر چونکہ مسئلہ میں خوب بحث ہوئی ہے، اس لئے احناف کے ذہنوں میں قبل السلام سجدے کی گنجائش نہیں رہی۔ اور شوافع بعد السلام سجدے کو جانتے ہی نہیں۔ یہ جو ذہن بن گئے ہیں وہ ٹھیک نہیں۔ (تحفۃ الالمعی ص ۲۲۰ ج ۲)

سجدۂ سہو کا اصل طریقہ یہ ہے کہ قعدۂ اخیرہ میں سب کچھ پڑھ لے: تشہد بھی، درود بھی اور دعا بھی، اس کے بعد سلام پھیرے، پھر دو سجدے کرے، پھر صرف تشہد پڑھ کر سلام پھیر دے، مگر جماعت کی نماز میں عارضی مصلحت سے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ صرف تشہد پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے، پھر سجدے کئے جائیں اور درود و دعا سہو کے قعدہ میں تشہد کے بعد پڑھے جائیں۔ اور ایسا اس لئے کیا جاتا ہے کہ مسبوق جان لیں کہ یہ ایمر جنسی سلام ہے اور وہ کھڑے ہونے میں جلدی نہ کریں۔ مگر اب طریقہ یہ چل پڑا ہے کہ ہر نماز میں صرف تشہد پڑھ کر سلام پھیر دیتے ہیں، بلکہ بعض کتابوں میں یہی مسئلہ لکھ دیا ہے۔ حالانکہ امام اعظم رحمہ اللہ کے قول کی صحیح صورت وہ ہے جو میں نے بیان کی۔ ائمہ کے اختلاف کو اور احادیث کے مطلب کو سمجھنے کے لئے مذہب کی اصل صورت سے واقف ہونا ضروری ہے۔ (تحفۃ الالمعی ص ۲۱۹ ج ۲)

نوٹ:......صحیح صورت مسئلہ یہ ہے کہ: حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے نزدیک قعدۂ اخیرہ میں سجدۂ سہو کے سلام سے پہلے ہی درود شریف اور دعائیں پڑھی جائیں گی، اور سجدۂ سہو کے بعد جو تشہد پڑھا جاتا ہے اس میں درود شریف اور دعائیں نہیں پڑھی جائیں گی، بلکہ تشہد کے فوراً بعد سلام پھیر دیا جائے گا۔ اس کے برخلاف حضرت امام محمد

رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ سجدۂ سہو کے سلام سے پہلے درود شریف اور دعائیں نہیں پڑھی جائیں گی، بلکہ سہو کے بعد والے تشہد میں انہیں پڑھا جائے گا........اور اس مسئلہ میں ایک تیسری رائے بھی ہے کہ دونوں قعدوں میں درود پڑھا جائے، اسی کو بعض فقہاء نے احوط قرار دیا ہے۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے! قاضی خان، شامی، ہدایہ، تاتارخانیہ۔ کتاب النوازل ص ۶۰۷ ج ۳)

حدیث کا کتب فقہ یا تفسیر یا بزرگوں کے ملفوظات میں پایا جانا کافی نہیں

کسی حدیث کا کتب فقہ میں یا کتب تفسیر میں یا بزرگوں کے ملفوظات میں یا کسی اور جگہ پایا جانا حدیث کی صحت کے لئے کافی نہیں یہاں تک کہ وہ حدیث کی کسی کتاب میں نہ ملے اور اس کے تمام روات ثقہ بھی ہوں۔ (تحفۃ الالمعی ص ۲۴۶/۲۴۷ ج ۲)

قنوت کی دعائیں دو منقول ہیں اس لئے ایک ہی پر اکتفا ٹھیک نہیں

قنوت کی دعائیں روایات میں دو آئی ہیں، ایک ”اللھم اھدنی فیمن ھدیت، الخ“ دوسری ”اللھم انا نستعینک، الخ“ پہلی کو شوافع نے اختیار کیا ہے، اور دوسری کو احناف نے، اس اختیار کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلی دعا احناف کو عموماً یاد نہیں ہوتی، اور دوسری دعا شوافع کو یاد نہیں ہوتی، یہ ٹھیک نہیں۔ دونوں دعائیں آپ ﷺ سے مروی ہیں۔ پس دونوں دعائیں یاد کرنی چاہیئے اور پڑھنی چاہییں، کبھی یہ کبھی وہ۔ اور دونوں کو ایک ساتھ پڑھے تو سبحان اللہ۔ (تحفۃ الالمعی ص ۳۲۰ ج ۲)

نوٹ:......احناف کی اختیار کردہ دعا صحاح ستہ میں نہیں، حتی کہ ”طحاوی شریف“ میں بھی نہیں ہے، ہاں ”مصنف ابن ابی شیبہ“ میں یہ دعا آئی ہے۔ اس لئے احناف کو بھی دونوں دعائیں یاد کرنی چاہیئے اور پڑھنی چاہیئے۔ ہمارے مدارس اور مکاتب میں ان دونوں دعاؤں کو سکھانا چاہیئے۔ مرغوب احمد

پبلک مقامات میں عورتوں کے لئے علیحدہ نماز کا انتظام ہونا چاہئے

یہ جو مسئلہ ہے کہ عورتوں کو مسجد میں نہیں جانا چاہئے، اس کا ردعمل یہ ہوا کہ عورتیں بازار میں یا اسٹیشن پر یا پبلک مقامات میں ہوتی ہیں اور نماز کا وقت ہو جاتا ہے اور نماز پڑھنے کے لئے کوئی جگہ میسر نہیں ہوتی تو وہ نماز قضا کر دیتی ہیں، مگر مسجد میں جا کر نماز نہیں پڑھتیں، کیونکہ ذہن یہ بن گیا ہے کہ عورتوں کو مسجد میں نہیں جانا چاہئے، حالانکہ مسجدیں مردوں کی جاگیر نہیں ہیں، ایسی مجبوری میں عورتوں کو مسجد میں جا کر کسی علیحدہ جگہ میں نماز پڑھنی چاہئے بلکہ پبلک مقامات میں جو مسجدیں ہیں ان میں عورتوں کے لئے علیحدہ نماز پڑھنے کا انتظام ہونا چاہئے، ان کا دروازہ الگ ہو، ان کے وضو وغیرہ کا انتظام الگ ہو تاکہ عورتیں اپنے دروازے سے آئیں اور نماز پڑھ کر چلی جائیں۔ (تحفۃ الالمعی ص ۴۱۶/۴۱۷ ج ۲)

فجر وعصر میں ائمہ کو مقتدیوں کی طرف پوری طرح منہ کر کے بیٹھنا چاہئے

نماز کے بعد مقتدیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھنے کا طریقہ عرب ائمہ کا صحیح ہے، وہ پوری طرح گھوم کر لوگوں کی طرف منہ کر کے بیٹھتے ہیں، اور ہمارے یہاں جو طریقہ ہے وہ کعبہ کے احترام میں اور اس کے ادب میں ایسا کرتے ہیں، دائیں بائیں مڑ کر بیٹھتے ہیں تاکہ کعبہ کی طرف پیٹھ نہ ہو، حالانکہ کعبہ کی طرف پیٹھ کرنے کی ممانعت صرف مخصوص حالات میں ہے، پس عصر وفجر کے بعد ائمہ کو لوگوں کی طرف پوری طرح متوجہ ہو کر بیٹھنا چاہئے۔

(تحفۃ القاری ص ۳۵۲ ج ۳)

اب مسجد میں ذرا سی تاخیر پر بھی امام کا انتظار نہیں کرتے، یہ صحیح نہیں ہے

ہمارے معاشرے کی ایک کوتاہی پر فرمایا:

اب ٹن کی نمازیں شروع ہو گئی ہیں جونہی گھڑی میں وقت ہوتا ہے امام کو نماز پڑھانی پڑتی

ہے، وہ تاخیر نہیں کرسکتا، اور امام حاضر نہیں ہے تو کوئی بھی پڑھا دیتا ہے، امام کا انتظار نہیں کرتے، یہ صحیح طریقہ نہیں۔ دور اول میں ائمہ کا مسجد پر کنٹرول تھا، ان کی مرضی کے خلاف نمازیں نہیں ہوسکتی تھیں، یہی سنت ہے۔ (تحفۃ القاری ص۴۲۵ ج ۲)

نماز کے بعد دعا کا ترک صحیح نہیں ہے

سلفی کہتے ہیں: اب نمازوں کے بعد دعا کا التزام ہوگیا ہے، اس لئے اس کو بند کردینا ضروری ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ آپ لوگوں نے عدم دعا کا التزام شروع کردیا ہے، لہذا اس کو بھی بند کرنا ضروری ہے۔

اصلاح کا یہ طریقہ نہیں کہ اللہ تعالی سے مانگنا بند کردیا جائے، یہ تو دوسری غلطی ہے، پہلی غلطی التزام دعا تھی، دوسری غلطی ترک دعا ہے، بلکہ اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ امام صاحب وقتاً فوقتاً لوگوں کو مسئلہ سمجھائیں، اور گاہ بہ گاہ اس پر عمل کرکے بھی دکھائیں، ان شاء اللہ ایسا کرنے سے لوگ صحیح بات سمجھ لیں گے۔ (علمی خطبات ص۵۳ ج ۲)

مدارس میں دارالافتاء کا جال

آج کل ہمارے ملک اور پڑوس کے ملک دونوں میں دارالافتاء کا جال بچھا ہوا ہے، بلکہ اب نئے مدارس دارالافتاء سے شروع ہوتے ہیں، اور داخلہ کے لئے کوئی استعداد ضروری نہیں، ہر فارغ داخلہ لے سکتا ہے، اور چند ماہ میں مفتی بن جائے گا، اور خوش فہمی میں مبتلا ہوجائے گا کہ اسے سب کچھ آگیا۔ اور لوگ بھی اس سے مسائل پوچھنے لگیں گے اور وہ ''ضلَّ و اضلَّ'' کا مصداق بن جائے گا، مگر مدارس میں استعداد سازی پر محنت کرنے والا کوئی نہیں، اس مدرسہ کو چھوٹا مدرسہ سمجھا جاتا ہے (جس میں دارالافتاء نہیں ہوتا) چندہ بھی اس کو کم ملتا ہے، اس لئے ہر شخص دورہ یا دارالافتاء کھول کر بیٹھ جاتا ہے، یہ جو طریقہ تیزی سے چل پڑا ہے یہ بھی تباہی کا پیش خیمہ نظر آتا ہے۔ (علمی خطبات ص۲۷۰ ج ۲)

دیوبندیت کا امتیاز مٹ رہا ہے، اکابر کی قبروں پر کتبوں کا رواج

دیوبندیت کا امتیاز انبیاء، اولیاء اوران کی قبور کو صحیح مقام دینا ہے، ان کے بارے میں غلو سے بچنا ہے، مگر اب ہم بھی اولیاء کی قبور کے ساتھ وہی معاملہ کرنے لگے ہیں جن کو بدعات کے دائرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اکابر کی قبروں پر کتبوں کا رواج عام ہو گیا ہے، جبکہ ’’ترمذی شریف‘‘ میں حسن صحیح حدیث ہے، اس میں قبروں پر لکھنے سے منع کیا گیا ہے، ہاں یہ جزئیہ فقہ میں ضرور ہے کہ بڑوں کی قبر پر لکھ سکتے ہیں، مگر بڑا کون ہے؟ اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ پس ماندگان کے نزدیک تو ان کا مرحوم بڑا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ نہ مقبرہ قاسمی میں کوئی کتبہ تھا، نہ حضرت گنگوہی قدس سرہ کی قبر پر، نہ حضرت تھانوی قدس سرہ کی قبر پر، مگر اب مقبرہ قاسمی میں ہم جاتے ہیں تو عیسائیوں کی قبرستان کا سماں نظر آتا ہے۔

(جلسۂ تعزیت کا شرعی حکم ص: ۳۹/۴۰)

مسجد کے احاطہ اور مدرسہ میں بزرگوں کی تدفین منع ہے

اب دیوبندیوں میں بزرگوں کی مسجد میں تدفین کا اور مدارس کے بانیان کا مدرسہ میں تدفین کا عام رواج ہو چلا ہے، جبکہ حدیث شریف میں اس کی صاف ممانعت ہے، اپنی ملکیت میں تدفین تو جائز ہے، یا گور غریباں میں تدفین ہو، مسجد اور مدرسہ کسی کی ملکیت نہیں مدرسہ اس کے بانی کا ذاتی وقف نہیں، چندے سے قائم کیا گیا ہے، پھر بانی کی مدرسہ میں تدفین کا کیا مطلب؟ کل جب جہالت کا دور شروع ہوگا تو انہی قبروں کی پوجا شروع ہو جائے گی۔ (جلسۂ تعزیت کا شرعی حکم ص: ۴۱)

دعوت وتبلیغ والوں کا جہاد کے فضائل اپنے کام پر چسپاں کرنا صحیح نہیں

یزید بن ابی مریم کہتے ہیں: عبایہ بن رفاعہ پیچھے سے آکر مجھ سے ملے، میں نماز جمعہ کے لئے جا رہا تھا، انہوں نے کہا: خوشخبری سن لو، آپ کے یہ قدم راہ خدا میں ہیں، میں نے

حضرت ابوعبس انصاری رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث سنی ہے کہ جس کے قدم راہ خدا میں گرد آلود ہوں وہ جہنم پر حرام ہیں۔

''کتاب الجہاد'' میں آنے والے فضائل ایک خاص کام کے لئے ہیں، لیکن تبلیغی جماعت کے حضرات ان روایات کو عام رکھتے ہیں، بلکہ اپنے ہی کام کو اس کا مصداق ٹھہراتے ہیں، اور ان حضرات نے ''مشکوۃ'' سے جو ابواب منتخب کئے ہیں ان میں پوری ''کتاب الجہاد'' شامل کی ہے، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان کا کام بھی جہاد ہے، میری اس موضوع پر حضرت مولانا محمد عمر صاحب قدس سرہ سے گفتگو بھی ہوئی ہے اور مکاتبت بھی ہوئی ہے، حضرت قدس سرہ کا موقف یہ تھا کہ ہمارا کام بھی جہاد ہے، حضرت نے ایک خط میں اپنی دلیل کے طور پر ترمذی شریف کی یہی روایت مجھے لکھی تھی کہ عبایہ نے مسجد میں جانے کو فی سبیل اللہ کا مصداق ٹھہرایا ہے، پھر دعوت وتبلیغ کا کام اس کا مصداق کیوں نہیں ہوسکتا؟ میں نے جواب لکھا کہ:

اول تو...... عبایہ صحابی نہیں ہیں، صحابہ کے اقوال حنفیہ کے نزدیک حجت ہیں، اور تابعین کے بارے میں خود امام اعظم رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: ''ھم رجال و نحن رجال ''یعنی ان کے اقوال ہم پر حجت نہیں، اگر کسی صحابی نے اس اصطلاح کو عام کیا ہوتا تو بات بھی تھی۔

ثانیا...... دعوت وتبلیغ ہی اس کا مصداق کیوں؟ آپ اگر چہ ''ہی'' نہیں استعمال کرتے ''بھی'' کہتے ہیں، مگر جماعت تبلیغ کے عوام نے تو اس ''بھی'' کو ''ہی'' سے بدل دیا ہے، یعنی وہ اپنے ہی کام کو جہاد کہتے ہیں، بلکہ وہ حقیقی جہاد کو بھی شاید جہاد نہیں مانتے، جہاد (کے فضائل) ان کے نزدیک دعوت تبلیغ میں منحصر ہیں۔

ثالثا...... دیگر دینی کام کرنے والے مثلاً تعلیم وتدریس میں مشغول اور تصنیف وتالیف میں منہمک لوگ اپنے کام کے لئے فی سبیل اللہ اور جہاد والے فضائل ثابت نہیں کرتے، پھر جماعت ہی یہ روایات کیوں استعمال کرتی ہے؟ اس کے بعد حضرت کا اس موضوع پر کوئی خط

نہیں آیا۔

البتہ ایک دوسرے خط میں حضرت قدس سرہ نے یہ عقلی دلیل لکھی تھی کہ جہاد حسن لغیرہ ہے، فی نفسہ تو جہاد فساد فی الارض ہے، اور دعوت وتبلیغ کا کام فی نفسہ حسن لذاتہ ہے، یہ دعوت الی اللہ اور دعوت الی الاعمال الصالحہ ہے، پس جو فضیلت اور ثواب حسن لغیرہ کا ہے وہ حسن لذاتہ کا کیوں نہیں؟ میں نے جواب میں عرض کیا کہ یہ ثواب میں قیاس ہے اس لئے معتبر نہیں، کیونکہ قیاس احکام شرعیہ میں چلتا ہے دیگر امور توقیفی ہیں، یعنی ان کے لئے نص چاہئے۔ نیز اجر بقدر مشقت ہوتا ہے، اور یہ بات اللہ تعالی ہی بہتر جانتے ہیں کہ کس کام میں کتنی مشقت ہے؟ اور کس کام کا کتنا ثواب ہونا چاہئے؟ بندے یہ بات نہیں جان سکتے، اور یہاں تو بات بدیہی ہے، جہاد اصطلاحی کی مشقت کے پاسنگ کو بھی مروجہ تبلیغ کا کام نہیں پہنچ سکتا، پھر وہ اجر وثواب اور وہ فضائل اس کام کے لئے بلکہ کسی بھی دینی کام کے لئے کیسے ہو سکتے ہیں؟ اور آج تک کسی نے یہ روایات دیگر کاموں کے لئے بیان نہیں کیں۔

ملحوظہ...... میں دعوت وتبلیغ کا مخالف نہیں ہوں، میں تمام دینی کاموں کی اوران کے کارکنان کی قدر کرتا ہوں، اور دعوت وتبلیغ سے تو بطور خاص تعلق رکھتا ہوں، مگر میرے لئے اللہ تعالی نے تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف مقدر کی ہے، یہ اپنا نصیب ہے، اس لئے میری بات کو کسی مخالفت پر محمول نہ کیا جائے، بلکہ میں نے جو بات عرض کرنی چاہئے تھی وہ کی ہے۔ (تحفۃ الالمعی ص ۵۶۴ ج ۴)

تبلیغی جماعت کے حضرات اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ ان کا کام جہاد ہے کیونکہ جب جمعہ کے لئے جانا فی سبیل اللہ ہے تو تبلیغ کے لئے نکلنا فی سبیل اللہ کیوں نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بلا شبہ تبلیغ کے لئے نکلنا فی سبیل اللہ (راہ خدا میں نکلنا) ہے مگر یہ الحاق ہی اس کی فضیلت ہے، جہاد فی سبیل اللہ کے تمام فضائل تبلیغ کے لئے ثابت نہیں کئے جائیں گے، جیسے ''مشکوۃ'' ''کتاب العلم'' میں حدیث ہے: ''**من خرج يطلب العلم فهو في سبيل الله حتى يرجع**'' جو شخص علم دین حاصل کرنے کے لئے گھر سے نکلا وہ جب تک

گھر لوٹ نہ آئے اللہ کے راستہ میں ہے، یعنی طالب علم: مجاہد فی سبیل اللہ کے ساتھ لاحق ہے، اور یہ الحاق ہی اس کی فضیلت ہے۔ یا جیسے ایک مرتبہ صحابہ کا سپہ گری میں مقابلہ ہو رہا تھا نبی ﷺ بھی موجود تھے، دونوں پارٹیوں کے لیڈروں نے اپنے لئے آدمیوں کا انتخاب کیا حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بچ گئے، نبی ﷺ نے ان کو اپنے پاس بٹھالیا اور فرمایا: ''سلمان منّا اھل البیت'' ''سلمان ہمارے گھرانے کے فرد ہیں۔ یہ الحاق ہی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے لئے فضیلت ہے، اہل بیت کے تمام فضائل حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے لئے ثابت نہیں کیے جائیں گے۔

مگر تبلیغی احباب کو اصرار ہے کہ ہمارا کام ہی فی سبیل اللہ ہے، پھر وہ جہاد فی سبیل اللہ کے سلسلہ کی تمام آیات واحادیث کو اپنے کام کا مصداق قرار دیتے ہیں، یہ ان کی غلطی ہے، اس لئے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ جو آیات واحادیث جہاد کے ساتھ خاص ہیں تبلیغی کام ان کا مصداق نہیں۔ حدیث شریف میں طالب علم کو فی سبیل اللہ قرار دیا گیا ہے، مگر کوئی شخص طالب علم کے لئے جہاد کی آیات واحادیث استعمال نہیں کرتا، اور اہل بیت کے تمام فضائل حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے لئے ثابت نہیں کرتا، اسی طرح تبلیغی کام بے شک دینی کام ہے، مگر اس کام کو ان آیات واحادیث کا مصداق قرار دینا جو مجاہدین کے لئے ہیں، سخت غلطی ہے۔ (تحفۃ القاری ص ۲۲۸ ج ۳)

تبلیغ والوں کا نمازیوں کا خیال رکھے بغیر نماز کے بعد اعلان شروع کر دینا

مسجد دراصل نماز پڑھنے کے لئے ہے، پھر دیگر دینی کاموں کے لئے ہے، لہذا جب تک لوگ نماز پڑھ رہے ہیں جماعت خانہ میں دیگر دینی کام نہیں کرنے چاہئیں۔ تبلیغ والے نمازوں کے بعد خاص طور پر مغرب کے بعد جلدی دو سنتیں پڑھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اعلان کرنے لگتے ہیں: ''نمازیوں کا خیال کر کے آگے آجائیں'' حالانکہ وہ خود خیال نہیں کر رہے ہیں۔ ابھی لوگ سنتوں میں مشغول ہیں اور وہ یہ اعلان شروع کر دیتے ہیں، اس سے

نمازیوں کی نماز میں خلل پڑتا ہے، لہذا ان کو اس سے احتراز کرنا چاہئے، جب لوگ سنتوں سے فارغ ہو جائیں تو دین کے دوسرے کام مسجد میں کرنے کی اجازت ہے۔

(تحفۃ الالمعی ص ۱۴۰ ج ۲)

تبلیغی احباب کہتے ہیں: دعوت کے کام پر جہاد کا ثواب ملے گا، یہ صحیح نہیں

تبلیغی احباب کہتے ہیں: جہاد حسن لغیرہ ہے، اور دعوت کا کام حسن لذاتہ ہے، پس جو ثواب حسن لغیرہ کے لئے ہے وہ ثواب ہمارے کام کے لئے بھی بدرجۂ اولی ہوگا۔ ان کی یہ بات صحیح نہیں، ثواب کا مدار حسن پر نہیں، نماز بھی حسن لذاتہ ہے، مگر اس کے لئے جہاد کا ثواب کوئی ثابت نہیں کرتا، بلکہ اجر کا مدار مشقت پر ہے، اور جہاد کی مشقت میں اور دعوت کی مشقت میں آسمان و زمین کا فرق ہے، پس دونوں کا ثواب ایک نہیں ہوسکتا، اور آیات واحادیث جہاد کا تبلیغ کے کام کے لئے پڑھنا درست نہیں۔ (تحفۃ القاری ص ۵۱۲ ج ۲)

چوتھا باب……حدیث میں بصیرت کی مثالیں

تسبیحات نوافل کے بعد پڑھے یا فرضوں کے بعد، اور حضرت کی رائے

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے ”حجۃ اللہ البالغۃ“ میں تحریر فرمایا ہے کہ تسبیحات فرضوں کے بعد متصلاً پڑھنی چاہئیں، مگر میری ناقص رائے یہ ہے کہ یہ تسبیحات سنن ونوافل سے فارغ ہو کر پڑھنے چاہئیں، تا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ۔ کہ: آپ ﷺ فرضوں کے بعد صرف ”اللّٰھم انت السّلام“ کے بقدر بیٹھتے تھے ۔ کے خلاف لازم نہ آئے۔ (تحفۃ الالمعی ص ۲۴۸ ج ۲۔ تحفۃ القاری ص ۱۷۱ ج ۳)

”سونے سے پہلے وتر پڑھ لو“ سے کیا مراد ہے؟ اور حضرت کی رائے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: مجھے رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ:

میں سونے سے پہلے وتر پڑھ لوں۔

اس حدیث میں وتر سے کیا مراد ہے؟ عام طور پر یہ بات سمجھی گئی ہے کہ اس سے مراد وتر حقیقی ہے، مگر میری رائے میں حدیث مذکور میں صرف وتر مراد نہیں ہے، بلکہ وتر اور صلوۃ اللیل کا مجموعہ مراد ہے۔ اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس کو اٹھنے کا یقین نہ ہو، اس کے مشاغل ایسے ہوں کہ وہ اٹھ نہیں سکتا، یا دیر سے سوتا ہے، یا طبعی طور پر مزاج ایسا ہے کہ پڑا اور مرا ایسے لوگوں کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ سونے سے پہلے تہجد کی نیت سے نفلیں پڑھ لیں، پھر وتر پڑھیں اور سو جائیں۔ یہ تہجد نہیں بلکہ ایڈوانس بدل ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی وجہ سے تہجد نہیں پڑھ پاتے تو سورج نکلنے کے بعد بارہ رکعت پڑھتے تھے۔ ظاہر ہے یہ نفلیں تہجد کی نہیں بلکہ اس کا بدل ہیں، اور بدل مؤخر بھی ہوسکتا ہے اور مقدم بھی۔ غرض حدیث میں حقیقی وتر مراد نہیں، بلکہ تہجد کا بدل مراد ہے۔ (تحفۃ الالمعی ص ۳۰۷ ج ۲)

ظہر سے پہلے سنت مؤکدہ چار رکعت ہیں یا دو؟ اور حضرت کی رائے

ظہر سے پہلے سنت مؤکدہ چار رکعت ہیں یا دو رکعت؟ دونوں طرح کی روایات منقول ہیں، اور دونوں صحیح ہیں۔ علامہ بدر الدین عینی اور علامہ کشمیری رحمہما اللہ کا رجحان یہ ہے اور میری بھی ناقص رائے یہی ہے کہ دونوں روایتیں معمول بہا ہیں، عمومی احوال میں ظہر سے پہلے چار رکعت سنت مؤکدہ ہیں، اور وقت کی تنگی ہو، جماعت کھڑی ہونے والی ہو تو پھر دو رکعت پڑھ لے، اس سے بھی فضیلت حاصل ہو جائے گی۔ (تحفۃ الالمعی ص ۲۵۵ ج ۲)

نوٹ:...... حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: آپ ﷺ نماز ظہر سے پہلے چار رکعت اور نماز ظہر کے بعد دو رکعت پڑھتے تھے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: آپ ﷺ کو کبھی ظہر سے پہلے چار رکعت پڑھنے کا موقع نہ ملتا تو ظہر کے بعد چار رکعت ادا فرمالیتے۔

(۱)...... عن علی قال : کان النبی صلی الله علیه وسلم یصلّی قبل الظهر اربعا و بعدها رکعتین۔

(۲)......عن عائشة : ان النبی صلی الله علیه وسلم کان اذا لم یصل اربعا قبل الظهر صلاهن بعدها۔

(ترمذی، باب ما جاء فی الاربع قبل الظهر ، و باب آخر منه ، رقم الحدیث:۴۲۶/۴۲۴)

اس لئے وقت کی تنگی ہو اور پہلے نہ پڑھ سکے تو بعد میں پڑھ لینی چاہئے۔ مرغوب احمد

ایک حدیث سے میں نے یہ سمجھا کہ احکام کی تشریع کی صورتیں یہ ہیں

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: آپ ﷺ بعض کاموں کو باوجود چاہت کے نہیں کرتے تھے ، اس خوف سے کہ لوگ ان پر عمل کریں گے اور وہ ان پر فرض کردیئے جائیں ، مثلاً آپ ﷺ چاشت کی نماز نہیں پڑھتے تھے ، اور میں پڑھتی ہوں۔

حضرت نے اس حدیث کی شرح میں فرمایا کہ: اس حدیث سے میں نے یہ بات سمجھی ہے کہ احکام کی تشریع کی ایک صورت یہ ہوتی تھی کہ امت کسی حکم کی خواہش کرے اور نبی اس کی تائید کرے ، پس اللہ تعالی کی طرف سے وہ حکم لازم کردیا جاتا ہے ، جیسے مسلمانوں نے جمعہ کی نماز شروع کی اور آپ ﷺ نے اس کی تائید فرمائی تو جمعہ فرض ہوگیا ، اور آپ ﷺ نے ہر نماز سے پہلے مسواک کرنا چاہا ، مگر امت کی طرف سے کوئی اشتیاق سامنے نہیں آیا تو مسواک فرض نہیں ہوئی ، اور اس کے برعکس صورت یہ ہے کہ لوگوں نے تراویح کی انتہائی خواہش کی مگر آپ ﷺ نے اس کی تائید نہیں فرمائی ، اور آپ ﷺ چوتھے دن تشریف نہیں لائے کہ کہیں تراویح فرض نہ ہوجائے ، پس تراویح فرض نہیں ہوئی۔

(تحفۃ القاری ص۴۵۳ ج۳)

بیعت کے وقت عورت کے ہاتھ پکڑنے کی روایات معتمد علیہ نہیں

مسئلہ:...... بیعت کے وقت اجنبی عورت کے ہاتھ پکڑنے کے جواز کی روایات ”تفسیر کبیر“ اور ”روح البیان“ وغیرہ میں ہیں ان کا حال معلوم نہیں۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: ایسی روایات ہیں اور قابل استدلال بھی ہیں، مگر معتمد علیہ نہیں ہیں۔ روح المعانی ص ۲۸ ج ۱۸، سورۂ ممتحنہ، آیت نمبر: ۱۲ رکی تفسیر میں ہے: ”او من یثبت ذلک یقول بالمصافحة وقت المبایعة، والاشهر المعول علیه ان لا مصافحة“ بلکہ اعتماد مسلم شریف کی روایت پر ہے (کہ آپ ﷺ نے کبھی کسی عورت کا ہاتھ نہیں چھویا)۔

(مسلم ص ۱۳۱ ج ۲، کتاب الامارة، باب کیفیة بیعة النساء)

(فتاوی دارالعلوم دیو بند ص ۶۶ ج ۱۷)

کیا حواء رضی اللہ عنہا حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا ہوئیں؟

مسئلہ:...... حضرت حواء رضی اللہ عنہا کو حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا فرمایا۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: ﴿وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ (سورۂ نساء، آیت: ۱) کی جو تفسیر کی جاتی کہ حواء رضی اللہ عنہا کو حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کیا، یہ تفسیر اسرائیلی روایات کی روشنی میں کی جاتی ہے، بائبل میں آج بھی یہ مضمون ہے، البتہ صحیح روایت ایک ہے جو ابھی آرہی ہے، مگر اس میں عورت کی تخلیق کا بیان نہیں ہے، بلکہ نسوانی فطرت میں جو کجی ہے اس کی تمثیل (پیرایۂ بیان) ہے۔

اور ”روح المعانی“ میں سورۃ النساء کی پہلی آیت کی تفسیر میں حاشیہ میں ایک بڑے تابعی کا قول ذکر کیا ہے: ”خُلقتْ حواء من بقیّة طِینة آدم“ یعنی آدم علیہ السلام کے لئے جو مٹی تیار کی گئی تھی اس کے باقی ماندہ سے حواء رضی اللہ عنہا کو پیدا کیا، بلکہ سبھی انواع کی تخلیق اسی طرح ہوئی ہے، نوع کے پہلے دو فرد مٹی سے بنائے گئے ہیں، پھر ان میں توالد و تناسل کا سلسلہ قائم

کیا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی میری وصیت قبول کرو، اس لئے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے، اور پسلیوں میں سب سے ٹیڑھی اوپر کی پسلی ہے، پس اگر آپ پسلی کو سیدھا کرنا چاہیں گے تو اس کو توڑ بیٹھیں گے اور اگر اس کو ٹیڑھا رہنے دیں گے تو وہ برابر ٹیڑھی رہے گی، پس عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی میری وصیت قبول کرو۔

تشریح:......اس حدیث میں نسوانی فطرت میں جو کجی ہے اس کی تمثیل ہے، پسلی کی مثال سے اس کو سمجھایا ہے، پسلی میں کجی فطری ہوتی ہے وہ کسی طرح ختم نہیں ہوسکتی، کوئی اس کو سیدھا کرنا چاہے تو ٹوٹ جائے گی، یہی حال صنف نساء کا ہے، اس کی فطرت میں کجی ہے، جو کبھی نکل نہیں سکتی، اس لئے اس بات کو پیش نظر رکھ کر بیوی سے معاملہ کرنا چاہئے، یعنی حسن سلوک کرنا چاہئے، بیوی کی کوتاہیوں سے در گذر کرنا چاہئے، اس کی نا مناسب باتوں کو نظر انداز کرنا چاہئے، جبھی نباہ ہوگا، اور اگر کوئی چاہے گا کہ بیوی کو سیدھا کردے تو یہ ناممکن ہے اس کو سیدھا نہیں کر سکے گا، بلکہ اس کو توڑ بیٹھے گا، اور بیوی کو توڑنا یہ ہے کہ طلاق کی نوبت آجائے گی پس اس سے بہتر نرمی کا معاملہ کرنا ہے۔

فائدہ:......اس حدیث کو دادی حواء رضی اللہ عنہا کے ساتھ جوڑا گیا ہے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کی پسلیوں میں سے کسی پسلی سے پیدا کی گئی ہیں، مگر حاشیہ میں اس قول کو ''قیل'' سے ذکر کیا ہے، یعنی یہ ضعیف قول ہے، صحیح بات وہ ہے جو اوپر بیان کی، اور حاشیہ میں قاضی بیضاوی رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھا ہے ''انّهُن خُلقن خلقا فيهن اِعوِجاجٌ : فكانّهن خُلقن من اصل مُعوَّجٍ ، كالضِّلع مثلا ، فلا يتهيّأ انتِفاعٌ بهنّ الا بالصّبر على اِعوِجاجِهِنَّ'' عورتوں کی بناوٹ ایسی ہے کہ ان میں کجی ہے، پس گویا عورتیں ٹیڑھی اصل سے پیدا کی گئی ہیں، مثلاً پسلی سے، پس ان سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں مگر ان کی کجی پر صبر کرنے کے ذریعہ

حدیث کا صحیح مطلب یہی ہے، اور جو عام بات چلی ہوئی ہے وہ ضعیف ہے، اسرائیلیات سے وہ بات در آئی ہے۔

(فتاوی دارالعلوم دیوبند ص۳۳۰ ج ۱۸۔ تحفۃ القاری ص: ۵۳۶/۵۳۷/۵۴۵ ج۶)

عمامہ باندھ کر نماز کی فضیلت والی روایت کا حکم

مسئلہ:...... ''فردوس دیلمی'' میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ: عمامہ کے ساتھ دو رکعت پڑھنا بغیر عمامہ کی ستر رکعت سے بہتر ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ: فرض یا نفل نماز عمامہ کے ساتھ پڑھنا بغیر عمامہ کی نماز سے پچیس درجہ بڑھی ہوئی ہے، اور عمامہ کے ساتھ جمعہ کی نماز بغیر عمامہ کے ستر درجہ بہتر ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سیوطی رحمہ اللہ نے ''جامع صغیر'' (حرف راء) میں ذکر فرما کر ضعیف کا نشان بنایا ہے۔ علامہ مناوی رحمہ اللہ نے ''فیض القدیر'' میں لکھا ہے کہ: سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''ھذا الحدیث لا یثبت'' یہ حدیث ثابت نہیں ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی سیوطی رحمہ اللہ نے ''جامع صغیر'' (حرف صاد) میں ذکر فرمائی ہے اور صحیح کا نشان بنایا ہے، لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کو موضوع کہا ہے۔ سخاوی رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے ''موضوعات کبری'' اور ''صغری'' دونوں میں اس کو موضوع کہا ہے۔ اور ''الموضوعات الکبری'' میں تو سیوطی رحمہ اللہ پر ''جامع الصغیر'' میں ذکر کرنے پر اعتراض بھی کیا ہے۔ (امداد الفتاوی جدید ص۱۸۶ ج۲)

پانچواں باب...... حضرت رحمہ اللہ کی فقہی بصیرت

حقیقی تملیک کے بغیر زکوۃ کا حیلہ 'حیلہ' نہیں، ڈھونگ ہے

مسئلہ:......زکوۃ کے مال کو حیلہ کرنا جائز ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: حیلۂ تملیک: اسی وقت حیلہ ہوگا جب واقعی تملیک ہو، ورنہ وہ حیلہ نہیں ہے ڈھونگ ہے، اس سے کوئی حلت پیدا نہ ہوگی۔

(فتاوی دار العلوم دیو بند ص۳۷۴ ج۱۴)

مفت خوری کی عادت پڑنے کا شبہ ہو تو زکوۃ نہیں دینی چاہئے

سوال:......جس کے پاس مایغنیہ ہو اس کو زکوۃ دینی چاہئے یا نہیں؟

جواب:......اگر احتمال ہو کہ اسے مفت خوری کی عادت پڑ جائے گی تو نہیں دینی چاہئے۔ اور اگر کار آمد آدمی ہے، مگر ضرورت مند اور عیال دار ہے، اور مفت خوری کی عادت پڑنے کا احتمال نہیں تو زکوۃ سے اس کی مدد کرنی چاہئے۔ (تحفۃ الالمعی ص۵۶۶ ج۲)

متولی کا اپنی ضرورت کے لئے مسجد کے پیسہ کو قرض لینا

مسئلہ:......اگر مسجد میں پیسے ہوں، اور بالفعل ضرورت نہ ہو اور اطمینان ہو کہ قرض لینے سے وہ روپیہ ضائع نہ ہوگا اور بہ وقت ضرورتِ مسجد فوراً ادا ہو سکے گا، اور واپس کر دیا جائے گا تو مسجد کے متولی کو اپنی ضرورت کے لئے قرض لینے کی گنجائش ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں کہ: مگر یہ اطمینان بہ قضائے قاضی قرض لینے کی صورت ہی میں ہو سکتا ہے۔ (فتاوی دار العلوم دیو بند ص۴۵۲ ج۱۳)

مسجد کی دیواروں پر ”یا غوث اعظم دست گیر“ لکھنا درست نہیں

مسئلہ:......مسجد کی دیواروں پر ”یا غوث اعظم دست گیر“ لکھنا درست نہیں۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں:

غوث: فریاد رس، اعظم: سب سے بڑے، غوث اعظم سب سے بڑے فریاد رس اللہ تعالی ہیں

، ان کے علاوہ کوئی غوث اعظم نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح دست گیر: ہاتھ پکڑنے والا، یعنی بے کسوں کا سہارا بننے والا بھی اللہ تعالی کے سوا کوئی نہیں، اس لئے یہ لکھنا بھی جائز نہیں، کیونکہ اللہ تعالی کی شان سے جاہل غوث اعظم دست گیر سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کو مراد لیتے ہیں۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند ص ۲۰۲ ج ۱۴)

مسجد میں بچوں کو اجرت لے کر تعلیم دینا

مسئلہ:...... مسجد میں بچوں کو اجرت لے کر تعلیم دینا بہتر نہیں۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: اور اب جب کہ تعلیم قرآن پر جواز اجارہ کا فتوی ہوگیا ہے کراہیت کی یہ وجہ تو باقی نہیں رہی کہ مسجد میں کوئی بھی ایسا کام کرنا مکروہ ہے جس پر اجرت لی جائے، البتہ ناسمجھ بچے جو مسجد کا احترام ملحوظ نہ رکھ سکتے ہوں ان کو مسجد سے دور رکھنے کا جو حکم حدیث میں آیا ہے، وہ وجہ باقی ہے، اور نمازیوں کے سکون کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند ص ۲۰۴ ج ۱۴)

مسئلہ:...... مسجد میں بچوں کو اجرت لے کر تعلیم دینے میں جواز ہی راجح ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: اس مسئلہ میں کچھ اختلاف اس زمانہ میں تھا جب طاعات مقصودہ پر اجارہ کے بطلان کا فتوی تھا، مگر اب جب کہ متأخرین نے جواز کا فتوی دے دیا تو اب جواز میں کچھ شبہ باقی نہیں رہا۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند ص ۲۰۶ ج ۱۴)

قبور پر پھول اور سبز پتے چڑھانا

مسئلہ:...... قبور پر پھول اور سبز پتے درخت کے چڑھانے میں اختلاف ہے، احوط ترک ہے

اس پر تحریر فرماتے ہیں: اختلاف پھول پتے رکھنے میں ہے، چڑھانا تو حرام ہے، کیونکہ وہ تو عبادت ہے۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند ص ۲۶۸ ج ۱۴)

فقہ کی کتابوں کے بیع سلم کے جزئیات دور اول کے ہیں

مسئلہ:...... بیع سلم درست ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ اس وقت ایک روپیہ دیوے، اور دوسرے سے یہ کہے کہ ایک ماہ میں یا اس سے زائد میں جو مدت مقرر ہو کر دیوے اس قدر فلوس ایک روپیہ کے عوض تم سے لوں گا، اسی طرح سو روپیہ دے کر اس قدر پیسہ لینا ٹھہرا دے جو سوا سو یا ڈیڑھ سو کے ہوں تو بطریق بیع سلم یہ معاملہ درست ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: یہ مسئلہ اس وقت تھا جب فلوس (پیسے) مستقل کرنسی تھے، روپے کے اجزاء نہیں تھے، اور روپے اور فلوس کا بھاؤ بھی گھٹتا بڑھتا تھا، مگر اب پیسے: روپے کے اجزاء ہیں، پس اب نہ بیع سلم جائز ہے نہ کمی بیشی۔ فقہ کی کتابوں میں سب جزئیات جو اس عنوان کے تحت جوابات میں ہیں وہ سب دور اول کے ہیں۔

(فتاوی دارالعلوم دیوبند ص ۴۲۸ ج ۱۴)

فارم مال متقوم ہے، اس کی بیع کا حکم

مسئلہ:...... مسلمان ہنود سے سودی قرض لیتے ہیں، اس کو بند کرنے کے لئے ایک بینک کھولا گیا، اور بینک کے متعلق بہت سے اخراجات ہوتے ہیں، اس لئے ایک کاغذ چھپوا کر قرض خواہ کے ہاتھ فروخت کرنا، مثلاً جو شخص دس روپیہ قرض لے اس کو دس آنے میں اور جو بیس روپے لے اس ایک روپیہ چار آنے میں فروخت کرنا یہ ناجائز ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: اصل فتوی تو یہی ہے، پھر بعض مفتیان کرام سے جواز کا فتوی حاصل کیا گیا، اور اس کے مطابق منظّم طریقہ پر کام شروع کیا گیا جو آج تک چل رہا ہے۔ اس سلسلہ میں: ۲۲/ تا: ۲۴/ رجب: ۱۴۱۱ھ میں ایک فقہی اجتماع من جانب جمعیۃ علماء ہند بلایا گیا جس میں اکثر کا موقف یہ تھا کہ: فارم (معاہدہ نامہ) چونکہ مال متقوم ہے اور اس کی خریداری

صلب عقد میں شرط نہیں، اس وجہ سے فارموں کی بیع اداروں کے لئے جائز ہے، اور بعض حضرات نے اختلاف کیا کہ فارم حاصل کرنے والے کا مقصد چونکہ فارم خریدنا نہیں ہے بلکہ قرض کے حصول کا ذریعہ ہے، اس لئے جائز نہیں، البتہ اجرۃ الخدمت (سروس چارج) کے سلسلہ میں رجحان جواز کا تھا مگر اس کی کوئی صحیح صورت کسی کے ذہن میں نہیں آئی، اور میں نے یہ رائے دی تھی کہ بزرگوں کی دی ہوئی اجازت کے مطابق فارم کی بیع ایک حیلہ تھی، جس کو خرابیوں کے سامنے آنے کی وجہ سے سد اللباب ناجائز کہنا ضروری ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ حیلہ درحقیقت قانون کی لچک ہوتی ہے، جس قانون میں لچک نہیں ہوتی لوگ اس قانون کو توڑنے پر مجبور ہوتے ہیں، مگر حیلے خود قانون نہیں ہوتے، یعنی ان کو مستقلا استعمال کرنا درست نہیں ہوتا۔ حیلوں کا جواز قرآن وحدیث سے ثابت ہے، سورۂ ص (آیت:۴۴) میں ایک حیلہ ہے کہ آپ اپنے ہاتھ میں ایک مٹھا سینکوں کا لیں اور اس سے ماریں اور قسم نہ توڑیں۔ اور حدیث میں ''عثکال'' (کھجور کے گچھے) کے ذریعہ ایک نہایت لاغر شخص پر جو ناقص الخلقت تھا حد جاری کرنے کا ذکر آیا ہے، (مشکوۃ ص ۳۱۲، کتاب الحدود) لیکن ان حیلوں کو اگر قانونی شکل دے دی جائے اور ہر زانی کو اسی طرح سزا دی جائے تو یہ کسی طرح بھی روانہ ہوگا۔ یہ بات صحیح ہے کہ فارم مال متقوم ہے، اس لئے اس کو جس قیمت پر بیچنا چاہیں بیچ سکتے ہیں، مگر اس کو حلت ربا کے حیلے کے طور پر استعمال کرنا درست نہیں ہے۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند ص۴۶۲ ج۱۴)

لائف انشورنس جائز نہیں، املاک کا انشورنس جائز ہے

مسئلہ: ...... بیمہ کرانا مکان وجان کا شرعا ناجائز ہے، اور یہ قمار ہے جو بنص قاطع حرام ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: بیمہ کی حرمت اس وجہ سے ہے کہ وہ واقعی سود اور قمار پر مشتمل ہے پہلے زندگی اور املاک کے بیمے ان دونوں باتوں پر مشتمل ہوتے ہوں گے، اس لئے حضرت

مفتی صاحب رحمہ اللہ نے دونوں کو ناجائز لکھا ہے، مگر اب زندگی کا بیمہ تو ان دونوں خرابیوں پر مشتمل ہوتا ہے، اور املاک کے بیمہ میں یہ دونوں باتیں نہیں ہوتیں، اس لئے لائف انشورنس تو حرام ہے، مگر املاک (کار، دکان، سامان وغیرہ) کا بیمہ جائز ہے، میڈیکل انشورنس میں یہ دونوں خرابیاں نہیں پائی جاتیں، اس لئے وہ بھی شرعاً جائز ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ لائف انشورنس میں اگر آدمی مدت بیمہ پوری کرنے سے پہلے مر جائے تو بیمہ کی رقم ملتی ہے، اور مدت بیمہ پوری کر لے اور حادثہ پیش نہ آئے تو بھری ہوئی رقم مع سود کے واپس ملتی ہے، پس اس میں ربا بھی ہے اور قمار بھی کہ معلوم نہیں: بیمہ کی رقم ملے گی یا بھری ہوئی رقم؟ اس لئے زندگی کا بیمہ ناجائز ہے۔

اور املاک کے بیمہ کا طریقہ یہ ہے کہ مثلاً کار کا بیمہ کرایا اگر مدت بیمہ میں حادثہ پیش آیا تو حسب قرارداد بیمہ کی رقم ملے گی جو کمپنی کی طرف سے ایک طرح کا تعاون ہوگا۔ اور مدت بیمہ پوری ہوگئی اور کوئی حادثہ پیش نہ آیا تو بھری ہوئی رقم گئی، پس وہ گویا ایک انجمن کی منبری فیس ہے، اور بیمہ کی رقم حادثہ پیش آنے کی صورت میں کمپنی کی طرف سے تعاون ہے، غرض اس میں نہ قمار ہے نہ سود، اس لئے املاک کا بیمہ جائز ہونا چاہئے۔ مفتیان کرام غور فرمالیں۔

اسی طرح جو مال ڈاک وغیرہ سے روانہ کیا جاتا ہے اور اس کا بیمہ کرایا جاتا ہے، اس کا طریقہ بھی املاک کے بیمہ کا طریقہ ہے، اس میں بھی نہ سود ملتا ہے نہ وہ قمار ہے، بلکہ بیمہ کی رقم سیکورٹی (حفاظت) کا معاوضہ ہے، اگر مال مطلوبہ جگہ پر پہنچ گیا تو بیمہ کی رقم یعنی حفاظت کا معاوضہ گیا، اور نہ پہنچ سکا تو ڈاک خانہ وغیرہ معینہ رقم ادا کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے، یہ بھی کمپنی کی طرف سے ایک طرح کا تعاون ہے، مال کا ضمان نہیں ہے، اس پر بھی مفتیان کرام غور فرمالیں۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند ص ۵۰۹ ج ۱۴)

غیر موسم میں دس روپے کے دو من گیہوں قرض دینا و موسم میں تین من لینا

مسئلہ:...... کسی نے دس روپے کے گیہوں بطور قرض دو من دیئے، اور فصل کے زمانہ میں بوجہ ارزاں ہونے کے تین من گیہوں دس روپے لئے، اس میں جواز کی گنجائش ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: یہ ایک طرح کا حیلہ ہے، بجائے گیہوں قرض لینے کے دس روپے قرض لئے ہیں، پھر روپے لئے بغیر گیہوں خریدے ہیں، اسی طرح بہ وقت وصولی بھی روپے وصول کئے بغیر اس سے گیہوں خریدے ہیں، اس لئے گنجائش کی بات فرمائی ہے ۔(فتاوی دار العلوم دیو بند ص ۶۸ ج ۱۵)

طیب خاطر نہ ہونے کا شبہ ہو تو ہدیہ نہ لینا بہتر ہے

مسئلہ:...... زید نے اپنی بیٹی کی شادی بکر سے کی، اور مہر ایک ہزار وصول کر کے بیٹی کو دیا، اور اس کو کہا کہ مجھے بخش دے، چنانچہ بیٹی نے اپنے باپ کو دے دیا، یہ ہدیہ بظاہر حلال ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: کیونکہ بیٹی نے بہ ظاہر رضا مندی سے باپ کو ہبہ کیا ہے، مگر چونکہ باپ کا بیٹی پر باپ ہونے کا دباؤ ہوتا ہے، اس لئے ممکن ہے طیب خاطر نہ ہو، اس لئے احتیاط بہتر ہے۔ (فتاوی دار العلوم دیو بند ص ۲۳۴ ج ۱۵)

ہبہ بالعوض میں رجوع نہیں ہوسکتا

مسئلہ:...... زید کا اپنے بھائی بکر کے احسانات گذشتہ کے عوض جائداد کا ہبہ کرنا شرعا ہبہ بالعوض ہے۔ اس پر تحریر فرماتے ہیں: ہبہ بالعوض میں بھی رجوع نہیں ہوسکتا، پس صورت مسئولہ میں رجوع کے لئے دو مانع ہیں: قرابت محرمہ اور ہبہ کا بالعوض ہونا۔

(فتاوی دار العلوم دیو بند ص ۲۴۷ ج ۱۵)

قاضی کا قضا پر اجرت لینا

مسئلہ:...... قاضی کو قضا پر اجرت لینا درست نہیں ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: یہ پہلے زمانہ کا مسئلہ ہے جب طاعات مقصودہ پر اجارہ باطل تھا اب فتوی یہ ہے کہ جن طاعات کے ساتھ نظام اسلامی وابستہ ہے، ان کا اجارہ درست ہے پس قاضی کی تنخواہ بھی درست ہوئی۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند ص۳۴۲ ج ۱۵)

مجلس میں کوئی چیز تقسیم کرنی ہوتو کس طرف سے شروع کرے؟

مسئلہ:......مجلس میں کوئی چیز تقسیم کرنی ہوتو شرعی حکم یہ ہے کہ داہنی طرف سے شروع کرے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: اگر مجلس میں میر محفل ہوتو پہلے مشروب اس کو دیا جائے، پھر اس کی دائیں طرف والے کو، ہکذا، ورنہ مجلس میں جو بڑا ہو اس کو دے، پھر دائیں طرف والے کو یا تقسیم کرنے والا اپنی دائیں طرف والے کو پھر اس کی دائیں جانب والے کو، دونوں باتیں درست ہیں۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند ص۱۲۰ ج ۱۶)

جیٹھ، دیور، بہنوئی، چچا، ماموں اور پھوپھی کے لڑکوں سے پردہ

مسئلہ:......جیٹھ، دیور، بہنوئی، چچا، ماموں اور پھوپھی کے لڑکے بھی غیر محرم ہیں، کیونکہ ان سے نکاح جائز ہے، مگر ہمارے معاشرہ میں ان سے کامل پردہ مشکل ہے۔

اول......تو ہندوستانی مسلمانوں کی معیشت کمزور ہے، ہر ایک کا گھر علیحدہ نہیں ہوسکتا۔

دوم...... ہندو معاشرہ کا مسلمانوں کے معاشرہ پر اثر پڑا ہے، اور اختلاط عام ہوگیا ہے، اس لئے اس معاملہ میں بھی دو شرطوں کے ساتھ تخفیف مناسب معلوم ہوتی ہے:

(۱)......بغیر اجازت لئے یہ لوگ اچانک گھر میں نہ آئیں، جب بھی آئیں پہلے آگاہ کریں تاکہ عورت خود کو سنبھال لے اور اعضاء (یعنی: چہرہ، ہتھیلی اور پیر) کے علاوہ باقی جسم ڈھانک لے۔

(۲)...... یہ لوگ تنہائی میں جمع نہ ہوں، اور بے تکلفی سے باتیں نہ کریں۔ حدیث میں ہے کہ: عورتوں کے پاس تنہائی میں جانے سے بچو، ایک انصاری نے پوچھا: جیٹھ، دیور کا کیا حکم ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا: جیٹھ، دیور تو موت ہیں، یعنی بڑا فتنہ ہیں، کیونکہ جیٹھ، دیور کی بھاوج سے بے تکلفی ہوتی ہے، اس لئے فتنہ پیش آنے میں دیر نہیں لگتی، اور یہی حکم سالیوں کا ہے، ان کے ساتھ بہنوئی کی بے تکلفی ہوتی ہے، اس لئے فتنہ پیش آتا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جیٹھ، دیور اگرچہ غیر محرم ہیں، مگر چونکہ ان کے ساتھ ہر وقت رہنا ہوتا ہے، اس لئے ان کے ساتھ تنہائی اور بے تکلفی تو جائز نہیں، مگر باقی پردے میں تخفیف ہے۔ (فتاوی دار العلوم دیوبند ص۲۰۰ ج۱۶)

نوٹ:...... جن کو اللہ تعالی نے مال دیا ہو وہ فورا شادی کے بعد بچے کو علیحدہ کردیں، تاکہ سالی کے ساتھ بے پردگی نہ ہو۔ ہمارے یہاں برطانیہ میں علیحدہ ہونا اتنا مشکل نہیں ہے، اس لئے یہاں برطانیہ میں بھی اس پر عمل کرنا چاہئے۔

دوسری بات بلاضرورت جیٹھ، دیور، اور سالی کے ساتھ بے تکلفی اور بے پردگی کی فضا عام ہوگئی ہے، اور علماء وارباب افتاء اور اہل دعوت اور اہل خانقاہ سے وابستہ ایک طبقہ بھی اس میں بہت کوتاہی کررہا ہے، اس کی اصلاح بہرحال ضروری ہے۔ اہل علم کو اپنے بیانات میں اس پر خصوصی توجہ دلانی چاہئے، اور باربار دلاتے رہنا چاہئے۔

اہل علم بھی اپنی سالیوں کے ساتھ حرمین شریفین میں عمرہ یا حج کے مواقع پر بے پردگی برتتے ہیں، ان مبارک مقامات پر اہل علم وفضل کا یہ عمل قابل صد حسرت وافسوس ہے۔

مرغوب احمد

مسئلہ:...... ستر مرد وعورت کا ایک ہے، ناف سے لے کر گھٹنے کے نیچے تک ستر ہے، یعنی چھپانے کا بدن ہے، اس کو بے ضرورت کسی کے سامنے کھولنا جائز نہیں، ایک عورت دوسری عورت کے سامنے جسم کا یہ حصہ بے ضرورت نہیں کھول سکتی، مجبوری کی بات الگ ہے، جیسے بچہ کی ولادت ہے یا کوئی آپریشن کرانا ہے تو وہ الگ مسئلہ ہے، لیکن بے ضرورت نہیں کھول

سکتی، مرد وعورت دونوں کا یہی ستر ہے۔

خطیب کا منبر پر اور مقرر کا اسٹیج پر سلام کرنا

مسئلہ:......خطیب کا منبر پر چڑھ کر سلام کرنا سنت اور مستحب نہیں ہے، بلکہ مکروہ ہے، اور ترک اس کا سنت ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: اور جن روایات میں نبی کریم ﷺ کا منبر سے سلام کرنا مروی ہے، احناف کے نزدیک وہ داخل (مجلس میں آنے والے) کا سلام کرنا ہے، خطبہ کا جزو نہیں ، پس اگر خطیب باہر سے مسجد میں آئے تو داخل ہو کر سلام کرے، پھر منبر پر پہنچ کر ساری مسجد کو سلام کرے، لیکن خطیب پہلے سے مسجد میں ہے، وہ جب خطبہ کے لئے کھڑا ہو اور منبر پر چڑھ کر سلام کرے تو یہ سنت اور مستحب نہیں ہے، کیونکہ اس کا ثبوت نہیں ہے، بلکہ مکروہ ہے کیونکہ اس کے جزو خطبہ ہونے کا وہم پیدا ہوگا۔

اور یہی حکم ہر مجمع کے لئے ہے، پس جو مقرر اسٹیج پر ہے، جب اس کی تقریر کا نمبر آتا ہے تو وہ اکیلا لاؤڈ اسپیکر پر پہنچ کر مجمع کو سلام کرتا ہے، یہ بے اصل ہے، ہاں مقرر اسی وقت باہر سے آئے تو سلام کرسکتا ہے، یہ داخل ہونے والے کا سلام کرنا ہے۔

(فتاوی دارالعلوم دیوبند ص۲۰۹ ج۱۷)

ظالم پر سحر کرنا یا کروانا نہیں چاہئے کہ سحر قطعی حرام ہے

مسئلہ:......ظالم کے شر سے بچنے کے لئے کوئی تدبیر کی جائے تو درست ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: مگر ظالم پر سحر کرنا یا کروانا نہیں چاہئے کہ سحر قطعی حرام ہے۔

(فتاوی دارالعلوم دیوبند ص۱۵۴ ج۱۷)

ضرورۃً بینک میں پیسے رکھنے کی اجازت ہے

مسئلہ:...... بینک میں روپیہ رکھنا اگرچہ بلا اخذ سود ہو جائز نہیں ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: مگر ضرورةً بینک میں روپیہ رکھنے کی ''کفایت المفتی'' (۸/۶۹، کتاب الربا، بینک کے معاملات، جواب نمبر: ۶۵/۶۶) میں اجازت دی ہے۔

(فتاوی دار العلوم دیوبند ص۳۵۹ ج۱۷)

''امداد الفتاوی'' کے حواشی کی مثالیں

نوٹ:...... ''امداد الفتاوی'' کے جو حوالے دیئے گئے ہیں وہ حضرت مولانا مفتی شبیر احمد قاسمی صاحب مدظلہ کی تحقیق والے نسخہ سے لئے گئے ہیں۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ کے ''امداد الفتاوی'' پر حاشیہ کی چند مثالیں یہ ہیں۔

رمضان کی عشاء تنہا پڑھنے والا تراویح اور وتر جماعت سے پڑھ سکتا

مسئلہ:...... رمضان کی عشاء کی نماز تنہا پڑھنے والا تراویح اور وتر جماعت سے پڑھ سکتا ہے۔ لیکن شامی میں قہستانی کے ایک جزئیہ سے نہ پڑھنے کا قول منقول ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: حضرت اقدس مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: علامہ شامی رحمہ اللہ نے بے شک قہستانی سے ایسا ہی نقل کیا ہے کہ جس نے فرض امام کے ساتھ نہیں پڑھے وہ وتر بھی اس کے ساتھ نہ پڑھے، یعنی وتر جماعت سے نہ پڑھے۔ ''غایۃ الاوطار'' میں بھی شامی سے اسی طرح نقل کیا ہے، لیکن علامہ طحطاوی رحمہ اللہ کی عبارت سے جواز معلوم ہوتا ہے اور وہی قرین قیاس ہے، اس لئے ہمارے حضرات اکابر کا فتوی جواز کا ہے..... پس جیسا کہ تراویح کو جماعت سے نہ پڑھنے والا وتر کو جماعت سے پڑھ سکتا ہے اسی طرح فرض کو تنہا پڑھنے والا بھی وتر کو جماعت سے پڑھ سکتا ہے۔ حضرت مولانا محمد

یعقوب صاحب قدس سرہ سے سنا ہوا یاد ہے کہ فرض کو تنہا پڑھنے والا وتر کو جماعت سے پڑھ سکتا ہے، اور ''طحطاوی'' کی عبارت سے استدلال فرماتے تھے۔

اسی طرح حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ بھی اس کو جائز فرماتے تھے۔

(فتاوی دار العلوم اول دوم ص ۲۴۲، قدیم۔ فتاوی رشیدیہ کامل ص ۳۲۸)

نماز کے انتظام اور امام ومؤذن کے تقرر والی بازار کی مسجد میں جماعت ثانیہ

مسئلہ:...... بازار کی مسجد میں جمعہ اور جماعت کا بھی معقول انتظام ہو یعنی امام و نائب امام اور مؤذن تنخواہ دار مقرر ہوں بعض عبارتوں سے جماعت ثانیہ کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: حضرت مجیب قدس سرہ نے مسئولہ ''بازار کی مسجد'' کو شارع اور طریق کی مسجد قرار دے کر جواب دیا ہے، لیکن اظہر یہ ہے کہ وہ ''مسجد محلّہ'' ہے اور اس میں جماعت ثانیہ مکروہ ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ''جس مسجد میں امام اور مؤذن مقرر ہوں اور جماعت کا وقت معین اور لوگوں کو معلوم ہو، اس مسجد کو محلے کی مسجد کہتے ہیں۔ (شامی) اگر امام اور مؤذن مقرر نہ ہوں یا جماعت کا وقت معین اور معلوم نہ ہو تو وہ راہ گذری کی مسجد ہے، محلے کی مسجد نہیں'' اھ۔ (علم الفقہ: ۲/۹۰)

اور (کفایت المفتی: ۳/۱۰۵ (فی نسخۃ: ص ۱۱۰) میں ہے: ''حنفیہ کے نزدیک ایسی مسجد میں جس میں پنج وقتہ منظّم طریقہ پر جماعت سے نماز ہوتی ہے، پہلی جماعت ہو جانے کے بعد دوسری جماعت مکروہ ہے''۔

اور مسئولہ ''بازار کی مسجد'' میں امام ومؤذن مقرر ہیں، جماعت کا معقول انتظام ہے، یعنی نماز کے اوقات معین ہیں اور لوگوں کو معلوم ہیں، پس وہ محلّہ کی مسجد ہے۔ اور محلّہ کی مسجد ہونے کے لئے ''جماعت معلومہ'' (معین نمازی) ہونا ضروری نہیں ہے، چنانچہ شیخ رحمہ اللہ سندھی

نے حرمین شریفین کی مسجدوں میں تکرار جماعت کو مکروہ قرار دیا ہے۔ علامہ شریف غزنوی حنفی رحمہ اللہ نے بھی نکیر فرمائی، بعض مالکیہ نے تو ائمہ اربعہ کے مذہب پر اجماعا عدم جواز کا فتوی دیا۔ علامہ خیر الدین رملی رحمہ اللہ نے بھی ''البحر الرائق'' کے حاشیہ میں کراہت کو تسلیم کیا ہے، حالانکہ حرمین کی مسجدوں میں جماعت معلومہ نہیں ہے، پس معلوم ہوا کہ ان تمام حضرات کے نزدیک مسجد محلّہ ہونے کے لئے ''جماعت معلومہ'' کی شرط نہیں ہے، لہذا علامہ شامی رحمہ اللہ کا مسجد محلّہ ہونے کے لئے جماعت معلومہ ہونا شرط قرار دے کر مذکورہ تمام فقہاء پر استدراک فرمانا صحیح نہیں ہے۔

علاوہ بریں آج کل جو بازاروں میں مساجد ہوتی ہیں ان میں تین طرح کے نمازی ہوتے ہیں: ایک وہ تاجر جن کی اس مسجد کے قرب وجوار میں دکانیں ہیں، دوسرے مسجد کے قرب وجوار میں بسنے والے مسلمان، تیسرے وہ لوگ جو بازار میں اپنی کسی ضرورت سے آئے ہوئے ہیں۔ پہلی قسم کے لوگ اگرچہ رات کو دکان بند کر کے گھر چلے جاتے ہیں، لیکن دن کی تمام (''اکثر'' کا لفظ زیادہ مناسب ہے، مرغوب) نمازیں اسی مسجد میں ادا کرتے ہیں ۔ اور دوسری قسم کے لوگ تو تمام نمازیں اسی مسجد میں ادا کرتے ہیں، لہذا ''بازار کی مسجد'' کے لئے بھی جماعت معلومہ ہوگئی۔ تیسری قسم کے کچھ لوگوں کے شریک ہونے کی وجہ سے وہ مسجد طریق اور مسجد شارع نہیں بنے گی، جیسا کہ حرمین کی مسجدیں۔

(امداد الفتاوی جدید ص ۱۵۵/۱۵۶ ج۱)

جس امام کے ثنایا علیا نہ ہوں، ایسے امام کی اقتدا کا حکم

مسئلہ:......جس امام کے ثنایا علیا نہ ہوں جو مخرج: 'تا' 'طا' 'دال' کا ہے تو ایسے امام کی اقتدا میں اختلاف ہے، احوط عدم صحت ہے، اور اوسع صحت ہے، اور میرے نزدیک اس زمانہ میں صحت کو ترجیح ہونی چاہئے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: یہ جواب مذکور شخص کو الثغ (وہ شخص جو بعض حروف ادا کرنے پر قادر نہ ہو) قرار دے کر دیا گیا ہے، لیکن حروف نطعیہ کا مخرج ''زبان کی نوک اور ثنایا علیا کی جڑ ہے'' پس اگر کسی کے ثنایا علیا نہ ہوں تب بھی ان کی صحیح ادائیگی ممکن ہے، کیونکہ جڑ موجود ہے، اور جسے خوب پختہ مشق ہو وہ تو بالکل صحیح ادا کر سکتا ہے، البتہ عام لوگوں کی ادا ناقص (غیر صاف) ہوتی ہے، اور اگر حرف صاف ادا نہ ہو تو وہ الثغ نہیں ہے، الثغ وہ شخص ہے جو کسی حرف کو بالکل ادا نہ کر سکے بدل کر دوسرا حرف ہو جائے، لہذا جس کے ثنایا علیا نہ ہوں اگر وہ پختہ مشق ہونے کی وجہ سے حروف نطعیہ کو بالکل صحیح ادا کر لیتا ہے تو اس کی امامت بلا کراہت جائز ہے، اور اگر صاف ادا نہیں ہوتے تو اس کے پیچھے بھی نماز صحیح ہے، لیکن اگر بالکل ادا نہیں کر پاتا یعنی حروف نطعیہ بدل کر دوسرے حروف ہو جاتے ہیں تب وہ الثغ ہے اور اس کے پیچھے نماز کی صحت میں اختلاف ہے، احوط عدم جواز ہے۔

(امداد الفتاوی جدید ص ۱۷۶/۱۷۷ ج ۲)

نوٹ:...... جو حروف نطع (حنک اعلی یعنی اوپر کا تالو) کی کھال سے نکلتے ہیں ان کو حروف نطعیہ کہتے ہیں، اور وہ تین ہیں: تا، دال، طا۔ (عمدۃ الفقہ ص ۱۳۳ ج ۲، القاب حروف کا بیان)

امام کی نماز کی کراہت مقتدیوں کی نماز کو متعدی ہوتی ہے یا نہیں؟

مسئلہ:...... اگر امام کی نماز مکروہ ہوگی تو مقتدی اس کراہت سے بچیں گے یا نہیں؟ اس باب میں کوئی روایت نہیں ملی، لیکن قواعد سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اگر کراہت کسی فعل داخل فی الصلوۃ سے ہے، مثلاً ترک واجب یا فعل زائد تب تو وہ کراہت صلوۃ مقتدی تک متعدی ہوگی، کیونکہ اس صوت میں اس کی نماز بھی مکروہ ہوئی۔ ''و صلوته متضمنة لصلوة المقتدی''۔

اور اگر کسی امر خارج عن الصلوۃ سے ہے جیسے کسی ہیئت غیر مشروعہ سے تو وہ متعدی نہ ہوگی، کیونکہ اس وقت نماز مکروہ نہیں ہوئی ایک جداگانہ فعل مکروہ ہے، گو ایسے شخص کا امام بنانا

مکروہ ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: علامہ شامی رحمہ اللہ نے قاعدہ "**کل صلوۃ ادیت مع کراھۃ التحریم تجب اعادتھا**" کی شرح میں لکھا ہے: "**الظاھر ان النقص فی صلوۃ الامام ولم یجبر وجبت الاعادۃ علی المقتدی ایضا، اھ**"۔

اس سے حضرت مجیب قدس سرہ کے جواب کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ مقتدی پر اعادہ کا واجب ہونا دلیل ہے تعدیہ کراہت کی اور یہ اس صورت میں ہے کہ کراہت امام کی نماز میں داخل ہوئی، پس اگر کراہت کسی امر خارج عن الصلوۃ کی وجہ سے ہے تو تعدیہٗ کراہت نہ ہوگا۔ (امداد الفتاوی جدید ص۲۰۰ ج۲)

عمل کثیر کی تعریف میں پانچ قول میں سے اصح قول

مسئلہ:...... عمل کثیر کی تفسیر میں اختلاف مشہور ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: عمل کثیر کی تعریف میں پانچ قول ہیں، اصح یہ ہے کہ "دور سے دیکھنے والا اس نمازی کو یہ خیال کرے کہ یہ نماز میں نہیں ہے"۔

(امداد الفتاوی جدید ص۲۴۲ ج۲)

کیا نماز کی حالت میں عینک لگا رکھنا مکروہ ہے؟

مسئلہ:...... نماز کی حالت میں عینک لگا رکھنا فی نفسہ جائز ہے، لیکن فعل عبث ہے، اور عبث نماز میں مکروہ ہے، اس عارض کے سبب یہ فعل عبث ہوگا۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: البتہ جو لوگ عینک کے عادی ہیں یعنی بینائی کی کمزوری کی وجہ سے "نمبری عینک" لگاتے ہیں، چونکہ انہیں بغیر عینک کے طمانینت وسکون نہیں رہتا، اس لئے ان کے لئے یہ فعل عبث نہیں ہے، اور مکروہ نہ ہوگا۔ (امداد الفتاوی جدید ص۲۶۵ ج۲)

نوٹ: ...... عینک کو فعل عبث کہنا مشکل ہے، اس لئے کہ یہ ضرورت کی چیز ہے، اور ضرورت کی چیز عبث نہیں ہوتی۔ البتہ جو لوگ رنگ برنگ کے شوقیہ چشمے اور عینک لگاتے ہیں، وہ نماز کی حالت میں لگانے اور اس کی وجہ سے سجدہ صحیح طور پر نہ ہوتا ہو تو نماز مکروہ ہوگی۔

(ملخص از حاشیہ: مفتی شبیر احمد صاحب قاسمی مدظلہ)

کیا مسجد کی چھت پر جماعت کرنا مکروہ ہے؟

مسئلہ: ...... مسجد کی چھت پر جماعت کرنا مکروہ ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: مسجد کی چھت پر تنہا یا با جماعت نماز پڑھنے کی کراہت کا مدار چھت پر چڑھنے کی کراہت پر ہے، چنانچہ "عالمگیریہ" میں "غرائب" سے جو کراہت صلوۃ نقل کی ہے وہ کراہت صعود علی السطح پر متفرع ہے، لیکن شامی رحمہ اللہ نے "در مختار" کے قول "وکرہ تحریما الوطء فوقه" کی شرح کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"ای الجماع "خزائن" اما الوطء فوقه بالقدم فغير مكروه الا فی الكعبة لغير عذر، لقولهم بكراهة الصلوة فوقها"۔

اور جب سعود علی السطح مکروہ نہیں تو چھت پر نماز پڑھنا بھی مکروہ نہیں، پھر شامی نے قہستانی سے کراہیۃ صعود علی السطح کا جزئیہ بھی نقل کیا ہے، اور اس پر کراہیۃ صلوۃ علی سطح المسجد متفرع کی ہے، لیکن علامہ شامی رحمہ اللہ کو اس پر اطمینان نہیں ہے، اس لئے "فلیتأمل" فرمایا ہے۔ (رد المحتار: ۱/۶۱۴، شامی، کتاب الصلوۃ، مکتبہ زکریا: ۲/۴۲۸، کراچی: ۱/۶۵۶)

حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندی رحمہ اللہ شرح منیہ اور شامی کی مذکورہ عبارت نقل کر کے فرماتے ہیں: خلاصہ اور حاصل یہ ہے کہ بعض عبارتوں سے جواز نماز فوق المسجد معلوم ہوتا ہے اور بعض سے کراہت معلوم ہوتی ہے۔

(فتاوی دار العلوم جدید ص: ۴/۱۵۰، سوال: ۱۶۲۱)

پس تطبیق کی صورت ذہن میں یہ آتی ہے کہ نفی کراہت تحریمی کی ہے اور اثبات کراہت تنزیہی کا، لہذا مسجد کی چھت پر تنہا یا با جماعت نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی یعنی خلاف اولی ہے البتہ عذر کے وقت مثلا: نیچے جگہ نہ ہو، یا گرمی شدید ہو اور دریچوں سے بھی علاج نہ ہو سکے اور دیگر کوئی محظور شرعی بھی نہ ہو مثلا قرب و جوار کے مکانوں کی بے پردگی تو چھت پر تنہا یا با جماعت نماز پڑھنا جائز ہے۔ (امدادالفتاوی جدید ص ۲۷۷ ج ۲)

تراوح بین القدمین کے مسئلہ پر تسامح

مسئلہ:......تراوح بین القدمین حنفیہ کے نزدیک افضل ہے ''طحطاوی'' نے ''ظہیریہ'' سے نقل کیا ہے، امام صاحب رحمہ اللہ نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: یہ تسامح ہے ''طحطاوی'' نے امام صاحب رحمہ اللہ کی تصریح قیام میں دونوں پیروں کے درمیان چار انگشت فاصلہ رکھنے کے مسنون ہونے کے بارے میں ''کتاب الاثر'' سے نقل کی ہے، اور ''ظہیریہ'' سے تراوح کے استحباب کی روایت نقل کی ہے ''طحطاوی'' کی پوری عبارت اس طرح ہے:

''قوله : ويسن تفريج القدمين في قدم القيام (اربع اصابع) نص عليه في "كتاب الاثر" عن الامام ولم يحك فيه خلافا ، وفي الظهيرية :أو روى عن الامام التراوح في الصلوة احب الى من ان ينصب قدميه نصبا''۔

(طحطاوی علی المراقی الفلاح ، کتاب الصلوة ، فصل فی بیان سننها، مکتبۃ: دارالکتاب، دیوبند ص ۲۶۲)۔ (امدادالفتاوی جدید ص ۲۸۲ ج ۲)

نوٹ:......تراوح اور صف (تراوح بین القدمین اور صف بین القدمین) میں فرق ہے۔ صف یہ ہے کہ ایک قدم پر زور دے کر دوسرے قدم کو اس طرح ڈھیلا چھوڑ دیا جائے کہ وہ کسی قدر مڑ جاوے جیسا کہ گھوڑا ایک پیر کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے یہ مکروہ ہے۔ تراوح میں ایک قدم

پر زور دیا جاتا ہے دوسرے پر زور نہیں دیا جاتا، مگر اس کو بالکل ڈھیلا بھی نہیں چھوڑا جاتا کہ مڑ جاوے۔ (امداد الفتاوی جدید ص ۲۸۳ ج ۲)

آج کے دور میں سنتوں کو مسجد میں پڑھنا افضل ہے

مسئلہ: ...... سنت فجر کا مسجد میں پڑھنا افضل ہے، بلکہ جمیع سنن مؤکدہ کا تاکہ اتہام یا تشبہ باہل بدعت سے محفوظ رہے جو کہ تارکین ان سنن کے ہیں۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: اصل مذہب یہ ہے کہ سنن مؤکدہ کا گھر میں پڑھنا افضل ہے لیکن اب مسجد میں پڑھنا بدو وجہ افضل ہے: اول تشبہ باہل بدعت، دوم: لوگوں میں تہاون و سستی عام ہے، اور مشاغل روز افزوں ہیں، اس لئے اندیشہ ہے کہ گھر میں نہ پڑھ سکیں۔

"قال في الفتح : وبه أي باصل المذهب افتى الفقيه ابو جعفر ، قال : الا ان يخشى ان يشتغل عنها اذا رجع ، فان لم يخف فالافضل البيت ، الخ"۔

(فتح القدیر ص ۴۹۴ ج ۱ (کوئٹہ: ص ۴۱۶ ج ۱)، كتاب الصلوة ، باب ادراک الفريضة)

حضرت علامہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ثم افتى ارباب الفتيا بان الافضل الاداء في المسجد كيلا يلزم التشبه بتركها بالروافض حيث لا يأتون بها ' و نظرا الى تهاون اهل عصرنا يكمن ان يفتى بادائها في المسجد كيلا يتشاغلوا عنها في البيوت ، الخ"۔

(معارف السنن ص ۱۱۱ ج ۴، كتاب الصلوة ، باب ما جاء انه يصليهما في البيت)

(امداد الفتاوی جدید ص ۳۲۱ ج ۲)

نوٹ: ...... مسجد میں سنت پڑھنے میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ فرض اور سنت کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا، اور دنیوی بات سے نمازی محفوظ رہتا ہے، اس لئے کہ بعض روایات میں فرض اور سنت کے درمیان بات نہ کرنے کے فضائل بیان کئے گئے ہیں: مثلاً: اس کی نماز اعلیٰ علیین

میں چڑھ جاتی ہے، یا علیین میں لکھ دی جاتی ہے۔ اس لئے علماء نے سنت وفرض کے درمیان دنیوی بات کرنے کو مکروہ لکھا ہے، اور عدم تکلم کو افضل فرمایا، اس لئے کہ سنن فرائض کے مکملات اور ان کا تتمہ ہیں، اور تتمہ شیء کے متصل اور ملا ہوا ہوتا ہے، لہذا فصل نہ ہونا چاہئے۔ بعض مشائخ نے تو گفتگو کی صورت میں سنت کا اعادہ کرنے کو کہا ہے۔ اور الدر المختار میں ہے کہ: فرض اور سنت کے درمیان بات کرنے سے ثواب میں نقص آئے گا۔

امام احمد اور اسحٰق بن راہویہ رحمہما اللہ کے ایک قول میں بات کرنے سے سنت باطل ہوجاتی ہے۔ ”درمختار“ اور ”بحر“ میں بعض حنفیہ کا بھی یہی قول منقول ہے، مگر یہ قول مختار نہیں قول محقق اس سلسلے میں یہی ہے کہ لغو اور خالص دنیوی باتیں یا کسی ایسے عمل سے جو نماز وذکر کے منافی ہو، جیسے خرید وفروخت، کھانا پینا وغیرہ یا زائد فصل اور تاخیر ہوجائے تو یہ عمل ثواب کو کم کرنے والا ہے۔

(زادالمعاد ص۳۱۳ ج ۱۔ اعلاء السنن ص ۱۹ ج ۷۔ شمائل کبری ص ۲۹۴ ج ۷/ط: زمزم پبلشرز، کراچی)

امام قعدہ سے کھڑا ہوجائے تو مسبوق تشہد ختم کر کے اٹھے

مسئلہ:...... مسبوق امام کے ساتھ قعدۂ اولی میں ملا، اور اس کے تشہد سے پہلے امام اٹھ گیا تو مسبوق تشہد ختم کر کے اٹھے، بدون تشہد کے نہ اٹھے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: لیکن اگر تشہد ادھورا رکھ کر اٹھ گیا، یا تشہد پڑھے بغیر اٹھ گیا تو حلبی رحمہ اللہ کی رائے میں نماز کراہت تحریمی کے ساتھ ہوگی، علامہ شامی رحمہ اللہ کا میلان بھی اسی طرف ہے، لیکن علامہ طحطاوی رحمہ اللہ بغیر کسی قسم کی کراہت کے نماز کو صحیح کہتے ہیں، صاحب درمختار کا میلان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے، نیز فقیہ ابو اللیث رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے

(امداد الفتاوی جدید ص ۳۹۲ ج ۲)

مرتد دوبارہ مسلمان ہو جائے تو پہلے کی قضا نمازوں کا حکم

مسئلہ:...... ایک شخص مسلمان تھا بعد میں مرتد ہو گیا، پھر مسلمان ہوا، مرتد ہونے سے پہلے کی نمازیں جو اس کے ذمہ تھیں قضا کرنی ہوں گی۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: ’’مختصر الطحاوی‘‘ ص ۲۹ / میں ہے:

’’ولا یقضی المرتد شیئا من الصلوات ولا مما تعبد به سواها (وفی نسخة : ولا شیئا یعبد به) ویکون بارتداد کمن لم یزل کافرا ، اه‘‘۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قضا نہیں ہے، اور اگر چہ یہ بات صحیح ہے کہ ترک صلوۃ وصیام معصیت ہے اور ارتداد کے بعد بھی معصیت باقی رہتی ہے، لیکن جب وہ دوبارہ مسلمان ہوا تو حسب ارشاد نبوی ’’الاسلام یھدم ما کان قبله‘‘ وہ معصیت ختم ہو گئی۔

(امداد الفتاوی جدید ص ۳۸۳ ج ۲)

مقیم مسافر امام کے پیچھے شریک ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟

مسئلہ:...... مقیم شخص چار رکعت والی نماز میں مسافر امام کے پیچھے دوسری رکعت میں یا قعدہ میں شریک ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟ اور اگر پہلی رکعت میں شریک ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟ اس سلسلہ میں دو رائے ہیں:

پہلی رائے یہ ہے کہ...... جب پہلی رکعت میں شریک ہوا ہو تو وہ صرف لاحق ہے، لہذا امام کے ساتھ سلام پھیرنے پر اپنی بقیہ دو رکعتیں بغیر قراءت کے پڑھے، اور جب دوسری رکعت یا قعدہ میں شریک ہوا ہو تو وہ مسبوق بھی ہے اور لاحق بھی، لہذا امام کے فارغ ہونے کے بعد پہلے وہ رکعتیں پڑھے جن میں لاحق ہے، یعنی آخر والی، اور ان میں نہ فاتحہ پڑھے نہ سورت کیونکہ ان رکعتوں میں وہ حکما امام کے پیچھے ہے، پھر وہ رکعتیں پڑھے جن میں مسبوق ہے یعنی پہلی ایک رکعت، یا دو رکعتیں، اور ان میں فاتحہ اور سورت دونوں پڑھے۔

(کفایت المفتی: ۳۸۷/۳ ۔ فتاوی دار العلوم دیوبند جدید: ۴۸۹/۴ ۔ فتاوی رشیدیہ ص ۲۹۲)

دوسری رائے یہ ہے کہ...... جب مقیم شخص مسافر امام کے ساتھ پہلی رکعت میں شریک ہوتو وہ صرف لاحق ہے، لہذا بقیہ دو رکعتیں بغیر قراءت کے پڑھے، اور جب وہ دوسری رکعت میں یا امام کے قعدۂ اخیرہ میں شریک ہوتو وہ صرف مسبوق ہے، لہذا یہ شخص اٹھ کر پہلی رکعت میں ثناء تعوذ، فاتحہ اور سورت پڑھ کر قعدہ کرے، اور پھر دو رکعتوں میں صرف فاتحہ پڑھے، اور آخری دونوں رکعتوں کے درمیان قعدہ نہ کرے، اگر وہ تمام رکعات کا مسبوق ہے (یعنی جب قعدہ میں فاتحہ کے ساتھ پڑھے)۔

یہ دوسری رائے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمہ اللہ (صاحب بذل المجہود) کی ہے، حضرت نے اس سلسلہ میں بہت ہی مفصل و مدلل فتاوی ارقام فرمائے ہیں، جو ماہنامہ ''نظام'' کانپور (شمارہ: مئی و جون: ۱۹۶۴ء) اور ''احسن الفتاوی'' میں شائع ہوئے ہیں۔ احقر کے ناقص خیال میں یہ دوسری رائے ہی صحیح ہے، اور وہی عمل و فتوی کے لئے متعین ہے، اور اس کے لئے مشبع دلائل حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمہ اللہ کے آخری مفصل و مدلل جواب میں موجود ہیں۔ (امداد الفتاوی جدید ص ۴۰۲ ج ۲)

سورۂ فاتحہ پڑھی اور سورت پڑھے بغیر رکوع کر لیا تو؟

مسئلہ:...... نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھی اور سورت پڑھے بغیر رکوع کر لیا تو اب قیام کی طرف عود کرے اور سورت ملائے پھر رکوع کرے تب سجدہ میں جاوے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: یہ اولی صورت ہے، اور یہ بھی جائز ہے کہ رکوع کے بعد سجدہ میں چلا جائے اور آخر میں سجدۂ سہو کرے۔ (امداد الفتاوی جدید ص ۴۴۵ ج ۲)

ترک واجب سے دوبارہ پڑھی گئی نماز میں نو وارد کی شرکت

مسئلہ:...... امام سے واجب چھوٹ گیا اور سجدۂ سہو بھی نہ کیا تو دوبارہ پڑھی جانے والی نماز میں نو وارد کے شریک ہونے سے اس کا فرض ادا ہو جائے گا۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: یہ جواب مختار قول کے مطابق نہیں ہے، مختار قول یہ ہے کہ نو وارد کی نماز صحیح نہ ہوگی، پھر سے پڑھنی ہوگی، کیونکہ امام کی یہ دوسری مستقل نماز نہیں ہے، بلکہ اول نماز کی تکمیل کے لئے ہے، لہذا مستقل فرض پڑھنے والے کی اقتدا ایسے امام کے پیچھے صحیح نہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو! فتاوی رحیمیہ :۱۹۸/۱۔ شامی :۴۲۶/۱۔ کفایت المفتی ۹۶/۹۳/۳۔ فتاوی دار العلوم دیوبند جدید: ۳۷۱/۳۔ (امداد الفتاوی جدید ص۴۵۲ ج ۲)

نوٹ:...... اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے، بعض کے نزدیک فرض ادا ہو جائے گا اور بعض کے نزدیک فرض ادا نہیں ہوگا۔ اس لئے تطبیق کی بہتر صورت یہ ہے کہ جس نو وارد کو اس بات کا علم ہو کہ یہ لوٹائی جانے والی نماز ہے تو اس کا فرض ادا نہ ہوگا، اور جس کو یہ بات معلوم نہ ہو کہ یہ لوٹائی جانے والی نماز ہے، اس کے شریک ہونے سے اس کا فرض ادا ہو جائے گا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے مفتی شبیر احمد صاحب قاسمی مدظلہ کا حاشیہ۔

(امداد الفتاوی جدید ص۴۵۵/۴۵۴/۴۵۳/۴۵۲ ج ۲)

سجدۂ تلاوت ایک ساتھ کرے یا ہر آیت پر اسی وقت کرے؟

مسئلہ:...... پورے قرآن کریم کی تلاوت کے ایک ساتھ سارے تلاوت کے سجدے کرنا جائز ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: اور بہتر یہ ہے کہ جس وقت آیت سجدہ تلاوت کی ہے، اسی وقت سجدہ کر لے۔ (امداد الفتاوی جدید ص۴۸۳ ج ۲)

محض نکاح سے وطن اقامت بن جائے گا یا نہیں؟

مسئلہ:...... محض نکاح سے وطن اقامت بن جائے گا یا نہیں اس مسئلہ میں دوسرے علماء سے

تحقیق کی جاوے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ کا فتوی یہ ہے کہ محض تزوج سے مقیم ہو جاتا ہے۔ دیکھئے فتاوی دار العلوم دیوبند جدید: ۴۵۸/۴۔ اور جلد چہارم: ۴۸۲/ میں وضاحت ہے کہ تزوج سے مراد یہ ہے کہ نکاح ہوا اور بیوی کو وہاں سے لے جانے کا ارادہ نہیں ہے۔ بہر حال خود وہاں رہنے کا عزم ضروری نہیں ہے۔

اب علماء کا رجحان حضرت مجیب قدس سرہ (یعنی حضرت تھانوی رحمہ اللہ) کے جواب کی طرف ہے، یعنی خود وہاں رہنے کا عزم ضروری ہے جیسا کہ ''قاضی خان'' کے جزئیہ میں ہے

(امداد الفتاوی جدید ص ۴۵۹ ج ۲)

نماز جنازہ میں چوتھی تکبیر کے بعد کیسے سلام پھیرے؟

مسئلہ: ...... نماز جنازہ میں چوتھی تکبیر کے بعد ہاتھ چھوڑ کر سلام پھیرنا چاہئے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ نے اس کے خلاف فتوی دیا ہے، ملاحظہ ہو فتاوی دار العلوم دیوبند جدید: ۳۱۴/۵۔ واضح رہے کہ یہ اختلاف اولیت میں ہے، جائز دونوں ہیں یعنی ارسال کر کے سلام پھیرنا اور ہاتھ باندھے سلام پھیرنا دونوں جائز ہیں۔ (امداد الفتاوی جدید ص ۳۸۱ ج ۳)

مسواک مرد اور عورت دونوں کے لئے سنت ہے

مسئلہ: ...... میرے نزدیک مسنونیت مسواک کی عام ہے (یعنی مسواک مرد اور عورت دونوں کے لئے سنت ہے)۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: ابن حجر رحمہ اللہ نے محدث احمد بن منیع رحمہ اللہ کے مسند سے ''المطالب العالیۃ'' (۱/۲۳) میں حدیث نقل فرمائی ہے:

حضرت واثلہ رضی اللہ عنہ (جو صحابی ہیں) ارشاد فرماتے ہیں کہ: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

اپنی مسواکوں کو تلوار کی موٹھ کے ساتھ باندھا کرتے تھے، اور عورتیں اپنی اوڑھنیوں میں باندھا کرتی تھیں۔ اس حدیث سے صحابیات رضی اللہ عنہن کا مسواک استعمال کرنا صراحۃً ثابت ہوتا ہے۔ (امداد الفتاوی جدید ص ۲۰۱ ج ۱)

عورت کے لئے علک کا استعمال جائز ہے

مسئلہ: ...... واضح ہو کہ اصل سنت درخت کی مسواک ہے، مسواک کی موجودگی میں انگلیاں بھی مسواک کے قائم مقام نہیں ہوسکتیں۔ ’’ولا تقوم الاصابع مقام العود عند وجوده‘‘

(کبیری قدیم ص ۳۲۔ جدید ص ۳۳، ط: مکتبہ اشرفیہ، دیوبند)

لیکن عورتوں کے لئے درخت کی مسواک موجود ہوتے ہوئے بھی علک (لبان کی ایک قسم) کا استعمال جائز ہے، وہ مسواک کے قائم مقام شمار ہوگا، جبکہ عورت نے اس کا استعمال سنت ادا کرنے کی نیت سے کیا ہو ’’یقوم العلک مقامه للمرأة مع القدرة علیه‘‘۔

(درمختار مع الشامی ص ۱۵۱ ج ۱، کراچی۔ ص ۲۳۶ ج ۱، زکریا دیوبند، کتاب الطهارة)

’’قوله : مقامه ای فی الثواب اذا وجدت النية‘‘۔

(طحطاوی علی الدر المختار ص ۷۰ ج ۱، کوئٹہ)

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے ’’لكون المواظبة عليه تضعف اسنانها فيستحب لها‘‘ یعنی ہمیشہ لکڑی کی مسواک استعمال کرنا عورت کے دانتوں کو کمزور کرتا ہے، اس لئے گاہ بگاہ علک کا استعمال اس کے لئے مستحب ہے، معلوم ہوا کہ عورت کے لئے بھی اصل سنت درخت کی مسواک ہے۔ (امداد الفتاوی جدید ص ۲۰۱ ج ۱)

پھایہ کان کے نرمہ یا سوراخ میں رکھا ہو تو مسح کا حکم

مسئلہ: ...... اگر پھایہ کان کے نرمہ میں رکھا ہو تو مسح کے وقت اس کا نکالنا سنت ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: اس لئے کہ کان کے اندر کے تمام حصہ کا مسح سنت ہے، اور وہ پھایہ

نکالے بغیر ممکن نہیں ہے، اور سنت کا موقوف علیہ سنت ہوتا ہے، لہذا اس کا نکالنا سنت ہوا۔

مسئلہ:……اگر پھایہ کان کے سوراخ میں رکھا ہو تو اس کا نکالنا مستحب ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: اس لئے کہ کان کے سوراخ میں تر انگلی ڈالنا مستحب ہے جو بغیر نکالے ممکن نہیں، لہذا نکالنا مستحب ہوا۔ (امداد الفتاوی جدید ص ۲۱۱ ج ۱)

سر کے مسح کے لئے نیا پانی لینے کی تفصیل

مسئلہ:……سر کے مسح کے لئے نیا پانی لینا چاہئے یا ہاتھ دھونے کے بعد جو تری بچی ہے، اس سے مسح جائز ہے، اس میں اختلاف ہے۔ حاکم شہید رحمہ اللہ جائز قرار نہیں دیتے، اور جمہور جائز کہتے ہیں۔ مولانا عبدالحئی صاحب لکھنوی رحمہ اللہ نے ''سعایہ'' (ص ۷۶ ج ۱، مکتبہ اشرفیہ دیوبند) میں بحث و تمحیص کے بعد مسئلہ کی دو صورتیں کی ہیں:

(۱)……ہاتھوں کے ذریعہ کسی عضو کو دھونے کے بعد ہاتھوں میں بچی ہوئی تری۔

(۲)……ہاتھوں سے کسی عضو پر پانی ڈالنے کے بعد ہاتھوں میں بچی ہوئی تری۔ پہلی قسم کی تری سے سر اور موزوں کا مسح جائز نہیں ہے، کیونکہ وہ تری مغسول عضو سے لی گئی ہے، اس لئے وہ ''ماء مستعمل'' ہے۔ اور دوسری قسم کی تری سے مسح کرنا جائز ہے، اس لئے کہ ہاتھ کسی مغسول عضو سے نہیں ملے ہیں، اس لئے وہ تری ''ماء مستعمل'' نہیں ہے۔

(امداد الفتاوی جدید ص ۲۱۶ ج ۱)

گردن کے مسح کے بارے میں علماء کی آراء

مسئلہ:……گردن کے مسح کے بارے میں علماء کی تین رائے ہیں، امام نووی رحمہ اللہ وغیرہ بدعت فرماتے ہیں۔ شرنبلالی رحمہ اللہ وغیرہ سنت فرماتے ہیں۔ اور اکثر احناف اور اصحاب متون مستحب فرماتے ہیں، اور یہی قول صحیح ہے۔ تفصیل کے لئے ''سعایہ'' (مکتبہ اشرفیہ، دیوبند: ۱/۱۷۸) اور رسالہ ''تحفۃ الطلبہ فی مسح الرقبۃ'' (مصنفہ مولانا عبدالحئی صاحب لکھنوی

رحمہ اللہ) ملاحظہ فرمائیں۔ (امداد الفتاوی جدید ص۲۲۲ ج۱)

کیا جنابت کی حالت میں بال کتروانا اور ناخن ترشوانا مکروہ ہے؟

مسئلہ:…… جنابت کی حالت میں خط بنوانا اور بال کتروانا اور ناخن ترشوانا مکروہ ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں: بال کترنے اور مونڈنے اور ناخن کترنے کو بحالت جنابت بعض فقہاء نے مکروہ لکھا ہے بظاہر مراد مکروہ سے مکروہ تنزیہی ہے، جن کا مآل خلاف اولی ہے۔ ''عالمگیریہ'' جلد خامس میں ہے: ''**حلق الشعر حالة الجنابة مكروه، وكذا قص الاظافير، هكذا فى الغرائب**''۔ (فتاوی دار العلوم دیوبند ص۲۳ ج۱)

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''**ما اعلم على كراهية ازالة شعر الجنب و ظفره دليلا شرعيا**''۔ (فتاوی ابن تیمیہ ص۴۴ ج۱)۔ (امداد الفتاوی جدید ص۲۵۵ ج۱)

نوٹ:…… امام بخاری رحمہ اللہ نے ''بخاری شریف'' کے ''ترجمۃ الباب'' میں امام عطاء بن رباح رحمہ اللہ کا اثر نقل فرمایا ہے، جس میں حالت جنابت میں بالوں کی صفائی اور ناخن تراشنے کو جائز بتلایا گیا ہے۔ اسی طرح مصنف ''عبد الرزاق'' میں ابن جریج عن عطاء کے طریق سے جائز نقل فرمایا ہے۔ اور بخاری کی شرح ''عمدۃ القاری'' میں بھی جواز کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ نیز شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے صاف الفاظ میں جواز اور عدم کراہت کی بات نقل فرمائی ہے۔ (ملخصا از: حاشیہ امداد الفتاوی جدید ص۲۵۵ ج۲)

نوٹ:…… امام عطاء بن رباح رحمہ اللہ کا اثر یہ ہے: ''**وقال عطاء: يحتجم الجنب ويُقلِّم اظفاره ويَحلِق رأسه وان لم يتوضأ**''۔

(بخاری، **باب الجنب يخرج و يمشى فى السوق و غيره، كتاب الغسل، قبل رقم الحديث:**۲۸۴)

مسجد کی زمین پر تیمّم کرنے کا حکم

مسئلہ:...... مسجد کی زمین میں تیمّم کرنا مکروہ ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: مسجد کی مٹی سے تیمّم کرنے کی دو صورتیں ہیں: اول: ضرورت کی وجہ سے، مثلاً کوئی شخص مسجد میں سویا اور اسے غسل کی حاجت پیش آگئی اور فوراً باہر نکلنا تاریکی یا بارش وغیرہ (جیسے دشمن یا درندے کا خوف، مرغوب) اعذار کی وجہ سے ممکن نہ ہو تو تیمّم کر لینا مستحب ہے تاکہ جنابت کی حالت میں مسجد میں ٹھہرنا لازم نہ آئے، تمام فقہائے احناف نے یہ مسئلہ لکھا ہے، لیکن کسی نے یہ نہیں لکھا کہ مسجد کی مٹی سے تیمّم نہ کرے، بلکہ سب کی عبارتیں مطلق ہیں۔ ’’**ولو كان نائما فيه فاحتلم والماء خارجه و خشي من الخروج يتيمم و ينام فيه الى ان يمكنه الخروج ، قال في المنية : وان احتلم في المسجد تيمم للخروج اذا لم يخف وان خاف يجلس مع التيمم ، الخ**‘‘۔

(شامی ص۴۱۰ ج۱، زکریا، دیوبند۔ ص۲۴۳ ج۱، کراچی)

لہذا اگر وہاں کوئی اور مٹی نہ ہو تو مسجد کی مٹی سے تیمّم کر لینا جائز ہے، لاطلاق الروایات۔

البتہ حضرات شوافع نے لکھا ہے کہ اس صورت میں بھی مسجد کی مٹی سے تیمّم نہ کرے اور مٹی ہو تو تیمّم کرے ورنہ بغیر تیمّم کے جنابت کی حالت ہی میں مسجد میں ٹھہرا رہے، لیکن امام نووی رحمہ اللہ نے اعتراض کیا کہ اگر ضرورت کی وجہ سے کوئی شخص مسجد کی تھوڑی سی مٹی استعمال کرلے تو اس میں کراہت کی کیا وجہ؟۔

امام زرکشی محمد بن عبداللہ شافعی رحمہ اللہ (ولادت: ۷۴۵ھ، وفات: ۷۹۴ھ) ’’اعلام المساجد باحکام المساجد‘‘ ص۳۱۷/ میں لکھتے ہیں:

’’**ما يجوز المكث للجنب في المسجد للضرورة بان نام في المسجد واحتلم ولم يمكنه الخروج لاغلاق الباب أو الخوف على نفسه أو ماله ، قال في الروضة :**

ويجب ان يتيمم ان وجد غير تراب المسجد ولا يتيمم بترابه ، الخ –الى قوله– وقول الرافعي : ولا يتيمم بتراب المسجد كما لو لم يجد الا ترابا مملوكا ، نازعه فيه النووي في شرح التنبيه ، فقال : هكذا قال تبعا لصاحبي التهذيب والتتمة ، وفيه نظر وأي مانع يمنع من غبار يسير للضرورة ؟ والفرق بينه و بين المملوک ظاهر ، وقال الروياني في البحر : لو احتلم في المسجد أو خاف العسس (الشرلهة التي تطوف ليلا للحراسة) يتيمم بغير تراب المسجد ، فان لم يجد الا تراب المسجد لا يتيمم كما لو وجدت فيه ترابا مملوكا للغير ، ولكنه لو تيمم به جاز ''۔

دوم:...... بلاضرورت مسجد کی مٹی سے تیمّم کرنا یہ مکروہ ہے۔

''قال في الاشباه في احكام المساجد : ومنها منع اخذ شيء من اجزائه ، قالوا في ترابه : ان كان مجتمعا جاز الاخذ منه ، ومسح الرجل عليه ، والا لا ، اه ، قال الحموي : قوله : والا لا ، اقول : لان المجتمع المنبسط بمنزلة ارض المسجد فيكره اخذه يعني على سبيل الاستعمال ، وأما اذا أخذه للتبرک فجائز ، كما قالوا في تراب الكعبة ، واعلم ان هذا الحكم كان حيث كانت المساجد لا تنبسط ، أما الآن فازالة التراب و رفعه قربة ''۔

علامہ حموی رحمہ اللہ کے قول ''واعلم ، الخ '' سے بھی معلوم ہوا کہ کراہت اس مٹی سے تیمّم کرنے میں ہے جو مسجد کا جزو ہے، لیکن اگر مسجد کے پکے فرش پر غبار ہو تو چونکہ وہ مسجد کا جزو نہیں ہے، اس لئے اس سے تیمّم کرنا جائز ہوگا۔ (امداد الفتاوی جدید ص ۲۸۵ ج ۱)

جرابوں پر مسح کے بارے میں حدیث مجمل و مبہم ہے

مسئلہ:...... جرابوں پر مسح کے بارے میں حدیث میں جو آیا ہے وہ مجمل و مبہم ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: جرابوں پر مسح کرنے کی تین حدیثیں مروی ہیں: حضرت مغیرہ

رضی اللہ عنہ، حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے کہ آپ ﷺ نے وضو فرمایا اور جرابوں اور نعلین پر مسح فرمایا۔ ان میں سے حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی حدیثیں تو ضعیف ہیں، البتہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے ''حسن صحیح'' فرمایا ہے، لیکن دیگر بڑے بڑے محدثین نے اس پر بھی نقد فرمایا ہے۔

(بحث کے لئے ملاحظہ ہو ''نصب الرایہ'': ۱/۱۸۴/۱۸۶۔ معارف السنن شرح ترمذی: ۱/۳۴۸/۳۵۱)

علاوہ بریں حدیث اس سلسلے میں مجمل ہے کہ وہ جرابیں ثخین تھیں یا رقیق؟ پھر سادہ تھیں یا منعل؟ کیونکہ حدیث کے الفاظ مسح علی الجوربین والنعلین کا مطلب بعض محدثین نے مسح علی الجوربین المنعلین بیان فرمایا ہے۔ نیز یہ تعیین بھی ضروری ہے کہ آپ ﷺ کا یہ وضو واجب تھا، یعنی حدث کی حالت میں فرمایا گیا تھا یا مستحب تھا، یعنی وضو علی الوضوء تھا، نیز یہ بھی واضح ہونا ضروری ہے کہ یہ حکم عام ہے، یعنی تمام امت کے لئے ہے، آپ ﷺ کے ساتھ خاص نہیں ہے، ورنہ کہا جاسکتا ہے کہ: ''واقعة حال لا عموم لها''۔

(امداد الفتاوی جدید ص۲۹۳ ج۱)

زخم سے نکلنے والا پانی ناپاک ہے؟ اور کپڑے کو لگ جائے تو کیا حکم ہے؟

مسئلہ:......زخم سے جو پانی نکلتا ہے وہ ناقض وضو ہے، یہ پانی نجس ہے اور نجس مغلظ ایک درہم تک معاف ہے، اس لئے وہ داغ اگر پھیلاؤ میں ایک روپیہ سے زائد نہ ہو تو نماز ہو جاوے گی۔

اس جزئیہ کے حاشیہ پر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

یہ اس صورت میں ہے کہ زخم سے نکل کر پانی بہہ گیا اور وہ کپڑے کو لگ گیا۔ اور اگر پانی یا پیپ وغیرہ صرف زخم کے منہ پر رہے اور کپڑا اس کو بار بار لگتا رہا یہاں تک کہ کپڑے پر پھیل گیا، یہ ناپاک نہیں، نہ اس کا دھونا واجب ہے۔ محمد شفیع

آپ اس حاشیہ پر تحریر فرماتے ہیں: بلکہ حاشیہ اس طرح ہونا چاہئے کہ:

’’یہ اس صورت میں ہے کہ زخم سے نکل کر پانی بہہ گیا اور وہ کپڑے کو لگ گیا، اور اگر پانی پیپ وغیرہ صرف داد کے زخموں کے منہ پر رہا اور کپڑا اس کو بار بار لگتا رہا یہاں تک کہ کپڑے پر پھیل گیا تو دل میں سوچے، اگر ایسا معلوم ہو کہ اگر کپڑا نہ لگتا تو بہہ پڑتا تو وہ ناپاک ہے اور کپڑے کو دھونا واجب ہے، اور اگر ایسا معلوم ہو کہ کپڑا نہ لگتا تب بھی نہ بہتا تو وہ ناپاک نہیں ہے، نہ اس کا دھونا واجب ہے۔‘‘ **ان مسح الدم عن رأس الجرح بقطنه ثم خرج فمسح ثم و ثم .... ینظر ان کان بحال لو ترک لسال ینتقض و الا فلا‘‘**

(منیہ ص ۴۸، **الطهارة ، فصل فی نواقض الوضوء**، مکتبہ: اشرفیہ، دیوبند ص ۱۳۲)

(امداد الفتاوی جدید ص ۳۴۰ ج ۱)

ناپاک کپڑے کو تین بار نچوڑا جائے، مگر بدن کے لئے یہ قاعدہ نہیں

مسئلہ:...... ناپاک کپڑے کو دھونے کے لئے قاعدہ یہ ہے کہ تین بار اسے نچوڑا جائے، مگر بدن انسانی ناپاک ہو تو اس کے لئے یہ قاعدہ نہیں۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: بدن تین بار مسلسل دھونے سے پاک ہو جائے گا، ہر بار خشک کرنا ضروری نہیں ہے۔ ’’**یطهر بالغسل ثلا ثا ولو بدفعة بلا تجفیف**‘‘۔

(رد المحتار: ۱/ ۳۰۷، مکتبہ زکریا، دیوبند۔ ص ۳۳۲ ج ۱، کراچی)، (امداد الفتاوی جدید ص ۳۶۵ ج ۱)

شہد میں چوہا گر کر مر جائے تو

مسئلہ:...... سیال شہد میں چوہا گر کر مر جائے تو سب ناپاک ہو گیا، پانی ڈال کر جوش دینا اور اس کا جلا دینا بعض کے نزدیک مطہر ہے۔ اس طرح طاہر کر کے کفار کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے، اور نجس کا فروخت کرنا بھی درست نہیں۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: یعنی امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک پاک ہو جائے گا.......
اور کفار کے ہاتھ فروخت کرنے کا مشورہ اس لئے دیا گیا کہ امام محمد رحمہ اللہ اس کو پاک قرار نہیں دیتے ، اگر چہ مفتی بہ قول امام ابو یوسف رحمہ اللہ ہی کا ہے، ممکن ہے کہ بعض طبائع اس کے استعمال سے اِبا (نفرت) کریں، اس لئے فروخت کر دینے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

(امدادالفتاوی جدید ص۳۷۲ ج۱)

چاند، سورج کی طرف پاخانہ' پیشاب کے وقت منہ کرنا مکروہ ہے

مسئلہ:......سورج بادل میں چھپا ہوا ہو تو اس کی طرف منہ کر کے پیشاب کرنا درست ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: چاند، سورج کی طرف پاخانہ' پیشاب کے وقت منہ یا پیٹھ کرنا مکروہ تنزیہی ہے۔

لیکن مراد چاند سورج کی ذات کا استقبال و استدبار ہے، اس جہت یا ان کی روشنی کا استقبال و استدبار مکروہ نہیں ہے۔ اسی طرح جب وہ نظر نہ آ رہے ہوں تو بھی کراہت نہیں ہے، اور صورت مسئولہ میں چونکہ آفتاب ابر میں چھپا ہوا ہے، اس لئے کراہت نہیں ہے۔

(امدادالفتاوی جدید ص۳۹۴ ج۱)

فرج کی رطوبت اور ایک تحقیقی حاشیہ

مسئلہ:......رطوبت فرج کے متعلق جوابات کا خلاصہ درج ذیل ہے:

اول......فرج خارج کی رطوبت پاک ہے، اس لئے کہ وہ در حقیقت پسینہ ہے۔

دوم......فرج داخل کی رطوبت جس کو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ پاک کہتے ہیں اور صاحبین رحمہما اللہ ناپاک کہتے ہیں، کیونکہ اس رطوبت کے بارے میں تردد ہے کہ وہ پسینہ ہے یا مذی؟ اس لئے اس کی نجاست میں اختلاف ہوا ہے، اور احتیاط اس کے نجس کہنے میں ہے۔

سوم: ......رحم کی رطوبت جو بالاتفاق ناپاک ہے۔

یہ جوابات کا خلاصہ تھا۔ اب اصل مسئلہ کے متعلق عرض ہے کہ تمام سوالات اس سفیدی کے بارے میں ہیں جو بعض عورتوں کو اکثر اوقات بہتی رہتی ہے، اس کا جواب معلوم کرنے کے لئے پہلے اس کی حقیقت جان لینی چاہئے۔ فرج کا ایک حصہ تو خارج کا ہے، یعنی وہ حصہ جس کا دھونا غسل میں فرض ہے، اس پر اگر تری محسوس ہو تو وہ درحقیقت پسینہ ہے، جس طرح جسم کے اور حصوں میں پسینہ نکل کر محل تر ہو جاتا ہے، یہاں بھی یہ صورت پیش آتی ہے، لہٰذا جس طرح جسم کے تمام حصوں کا پسینہ پاک ہے، یہاں کا پسینہ بھی پاک ہے، اس لئے نہ اس سے وضو ٹوٹتا ہے، نہ اس کا دھونا ضروری ہے۔

دوسرا حصہ داخل (اندرونی حصہ) کا ہے، اس کی رطوبت میں کئی احتمال ہیں:

الف...... یا تو یہ طبعی رطوبت ہے، یعنی وہ رطوبت ہے جو عضو کو نرم رکھنے کے لئے اس مقام میں پیدا ہو کر ہمیشہ وہاں رہتی ہے، اس رطوبت کو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پاک فرماتے ہیں، اور صاحبین رحمہما اللہ ناپاک قرار دیتے ہیں، لیکن واضح رہے کہ یہ رطوبت اندر ہی رہتی ہے، خود سے باہر نہیں آتی۔ ائمہ کا اختلاف اس کے متعلق چند مسائل میں ہے۔

ب...... دوسرا احتمال یہ ہے کہ وہ مذی ہو جو غدۂ قدامیہ میں پیدا ہوتی ہے اور بوقت شہوت یا بوقت تخیلات شہوانیہ نکلتی ہے۔

”والمذی: هو رطوبة تسيل عند ابتداء الشهوة لتليين مجرى المنى ...... ومجراها فوق مجرى المنى“۔ (شرح الاسباب: ۱۲۵/۲)

ترجمہ...... مذی وہ رطوبت ہے جو شہوت کے شروع میں بہتی ہے، جس سے منی کے راستے نرم ہوتے ہیں..... مذی کا راستہ منی کے راستے کے اوپر ہے۔ (ترجمہ کبیر: ۲۵۱/۳)

ج...... تیسرا احتمال یہ ہے کہ وہ ودی ہو جو ایک سیال رقیق رطوبت ہے جو غدۂ ودی میں پیدا

ہوتی ہے، اور پیشاب سے پہلے اس کے ساتھ خارج ہوتی ہے تاکہ پیشاب بہ سہولت خارج ہوجائے اوراس کی تیزی پیشاب کی نالی میں محسوس نہ ہو، پیشاب کے بعد بھی نکلتی ہے۔

’’و الودی : هو رطوبة غروبة لزجة تسيل مجری البول عند ارادته لتغرية المجری و تولدها من غدة موضوعة بقرب عنق المثانة .....وهی اذا كثرت غلظت و سَالَت بعد البول ايضا‘‘۔ (شرح الاسباب:۲/۱۲۵)

اگر چہ عورت کے پیشاب کا سوراخ مَہْبَل (مقام جماع) سے تقریباً ایک انچ اوپر ہوتا ہے، لیکن وہ ہوتا ہے فرج داخل ہی میں۔

د...... چوتھا احتمال یہ ہے کہ وہ منی ہو، جس طرح مردوں کو جریان کی شکایت ہوجاتی ہے، یعنی عوارض کی وجہ سے منی کا کچا مادہ نکلنے لگتا ہے، اسی طرح عورتوں کو بھی یہ عارضہ لاحق ہوتا ہے

’’وربما عرض لهن سيلان المنی كما يعرض للرجال‘‘۔ (شرح الاسباب:۲/۱۵۸)

ھ...... پانچواں احتمال یہ ہے کہ وہ مذکورہ رطوبت کے علاوہ رحم سے نکلنے والے فضلات ہوں

’’قد يعرض للنساء ان تسيل من ارحامهن دائما رطوبات ...... وتلک الرطوبات اما ان يكون تولدها فی الرحم نفسه اذا ضعفت القوة الغاذية التی فيها ..... واما فضول تصل اليها من جميع البدن علی جهة الاستفراغ والتنقية‘‘۔

(شرح الاسباب:۲/۱۵۸)

ان رطوبات کو ’’سیلان الرحم‘‘ اور ’’سفیدی‘‘ اور سفیدی کا مرض‘‘ بھی کہتے ہیں۔

(دیکھئے! ترجمہ کبیر:۳/۳۰۵)

پچھلی چار صورتوں کی رطوبت باہر نکلتی ہے اور چونکہ مذی، ودی، منی اور تمام فضلات رحم ناپاک ہیں، اس لئے رطوبت بھی ناپاک ہوگی اور ناقض وضو ہوگی۔

خلاصۂ بحث یہ کہ: جو رطوبت بہتی ہے وہ خواہ کوئی ہو ناقض وضو ہے اور ناپاک ہے، لہذا

بعض عورتوں کو اکثر اوقات جو سفیدی بہتی رہتی ہے وہ ناپاک ہے، اور ناقض وضو ہے، جب وہ بہہ کر فرج خارج تک نکل آئے وضو ٹوٹ جائے گا۔ اور فرج داخل کی جس رطوبت میں امام صاحب رحمہ اللہ اور صاحبین رحمہما اللہ کا اختلاف ہوا ہے وہ خود سے باہر آتی ہی نہیں، لیکن اگر یہ رطوبت (سفیدی) ہر وقت بہتی رہتی ہو تو وہ عورت معذور ہے۔

(امدادالفتاوی جدید ص ۳۴۷/۳۴۸/۳۴۹/۳۵۰ ج ۱)

عشاء کا وقت غروب سے ڈیڑھ گھنٹہ بعد ہو جانا' قاعدہ کلیہ نہیں

مسئلہ:...... عشاء کا وقت غروب سے ڈیڑھ گھنٹہ بعد ہو جاتا ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: تمام سال کے لئے یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے، بلکہ موسم کے اختلاف سے کم و بیش ہوتا ہے۔ (امدادالفتاوی جدید ص ۴۱۳ ج ۱)

گھڑی دیکھ کر نماز کی جماعت کھڑی کر دینے کا التزام بدعت نہیں ہے

مسئلہ:...... گھڑی دیکھ کر نماز کی جماعت کھڑی کر دینے کا انتظام بمصلحت سہولت نمازیوں کے ہے، اور غیر ممنوع ہے۔ انتظام ممنوع وہ ہے جو دین بکسر دال یا بفتح دال کے طور پر ہو۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: یعنی ہر ایسی نئی بات جس کی شریعت میں کچھ اصل نہ ہو اور اسے دین کا کام سمجھ کر کیا یا چھوڑا جائے تو وہ بدعت اور ممنوع ہے، اسی طرح کسی مباح فعل (غیر ضروری کام) کو دَین (قرضہ) کی طرح لازم اور ضروری سمجھ کر کرنا بھی ممنوع ہے، اور نماز کے لئے اوقات مقررہ کی پابندی کو نہ دین (ثواب کا کام) سمجھا جاتا ہے، نہ دَین (لازم) سمجھا جاتا ہے، اس لئے ممنوع نہیں ہے۔ (امدادالفتاوی جدید ص ۴۲۴ ج ۱)

اذان کے بعد دعا میں ہاتھ نہ اٹھانا افضل ہے

مسئلہ:...... اذان کے بعد دعا میں ہاتھ نہ اٹھانا افضل ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: امام العصر علامہ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کی رائے بھی یہی ہے کہ اذان کی دعا میں عدم رفع مسنون ہے۔ ’’المسنون فی هذا الدعاء ألا ترفع الایدی ، لانه لم یثبت عن النبی صلی الله علیه وسلم رفعها ، الخ ‘‘۔

(فیض الباری ص۱۶۷ ج۲ ط: کوئٹہ، باب الدعاء عند النداء ، کتاب الاذان)

اور آپ نے بھی ’’نیل الفرقدین‘‘ میں ص: ۱۳۳/ میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی تحقیق کے قریب قریب تحقیق بیان فرمائی ہے، جسے فیض الباری (۱۲۷/۲) میں نقل کیا گیا ہے:

’’ما ملخصه اکثر دعاء النبی صلی الله علیه وسلم کان علی شاکلة الذکر ، لا یزال لسانه رطبا به ، و یبسطه علی الحالات المتواردة علی الانسان ......ومثل هذا فی دوام الذکر علی الاطوار لا ینبغی له ان یقصر امره علی الرفع‘‘۔

احقر عرض کرتا ہے کہ اذان کے بعد کا وقت احادیث میں ’’محل اجابت دعا‘‘ میں شمار کیا گیا ہے، اور اپنی حاجات کے لئے دعا کرنے کا امر بھی وارد ہوا ہے۔

’’عن عبد الله بن عمرو : قال ان رجلا قال : یا رسول الله ! ان المؤذنین یفضلوننا ، فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم : قل کما یقولون ، فاذا انتهیت فسل تعطه‘‘۔ (ابوداؤد ص۷۸ ج۱، باب ما یقول اذا سمع المؤذن ، رقم الحدیث: ۵۲۴)

لہٰذا اگر کوئی شخص اذان کے بعد صرف دعائے ماثورہ پڑھنا چاہتا ہو تو عدم رفع افضل ہے جیسا کہ مجیب اور علامہ کشمیری رحمہما اللہ کی رائے ہے، لیکن اگر کسی کو دعائے ماثورہ کے علاوہ اپنی حاجات کے لئے دعا کرنا ہے تو اس کے لئے رفع ید افضل ہے، اسی قاعدے سے جو حضرت مجیب رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ہے۔ (امداد الفتاوی جدید ص۴۳۷/۴۳۸ ج۱)

ڈوبنے کے خوف اور امراض کے عموم کے وقت اذان

مسئلہ:...... بعض بزرگوں کا عمل (اذان دینے کا) وقت عموم امراض وخوف غرق بھی دیکھا ہے

لیکن کوئی روایت نہیں دیکھی۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: اس لئے (اذان دینا) نہ چاہئے بالخصوص جب کہ عوام کا اعتقاد اس میں حد فساد تک پہنچا ہوا ہے۔ (امداد الفتاوی جدید ص ۴۳۹ ج ۱)

اقامت میں حیعلتین میں تحویل وجہ

مسئلہ:......التفات یمین و یسار جیسے اذان میں مسنون ہے ویسا ہی اقامت میں۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: اقامت کے حیعلتین میں تحویل وجہ کے متعلق تین قول ہیں:

اول......تحویل نہ کرے، اس لئے کہ اقامت حاضرین کے اعلام کے لئے ہے، برخلاف اذان کے کہ وہ غائبین کے اعلام کے لئے ہے۔

دوم......اگر جگہ وسیع ہو یعنی مسجد بڑی ہو تو تحویل کرے، ورنہ نہ کرے۔

سوم......خواہ جگہ وسیع ہو یا نہ ہو ہر صورت میں تحویل کرے۔

یہ تیسرا قول صاحب درمختار کا پسندیدہ ہے۔ کبیری (ص ۳۶۰) میں تحویل کو سنت متوارثہ کہا ہے۔ حضرت مجیب رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کے مطابق فتوی ارقام فرمایا ہے، لیکن ''سراج وہاج'' میں پہلا قول ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ نے (منحۃ الخالق، حاشیہ البحر الرائق م، مکتبہ، زکریا، دیوبند: ۱/۴۴۹، کوئٹہ: ۱/۲۵۸) میں ''النہر الفائق شرح کنز الدقائق'' سے اسی کی ترجیح نقل کی ہے۔

''قولہ فی السراج الوھاج : لا یحول ، الخ ، قال فی النھر : الثانی اعدل الاقوال''۔

مولانا عبدالحئی صاحب لکھنوی رحمہ اللہ نے ''سعایہ'' (ص ۱۸ ج ۲، باب الاذان ، کتاب الصلوۃ، مکتبہ اشرفیہ، دیوبند) میں اسی کو حق کہا ہے: ''قلت : والحق الصریح ھو القول الاول''۔

حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمہ اللہ نے ’’محمود الروایہ شرح نقایہ‘‘ میں اذان و اقامت کا فرق بیان فرماتے ہوئے لکھا ہے: ’’و كذا لا تحويل فيها‘‘۔ (شرح نقایہ: ۱/۶۱)

یعنی ایک فرق یہ بھی ہے کہ اذان میں تحویل ہے، لیکن اقامت میں نہیں ہے۔ اور گو یہ بات صحیح ہے کہ اقامت احد الاذانین ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ اذان کی تمام سنتیں اقامت میں بھی ہوں، اذان میں انگلیوں سے کان بند کرنا مسنون ہے، نیز ترسل یعنی ٹھہر ٹھہر کر اذان مسنون ہے، لیکن اقامت میں یہ دونوں چیزیں مسنون نہیں ہیں، لہذا صحیح یہ ہے کہ اقامت میں تحویل وجہ مسنون نہیں ہے۔ (امداد الفتاوی جدید ص۴۴۰/۴۴۱ ج۱)

جمعہ کی کونسی اذان سے بیع مکروہ ہے؟

مسئلہ: ...... جمعہ کی اذان کئی مساجد میں ہو تو بیع کی کراہت کس اذان سے ہوگی؟ اس سلسلہ میں روایت صریحہ احقر نے نہیں دیکھی، لیکن تعدد اذان میں اجابت اذان اول کو لکھا ہے، اس قیاس پر وجوب سعی و کراہت بیع بھی اذان اول پر چاہئے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: روایت صریحہ تو اس سلسلہ میں ہے نہیں، جیسا کہ حضرت رحمہ اللہ نے لکھا ہے، بلکہ جواب ’’اجابت اذان اول‘‘ پر قیاس کر کے لکھا ہے، لیکن یہ قیاس صحیح معلوم نہیں ہوتا ہے، کیونکہ ’’در مختار‘‘ کی جس عبارت سے استشہاد کیا گیا ہے وہ ایک مسجد کی چند اذانوں کے متعلق ہے، اور بحث متعدد مساجد کی اذانیں ہیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ اجابت اذان کی دو قسمیں ہیں: ایک اجابت بالقدم یعنی اذان سن کر مسجد میں جانا، اور دوسری اجابت باللسان یعنی اذان سن کر زبان سے اس کا جواب دینا اول واجب ہے اور ثانی مستحب ہے۔.....

اسی طرح چند اذانوں کی بھی دو صورتیں ہیں: اول: ایک ہی مسجد میں چند اذانیں ہوں دوم: چند اذانیں الگ الگ مساجد میں ہوں، قسم اول کا حکم ’’در مختار‘‘ میں یہ بیان کیا ہے کہ

صرف اذان اول کا جواب واجب ہے۔

’’ولو تکرر اجاب الاول (در مختار) (قوله : ولو تکرر) ای اذان واحد بعد واحد اما لو سمعهم فی آن واحد من جهات فسیأتی‘‘۔ (رد المحتار)

علامہ شامی رحمہ اللہ کی عبارت سے معلوم ہوا کہ ’’درمختار‘‘ کا مذکور قول اس صورت کا حکم ہے، جبکہ متعدد اذانیں ایک ہی مسجد میں ہوں، اور اس حکم کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ حرمت صرف اذان اول کے لئے ہے، کیونکہ بعد کی اذانیں مسنون نہیں ہیں۔

’’ویفیده ما فی البحر ایضا عن التفاریق اذا کان فی المسجد اکثر من مؤذن واحد أذنوا واحدا بعد واحد، فالحرمة للاول‘‘۔

اور قسم دوم: (یعنی جب متعدد مساجد کی اذانیں سنے) کے متعلق علامہ شامی رحمہ اللہ نے ترجیح اس کو دی ہے کہ زبان سے تمام اذانوں کا جواب دے۔

’’بخلاف ما اذا کان من محلات مختلفة تأمل، ویظهر لی اجابة الکل بالقول لتعدد السبب وهو السماع کما اعتمده بعض الشافعیة‘‘۔ (رد المحتار)

یعنی داعی الی اللہ کے ساتھ حسن ادب کا تقاضہ یہ ہے کہ اجابت باللسان تمام مساجد کی اذانوں کی مستحب ہو۔

رہی اجابت بالقدم تو ’’درمختار‘‘ میں ہے:

’’وفی التاتارخانیة : انما یجب اذان مسجده، و سئل ظهیر الدین عمن سمعه فی آن من جهات ماذا یجب علیه ؟ قال : اجابة مسجده بالفعل، قال الشامی : (قوله : انما یجب اذان مسجده) ای بالقدم‘‘۔ (۱/۳۳۰، مکتبہ زکریا۔ ۲/۷۰/۱۷، کراچی: ۱/۳۹۹)

یعنی اجابت بالقدم صرف مسجد محلّہ کی اذان کی واجب ہے۔

ادھر قول مختار کے مطابق جمعہ کی اذن اول کے وقت اجابت بالقدم واجب ہے۔

”وان یستجیب بقدمه اتفاقا فی الاذان الاول یوم الجمعة لوجوب السعی“۔ (در مختار)

کیونکہ آیت کریمہ: ﴿اذا نودی للصلوة، الخ﴾ سے مستفاد یہی ہے کہ اذان جمعہ سنتے ہی تمام کاروبار اور مشاغل چھوڑ کر علی الفور اجابت بالقدم واجب ہے، اور جب ایک بستی میں متعدد جگہ جمعہ جائز ہے تو اجابت بالقدم ہر مسجد کی طرف تو واجب ہو نہیں سکتی کہ یہ محال ہے، اور نہ اس مسجد کی طرف واجب ہے جہاں سب سے پہلے اذان ہوئی ہے، ورنہ تعدد جمعہ کا جواز ہی ختم ہو جائے گا، کیونکہ جب سب لوگوں کے لئے اسی مسجد کی طرف اجابت بالقدم واجب ہوئی تو اب اور جگہ جمعہ جائز کہاں رہا؟ بلکہ اجابت بالقدم مسجد محلّہ کی طرف واجب ہے، لہذا کراہت بیع اور وجوب سعی کا حکم بھی اسی مسجد محلّہ کی اذان اول کے ساتھ متعلق ہوگا۔

”والظاهر ان المأمورين بترك البيع هم المأمورون بالسعی الی الصلوة“۔

(روح المعانی: ۲۸/۹۱، مکتبہ زکریا، دیوبند، جز نمبر: ۲۸، ۱۵/۵۲۱، سورۃ الجمعہ، آیت نمبر: ۹/۱۱)

(امداد الفتاوی جدید ص ۴۴۲/۴۴۳/۴۴۴ ج ۱)

کیا منبر اور اذان کی جگہ مسجد میں داہنی جانب ہو؟

مسئلہ: ...... منبر مسجد میں بائیں جانب ہونا چاہئے یا دائیں جانب؟ اسی طرح اذان مسجد میں دائیں جانب دینی چاہئے یا بائیں جانب؟ اس کی کوئی اصل یا نہیں۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: منبر مسجد کی داہنی جانب یعنی امام کی داہنی جانب بنانا سنت ہے آپ ﷺ کا منبر اسی جانب تھا۔

”یستحب أن یکون المنبر علی یسار القبلة تلقاء یمین المصلی اذا استقبل كذا قاله الضمیری والدارمی والرافعی وغیرهم“۔ (اعلام المساجد ص ۳۷۳)

”وكان منبر رسول الله صلی الله علیه وسلم عن یمین المحراب اذا استقبلت القبلة“۔ (بذل المجہود ص ۱۷۸ ج ۲، قدیم، كتاب الصلوة، باب موضع المنبر)

”ومن السنة ان يخطب عليه اقتداءً به صلى الله عليه وسلم ، (بحر) وان يكون على يسار المحراب ، قهستانی“۔

(ردالمحتار ص۷۷۰ ج۱، ط: مکتبہ: زکریا، دیوبند۔ کراچی ص۱۶۱ ج۱، کتاب الصلوة ، باب الجمعة)

”انما وضع فی جانب الغربی قریبا من الحائط “۔ (زادالمعاد ص۱۱۶ ج۱)

اور دیکھئے! فتاوی دارالعلوم دیوبند (۲۹۰/۲)

دوسرے مسئلہ کے متعلق حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ کا فتوی ہے کہ: شریعت میں اس کا کچھ حکم نہیں کہ اذان بائیں جانب ہو اور اقامت داہنی جانب ہو، بلکہ جس طرف اتفاق ہو اذان واقامت درست ہے، کچھ کراہت کسی جانب میں نہیں ہے۔

(امدادالفتاوی جدید ص۴۴۸ ج۱)

اقامت کا جواب امام، مقتدی اور فارغ عن الصلوۃ سب دیں

مسئلہ:...... اقامت کا جواب امام، مقتدی اور فارغ عن الصلوۃ سب دیں۔

اس پر ایک اور حاشیہ میں یہ عبارت ہے:

”انما فی الجواب بحث من وجوه : اما الاول : فلان الرواية المنقولة متعلقة بالاذان ، والسائل يستفتی عن حكم الاقامة ، و جوابه : انه استدل بالنظير على النظير ، لان الاقامة فی الجواب مثل الاذان وهو ظاهر ، واما الثانی : فلأن سببية السماع فی غير الفارغين مسلم ، واما الفارغون فلا ، لانه دعاء لغير الفارغين لا للكل ، فيكون الجواب عليهم لا على الكل ، وجوابه : ان شرعية الجواب لمراعاة حسن الادب مع داعی الله وهو لا يختص بغير الفارغين ، ويؤيد ما قلنا ما قال العلامة الشامی فی رد المحتار : حيث قال : هل يجيب اذان غير الصلوة كالاذان للمولود لم اره لائمتنا والظاهر نعم ، ولذا يلتفت فی حيعلته كما مر وهو ظاهر الحديث الا ان يقال : ان ال

فی العهد آه ما فیه اقول : فان کان للجنس والاستغراق فظاهر ، وان کان للعهد فلا یضر فی ما نحن فیه ، لانه یشمل ح کل اذان للصلوة ، وفیه المدعی ''۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: لیکن مناسب یہ تھا کہ مندرجۂ ذیل عبارت استدلال میں پیش کی جاتی:

'' ویجیب الاقامة ندبا اجماعا کالأذان و یقول عند '' قد قامت الصلوة '' اقامها الله و ادامها ''۔

(درمختار ص۳۷۱ ج۱، کتاب الصلوة ، باب الاذان ، قبیل مطلب : هل باشر النبی صلی الله علیه وسلم الاذان بنفسه)

'' قوله :اجماعا ، قید لقوله ندبا ، أی ان القائلین باجابتها اجمعوا علی الندب ولم یقل احد منهم بالوجوب ، کما قیل فی الاذان ''۔(رد المحتار)

مذکورہ عبارات اپنے اطلاق کی وجہ سے امام، مقتدی اور فارغ عن الصلوۃ سب کو شامل ہیں، اور بالخصوص امام کے بارے میں مندرجہ ذیل حدیث بھی دلیل ہے:

''عن ابی امامة او عن بعض اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم : ان بلالا أخذ فی الاقامة ، فلما ان قال :'' قد قامت الصلوة '' قال النبی صلی الله علیه وسلم : اقامها الله و ادامها ، وقال فی سائر الاقامة کنحو حدیث عمر فی الاذان ''۔

(ابوداؤد ص۸۵ ج۱، باب ما یقول اذا سمع الاقامة ، رقم الحدیث:۵۲۸)

(امداد الفتاوی جدید ص۴۵۸ ج۱)

تکبیر تحریمہ کے بعد قیام کی ادنی مقدار

مسئلہ:...... تکبیر تحریمہ میں قیام فرض ہے، اور اس کی ادنی مقدار ایک تسبیح یا تین تسبیح کے قدر ہے..... البتہ یہ جو عادت ہے کہ اللہ اکبر کے ساتھ اول ہی سے رکوع میں پہنچ جاتے ہیں، ان

لوگوں کی نماز صحیح نہیں ہوتی۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: تکبیر تحریمہ کھڑے ہو کر ادا کرنے کے بعد تین یا ایک تسبیح کے برابر کھڑا رہنے کی ضرورت مسبوق کے لئے کسی روایت فقہی سے ثابت نہیں، اس لئے سوال نمبر: ۱۸۱ر کے جواب میں جو کچھ حضرت رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا ہے وہ اس پر شاہد ہے، اور اس میں بحوالہ شامی یہ الفاظ بھی منقول ہیں ''لو کبر قائما فرکع ولم یقف صح ''یعنی اگر صرف تکبیر تحریمہ بحالت قیام ادا کر کے رکوع میں چلا گیا اور مزید کچھ قیام نہیں کیا تو نماز صحیح ہو گئی۔ اس لئے اس جگہ جو نماز نہ ہونے کا حکم فرمایا ہے اس میں کچھ تسامح ہوا ہے، صحیح یہ ہے کہ نماز ہو جاتی ہے۔ (امداد الفتاوی جدید ص ۱۷۴ ج ۱)

نماز میں ایک سورت کے فاصلہ کا حکم

مسئلہ:...... اگر درمیان میں بڑی سورت چھوٹ جاوے جس میں دو رکعت ہو سکیں جائز ہے چھوٹی ناجائز۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: فقہاء کرام کی عبارتیں اس مسئلہ کے بیان میں غیر واضح ہیں، بلکہ بعض عبارتوں سے تو متبادر وہی ہوتا ہے جو حضرت قدس سرہ نے اپنے سابق جواب میں تحریر فرمایا ہے، یعنی بڑی سورت وہ ہے جس میں دو رکعت ہو سکیں اور چھوٹی وہ ہے جس میں دو رکعت نہ پڑھی جا سکیں، لیکن صحیح وہ ہے جو حضرت قدس سرہ نے حاشیہ میں تحریر فرمایا ہے ..... چونکہ اس مسئلہ میں عام طور پر غلط فہمی پائی جاتی ہے، اس لئے قدرے تفصیل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

دو سورتوں کے درمیان ایک سورت چھوڑنے کی کراہت کی وجہ ہجر و تفضیل کے شبہ سے بچنا ہے۔

''ویکرہ فصله بسورة بین سورتین قرأهما فی رکعتین لما فیه من شبهة التفضیل

والهجر ''۔ (حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص۳۵۲، الصلوۃ ، فصل فی مکروھات الصلوۃ)

پس اولی یہ ہے کہ پہلی رکعت میں جو سورت پڑھی ہے اسی سے متصل بعد والی سورت دوسری رکعت میں پڑھی جائے، اگر ایک سورت چھوڑ کر پڑھے گا تو اس کا ہجر (چھوڑنا) اور بعد والی کی تفضیل (ترجیح بلا مرجح) لازم آئے گی۔

'' اذا قرأ فی کل رکعۃ الحمد والسورۃ ، فانہ یقرأ سورۃ اخری فی الرکعۃ الثانیۃ متصلۃ بالسورۃ الاولی ، وان أراد ان یفصل بینھما ینبغی أن لا یفصل بسورۃ أو بسورتین ، وانما یفصل بسور ، ھکذا روی فی الحدیث ''۔ (حموی براشباہ ص۱۱۲ ج۱)

لیکن دو سورتوں کا چھوڑنا احادیث سے ثابت ہے، آپ ﷺ کی جمعرات مغرب کی نماز میں سورۃ الکافرون اور سورۃ الاخلاص تلاوت فرماتے تھے۔

'' ولو ترک سورتین فالصحیح انہ لا یکرہ ایضا ، لما روی جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ : کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی المغرب لیلۃ الجمعۃ : قل یایھا الکافرون ' و قل ھو اللہ احد ، رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ ''۔

(کبیری ص۴۶۲، الصلوۃ ، تتمات فیما یکرہ من القرآن)

لہٰذا دو سورتوں کا فصل جائز ہوا، اور ان میں ہجر و تفضیل کا شبہ نہ رہا، کراہت صرف ایک سورت کے چھوڑنے میں ہوگی، خواہ وہ سورت چھوٹی ہو یا بڑی، لیکن بعد والی سورت اتنی بڑی ہو کہ اسے دوسری رکعت میں پڑھنے سے اس کا پہلی رکعت سے طویل ہونا لازم آتا ہو تو اس عارض کی وجہ سے ایسی طویل سورت کا چھوڑنا جائز ہوگا، کیونکہ ہر رکعت میں کامل سورت پڑھنا افضل ہے۔ اور دوسری رکعت کو طویل کرنا مکروہ ہے۔ اور جہاں یہ عارض نہ ہو وہاں پہلی سورت سے متصل جو سورت ہے اسی کو پڑھنا اولی ہے اور اس کو چھوڑ کر (خواہ وہ بڑی ہو جس میں دو رکعت ہو سکیں یا چھوٹی ہو) بعد والی سورت پڑھنا مکروہ تنزیہی یعنی خلاف اولی ہے، اور

یہ کراہت فرائض میں ہے، نوافل میں ایک سورت چھوڑنا جائز ہے۔

’’ویکره الفصل بسورة قصيرة (در مختار) أما بسورة طويلة بحيث يلزم منه اطالة الركعة الثانية اطالة كثيرة فلا يكره، شرح المنية كما اذا كانت سورتان قصيرتان‘‘۔ (شامی ص۴۰۴ ج۱، کتاب الصلوۃ، باب صفۃ الصلوۃ)

’’ولو قرأ في كل ركعة سورة و ترك بين سورتين سورة يكره لما قلنا (أى لانه يوهم الاعراض والترجيح بلا مرجح) الا ان تكون تلك السورة اطول من التى قرأها فى الركعة الاولى بحيث يلزم منه اطالة الركعة الثانية اطالة كثيرة فحينئذ لايكره‘‘۔ (کبیری قدیم ص۴۶۳، کتاب الصلوۃ، تتمات فیما یکرہ من القرآن)

(امداد الفتاوی جدید ص۵۴۱/۵۴۲ ج۱)

نوٹ:......از: مرتب: اوپر ’’کبیری‘‘ کی عبارت میں جمعرات کی مغرب میں آپ ﷺ کا سورۂ کافرون اور سورۂ اخلاص پڑھنا منقول ہے، اور حوالہ ’’ابوداؤد‘‘ اور ’’ابن ماجہ‘‘ کا دیا گیا ہے، راقم الحروف کو ان دونوں کتابوں میں یہ روایت نہیں ملی۔ البتہ ’’مشکوۃ‘‘ اور ’’شرح السنہ‘‘ میں یہ حدیث ہے۔ بظاہر ’’کبیری‘‘ کے حوالہ میں تسامح ہے۔

(شرح السنة ص۸۱ ج۳، باب القراءة في الصبح، كتاب الصلوة، رقم الحديث:۶۰۵۔ مشكوة، باب القراءة في الصلوة، الفصل الثاني، كتاب الصلوة، رقم الحديث:۷۹۱)

آبادی سے دور رہنے والے اور گھر پر نماز پڑھنے والے کے لئے اذان

مسئلہ:......کوئی شخص آبادی سے دور رہتا ہے تو اسے نماز کے لئے اذان اور اقامت کہنی چاہئے۔ اسی طرح کوئی اپنے گھر میں نماز پڑھے تو اس کے لئے اذان و اقامت کہنا مستحب ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: ان مسائل میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ اذان و اقامت

ایک ذکر ہیں، ان کا بلند آواز سے پکار کر کہنا ان کی ماہیت میں داخل نہیں ہے، چنانچہ نومولود کے کان میں جو اذان واقامت کہی جاتی ہے وہ محض جہر سے کہی جاتی ہے، جہر مفرط سے نہیں کہی جاتی، اس لئے ان مسائل کا مطلب یہ ہے کہ جن جن صورتوں میں اذان واقامت مستحب ہیں ان میں بطور ذکر اذان واقامت کہی جائے گی معروف طریقہ پر اذان کہنا مقصود نہیں ہے۔ (آداب اذان واقامت ص ۷۸)

مضحی پر نفس وجوب کے بعد ہی قربانی صحیح ہوگی

قربانی کے ایک مسئلہ پر حضرت مولانا مفتی اسماعیل صاحب بھڑکودروی رحمہ اللہ کے فتوی کی تصدیق وتائید میں تحریر فرمایا کہ:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب صحیح، والمؤیدون مصیبون:...... مضحی پر نفس وجوب کے بعد ہی قربانی صحیح ہوگی، اور'' المعتبر مکان الاضحیة'' کی رو سے جہاں جانور قربان کیا جارہا ہے وہاں قربانی کا وقت باقی ہونا ضروری ہے، پس اگر سعودیہ میں: ۱۳/ ذی الحجہ ہو جائے اور ہندوستان میں: ۱۲/ ذی الحجہ ہو تو سعودیہ میں قربانی نہیں ہوسکتی، کیونکہ مکان اضحیہ میں قربانی کا وقت ختم ہوگیا ہے، جبکہ یہ بھی شرط ہے۔ واللہ اعلم حررہ: سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری

مذکورہ فتوی میں گجرات کے جن مفتی صاحب کے اختلاف کا ذکر ہے وہ قربانی میں نفس وجوب اور وجوبِ ادا کو علیحدہ علیحدہ مانتے ہیں، اور نفس وجوب کا سبب غنا (مالداری) کو قرار دیتے ہیں، اور وجوبِ ادا کا سبب وقت کو گردانتے ہیں، جیسے زکوۃ اور صدقۃ الفطر میں یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں، حالانکہ زکوۃ میں مالکِ نصاب ہونے کے بعد کئی سالوں کی زکوۃ مقدم ادا کی جاسکتی ہے، اور صدقۃ الفطر میں'' رأسٌ یَمُونُهُ وَیَلِیْ عَلَیْه '' (وہ ذات جس کا خرچہ آدمی برداشت کرتا ہے اور جس کی سرپرستی کرتا ہے) کے تحقق کے بعد متعدد سالوں کا صدقۂ فطر

پیشگی ادا کیا جاسکتا ہے۔ اور نماز، روزے میں یہ چیزیں ساتھ ہیں، خطابِ خداوندی سے نفس وجوب آتا ہے، اور وقت وجوبِ ادا کا سبب ہے، چنانچہ ظہر کا وقت ہونے کے بعد ایک ہی ظہر ادا کی جاسکتی ہے، متعدد ظہر کی نمازیں ادا نہیں کی جاسکتیں۔

قربانی میں بھی یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ ہیں، قربانی کا وقت شروع ہونے کے بعد خطابِ خداوندی متوجہ ہوتا ہے اور اس سے نفسِ وجوب آتا ہے، اس لئے جب تک قربانی کرنے والے پر قربانی کا وقت نہیں آئے گا اور اس کی طرف خطابِ خداوندی متوجہ نہیں ہوگا، اس کی طرف سے قربانی کرنا درست نہیں۔

اور دوسری صورت میں مکانِ اضحیہ کا بھی اعتبار ہوگا، یعنی جہاں جانور ذبح کیا جارہا ہے وہاں قربانی کا وقت باقی ہونا ضروری ہے، اگر قربانی کے ایام گذر گئے ہیں تو قربانی درست نہیں ہوگی، اگرچہ قربانی کرنے والے کی جگہ ابھی ایام قربانی چل رہے ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

واللہ اعلم حررہ: سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری

(فتاوی رحیمیہ ص۴۲۴ ج ۵، مکتبۃ الاحسان دیوبند)

حکومت کا وظیفہ لینا جائز ہے، اس پر ایک شبہ اور اس کا جواب

حکومت کا وظیفہ (جھوٹ اور دھوکہ کے بغیر ہو تو) لینا جائز ہے۔ کسی کے ذہن میں یہ شبہ ہو کہ حکومت کا مال معلوم نہیں کن کن ذرائع سے حاصل ہوتا ہے؟ ہوسکتا ہے وہ ناجائز ذرائع سے حاصل ہوا ہو۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ملکیت بدلنے سے حکم بدل جاتا ہے، مثلاً ٹیکس کی رقم گورنمنٹ نے لوگوں پر ظلم کرکے لی، یا جرمانہ کرکے لی تو گورنمنٹ مالک ہوگئی پھر وہ کسی کو دیتی ہے تو ملکیت بدل گئی، اور ملکیت بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں۔ اور دلیل وہ حدیث ہے جس میں حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو گوشت صدقہ کیا گیا تھا، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

بریرہ کے لئے صدقہ ہے، اور ہمارے لئے ہدیہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ملکیت بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں۔ (علمی خطبات ص۲۹۴ ج۱)

آفس سے سیدھے مسجد آنے والوں کا کوٹ، پتلون پہن کر نماز پڑھنا

جو لوگ کام پر سے سیدھے مسجد آتے ہیں ان کو کوٹ، پتلون اور ٹائی وغیرہ پہن کر نماز پڑھنے کی گنجائش ہے، مگر جب کام سے فارغ ہو کر گھر سے مسجد آئیں تو اسلامی لباس پہن کر آنا چاہئے۔ جیسے آفس جانے کے لئے یونیفارم ہے، اللہ تعالےٰ کے دربار میں آنے کے لئے بھی ایک یونیفارم ہے، اور وہ اسلامی لباس ہے۔ (علمی خطبات ملخص ص۲۹۹ ج۱)

حلال جانور کی سات چیزیں کھانا مکروہ ہے اور ''فتاوی رحیمیہ'' کا تسامح

سات چیزیں حلال جانور کی کھانی منع ہیں: ذکر، فرج مادہ، مثانہ، غدود (یعنی) حرام مغز جو پشت کے مہرے میں ہوتا ہے، خصیہ، پتہ مرارہ جو کلیجی میں تلخ پانی کا ظرف ہے، اور خون سائل قطعی حرام ہے، باقی سب اشیاء کو حلال لکھا ہے، مگر بعض روایات میں کڑوے (پتہ) کی کراہت لکھتے ہیں، اور کراہت تنزیہیہ پر حمل کرتے ہیں۔......

مذکورہ عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ حرام چیزوں میں نر کا عضو تناسل (ذکر) بھی داخل ہے، اور حرام مغز سے مراد غدود ہے جو پشت کے مہرے میں ہوتا ہے۔

اس پر تحریر فرماتے ہیں: بکری وغیرہ مذبوح جانور کی سات چیزیں مکروہ ہیں، امام محمد رحمہ اللہ کی ''کتاب الآثار'' (ص:۱۱٦) میں حضرت مجاہد رحمہ اللہ کی مرسل روایت ہے: ''کرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الشاۃ سبعا : المَرارۃ' والمَثانۃ' والغُدَّۃ' والحَیاء' والذَّکر' والانثیین والدم، والحدیث اخرجہ الطبرانی فی الاوسط عن ابن عمر والبیھقی عن مجاھد مرسلا، وعنہ عن ابن عباس موصولا کما فی العزیزی (ص۱۷۱ ج۳)۔ (اعلاء السنن ص ص۱۳۰ ج۱۷)

سات چیزوں کی تفصیل:

(۱)......المَرارة: پتّا (جگر سے ملی ہوئی صفرا کی تھیلی)۔

(۲)......المَثانة: گردوں سے نکل کر پیشاب کے جمع ہونے کی تھیلی۔

(۳)......الغُدَّة: غدود، گوشت کی گانٹھ جو کسی بیماری کی وجہ سے بن جاتی ہے۔ ''قاموس'' سے علامہ شامی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے: '' کل عقدة فی الجسد ' أطاف بها شحم ' و کل قطعة صلبة بین العصب ' ولا تکون فی البطن ''۔ (شامی ص۵۲۹ ج۵)

(۴)......الحَیاء: (بالقصر) الحَیاء (بالمد) کھر اور سُم والے جانوروں کی فرج، پیشاب کے سوراخ کے گرد جمع ہونے والی کھال، بکری وغیرہ کی کھال اتارے بغیر پکائی جائے تو فرج کو کاٹ دینا ضروری ہے۔

(۵)......الذَّکر: عضوِ تناسل، یہ پٹھا (رگ) ہوتا ہے، جس میں سے پیشاب نکلتا ہے، اس کا کھانا بھی جائز نہیں۔

(۶)......الانثیین: فوطے، کپورے، خصیے۔

(۷)......الدم: غیر سائل خون جو گوشت کے ساتھ لگا ہوا ہوتا ہے۔

''تفسیر عزیزی'' (سورۃ البقرہ کی آیت: ۱۷۳) میں جو ''الدم'' آیا ہے، اس کا مصداق حضرت شاہ عبد العزیز صاحب قدس سرہ نے دم مسفوح کو قرار دیا ہے، پھر لکھا ہے:

آمدیم بر آنکہ خونے کہ حرام و ناپاک ست کدام خون ست؟ خونے کہ در رگہائے جاری میشود فقط یا خونے کہ بر گوشت چسپیدہ، مستعد پوشیدن صورت لحمی گردیدہ؟ نزد امام اعظم حرام و ناپاک ہماں خون جاری ست۔ وقطراتِ خون کہ بر گوشت چسپیدہ می باشد نہ حرامند و نہ ناپاک۔ اگر گوشت را نا شستہ بپزند خوردنش رواست، اما خلاف نظافت طبع ست۔

ترجمہ:......اب ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ کونسا خون ناپاک و حرام ہے؟ آیا وہ خون کہ رگوں

میں جاری رہتا ہے؟ یا وہ خون کہ گوشت سے چسپیدہ ہوکر بہ صورت گوشت ہوجاتا ہے؟ امام اعظم صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک وہ ہی جاری حرام اور ناپاک ہے، اور قطرات خون کے کہ گوشت پر چسپیدہ ہوتے ہیں حرام اور ناپاک نہیں ہیں، اگر ایسے گوشت کو بغیر دھوئے پکالیا تو اس کا کھانا جائز ہے، لیکن خلاف لطافتِ طبیعت ہے۔

(تفسیر عزیزی ص ۸۰۸، تفسیر سورۂ بقرہ۔ بستان التفاسیر ترجمہ تفسیر عزیزی ص ۱۱۴)

اس کے بعد دو باتیں رہ جاتی ہیں:

ایک:...... یہ کراہت تحریمی ہے یا تنزیہی؟ فقہ کی کتابوں میں اس سلسلہ میں دونوں قول ہیں میری ناقص رائے میں یہ ''اسـاءـة'' کے درجہ کی کراہیت ہے۔ یہ تحریمی اور تنزیہی کے درمیان کا درجہ ہے، یعنی نہ صرف خلاف اولی ہے اور نہ قطعی حرام، بلکہ ان کا کھانا برا ہے، ان سے پرہیز کرنا چاہئے۔

دوم...... کراہت ان سات چیزوں میں منحصر ہے یا اور بھی اجزاء مکروہ ہیں؟ جواب یہ ہے کہ حصر نہیں، حدیث میں بطور مثال سات چیزوں کا ذکر ہے، چنانچہ فقہاء نے اور چیزیں بھی بڑھائی ہیں۔ ''فتاوی رضویہ'' میں بہت سی چیزوں کو مکروہ لکھا ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ ''فتاوی رحیمیہ'' میں اس سلسلہ میں دو فتوے ہیں، ایک جلد دوم (ص ۲۲۳) میں ہے، اس پر کسی نے اشکال کیا ہے، تو دوسرا فتوی جلد نہم (۳۲۲) میں ہے، اور دونوں فتووں کا مدار ''فتاوی رشیدیہ'' کے فتوی پر ہے، جو دونوں جوابوں میں منقول ہے، وہ فتوی بعینہ یہ ہے:

الجواب...... سات چیز حلال جانور کی کھانی منع ہیں: (۱): ذکر، (۲): فرج مادہ، (۳): مثانہ، (۴): غدود، (۵): حرام مغز جو پشت کے مہرے میں ہوتا ہے، (۶): خصیہ، (۷): پتہ مرارہ جو کلیجی میں تلخ پانی کا ظرف ہے، اور خون سائل قطعی حرام ہے، باقی سب اشیاء کو حلال

لکھا ہے، مگر بعض روایات میں کڑوے (پتہ) کی کراہت لکھتے ہیں اور کراہت تنزیہیہ پر حمل کرتے ہیں۔

''فتاوی رحیمیہ'' جلد دوم میں غدود کے بعد ''یعنی'' بڑھایا ہے، جو ''فتاوی رشیدیہ'' میں نہیں ہے، اب حرام مغز: غدود کی تفسیر ہوگئی، چنانچہ ساتویں چیز ''خون سائل'' کو بنایا، یہ صحیح نہیں۔ دم مسفوح سات کے علاوہ ہے، اور قطعی حرام ہے، اور حرام مغز کو عربی میں النخاع کہتے ہیں، حدیث میں اس کا ذکر نہیں، بلکہ دم کا ذکر ہے جس سے مراد دم غیر مسفوح ہے ''کفایت المفتی'' (۸:۲۸۷) میں ہے کہ: حرام مغز نہ حرام ہے نہ مکروہ، یونہی بیچارہ بدنام ہوگیا۔ اور ''فتاوی رشیدیہ'' کے بعض نسخوں میں ''گردے'' کے بجائے ''کڑوے'' چھپا ہے چنانچہ ''فتاوی رحیمیہ'' جلد دوم اور نہم میں کڑوے کے بعد ''پتہ'' بڑھادیا جو ''فتاوی رشیدیہ'' میں نہیں ہے۔ اور گردے کی کراہیت کی کوئی روایت نہیں ملی۔ اور ''فتاوی رشیدیہ'' کے مختلف نسخے دیکھنے سے تقریبا یقین ہوجاتا ہے کہ یہ لفظ ''گردے'' ہے، کیونکہ پتہ کا ذکر اوپر آگیا ہے۔

پھر ''فتاوی رحیمیہ'' جلد نہم ص:۳۲۲ / میں سائل نے پوچھا ہے کہ ''غدود اور حرام مغز ایک ہیں یا الگ الگ؟'' مفتی صاحب نے یہ جواب دیا ہے کہ '' حرام مغز سے مراد غدود ہے جو پشت کے مہرے میں ہوتا ہے'' یہ درست نہیں، حرام مغز اور غدود دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، غدود: گوشت میں پیدا ہونے والی گانٹھیں ہیں اور حرام مغز ریڑھ کی ہڈی میں سفید رگ ہے۔ (فتاوی رحمیہ ص:۳۷۳/۳۷۴/۳۷۵ ج۵، مکتبہ الاحسان، دیوبند)

حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد پالن پوریؒ

فقہی بصیرت و فکری اعتدال

مولانا نوراللہ جاوید

24 سالہ دور طالب علمی میں کئی درجن اساتذہ سے پڑھنے اور سیکھنے کا موقع ملا ہے، تمام اساتذہ قابل احترام اور ان کی عظمت مسلم ہے۔ استاذ اور شاگرد کا رشتہ دنیا کے بہترین رشتوں میں سے ایک ہے۔ بلکہ یہ رشتہ کبھی کبھی خونی رشتے پر بھی فوقیت لے جاتا ہے۔ اساتذہ صرف درسی کتابیں ہی نہیں پڑھاتے ہیں بلکہ اپنی زندگی کے تجربے سے عملی زندگی میں درپیش حالات، مسائل و مشکلات کا مقابلہ کرنے کا ہنر بھی سکھا جاتے ہیں۔ ان کی نصیحتیں، تجربات اور مشاہدات اس وقت فضول سے معلوم ہوتی ہیں مگر وہ باتیں لاشعور کا حصہ بن جاتی ہیں اور وقت آنے پر اساتذہ کی نصیحتیں اور ان کی باتیں ذہن و دماغ پر دستک دیتی ہیں اور صراط مستقیم پر گامزن کر جاتی ہے۔ زندگی کے اس سفر میں چند ایسے اساتذۂ کرام سے واسطہ پڑتا ہے کہ ان کی عظمت و رفعت اور شفقت و محبت اور علمی حیثیت ذہن و دماغ پر ہمیشہ ہمیش کے لئے نقش بن کر رہ گئے ہیں۔ ان کی یادیں، باتیں وقت کے دھول کا حصہ نہیں بنی ہیں بلکہ زندگی کے سفر کے ساتھ وہ بھی سفر کر رہی ہیں۔ میرے ان ہی اساتذہ میں سے ایک محدث کبیر، محقق اور دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین، مقبول ترین استاذ، شیخ الحدیث حضرت مولانا سعید احمد پالن پوریؒ کی ذات گرامی ہے، جنہیں دنیا سے رخصت ہوئے کئی دن گذر چکے ہیں مگر اس کا غم دل و دماغ پر اب بھی چھایا ہوا ہے۔ 20 سال بیت گئے، جب ہم نے حضرت الاستاذ سے ترمذی شریف پڑھی تھی۔ ان دو دہائیوں میں زندگی

کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ سوچ وفکر کے زاویے تبدیل ہو گئے اور ترجیحات بدل گئیں، میدان کار بدل گیا۔ درس و تدریس اور مدارس کے روح پرور ماحول سے دور صحافت سے وابستہ ہو چکا ہوں۔ ان 20 سالوں میں براہ راست ایک بھی ملاقات نہیں ہوئی ہے، مگر اس کے باوجود حضرت الاستاذ کے انتقال کی خبر سن کر دل بیٹھ سا گیا اور ایسا محسوس ہوا کہ بہت بڑی نعمت سے محروم ہو گئے۔

یہ جو ملتی ہے ترے غم سے، غم دہر کی شل

دار العلوم دیوبند میں قیام کے چار سالہ دور کی یادوں کے نقوش ایک بار پھر نگاہوں کے سامنے گردش کرنے لگے۔ حضرت لااستاذؒ کا احاطۂ دار العلوم میں داخل ہونا احاطۂ مولسری سے گزرتے ہوئے دار الحدیث تک پہنچنا اور پھر پورے وقار کے ساتھ مسند درس پر بیٹھ کر درس حدیث کا انداز دلبرانہ، حسن بیان، افہام و تفہیم، تحقیق و تنقید اور دلائل اور مختصر مگر جامع گفتگو سے طلباء کو مسحور کر دینا۔ ایشیا کی عظیم دینی درسگاہ دار العلوم دیوبند کی ایک تاریخ ہے۔ یہاں کے اساتذہ علم و فن تقویٰ وللّٰہیت، ایثار و قربانی کے لئے مشہور رہے ہیں دار العلوم دیوبند کے مسند درس کو امام ربانی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، محدث کبیر مولانا فخر الدینؒ، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ، علامہ ابراہیم بلیاویؒ، مولانا معراج الحق دیوبندیؒ، مولانا حسین احمد ملا بہاریؒ اور مولانا نصیر احمد خان صاحبؒ جیسی صاحب علم شخصیتوں نے رونقیں بخشی ہیں۔ یہ تمام حضرات اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ باکمال اساتذہ کا ایک سلسلۃ الذہب ہے۔ حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کی ذات گرامی اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی اور اکابرین کی یادگار تھے۔ علوم دینیہ اور عقلیہ پر گہری گرفت کے ساتھ خلوص وللّٰہیت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے اس دور میں دار العلوم دیوبند کے مسند درس کی آبرو تھے۔ اکابرین کی سنہری روایات واقدار کے

پاسبان تھے۔ دار العلوم دیوبند میں درس حدیث کا خاص اسلوب تھا۔ دار العلوم دیوبند شاہ ولی اللہ اور شیخ سرہندی دونوں بزرگوں کے ''مکاتب حدیث'' کا ماحصل ہے۔ حضرت امام شاہ ولی اللہؒ کے درس حدیث کا انداز یہ تھا کہ ''طلبہ سے خود ہی نیا سبق پڑھوایا کرتے تھے اور پھر اس کے تمام پہلوؤں اور گوشوں پر نہایت جامع اور سیر حاصل کیا گفتگو کرتے تھے۔ فقہی مسائل کو طلبہ کے سامنے پیش کرتے تو وقت آپ کی تمام تر توجہ اور کوشش اس امر کی جانب مرکوز رہتی کہ بالعموم مختلف اور بالخصوص حنفی اور شافعی مسلک کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کو حتی المقدور کم کیا جائے۔ کم وبیش یہی اسلوب حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ کا بھی تھا کہ ''اختلافی مسائل کو اچھالنے کی بجائے ان پر غور وفکر کرکے ان کے درمیان تطبیق دینے کی کوشش کرتے تھے۔ درس حدیث میں ائمہ اربعہ کے فقہی اختلاف کو ضرور بیان کرتے تھے مگر حنفی نقطۂ نظر کو ترجیح دینے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ ترجیح حدیث کے مسئلہ کو ہی دیتے تھے۔ طلبہ میں تنگ نظری کی بجائے وسعت نظری اور تحقیق وجستجو کا جذبہ پیدا کرنے کی آپ کی کوشش ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے ان کے سبق میں طلبہ بہت ہی ذوق وشوق سے شریک ہوتے تھے۔

دنیا میں ایسے بہت ہی خوش نصیب ہیں جن کی پوری زندگی قرآن وحدیث کی خدمت کے لئے وقف رہی ہو۔ تدریس بذات ایک بڑا مشغلہ ہے، گھنٹوں مطالعہ کا متقاضی ہے۔ علالت، خانگی مصروفیات کے باوجود حضرت استاذ مفتی سعید احمد پالنپوریؒ نے غیر معمولی علمی وتالیفی نقوش چھوڑے ہیں، جو معیار اور مقدار دونوں اعتبار سے بہت ہی زیادہ ہیں حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث کی معرکۃ الآراء کتاب حجۃ اللہ البالغہ کی شرح ''رحمۃ اللہ الواسعہ'' قرآن کریم کی تفسیر، ترمذی شریف اور بخاری شریف کی شروحات کے علاوہ درجنوں کتابیں آپ کے قلم سے نکلیں۔ یہ کتابیں آپ کی علمی بصیرت، تحقیق وجستجو، فراست اور یکسوئی کی آئینہ دار ہے۔ چناں چہ ان کے انتقال کو علم وفن اور کمالات کے کارواں کے رخصت ہوجانے سے تعبیر کیا جارہا ہے۔ عربی شاعر امرؤ القیس کا یہ شعر: ع

وما كان قيس هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهدما

کے مصداق اسی طرح کی شخصیات ہوتی ہیں۔ میں یہ بات لکھ بھی نہیں سکتا ہوں کہ ان کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا ممکن نہیں ہے، کیوں کہ خالق کائنات سے کچھ بھی بعد نہیں ہے۔ حضرت الاستاذؒ تو گفتگو اور تحریر میں حد درجہ اعتدال کے قائل تھے۔ مدح سرائی میں غلو کے وہ سخت مخالف تھے۔ اس لئے حضرت استاذ کی عظمت و رفعت اور ان کے علمی مقام کا تعین کئے بغیر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حضرت الاستاذ کا انتقال صرف ایک خاندان کا غم نہیں ہے، ایک ادارے کا نقصان نہیں ہے۔ لاکھوں شاگردوں اور ہزاروں عشاقان حدیث اور سب سے بڑھ کر ایشیا کی عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم دیو بند ایک ایسے عظیم استاذ سے محروم ہو گیا ہے جو اس کی آبرو اور علمی قیادت و سیادت کے مرتبے پر فائز تھا۔ باری تعالیٰ کی قدرت سے یہ امید ہے کہ اکابرین کے خلوص وللّٰہیت کے تاج محل دارالعلوم دیو بند کو جو نقصان پہنچا ہے اس کے تدارک کے لئے اسباب وحالات پیدا فرمادے۔ حضرت کے علمی تفوق، اسلوب درس، علوم حدیث پر دسترس اور تصنیفی خدمات پر بہت کچھ لکھا جارہا ہے اور لکھا بھی جائے گا۔ ضرورت بھی اس بات کی ہے کہ حضرت کی تفسیر ”ہدایت القرآن“ ”تحفۃ الالمعی شرح سنن الترمذی“ ”تحفۃ القاری شرح بخاری“ اور حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی مشہور زمانہ اور معرکۃ الآراء کتاب حجۃ اللہ البالغہ کی شرح ”رحمۃ اللہ الواسعہ“ اور دیگر تصانیف کا علمی جائزہ لیا جائے۔ ان کے تصانیف پر سیمینار کا انعقاد اور بحث ومباحثہ کا دور چلے تاکہ ان کتابوں کی رسائی عام لوگوں تک ہو اور مجھے قوی امید ہے کہ حضرت کے لاکھوں شاگردوں میں سے کوئی نہ کوئی کارخیر کو ضرور انجام دے گا۔ مگر علمی تحریف، بدعات اور غلط آمیزش کے خلاف حضرت الاستاذ کی خدمات ناقابل فراموش ہے۔ ویسے حضرت مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کی زندگی کا ہر پہلو روشن ہے، مگر اس معاملے میں مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کو

اپنے معاصرین پر فوقیت حاصل ہے۔ علوم نبوت کے حاملین کی صفت بیان کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا تھا کہ ''یہ علم ہر نسل سے آنے والی نسل کے بہترین عادل افراد وصول کریں گے پھر وہ اس علم سے تحریف، بدعات اور غلط آمیزش کو مٹا ڈالیں گے''۔

علوم نبوت میں تحریف اور بدعات وخرافات کی آمیزش کے خلاف مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کی کوششوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ انہیں جب یہ محسوس ہوا کہ تمسک بالسنہ اور اعتدال کی راہ ترک کر کے افراط وتفریط اور مداہنت کی راہ اختیار کی جارہی تو انہوں نے لومۃ لائم کی پرواہ کئے بغیر حق واضح کرنے کی بھرپور کوشش کی، اس کے لئے انہوں نے اپنوں کو بھی نہیں بخشا۔ ان کے فکر وخیال سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، مگر ان کی وسعت نظر، قوت حافظہ اور کثرت مطالعہ اور سب سے بڑھ کر ان کے خلوص وللہیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

''جلسۂ تعزیت اور شخصیات پر سیمینار'' کی شرعی حیثیت سے متعلق حضرت مفتی صاحب نے حدیث وسیرت کی روشنی میں جلسہ تعزیت اور شخصیات پر منعقد ہونے والے سیمیناروں میں افراط وتفریط اور غلط روایات کی آمیزش پر مواخذہ کرتے ہوئے علمی بحث کا آغاز کرتے ہوئے تحقیق وجستجو کی نئی راہ کھول دی۔ گرچہ بعض نادانوں نے پوری بحث کو ذاتی دشمنی اور تعصب سے تعبیر کر کے ایک علمی بحث کو متنازع بنادیا۔ دار العلوم دیوبند جیسے عظیم اداروں میں اس طرح کی علمی بحثیں نہیں ہوں گی تو پھر کہاں ہوگی؟ مثبت ماحول میں تحقیق و تنقید اور ادب واحترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے علمی اشکالات سے تخلیق کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے تحقیق وجستجو کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ تنگ نظری کے بجائے وسعت نظری پیدا ہوتی ہے۔

بدعات کی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی کہ بدعت کا آغاز کس ماحول میں ہوتا اور پھر سماج ومعاشرہ میں اس کی کونسی شکل اختیار کر جاتی ہے، اس سے وہ بخوبی واقف تھے چناں کہ تمسک بالسنہ اور بدعات کے معاملے میں وہ انتہائی سخت تھے۔ ربیع الاول کے مہینے

میں ہونے والے میلادالنبی کے جلسے اب مستقل ایک تہوار کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ عید میلادالنبی کو دین سمجھ کر ہندوستان بھر میں جلوس نکالے جاتے ہیں اور طرح طرح کے خرافات وبدعات کا ارتکاب ہوتا ہے۔ ابتدا میں علمائے دیوبند بھی میلاد کے پروگراموں میں یہی کہہ کر شریک ہوتے تھے کہ اس کی وجہ سے سیرت کے پیغام کو عام کرنے کا موقع مل جاتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ آج میلاد کی وہی صورت ہے جو دس بیس سال قبل تھی ظاہر ہے کہ نہیں۔

ایسا بھی نہیں کہ حضرت مفتیؒ نے پہلی مرتبہ اس طرح کی بحث کا آغاز کیا ہے، کئی دہائی قبل حضرت حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمدم طیبؒ کے دور اہتمام میں بھی دارالعلوم دیوبند کے یوم تاسیسی پر دیگر عصری اداروں کے طرز پر جشن اور یادگار منانے کی تجویز پر غور وفکر شروع ہوا اور منتظمین دارالعلوم دیوبند اس کے لئے راضی بھی ہو گئے۔ حضرت الاستاذؒ دارالعلوم دیوبند میں اس وقت وسطیٰ علیا کے استاذ تھے۔ اس کے باوجود حضرت مہتممؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حدیث وسیرت کی روشنی میں اس طرح کے پروگرام کے خلاف دلائل پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''دارالعلوم دیوبند'' جیسے فکری ونظریاتی ادارے میں اگر اس طرح بدعت کی شروعات کی جائے گی تو مستقبل میں اچھی نیت سے شروع کیا جانے والا کام غلط رسم کے طور پر معاشرے میں جڑ پکڑ لے گا۔ حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ قاسم العلوم والخیرات امام محمد قاسم نانوتوی کے نہ صرف صلبی اولاد ہیں بلکہ ان کے علوم ومشن کے وارث بھی تھے، چناں چہ اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت مفتیؒ صاحب کے دلائل سے اتفاق کیا اور سالانہ جشن کے پروگرام کو ملتوی کر دیا۔ دارالعلوم دیوبند کے صدسالہ تقریبات کے موقع درپیش ایک عجیب وغریب قصے کا حضرت الاستاذؒ نے اپنی کتاب ''جلسۂ تعزیت کا شرعی حکم'' میں ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> ''الٰہ آباد کے ایک بزرگ روپے کے پانچ سکے لے کر آئے اور حضرت حکیم الاسلام قدس سرہٗ کو دیے اور کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس بیداری میں آئے اور یہ روپے دیے اور فرمایا: ایک

> اجلاس صد سالہ میں دینا، ایک حضرت حکیم الاسلام کو دینا الخ۔ اسی شام کو دارالحدیث تحتانی میں جلسہ منعقد ہوا اور حضرت مولانا سالم قدس سرہٗ نے تقریر فرمائی اور خوب چندہ ہوا۔ دوسرے دن صبح میں کتابیں لے کر حضرت حکیم الاسلام کے پاس گیا اور ''التعلیق الصبیح'' میں حالت بیداری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لئے جو شرائط تھیں وہ دکھائیں اور میں نے عرض کیا کہ ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دوسری دنیا میں ہے اور دوسری دنیا کی چیز اس دنیا میں آسکتی ہے، حجر اسود کے بارے میں روایت ہے کہ وہ جنت کا پتھر ہے، مگر انڈیا کی ٹکسال میں ڈھلا ہوا سکہ، جن پر تین شیروں کا فوٹو بھی ہے اور سن بھی چھپا ہوا ہے، یہ سکے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت میں کیسے پہنچے اور آپ نے ان بزرگ صاحب کو کیسے عنایت فرمائے، ضرور ان کو دھوکہ ہوا ہے۔
>
> حضرت حکیم الاسلام قدس سرہٗ نے میری یہ بات قبول فرمائی اور دوسرے دن دارالحدیث فوقانی میں جلسہ ہوا اور حضرت مولانا سالم صاحب قدس سرہٗ نے تقریر کی اس میں صاف فرمایا کہ کل کی بات ہم نے غلبہ محبت میں مان لی تھی اس کو آگے نہ بڑھایا جائے''۔

علوم نبوت کے حاملین کی صفات کی بابت حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیش گوئی میں جو کچھ فرمایا ہے، اسی کا یہ عملی مظہر ہے۔ قرآن وحدیث اور قرون ثلاثہ کی فکر سے ذرہ برابر انحراف اور فکری بے راہ روی بڑے فتنے کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ حضرت مفتی سعید احمد پالنپوریؒ نے اس فریضہ کو بخوبی نبھایا اور یہی وجہ ہے کہ ان سے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ اس دور میں ''مسلک دیوبند'' کے علمی سالار رہیں۔

مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کی فکر تھی کہ ’’دیوبندیت کوئی فرقہ نہیں ہے بلکہ اہل السنہ والجماعہ کا دوسرا نام ہے، ہر وہ شخص جو خرافات، بدعات اور رسومات سے مجتنب اور سنت رسول کا پیروکار رہے وہ ’’دیوبندی‘‘ ہے، اہل سنت کا مدار قرآن وسنت اور قرون ثلاثہ (صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین) کے عمل پر ہے۔ جو باتیں قرآن وسنت کے خلاف ہے اور قرون ثلاثہ کے بعد شروع ہوا ہے وہ بدعت ہے۔ فقہی جزئیات اگر حدیث کے خلاف ہیں تو وہ ناقابل قبول ہے۔ (ماخوذ علمی خطبات)

قبروں پر کتبہ، قبرستانوں میں مراقبہ اور قبروں پر قرآن کی تلاوت، اسی طرح تصوف کے نام پر افراط وتفریط اور اکابر پرستی میں غلو پر نکیر کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ دیوبندیوں اور بدعتیوں کے درمیان صرف ایک بالشت کا فرق رہ گیا ہے۔ جب کہ یہ چیزیں قرآن وحدیث سے ثابت نہیں ہے تو پھر مسلک دیوبند داعیان ان حرکتوں کا ارتکاب کس طرح کرسکتے ہیں؟۔

دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو
ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں
ہوگیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

خود احتسابی اور اپنے فکر ونظر کو قرآن وحدیث کی کسوٹی پر پرکھنے کا عمل اگر بند کردیا جائے تو کوئی بھی تحریک اور جماعت صراط مستقیم سے بھٹک جاتی ہے اور اس کا مشن پس پشت چلا جاتا ہے اور خرافات حاوی ہوجاتی ہیں۔ ’’تحریک دارالعلوم دیوبند‘‘ ان تحریکوں میں سے ایک ہے جس نے کئی محاذوں پر کام کیا ہے اور ہر محاذ پر کامیابی وکامرانی نے اس کے قدم چومے ہے۔ ڈیڑھ سو سال بعد بھی اگر یہ تحریک اپنی معنویت اور اہمیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تحریک دارالعلوم دیوبند سے وابستگان میں ہمیشہ ایسے افراد رہے ہیں جنہوں نے خود احتسابی اور جماعت کے فکر وعمل کو قرآن وحدیث کی کسوٹی پر پرکھا اور اپنوں کا

بھی مواخذہ کرنے سے گریز نہیں کیا ہے۔ ساتھ ہی خرافات، لغویات کی آمیزش پر تنبیہ کر کے تحریک دیوبند کو اپنے مقاصد سے منحرف نہیں ہونے دیا ہے۔ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، محدث کبیر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، محدث کبیر مولانا فخر الدینؒ، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب، شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریاؒ، حضرت مولانا منظور نعمانیؒ اور ماضی قریب کی عظیم شخصیت محی السنہ حضرت مولانا ابرار الحق حقی ہردوئیؒ سے لے کر حضرت مفتی سعید احمد پالن پوریؒ تک ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے تحریک دیوبند کی حفاظت کی ہے۔ خامیوں وکوتاہیوں کی برملا نشاندہی کر کے تحریک کو صراط مستقیم پر گامزن رکھا ہے۔ امید ہے کہ مستقبل میں ایسی شخصیات پیدا ہوں گی جو اس عظیم فریضے کو انجام دیتی رہیں گی۔

حضرت مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کی عظمت و رفعت کو جو باتیں دوبالا کرتی ہیں ان میں ایک یہ بات تھی کہ وہ اپنی رائے قائم کرنے سے قبل قرآن وحدیث اور علماء کی کتابوں کا غائرانہ مطالعہ ضرور کرتے تھے اور مزید تحقیق کی راہیں بھی کھلی رکھتے تھے۔ چناں چہ حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمیؒ کے سیمینار کے موقع پر جو علمی بحث شروع ہوئی تھی اس موقع پر بھی انہوں نے واضح لفظوں میں کہا تھا کہ ”ابنائے دار العلوم آگے آئیں اور مسئلہ کو مثبت یا منفی پہلو سے واضح کریں“۔ مگر افسوس ہے کہ حضرت نے جس علمی بحث کی شروعات کی، وہ تعصب اور ضد کی شکل اختیار کر گئی اور لوگوں نے لعن طعن اور دشنام طرازی کا ایک سلسلہ شروع کرتے ہوئے ماضی کے زخموں کو کریدنا شروع کر دیا، کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ کئی دہائیوں تک ترمذی شریف پڑھانے والا شخص اگلے دن سبق میں آئے اور کہے کہ ”کل میں نے ایک طالب علم کے سوال کے جواب میں جو باتیں کہی تھیں وہ غلط تھیں، اصل مسئلہ یہ ہے“۔ آج درسگاہوں میں سوال وجواب کا سلسلہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ سوال کرنے والے طالب علم کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے سوال پر ہی سوال کھڑا کر کے طالب علم کو خاموش کر دیا

جاتا ہے۔ چناں چہ آج ہمارے اداروں میں تحقیق و جستجو ختم ہوگیا ہے اور تخلیقی ذہن کے حاملین سامنے نہیں آرہے ہیں۔

حضرت مفتی سعیدؒ مسلک کی تبلیغ کے داعی نہیں تھے۔ مگر وہ حق کے اظہار میں ہچکچاہٹ کو بھی برداشت کرنے کا مزاج نہیں رکھتے تھے، ان کی سوچ تھی کہ ”ملکی مسائل کے حل کت لیے ملک کے تمام باشندوں کو مل بیٹھنا چاہیے اور ملک کی سالمیت کے لئے متفقہ فیصلہ کرنا چاہیے۔ جنگ آزادی کے وقت ہندو مسلم اتحاد اس کی مثال ہے۔ ملی مسائل میں ملت کے تمام فرقوں کو مل کر بیٹھنا چاہیے اور ملک کی سلامتی کے لئے ایک آواز بلند کرنی چاہیے مسلم پرسنل لاء بورڈ کا اتحاد اس کی مثال ہے۔ مسلک و مشرب کے اختلاف میں ہر ایک کو اپنی رائے پر رہ کر نزاع سے بچنا چاہیے“۔ یادش بخیر میرے دورۂ حدیث کے سال میں ایک دن حضرت الاستاذ آئے اور کہا کہ کیرالہ کے کچھ طلبہ میرے گھر آکر یہ خواش ظاہر کی ہے کہ وہ میرے دلائل سے متاثر ہوکر حضرت امام شافعیؒ کی تقلید چھوڑ کر امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کرنا چاہتے ہیں“۔ حضرت الاستاذ نے فرمایا میں یہاں لوگوں کو حنفی بنانے کے لئے نہیں آتا ہوں، چوں کہ میں فقہ حنفی پر عمل کرتا ہوں اس لئے درس دیتے وقت احادیث سے مطابقت کرتا ہوں۔ اس لئے میں اپنے عزیزوں سے کہتا ہوں کہ وہ میرے دلائل سے متاثر ہوکر اپنے امام کی تقلید نہ چھوڑیں ایک جگہ لکھتے ہیں:

”دارالعلوم دیوبند مسلک کی دعوت نہیں دیتا، اہل السنہ والجماعہ کے مسلک معتدل کی حفاظت کرتا ہے، چار فقہی مسالک ہیں اور دارالعلوم دیوبند میں ہر مسلک کے طالب علم پڑھتے ہیں، اب شوافع بڑی تعداد میں ہیں مگر دارالعلوم کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں ایک بھی شافعی طالب علم دارالعلوم میں پڑھ کر حنفی نہیں ہوا، اس لئے کہ دورۂ حدیث کے اساتذہ مسلک کی دعوت نہیں دیتے“۔ (جلسۂ تعزیت کا شرعی حکم: ص 81)

حضرت الاستاذؒ فکر و نظر میں اعتدال کے قائل تھے، ساتھ ہی وہ اپنی بات اور موقف کو واضح کرنے میں جری بھی تھے، اس معاملے میں کسی ملامت کرنے والوں کی ملامت

دوستوں کی ناراضگی اوراپنوں کی بے اعتنائی کی پرواہ کئے بغیر اپنے ضمیر کی آواز ضرور بلند کرتے تھے۔ تحقیق وتخلیق اوراجتہاد جاری رکھنے کے حق میں تھے۔ مخاطب کی ذہنی استعداد اورقابلیت کے لحاظ سے اپنی بات رکھنے میں وہ ماہر تھے، ان کی باتیں سادہ ہوتی تھیں مگر معنی کے لحاظ سے دقیق ہوتی تھیں۔ حضرت علی بن طالب کرم اللہ وجہہ کا حکیمانہ قول ہے: کلموا الناس علی قدرقولهم اتريدون ان يكذبوا الله ورسوله (لوگوں سے ان کی سمجھ کے مطابق خطاب کیا جائے تاکہ وہ نادانی سے اللہ ورسول کی بات کی تکذیب نہ کریں) حضرت الاستاذ اس کے عملی مصداق تھے۔

اللہ کے ولیوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اگر وہ قسم کھالیتے ہیں تو اللہ اس کو پورا کرنے کے اسباب پیدا فرماتے ہیں۔ حضرت الاستاذ مختلف مواقع پر قبروں پر کتبہ، مہینوں تعزیتی جلسے کے انعقاد کے شدید مخالف تھے۔ قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ ان کی موت ایسے حالات اوروقت میں ہوئی کہ خاموشی سے ممبئی کے ایک عام قبرستان میں علم و صلاح کے گنجینے کوسپرد خاک کردیا گیا۔ چوں کہ کورونا وائرس کی وجہ سے اجتماعات کے انعقاد پر مکمل پابندی ہے، تو پھر تعزیتی جلسوں کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟ مگر حضرت الاستاذ کا مشن اب بھی باقی ہے اوران کی روح شاگردوں سے مخاطب ہے:

ہے جنوں جنوں کے لئے آغوش و داع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا، میرے بعد
کون ہوتا ہے حریف مئے مردافگنِ عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا، میرے بعد

تعزیتی پیغامات

مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کا انتقال: ایک عظیم سانحہ

حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم

صدر جمعیۃ علماء ہند وصدر المدرسین واستاذ حدیث دار العلوم دیوبند

یہ خبر انتہائی رنج وخبر کے ساتھ سنی جائے گی کہ دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث وصدر المدرین حضرت مولانا سعید احمد پالن پوریؒ آج صبح ممبئی میں انتقال فرما گئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت مولانا سعید احمد پالن پوریؒ دار العلوم دیوبند کے ابنائے قدیم میں سے تھے، مولانا بچپن ہی سے نہایت ذہین وفطین، کتب بینی اور محنت کے عادی تھے۔ اپنی ذہانت و ذکاوت کی وجہ سے مختلف علون وفنون اور خاص طور پر فقہ اور حدیث میں ممتاز جانے جاتے تھے، فراغت کے بعد دار العلوم اشرفیہ راندیر سورت میں علم حدیث کی خدمت کرتے رہے اور پھر تقریباً 47 رسال پہلے دار العلوم دیوبند نے مادر علمی کی خدمت کے لئے دار العلوم میں بلالیا۔ اسی وقت سے ان کا علم حدیث سے خاص شغف رہا ہے، اس وقت موصوف دار العلوم کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس تھے۔ بخاری شریف کا درس دیا کرتے تھے، اس زمانہ میں ان کا درس حدیث مختلف علوم وفنون پر دسترس کی بنیاد پر بہت ہی ممتاز سمجھا جاتا تھا، اگر یہ کہا جائے کہ دار العلوم کے مسند حدیث کے امتیاز کو انہوں نے قائم رکھا تھا تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا، اس کے علاوہ مولانا مرحوم کی متعدد تصانیف ہیں جن سے لوگ مستقبل میں استفادہ کرتے رہیں گے۔

مولانا مرحوم دار العلوم کے شعبہ ختم نبوت کے ناظم اعلیٰ بھی تھے، ہمیں افسوس ہے کہ مولانا ہم سے جدا ہو گئے، وہ زمانہ سے شوگر کے مریض تھے اور اس وقت ان کے عوارض یکے بعد دیگرے بڑھتے گئے یہاں تک کہ انہوں نے ہم کو داغ مفارقت دے دیا۔ ہماری بارگاہ خداوندی میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور دار العلوم کو اس کا نعم البدل عطا فرمائے اور مولانا مرحوم کی علمی وصلبی اولاد کی نگہبانی فرمائے، ہم سب خدام جمعیۃ

ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں، میری جماعتی احباب، اہل مدارس، علمائے کرام، طلبۂ عزیز، ابنائے دارالعلوم اور مسلمانوں سے حضرت مرحوم کی مغفرت و ترقی درجات کے لئے اور پسماندگان، اعزا و اقارب کے لئے بارگاہ خداوندی میں صبر جمیل کی دعاء کی اپیل ہے۔

ارشد مدنی

خادم دارالعلوم دیوبند

تعزیت نامہ

حضرت مولانا ابوالقاسم نعمانی صاحب زید مجدہم مہتمم دارالعلوم دیوبند

مکرمی حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری ودیگر برادران گرامی، وجناب
مولانا وحید احمد صاحب ودیگر صاحبزادگان محترم
حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری قدس سرہٗ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری قدس سرہٗ کی وفات حسرت آیات کا جو حادثۂ عظمیٰ آج صبح پیش آیا، اس پر اپنی جانب سے نیز دارالعلوم کے تمام اراکینِ شوریٰ اساتذۂ کرام اور کارکنان وخدام کی جانب سے آپ حضرات کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش کرتا ہوں، اللہ رب العزت آپ حضرات اور تمام متعلقین ومحبین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور حضرت مرحوم کو اعلیٰ علیین میں مقام بلند نصیب فرمائے۔ آمین

حقیقت تو یہ ہے کہ اس موقع پر ہم سبھی مستحق تعزیت ہیں اس لئے کہ یہ ہم سب کا مشترک حادثہ ہے۔ بلاشبہ حضرت مفتی صاحب دارالعلوم کی مسند تدریس کی آبرو اور جماعت دیوبند کے علمی سالار تھے۔ انہوں نے تقریباً نصف صدی تدریسی خدمات انجام دیں اور مقبولیت کا اعلیٰ معیار حاصل کیا۔ ان کا شوق تدریس اور سبق میں انہماک حضرات اکابر کی یاد تازہ کرتا تھا۔ اسی کے ساتھ اللہ رب العزت کی توفیق سے انہوں نے بلند پایہ تصنیفی وتالیفی خدمات بھی انجام دیں۔ رحمۃ اللہ الواسعہ، تحفۃ القاری، تحفۃ الالمعی اور ہدایت القرآن

وغیرہ جیسی گراں قدر تالیفات ان کے نام کو زندہ جاوید رکھنے کے لئے کافی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ فنا فی العلم تھے اور ان کی شخصیت سے علم کی خوشبو مہکتی تھی، علم ان کا اوڑھنا بچھونا تھا، وہ اپنی مسلسل محنت اور علمی اشتغال کے اعتبار سے اسلاف کی یادگار تھے۔ ایسی شخصیت کا اٹھ جانا نہ صرف آپ حضرات کے لئے بلکہ پوری جماعت دیوبند اور ملت اسلامیہ کے لئے عظیم سانحہ ہے۔

میں غم کی اس گھڑی میں آپ تمام حضرات سے تعزیت کرتے ہوئے دعا گوں ہو ل کہ اللہ رب العزت حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ حضرات اور تمام اہل تعلق کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

والسلام

ابوالقاسم نعمانی

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۲۵/ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹/ مئی ۲۰۲۰ء

تعزیت نامہ

امیر الہند مولانا قاری سید محمد عثمان منصور پوری جمعیۃ علماء ہند

جمعیۃ علماء ہند کے صدر امیر الہند مولانا قاری سید محمد عثمان منصور پوری اور ناظم عمومی مولانا محمود مدنی نے دار العلوم دیوبند کے انتہائی مؤقر شیخ الحدیث وصدر المدرسین حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری کی وفات حسرت آیات پر دلی رنج والم ظاہر کیا ہے۔ حضرت مولانا کے دار العلوم دیوبند میں درس و تدریس کے اڑتالیس سالہ دور میں ہزار ہا تشنگان علوم سر چشمہ فیض سے بلا واسطہ فیضیاب ہوئے، جن کے قلمی فیوض اہل علم کے لئے نعمت لازوال ہیں۔ آپ جیسے کریم النفس صاحب تقویٰ مشفق استاذ کا سایہ بہت بڑی سعادت اور ان کی وفات بڑی محرومی اور عظیم نقصان ہے۔ آپ کی ذات ستودہ صفات بہت سی علمی و عملی خوبیوں کا مظہر تھی۔ رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ، افادات درس ترمذی تحفۃ الالمعی، افادات درس بخاری تحفۃ القاری، زبدۃ الطحاوی، داڑھی اور انبیاء کی سنتیں، حرمت مصاہرت، العون الکبیر وغیر ان کی بہترین تصنیفات ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے متعدد علمی وفقہی کتابیں لکھی ہیں۔

مولانا موصوف کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دار العلوم دیوبند کے ابتداء سے تاحیات ناظم عمومی رہے، انہوں نے دار العلوم دیوبند میں بوقت ضرورت فتاویٰ نویسی فرمائی اور اہم فتاویٰ کے جوابات کی نگرانی فرماتے۔ آپ نے ہمیشہ جمعیۃ علماء ہند اور اکابر جمعیۃ سے خصوصی تعلق رکھا اور دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ۱۳۸۴ھ میں دار العلوم اشرفیہ راندیر سورت میں درجہ عُلیا کے استاذ مقرر ہوئے تو وہاں جمعیۃ علماء کی سرگرمیوں سے باضابطہ وابستہ ہوئے اور مسلسل نو سال تک جمعیۃ علماء راندیر کے ناظم بھی رہے۔ حضرت فدائے ملت

مولانا اسعد مدنیؒ ان سے مشورہ فرماتے اور جب بھی مباحث فقہیہ جمعیۃ علماء ہند کے اجتماعات منعقد ہوتے ان کو خصوصی طور سے مدعو فرماتے۔ حضرت مولانا سال گذشتہ بھی مباحث فقہیہ کے اجتماع میں شریک ہوئے وہ فقہ حنفی کے برصغیر میں نامور عالموں میں تھے اور دلائل کی قوت سے مسلک احناف کو عصر حاضر کے مسائل کے بہترین حل کے طور پر پیش فرماتے۔

جمعیۃ علماء حضرت مولانا کے پسماندگان سے دلی ہمدردی ظاہر کرتی ہے اور دست بدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جنت میں مقام اعلیٰ عطا فرمائے اور انبیاء وصدیقین کا رفیق بنائے۔ نیز اہل خاندان، اولاد ورفقاء، ہزار تلامذہ اور ہم متوسلین کو صبر واستقامت کے ساتھ اس غم کو برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جمعیۃ علماء ہند اپنے تمام جماعتی احباب، دینی مدارس کے ذمہ داروں سے مولانا مرحوم کے لئے ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کے اہتمام کی اپیل کرتی ہے۔ ممبئی میں صبح حضرت مولانا موصوف کے انتقال کی خبر موصول ہوتے ہی جمعیۃ علماء ہند کے صدر مولانا قاری محمد عثمان منصور پوری نے دیوبند میں ان کے گھر جاکر برادر خورد حضرت مفتی امین پالن پوری صاحب اور مفتی صاحب مرحوم کے صاحبزادگان ودیگر اہل خانہ سے تعزیت مسنونہ پیش کی۔ نئی دہلی میں جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں بعد نماز ظہر ایک تعزیتی نشست بھی منعقد ہوئی جس میں دعائے مغفرت کی گئی۔ اس میں جمعیۃ علماء ہند کے سکریٹری مولانا حکیم الدین قاسمی، مولانا کلیم الدین قاسمی، مولانا عرفان، مولانا نجیب اللہ قاسمی، مولانا ضیاء اللہ قاسمی، مولانا یاسین قاسمی، مولانا عظیم اللہ قاسمی سمیت دفتر میں موجود سبھی اسٹاف شریک ہوئے۔

جاری کردہ
نیاز احمد فاروقی
جمعیۃ علماء ہند (محمود مدنی)

تعزیت نامہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب

گرامی قدر مکرم حضرت مولانا ابوالقاسم نعمانی صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند حفظکم اللہ تعالیٰ من کل سوء

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ کی وفاتِ حسرت آیات اس امت کا بڑا سانحہ ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ان کی وفات کے موقع پر ان کے صاحبزادے سے ٹیلی فون پر حالات معلوم ہوئے اور زبانی تعزیت بھی تمام اہل خانہ تک پہنچائی گئی، لیکن خیال آیا کہ اگرچہ ان جیسی شخصیت کی وفات پر ہم جیسا ہر طالب علم بلکہ ہر مسلمان مستحق تعزیت ہے، کون کس کی تعزیت کرے؟ لیکن شاید سب سے زیادہ قابل تعزیت دارالعلوم دیوبند ہے جس کی مسندِ حدیث کی عظیم زینت حضرت قدس سرہٗ کی عظیم ذات تھی، نہ صرف درسِ حدیث کی حد تک، بلکہ دارالعلوم کے مسلک ومشرب اور مزاج ومذاق کے تحفظ میں ان کا وجود ایک بڑا سرمایہ تھا، اس سرمایہ سے محرومی ہماری اس امّ المدارس کا بڑا نقصان ہے، اس لیے یہ تعزیت نامہ دارالعلوم کے نمائندے کی حیثیت سے آنجناب کی خدمت میں ارسال ہے، جس میں اولاً کلماتِ مسنونہ سے تبرک کرتا ہوں۔ ان للہ ما اخذ ولہ اعطی وکل شئی عندہ باجل مسمیٰ، اللہ اکرم نزلہ ووسع مدخلہ واسکنہ جنات النعیم۔

ساتھ ہی اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ دارالعلوم کو اس نقصان کے اثرات سے محفوظ رکھ کر اپنی خاص دستگیری سے نوازیں اور آپ حضرات پر جو ذمہ داری آئی ہے، اللہ تعالیٰ اس سے بطریقِ احسن عہدہ برآ ہونے کی توفیق مرحمت فرمائیں۔ آمین!

والسلام

محمد تقی عثمانی

جامعہ دارالعلوم کراچی

پیغام تعزیت

بروفات حسرت آیات حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری

حضرت مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

آج صبح بعد نمازِ فجر متصلاً موبائل پر مکتوب پیغام موصول ہوا کہ استاذ مکرم جناب حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمہ اللہ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند حالیہ مختصر علالت کے بعد ممبئی کے ایک ہسپتال میں وفات پاگئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بارگاہ رب جلیل میں دست بدعا ہوں حق تعالیٰ اپنے بیکراں فضل واحسان کے صدقے میں مرحوم ومغفور کو اعلیٰ علیین میں مقام کریم سے سرفراز فرماتے ہوئے جملہ اہل خانہ و متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق سے بہرہ ور فرمائیں۔

عقل انسانی کے وساوس وشکوک سے بھی وراء الوراء اس حقیقت کی صداقت میں کیا کلام ہوسکتا ہے کہ جو کوئی بھی اس دار فانی میں آتا ہے پہلی سانس کے ساتھ ہی اس کی زندگی کا اپنے منطقی انجام کی طرف سفر کا آغاز ہوجاتا اور وقت موعود آجانے پر انجام کار اس کو دار بقاء کی جانب رخت سفر باندھ کر رخصت ہونا ہوتا ہے، کیوں کہ موت وحیات اس کارگاہ عالم کی ناقابل تبدیل خاصیات کے لازمی اجزاء کا سب سے اہم ترین حصہ ہے۔ کوئی بھی انسان ظاہری ومعنوی مراتب کی کتنی ہی رفعتوں اور بلندیوں کو کیوں نہ عبور کرلے لیکن وقت موعود آجانے پر نہ کسی کے لئے کوئی راہِ فرار ہے، نہ کوئی استثناء اور نہ کسی کے لئے کوئی رعایت اگر مشیت رب میں استثناء کو امکان کا درجہ حاصل ہوتا الاقرب فالاقرب کی بنیاد پر روئے زمین پر حق تعالیٰ کے سب سے مقدس ومحبوب ترین طبقہ انبیاء اور اس میں بھی بالخصوص نبی

کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اس مرتبۂ استثناء کے احق قرار پاتے لیکن اس حوالے سے ازروئے کلام اللہ قانون ازلی بیان فرمادیا گیا ہے: کل من علیھا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

حضرت مفتی صاحبؒ کی رحلت پر دارالعلوم وقف دیوبند میں ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کا اہتمام کیا گیا۔ حق تعالیٰ جملہ تلامذہ ومحبین کی دعاؤں کو شرف قبولیت سے سرفراز فرماتے ہوئے حضرت کو آسودۂ رحمت فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

محمد سفیان قاسمی
مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند
۲۵؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ

تعزیت نامہ

حضرت مولانا محمد سعیدی ناظم ومتولی مظاہر علوم (وقف) سہارنپور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمان ومحترمان پسران حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ
(شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

آج ۲۵؍رمضان المبارک کو علی الصباح یہ جانکاہ ودلگداز خبر صاعقہ اثر ملی کہ اسلام کے عظیم فقیہ ومحدث حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ نے مختصر علالت کے بعد ممبئی کے اسپتال میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مفتی صاحب موصوف دور حاضر کے مثالی محدث، بے باک خطیب، ادیب اریب اور فقیہ لبیب تھے وہ اخیر عمر میں مسلک علمائے دیوبند کے عظیم ترجمان اور شان تھے ان کے وجود سے طبقۂ علماء کو سکون اور قرار تھا، ان کی گفتگو عالمانہ، ان کی تحریریں محققانہ، ان کا طرز تحریر ادیبانہ اور ان کا اشہب قلم سچ اور حق کا پاسبان وچوبدار تھا، انہوں نے تقریباً نصف صدی تک علم فقہ اور حدیث کی شان کے ساتھ خدمت انجام دے کر نئی نسل کی تعمیر وتشکیل میں کلیدی کردار ادا فرمایا ہے۔

مفتی صاحب جس بات کو سچ اور حق سمجھتے تھے اس کے لکھنے اور بیان کرنے میں کسی لومۃ لائم کی پرواہ نہیں کرتے تھے، وہ اپنی ٹھوس استعدادِ علمی اور کمالات فقہی کے باعث دیوبندیت کی ڈھال تھے، انہوں نے مظاہر علوم (وقف) سہارنپور میں چندسال پہلے اجلاس ختم بخاری کے

موقع پر ڈیڑھ گھنٹہ تک مظاہر علوم کے اپنے دور طالب علمی، یہاں کے اساتذہ اور اس وقت کے حالات اور ماحول پر دلچسپ تقریر فرمائی تھی۔ مفتی صاحبؒ کو مظاہر و اکابر مظاہر سے بے انتہا محبت رہی۔ چنانچہ انہوں نے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ سے اپنے اصلاحی تعلق کی شروعات کی تھی بعد میں فقیہ الاسلام حضرت مولانا مفتی مظفر حسین سے خلعت خلافت حاصل ہوئی چنانچہ یہ خلافت نامہ مفتی محمد امین صاحب پالن پوری نے اپنی کتاب الخیر الکثیر کے ابتدائیہ میں شامل کر کے جاوید بنا دیا ہے۔

اس آنی جانی اور فانی دنیا میں قرار کسی کو نہیں ہے سب کی تقدیر میں یہاں سے فرار مقدر ہے، موت سے سبھی کو ہمکنار ہونا ہے، کل نفس ذائقۃ الموت ایک سچائی ہے جس سے مجال انکار کسی کو نہیں ہے، اب جب کہ مفتی صاحب ہمارے درمیان نہیں رہے تو اس موقع پر ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم تعلیمات شریعت، سیرت نبوی اور احکامات قرآنی کی روشنی میں اپنی زندگیاں گزار کر ان کی روح کو شاد اور ان کے مشن کو عام کریں، زیادہ سے زیادہ دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کریں۔ رمضان المبارک کے عشرۂ اخیرہ میں ان کا اس دنیا سے پردہ فرمانا ان شاء اللہ، اللہ کی رضا قرب اور عنایات سے لطف اندوز ہونے کا باعث ہوگا۔

اس المناک حادثہ، جانکاہ صدمہ اور صاعقہ اثر خبر اثر پر ہم اپنے آپ کو مستحق تعزیت سمجھتے ہیں۔ ان للہ ما اخذ ولہ ما اعطیٰ وکل شیء عندہ باجل مسمی فلتصبر ولتحتسب۔ یا اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحبؒ کو جنت الفردوس میں مقام رفیع عطا فرما اور ان کے مشن کے احیاء و سربلندی کے لئے غیب سے سامان پیدا فرما۔

والسلام

محمد سعیدی

ناظم و متولی مظاہر علوم (وقف) سہارنپور

تعزیت نامہ

بروفات حسرت آیات حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ

حضرت مولانا سعید الرحمٰن صاحب مدیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

بخدمت گرامی حضرت مہتمم صاحب مدظلہ دارالعلوم دیوبند

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! مزاج شریف!

ابھی ابھی حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ کی اچانک وفات کی خبر معلوم ہوئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بہت بلند فرمائے۔ مفتی صاحب مرحوم علم و دین کی بے مثال خدمات انجام دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں اور دارالعلوم کو ان کا بدل عطا فرمائیں۔ آپ اور سبھی حضرات اساتذہ اور طلبہ کی خدمت میں تعزیت پیش ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنی شایانِ شان انہیں ان کی دینی وعلمی خدمات کا بدلہ عطا فرمائیں اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائیں

والسلام

مخلص

سعید الرحمٰن اعظمی

مدیر دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

تعزیت نامہ

تعزیت بروفات استاذ مکرم حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ
شریکِ غم: مفتی خالد سیف اللہ گنگوہی مدیر جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ
۲۶؍ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۲۰؍ مئی ۲۰۲۰ چہار شنبہ

گرامی قدر حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری و پسران ذی احترام حضرت اقدس مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گزشتہ کل ہی قدرے تاخیر سے یہ خبر وحشت اثر معلوم ہو کر انتہائی صدمہ ہوا کہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث وصدر المدرسین ہزاروں علماء کے قابل فخر استاذ، فقیہ النفس عالم بے بدل، استاذ اکبر حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ طویل علالت کے بعد مسافران آخرت میں شامل ہو گئے۔ انا لله وانا اليه راجعون، ان لله ما اخذ وله ما اعطى وكل شىء عنده باجل مسمى فلتصبر ولتحتسب۔

یہاں جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ کے شیخ الحدیث اور ہمارے محسن و مخلص استاذ حضرت شیخ مولانا وسیم احمد سنسارپوری رحمہ اللہ کی وفات کا غم بالکل تازہ تھا کہ عالم جلیل اور محدث شہیر حضرت مفتی صاحب بھی داغ مفارقت دے گئے آپ کی وفات سے فضل و کمال کی ایک بستی اجڑ گئی۔ علم و تحقیق کا ایسا فرہاد چل بسا جس نے ساری زندگی قال اللہ وقال الرسول کی تفہیم وتشریح کے لئے وقف کر دی تھی، آپ کی وفات درحقیقت ایک عالم کی وفات ہے۔

وما كان قيس هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهدما

فخر دارالعلوم کا سانحۂ ارتحال

حضرت مفتی افتخار احمد صاحب قاسمی

صدر جمعیۃ علماء کرناٹک و مہتمم مدرسہ تعلیم القرآن بنگلور

۲۵؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ بمطابق 19 مئی 2020 بروز پیر صبح تقریباً ساڑھے چھ بجے ممبئ شہر کے ایک ہاسپٹل میں عالم اسلام کی ایک علمی وعبقری شخصیت محدث جلیل، مفسر کبیر امام الھند حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کے علوم ومعارف کے مستند اور قابل فخر شارح، قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم وفنون کے ترجمان امام الفقہا والمحدثین امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب گنگوہی قدس سرہ کے علوم وافکار کے امین، اکابر علماء دیوبند کے مسلک ومشرب کے پاسبان استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری قدس سرہ العزیز شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند مختصر علالت کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا اور ہزاروں علماء واساتذہ بلکہ علمی میدان ہی کو سوگوار کر کے عارضی قیامگاہ دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔

یوں تو حضرت موصوف کے خصوصیات اور خوبیوں پر لکھا گیا اور لکھا جاتا رہے گا اللہ تعالیٰ نے آپ کے اندر بے شمار صلاحیتیں ودیعت فرمائی تھیں۔ جن میں ایک اہم صلاحیت افہام وتفہیم اور درس وتدریس کی تھی اور یہی خصوصیت آپ کے درس کو طلبا میں بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ آپ کا درس انتہائی مربوط ومنظّم ہوتا اور مشکل سے مشکل مسئلہ چٹکیوں میں حل فرماتے اور ہر بات مدلل ہوتی بالخصوص اختلافی مسائل ہوں یا روایات تطبیق کا مسئلہ اتنا صاف اور دوٹوک انداز میں اطمینان بخش اور دلنشیں طریقے پر حل فرماتے۔ عبارت خوانی میں کوئی نحوی یا صرفی غلطی ہو جاتی تو عبارت خواں سے مکمل تحقیق کرتے اور کرواتے یہاں تک کہ عبارت خواں کے مکمل سمجھ جانے کے بعد آگے پڑھنے کی اجازت دیتے مقصد یہ عبارت

خواں پوری بصیرت کے ساتھ عبارت پڑھے، یہی وجہ تھی حضرتؒ کے یہاں عبارت پڑھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔

حضرت قدس سرہ کبھی کبھی درس میں فرمایا کرتے تھے کہ میں نے یہ طریقہ اپنے دو اساتذہ کرام سے سیکھا ہے

(۱) حضرت الاستاذ مولانا صدیق صاحب جموی کشمیری قدس سرہ، استاذ مظاہر علوم سہارنپور جو امام النحو سے مشہور تھے۔

(۲) اپنے مخدوم گرامی استاذ الاساتذہ حضرت علامہ ابراہیم صاحب بلیاویؒ قدس سرہ جو تمام علوم وفنون میں مہارت رکھتے تھے۔

خاص طور سے معقولات کے امام تھے۔ پڑوسی ملک کے کے ایک مشہور ومقبول محدث حضرت مولانا منظور صاحب مینگل فرماتے ہیں کہ حدیث کے درس کا طریقہ ہندوستان کے دو علماء کا بڑا نرالا اور انوکھا ہے روایتی نہیں ہے۔

(۱) حضرت مولانا شیخ یونس صاحب جونپوری رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور

(۲) حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند۔ ولی را ولی می شناسد کے طور پر ایک محدث کو محدث ہی سمجھ سکتا ہے، بہر حال حضرت رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے باکمال وبافیض استاذ عظیم محدث ومفسر اور دارالعلوم کی گویا شان تھے۔

جو اب ہمارے درمیان نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے درجات بلند فرمائے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آپ کی تمام حسنات بالخصوص تصنیفات وتالیفات کو صدقہ جاریہ اور ذریعہ ترقی درجات بنائے۔ آمین، دارالعلوم کو آپ کا نعم البدل عطا فرمائے، آمین

منظومات

مرثیہ

بروفات: حضرت اقدس مفتی سعید احمد پالنپوری نور اللہ مرقدہٗ، شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند

مفتی محمد یوسف صاحب تاؤلوی

استاذ حدیث دار العلوم دیوبند، الہند

حق تعالیٰ نے بنایاان کوذی علم وہنر
معدن اخلاق بھی اورعلم و فن کا اک گہر
معدن حکمت بھی ہے لعل و گہر سے کم نہیں
ذی بصیرت پرضیاء ہے۔ ساتھ میں نوربصر
سوز دل دردنہاں عفووکرم بھی بے مثال
علمی کروفربھی ہے اورساتھ میں سوز جگر
گنج علم و آگہی ہے ان کی محنت کی دلیل
لطف کتب بینی بھی ہے ذوق مناجات سحر
میرا دیرینہ تعلق ان سے وابستہ رہا
بہت سے اسفار میں دیکھاہے میں نے ذوق سفر
رہا محسن و ہمدرد، سادہ بے تکلف ہم سفر
میں نے دیکھا ہے سفر میں ساتھ میں لطف حضر
بحرعرفاں چشم تر غواص اسراروحکم
دوررس بھی حق نگر بھی ساتھ میں حق بیں نظر

عدل سے دیکھوتوہستی جامع الاشتات ہے
جلوئے صدیق بھی ہے اورکبھی رعب عمر
لذت شب زندہ داری کا کمال ان کو ملا
پختگی تھی علم میں اورذات ان کی ذی اثر
الفت علم نبوت دل میں ان کے موجزن
بس یہی راحت کا ساماں تھا نہ کچھ چیز دگر
ابررحمت ان کی تربت پر رہے سایہ فگن
ان کی کھیتی پر کبھی ظاہر نہ ہو گردسفر
صدق کا اعلیٰ ٹھکانہ ان کو یارب عطاکر
ہے دعا یوسف کی یارب کر عطااعلیٰ ثمر

نظم

استاذ محترم حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری کے انتقال پر ملال پر لکھی گئی دل کی ترجمانی کرتی نظم

اظفر اعظمی

ہر دل ہے حزیں ہر آنکھ ہے نم اب ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا
منہ موڑلیا ہے کیوں اس نے وہ ہم سے کیوں اب روٹھ گیا
خود آنکھ تو اپنی بندکرلی ہر آنکھ مگر نمناک ہوئی
دل زور سے دھڑکا سن کر یہ وہ شیخ ہماراچھوٹ گیا
اس دل کو سنبھالاکیسے دیں اس آنکھ کو کیسے سمجھائیں
بے تاب ہوا ہے سارا جہاں یہ کیسا پھپھولا پھوٹ گیا
ہر شخص یہاں غمگین ہوااب کون تسلی کس کو دے
غمخوار نہیں کوئی بھی محفل کووہ ایسے لوٹ گیا
راضی برضاہی رہنا ہے جنت میں ملیں گے شیخ سے ہم
اظفر کو تسلی ہوجائے کہہ دو کہ نہیں وہ جھوٹ گیا

دعائیہ کلام

بروفات حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ

حیدر میواتی ندوی

مرے استاذ کا نعم البدل مولا عطا کر دے
چمن میں ہمنوا ان سا کوئی نغمہ سرا کر دے

زمیں گریہ کناں ہے آسمان نالاں ہے فرقت میں
لگا جو زخم ہے دل میں خدا اس کی دوا کر دے

چراغ مصطفےٰ اب گل ہوا جاتا ہے گلشن میں
اب تو اپنے نور سے اس کی ضیا مولا سوا کر دے

گیا باطل شکن، ایوان باطل میں چراغاں ہے
مرے مولا ہمیں پھر اک عطا شعلہ نوا کر دے

سلوک و معرفت کی آج گلیوں میں ہے خاموشی
تو پھر آباد ویرانے میں اک شہر وفا کر دے

ہجوم عاشقاں دیدار کو بیتاب رہتا تھا
مرے استاذ کا ثانی کوئی جلوہ نما کردے

ہزاروں تشنگان علم وفن نے فیض پایا تھا
تو پیدا ان کے جیسا نکتہ داں اک رہنما کردے

سنائے حال دل کیسے ہے مجبور نوا حیدر
خدایا مغفرت حضرت کی صدقے مصطفےٰ کردے

دکھے دلوں کی عرضی

شہِ دوجہاں کی بارگاہ میں

بروفات حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری نوراللہ مرقدہٗ

قاسم نور حیدرآبادی

صبا تو روضے پہ ان کے جا کے بڑے ادب سے سلام کہنا
سلام کے بعد بے کسوں کا دکھوں بھرا اک پیام کہنا

یہ کہنا ان سے کہ دور تم سے ہوا ہے یاں حادثہ ایسا
دل کی بستی اجڑ گئی ہے، غموں کی بکھری ہے شام کہنا

وہ ایک ساقی تمہارا عاشق پلا رہا تھا جو مئے محبت
بہت دنوں سے تھامے کدے میں جو روحِ میناوجام کہنا

وہ آج فرقت کا داغ دے کر وہ الوداع الوداع کہہ کر
سسکتے روتے ہوئے دلوں کو پلا گیا غم کا جام کہنا

چمن کے ان سرخ روگلو کو اس نے خون جگر دیا تھا
حقیقی ذرے بنے تھے ہاتھوں میں اس کے ماہِ تمام کہنا

اس نے سب کو افق پر پرواز کا نیا طور تھا سکھایا
اس کے دم سے امید کے دیپ جل رہے تھے مدام کہنا

یہ کیسی آندھی چلی یکا یک کہ بجھ گئے آس کے دیے سب
اداس وویران ہوگئے ہیں ہر ایک دراوربام کہنا

اجڑ گئی ہیں وہ محفلیں سب بکھر گئے ہیں وہ سارے منظر
خراب حالوں کا اب نہیں ہے کوئی بھی عالی مقام کہنا

وہ جس کے دیدار سے تھی قلب وجگر کو آسودگی میسر
اب اس روئے جانفزاں کو آقا ترس رہے ہیں غلام کہنا

حیات کا بے نشاں جزیرہ کسی کی شفقت کا تھا پیاسا
مگر وہ شفقت کا ماہ تاباں غروب ہوگیا آج شام کہنا

یہ کہنا آقا کہ اس کی محفل کی جلوہ افشانیوں کے منظر
بہت ستاتے ہیں یاد آکر یہ دل ہے تڑپے مدام کہنا

یہ کہنا ان سے تمہارا اک امتی ہے صد پارہٴ شکستہ
نہیں ہے کچھ باعث سکوں بس وہ روئے ہے صبح وشام کہنا

مرثیہ

محدث عصر فقیہ دوراں حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری علیہ الرحمۃ کی رحلت

ایک عہد کا خاتمہ

نتیجہ فکر: رشید الدین معروفی

افسردہ کلی ، پژمردہ ہے گل، اب عہد بہاراں ختم ہوا
صد پارہ ہوا دامانِ جگر اک درد کا درماں ختم ہوا
وہ مشک ختن ، وہ شیخ زمن ، وہ علم و ہنر کا در عدن
گلزار ادب ویران ہوا، گلبانگ گلستاں ختم ہوا
میخانے ہوئے خالی ایسے کہ جام و سبو بھی ٹوٹ گئے
ساقی جو گیا تو ایسا گیا پینے کا ہی ساماں ختم ہوا
ساحل کی طلب میں رہ رو ہیں ، طوفان کی ہر سو آہٹ ہے
ملاح ہوا رخصت ہم سے اور عزم جواناں ختم ہوا
مایوس مکیں، سنسان مکاں، نمناک زمیں ، غمناک زماں
یہ کون گیا منزل سے مری ایک عہد درخشاں ختم ہوا
یہ بزم جہاں ہے راہ گذر، ہر کوئی یہاں ہے پا بہ سفر
اک دھڑکن دل کیا بند ہوئی ہر جوبن جاناں ختم ہوا
کہتے ہیں سعید احمد ان کو، وہ علم کا مہر تاباں تھا
اس ماہ جبیں کی رحلت سے اک شہر نگاراں ختم ہوا
اے رب دو عالم سن لے تو یہ نالۂ سوز رشید الدیں
پھر بھیج دے کوئی مہر مبیں ، آفاق درخشاں ختم ہوا